(ملا وجہی)

سب رس

۱۹۳۴ء ماہنامہ ۱۱

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایکدوپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶/

سب رس

جلد ۸ بابت جنوری ۱۹۴۵ء شمارہ ۱

۱	اداریہ	ادارہ	۲
۲	چاند (نظم)	محمد فضل الرحمن بی اے	۳
۳	بی بی (فسانہ)	زینت ساجدہ	۴
۴	شمس الامراء کے سائینسی کارنامے	خواجہ حمید الدین ایم اے	۹
۵	ہندوستان میں انگریزی دور کا اسلامی قانون	عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی ایل ایل بی	۱۷
۶	غزل	ملک عبدالعزیز فطرت (راولپنڈی)	۲۴
۷	تقریب کچھ تو ہے	شاہین فاروقی (عثمانیہ)	۲۵
۸	نور باغ کے گنبد	جہانگیر علی خاں لکچرار گلبرگہ کالج	۳۱
۹	علم جر ثومیات کا امام	گلچیں حیدرآبادی	۳۳
۱۰	رباعیات	تمکین سرمست	۳۷
۱۱	شہزادی گلبدن	شاہ ابرار احمد ذکی ایم اے	۳۸
۱۲	غزل	لطیف ساجد (عثمانیہ)	۴۰
۱۳	۱۸۵۷ء کے حیدرآباد کی ایک جھلک	مبارز الدین رفعت ایم اے (عثمانیہ)	۴۱
۱۴	سوال وجواب	م، ر، س	۴۵
۱۵	تنقید و تبصرہ	" "	۴۷
۱۶	ادارہ کی خبریں (نتیجہ امتحان اردو دانی دوم ۱۹۴۴ء)	ادارہ	۴۹ تا ۶۴

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

اداریہ

اس شمارے سے سب رس اپنی عمر کے آٹھویں دور میں داخل ہو رہا ہے اور خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ زبان اردو کا یہ جواں سال ماہنامہ اپنی زندگی کے ہر قدم پر اپنے سرپرستوں اور قدر دانوں کی متوقعہ تمناؤں کا حتی المقدور ساتھ دیتا رہا۔

جس ناسازگار زمانہ میں اس "ہونہار بروا" کی داغ بیل ڈالی گئی اس کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود اپنوں کو اس کا یقین نہ تھا کہ حیدرآباد کی اس فضا میں جو ادبی رسالوں کے لئے خاص طور پر ناساعد سمجھی جانے لگی تھی، اس نونہال کو پھلنے پھولنے کا موقع نصیب ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے بھی کئی انفرادی اور اجتماعی کوششیں اس کٹھن راہ میں ہار مان چکی تھیں اور کئی ادبی ماہنامے جن کی اٹھان سب رس سے کہیں زیادہ امید افزا اور جن کی بنیاد کہیں زیادہ مضبوط نظر آتی تھی، دو چار قدم بھی چلنے نہ پائے تھے کہ تھک کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ یہ کہنا یقیناً خودستائی یا تعلی نہیں ہے کہ اس سات سال کے پر آشوب زمانے میں دکن کے اس رسالے نے جس پابندی اور محنت سے زبان کی خدمت انجام دی وہ اپنی آپ نظیر ہے جو اصحاب ابتدا سے سب رس کی زندگی میں دلچسپی لیتے رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس قلیل مدت میں اس پر حوادث کے بعض ایسے طوفان آئے جن کا مقابلہ کچھ آسان کام نہ تھا۔ ابھی وہ اپنی اصلی شان میں جلوہ گر ہونے بھی نہ پایا تھا کہ جنگ کے خوفناک بادل یورپ کے امن مطلع کو مکدر کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان سے آگ اور شعلوں کی بارش ہونے لگی۔ ناممکن تھا کہ مشرق بھی اس خونی سیلاب کی زد میں نہ آتا اور پھر ہندوستان جو اپنے صنعتی وسائل میں پہلے ہی سے تہی دست تھا ایسی معاشی الجھنوں سے دوچار ہو گیا جس سے بچنے کی کوئی سبیل اسے نہ سوجھتی تھی۔

ان غیر معمولی حالات میں دوسری اشیاء کے علاوہ کاغذ کی گرانی اور کمیابی کا بھی ایک مسئلہ اہل ملک کے سامنے تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے دو چار نہیں کہ اس جھٹکے سے کافی نقصان پہنچا اور اس غیر متوقع گرانی کی ضرب سے نوآموز تو نوآموز کئی پختہ کاروں کے قدم بھی ڈگمگا گئے۔ پھر اس روداد مصائب میں "ستم ہائے عزیزاں" اور "جفائے اغیار" کا ایک علیحدہ باب ہے جو خود ایک تفصیل کا محتاج ہے۔

لیکن سب رس کی یہ زندگی یقیناً ان ہمدرد سرپرستوں اور بہی خواہوں کی مرہون منت ہے جنہوں نے ہر آڑے وقت میں نہ صرف اس کی دستگیری کی بلکہ اپنی قدر دانی سے اس کا دل بڑھاتے رہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ان بزرگان وطن کی ہمہ جہتی امداد شامل حال نہ ہوتی تو ادارۂ ادبیات اردو کے اس ماہنامے کو یہ کامیابی نصیب نہ ہوتی اور یقیناً ادارہ آج بھی ان تمام معاونین کی قلمی اور روحانی امداد پر بجا طور پر فخر کرتا ہے جن کی روز افزوں محبت اور شفقت اس کے سمند ہمت کو ہر گھڑی تازیانے لگاتی رہتی ہے۔

سات سال کے اس عرصہ میں سب رس نے جو ادبی محفلیں منعقد کیں ان کی اہمیت نقادان علم و فن کی نظروں میں اس وجہ سے بھی قیمت رکھتی ہے کہ ان مجلسوں میں ملک کے نامور کہنہ مشقوں کے علاوہ ایسے نوعمر ادیبوں نے بھی حصہ لیا تھا جن کا شمار آجکل کے اچھے لکھنے والوں میں ہو رہا ہے۔ سب رس کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالئے تو عنوانوں کا تنوع اور سرخیوں کی وسعت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ ان نوجوان ادیبوں نے اپنے زور قلم، اپنی تحقیق اور تلاش سے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر صحیح طریقے اختیار کئے جائیں تو ہماری زبان نہ صرف ہر قسم کے خیالات اور جذبات کے بیان کرنے کی اہلیت رکھتی ہے بلکہ اس میں ایسی ایسی راہیں کھولنے کی صلاحیت بھی موجود ہے جن پر اصناف زبان کی نئی نئی بنیادیں کھڑی کی جاتی ہیں۔ چنانچہ یہی اس ماہنامہ کا مقصد ہے اور یہی اس کی خصوصیت بھی۔

اس ضمن میں ہم دو ایک باتیں گوش گزار کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ اکثر احباب کو سب رس کی اس حکمت عملی پر یہ اعتراض ہے کہ اس کوشش میں وہ کسی "خاص نقطۂ نگاہ" کا حامل نہیں رہا ہے اور یہ کہ اسے ہندوستان کے رسالوں کے

کسی خاص گروہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ ان اصحاب کی نظروں میں نیت پر ہم کو کامل بھروسہ ہے پھر بھی ہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ یہ احتراز کبھی خود سب رس کو ایک علٰحدہ نقطۂ نگاہ کا حامل قرار دیتا ہے اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس کی پالیسی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ کسی خاص گروہ کی حد بندیوں سے ہمیشہ آزاد رہے۔ اگر آپ اس کو خالص ادبی، خالص تحقیقی یا خالص سماجی رسالہ نہیں سمجھتے تو آپ بالکل بجا سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ کوئی ایسا ٹھوس علمی یا نرا حکمیاتی پرچہ نہیں جس کی خشک علمی یا حکمیاتی بحثیں چند مخصوص افراد ہی کی دلچسپی کا موجب ہوں۔ نہ وہ کوئی ایسا "عام پسند" رسالہ ہے جو کسی ریلوے بک اسٹال پر چند آنوں میں مل جاتا ہے اور جس کا ہلکا پھلکا، تخیل اور عامیانہ مضامین ایک پست مذاق مسافر کے لئے سامان تفریح پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ سب رس کی یہ کوشش ہے کہ وہ مختلف مزاج طبیعت اور ذوق کے افراد میں زبان کا صحیح مذاق پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اس کے پڑھنے والوں میں سائنس داں بھی ہیں اور ادیب بھی، یونیورسٹیوں کے متبحر اساتذہ بھی ہیں اور نوآموز شاگرد بھی، سرمایہ دار بھی ہیں اور مزدور بھی، شہری بھی ہیں اور دیہاتی بھی، غرض اس کی ہمیشہ یہ سعی رہی ہے کہ حتی الامکان علم و زبان کا ایک ایسا چشمہ صاف بہاتا رہے جس سے ہر گروہ بہ اندازۂ خواہش مستفید ہو سکے اب رہی یہ بات کہ اس اقدام میں وہ کامیاب ہوتا بھی ہے یا نہیں، تو اس کا تصفیہ ہم اہل نظر کی آنکھ پر چھوڑ دیتے ہیں۔

ادارہ

چاند

(اردو کے مشہور ڈراما نگار محمد فضل الرحمن صاحب کی ایک تازہ نظم "چاند" شائع کی جا رہی ہے۔ ان کی بہت کم نظمیں ارباب ذوق تک پہنچی ہیں لیکن ان کی جن نظموں کو پڑھنے یا سننے کا موقع ملا ہے ان سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اردو کو مستقبل میں ایک ایسا شاعر ملنے والا ہے جو مقصد یا حقیقت کے اظہار میں آرٹ کے اصل حسن کو فنا نہیں کرتا بلکہ اپنی فکر و نظر کو شعری لطافت بخشتا ہے۔)

کروڑوں سال سے تو دیکھتا ہے دنیا کو
زمیں کے بحر و بیاباں کو دشت و دریا کو

یہ دورِ شام و سحر، وقت کا یہ پیمانہ
یہ انقلابِ بہار و خزاں کا افسانہ

یہ سازِ دہر تری انجمن کا اک نغمہ
نوائے بزمِ بشر اس چمن کا اک نغمہ

نمودِ معدن و آرائشِ نبات ہوئی
تری ہی آنکھوں کے آگے جواں حیات ہوئی

انہی شعاعوں سے چمکا ہے سینۂ عالم
ہوا ہے مطلعِ انوار دیدۂ آدم

ترے حضور دھڑکتا ہے دل سمندر کا
دمکنے لگتا ہے چہرہ فضائے برتر کا

وہ رہروانِ عدم، قافلے وہ ہستی کے
گزرنے والے مسافر زمیں کی پستی کے

سمائے آنکھوں میں آنکھوں سے پھر نہاں بھی ہوئے
وہ کاروانِ صفت، گردِ کارواں بھی ہوئے

مگر تو بزمِ فلک میں یوں ہی درخشاں ہے
یہ تیری شمعِ تاباں ہمیشہ تاباں ہے

تری نگاہوں میں رنگِ ازل جھلکتا ہے
ابد کا جام ترے ہاتھ میں چھلکتا ہے

کبھی ہلال، کبھی صورتِ مہِ کامل
ہے تیرے راستے میں ارتقا کی ہر منزل

مشابہ حال سے تیرے ہے حال قوموں کا
عروج قوموں کا یا پھر زوال قوموں کا

یہ زندگی بھی ہے گویا وہ روشنی تیری
نظر سے چھپتی ہے لیکن کبھی نہیں بجھتی

اگرچہ پرتوِ خورشید سے ہے نور ترا
ہے قرضِ دام کا جامِ مے سرور ترا

بلندیوں میں بھی تیرا کوئی مقام نہیں
نجومِ چرخِ بریں کا تو ہم خرام نہیں

زمیں کے پہلو میں تو نے مگر جگہ پائی
مٹا کے دولتِ حسن و متاعِ رعنائی

محمد فضل الرحمن

بی بی

یا رب ۔ دل کی قسمت میں غم ستارا ہے

بی بی کی طبیعت شاید کچھ خراب تھی۔ نرم گدے والے گدیلے پر نیم دراز
میں دیکھی سکڑی پڑی تھی۔ میں نے پوچھا "بھئی بی بی! طبیعت کیسی
ہے؟" "اوہ! آپ ہیں۔ جی ذرا خراب سا ہے" "پہلے وہ
کی کاہل لڑکی ہے۔ پڑے پڑے منہ چھپاتی ہے اور بہانہ بناتی ہے
جی ذرا خراب ہے" گھنی گھنی پلکوں میں وہ چمکیلی نگاہیں
مسکرا اٹھیں۔ میں کرسی گھسیٹ کر قریب بیٹھ گیا۔ "آخر تمہیں
کیا بیماری ہے۔ بتاؤ تو" "جی۔ ویسے ہی جی ماندا ہے بیماری
تو کچھ نہیں سردی لگتی ہے" میں نے اس کے دونوں ہاتھ
پکڑ لیے ٹھنڈے ٹھنڈے ہی۔ نیلی نیلی رگیں مجھے بہت بھائیں۔ کیسی ٹھنڈی
بجلی سی ہیں۔ میں گھبرا گیا" "اور میرے پیر بھی اتنے ہی سرد ہیں"
میں نے اس کے پیروں کو محسوس کیا اور بلا کی ٹھنڈک تھی۔ اس نے
گھبرا کر پیر ہٹا لیے۔ "نہیں نہیں پاؤں نہ چھوئیے" میں نے
پوچھا "تم پاتا بے کیوں نہیں پہنتیں؟" "جی مجھے دستانوں
اور پاتابوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے"

"پھر؟" "پھر کیا۔ یہی بابا ابھی اپنے ہاتھوں سے گرم
کر گئے تھے" "تو لاؤ میں گرم کر دوں" میں نے دونوں ہاتھ
مضبوطی سے پکڑ لیے ٹھنڈے پالے۔ میری رگ رگ میں ٹھنڈک
دوڑ گئی۔ کتنی دیر تک میں ان ہاتھوں کو گرماتا رہا اور سوچتا
رہا اس ٹھنڈک میں آگ کو سرد بھی ہے جو چپکے چپکے دلوں
کو گرماتی ہے۔ ان سفید نرم ہتھیلیوں کا یہ تو کہیں وہ جادو
نہیں جو دلوں کو یوں ناگہانی طور پر کھینچ لیتا ہے۔ جادو بھری
ٹھنڈک ..... "بس بھی کیجئے۔ اب تو ہاتھ گرم ہو گئے"
میں چونک گیا۔ "تو پھر لائیے مزید رقم!" "کاہے کی؟" "ہاتھ جو گرم
ہو گئے" "تو کیا! صرف وقتی طور پر" میرا دل دھڑک اٹھا "تو
لائیے ہمیشہ گرماتا رہوں" وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماند زرد
چہرہ سلونا ہو گیا۔ ایسے لگا جیسے اندھیری برسات میں کہیں ہموار

چمک اٹھے: "اوہ سنو تو بھلا۔ میں بتاؤں ہاتھ کیوں ٹھنڈے
ہو گئے ہیں" بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا۔ وہ چپ چاپ
بھرے تکیوں کے سہارے لیٹ گئی۔ اس کی آنکھیں مندی
مندی سی تھیں۔ "ہاں! کیوں ٹھنڈے ہوتے ہیں؟" "سنو تو۔
دل میں اگر کوئی چور ہو تو"

"ہٹائیے بھی کون چور ہوگا میرے دل میں۔ ویسے میں
چوروں سے ڈرتی ضرور ہوں۔ مگر آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے
ڈاکٹر ہوں"

"اور کیا میں ڈاکٹر ہونے والا ہو رہا ہوں" "سچ!
بالکل" "ہوں" "اور سنو تو۔ ڈاکٹر بنوں گا بھی تو ہارٹ
اسپیشلسٹ دل کی بیماری جاننے والا" "اچھا ہے پھر تو مفت
علاج ہوا کرے گا۔ آئے دن طبیعت خراب ہوتی رہتی ہے۔ لیکن
میرا دل تو اچھا خاصا ہے اور یہ ہاتھوں کا بھلا دل سے کیا تعلق؟"

"یہ تم کیا جانو!" اب اس کے ہاتھ کافی گرم ہو گئے تھے۔
خالہ امی کی آواز آئی۔ میں چائے پینے چلا آیا۔

رات بھر مجھے ٹھنڈی ٹھنڈی جاندار انگلیوں کا لمس اپنے ہاتھوں
گردن اور بانہوں پر محسوس ہوتا رہا۔ ایسے لگا جیسے میرا دھڑکنے والا
دل برفیلی قلموں میں جکڑا گیا ہے۔ — رات بھر میں دہکتے سورج
اور برفیلی چوٹیوں کے خواب دیکھتا رہا۔

(۲)

بی بی بری طرح خفا تھی۔ خالہ امی مسلسل صلواتیں سنا رہی
تھیں۔ اور خالو باوا مزے سے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں خود
بھی چائے پیتا رہا اور لڑکی کا لطف بھی اٹھاتا رہا۔ خالہ امی کہہ رہی
تھیں "اتنی بڑی ہو گئی۔ سترہ برس یوں گزر گئے۔ لیکن بے
ڈھنگا پن نہ گیا۔ باوا کو تو کچھ فکر ہی نہیں۔ بیٹی کی جوتیاں بھی
بھلی لگتی ہیں۔ نا بابا! مجھ سے تو ایسی بچی نہ سنبھلے گی اب۔ میں
کہتی ہوں یہ فٹ بال، نیٹ بال اللہ ماری کھیل لڑکیوں کو کھیلنے کیا
ضرور ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی روگ لگا رہتا ہے۔ اب اگر کچھ
خرابی ہو تو سمجھو۔ پھر یہ لو آج ہاتھ میں موچ آ گئی۔ کل کمر
لچک گئی۔ پرسوں —"

"ارے ابھی سے جان کو کیا گھن ہے۔ یہ بٹیا کی ننھی منی بیٹی تو ہے۔ دیکھو یہی بگڑ جائے گی۔" خالہ امی چمک اٹھیں۔ "اے لو! دنیا تو میری جان کھائے لیتی ہے۔ احسان کرا ئیں۔ بیٹی ننھی منی ہی سمجھتی ہے۔ اور کیا سترہ برس میں بڑی نہ ہوگی تو ستر میں ہوگی؟ مجھے کیسے لائے تھے چودہ برس کی جان سارا گھر سنبھالا تھا۔"

"اسی کی سزا تو بھگت رہا ہوں۔ اور تم سمجھا بیچاری چودہ سالہ ننھی گڑیا لگتی ہو جو جوانی کی حماقت میں بیاہ لایا تھا۔" خالو ابا مسکرانے لگے۔ بات پہل گئی۔ خالہ امی خفا گئیں۔

"جی اور بگاڑیئے بہو کو۔ دیکھوں کون سی ماں کا لال سہارتا ہے اس کے ماد تولی کو۔" "اوہ — تم فکر کرو۔ کوئی بادا کا لال مل ہی جائے گا — کیوں رانی بیٹی؟" بی بی ابھی تک چپ چاپ بیٹھی سن رہی تھی۔ اب وہ شکر کا ہوئی اور تیر کی طرح اپنے کمرے میں جا گھسی۔ خالہ امی برابر بڑبڑاتی رہیں۔ میں بی بی کے پاس چلا آیا۔

وہ مچلکی حوض پر بیٹھی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرہ زیادہ زرد ہو رہا تھا، جیسے کوئی اندرونی تکلیف ہو۔ میں نے دیکھا۔ پلکیں اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ میں نے آہستہ سے ہاتھ دبایا۔ اس نے چپکے سے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحہ تک آنکھیں مجھے گھورتی رہیں۔ پھر پلکیں آپ ہی آپ جھک گئیں اور دیر تک جھکی رہیں۔

"بی بی! کیا ہو رہا ہے۔" میں نے ہاتھوں کی سردی میں اپنی گرمی جذب کرنی شروع کی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش میں نے محسوس کی۔

"اوہ رانی۔ بی بی رانی آنکھیں کھول بھی دو۔ یہ کیا حماقت ہے جناب۔ ہم مہمان آئے ہیں۔ اور تم بت بنی بیٹھی ہو۔" اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ "ہاں —"

"آپ مہمان آئے ہیں۔ بیٹھ جائیے۔ کہئے طبیعت کیسی ہے۔ ٹھیک تو ہیں۔ بہت دنوں بعد بھول پڑے۔" یہ طنز یہ آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی۔ میں نے سہارا ہو گئی۔

"کیوں رانی! تم خفا کیوں ہو؟" "خوب! میں رانی

کیسے ہو گئی۔ واہ یہ تو ہیرے بابا پکارا کرتے تھے۔ رانی بیٹی آپ کہاں — سے حال ہو گیا۔" "حق وقت ہم نہیں جانتے۔ تمہی پکار لیتا راجہ صاحب ہم کو۔" "ہشت۔ بڑے راجہ بنے ہیں۔ راج دلاری بنیر راجہ —"

"جو کچھ بھی ہو۔ یہ تو بتاؤ تم کو آخر ہوا کیا ہے۔ کچھ خفا تھا۔ ماندی ماندی لگ رہی ہو اور پھوپھی لاتی کا کچھ — میں کچھ نہ سکا۔ تمہارا دو"

"اونہہ! امی تو بس ایسے ہی بہت — سے پالتو ہو کر پڑ جاتی ہیں۔"

"آخر کوئی سبب بھی تو ہو۔" "کچھ بھی نہیں۔"

"بابا نے چاکولیٹ کو پیسے نہیں دیئے!" — "ہوں۔"

"کالج میں سزا ملی تھی!" — "ہشت۔"

"شمس نے تمہاری دوستی کو طلاق دے دی!" "خدا کرے۔"

"آج پھر طبیعت کس وجہ سے خراب ہے۔" "کوئی نئی بات نہیں۔"

"تو۔ تو...... یقیناً کوئی بات آئی ہے۔ تمہاری شادی ہونے لگی!"

"پاگل ہوئے ہیں آپ۔ جانے بھی کیا فضول بات ہے۔"

"فضول کیوں ہے۔ زندگی کی تان اسی پر ٹوٹتی ہے تم کی ہوگا بھئی — اور........ میں تو کسی ڈاکٹر سے شادی کروں گی۔"

"ڈاکٹر کی خصوصیت کیوں؟"

"بھئی اس لئے کہ میں روز روز بیمار ہوا کرتی ہوں۔ اور کوئی ڈاکٹر بھی ٹھیک سے علاج نہیں کر پاتا۔ ایک بیماری کا علاج کروں تو دوسری نئی آ جاتی ہے۔"

"تو گویا مفت کے ڈاکٹر کے لئے شادی ہوگی۔" "اور کیا۔"

"پھر اپنے دل کا ضرور علاج کرا لینا۔ جو کوئی ضرور ہے جب ہی تو ہاتھ ٹھنڈے رہتے ہیں۔"

"وہ تو علاج ہوگا۔ جب چاہو جس وقت چاہو۔ ڈاکٹر کے گھر علاج کی کون کمی۔"

"تم شرماتی بالکل نہیں بی بی۔" — "اس لئے کہ آپ شرمیلے ہو گئے ہیں۔"

(۳)

بی بی چپکی چپکی سسکیاں بھر رہی تھی۔ چہرہ کا رنگ اڑا اڑا تھا۔ گرم پانی کی تھیلیوں پر لیٹی تھی۔ آنسو چہرہ کو پیار کر رہے تھے۔

مجھے دیکھ کر چپ ہو گئی۔ آنسو پونچھ ڈالے۔ سسکیاں پی گئی۔ اور چہرہ پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ درد اور بیماری میں فدا دیر کو گھبراتی۔ پھر وہی مسکراہٹ۔ شکست دینے کا بڑا بہتر ہتھیار تھا۔ گردن کی تنی رگیں ظاہر کرتی تھیں کہ کسی نہ کسی تکلیف کی شدت ضرور ہے۔ مجھے دکھ کا احساس ہوا۔ اتنا کمزور جسم، ایسی بر فیلی زندگی اور پھر ایسی آئے دن تکلیفیں۔ روح کہیں لرز نہ جائے۔ ہاتھ بدستور ٹھنڈے تھے۔ میں نے اپنے گرم ہاتھوں میں انھیں سہار لیا۔

اس بیمار لڑکی سے مجھے ہمدردی ہو چلی تھی۔ وہ چپ چپ لیٹی مجھے دیکھتی رہی۔ اور پھر یکدم ہاتھ کھینچ لئے۔

"کیوں؟" "ایسے ہی مجھے ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے کسی نے گالی دی ہو۔" "عجیب بات ہے آپ کی بہت ساری باتیں عجیب ہیں۔" "میں خود عجیب ہوں۔"

"اچھا خیر لاؤ۔ فلسفی نہ بنو — بچپن کو زیادہ سوچنا نہیں چاہیئے۔ میں ڈاکٹر بن کے دیکھتا ہوں۔"

"بن چکے آپ ڈاکٹر۔ جانے کب بنیں۔ کہیں میں جب تک ختم نہ ہو جاؤں۔"

"اونھوں ایسا نہیں کہتے۔ بس ذرا سا انتظار درکار ہے۔"

"انتظار! بہت طویل ہوتا ہے انتظار۔" "اب تمھیں کیا تکلیف ہے؟" "بتا نہیں سکتی۔ بس سمجھ جایئے کچھ تکلیف ہے۔ لیکن اب نہیں ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ ہر درد کے بعد میں سو جایا کرتی ہوں۔" واقعی وہ سو گئی — زرد و زرد کمزور چہرہ پر گھنی پلکیں سو گئیں۔ سیاہ نرم بال بکھر گئے تھے۔ میں نے سلجھا دیئے۔ آرام کی نیند سو جائے۔

میں نے اسے اچھی طرح لحاف اڑھا دیا۔

(۴)

بی بی گھاس پر لیٹی ہنسی بجا رہی تھی۔ میں نے سیکڑوں دفعہ اسے ہنسی کی تانوں سے کھیلتے دیکھا تھا۔ لیکن ایسا دکھیا راگ، دل کی گہرائیوں کو ٹٹولنے والا، سوئے ہوئے خوابوں کو جگانے والا میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ بہت دیر تک وہ بجاتی رہی۔ بہت دیر تک میں کھڑا سنتا رہا۔ اس ہنسنے کھیلنے والی لڑکی کی روح اتنی غمگین ہو سکتی ہے، مجھے کبھی محسوس بھی نہ ہوا تھا۔ میں ڈاکٹر بن رہا تھا۔ روز روز نئی بیماریوں کا انکشاف ہوتا۔ لیکن یہ روح کا دکھ کون بیماری ہے! ہر ناسور کا علاج مجھے معلوم تھا۔ لیکن دل کی جراحتوں کا اندمال کہاں معلوم! آج میں اسے میڈیکل کالج کے قصے سنانے آیا تھا۔ اس سے خود اس کی کالج کی باتیں سننے آیا تھا۔ اُف یہ ہنسی کی تانیں۔ واہ میں تو جادو کا قائل نہیں۔

منّی روتے روتے خاموش ہو گئی۔ "اوہ ڈاکٹر صاحب آپ ہیں۔" آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرزاں۔ اور ہونٹ سُر نکالتے نکالتے تھک گئے تھے۔ میں آہستہ چلتا چلتا پاس جا کر بیٹھ گیا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ دو پٹہ پیلے رنگ۔ سفید تھا۔ میں گفتگو کا موضوع ڈھونڈ رہا تھا۔ "اُنھ بھلا کس نے کہا تھا تم سے کہ اس منحوس رنگ کا دو پٹہ اوڑھو۔ ہشت یہ سفید رنگ تو کوئی رنگ نہ ہوا۔ بھئی کوئی زندہ رنگ پہنو۔" "مثلاً" "مثلاً زرد۔ سرخ۔ سبز۔ نیلا۔" "واہ کیا پسند ہے جناب کی۔ لیکن میں زرد سی ہوں۔ کوئی سا رنگ نہیں کھلتا۔" "کس بے وقوف نے بتایا تمھیں۔" "میں نے خود سمجھ لیا۔" "ارے واہ۔ زرد زرد چہرہ تمھارا۔ ملاحت کی بات ہی اور ہے۔ کیوں نہیں رنگ سجتا۔ اس کے علاوہ انسان میں کشش ہونی چاہیئے۔" "تو مجھ میں ہے یہ کشش۔ کوئی نئی بیماری۔" "ہے کیوں نہیں۔" "کاہے سے پیدا ہوتی ہے۔" "مقناطیسی مادہ زیادہ ہونے سے۔ جو لوہے کو اپنے طرف کھینچ لیتا ہے۔ اور ویسے تم کافی کھلتی ہوئی ہو۔ بس ذرا سرخی آجائے تو یہ زردی صرف لوہے کو کھینچ سکتی ہے ٹھیک۔ دلوں کو نہیں۔" "عجیب کوڑمغز ہو تم —" "ارے بھیا سنا ہیے تو کیسی ہیں آپ کی شیلا، راجکماری، ہیلن — اور ہاں کیا نام ہے اس کا جو آپ کی ساتھی ہے۔ ارے وہی با تکی ترچھی جو جنے میں بھول گئی ہاں وہ برجیس۔ پرسوں دیکھا میں نے اسے نمائش میں نیلی ساڑی پہنے ایسی پیاری لگ رہی تھی جی چاہا میرا کہ —" "کیا چاہا تھا جی؟" — "یہی کہ اس کو چھو کر دیکھوں۔ سچ جو میں لڑکا ہوتی شادی ہی کر لیتی اس سے۔" "بے وقوف نہ ہو

بی آپی۔ بہشت میں تو دیکھیں بھی نہیں اس کی طرف۔ شلغم ہے پھیکا شلغم اور بھی اتنی زیادہ ہے کہ بس۔ گڑیا کھتی ہے جاپانی!"

میں نے دیکھا اس کی سیاہ آنکھیں یونہی چمک گئیں دور کہیں شاید شفق پھولی تھی۔ کہ اس کا زرد چہرہ سلونا ہو گیا۔ مگر پھر آنکھیں جھک گئیں۔ چہرہ اور زرد ہو گیا۔ اور ایک ہلکی سی سانس میں نے فضا میں تیرتی محسوس کی۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور جلدی جلدی قدم بڑھاتے اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ اس کی چال پریشان تھی۔ میں سوچتا ہی رہا کہ بات کیا ہے۔

بی بی زرد زرد کپڑے پہنے پلنگ پر لیٹی تھی۔ زمین زرد، آسمان زرد۔ مانو بسنت پھولی ہو۔ اور وہ زرد زرد چہرہ۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا اور چاہا انجان گزر جاؤں کہ اس نے آواز دی۔ "ڈاکٹر بھائی!" کوئی قوت مجھے بلا رہی تھی۔ میں مجبور بے دلی سے اندر چلا آیا۔ کمرہ مہکتا۔ خوشبو مہکی ہوئی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے بھی قریب بٹھا لیا۔ "واہ یہ کوئی بات ہے کہ آپ ایسے انجان انجان گزر جائیں۔ خیر سے ابھی پورے ڈاکٹر بھی نہیں بنے آپ۔ ایک لمبا چوڑا سال اور باقی ہے۔ مگر ابھی سے جناب اکڑ رہے ہیں۔ ہمارے بھی میں تو نہ بنوں گی آپ کی مریض ——"

اس نے ایک سانس میں سب کچھ کہہ دیا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی چیز میرے حلق میں پھنسی ہوئی تھی۔ کوئی انوکھا درد تحیر دل میں دھڑک رہا تھا۔ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ خوش ہے یا رنجیدہ۔ بال زیادہ سیاہ اور بکھرے ہوئے تھے۔ پلکیں اور زیادہ لرزاں تھیں۔ ہونٹ البتہ خاموش سے تھے۔ اداس۔ اور آنکھیں جانے کیا کہتی تھیں میں سمجھ نہ سکا

"اور دیکھیے۔ آپ نے تو جیسے گوشت کا گڑ کھا لیا ہے۔ ارے ہاں۔ چلیے گڑ پر مٹھائی یاد آ گئی۔ کھائیے نا مٹھائی۔ سچ بڑی مزیدار ہے۔ اور لیجیے آپ کا پسندیدہ حلوا سوہن، قلاقند اور ——" "رہنے بھی دو۔" بڑی مشکل سے میں کہہ سکا۔ "مجھے اب مٹھائی پسند نہیں کچھ پسند نہیں۔" "ہاں ہاں آج کل تو آپ اپنے مریضوں کو شاید کڑوی دوا پلانے لگے ہیں۔ ڈاکٹر جو ہوئے۔"

"کیوں تم بھی پینا چاہتی ہو؟" —— "نا بابا کڑوی دواؤں کا بھلا کسے شوق ہے ویسے میں ڈاکٹروں اور بیماریوں سے اکتا گئی ہوں۔ صحت کا بڑا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ خیر —— اب تو کوئی بیماری نہیں میں خاصی بھلی ہو گئی ہوں ——" میں سمجھ نہ سکا وہ کیسے بول رہی ہے۔ طنز ہے کہ ماتم۔ اظہار خوشی ہے کہ مجھ پر غصہ۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔

"اب تو بہت بڑی بن جاؤ گی نا۔ جاگیر دارنی۔ ہم غریب کاہے کو یاد آئیں گے۔" "واقعی کوئی یاد رکھے جانے کے قابل بات بھی ہو۔ اب جائیے۔ چلے جائیے۔ شکریہ آپ کی تکلیف کا۔ آپ کو شاید کوئی ضروری کام تھا۔ میں نے یونہی روک لیا تھا باتیں کرنے کو۔ اب باتیں ختم ہو گئیں۔ جائیے شاید کوئی انتظار کرتا ہو۔" یہ کہتے کہتے وہ بستر پر گر پڑی۔ آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو چلے تھے۔ بال بہت زیادہ بکھر گئے تھے۔ میں اس کے بالوں کو سلجھاتا رہا کتنے خوبصورت بال تھے۔ اور پیشانی۔ میں نے ان ہاتھوں کو تھام لیا۔ بدستور سرد سرد ہاتھ تھے۔ بلکہ ہمیشہ سے زیادہ سرد۔ زندگی خدا جانے کہاں سوئی ہوئی تھی۔ شاید پھر ان ہاتھوں کو گرم نہ کر سکوں۔ میں خود اس خیال سے گرم ہو گیا۔ مجھ میں کتنی سوزش تھی۔ اب تو آگ بھڑک اٹھی۔ میں اس کی سرد نرم ہتھیلی، انگلیوں کو محسوس کرتا رہا۔ آہستہ سے دبایا اور چھوڑ دیا۔ میں نے اپنی زندگی آخری بار اس میں منتقل کر دی۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ ان پلکوں کی آڑ میں میری زندگی چھپی تھی۔ کدھر، کہاں! میں یونہی دیکھتا رہا —— اور چلا آیا۔ بغیر مقصد کے۔

(۶)

بی بی بیمار ہے۔ زیست کی امید نہیں۔ تکلیف کی شدت ہے ....

میں خدا جانے کیا کیا سنتا رہا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اسے نئی زندگی مل گئی اس کے سب دکھ دور ہو گئے۔ اس نے خود ہی تو کہا تھا کہ اب سے ڈاکٹروں اور ان کی کڑوی دواؤں کی ضرورت نہیں۔ پھر —— کسی میٹھے شربت کی بجائے وہ

زہر تو نہیں پی گئی۔ زہر میٹھا بھی تو ہوتا ہے نا۔ تو کیا اس کی یہ نئی زندگی زہر تھی۔ ہے۔ میرا دماغ چکرا گیا۔ ڈاکٹر! میں کس لئے بنا تھا۔ کس کے لئے بنا تھا۔ دل کے چوروں کو ڈھونڈنے کے لئے۔ پھر کہاں گیا مقصد۔ کدھر ہے جراحتوں کا اندمال۔ خدایا! آزمائش دو دھاری تلوار بھی ہے۔

میں جب کمرے میں پہونچا تو سفید چادر پر بی بی بے ہوش لیٹی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ پلکیں خاموش تھیں۔ ہاتھ برف سے بھی بڑھ گئے تھے۔ سرچشمۂ حیات خشک ہوا تھا۔ درخت جلتے وقت سوکھ رہا تھا۔ جاگیردار صاحب پاس کھڑے تھے۔ کسی طرح جان بچ جائے۔ مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ اب تک ہر چیز پاتے رہے تھے۔ اب وہ بہت جلد کھو دیں گے۔ تو کیا میں نہ کھو دوں گا۔

میں تو کبھی کا کھو چکا تھا ـــــ

میں نے دیکھا بھالا۔ بے ہوش بی بی کی رگ رگ کو میں نے محسوس کیا۔ آج تک کسی بیماری کا بھی اس نے کھلا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب میں سب کچھ جان رہا تھا۔ کمزور پیدا خود ہی بمشکل پنپ سکا تھا۔ پھولنا پھلنا عذاب ہو گیا۔

آپریشن آخری کوشش تھی۔ میں نے اجازت طلب کی۔ پھر بھی جان بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے کام کیا۔

دو گھنٹے بعد بی بی کو جیتی جاگتی بچی پیدا ہوئی۔ میری آس بندھ گئی۔ شائد ماں بھی زندہ رہ جائے۔ چھ گھنٹے بعد ہوش آیا۔ میں نے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے کر گرمانا شروع کیا۔ ان ہاتھوں میں اب جان نہ تھی۔ میری گرمی لوٹ آئی۔ آنکھیں کھلیں۔ رونق ساری آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اداس ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ڈاکٹر صاحب" ہونٹ گنگنا اٹھے۔ "مجھے ہمیشہ کے لئے اچھا کر دیجئے۔ بیماریاں اب ختم ہونیکو ہیں۔ یہ بچی ہے۔ مجھے یقین نہ تھا کہ یہ زندہ جنم بھی لے سکے گی۔ ارے آپ روتے ہیں۔ ڈاکٹر ہو کر۔ جاگیردار صاحب روئیں تو بات بھی ہے۔ اُن کی چاہت قدرت نے لوٹا دی۔

آپ تو ڈاکٹر ہیں نا۔ ہزاروں اور بھی مریض ہوں گے۔ انھیں چنگا کیجئے۔ او مجھے تو مسرت ہے۔ ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر بھیا ـــــ دل کے چور ڈھونڈھنے والے ـــــ ڈاکٹر ڈاکٹر ـــــ آ!"

زندگی ختم ہو گئی۔ کش مکش باقی نہ رہی۔ درد کا احساس ہٹ گیا۔ چہرہ چمک اٹھا۔ ہاتھوں میں جانے کہاں سے گرمی آ گئی۔ اور ہونٹ مسکرا اٹھے۔ نہ جانے طنز سے نہ جانے رہائی پانے سے۔

بال بکھر گئے تھے میں نے انھیں سلجھا دیا۔ تکیوں کے سہارے وہ گدیلے پر پڑی تھی۔ نازک نازک سی۔ آج دکھ ختم ہو گئے۔ آرام ہی آرام ہے۔ میں نے پلکوں کی آڑ میں دیکھنا چاہا۔ وہاں ابدی نیند تھی۔ میں نے ہاتھوں کو محسوس کیا۔ بالوں کی نرمی کو چوم لیا اور اسے سفید بے رنگ چادر اڑا دی۔

پھر میں ـــــ نہ جانے کیوں کر ننھی چند گھنٹوں کی جان کو اٹھائے سینہ سے لگائے چلا آیا۔ اسے اکیلا چھوڑ کر۔ انتظار کرنے کو۔ بی بی ـــــ!

زینت ساجدہ

اطلاع :- نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم اپنا چندہ روانہ فرما کر باضابطہ رسید حاصل فرما لیجئے۔

جلسہ تقسیم اسناد اردو امتحانات ۱۹۴۴ع

دبل والاشان ڈاکٹر شہزادہ معظم جاہ بہادر نے صدارت فرمائی اور
شہزادی نیلوفر بیگم صاحبہ نے ۱۹۴۳ع کے کامیاب
امیدواران اردو امتحانات کو اسناد اور تمغے تقسیم فرمائے۔

ارباب ادارۂ ادبیات اردو

ادارے کے نائب صدر آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر کے عہدہ صدرالمہامی پر فائز ہونے کی
مسرت میں جو عصرانہ ۱۳ اکتوبر ۴۴ع کو دیا گیا تھا اس کا ایک عکس

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

"(۱) بیرم جس کو محل بھی کہتے ہیں (۲) چرخ و محور یعنی وہ چرخ جو اپنے محور کے ساتھ گردش کرے۔ (۳) بکرہ یعنی وہ چرخ جو اپنے محور پر گردش کرے (۴) سطح مائلہ (۵) اسفین جس کو پیچ بھی کہتے ہیں (۶) لولب اس کا دوسرا نام ملسوط ہے۔"

ان آلات کی مدد سے بھاری وزن کی چیزوں کو آسانی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر انسانی قوت کام نہیں آتی۔ پندرہویں اور سولھویں گفتگو میں بیرم کی تعریف اور اس کے استعمال کے طریقے بتلائے گئے ہیں پھر اس کی تین اقسام کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے۔ ستہویں گفتگو میں جرثقیل کے دوسرے آلے چرخ و محور کا بیان ہے جس کو عمل قوت دوم جرثقیل کہتے ہیں۔ اس قوت کے عمل کو چرخ، ڈول اور رسی کی مثالوں سے سمجھایا گیا ہے۔ "اٹھارہویں گفتگو" میں بکری کے آلے کا بیان ہے جو جرثقیل کی تیسری قوت ہے۔ "بیسویں گفتگو" میں پانچویں قوت کا بیان ہے جو اسفن آلے سے حاصل ہوتی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ آلیاں، تبر، میخیں اور حیوانوں کے دانت اسفین کا عمل کرتے ہیں۔ اس قوت سے لکڑی اور پتھر وغیرہ پھوڑنے کا کام لیا جاتا ہے۔ اور جہاز کے نیچے دیکر اسے تھوڑی بلندی پر اٹھا سکتے ہیں۔ "اکیسویں گفتگو" میں جرثقیل کی چھٹی قوت کو بیان کیا گیا ہے جو لولب یا ملسوط کے آلے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس قوت سے بھاری چیزوں کے اٹھانے اور دبانے کا کام لیا جاتا ہے۔ صحاف اس آلہ کی مدد سے ضخیم کتابوں کو شکنجہ میں دباتے رہیں تاکہ کتاب کی ضخامت دب جائے۔

"قاعدہ" کی سرخی کے تحت شاقول کی قوت کا بیان ہے جس کا جرثقیل سے قریبی تعلق ہے۔ اس قوت سے وقت کے شمار کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے اسی کلیہ کی مدد سے گھڑیال کے

(سلسلہ گزشتہ)

لات تیار کئے جاتے ہیں۔

اصل کتاب کے ختم پر ہر گفتگو سے متعلقہ سوالات کی فہرست دی گئی ہے تاکہ استاد شاگردوں سے سوالات کرکے جوابات پوچھے۔ انگریزی کتابوں میں جن سے ترجمہ کیا گیا ہے ایسا نہیں ہوا بلکہ جملہ کتابوں کے سوالات اور تعریفات کو ایک علٰحدہ کتاب کی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسبارے میں کتاب کے ختم پر "پوشیدہ نہ رہے" کی سرخی کے تحت حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"حکیم ریوری رنٹ جانس صاحب نے ۱۸۱۳ء میں سات کتابیں علوم ریاضی کی تیار کرکے جو چھپوائی تھیں ان میں سے چھ کتابیں۔ . . . ترجمہ کرکے ستہ شمسیہ نام رکھا گیا اور باقی ساتویں کتاب تعریفات اور سوالات علوم مذکورہ میں اس واسطے لکھی تھی کہ علوم مذکور کی تحصیل کے بعد شاگردوں سے ہر علم کے امتحان کے لیئے سوال کرکے جواب اسکا ان سے سنے کہ یاد ہے یا نہیں اور ہم نے اس حکیم کے آئین کو بہتر جان کر ساتویں کتاب کا بھی ترجمہ کیا مگر اس میں سے ہر ہر علم کی تعریفات اور کیفیات اور سوالات علٰحدہ کرکے ہر علم کے رسالے میں اسطور شریک کیئے کہ آغاز رسالے میں دیباچہ کے بعد تعریفات اور کیفیات اور آخر رسالے میں سوالات اس کے داخل کرنے میں آئے تا استاد ہر علم کی تعلیم کے بعد اسی کتاب سے شاگردوں سے سوالات کرکے جوابات پوچھے، دوسری کتاب سے سوالات کی احتیاج نہ ہو۔ تمت بالخیر"

کتاب کے آخر میں تین صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات میں علم جرثقیل کے آلوں کی (۳۰) اشکال شریک ہیں جو لیتھو میں چھاپی گئی ہیں۔ ان اشکال پر نمبر درج ہیں اور کتاب میں جہاں جس شکل کا ذکر ہے۔ حاشیہ پر وہی نمبر لکھا ہوا ہے تاکہ پڑھنے والے کو شکل تلاش کرنے میں دشواری نہ ہو۔

اس رسالہ میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ قدیم اردو

حسب ذیل جملوں سے اس کی قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً

"متوجہ طرف تمہاری تعلیم کے ہوتا ہوں۔"
"ساتھ ایسے ہی اعلیٰ مراتب کے متصف ہے۔"
"ملسوط کر موسوم ہے۔"
"عرض خدمت رکھتا ہوں۔"
"آپ نے یہ بات پرسوں کے دن فرمائے تھے۔"

اکثر جگہ ایسے الفاظ اور املا کا استعمال کیا گیا ہے جو اب معیاری اردو میں متروک ہو چکے ہیں مثلاً

وہ کی بجائے وے
کو " تئیں
مٹی " ماٹی
کنویں " کوتے
بحث " تکرار
کسی کو " کسو کو
بند ہونا " موندھنا
ان سے " ون سے

بعض حروف اور الفاظ کا رسم الخط بھی مختلف ہے مثلاً

ٹ ——— تؔ
ڑ ——— رؔ
سننے ——— سنے
فٹ ——— فوٹ
ٹوٹ ——— توؔٹ

بعض انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا اور بعض کا نہیں کیا گیا بلکہ ان کی اصلی شکلیں اردو میں برقرار رہیں مثلاً

پڈین۔ Pudding
چوب شولہ۔ Cork
اسفنج۔ Spunge
خط راہ۔ Line of direction
ایر پمپ۔ Air pump

علم ہیئت

یہ رسالہ ستہ شمسیہ کی دوسری جلد ہے جو (۳۴۴) صفحات پر مشتمل ہے ابتداً میں دیباچہ فہرست وغیرہ کے (۳۱) صفحات اور آخر میں دو صفحات کا غلط نامہ اور (۴) صفحات پر متن سے متعلقہ (۲۰) اشکال ہیں جن میں اجرام فلکی مثلاً ثوابت۔ سیارگان۔ بارہ برج اور زمین کی گردش وغیرہ کو بتلایا گیا ہے۔ صفحہ (۲) پر علم ہیئت کے آلات کو تصاویر سے واضح کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی غرض وغایت اور سنہ طباعت سے متعلق اسی صفحہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے۔

"دوسری جلد ستہ شمسیہ کی جو علم ہیئت میں ہے ..... طلبہ کی تعلیم کے واسطے سرکار شمس الامراء بہادر امیر کبیر کے سنگی چھاپہ خانہ میں شہر فرخندہ بنیاد حیدر آباد کے درمیان ۱۲۵۶ھ میں مطبوع ہوئی۔"

یہ بھی ریورنڈ جالس صاحب کے انگریزی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے جن انگریزی اصطلاحوں کا عربی اور فارسی میں ترجمہ نہ ہو سکا ان کو اسی طرح اردو میں لکھ دیا گیا ہے۔

رسالہ کی ابتداء میں (۲) صفحات کی فہرست ہے جو دیباچہ اور (۲۶) گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ صفحہ (۶) اور (۷) پر علم ہیئت کی (۲۰) اشکال کی تفصیلی فہرست دی گئی ہے۔ دیباچہ کے بعد (۱۶) صفحات میں علم ہیئت کی تعریفات اور بیانات کو درج کیا گیا ہے تاکہ طالب علم اصل کتاب پڑھنے سے قبل انھیں یاد کریں اور کتاب کے سمجھنے میں آسانی ہو مثلاً ثوابت۔ سیارے۔ نظام شمسی۔ خط استوا۔ حرکت سالانہ۔ زمین انعکاس۔ گہن۔ عطارد۔ زہرہ۔ مریخ۔ مشتری۔ زحل۔ ہرشل۔ دمدار تارے وغیرہ اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ "پہلی گفتگو" میں اجرام علوی کے متعلق استاد شاگرد کے سوالات و جوابات درج ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"تلمیذ کلان۔ قبلہ و کعبہ آج کی شب آسمان اس قدر

صاف اور غبار سے پاک ہے کہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔"

"تلمیذ خرد۔ جناب واقعی بجا ہے آپ نے سچ عرض کیا بسبب کثرت صفائی کے بندہ بھی جس قدر چہار سو نظر کرتا ہے تارے بیحد نظر آتے ہیں ان کو کس طور شمار کرنا کیونکہ سنا ہوں استادوں نے ان کو شمار کیا ہے......... اس مقدمہ مشکل کی راہ دریافت مجھ پر روشن فرمایئے۔"

"استاد ــــ ابھی نہیں چند روز توقف کرو......... بالفعل اور ایک امر کی تعلیم تم کو میری مدنظر ہے۔ سنو جب تم شب کو اوپر کی طرف یعنی منتہائے امتداد نظری سر پر کا جس کو آسمان کر تعبیر کرتے ہیں.......... فقط آنکھ سے دیکھتے ہیں وے نجوم بیحد جو ہم کو نظر آتے ہیں صرف باصرے کا دھوکا ہے.......... بدون استعانت دوربین کے ہزار سے زیادہ تارے نہیں نظر آتے۔ پس یہاں سے ثابت ہوا ظاہراً ہم کو جتنے تارے نظر آتے ہیں دراصل وے سب تارے نہیں ہیں بلکہ تخیلہ باصرے کا ہے۔"

(دوسری گفتگو" میں ثوابت کی وجہ تسمیہ۔ شکل۔ اقسام ان کے نام اور محل و قوع کو سمجھایا گیا ہے۔")

"تیسری گفتگو میں ثوابت اور منطقۃ البروج کی تعریف اور اس کے متعلقات کا ذکر ہے۔ مختلف تاروں کے نام اور ان کی خصوصیات بھی تبلائی گئی ہیں۔ چوتھی گفتگو میں تقویم کے علم سے بحث کی گئی ہے۔ چھٹی گفتگو نظام شمسی کے مسائل پر مبنی ہے جس میں یہ تبلایا گیا ہے کہ آفتاب اپنے مرکز پر قائم ہے اور اس کے اطراف (۷) سیارے اور (۱۸) چاند گردش کرتے ہیں۔ ۵۰۰ ق م میں یونان کے ایک ہیئت داں فیثاغورس نے اس نظام کو دریافت کیا۔ چھٹی گفتگو میں زمین کی شکل گول ثابت کرنے کے لئے مختلف مثالیں دی گئی ہیں۔ زمین کے محور۔ قطبین اور خط استوا کی تعریفات بیان کی گئی ہیں۔ ساتویں گفتگو میں زمین کی روزانہ گردش کا حال لکھا ہے اور تبلایا ہے کہ زمین اپنے محور پر (۱۰۰۰) میل فی ساعت گھومتی ہے۔ اسی طرح آٹھویں اور نویں گفتگو میں روز و شب اور زمین کی سالانہ گردش کا بیان ہے۔ بارہویں گفتگو تک موسموں کی کیفیت اختلاف اور اعتدال پر معلومات درج ہیں۔ تیرہویں گفتگو میں سال کبیسہ اور اس کے پہچاننے کا قاعدہ تبلایا گیا ہے۔ چودہویں گفتگو میں چاند کی گردش کا ذکر کرکے سال کو بارہ مہینوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پندرہویں میں خسوف و کسوف۔ سولھویں اور سترہویں میں بدر کا حال لکھا گیا ہے۔ اٹھارہویں گفتگو سے لیکر پچیس ویں گفتگو تک مختلف سیارے مثلاً عطارد۔ زہرہ مریخ مشتری۔ زحل۔ آفتاب اور دمدار ستاروں کے متعلق تفصیلی معلومات درج ہیں۔ چھبیسویں گفتگو میں پھر ثوابت کی بحث چھیڑ دی گئی ہے۔ کتاب کے ختم پر سیاروں کی جدولیں دی گئی ہیں جو امتو صاحب کی کتاب "پیاناراما" سے اردو میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

اس رسالے کا اسلوب بیان اور خصوصیات زبان تقریباً وہی ہیں جو پہلے رسالے کے سلسلہ میں بیان ہو چکی ہیں۔ فارسی اور عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ مثال کے طور پر ان میں سے چند یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

فارسی الفاظ۔ اندک۔ بنابر۔ درمیولا۔ بہ آئین۔ بہمین ہمہ جا وغیرہ۔

عربی الفاظ۔ مرئی۔ تفحص۔ موہومہ۔ کماہی۔ کماینبغی۔ سریع۔ بطی۔ محتجب وغیرہ۔

متروکات۔ ونکے۔ تکے۔ غلظت۔ کسو۔ سرکتے۔ تئیں وغیرہ۔

کواکب کے اقدار کی علامتیں یونانی حروف میں لکھی گئی ہیں یونانی زبان میں الف کو الفا اور ب کو بیتا اور ج کو گیاما اور د کو ڈلٹا کہتے ہیں۔ علامتیں یہ ہیں۔

علامت قدر اول کے کوکب کی الفا - α
" " دوم کے " " بیتا - β
" " سوم کے " " گیاما - γ
" " چہارم کے " " ڈلٹا - δ

عبارت کا نمونہ:- "پیش از طلوع آفتاب جب مشرق طرف نظر

آتا ہے ستارۂ صبح گاہی اور جب بعد از غروب آفتاب مغرب طرف دکھلائی دیتا ہے ستارۂ شام گاہی کہلاتا ہے۔ پس جب زہرہ کے مقام میں ہوتا ہے بشرطیکہ نقطۂ تقاطع پر ہووے ناظر زمین کی نظر سے بالکل محجوب۔"

رسالہ کیمسٹری تقطیع ۰ ۲/۶ حجم (۲۱×۱۰) صفحات ستہ طباعت ۱۲۶۱ھ۔ یہ کتاب بھی سوال و جواب کے طریقہ پر لکھی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر بارہویں گفتگو تک علم کیمسٹری کے مسائل کو سمجھایا گیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ کیمسٹری کا ترجمہ کیمیا نہیں کیا گیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کیمیا کا لفظ اردو میں ایک خاص مفہوم کو ادا کرتا تھا۔ ابتدا میں حمد کے بعد لکھا ہے۔

" دانشوران ذی فہم پر پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے مختصر چند اصول کیمسٹری کے بیان میں کہ اس علم میں ترکیب عناصر کی حقیقت جو زبان فرنگ میں اس کو کیمیا کہتے ہیں پائی جاتی ہے اور یہ علم بہت عجیب و غریب ہے کہ اس کی تحصیل اہل حکمت کو بہت ضرور اور لازم ہے اور یہ علم اہل فرنگ کی زبان میں مندرج تھا لیکن حال میں ایک رسالہ اس علم کا ہندوستان سے شہر آگرہ کا چھپا ہوا ایسا آیا تھا کہ اس میں ایک صفحہ انگریزی زبان کا اور دوسرا صفحہ اس کے ترجمے کا اردو زبان میں لکھا ہوا تھا اگرچہ وہ دوبارہ مختاج چھاپے کا نہ تھا مگر بسبب عام فائدہ کے لیے اس کے اردو ترجمے کو علیحدہ لکھوا کر چھپا یا گیا"

پہلی گفتگو میں علم کیمیا کی تعریف اور اربعہ عناصر کا بیان ہے۔ دوسری گفتگو میں نور۔ حرارت اور بخر ماہیت کی خاصیت بیان کی گئی ہے۔ تیسری گفتگو میں گرمی کا اثر پانی پر۔ بھاپ اور برف کے متعلق معلومات درج ہیں۔ چوتھی گفتگو میں ہوا کا بیان ہے جس میں آکسیجن اور نیٹروجن کے خواص کو سمجھایا گیا ہے۔ پانچویں گفتگو میں جمادات کو ذکر کرنے ہوئے گندھک اور فاسفورس کے خواص بتلائے گئے ہیں چھٹی گفتگو میں کوئلے اور کاربن کا بیان ہے۔ ساتویں اور آٹھویں گفتگو میں فلزات اور دھاتوں کے پگھلانے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ نویں گفتگو میں سوڈیم اور پٹاشیم کے خواص کی تشریح کی گئی ہے۔ دسویں گفتگو میں امونیا۔ پٹاس اور سوڈا کی خاصیتیں بیان کی گئی ہیں۔ گیارہویں گفتگو میں خاک اور اس کے متعلقات مثلاً چقماق۔ چکنی مٹی۔ چونا اور میگنیشا کے خواص کو گنایا گیا ہے۔ بارہویں گفتگو میں مختلف ایسڈ اور سالٹ کے خواص اور ان کے بنانے کے طریقے بتلائے گئے ہیں۔

اس کتاب کی زبان اور اسلوب بیان میں وہ سادگی اور روانی نہیں پائی جاتی جو شمس الامراہی کی لکھوائی ہوئی ایک کتاب "کیمسٹری یا مختصر رسالہ" میں پائی جاتی ہے بعض الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے مثلاً

تھنڈھا (ٹھنڈا)۔ بھاپھ (بھاپ) چونٹی (چھوٹی) گرڈا (گڑھا) وغیرہ۔

دکنی اردو کے بعض الفاظ یہ ہیں۔

آدھون۔ آدھا۔ بھاہر وار۔ دھڑک۔ وغیرہ

اکثر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا ہے۔ انہیں اسی طرح رکھ کر مفہوم سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً

ڈیکامپوزیشن۔ الیکٹرسٹی۔ نیٹرک آسڈ۔ تھرمامیٹر۔ کنڈکٹر۔ نان کنڈکٹر (بعض جگہ نن کنڈکٹر بھی لکھا ہے) پیٹن سالٹ۔ میگنیشیا۔ کاسٹک۔ ایرپمپ وغیرہ۔

جن اصطلاحات کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں۔

قوت جاذبہ۔ رغبت۔ **Attraction**

جامد Solid

سیال Liquid of fluid

ہوائی Gas

سنگ چقماق Flint

شعلہ گیر Inflamable

نشاستہ Starch

حرارت Heat

خاک Earth

کشتہ Axide

چونا Lime

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"س۔ آپ نے آگے کہا کہ پانی کا بخار ہوا سے مل جاتا ہے۔ ہوا کیا شئے ہے۔

ج۔ ہوا میں دو چیزیں ہیں آکسیجن اور نیٹروجن۔ آکسیجن پانچواں حصہ ہے۔ اور باقی نیٹروجن ہے۔

س۔ ان دونوں شئے کی تعریف کیجئے۔

ج۔ جب نیٹروجن آکسیجن سے جدا کیا جاوے تو اس میں نہ کوئی جاندار سانس لے سکتا ہے نہ شعلہ جل سکتا ہے نہ پھول کھل سکتا ہے نہ نباتات اگ سکتی ہے۔ غرض کسی شئے کی زندگی نہیں ہو سکتی اور آکسیجن وہ شئے ہے کہ ضرور ہے واسطے جلنے کے اور دم لینے کے۔"

اصل انگریزی کتاب اور مصنف کا نام نہیں دیا گیا ہے اور اس کی بھی صراحت نہیں کہ ترجمہ کسی ایک شخص نے کیا یا جماعت نے۔ (نمبر ۴۰۵ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ)۔

علم آب یہ کتاب ستہ شمسیہ کی تیسری کڑی ہے جو دیباچہ اور بائیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ دیباچہ کے سوا کتاب کا حجم (۲۱۲) صفحات ہے آخر میں چار صفحات کا غلط نامہ اور تین صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۶) اشکال درج ہیں۔ دیباچہ میں اس رسالے کی تالیف کا مادہ تاریخ مذکور ہے جو یہ ہے۔

شمس الامراء کی ہے یہ تالیف

سنہ ۱۲۵۴ھ

ایک سرخی "تعریفات اور کیفیات علم آب" کے تحت بارہ صفحات میں مختلف اصطلاحوں اور آلوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ پہلی گفتگو سے لیکر پندرہویں گفتگو تک علم آب کی حقیقت سیال اجسام کے اوزان، دباؤ اور ان کی حرکت سے متعلقہ جملہ امور کو سمجھایا گیا ہے۔ سولھویں اور سترہویں گفتگو میں ہیڈرامیٹر اور تیرنے کی کیفیت کا حال درج ہے۔ اٹھارویں گفتگو میں سفن لے آلے کے اعمال کی تشریح کی گئی ہے۔ انیسویں اور بیسویں گفتگوؤں میں آلہ غوطہ زنی اور اس کے استعمال کے طریقوں اور فوائد کو تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ اکیسویں گفتگو میں پمپ سے پانی کھینچنے کے طریقے سمجھائے گئے ہیں۔ بائیسویں گفتگو میں زبردستی کے پمپ کا ذکر ہے جس سے فوارے کا کام لیا جاتا ہے۔ آگ بجھانے کے آلے کا ذکر بھی اسی ضمن میں کیا گیا ہے۔ کنوؤں سے پانی کھینچنے کے لیے رسی کے ڈولوں کی ساخت کا طریقہ بھی واضح کیا گیا ہے۔ پھر زنجیری پمپ کا ذکر ہے جو جہازوں کی تہہ سے پانی باہر نکالنے کے کام آتا ہے۔ آخر میں شکنجہ آب کا ذکر ہے جس کی مدد سے روئی کے گٹھوں کو دباتے ہیں۔ جہازوں میں جب روئی بھری جاتی ہے تو پہلے اس شکنجہ میں اس کو دباتے ہیں جس کی وجہ سے بیس گنا زیادہ روئی بھری جا سکتی ہے۔

اس رسالے میں بھی کم و بیش وہی زبان استعمال کی گئی ہے جو اس سے پہلے کے رسالوں کی ہے جملوں کی ترکیب اور ساخت کی قدامت کی چند مثالیں یہ ہیں۔

"میں تم سے کہا چاہتا تھا۔"

"چار شکلیں مدور کی رنگتیں ہیں۔"

"جو جسم کہ اس کا ثقل پانی سے کم ہے۔"

"کس طرح پانی اعضوں کی حیات کا سبب پڑتا۔"

"سفوف بارک دیا اور کوئی رنگین شئے کا۔"

"نے" کا استعمال ملاحظہ ہو:

"ہم نے اپنے استعداد حوصلے کے موافق سمجھے"

بعض جگہ "نے" کا استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ مثلاً

"اوپر آپ فرمائے تھے۔"

نقط " کر " مختلف طریقوں سے جملوں میں لایا گیا ہے۔ جیسے
مجھ سے کر دیکھو گے (مجھے کرتے ہوئے دیکھو گے)
امتحان کر دکھلائیے۔ (امتحان کرکے دکھلایئے)

بعض قدیم الفاظ بھی ملتے ہیں جو اب متروک ہیں مثلاً
ماٹی (مٹی)۔ قیمت دار (قیمتی)۔ جاگہ (جگہ)۔
دوڑنے لاگا (دوڑنے لگا) وسکا (اس کا) وغیرہ۔
کہیں کہیں دکنی الفاظ اور زبان کی جھلک ہے۔
سرکاؤ (ہٹاؤ) ڈھیپا (تودہ) معصمت پنا
(معصمت پن) دھڑ (جسم) ماپ (ناپ) کھلتیاں
بند ہوتیاں ہیں (کھلتی اور بند ہوتی ہیں)

انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ ہیڈرو
اسٹاٹکس کو کہیں ہائے ہوز اور کہیں ہائے حطی سے لکھا ہے۔
بعض انگریزی اصطلاحوں کے ترجمے کئے گئے اور بعض انگریزی
تلفظ کے مطابق اردو میں لکھے گئے۔ چند بطور نمونہ پیش کی
جاتی ہیں۔

علم آب ۔ Hydrostatics
علم آب کی ترازو۔ Hydrostatic Balance
چوسنے کا پمپ۔ Sucking pump
زبردستی کا پمپ۔ Force pump
ہیڈرامیٹر۔ Hydrametre

کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

" علم آب جس کو یونانی زبان میں ہیدرس
ٹاٹکس کہتے ہیں۔ علم فلسفی طبیعی کی ایک نوع
ہے جو طبیعت اور ثقل اور دباؤ اور حرکت
اکثر سیال کی ظاہر کرتا ہے۔"

" کسب کسا ہی آسان ہو نہیں سمجھنا اس کے
عمل میں کچھ خطر نہیں۔ چنانچہ لکھا ہوا
دیکھنے میں آیا ہے۔ حکیم اسپالڈین اور
اس کا مددگار دے دونوں اپنے بنائے
ہوئے آلے میں بیٹھ کر جہاز شکستہ اور ڈوبے
ہوئے مال کے نکالنے کے واسطے دوبار
دریا کے اندر جا کر نکلے اور دفعہ سوم جو
ڈوبے ایک ساعت تک رہے جب وقت
بہت گزرا اور اوپر کے مددگاروں نے
کچھ اشارہ مراجعت کا نہیں پایا یا آلہ غوطہ زنی
کو اوپر کھینچا دیکھے اور دونوں کی روح پرواز
ہو گئی تھی۔"

بعض صفحات کے حاشیہ پر اس سلسلے کی دوسری کتابوں
مثلاً جر ثقیل۔ علم مناظر اور شمس الہندسہ وغیرہ کے حوالے بھی
دیئے گئے ہیں۔

علم ہوا

رسالہ شمسیہ کی چوتھی کڑی ہے جو دیباچہ کے علاوہ
چوبیس گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔ اصل کتاب کا
حجم (۳۳۵) صفحات ہے۔ آخر میں (۴)
صفحات کا غلط نامہ اور پانچ صفحات پر علم آب سے متعلق (۳۴)
آلوں کے نقشے دیئے گئے ہیں اور مترجم نے پانچ مختلف قسم
کے فواروں کے نقشے بھی ان میں شامل کر دیئے ہیں جو کسی دوسری
کتاب سے لئے گئے ہیں۔ چنانچہ صفحہ (۹۵) کے نیچے حسب ذیل
عبارت درج ہے۔

" مترجم نے فواروں کے نقشے اور ایک کتاب سے
واسطے تفہیم کے داخل کیا۔"

کتاب کی ترتیب کا ڈھنگ وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتاب کا
ہے۔ ہوا سے متعلق جملہ امور کو انتہائی وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا
گیا ہے اور کوئی بات تشنہ باقی نہیں رہتی جن مسائل سے اس
کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ ان کی چند سرخیاں یہ ہیں۔

کیفیت ہوا۔ ایر پمپ۔ ہوا کا دباؤ۔ ہوا کا منن۔ ہوا
کی لچک۔ ہوا کی بندوق اور آواز۔ پون۔ اسٹیم انجن۔ برامیٹر
تھرمامیٹر، پیرامیٹر، ہیگرامیٹر اور آلہ بارش پیما وغیرہ۔ جن انگریزی
اصطلاحوں کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ حسب ذیل ہیں:۔

ہوائی بندوق Air gun
آلہ ہوا کش Air pump

بخار کا آلہ Steam Engine
ٹھوس پن Solidity
آتش پیما Paerametre
موسمی پون Monsoon

بعض الفاظ کا املا اور تلفظ بھی اب سے مختلف ہے۔ مثلاً
جیتیا ـــــ جتنا
جانوں ـــــ جانو
بانسلی ـــــ بانسری
سنا ـــــ سننا

بعض الفاظ کی جمع دکنی قاعدہ کے مطابق بنائی گئی ہے۔ مثلاً
شاخ سے شاخاں۔
سیخ سے سیخاں وغیرہ۔

وے۔ وو۔ اور ون سے جگہ جگہ استعمال ہوئے ہیں۔
"نے" کے استعمال کی دو مثالیں بطور نمونہ پیش کیجاتی ہیں۔
"ہوا کو آپ نے تولی تھی" "حضرت میں اس بات کو خوب سمجھا۔"
بعض مقامات پر اسم کیفیت یا حاصل مصدر کی بجائے مصدر کا استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً
"حضرت کیا گرجنا ہوا سے ہوتا ہے۔"
"تعجب ہے کہ گرجنا اکثر سننے میں کیوں نہیں آتا۔"
انگریزی الفاظ کے املا کا تعین نہیں کیا گیا تھا۔ چنانچہ حسب ذیل الفاظ کو دو طرح سے لکھا گیا ہے۔
اسٹیم انجن۔ اشٹیم انجن
ترمامیٹر۔ تھرمامیٹر

اس کتاب کی "تیسویں گفتگو" سے تلمیذ اور استاد کے سوال و جواب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔
"استاد۔ اب اپنے بیان کو علم طبیعیات کے آلات کی گفتگو میں تمام کرنے کے واسطے آج تم کو پیرامیٹر اور ہیگرامیٹر کی ترکیب اور عمل دکھاتا ہوں اور کل اس کتاب کو آلہ بارش پیما کے بیان پر تمام کرتا ہوں۔
تلمیذ غرہ۔ حضرت پیرامیٹر کی معنی بیان کیجئے۔

استاد۔ یہ لفظ یونانی ہے اور اس کی معنی آتش پیما ہے اور یہ ایک آلہ ہے منجمد چیزوں علی الخصوص معدنیات کے بڑھاؤ کی پیمایش کے واسطے جو بہ سبب گرمی کے ان کو حاصل ہوتا ہے اور چیزیں کتنی بھی تھوڑی پھیلیں اس آلے کی استعانت سے تیسویں شکل کی مانند فقط آنکھ سے نظر آویں گی۔"

علم مناظر یہ کتاب بستہ شمسیہ کی پانچویں جلد ہے اور اس میں علم مناظر سے بحث کی گئی ہے۔ دیباچہ اور تعریفات علم مناظر کے صفحات کے علاوہ کتاب کا حجم (۲۰۰) صفحات ہے۔ آخر میں (۸) صفحات کا غلط نامہ اور متن سے متعلقہ (۴۲) اشکال تحریک ہیں۔ اصل کتاب میں علم مقناطیس کا رسالہ بھی اس کے ساتھ شامل تھا مگر ترجمے میں اس کو علم مناظر سے علحدہ کر کے علم برق کی جلد کے آخر میں شریک کیا گیا۔ اس کتاب کے سنہ تالیف کے متعلق دیباچہ میں غلام محی الدین کا نکالا ہوا مادہ تاریخ یہ ہے۔

"ایں تالیف شمس الامرا"
۱۲۵۵ھ

دیباچہ کے بعد علم مناظر کی مبادیات اور اصطلاحات کی تشریحیں کی گئی ہیں جس سے کتاب کے سمجھنے میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ پوری کتاب کو بائیس گفتگوؤں پر تقسیم کیا گیا ہے جن میں علم مناظر کی مختلف شاخوں مثلاً شعاع۔ روشنی۔ آئینہ۔ عینک۔ قوس قزح۔ کلان بین اور دوربین پر تفصیلی معلومات درج ہیں۔ ترجمہ کی خصوصیات وہی ہیں جو اس سے پہلے کی کتابوں کے متعلق بیان کی جا چکی ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ علمی مباحث کو سادہ اور سلیس پیرایہ میں ادا کیا گیا ہے۔ ترجمہ اس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ عبارت میں ترجمہ پن نہیں پایا جاتا۔ جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ ہوا وہ حسب ذیل ہیں:۔

قندیل سحری Magic lantern
لنتر یا لانتر Lantern

منہ دیکھنے کا آئینہ Looking glass

کلاں بین Microscope

منعکس دوربین Reflecting Telescope

موازی شعاعیں Convergent Rays

انقباضی شعاعیں

انبساطی شعاعیں Divergent Rays

منعکس روشنی Reflected Light

بعض الفاظ کو کہیں مذکر اور کہیں مونث استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً :—

شعاع آتی ہے —— شعاعیں گرتے ہیں۔

بوڑھے کی آنکھیں —— آدمی کے آنکھیں۔

بعض الفاظ کا املا موجودہ املا سے مختلف ہے۔ جیسے

سابون (صابن) لبنی (لانبی)۔ بڑتا ہے۔

(بڑھتا ہے) ہاتی (ہاتھی)۔

عبارت میں جگہ جگہ ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اب ہماری زبان میں متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً

کبھو۔ کسو۔ جدی جدی۔ وو۔ وے۔ دکھنے (لگی)

وغیرہ وغیرہ۔

اگر کسی جملہ میں فاعل جمع ہو تو اس کا فعل بھی جمع لایا گیا ہے اور یہ دکنی زبان کی ایک خصوصیت ہے۔ مثال کے طور پر چند جملے یہاں لکھے جاتے ہیں :—

"یاد رکھو...... کہ تفاوتیں ہوا میں معلوم کر سکتے ہیں برخلاف پانی کے کہ وہاں خوب دریافت نہیں ہو سکتیں ہیں"

"یہ تعریفات تمہارے ہر کام پر آئیں گیں"

"جس جگہ وو سب شعاعیں بیچ کے خط ملیں گیں"

بعض جگہ "نے" کے استعمال کو ضروری نہیں سمجھا گیا۔ مثلاً

"کیا حضرت آپ سمجھے ہیں کہ روشنی چار مرتبہ کم ہوئی ہے"

یہ کتاب بھی بطور سوال و جواب کے لکھی گئی ہے۔ پندرہویں گفتگو سے ایک مکالمہ کا اقتباس بطور نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے :—

"تلمیذ خرد۔ حضرت بہتر بندہ ایسا ہی عمل کرے گا لیکن کچھ آپ نے آبرو اور مژگاں کا ذکر نہ کیا یہ کس کام پر آتی ہیں۔

استاد......... ابرو بہت آنکھ کو پناہ دیتی ہے جس وقت کہ بہت روشنی آنکھ پر آتی ہے اور کوئی جسم اگر پیشانی پر سے پھسل کر آنکھ پر گرے آنکھ کو مضرت نہیں پہنچنے دیتی ہے اور مژگاں کام کرتی ہیں آنکھ کے پردے کی مانند کس واسطے کہ جب کوئی شخص سوتا ہے وو سنبھالتے ہیں۔ حادثہ روشنی کو یعنی زیادہ روشنی آنکھ میں جانے نہیں دیتی ہیں۔... اور یہ مژگاں ہزاروں صدمات سے آنکھوں کو بچاتے ہیں اور جو گرد کہ ہوا میں بھری ہوئی ہے اُن کو آنکھوں میں آنے نہیں دیتے ہیں۔"

علم برقاک

یہ سلسلۂ ثلاثہ کی آخری کڑی ہے جس میں علم برقک۔ گیال وی نیزم اور مقناطیس کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب بھی سنہ [illegible] میں تالیف ہوئی۔ جس کا دیباچہ میں حوالہ دیا گیا ہے۔ (۱ تا ۲۰۶) صفحات میں علم برقک پر بحث کی گئی ہے اور آخر میں تین صفحات پر (۳۱) اشکال ہیں۔ (۲۰۷ تا ۲۶۲) صفحات میں گیال وی نیزم کے مسائل سمجھائے گئے ہیں اور ختم پر متعلقہ آلوں کے (۶) نقشے دیئے گئے ہیں۔ (۲۶۳ تا ۳۰۲) صفحات علم مقناطیس کے لئے وقف ہیں اور آخر میں مقناطیس کی قوتوں کو پانچ مختلف اشکال سے واضح کیا گیا ہے۔ (۳۰۳ تا ۳۴۴) صفحات میں سوالات کی فہرستیں درج ہیں کتاب کے ختم پر تینوں رسالوں کے غلط نامے علحدہ علحدہ سرخیوں کے تحت ترتیب دیئے گئے ہیں۔ علم برقک سولہ گفتگوؤں پر گیال وی نیزم اور علم مقناطیس چار چار گفتگوؤں پر مشتمل ہے۔

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

ہندوستان میں انگریزی دور کا اسلامی قانون

دیگر ملکوں کے قوانین کی طرح برطانوی ہند کے قانون کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ان قوانین کا ایک حصہ تو ایسا ہے جس کے اصول عالمگیر نوعیت کے ہیں اور بقیہ حصہ خاص جماعتوں اور فرقوں کے قوانین سے متعلق ہے۔ البتہ دیگر ملکوں کے مقابلے میں ہندوستان میں فرقہ دار قوانین زیادہ ہیں۔ انگلستان میں ایک غیر اہم اقلیت یعنی یہودیوں کے لئے ازدواج وغیرہ سے متعلق بعض علیحدہ قوانین ہیں لیکن ہندوستان میں یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ یہاں خاص اور شخصی قوانین، قانون ملک کا بڑا جزو ہیں۔ مثلاً شادی بیاہ، وراثت اور دیگر اہم امور میں مختلف فرقوں کے مختلف اصول اور قاعدے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب فریقین ہندو ہوں تو عدالتوں کو دھرم شاستر اور مسلمان ہوں تو شرع شریف کے مطابق فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ برما میں بدھی قانون پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ خاندانوں کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں بعض مقامی اور خاص قسم کے رسم و رواج بھی ہیں جن پر مثلاً سکھوں اور جینیوں وغیرہ کی صورت میں عمل ہوتا ہے۔ پارسیوں کا اپنا علیحدہ نظام قانون ہے جسے اب ہندوستانی مقننہ کی طرف سے قانون کی حیثیت دی جا چکی ہے۔ ہندوستان میں جو یورپی اشخاص بستے ہیں، ان کی حیثیت موسمی پرندوں کی ہے اور جب کبھی وہ ہندوستان آتے ہیں، اپنے ملک کا قانون ساتھ لاتے ہیں۔ نیز ہندوستان میں بسے ہوئے عیسائیوں کے لئے خواہ وہ مقامی ہوں یا یورپی، شادی بیاہ اور طلاق وغیرہ سے متعلق علیحدہ قانون بنایا گیا ہے۔ غرض مختلف اقلیتوں اور فرقوں کے لئے ہندوستان میں مختلف قسم کے شخصی قوانین ہیں۔ لیکن ان میں سب سے اہم دو نظام ہائے قوانین ہیں جو دو بڑی جماعتوں کے شخصی قانون سمجھے جاتے ہیں یعنی دھرم شاستر اور شرع شریف۔ انگریزی دور حکومت میں ان نظام ہائے قوانین کی کیا حیثیت رہی؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے جو کافی وقت چاہتا ہے۔ اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ایک غیر مسلم حکومت کے زیر عاطفت اسلامی قانون ہندوستان میں کس حد تک باقی رہا اور اس پر انگریزی دور کے کیا اثرات پڑے۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

مسلمانوں کا شخصی قانون، جس پر آج ہندوستان میں عمل کیا جاتا ہے، انگریزی دور میں ایک انوکھی نوعیت رکھتا ہے، اور اگر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا قانون یعنی شرع شریف اپنی ابتدائی شکل اور اصل سے بہت دور جا پڑا ہے۔ شرع شریف پر انگریزی حکومت کے اثرات کا مطالعہ کرنے سے قبل مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اس وقت کے قانون کی کیفیت دیکھی جائے جب کہ وہ پہلے پہل ہندوستان آئے کیونکہ موجودہ قانون کی اصل بنیادیں وہیں سے شروع ہوئی ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر مسلمان دو راستوں سے آئے یعنی سمندر اور خشکی کے راستے؛ سمندر کے راستے جو مسلمان آئے وہ ابتداءً ملابار اور کارومنڈل پہنچے اور ان آنے والوں میں، جیسا کہ بعض روایتوں کی بنا پر معلوم ہوتا ہے، بعض لوگ عہد نبوی ہی کے اصحاب نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک روایت یہ ہے کہ ملابار کے سامری (Zamorin) نے شق القمر کے معجزے کے بعد اسلام قبول کیا۔ یہ آنحضرتؐ سے مدینہ میں ملا۔ اس نے وہیں بیعت قبول کی اور یمن میں وفات پائی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جب راجہ سامری ہندوستان سے عرب گیا تو اس نے اپنے بیٹے سے خواہش ظاہر کی کہ وہ بھی ساتھ چلے اور اسلام قبول کرے۔ بیٹے نے انکار کیا۔ اس پر سامری نے بیٹے کو عاق کیا اور اپنے بھانجے کو جانشین کیا اور کہا جاتا ہے کہ اسی کے بعد سے ملابار کے شاہی خاندانوں میں بھانجے کی جانشینی کا رواج ہوا۔ اس سلسلے میں ایک عجیب بات یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جتنے جانشین ملابار میں ہوئے، سب یہ حلف اٹھاتے تھے کہ ہم راجہ کے عرب سے واپس ہونے تک تخت نشین رہیں گے۔

ممکن ہے کہ سامری کی یہ روایت اصلیت پر مبنی نہ ہو کیونکہ سیرت یا عہد نبوی کی کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، لیکن اس سے اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ جنوبی عرب کا تعلق ابتدائے اسلام میں ملابار سے رہا ہے۔ چنانچہ حضرت تمیم انصاری جو عہد خلفاء کے مشہور بزرگ ہیں کاذومنڈل میں بمقام کولم مدفون ہیں۔ حضرت عکاشہ کا مزار محمود بندر پر موجود ہے۔ کرانگنور اور دوسرے بعض مقامات پر اسی ابتدائی زمانے کے بعض بزرگوں کی مسجدیں وغیرہ بنی ہوئی ہیں چنانچہ ملابار میں مالک ابن دینار کی مسجدیں آج تک موجود ہیں۔ اس ابتدائی زمانے میں جو مسلمان آئے وہ ظاہر ہے کہ حنفی یا شافعی کی طرح مقلد تو نہ ہوں گے کیونکہ حنفی اور شافعی مذہب بعد کی پیداوار ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بعد کے آنے والوں میں جو سمندر کے راستے سے ہندوستان آئے، عموماً شافعی تھے اور بعض مورخ کہتے ہیں کہ پہلی دفعہ یہی ہندوستان آئے۔ یمن وغیرہ میں شافعی مذہب اب تک ہے۔ جو مسلمان شافعی مذہب لے کر سمندر کے راستے سے ہندوستان آئے، یہ لوگ دوسری اور تیسری صدی ہجری کے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ بعض مصنف لکھتے ہیں کہ اگر مسلمان واقعی عہد نبوی میں آئے ہوتے تو ہندوستان میں ایک فرقہ ضرور ایسا ہوتا جو حنفی ہو نہ شافعی۔ اس مسئلہ پر بعض مورخ مثلاً زین الدین المصری وضاحت سے لکھتے ہیں۔ تحفۃ المجاہدین میں جو اکبر کے زمانے میں لکھی گئی تھی، ملابار کے چشم دید واقعات مصنف نے خود ملابار جاکر لکھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ شق القمر پر ایمان لانے کی روایت غلط معلوم ہوتی ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ دوسری صدی ہجری میں مسلمان ملابار آئے اور ظاہر ہے کہ امام شافعی کا اس وقت اثر تھا۔

جو لوگ خشکی کے راستے ہندوستان آئے وہ افغانستان اور ترکستان کے لوگ تھے۔ عباسی دور میں جب حنفی مذہب ملک کا سرکاری مذہب ہوگیا تو عباسی سلطنت میں حنفیت چھا گئی۔ چوتھی اور پانچویں صدی میں ترکستان کے باشندوں میں جن میں مغل اور ترک دونوں شامل ہیں، وقت واحد میں دو مذہبوں نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ عیسائیوں اور مسلمانوں نے مسابقت کی۔ اسلام اس دوڑ میں جیت گیا اور یہ لوگ مسلمان ہو کر حنفی قانون کے پیرو ہوگئے۔ بلکہ ترکوں نے تو یہ بھی حکم دے دیا کہ صرف حنفی مذہب ہی سرکاری مذہب ہے اور وہ غیر حنفی مذہب کے لئے مفتی مقرر کرتے تھے۔ حجاز وغیرہ میں حنفیوں کو قاضی مقرر کیا جاتا تھا۔ سندھ کے پہلے عرب فاتح جو بصرہ (عراق) سے آئے تھے جو حنفی مذہب کا مرکز تھا۔ محمود غزنوی جو پہلی دفعہ وادی گنگا کو عبور کرکے ہندوستان کے اندر بہت دور تک گھس آیا تھا، فارسی زبان بولنے والا ایک ترک تھا اور ترک، خواہ سلجوقی ہوں یا عثمانی، حنفی نقطۂ خیال کے حامی تھے۔ محمود جو خود حنفی تھا خلیفۂ بغداد کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو شاہی خاندان ہندوستان میں حکومت کرتے رہے، مثلاً تغلق جو ترک تھے اور لودھی جو پٹھان تھے، یہ سب حنفی مذہب اپنے ساتھ لائے۔ اس موقع پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کا اچھی طرح تسلط ہونے تک خراسان اور ماوراء النہر کے بڑے قانونی مکاتب خیال میں حنبلی اور شافعی مذہب کا اثر بہت کم ہوگیا تھا اور ظاہر ہے کہ ہندوستانی علماء یا تو ان ہی درس گاہوں سے فیض یاب ہوتے تھے یا پھر ان ہی مقاموں سے علماء ہندوستان آتے تھے، ان خطوں میں اصل کشمکش اس زمانے میں حنفیوں اور شیعوں کے درمیان تھی اور اس سے ہندوستان بھی متاثر تھا۔ اسی لئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اولاً خشکی کے راستے ہندوستان آنے والے مسلمانوں میں صرف حنفی تھے۔ جو لوگ آج حنبلی یا شافعی وغیرہ نظر آتے ہیں، وہ بعد میں انفرادی شوق کی بناء پر ہوئے ہیں۔ خود مغل بھی حنفی مذہب کے سنی تھے۔ البتہ مغلوں کے زمانے میں شیعہ اثرات ضرور ہندوستان آئے۔ چنانچہ خاندان مغلیہ کا بانی بابر ایران کے پہلے شیعہ بادشاہ سے

کافی تعلقات رکھتا تھا۔ اس کے بیٹے ہمایوں نے، جب اُسے ہندوستان سے بھاگنا پڑا، ایرانی دربار میں پناہ لی اور جب اسماعیل صفوی کے جانشین طہماسپ کی مدد سے دوبارہ ہندوستان آیا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے شیعیت پھیلانے کا وعدہ کیا تھا جو بعد میں پورا نہ ہوا لیکن اکبر کے منظورِ نظر افسروں میں ایک شیعہ افسر ضرور ملتا ہے جو آٹھویں امام کی نسل سے بتایا جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں جو حوصلہ مند شخصیتیں اور نبرد آزما ہندوستان آئے، ان کے ساتھ مہاجرین بھی آتے رہے اور یہی لوگ اپنے ساتھ شیعہ مذہب لے آئے۔ مثلاً نورجہاں انہی مہاجرین میں سے تھی۔ سب سے پہلے بویہی خاندان شیعہ مذہب اپنے ساتھ لایا۔ بنی بویہ نے جب پایۂ تخت بغداد پر قبضہ جما لیا تو سلطان اور خلیفہ دونوں ایک ہی چیز بن گئے اور خلیفہ محض ایک کٹھ پتلی ہو کر رہ گیا۔ لیکن ایک بات ضرور قابلِ ذکر ہے کہ عضد الدولہ نے شیعہ ہونے کے باوجود خطبوں میں محض خلفاء کا نام باقی رکھا۔ مغلوں کے زمانے میں جب ہندوستان کا سرکاری مذہب حنفی ہو گیا تو مغلوں نے دیگر فرقوں کے لئے ان کا شخصی قانون برابر قائم رکھا۔ مغلوں کے بعد شیعوں کا اثر اور بڑھ گیا اور سچ پوچھئے تو خود مغلوں کے زمانے ہی سے شیعہ زور پکڑنے لگے تھے چنانچہ دکن کی دو اسلامی سلطنتوں پر یکے بعد دیگرے شیعہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ اورنگ زیب کے تین بھائیوں ہی سے جنھوں نے تختِ شاہی کے لئے اورنگ زیب کا مقابلہ کیا، ایک شیعہ بھی تھا۔ نیز وسط اٹھارویں صدی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک اودھ کے نواب وزرا نے جو بعد میں بادشاہ کہلانے لگے۔ اسی شیعہ مذہب کی سرپرستی کی۔

مسلمان سلاطین اور اسلامی قانون

جو اسلامی قانون وسط ایشیا سے ہندوستان آیا، اس میں ہندوستانی حالات اور رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ تھوڑی بہت تبدیلیاں ہونے لگیں۔ مثلاً ذمیوں یا غیر مسلم رعایا سے متعلق جو قواعد اور عمل درآمد تھے، ان میں تبدیلی کرنی پڑی کیونکہ وہ ہندوستان میں اپنی اصلی شان کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ جس طرح عام مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اسی طرح ذمیوں سے جزیہ کی وصولی اسلامی نظم و نسق کا ایک بڑا عنصر تھا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان سلاطین نے جزیہ وصول کرنے میں کم سے کم توجہ کی۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہندوؤں کے ذاتی معاملات، مثلاً ازدواج، تہنیت، وراثت وغیرہ سے متعلق ان کو آزادی دیدی گئی کہ اپنی مذہبی کتابوں اور رسم و رواج کے لحاظ سے عمل کریں اور ہندوؤں کو مسلمان قاضی کے سامنے بہت کم لایا گیا۔ البتہ اسلامی حکومت نے تعزیرات اور تعزیری سزاؤں کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کے لئے منو کے ضابطہ پر لحاظ نہ کیا جو بذاتِ خود اسلامی قانون سے زیادہ سخت تھا۔ قانونِ معاہدے کے سلسلے میں بھی تمام فرقوں کے لئے یکسانیت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ پھر بھی جیسا کہ مسٹر بیلی کا خیال ہے، فریقین ہندو ہوں یا مسلمان یا ایک ہندو اور دوسرا مسلمان، ہر صورت میں ایک ہی حاکمِ عدالت ایک ہی ضابطے کے تحت کارروائی کرتا تھا۔ البتہ زمینوں کے لگان اور ملکیت سے متعلق یہ سوال سر ولیم جونس کے زمانے ہی سے بحث طلب رہا ہے کہ مغلوں نے اس سلسلے میں ہندوؤں کے رسم و رواج اور مسلمانوں کے قانون سے کس طرح فائدہ اٹھایا جو طریقہ بھی مغلوں کا اس انتظام کی نسبت رہا ہو، یہ امر یقینی ہے کہ ہر مذہب اور فرقے کے زمینداروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا برتاؤ تھا۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ ہندی مسلمانوں نے شریعت پر کہاں تک عمل کیا اور حنفی معیار پر اسلامی قانون کی کہاں تک پابندی ہوئی، کافی دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلے کی حد تک ہماری معلومات بھی محدود ہیں۔ مغلوں کے دور میں سلاطین نے رفتہ رفتہ ہندوؤں کے ساتھ قانونی رعایت برتی حتیٰ کہ اکبرِ اعظم نے اپنی ہندو رعایا کو اپنے معاملات کی حد تک کافی آزادی دے دی تھی بلکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس مغل شہنشاہ نے ایک نیا مذہب ہی تراشا تھا تاکہ تمام ہندوستانیوں

کے لئے مشترک مذہب بن سکے۔ لیکن اس جدّت کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ کا مشہر خاص مارا گیا اور خود اکبر سے ناراضگی کا اظہار ہونے لگا اور اسے اپنی موت سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑا کہ سلطنت مغلیہ کا سرکاری مذہب شریعت اسلام ہے۔ اور اکبر کے پیروؤں نے تو شریعت کے نفاذ میں سختی سے پابندی کی۔ اس کے باوجود مغلوں کے زوال کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی شریعت پر عمل کرنے کا رجحان رفتہ رفتہ کم ہوگیا۔ چنانچہ ۱۸۰۷ء میں عالیہ عدالت کلکتہ کے سامنے یہ ثابت کیا گیا کہ برطانوی حکومت کے قیام سے کافی عرصہ پہلے ہی سے بنگال کے حکام عدالت یہ تسلیم کرتے رہے ہیں کہ مسلمان اور ہندو دونوں سود پر قرضے کا لین دین جاری رکھتے رہے، حالانکہ مسلمانوں کے شرع شریف کی رو سے سود کی ممانعت ہے۔

ملاحظہ ہو مقدمہ میاں خاں بنام بی بی جان۔ ۵ بنگال لا رپورٹ صفحہ (۵۰۰)

انگریزی حکومت اور شریعت

ہندوستان میں برطانوی حکومت کی بنیاد ان معاہدات پر رکھی گئی تھی جو انگریزوں نے مغلیہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے ساتھ کئے۔ یہ مغلوں کا آخری زمانہ تھا جب کہ سلطنت کے صوبوں پر مسلمان صوبہ دار مغل شہنشاہ کے وائسرایوں کی حیثیت سے حکومت کرتے تھے۔ انگریزوں نے ان صوبہ داروں سے بنگال، بہار، شمال مغربی صوبے اور کرناٹک حاصل کئے اور ان علاقوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۸۵۸ء تک دہلی کے نام نہاد مقتدر اعلیٰ کے نام سے حکومت کرتی رہی۔ لیکن کمپنی کو ابتداءً ایک "فرمان" کی رو سے صرف دیوانی اور مال کے انتظام کا حق ملا تھا اور فوجداری انتظام کئی سال تک بنگال کے نواب ناظم کے ہاتھ میں رہا اور نظامت عدالت یا فوجداری عدالت عالیہ کلکتہ میں نہیں بلکہ نواب کے مستقر مرشد آباد میں قائم تھی۔ اس فرمان میں، جو ابتداءً ۱۷۶۵ء میں کمپنی کو عطا کیا گیا، اس چیز کی صراحت تھی کہ کمپنی تمام معاملات "شریعت محمدیؐ" اور "سلطنت کے عام قوانین" کے مطابق طے کرے۔ لیکن متعاقب معاہدات یا فرامین میں اس قسم کے تاکیدی الفاظ نہیں ملتے گو ان کی روح میں یہ حکم ضرور موجود تھا اور کمپنی کو رائے عامہ اور تاجدار دہلی کی وجہ سے اس پر ضرور عمل کرنا پڑتا تھا۔ نیز انگریز تاجروں کو مالگزاری وغیرہ وصول کرنے سے اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ قانون کی طرف توجہ کرتے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ اس وقت تک بھی مسلمانوں کا قانون ملک میں جاری تھا۔ البتہ مسلمانوں نے جن معاملات کی حد تک ہندو شاستر کے احکام روا رکھے تھے وہ حسب حال جاری رہے۔ چنانچہ ۱۷۷۲ کے قانون کی ایک دفعہ یہ ہے:-

"In all suits regarding inheritance, succession, marriage and caste, and religions usages or institutions, the Laws of the Koran with respect to Mohamadans, and those of the Shastras with respect to Gentoos, shall be invariably adhered to."

(Regulation II of 1772, by Section 27.)

ان مخصوص مسائل کو چھوڑ کر وارن ہسٹنگز کی اسکیم میں شرع پر عمل کرنے سے متعلق کوئی حکم نہیں تھا البتہ کمپنی کی زیر اثر تمام عدالتوں میں، خواہ وہ ابتدائی قسم کی ہوں یا عدالت ہائے مرافعہ دیوانی اور فوجداری ہوں، ان میں قانونی مشورے کے لئے مسلمان افسر ضرور موجود ہوتے۔ خاص طور پر فوجداری جرائم کی سزائیں شریعت کی بناء پر دی جاتی تھیں، خواہ مجرم کا کوئی بھی مذہب ہو۔ ۱۷۹۰ میں ناظم کے ہاتھ سے اختیار سماعت چھین لیا گیا اور گو اس تاریخ سے نظام قانون رفتہ رفتہ

انگریزیت کی طرف لایا جانے لگا، پھر بھی مسلمانوں کا عنصر برابر قائم رہا حتی کہ ۱۸۶۰ء میں مجموعہ تعزیرات اور پہلا ضابطہ فوجداری نافذ کیا گیا۔ قانون شہادت ہند بھی ۱۸۷۲ میں نافذ ہوا اور اس طرح شہادت سے متعلق بھی اب انگریزی قانون کا سکہ رائج ہو گیا۔

غرض مغلیہ دور ختم ہوا اور انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہو گئی تو فطرتاً انگریز تاجروں نے اپنے تمدن اور اپنے نقطہ ہائے خیال کو پھیلانے کی کوشش شروع کر دی۔ گو ابتدا میں ان کی حیثیت نائب دیوان اور سرکاری ملازم کی تھی لیکن ان کی طاقت بڑھتی گئی اور آخر میں شاہ انگلستان کے چارٹر کے تحت بمبئی، کلکتہ اور مدراس میں حکومت قائم کی گئی۔ دیگر علاقوں میں شرع شریف ہی قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کے بعد کمپنی کی حکومت تاج کے ہاتھ میں آگئی تو انگریزی زبان رائج ہوئی اور سرکاری زبان فارسی ختم کر دی گئی۔ اب انگریزی تعلیمی اور ملکی زبان بن گئی۔ ضمناً چند روز تک اردو کی بھی سرپرستی ہوتی رہی لیکن انگریزی سرکاری اور عدالتی زبان قرار پا گئی۔ مرکزی مقننہ کے ذریعے انگلستان کے قوانین یکے بعد دیگرے نافذ ہونے لگے اور مغلیہ قانون برخاست کر دیا گیا اور جس طرح کہ اوپر ذکر کیا گیا، شہادت تعزیرات وغیرہ سے متعلق قوانین نافذ کئے گئے۔ چنانچہ اب برطانوی قانون کا یہ مسئلہ کلیہ بن گیا کہ ملک کے قانون موضوعہ میں کچھ نہ ملے تو برطانوی قانون سے رجوع کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کے زمانے میں شرع اسلام کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔

گو یہ صحیح ہے کہ خالص شرع شریف خود مغلیہ دور میں پوری پابندی کے ساتھ نافذ نہ رہ سکا۔ خاص طور پر اس کے تعزیری پہلو کی سختی قانون کے نفاذ میں مانع سمجھی جاتی رہی اور رفتہ رفتہ اسلامی تعزیری احکام زمی کے پردے میں اپنی اصلیت سے دور جا پڑے لیکن انگریزی دور میں جب مقامی رواجات کی سرپرستی شروع ہوئی تو یہ شرع شریف کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔ چنانچہ بمبئی، اودھ، پنجاب اور بنگال وغیرہ میں بعض خاص رسوم و رواجات کی پابندی مسلمانوں میں پائی جانے لگی۔ مغربی ہند کے عجیب و غریب رواجات شرع اسلام کا جزو بنا دئے گئے۔ خوجوں، میمنوں اور شیعیوں کے لئے علحدہ علحدہ اصول مرتب ہوئے اور اس کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں میں آپس میں نفاق پیدا ہوا اور ہر جگہ کے مسلمانوں میں الگ الگ رواج بن گئے جن کی سرپرستی کی گئی۔ بعض صورتوں میں تو ایسا بھی ہوا کہ سارے ہندوستان میں کسی فرقے کے زیادہ سے زیادہ سات آٹھ افراد ہوں گے لیکن ان کے لئے بھی ان کا علحدہ رواج تسلیم کیا گیا۔ چنانچہ اب ایک مسلم لا کی جگہ چھ مسلم لا پیدا ہو گئے۔ شیعیوں کے لئے ایک، سنیوں کے لئے ایک وغیرہ۔ ہر فرقے کو اس کے نفاذ کا اختیار دیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یہ انتظام ہوا کہ فریقین کے مذہب کا قانون حاکم عدالت استعمال کرنے لگا۔ اگر کسی مقام کے لوگ اجتماعی طور پر مسلمان ہو جائیں اور ان کی خاص تربیت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی قدیم روایات کو بھولتے نہیں اور اسلام کے خلاف بھی اکثر و بیشتر کسی حرکت کو برا نہیں سمجھتے۔ ملابار کے مسلمانوں میں کثرت شوہران کا رواج ہے جیسا کہ ملا نے لکھا ہے، خود حیدرآباد میں مسلمان دیول جاتے ہیں اور ناریل پھوڑتے ہیں۔ غرض رواجات کی سرپرستی سے شرع اسلام کی یہ انوکھی شان ہو گئی۔ اسی طرح جاگیرات سے متعلق عمل در آمد بھی دلچسپ ہے۔ مغلیہ دور میں بادشاہ بیٹے کو جاگیر دیتا تھا یا واپس لے لیتا تھا۔ انگریزی اثر کے تحت یہ طے ہوا کہ جاگیروں کی وراثت میں اصول یہ رہے گا کہ اولاد اکبر کو زیادہ جائداد ملے گی اور ماباقی کو حق پرورش۔ قاضی سے اختیار سماعت لے کر منصف کو دیدیا گیا اور منصف خواہ مسلمان ہو یا ہندو یا کوئی اور مسلمانوں کے

شخصی قانون سے متعلق فیصلہ کرنے لگا۔ اور ظاہر ہے کہ غیر مسلم جب اسلامی قانون کو منطبق کرنے کی کوشش کرے تو اس سے لغزش اور غلطی کا کافی امکان رہتا ہے۔ چنانچہ ایسے فیصلوں کا اثر یہ ہوا کہ اسلامی تصورات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ مقدمات کے فیصلے کے لئے آخری عدالت مرافعہ پریوی کونسل قرار دی گئی اور ایک عرصے تک پریوی کونسل کے تمام ارکان انگریز تھے جو شرع شریف کے مسائل پر غور فرما کر آخری اور قطعی فیصلہ صادر کرتے۔ امیر علی پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے پریوی کونسل میں شرکت کی۔ اسلامی قانون پر انگریزوں کی تعبیر و توضیح سے کافی برا اثر پڑا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ خالص شرع شریف سے ہٹ کر ہندی مسلمانوں کے لئے ایک انوکھا قانون بن گیا جسے " اینگلو محمڈن لا " کہا جانے لگا۔

اینگلو محمڈن لا

خالص شرع شریف میں انگریزی اثر کے تحت جو تبدیلی ہوئی، اسے سر رولینڈ ولسن کے الفاظ میں دو قسموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ تبدیلی ہے جو ارادی طور پر کی گئی اور دوسری وہ جو غیر ارادی طور پر ہو گئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اسلامی قانون تعزیرات میں رفتہ رفتہ مختلف اوقات میں تبدیلیاں کی جاتی رہیں اور بالآخر قانون تعزیرات ہند کے نفاذ سے اسلامی قانون کلی طور پر ختم کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ارادی تبدیلی ہے۔ اسی طرح قانون نشان (۵) ۱۸۴۳ء کی رو سے پورے برطانوی ہند میں ادارۂ غلامی برخاست کر دیا گیا۔ قانون نشان (۲۱) ۱۸۵۰ء کے ذریعے تبدیلی مذہب کے لئے یہ سہولت پیدا کی گئی کہ مرتد ہونے کے بعد بھی کوئی شخص وراثت سے محروم نہیں ہوگا۔ ۱۸۷۵ء کے قانون بالغاں کے ذریعے بلوغ کی عمر شرع اسلام کے نظریہ سے ہٹ کر علیحدہ رکھی گئی اور قانون نشان (۱۰) ۱۸۹۱ء کے ذریعے شادی بیاہ کے لئے بھی خاص عمر مقرر کر دی گئی (Baillie 1. 54.) ٹھیک اسی ارادی طریقے سے پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، اور اودھ میں قانون موضوعہ کے ذریعے حق شفعہ کے اسلامی قانون میں بڑی تبدیلی کی گئی۔ بلکہ حق شفعہ سے متعلق دوسرے صوبوں میں بھی عدالتوں کے فیصلے غیر ارادی طور پر اسلامی قانون کو بدلتے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حق شفعہ کا اسلامی اصول کہیں مقامی رواج اور باہمی سمجھوتے کی بنا پر تسلیم کیا جاتا ہے اور کہیں خود مسلمانوں کے معاملات میں بھی قابل قبول نہیں سمجھا جاتا۔

اسلامی قانون میں غیر ارادی طور پر بھی بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں۔ سب سے پہلے یہ بات قابل ذکر ہے کہ یورپی تمدن کے تحت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسا ماحول پیدا کر دیا گیا کہ خود ان کے لئے اسلامی قانون کے بیشتر اصول کی پابندی گراں ہو گئی۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑا عنصر عدالتیں ہیں جو اپنے فیصلوں کے ذریعے نہایت خاموشی کے ساتھ اسلامی قانون میں تبدیلیوں کا موجب ہوتی گئیں۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کا نظام قانون قرآن شریف اور حدیث پر مبنی ہے اور اجماع، قیاس اور استحسان وغیرہ کے ذریعے اس میں بست و کشاد کی گنجائش رہی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ قاضیوں کے فیصلے آنے والے معاملات کے لئے ہدایتیں ہوتے تھے لیکن جب قاضیوں کی جگہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے معاملات طے کرنے شروع کئے جن کو شرع اسلام کے متعلق مبہم معلومات ہوں، یا وہ جن کو اس پر کافی عبور نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ زمانے کی رفتار اور غلط نظائر کے انبار میں نص صریح کے اصل مقاصد اور اصل اصول بہت دور جا پڑتے ہیں۔ یہ پیچیدگی وقت اور بھی قابل لحاظ اہمیت اختیار کر لیتی ہے جب کہ فیصلہ کرنے والوں کے دل و دماغ بنیادی تبدیلیاں کرنا چاہتے ہوں۔

یوں تو شرع اسلام کے تقریباً ہر شعبے پر انگریزی تعبیر و توضیح، قانون سازی اور نظائر کا کافی اثر پڑا ہے لیکن مشتے نمونہ، نکاح، ولایت، وصیت، ہبہ، وقف اور شفعہ کے مسائل تو بقول شخصے اتنے انگریز زدہ ہو گئے کہ آج

ایک قانون پیشہ کے سامنے نت نئے نظائر کا انبار ہے اور اصل اصول جو عرب کی مقدس سرزمین سے نکلے تھے اب از کار رفتہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکام عدالت کا مقصد صرف تعبیر و توضیح ہے اور وہ قانون سازی نہیں کرتے لیکن اسی تعبیر و توضیح سے نظائر میں جو اصول طے پا جاتے ہیں وہ رفتہ رفتہ قانون صریح کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں اور اس میں بسا اوقات غلط قسم کے قانونی اصول بھی بن جاتے ہیں۔ جب ایک مرتبہ کوئی غلط چیز طے ہو جائے تو وہ برابر دہرائی جاتی ہے اور جب تک صریح قانون سازی کے ذریعے اسے منسوخ نہ کیا جائے، وہ برابر اہمیت حاصل کرتی جاتی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی مقننہ کا ہمیشہ یہ رجحان رہا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاملات میں صریح قانون سازی کم سے کم کی جائے اور اس کے لئے جب تک خود غرض مند مطالبہ نہ کریں، سو وہ قانون مقننہ سے نہیں منظور ہوتا۔ چنانچہ ان غلط اصولوں کو روکنے کے لئے جو نظائر کے ذریعے قائم ہو گئے ہیں، بہت کم قانون سازی ہوئی ہے۔ ۱۹۱۳ میں جو قانون وقف پاس ہوا، وہ غالباً اس نوعیت کا پہلا قانون تھا۔

ردِ عمل انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں تو مسلمانوں پر ان کے شخصی قانون کی تبدیلی کا کوئی خاص اثر نہیں معلوم ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ انگریزی اثر جو پوشیدہ قوت رکھتا تھا، عام مسلمانوں کی نظروں سے پس پردہ رہا اور خود علماء جو مسلمانوں کی کم سے کم مذہبی قیادت کا دعویٰ کرتے تھے، وہ بھی اسے محسوس نہ کر سکے۔ یہ کچھ فطری بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر زمانے میں نوجوان اپنے پیشرو بزرگوں پر الزام لگاتے ہیں کہ موجودہ خرابیاں ان کی کمزوری کا نتیجہ ہیں اور ٹھیک اسی طرح سے پیران کہن سال، نوجوانوں پر الزام لگاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے معاشرے کی خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اصل حقیقت کیا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے قانون کی تبدیلی، اس نظام کی تبدیلی جس پر مسلمانوں کو فخر رہا ہے، ہندوستان میں کچھ انگریزی حکومت کی حکمت عملی کے سبب ہے اور کچھ ہمارے پیشروؤں کی لاپروائی اور بے حسی کے باعث۔ بہرحال یہی غنیمت ہے کہ بالآخر مسلمانوں کو اپنے قانون کی حفاظت کا خیال پیدا ہو گیا۔ جو خرابیاں نظائر یا عجیب و غریب قسم کے رسوم اور رواجوں کی پابندی سے پیدا ہو گئی تھیں، ان کو مرکزی مقننہ کے ذریعے دور کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۳ء میں وقف کے متعلق قانون منظور کروایا گیا اور اب وقف علی الاولاد بھی، جسے پریوی کونسل نے تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا، امیر علی اور دیگر مسلمانوں کی کوششوں سے تسلیم کر لیا گیا۔

اس چیز سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب اسلامی قانون پر چاروں طرف سے ضرب پڑنے لگی اور سیاسی وجوہ سے مسلمان خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگے تو ایک بڑا ردِ عمل شروع ہو گیا۔ وہابی تحریک کا آغاز بھی اسی سے ہوتا ہے۔ اسماعیل شہید جیسے لوگوں کا منشا یہ تھا کہ شریعت قائم رہے۔ ابھی حال میں مسٹر جناح کی کوشش سے "شریعت اپلی کیشن ایکٹ" پاس ہوا اور وصیت اور تبنیت کو چھوڑ کر جملہ مسائل نکاح، وراثت، مہر، نفقہ وغیرہ میں شریعت کے لحاظ سے عمل شروع ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء کے اس قانون سے بعض خلاف شرع قوانین، جن میں بمبئی، مدراس، بنگال، آگرہ، آسام، پنجاب، یو۔ پی اور اجمیر کے قوانین شامل ہیں، منسوخ کر دئے گئے اور جملہ خلاف شرع رسم و رواج بھی منسوخ کئے گئے۔ گو اس قانون سے پوری اصلاح تو نہ ہو سکتی تھی لیکن بڑی اصلاح کی طرف اسے اچھا اقدام سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ وصیت تبنیت سے متعلق بھی شرع اسلام پر عمل کا امکان رکھا گیا ہے اور اگر کوئی خاندان ناظم ضلع کے پاس اپنے کو رجسٹر کروا لے کہ وہ

شریعت کا پابند رہے گا تو پھر وہ رواج سے بے نیاز ہو جائے گا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں اپنے اصلی قانون پر عود کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے خود ہندوؤں نے بھی اپنے قدیم قانون اور رسم و رواج کو چھوڑ کر نئے نئے قدم اٹھائے ہیں۔ نکاح بیوگان، بچوں کی شادی اور طلاق وغیرہ کے مسائل میں نئے مسودات منظور کرائے گئے ہیں جو یا تو اسلامی اثرات کے تحت ہیں یا انگریزی اثرات کا نتیجہ، گو یہ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ چیزیں ان کے ہاں موجود تھیں۔

حفیظ صدیقی

غزل

تقدیرِ عشق آہ و فغاں کے سوا ہے کیا؟ فرمائیے کہ آہ و فغاں ناروا ہے کیا؟

رنگینیٔ جہاں بھی ہے کس درجہ دل فریب اور وقت بے نیاز بھی سیماب پا ہے کیا؟

اے لطفِ ناتمام ترے لطف کے نثار جز درد حسرتِ دلِ درد آشنا ہے کیا؟

صیّاد، دام، کنج قفس، مرگِ بے کسی کس سے کہوں کہ معنیٔ حسن نوا ہے کیا؟

آنسو فسانہ، داغ ہے مہتاب، سانس زیست کیونکر کہوں کہ عشق کی نظروں میں کیا ہے کیا؟

پھر یاد آگئی مجھے گزری ہوئی بہار غم کے بغیر تحفۂ بادِ صبا ہے کیا؟

مجھ سے سہے نہ جائیں گے غم ہائے روزگار تیرا خیال اے دلِ درد آشنا ہے کیا؟

اے جانِ التفات! وفا کی نگاہ میں لطفِ روا ہے کیا؟ ستم ناروا ہے کیا؟

دل مجھ سے کہہ رہا ہے کہ تو یہ کی فکر کر ابرِ سیاہ میکدہ پر چھا گیا ہے کیا؟

میری حیات سجدۂ شکرِ کریم ہے انعام اس کا میری طلب کے سوا ہے کیا؟

تو مل گیا ہے جب تو کہاں پھر مرا وجود موجود جب کہ تو ہے تو پھر ماسوا ہے کیا؟

جامہ ہے تار تار کبھی دل ہے چاک چاک
فطرتؔ تمہارے دردِ جنوں کی دوا ہے کیا؟

ملک عبدالعزیز صدیقی فطرت

تقریب کچھ تو ....!

کسی جذباتی انسان کا خیال کوئی پھٹا پرانا کپڑا تو نہیں جو فوراً نکال کر پھینک دیا جا سکے ـــــ ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ایک خیال رہ رہ کر ذہن زنی کر رہا تھا! بات ہی کچھ ایسی تھی ـــــ

عتیق اپنی شادی کی سالگرہ پر مجھے بڑے ہی اصرار سے کھینچ لے گیا، یہ تقریب کچھ بڑے پیمانے پر نہ تھی بلکہ نجی طور پر اور چونکہ میں اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کی شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا، اس لئے خاص کر میری غیر حاضری کو بھلانے کے لئے دوستانہ طریقے پر ترتیب دی گئی تھی ع

تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے!

کھانے کی میز پر صرف عتیق، اس کی بیوی اور میں تھا۔ عتیق اپنی رفیقۂ حیات کی شدید محبت اور گہرے جذبات سے اس قدر مغلوب اور بے خود تھا جیسے کوئی رندِ بدمست! وہ حق بجانب تھا، اس کی بیوی کا رنگ روپ، شوخی رفتار و گفتار سب ایک کیف و سرور میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کھانے پر ادھر ادھر کی گفتگو کے دوران میں کچھ شعر و ادب کی بحث بھی چھڑ گئی ـــــ ادب کی حقیقت کیا ہے؟ اس میں شک نہیں یہ بالکل سرِ راہ تھی، لیکن عتیق نے سرور و کیف کے عالم میں اپنی بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ـــــ ایسی حسین رفیقہ کی معیت میں ادب کا معیار بتانا کون مشکل بات ہے؟ ـــــ اور پھر بڑے ہی کیف و سرور میں ڈوب کر وہ ادب کی تعریف کرنے لگا کسی جذباتی نوجوان کو موہ لینے کے لئے ایک دوشیزہ کون سے ہتھیار استعمال کرتی ہے؟ سادہ سی بات ہے شوخی، عشوہ و ناز حسنِ سحر انگیز، میٹھے بول اور بناؤ سنگھار! اسی طرح پڑھنے والوں کی دلچسپی کی خاطر شوخی، انوکھا پن، حسن اور تمثیل و تشبیہہ اور حسینِ الفاظ ہی ادب کی کنجی ہے! ـــ

عتیق نے یہ سب کچھ یوں ہی کہہ دیا اور بولتے بولتے کیف میں ڈوب گیا، مگر مجھے ایک تازیانہ سا لگ گیا، میں نے سوچا، آخر میں بھی تو بتا سکتا ہوں کہ ادب کی اصلیت کیا ہے؟ معیارِ ادب کیا ہے؟ ـــ

رات کے دس بج چکے، میں گھر آ گیا تھا، میری بیوی بچے جس سو چکی تھی، لیکن مجھے نیند نہ آنا تھی نہ آئی، ادب کی حقیقت کیا ہے؟ یہی ایک سوال شریر بچے کی طرح دماغ میں اچھل رہا تھا۔ میں نے بہت غور کیا، کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا، آخر کار میں اٹھا، لیمپ کی بتی بڑھائی اور بیوی کو جگا کر کہا ـــــ "میں ایک نہایت اہم موضوع پر لکھ رہا ہوں، ذرا تھوڑی سی چائے تو بنا دو، مگر دیکھو گڑبڑ نہ کرنا!"

میں نے الماری سے دس پانچ کتابیں نکالیں اور لکھنے بیٹھ گیا، مگر آج تو جیسے دماغ تھک گیا تھا، وہ قلم تو ایک اڑیل ٹٹو کی طرح ایک سطر بھی لکھنے سے انکار کر رہا تھا، وہ جھنجھلا گیا، کرسی کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں اور قلم کے ایک سرے سے سر کھجاتے ہوئے دماغ پر بار ڈالنے لگا، اتنے میں بیوی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی اور چائے کی پیالی میز پر رکھ کر بازو کے کمرے میں رونے والے بچے کو سمجھانے چلی گئی۔

ـــــ چائے سامنے رکھی تھی۔ اور میں بغیر چائے کے لکھ نہیں سکتا تھا ..... چائے ہی تو صرف مجھے کام کی توانائی بخشتی ہے اور چائے کے بخارات کے ساتھ میرے خیالات اٹھنے لگے۔

(۱) بہترین ادب دلی جذبات کی پکار ہے۔ اس پکار میں دنیا کے دکھ اور ناانصافیوں پر تڑپنے والی روح کا اضطراب ہوتا ہے، دنیا کے رنگ ڈھنگ پر کھل کھلانے والوں کا ترنم رہتا ہے، جرأت و مقاومت کا جوش ہوتا ہے، آج کل کے لکھنے والوں میں آہ اور واہ کی کمی نظر آتی ہے، وہ نہیں جانتے کہ حیاتِ انسانی کا وسیع علم ہی ادب کی کنجی ہے، یہی سبب ہے کہ موجودہ ادیب فضا میں لہرانے والے سماجی انقلاب کے جھنڈے تلے جمع ہونے کے بجائے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی جھنڈیاں لے کر ایک دوسرے سے لڑنے ہی میں مگن ہیں!

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد یہ خیال پسند نہ آیا اور
پھر ایک خیال سوجھا ـــــــ

(۲) گوناگوں رنگوں کے اتار چڑھاؤ سے مسرت حاصل
کرنے کی صلاحیت نہ ہو تو مصور کے حقیقی خیال سے واقفیت
ممکن نہیں، اسی طرح زندگی میں ہر گھڑی پیش آنے والے
واقعات اور زیر و بم کا صحیح اندازہ نہ ہو تو ادب کی حقیقت کا
پتہ نہیں چلتا، اور جو اس حقیقت سے ناواقف ہوتا ہے، اسے
لکھنے کی اس قدر جلدی ہوتی ہے کہ وہ ہر مہینے کسی نہ کسی
پرچے میں اپنی کہانی چھپی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے، آج کل تو
مختلف طبقوں اور گروہوں کی تصویریں پیش کی جا رہی ہیں،
مارکسی خیالات کے زیر اثر مزدوروں کی زندگی کو رنگ دیا
جا رہا ہے، بس اسی پر کچھ لکھ دینا چاہیئے یہی انسان کا
اصل مدعا ہوتا ہے۔

مدعا ہوتا ہے، تتلیوں کی طرح اس خیال سے اس
خیال پر اڑ بیٹھے، جاپانی پتلے کی طرح کسی پرانے خیال کو
از کار رفتہ سمجھ کر یا محض ہٹ دھرمی یا کھوکھلے انکار کی
بنیاد پر سپاہی کے ساتھ ترقی پسندی کا ناچ ناچنے والے
اردو کے نام نہاد ادیبوں کو ادب کی حقیقت کیا معلوم؟
اور جب تک اس سے واقف نہ ہوں ان کی تحریروں
کی قدر و قیمت ہی کیا ہے؟

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار
جو فلسفہ لکھا نہ گیا خونِ جگر سے

پہلے تو مجھے یہ خیال پسند آیا، لیکن نظر ثانی کے بعد
میرے مضمون کا لحاظ کرتے ہوئے قطعی ناموزوں معلوم
ہوا۔ اس کے بعد ہی ایک اور خیال ابھرا ـــــ

(۳) افسانوی ادب کو پیش کرنے والے غیروں کے
بنائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں، انھیں لارنس، شکسپیر
ابسن مرغوب ہیں لیکن نذیر احمد، آغا حشر، کالیداس، سرشار
سجاد حیدر پسند نہیں۔ غیروں کے بنائے ہوئے اصولوں
اور تفسیروں کے سہارے پلنے والے ادب سے حقیقی تشفی
ممکن نہیں۔ اور دوں کے خیالات و افکار کو پیش کرنے کے
بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لے کر غور و فکر کرنا ہی اصل معیار
فن ہے۔ اگر ایسی ہی مشقت اور جگر کاوی کی جائے تو کئی
اقبال، غالب، حالی اور نذیر احمد پیدا ہو سکتے ہیں، ابھی
تک ہمارے نئے لکھنے والوں کو ادب کی کنجی نہیں ملی، جس کی
وجہ سے ادب کی بظاہر ترقی ہو رہی ہے اور سیلاب امڈا چلا
چلا جا رہا ہے لیکن یہ سب بلبلوں اور شر و خس سے زیادہ
نہیں ہے ع یہ شرارے کا تبسم، یہ خس آتش سوار!

میں نے کافی غور کیا مگر ادب کا اصل امتیاز میری
سمجھ میں نہ آیا، کوئی قطعی فیصلہ نہ کر سکا آخر کار میں نے
سوچا حالی، آزاد اور نیاز جیسے چند ادیبوں کے خیالات
کا مطالعہ کرنے کے بعد شاید کوئی خیال سوجھے، چنانچہ
ان کی چند تحریروں کو جستہ جستہ پڑھنے کے بعد ایک
نظریہ سوجھا ـــــ

(۴) آج کل افسانوی ادب نے ایک ہل چل مچا دی ہے،
ادب اور افسانوی ادب میں کوئی فرق ہی باقی نہ رہا، ادب
کے نام کے ساتھ ہی افسانوی ادب کا تخیل پیدا ہو جاتا ہے،
وجہ یہ ہے کہ نوجوان نسل کے دماغ میں ادب کے معنی صرف
افسانوی ادب کا تصور ـــــ نہیں غلط فہمی ـــــ
رچ گیا ہے۔ در اصل ہم جسے افسانوی ادب کہتے ہیں وہ
ادب کی ایک شاخ ہے، ادب کے معنی اس قدر وسیع ہیں کہ
انسانی دل و دماغ کو جن باتوں سے جولانی، امنگ، جوش
اور مسرت حاصل ہوتی ہے وہ سب ادب ہے، وہ تحریکات
ہیں جن سے دل کے تار بجتے اور ذوقِ صحیح وجد کرتا ہے۔
اور اس ادب کی کنجی مطالعہ کی وسعت، تخیل کی گہرائی
اور مشاہدہ اور تجربے کی صداقت ہے۔ اس اہم امتیاز
سے عدم واقفیت کی بنا پر آج کے ادب میں ـــــ
خصوصاً افسانوی ادب میں اوچھاپن، سطحیت اور جذبات
نے قبضہ کر لیا ہے ـــــ اور فن بے روح اور
فطرت و ماحول کی نقالی ہو گیا ہے۔

اس کے بعد نئے لکھنے والوں میں اختر رائے پوری احتشام حسین اور دوسرے چند ادیبوں کی دو ایک کتابیں دیکھنے کے بعد خیال آیا ــــــــــ

(۵) فن صرف فن کے لئے نہیں بلکہ زندگی کے لئے ہے، "فن برائے فن" کی اصطلاح میں آج تک نہ سمجھ سکا اور نہ آئندہ سمجھنے کا کوئی امکان ہے۔ درحقیقت "ادب برائے ادب" ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ رقص برائے رقص، گانا برائے گانا، تصویر برائے تصویر، تماشا برائے تماشا، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جیسے "حماقت برائے حماقت"!

فن ایک انسانی عمل ہے، انسان کا کوئی عمل بغیر مقصد اور افادیت کے ممکن نہیں، زندگی کی راہ پر چلتے ہوئے انسان کو اچھے اور برے ہر قسم کے تجربات ہوتے ہیں۔ کسی نہ کسی قسم کی آرزوئیں اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی تمناؤں کی مخالفت ہوتی ہے اور اس کے دل و دماغ میں جوالا پھٹ پڑتا ہے اور اس کے مختلف بہاؤ ہوتے ہیں، انسانی جذبات کبھی شاعری کی راہ سے بہنے لگتے ہیں اور کبھی رقص و سرود، کبھی مصوری اور کبھی بت تراشی اور کبھی نثر میں! ــــــــ جس زندگی میں پیچ و خم ہے، روشنی اور اندھیرا ہے اس کا کھلاڑی ایک سیدھی راہ پر کیسے چل سکتا ہے، سچا فن کار اپنے کرداروں کو زندگی کے اسی اتار چڑھاؤ کے ساتھ چلاتا ہے اور یہی امر بن جاتے ہیں، انسان خدا اور جانور کے درمیان کی ایک چیز ہے۔ اس کی زندگی میں ایک طوفان اور تلاطم کا نمایاں ہونا ضروری ہے، یہ اور بات ہے کہ دبے ہوئے میلانات ابھرنے کے لئے حالات کی سازگاری کے محتاج ہوتے ہیں۔ ایسی تحریریں جن میں عوام کے جذبات و احساسات کو پیش کیا جائے اور ان میں ایسی قوت ہو کہ ہم اونگھنے کے بجائے جاگنے لگیں، بےخودی کے بجائے ہشیاری طاری ہو جائے اور ان میں حیات بخشی کی قابلیت ہو ترقی پسندی کے نام سے منسوب کی جا رہی ہیں۔

لیکن سنہ ۱۹۲۰ء کے بعد یا اس وقت کے ادب کا سارا رس اس میں دکھائی نہیں دیتا، اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ آج کے لکھنے والے ادب کی اہم خصوصیت سے ناواقف ہیں۔ وہ یا تو صرف داخلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں اور ساری دنیا کو "حلقۂ دام خیال" بنا کر پیش کرتے ہیں یا پھر سطح پر تیرنے والے خس و خاشاک کو جمع کرنا شروع کر دیتے ہیں، وہ ابھی ناتجربہ کار ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ زندگی کی تصویر کے لئے کیمرہ لئے کھڑے ہیں مگر ان کی سہل انگاری شہرت پسندی یا پھر کوئی اور وجہ ہے کہ کیمرے کا فوکس ذرا ہل جاتا ہے اور زندگی کی صحیح تصویر ان کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ مشاہدوں اور تجربوں سے ان کے دلوں میں گداز نہیں پیدا ہوا، فن اور رنگینی تو ہے مگر ادب میں روح نہیں، زندگی ہے اور نہ بلند مقصد!

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عین حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی!

اقبال کے نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک اور خیال نے میرے دل میں جنم لیا ــــــــ

(۶) آج کل ادب میں انسان کی فطری کمزوریوں سے کھیلنے اور دل و دماغ کو ہوس و جذبات کی تحریص دلانے والے ناول، عریانی اور بوالہوسی سے آراستہ افسانے اور معشوق کی زلف و کمر سے مزین شاعری میں اضافہ ہو رہا ہے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اس میں شک نہیں کہ حسن و عشق کے بغیر لوچ اور کشش باقی نہ رہے گی، ادب خشک اور بے رس ہو جائے گا، پھر بھی دنیا کی اٹل اور کھلی حقیقتوں کو "خال رخ یار" اور "زلف پیچاں" اور "وصل کی راحتوں" میں بھلا دینا قرین دانشمندی نہیں ہے، پند و نصیحت سے

انسان حقیقت کو نہیں بھول سکتا۔ آرٹ میں جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں، کیونکہ ادب کا جسم فنی ہے لیکن اس کی روح بالکل سماجی ہے۔ اس لئے بدلتے ہوئے رجحانات کا خیال کرتے ہوئے اب ہمیں قوم کو "عشق و عاشقی" کے بھنور میں دیکھنا نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں کو پیدا کرنا ہے جن کے جسم فولادی ہوں اور ان کی رگوں میں تیل اور پانی کے بجائے رواں دواں گرم خون ہو ــــ جسے وقتِ ضرورت گرایا بھی جاسکے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ادیبوں کے دلوں میں گداز پیدا ہوجائے۔ وہ قوم کی تکلیفوں، دکھ درد کو اسی طرح محسوس کریں جیسے ہماری قوم محسوس کرتی ہے، خلوص و صداقت ہو۔ ادیب اپنے سفینۂ حیات کو زندگی کی ہیجانی لہروں پر سے کھیتا ہے۔ برخلاف اس کے ادھورے جذبات اور کھوکھلے تجربات کے سہارے جو چیز لکھی جائے گی وہ صرف فطرت و ماحول کی نقالی ہوگی اور بالکل بے روح ؎ نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر

آج کے ادیب ــــ چاہے وہ ترقی پسند ہوں، رجعت پسند ہوں خواہ کوئی اور پسند ــــ ادب کی امتیازی خصوصیات سے لاعلم ہیں، یہی سبب ہے کہ اس دور میں ایسی مضحکہ خیز اور حیرت انگیز چیزیں پھیلتی جارہی ہیں، ادب میں فن کاری کو اہمیت حاصل ہے پھر بھی حرکت اور زندگی اس سے زیادہ اہم ہیں، فن زندگی کے تابع ہے، زندگی فن کی محتاج نہیں ہے، جیسے یہ معلوم ہوجائے وہ ادب کے لازوال خزانے پر قابض ہوسکتا ہے اور جب ہمارے ادیب ان چیزوں سے واقف ہوجائیں گے تب ہی ہمارا ادب اپنی تابندگی سے دنیا کو خیرہ کرسکتا ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

ان چھے مختلف نظریوں کے بعد میں نے کچھ قدیم فارسی اور عربی کتابوں کو الٹا اور چند انگریزی کتابیں بھی نکالیں، عربی، فارسی کے تذکرے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا۔

(۷) ادب میں گہرائی، رس، صنائع بدائع اور کیف کا وجود خود ادب کا امتیاز ہے۔

ان ساتوں مختلف خیالات کو میں نے خوب اچھی طرح پڑھ لیا، مجھے محسوس ہوا ــــ سورج کی تیز، صاف اور شفاف روشنی سات رنگوں پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ترشح کے وقت افق پر قوس قزح اپنے سات رنگوں کو پیش کرتی ہے، کیا عجب ہے کہ یہ سات رنگ بھی ایک قوس قزح ہی ہوں؟ آخر اس کا کونسا رنگ میرے کام آسکتا ہے، مجھے کس خیال سے اتفاق کرنا چاہئے ــــ

میں نے بے حد سوچا، خوب پڑھا، غور کیا، کتابوں میں یہ پڑھا ہے کہ سورج کی روشنی سات مختلف رنگوں کا نتیجہ ہے، یہ پڑھ لینا اور اصولوں کو یاد کرلینا تو بہت آسان ہے، لیکن سات رنگوں سے ایک رنگ پیدا کرنا بہت مشکل ہے ہے نا؟

میں بوکھلا اٹھا، میں نے ان ساتوں اصولوں کو کئی مرتبہ پڑھا اور انھیں ایک دوسرے میں سمو دینے کی بے حد کوشش کی، لیکن پھر بھی کسی ایک سفید رنگ کے حاصل ہونے کی توقع نظر نہ آئی!

گھڑی نے رات کے دو بجا دئے۔ معمہ حل کرنے والے کو حل نہیں سوجھتا ہے تو وہ گھبرا کر کاغذ اور قلم پھینک دیتا ہے، یہی کیفیت میری بھی تھی، میں نے اسے ویسے ہی میز پر ڈال دیا اور لیمپ گل کرکے سو رہا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں کافی روشنی پھیل چکی تھی اور گھڑی آٹھ بجا رہی تھی، جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور باورچی خانے میں گھس گیا، رضیہ بیٹھی کچھ پکا رہی تھی۔ ناشتہ کھاتے ہوئے اس نے پوچھا ــــ کچھ پتہ چلا ادب کی حقیقت کا؟

میں نے اسے رات کے سارے ذہنی انتشار اور قلبی ہیجان کی روداد سنائی۔

وہ کہنے لگی ــــ "صبح اٹھتے ہی میں نے آپ کے سارے خیالات دیکھے

اور میں نے ان سب کے نیچے اپنا خیال بھی لکھ دیا" ———
اور وہ پڑھ کر سنانے لگی ———

——— ادب کی حقیقت اور غایت کے تعین سے پہلے ہر ادیب کو انسانی زندگی کی وسیع مملکت میں قدم رکھنا چاہئے زندگی کو زندگی ہی سے سیکھنا چاہئے۔ اسے ہر قسم کی معلومات ہوں، غیروں کی بنائی ہوئی پگڈنڈیوں پر چلنے کے بجائے اپنے ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے اپنی طاقت و توانائی کا اندازہ کرکے اپنی راہ آپ بنانا چاہئے، مطالعہ و مشاہدہ اور تفکر کی گہرائی ضروری ہے!

ہمارے داخلی جذبات کو اجاگر کرکے ان میں ایک الہامی تاثر پیدا کرنے کی صلاحیت ہونا چاہئے، فن کاری سے زیادہ آفاقی اصولوں پر نظر رکھنی چاہئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے لئے ادب پیدا کیا جا رہا ہے ان سے ادیبوں کو انس ہمدردی اور دلی تعلق ہو، اور یہی ادب کا امتیاز ہے!۔

ادیب کو انسانی زندگی کا پورا پورا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ سماج کی اصلاح ہو جائے، سماج انتہا بلندی کو پہنچ جائے اور ادیبوں کے دلوں میں ایک اضطراب سا پیدا ہو جائے، ادیبوں کو اسی وقت حقیقت کا پتہ چلے گا جب کہ خود اُن کے دلوں میں ایک بے چینی اور آگ سی پیدا ہو جائے، غیروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو چھوڑ کر اپنا لقمہ اسی وقت بنا سکیں گے جب کہ انھیں اپنے اطراف پھیلی ہوئی سماج اور ماحول سے دلی تعلق پیدا ہو۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جس وقت سماج میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے تو ایسے وقت ادیب کے دل میں ایک عجیب رسہ کشی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ یکایک مطالعہ کرنے لگتا ہے اور خود بخود اس کے خیالات و افکار میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور داخلی جذبات کے زیر و بم سے غیر ارادی طور پر وہ فن کی تخلیق کرتا ہے، بسنت رُت میں جس طرح درختوں میں نئی کونپلیں اور نئی نئی پتیاں آتی ہیں اسی طرح فن میں بھی نئی نئی شاخیں نکل آتی ہیں، اس وقت سماج ایک اہم قوت اور سماجی اصلاح ہی ہمہ گیر اصول بن کر اس کے فن میں ظاہر ہونے لگتا ہے، اختر حسین، حیات اللہ، بیدی، اختر انصاری، ندیم قاسمی، ممتاز مفتی کی تحریروں میں حیرت انگیز فنی خوبیاں نہیں ہیں پھر بھی ان کے دلوں کی انتہائی گہرائی میں عوام کی فلاح و بہبود کا ایک اضطراب ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ اُن ادیبوں سے جو صرف فن ہی کو اصل سمجھے ہوئے ہیں زیادہ مقبول ہو رہے ہیں ———

آج کل اوچھا پن، عریانی اور جنسیات سے معمور ادب خس و خاشاک کی طرح بہہ رہا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ لکھنے والے عوام کے خلوص و محبت اور صداقت پر خود غرضی کو ترجیح دے رہے ہیں، اس قسم کے پہاڑی نالے کی طرح تیز دوڑنے والے ادب میں سمندر کی سی گہرائی، سکون اور زندگی کیونکر رہ سکتی ہے؟ اپنے دل، شعور اور دماغ میں انتہائی اضطراب، ہمدردی، احساس اور محبت رکھنے والا ادیب اس طرح لکھے گا کہ اس کی تحریر کا ہر صفحہ، ہر سطر اور ہر جملہ اور ہر لفظ زندگی میں ڈوبا ہوا ہوگا۔ کیونکہ فن کار بحرِ حیات کی طوفانی موجوں اور گرداب سے اپنی کشتئ دل کو لے جاتا ہے، بعض حیرت انگیز قوتوں کے ساتھ وہ محبت و نفرت، ایثار و خود غرضی کی مخالف لہروں پر چھوڑ دیا گیا ہے، اسی لئے انسانی زندگی میں قدم قدم پر کشمکش ہے، اضطراب ہے، لڑائی ہے اور طوفان ہے اور یہی معیارِ فن ہے! ع

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے

ورنہ چند جملے لکھ لینا یا چند شعر موزوں کر لینا، ادیب اور شاعر ہونے کے لئے کافی نہیں ع

جس پاس عصا ہو اسے موسیٰ نہیں کہتے
ہر ہاتھ کو عاقل یدِ بیضا نہیں کہتے

برجیس کے خیالات سننے کے بعد مجھے محسوس ہوا ——— میں ان سات رنگوں سے ایک رنگ حاصل نہ کر سکا لیکن

برجیس نے اسے پالیا — واقعیٔ اپنی بڑائی کی خاطر لکھنے کے بجائے سماج کی فلاح اور بہبود کے لئے لکھنا اور لکھنے والے کے دل میں سماج سے انتہائی محبت اور خلوص کا وجود ہی ادب کی کنجی ہے — اور حقیقت ہے کہ جب دل میں گداز نہ پیدا ہو تو فن بے روح ہو جاتا ہے، اگر صرف خارجیت ہی ہو تو "دیدۂ بینا" کی بجائے "لڑکوں کا کھیل" ہی تو رہ جائے گا ———

اور مجھے اپنی رفیقۂ حیات پر فخر سا محسوس ہونے لگا، عتیق کی بیوی کے حسن جمال اور نسوانیت کے دلفریب خط وخال نے میرے اندر جو احساس کمتری پیدا کر دیا تھا وہ برجیس کی اس معنوی خوبی سے کالعدم ہو گیا۔

میں نے سوچا کہ میری بیوی عتیق کی رفیقۂ حیات کی طرح شکیل وجمیل اور حسن دلآویز کا مجسمہ نہیں ہے، اس کی سی شوخی، چنچل پن اس میں نہیں ہے لیکن اس کی فطرت اور ذہانت اس قدر بلند ہے کہ پھر کسی خیال کی تمنا نہیں رہتی۔ اس سے پہلے بارہا اس نے اپنی فطرت اور سیرت کے محاسن سے مجھے متاثر کیا تھا اور آج تو ایسا محسوس ہوا کہ حسین اور شوخ عورت آنکھوں کے لئے نور وسرور ہو سکتی ہے لیکن رفیقۂ حیات نہیں! اور خارجی خوبیوں سے زیادہ داخلی محاسن رکھنے والی عورت طوفانِ حیات میں ایک اٹل مونس وغمخوار اور حقیقی دوست بن سکتی ہے! ———

شاہین فاروقی

نور باغ کے گنبد

جس طرح چتنبر داس کے مٹے (اکھیت اکے گنبد، ہفت گنبد سے جانب جنوب واقع ہیں اسی طرح بیجا پوری مسجد و مقبرے کے سامنے کے یہ تینوں گنبد جو اب نور باغ کے احاطے میں آگئے ہیں، ہفت گنبد سے دو ایک فرلانگ کے فاصلے پر جانب شمال واقع ہیں اور اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان میں ایک گنبد چھوٹا ہے اور دو بڑے۔

چھوٹا گنبد اس کا ہر ضلع اندر سے ۱۹ فٹ ۲ انچ اور باہر سے ۲۶ فٹ ۷ انچ ہے۔ اندر سے قبہ اور دیواروں کی ساری گچ جھڑ گئی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں کا بھی یہی حال ہے۔ صرف مشرقی کمان کی گچ باقی ہے اور اس کے دونوں ڈھال نما پھول بھی رہ گئے ہیں۔ سوائے ان پھولوں کے اس پر کسی قسم کا نقش ونگار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام کمانیں اور نیم محرابیں بالکل بے نقش اور سادہ ہوں گی۔ اس کی بائیں طرف کے نیم محراب پر بھی ایک ڈھال نما پھول رہ گیا ہے اسی طرح جنوبی کمان کے اوپر کے آدھے حصے پر گچ اور ایک ڈھال نما پھول باقی ہے۔ مغرب رویہ محراب پر بھی ذرا سا نقش ہے جو بہت معمولی ہے اور دو ڈھال نما پھول ہیں۔ یہ تمام پھول چھوٹے چھوٹے اور بہت معمولی ہیں۔ قبہ بھی بالکل سادہ ہے سوائے لوح نما کنگروں کے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گنبد دورِ اول کے ابتدائی حصے کا ہے اس لئے کہ اس کی کمانوں کا طرز اسی دور کا ہے۔ مغربی محراب کے سیدھے بازو ایک بہت ہی چھوٹا سا طاقچہ گچ کا بنا ہوا ہے۔ کیا عجب ہے کہ گنبدوں میں طاقچہ کی ابتداء اسی سے ہوئی ہو۔

یوں تو کہنگی کی وجہ سے پورے گنبد ہی کی حالت خستہ ہے مگر قبہ کی حالت تو اور بھی بری ہے، بیچ میں اور اطراف میں کئی سوراخ پڑ گئے ہیں باوجود اس کے اوپر کی استرکاری جوں کی توں باقی ہے اور چونکہ نہ اب تک کبھی اس کی داغ دوزی ہوئی ہے اور نہ کبھی آہک پاشی کی نوبت آئی ہے اس لئے صدیوں کی بارش اور گرد و غبار سے اس کا رنگ اتنا سیاہ ہو گیا ہے جس سے ہم اس کی قدامت کا اندازہ کر سکتے اور اگر کوئی پیمانہ ایجاد ہو تو اس سے صدیوں کا تعین بھی کر سکتے ہیں۔ گلبرگہ میں اس وقت اس سے زیادہ سیاہ کوئی قبہ نہیں ہے اور اسی وجہ سے دور اول کے قبہ کو ہم اصلی حالت میں دیکھ رہے ہیں۔ وضع قطع میں یہ ایسا ہی ہے جیسے حید ر باؤلی کے گنبد کا قبہ۔ وہ بڑا ہے اور یہ چھوٹا۔ اس گنبد کی دیواریں سلامی ہیں اور اس کی سیدھی۔ دور اول کے گنبدوں میں یہ گنبد سب سے چھوٹا ہے۔

گنبد کا چبوترہ جانب مشرق ۷ فٹ بلند ہے۔ اس کی اس بلندی کو خوبصورت اور کارآمد بنانے کے لئے اس کے نیچے تین پختہ کمانیں تہ خانہ کے شکل کی بنا دی ہیں اگر ان پر دروازے لگا دئے جائیں تو چھوٹے چھوٹے کمروں یا کوٹھوں کا کام دے سکتے ہیں۔

بڑا گنبد اس چھوٹے گنبد سے جانب مغرب، تقریباً ۸۳ فٹ کے فاصلہ پر ایک بڑا عالی شان گنبد ہے جس کا ہر ضلع اندر سے ۳۴ فٹ چار انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ہے۔ اندر و باہر کی اکثر گچ جھڑ گئی ہے اور گنبد خستہ حالت میں ہے۔ علاوہ ازیں وہ نقش ونگار سے بالکل خالی ہے۔ کمانوں اور نیم محرابوں پر صرف ایک ہلال نما بیل دوڑا دی گئی ہے البتہ مغرب رویہ محراب پر اس سے مختلف دوسری قسم کی خوش نما بیل ہے اور سیدھی طرف ایک طاقچہ ہے۔ اس نہایت مختصر گلکاری کے ساتھ ہر ایک پر مختلف نقش کے دو دو ڈھال نما پھول بنے ہوئے ہیں۔ باہر کی طرف بھی کمانوں پر ایسے ہی پھول بنے ہوئے ہیں۔ مغربی محراب پر ہلالی کنگرے بھی تھے جو سب کے سب جھڑ گئے۔

ان کی کچھ علامتیں بائیں جانب باقی رہ گئی ہیں۔ ان ہلالوں کی دو حالتیں ہیں، کہیں تو ان کے جھڑ جانے سے کمان پر کچھ اثر نہیں پڑتا صحیح سالم رہتی ہے جیسے ہیکل باؤلی کے گنبد کی کمانیں اور کہیں ان کے جھڑ جانے سے کمان شکستہ ہو جاتی ہے جیسے زیر بحث گنبد میں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں ہلال، کمان بننے کے بعد بنائے جاتے ہیں اس لئے وہ پوری طرح پیوست نہیں ہوتے اور دوسری صورت میں کمان کے ساتھ ساتھ اسی میں ہلال تراشے جاتے ہیں۔ مغربی محراب کی گولائی میں نہ تو کوئی پھول ہے اور نہ اس کے گوشوں میں آرائشی ستون ہیں اور نہ ستونوں کے درمیان کوئی ابھری ہوئی کمان ہے اور نہ کلام شریف کی آیتیں تحریر ہیں۔ کمانوں کے پاکھے لٹکے ہوئے، نیچے سے پھیلے ہوئے اور بے ڈول سے ہیں بالکل ایسے جیسے مجاہد شاہ کے گنبد کے۔ ان تمام باتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ دور اول کے کے ابتدائی حصے میں بنا ہوگا۔ اس دور کی کمانوں کو اصلی حالت میں دیکھنا ہو تو اس گنبد میں دیکھنا چاہئے۔ مزید براں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہلالوں کا استعمال اس قدر عام اور مقبول تھا کہ دور اول کے ابتدائی حصے میں بھی جب کہ دوسری آرائشوں کی ابھی ابتدا نہیں ہوئی تھی ان کا استعمال کہیں کہیں ہوتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی طرح خونزہ ماں صاحبہ کے گنبد میں بھی ان کا استعمال ہوا ہے اس گنبد کا قبہ بھی اندر سے بالکل سادہ ہے صرف کتاب نما کنگرے اطراف میں ہیں۔ ممکن ہے بیچ میں گول پھول بھی ہو مگر اب وہاں کی تمام گچ ہی جھڑ گئی ہے۔ اوپر سے قبہ چپٹا ہے اور اتنا خوبصورت نہیں ہے جتنا کہ ہیکل باؤلی کے گنبد کا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دور اول میں دونوں قسم کے قبے استعمال ہوتے رہے، ابھرے ہوئے اونچے اور چپٹے پست ان دونوں کی مثالیں یہاں اس چھوٹے بڑے گنبد میں موجود ہیں۔

دوسرا بڑا گنبد مذکورۂ بالا بڑے گنبد سے جانب شمال تقریباً ۴۶ فٹ کے فاصلہ پر ایک اور اتنا ہی بڑا گنبد ہے۔ اس کا ہر ضلع اندر سے ۳۳ فٹ ۲ انچ اور باہر سے ۴۹ فٹ ۵ انچ ہے۔ اس کی کمانیں اور نیم محرابیں فیروز شاہی طرز کی ہیں۔ دور اول اور دور ثانی دونوں کے نمونے یہاں آمنے سامنے موجود ہیں۔ اندر ہر طرف مچان باندھنے کے سوراخوں سے اور ویسے بھی دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیواروں اور کمانوں کی استرکاری نہیں ہوسکی ہے اس لئے استرکاری سے پہلے کی حالت دیکھنی ہو تو ہم یہاں اس کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اس گنبد میں اب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مغربی کمان کے ہر دو طرف دو بڑے طاق ہیں۔ پورے قبہ میں کمانوں اور نیم محرابوں کے اوپر اوپر تک استرکاری ہو چکی ہے اور وہ اب بھی موجود ہے چنانچہ سب سے پہلے ہر کمان اور نیم محراب پر گچ میں خوش نما طاق بنے ہوئے ہیں، ایسے آٹھ طاق ہیں۔ ان کے اوپر لوح نما کنگروں کا حلقہ پڑا ہوا ہے۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک منقش پتلا سا حلقہ ہے، اس حلقے پر چار منقش چھوٹے چھوٹے پان ہیں اور ہر دو پانوں کے درمیان ایک گول پھول، اس کے اوپر کچھ فاصلے سے بیچوں بیچ ایک گول پھول ہے جس کا اکثر حصہ جھڑ گیا ہے۔ یہ تمام نقوش بہت معمولی اور ادنیٰ قسم کے ہیں۔

باہر تمام گنبد پر قبہ سے لے کر دیواروں تک استرکاری ہو چکی ہے مگر اکثر جھڑ گئی ہے۔ ہر کمان پر دو دو ڈھال نما پھول باقی ہیں۔

میر جہانگیر علی خاں

ضروری اطلاع:- نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم خریدار اصحاب نئے سال کا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کر کے عنایت فرمائیں۔ اضلاع کے خریدار بذریعہ منی آرڈر بھیج دیں یا وی۔ پی کرنے کے لئے دفتر کو آرڈر روانہ فرمائیں۔

علم جرثومیات کا امام ـــــ پاسچر

لوئی پاسچر ۱۸۲۲ء میں پیدا ہوا۔ پاسچر کا باپ نپولین کی فوج کا ایک سپاہی تھا جس نے بعد میں ایک چھوٹے سے فرانسیسی قصبے میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور چمڑوں کی دباغت کا کام کرنے لگا۔ پاسچر کی ابتدائی زندگی نہایت ہی سادہ رہی اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حالیہ سائنس کا یہ جدید حکیم اپنی نوعمری میں بھی اتنا ہی ذہین ہوگا وہ یہ سن کر متعجب ہوں گے کہ اپنے مکتب کے زمانہ میں وہ ایک متوسط درجہ کا طالب علم تھا۔

۱۸۴۰ء میں پاسچر نے طلبان کی ڈگری حاصل کی، اس کے تین ممتحنوں نے جوابی پرچوں کے دیکھنے کے بعد اس کے متعلق یہ نوٹ لکھا۔

"یونانی، لاطینی، فن خطابت، طب، تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ میں بہتر، ابتدائی سائنس میں بہترین، فرانسیسی مضمون نویسی میں بہتر"

۱۸۴۳ء میں وہ ایک ایسے ادارے (Ecole Normale) میں داخل ہوا جہاں پروفیسروں کی ٹریننگ کا انتظام تھا اور یہیں اس نے ٹارٹیرک اور پارا ٹارٹرک ترشوں کے قلموں کا مطالعہ کیا گویا یہ اس کے پہلے سائنٹفک تجربے تھے۔

۱۸۴۴ء میں ایک السانسی دوافروش کسٹنر نے ٹارٹرک ترشے کی تیاری کے دوران میں محض اتفاق سے ایک ایسا ترشہ حاصل کیا تھا جسے وہ دوبارہ باوجود کوشش کے تیار نہ کرسکا۔ گے لوسک نے اس عجیب و غریب ترشے کا امتحان کرکے اس کا نام رسمک ترشہ تجویز کیا، لیکن برزی لیس نے یہ رائے دی کہ اسے پارا ٹارٹرک ترشہ کہنا چاہئے، بہرحال پاسچر کے تجربوں سے اس نامعلوم الاصل مرکب کی ساخت واضح ہوگئی۔ اس نے اس ترشے کی دو شکلیں تمیز کیں یعنی ایک وہ جو انگور کے ٹارٹرک ترشے سے مماثل ہے اور جسے عام زبان میں دست راست کا ترشہ اور دوسرا وہ جسے دست چپ کا ترشہ کہنا چاہئے۔ یہ مشاہدہ دراصل اس اہم علم کا سنگ بنیاد ہے جو بیس سال بعد مجسمی کیمیا کے نام سے ایک مستقل حیثیت کا مالک ہوا۔

گریجویٹ ہونے کے بعد پاسچر سٹراس برگ بھیج دیا گیا جہاں اس نے اکادمی کے رکٹر کی لڑکی ماری لارین سے شادی کرلی۔ ۱۸۵۴ء میں وہ لل کی نئی سائنس فیاکلٹی کا ڈین اور پروفیسر ہوگیا اور بہت جلد ہی اس کی جماعت علم کیمیا کی تعلیم کے لئے مشہور ہوگئی۔ اس کے دو سال بعد ہی یعنی ۱۸۵۶ء میں لل کے ایک شراب کے کارخانہ کا مالک نوجوان ڈین کے پاس مشورہ اور امداد کے لئے دوڑتا ہوا آیا۔ اس شخص کو جو چقندر سے الکحل تیار کرنا چاہتا تھا، اپنی اس کوشش میں سخت ناکامی ہوئی تھی۔ پاسچر نے یہ دیکھ کر کہ یہ موقع تخمیر کے مطالعہ کے لئے سودمند ثابت ہوگا فوراً اس کی امداد کے لئے راضی ہوگیا۔

اس نے تخمیر کا باضابطہ مطالعہ شروع کیا اور اپنے تجربوں میں خاص طور پر دودھ کی کھٹاس پر نظر رکھی جسے سائنٹفک زبان میں لیاکٹک تخمیر کہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ پھٹے ہوئے دودھ میں ایک خاکستری رنگ کی شئے کے اندر نہایت مہین مہین دانے مرتب تھے جن کی جسامت الیسٹ سے بھی چھوٹی تھی اور وہ دیگر بیوٹرک حاصلات سے اس قدر مشابہ تھے کہ اب تک دوسرے کیمیا دانوں اور ماہرین حیاتیات کی نظریں ان پر نہ پڑ سکی تھیں۔

جب اس خاکستری شئے کو علحدہ کرکے اس کی نہایت قلیل مقدار تازہ دودھ میں شریک کی گئی تو پاسچر نے دیکھا کہ لیاکٹک تخمیر کی مخصوص علامتیں نمودار ہوگئیں، لہذا معلوم ہوا کہ یہ خاکستری شئے دراصل ایک خامرہ ہے۔

اس دوران میں پاسچر پیرس آگیا جہاں (Ecole Normale) میں سائنٹفک تحقیقات کا کام اس کے سپرد کردیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی سے قبل ہی سائنٹفک دنیا میں زندہ اجسام کی از خود پیدائش کا نظریہ اپنی اہمیت تقریباً کھو چکا تھا، لیکن اس زمانہ میں خوردبین کی ایجاد کے ساتھ ساتھ ہی بظاہر اس کی موافقت میں نئی نئی دلیلیں مہیا ہونے لگیں۔

مثلاً بارش کے پانی اور دوسری نامیاتی مائعات میں جو ہوا میں کھلے رکھے جائیں نہایت ہی چھوٹی چھوٹی جسامت کے جاندار رونما ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نظریہ از خود پیدائش کی موافقت میں یہ حجت پیش کی جاتی تھی کہ اگر یہ جاندار خود بخود پیدا نہیں ہوئے تو پھر کہاں سے آئے؟۔

دسمبر ۱۸۵۸ء میں موسیو پوشے نے سائنس اکادمی میں ایک مقالہ روانہ کیا جس کا عنوان تھا "مصنوعی ہوا اور آکسیجن میں نباتی اور حیوانی عضویوں کی از خود پیدائش" اس سائنسداں نے یہ بیان کیا کہ اس نے اپنے تجربوں میں غلطی کے امکانات کے سدباب کی خاص کوششیں ملحوظ رکھی تھیں اور یہ بلند آہنگ دعویٰ بھی کیا کہ وہ ہوا اور آکسیجن سے معرا فضا میں جانداروں کی از خود پیدائش کو دکھلا سکتا ہے۔

ابھی سائنسداں اس مسئلہ پر بحث کر ہی رہے تھے کہ پاسچر نے خوردبین کے ذریعہ فضائی ہوا کا مطالعہ شروع کر دیا، اسکا خیال تھا کہ اگر ہوا میں جراثیم موجود ہوتے ہیں تو انھیں روکا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک نلی میں سے جس کے ایک سرے پر شیشہ روئی کا ڈاٹ لگا دیا گیا تھا ہوا گزاری گئی تو شیشہ روئی پر جمنے والی گرد میں کئی جراثیم موجود تھے، اس کے بعد اس نے مسلسل تجربے کئے اور یہ دکھلانے کی کوشش کی کہ اگر کوئی نامیاتی مائع، فضائی ہوا کی دسترس سے دور رکھا جا سکے تو وہ عرصۂ لامتناہی تک خالص رہ سکتا ہے۔

پانچویں مارچ ۱۸۶۰ء میں وہ لکھتا ہے کہ "جتنے تجربے میں نے اس وقت تک کئے ہیں اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نامیاتی مائعات میں عضویوں کی پیدائش کی علت خالص فضائی ہوا کی گرد ہوا کرتی ہے"۔

اس کے بعد پاسچر نے پھر سے تخمیر کا مطالعہ شروع کیا اور اس سلسلے میں لیاکٹک تخمیر کے مشاہدہ کے دوران میں وہ ایک اور تخمیر سے دوچار ہوا جسے بیوٹرک تخمیر کہتے ہیں اور جس کی وجہ سے باسی مکھن میں سڑاند پیدا ہوتی ہے، اور چونکہ اول اول وہ اس تخمیر کا اصلی سبب نہ معلوم کر سکا تھا اس لئے وہ اس ترشے کی پیدائش کے ساتھ ساتھ ہوائی جراثیم کی موجودگی سے بہت متاثر ہوا۔

فروری ۱۸۶۱ء میں پاسچر لکھتا ہے "تجربوں کو متعدد مرتبہ دہرانے پر بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ شکر، مانائٹ اور لیاکٹک ترشے کی بیوٹرک ترشے میں تبدیلی صرف انھیں عضویوں کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہی عضوئے اصلی بیوٹرک خامرے ہیں" اس نے یہ بھی بیان کیا کہ یہ جراثیم چھوٹے استوانہ نما اجسام ہیں جو انفرادی طور پر یا زنجیروں میں حرکت کرتے ہیں اور جب ان جراثیم کو موزوں مائعات میں اگانے کی کوشش کی گئی تو ایک اور دلچسپ حقیقت ظاہر ہوئی چنانچہ وہ اپنے تجربوں کی تفصیل کے دوران میں یہ بیان کرتا ہے کہ "یہ ایک عجیب بات ہے کہ یہ جراثیم ہوا کی موجودگی کے بغیر نمو پاتے ہیں بلکہ لطف تو یہ ہے کہ ہوا ان کی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے"۔

اس سائنسداں نے شرابوں کی خرابی کے اسباب کا بھی تحقیقی مطالعہ کیا چنانچہ ۱۸۶۳ء میں وہ لکھتا ہے "کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ شراب کی بیماریاں بھی خامروں، خوردبینی نباتیے اور ایسے جراثیم کی وجہ رونما ہوتی ہوں جو فضائی تبدیلیوں، تپش کے اختلافات وغیرہ سے شرابوں میں پیدا ہو جاتے ہیں"۔ بعد میں اس نے دکھلایا کہ اگر شراب کو ابتدا میں ۵۰ سے ۶۰ سنٹی گریڈ کی تپش میں تھوڑی دیر تک رکھا جائے تو یہ طریقہ ہر لحاظ سے سودمند ثابت ہوتا ہے۔

اس زمانہ میں ریشم کی کاشت والے خطوں میں ایک وبائی مرض پھوٹ پڑا اور اس مرض کی تباہیاں بڑھنے لگیں تو لوگوں نے پاسچر سے درخواست کی کہ وہ اس وبا کا اصلی سبب دریافت کرے، چنانچہ اس نے بڑی ہی کد و کاوش کے بعد نہ صرف ریشم کے کیڑوں کی بیماری کی اصلی وجہ معلوم کرنے میں کامیابی حاصل کی بلکہ اس سے بچنے کی احتیاطی تدابیر بھی اہل ملک کو بتلائیں، اسطرح پاسچر نے فرانس کی ریشم کی صنعت کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔

اس سے فرصت ہوئی تو پاسچر نے اپنے تجربوں کا رخ ایک اور جانب پھیر دیا لیکن اس مرتبہ محض جذبۂ حب الوطنی تھا اس کو اکسایا تھا، بات یہ تھی کہ ایک زمانہ سے جرمنی بیر کی تیاری کے لئے

مشہور چلا آتا تھا' اور اس صنعت میں فرانسیسی جرمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ پاسچر نے یہ تہیہ کیا کہ وہ بیر کی تیاری کا سائنٹفک مطالعہ کرے گا تاکہ اہل فرانس کو اس مفید صنعت سے فائدہ پہونچا سکے۔

اس زمانہ میں شمالیرے میں بیر کا ایک کارخانہ موجود تھا' پاسچر نے کئی مرتبہ خود جا کر اس کارخانہ کو دیکھا اور کارخانہ والوں سے مختلف تفصیلات دریافت کیں' لیکن اس کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کارخانہ کے کارکن اپنی صنعت کی کئی جزیات سے قطعاً ناواقف تھے۔ جب کبھی ان کے گاہک کوئی شکایت کرتے یا بیر کے غیر خالص ہونے کی اطلاع مالکوں کو دیتے تو فوراً ایک نیا خامرہ بیرون ملک سے منگوالیا جاتا اس طرح ہر مرتبہ نئے خامری کی موجودگی سے بیر کا معیار قائم نہیں رہ سکتا تھا۔

پاسچر نے مشہور بیر شرابوں کے نمونے حاصل کئے اور ان پر تجربے کرنے کے بعد وہ حسب ذیل نتائج پر پہونچا۔

(۱) خالص راب یا بیر خراب میں ہر تبدیلی کی وجہ جراثیم ہی ہوتے ہیں۔

(۲) یہ جراثیم یا تو ہوا سے آتے ہیں یا اجزاء مستعملہ سے، یا ان برتنوں میں ہوتے ہیں جنھیں بیر کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔

(۳) بیر میں جراثیم نہ ہوں تو وہ غیر متبدل رہتی ہے۔

اسی طرح ان سے یہ بھی دکھلایا کہ اگر تمام مشروبات کو پہلے سے گرم کی ہوئی بوتلوں میں ۶۰ تا ۵۵ درجہ تپش کے زیر اثر بھرا جائے تو ان میں کوئی خرابی نہیں ہوتی۔ اس طرح سائنسی ادب میں ایک نئی اصطلاح (Pasteurization) کا اضافہ ہوا جس سے مراد مذکورہ بالا طریقہ پر بیر یا شرابوں وغیرہ کو محفوظ کرنا ہے۔

ان کامیاب تجربوں کے بعد پاسچر نے اس مہلک بیماری پر تحقیقات کا آغاز کیا جسے انتھراکس (Anthrax) کہتے ہیں۔ فرانس میں اس متعدی مرض کے شروع ہو جانے سے زراعت کو سخت نقصان پہونچ رہا تھا، اس لئے کہ اس سے جو مویشی متاثر ہوتے وہ آناً فاناً میں مر جاتے تھے' بعض گاؤں میں تو اس مرض منحوس سے سارے کے سارے مویشی تباہ ہو گئے تھے، یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی اس وبا سے کافی نقصان پہونچ رہا تھا مثلاً ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۰ء کے درمیان روس کے ضلع نووگراڈ میں (۵۶ ہزار) زراعتی مویشی اور (۵۲۸) انسانی جانیں اس مرض کا شکار ہو گئیں۔

گو بہت زمانہ قبل یعنی ۱۸۳۸ء ہی میں الفرٹ کے وٹرنری اسکول کے ایک پروفیسر مسیو ڈیلافان نے یہ دکھلایا تھا کہ انتھراکس سے مرے ہوئے مویشی کے خون میں چھوٹی چھوٹی سلاخ نما شکلیں ہوتی ہیں' لیکن یہ دریافت محض ایک دلچسپ بات ہی ہو کر رہ گئی اور کسی نے اس کی سائنٹفک توجیہ نہیں کی۔

اسی زمانہ میں ایک جرمن طبیب ڈاکٹر کاخ ان جراثیم کو مصنوعی طور پر اگانے کی کوشش کر رہا تھا' اس نے دیکھا کہ اگر ان جراثیم کو خاص غذائی محلول میں رکھا جائے تو وہ تیزی سے نمو کرنے لگتے ہیں اور چند گھنٹوں کے اندر اندر اپنی اصلی جسامت سے ۱۰۰-۲۰ گنا زیادہ ہو جاتے ہیں اس طبیب نے یہ بھی مشاہدہ کیا کہ کچھ عرصہ کے بعد جراثیم کے جسم میں مہین مہین دانے پیدا ہو جاتے ہیں۔

پاسچر نے ریشم کے کیڑے کی بیماریوں پر تجربہ کے دوران میں یہ دکھلایا تھا کہ یہ دانے دراصل معمولی پودوں کے بیج یا تخم سے مشابہ اجسام ہیں جن کو سائنس کی اصطلاح میں "بذرے" کہا جاتا ہے اور جن سے جراثیم کی افزائش ہوتی ہے۔

معلوم ہوا کہ انتھراکس کا جرثومہ بھی اپنی افزائش اسی طرح کر سکتا ہے اور جب ان سے پیدا شدہ جراثیم کو مصنوعی طور پر خرگوش، چوہے، اور گنی پگ کے جسم میں داخل کیا گیا تو وہی علامات رونما ہو گئیں جو انتھراکس کی بیماری یا انتھراکس سے مرے ہوئے کسی جانور کے خون کے لگ جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔

ان جراثیم کو جب ۴۰ درجہ سنٹی گریڈ تپش پر رکھ کر دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اب بذرے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہے لیکن اس ضمن میں ایک اور اہم بات بھی دریافت ہوئی وہ یہ کہ جراثیم

کا وہ غذائی محلول جس میں انھیں مصنوعی کاشت کے لئے رکھا گیا تھا وقت کے ساتھ اپنی مضرت رساں قوت بھی کھوتا جاتا تھا مثلاً جسم میں مصنوعی طور پر داخل کرنے پر اگر یہ کاشتی محلول ابتدا میں دس میں سے دس جانوروں کے لئے مہلک ثابت ہوتا تو آٹھ روز کے وقفہ کے بعد بھی صرف چار یا پانچ کو ہلاک کر سکتا اور دس یا بارہ روز گزر جانے پر تو وہ بالکل بے ضرر ہو جاتا یعنی یہ معلوم ہوا کہ وہ جانوروں کے جسم میں کوئی ایسی مدافعتی قوت پیدا کر لیتا ہے جو انھیں اس مہلک بیماری کے اثرات سے محفوظ کر دیتی ہے۔

اس کے بعد ان اصولوں کو پیش نظر رکھ کر بہت بڑے بڑے پیمانوں پر تجربے کئے گئے اور یہ دیکھ کر سائینس دانوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ پاسچر کی یہ دریافت ایک معجزہ ہے۔ چنانچہ اس طریقہ سے فرانسیسی کسانوں کے لاکھوں مویشی بچا لئے گئے۔

اسی سلسلہ کے تجربوں کے دوران میں پاسچر ہڑک بائی (Hydrophobia) کے مسائل کو سب پر ترجیح دیتا رہا۔ اس زمانہ میں اس تکلیف دہ اور خطرناک بیماری کے متعلق سوائے اس کے کچھ معلوم نہ تھا کہ

(۱) دیوانے جانوروں خصوصاً دیوانے کتے کے تھوک میں اس بیماری کا سمی مادہ موجود ہوتا ہے۔

(۲) متاثرہ جانوروں کے کاٹنے سے یہ مرض دوسروں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

(۳) جانور کے کاٹنے اور بیماری کے اثرات کے ظاہر ہونے کے درمیان عموماً چند دنوں سے لیکر کئی کئی ماہ تک کا وقفہ درکار ہوتا ہے۔

ایک سگ گزیدہ مردہ بچے کے لعاب دہن کو مصنوعی طور پر خرگوش کے جسم میں داخل کرکے پاسچر نے یہ ثابت کیا کہ اس طرح بیماری کا ایک جانور سے دوسرے میں منتقل کیا جا سکتی ہے۔

اس کے بعد اس حاضر دماغ سائینس داں نے انتقال کے تجربوں کو دہرا کر اس سمی مادے کی قوت کو گھٹا دینے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک ایسے خرگوش کے دماغ کے ٹکڑے کو جو مصنوعی طور پر ہڑک بائی سے مار ڈالا گیا تھا حاصل کرکے ایک صاف ستھرے برتن میں رکھا گیا، اور جب اس پر تجربے کئے گئے تو معلوم ہوا کہ جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور دماغ کا یہ ٹکڑا سوکھتا گیا اس کے سمی اثرات بھی کم ہوتے گئے تا آنکہ آخر میں اس کو سادہ پانی میں پیس کر عرق حاصل کیا گیا اور جب اس عرق کو کتوں کے جسم میں داخل کرکے اس کے اثرات دیکھے گئے تو خود پاسچر کو اپنی اس کامیابی پر انتہائی مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ اب یہ کتے اس بیماری سے بالکل محفوظ ہو گئے تھے یعنی یہ کہ دوسرے دیوانے کتوں کے کٹوانے سے بھی ان میں مرض کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوئیں۔

جس زمانے میں پاسچر ان تحقیقات میں مصروف تھا اس کے پاس ایک کم عمر فرانسیسی لڑکے جوزف میسٹر کو لایا گیا جسے دیوانے کتے نے کاٹ لیا تھا، بڑے ہی کشش و پنج کے بعد اس حکیم نے یہ فیصلہ کیا کہ اس پر بھی اسی طریقہ علاج کا تجربہ کیا جائے جو کتوں کے ساتھ ہوا تھا، یعنی اس بچے کو بھی چودہ دنوں کے رکھے ہوئے دماغی مادے کا ٹیکا لگایا گیا اور مسلسل دس روز تک علاج جاری رہا جس دوران میں بارہ ٹیکے لگائے گئے اور اس طرح اس بچے کی جان بچا لی گئی۔

بعد میں دو اور سگ گزیدہ مریضوں کے ساتھ اسی طریقہ علاج کو استعمال کیا گیا اور ان صورتوں میں بھی ان کی جان بچا لی گئی۔ اب پاسچر نے بڑے پیمانے پر اس سلسلے میں تجربے شروع کئے اور سائنس اکادمی کے ایک اجلاس میں دنیا کو یہ خوشخبری دی کہ اس نئے طریقۂ علاج سے دیوانے کتے کا سو فیصدی کامیاب علاج کیا جا سکتا ہے۔

پاسچر کے اپنے کام کے علاوہ اس کے لائق شاگردوں نے بھی پاسچر انسٹیٹوٹ میں کام کرتے ہوئے کئی مہلک اور خطرناک بیماریوں مثلاً خناق وغیرہ کا علاج دریافت کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک تو ہیضہ کا سبب معلوم کرتے کرتے خود اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔

علم جرثومیات کے اس امام کی آخری عمر، شہرت، اعزاز اور علمی خطابات سے مالا مال تھی، دنیائے سائنس نے اس کی خدمات کی دل کھول کر ستائش کی اور اس کے کارناموں کو خوب سراہا۔

اور گو آخر میں اس کی صحت خراب ہوتی گئی تاہم ان سے اپنی لیبوریٹری اور سائنس میں دلچسپی جاری رکھی تا آنکہ دنیا کے اس بڑے محسن سائنسدان نے ۱۹۴۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے سائنٹفک کارناموں کی سنہری داستان ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی پر چھوڑ گیا۔

(ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ) گلچیں حیدرآبادی

رباعیات

ہر قید کو توڑ کر نکل جاتا ہوں
ہاں تجھ کو بھی چھوڑ کر نکل جاتا ہوں
اس نشہ کے قربان کہ اب تو ساقی
منہ کعبے سے موڑ کر نکل جاتا ہوں

گرتا ہوں سنبھلتا ہوں ہنساتا ہوں اسے
روتا ہوں مچلتا ہوں مناتا ہوں اسے
جس وقت کوئی گناہ کر لیتا ہوں
اپنے سے بہت قریب پاتا ہوں اسے

گو فرد عمل سیاہ کرتا ہوں میں
تجھ سے تو مگر نباہ کرتا ہوں میں
اپنے لئے کرتا ہوں جو کوئی نیکی
تیرے بھی لئے گناہ کرتا ہوں میں

توبہ توبہ الٰہی میری توبہ
رحمت کو تری بھول کے کی تھی توبہ
جتنی تھی ترے کرم سے خالی کر دی
اور مے کی جگہ شیشے میں بھر دی توبہ

اپنا دلِ چاک چاک سینے دو مجھے
پینے دو مجھے شراب پینے دو مجھے
للہ ہٹاؤ نہ ابھی جام و سبو
جینے دو خدا کے لئے جینے دو مجھے

جس وقت ہو دستیاب پی لیتا ہوں
تھوڑی ہو کہ بے حساب پی لیتا ہوں
ہونٹوں کی ترے ملے کہ آنکھوں کی ملے
جیسی بھی ملے شراب پی لیتا ہوں

تمکین سرمست

شہزادی گلبدن

(اخبار ڈان کے ایک مضمون کا آزاد ترجمہ)

شہنشاہ بابر کی لڑکی گلبدن بیگم قلعہ معلی کی بے فکر عیش پسند اور روشن خیال فضا میں رہنے والی خواتین میں اپنی آپ مثال ہے۔ شہزادی نے اپنے بھانجے اکبر کے کہنے پر اپنے اشہب قلم کے ذریعہ اس زمانہ کے معرکتہ الآرا واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ گلبدن بیگم کو یہ خیال بھی نہ گزرا ہوگا کہ جس کام کو اس نے اپنے ذمہ لیا ہے وہ اسے زندۂ جاوید بنائے گا۔ اور زیب النساء جیسی باکمال شاعرہ کا کلام بھی شہرت کی دنیا میں گلبدن بیگم کی تصنیف پر رشک کرے گا۔

کئی اعتبار سے شہزادی گلبدن بیگم کو واقعات کے مدون کرنے میں ازحد مدد ملی۔ اول تو یہ کہ شہزادی کو ہمایوں، بابر اور اکبر جیسے جلیل القدر بادشاہوں کی سرپرستی حاصل رہی۔ ثانیاً یہ کہ قلعہ معلی کے واقعات اس کی آنکھوں نے دیکھے تھے مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کے الفاظ ہیں کہ گلبدن بیگم نے اپنے اور اپنے ہمعصر خاندان کی بے کم و کاست تفصیلات سے روشناس کرا کر دنیائے تاریخ میں ایک بڑی خدمت انجام دی ہے اس کی تحریر سلیس بیساختہ اور برمحل ہے۔

گر ابوالفضل کے ادبی شاہکار "آئینہ اکبری" یا بایزید کی تصنیف "ترقی ہمایوں" کی طرح گلبدن بیگم کے "ہمایوں نامہ" کو اہمیت نہ دیجائے لیکن بعض اعتبارات کی بنا پر شہزادی کا ہمایوں نامہ" ابوالفضل اور بایزید کی تصانیف کے مقابل میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا بلکہ کچھ بڑھا چڑھا ہی ہوگا۔

ہمایوں نامہ قلعہ معلی کے باسیوں کی صحیح تاریخ کہی جا سکتی ہے یہ تاریخ ایک خاتون کے قلم اور زاویۂ نگاہ کا کارنامہ ہے جس کی ساری زندگی شاہان مغلیہ کی سرپرستی میں بسر ہوئی۔

شہزادی نے اپنی اس تصنیف میں دربار اور خاندانی افراد کے نام بنام حالات تعلقات واقعات بے کم و کاست بیان کئے ہیں خواہ وہ شہنشاہ بابر یا ہمایوں کے پرآشوب زمانہ سے متعلق ہوں یا شہنشاہ اکبر کے پرسکون دور سے مغلوں کے دور کی اس تاریخ (ہمایوں نامہ) کے متعلق تاریخ کے انگریزی طلبہ کو اس وقت تک علم نہ ہوا جب تک کہ ڈاکٹر ریو (Dr. Rieu) نے ہمایوں نامہ کو مدون نہ کر لیا۔ ہمایوں نامہ کے متعلق ہندوستانی مورخین کو علم تھا مگر موجودہ دور کے تاریخ کے طلبہ کو مسز بیورج (Mrs. Beveridge) کا مرہون منت ہونا چاہیئے جنہوں نے اس نسخہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اصل نسخہ ہیملین (Hamillon) کے مجموعہ میں برٹش میوزیم میں محفوظ ہے یہ نسخہ بھی مکمل نہیں ہے کیونکہ مرزا کامران کے نابینا ہونے تک کے واقعات اس میں درج ہیں۔ اصل ہمایوں نامہ میں غالباً شہنشاہ اکبر کے بائیس سالہ دور حکومت کے واقعات درج ہیں کیونکہ نسخہ پر شاہجہاں کے قلم کا یہ ایک نوٹ ہے۔ "اس تاریخ میں صاحب قراں (تیمور) کی فاتح اولاد اور حضرت آشیانی اکبر بادشاہ کے بائیس سالہ دور حکومت کے حالات درج ہیں۔"

جس طرح ہمایوں نامہ مختصر ہے اسی طرح شہزادی گلبدن کے حالات زندگی بھی مختصر ہیں۔ گو شہزادی کی زندگی ایک پردہ نشین خاتون کی حیثیت سے ازحد خاموش اور بے خرخشہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے والد کے مصائب اور اپنے سوتیلے بھائی کی جلاوطنی کی تکالیف کے باعث ضرور متاثر تھی۔ شہزادی گلبدن سنہ ۱۵۲۳ء میں اس وقت پیدا ہوئی جب کہ شہنشاہ بابر ہندوستان پر اپنے آخری حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ پانی پت کی لڑائی کے وقت گلبدن بیگم بمشکل تین سال کی تھی۔ شہزادی کی ماں دلدار بیگم بابر کی بیوی تھی لیکن ماہم بیگم ملکہ تھی۔ ماہم بیگم کے بچوں میں سوائے ہمایوں کے کوئی باقی نہ رہا تھا اس لئے شاہ بیگم نے شہزادی گلبدن اور اس کے بھائی ہندال کو اپنی اولاد کی طرح پالا پوسا یہی وجہ تھی کہ بابر بھی شہزادی کو بہت چاہتا تھا اور ہمایوں بھی اپنی سوتیلی بہن سے ازحد محبت کرتا تھا۔ جب ہمایوں کی شادی حمیدہ بیگم کے ساتھ ہوئی تو گلبدن اور

حمیدہ بیگم میں بڑا اختلاط ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہ اکبر بھی گلبدن کی بڑی عزت کرنے لگا۔ دربار تک میں شہزادی گلبدن کی ہر طرح عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ گلبدن بیگم نے اپنا ایک واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے "جب کہ خواجہ نظام الدین برلاس شاہ بابر کے خلیفہ ہندوستان تشریف لائے اس وقت گلبدن بیگم نظام الدین برلاس کی بیوی کے ہمراہ انگرام گئی ہوئی تھی۔ شہزادی کی خادماؤں نے اس کو بتایا تھا کہ جب خلیفہ آئے تو شہزادی کو تعظیم کے لئے اٹھنا چاہیے چنانچہ خلیفہ کی آمد پر شہزادی تعظیم کے لئے اٹھی۔ ازاں بعد سلطانم خلیفہ کی بیوی پہونچی۔ شہزادی ان کی تعظیم کے لئے بھی اٹھی لیکن نظام الدین نے شہزادی کو تعظیماً کھڑا ہونے سے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ آپ کی خادمہ ہے۔" اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گلبدن بیگم کی کیا عزت و توقیر کی جاتی تھی۔ نظام الدین اور اس کی بیوی نے شہزادی کو کئی ہزار اشرفیاں اور کئی سو گھوڑے نذر دیئے اور خاصہ پر مدعو کیا۔ ایک پر فضا اور اونچے چبوترے پر خلیفہ کے لئے سرخ خیمہ جس کا حاشیہ گجراتی زربفت کا تھا نصب تھا جس کے اطراف چھ مختلف اعلیٰ درجہ کے خیمے ایستادہ تھے خیموں کے اطراف ایک بہت ہی خوبصورت قنات تھی۔ خاصہ کے بعد گلبدن بیگم اپنے والد بابر کے سلام کے لئے گئی۔ جس محبت کے ساتھ بابر پیش آیا اس کی تصویر شہزادی نے ان الفاظ میں کھینچی ہے "میرے قدمبوس ہونے کے بعد اس نے مجھے گود میں لیکر مختلف سوالات کئے اور از حد مسرور ہوا۔" جہاں کہیں بھی ماہم بیگم جاتی تھیں گلبدن بیگم کو ہمراہ لیجاتی تھیں۔ جس وقت شہنشاہ بابر دھول پور تشریف لے گئے ماہم بیگم بھی گئیں۔ ہمایوں بھی گلبدن سے محبت کرتا تھا۔ شہنشاہ بابر کی مہلک بیماری سے پہلے ہمایوں دہلی میں سخت بیمار پڑا شاہی خاندان آگرہ سے دہلی گیا اس وقت گلبدن بھی ہمراہ تھی جس وقت گلبدن بیگم بستر کے قریب پہونچی ہمایوں باوجودیکہ دردِ سر میں مبتلا تھا مگر شہزادی کو دیکھ کر اس نے محبت سے اپنا ہاتھ بڑھایا اور اسے خوش آمدید کہا۔

بابر کے انتقال کے بعد گلبدن بیگم اپنی ماں دلدار بیگم کے ہمراہ رہنے لگی لیکن اس سے ہمایوں کی محبت میں سرمو فرق نہ آیا۔ ہمایوں ہمیشہ گلبدن کے مکان پر جایا کرتا جہاں معصومہ سلطان بیگم گلرنگ بیگم اور گلچہرہ بیگم سلطان کے سلام کو حاضر ہوتیں۔ شہزادی گلبدن بیگم ہمایوں کی محبت کا ان الفاظ میں ذکر کرتی ہیں۔

"شہنشاہ بابر کے بعد ہمایوں نے مجھ پر اپنی عنایات کی اس قدر بارش کی کہ مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ میں یتیم ہو گئی۔" شہزادی کی شادی خضر خواجہ خاں سے ہوئی جس سے دو بچے ہوئے۔ لڑکے کا نام سعادت یار اور لڑکی کا نام سلیمہ خانم تھا۔ خضر خواجہ خاں ۱۵۵۵ء میں ہمایوں کے ہمراہ ہندوستان آیا دو سال بعد اکبر نے اسے لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا اسکی زندگی کا بیشتر حصہ اکبر کی مصاحبت میں گزرا۔ شہنشاہ اکبر نے اس کو بڑا فوجی اعزاز عطا کیا اور کچھ عرصہ تک امیر الامراء کی اہم خدمت بھی منصرماً طور پر انجام دی۔

مورخین نے شہنشاہ اکبر کے دور میں گلبدن بیگم کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہو کہ شہنشاہ اکبر کی اناماہم انگا کے زوال کے بعد محل کی خواتین کی اہمیت گھٹ گئی ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شہزادی گلبدن معمر ہو چکی تھیں اسلئے وہ اپنا زیادہ وقت اپنے خانگی امور میں صرف کرتی تھیں لیکن اس کے باوجود اکبر کی نظروں میں اس کی عزت تھی جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اس نے ۱۵۸۷ء میں شہنشاہ ہمایوں کے حالات رقم کرنے کے لئے گلبدن بیگم کو حکم دیا۔ شہزادی کے لئے اس پیرانہ سالی میں یہ کام بہت موزوں تھا اب اس کی عمر ۶۴ سال کی تھی اور اس نے اپنی آنکھوں سے تین شاہی دور دیکھے تھے۔ شہزادی نے اپنے کام کو کما حقہ انجام دیا۔ ہمایوں نامہ کی تکمیل سے دس سال پہلے گلبدن بیگم فریضۂ حج کے لئے مشرف ہوئیں۔ سفر میں ان کے ہمراہ ایک اچھا قافلہ تھا۔ قافلہ کے افراد میں بابر اور ہمایوں کے زمانہ کی خواتین تھیں جن کے لئے دو جہاز مخصوص تھے۔ ابوالفضل نے اس قافلہ کی روئداد یوں بیان کی ہے۔ "یہ قافلہ ۱۵ اکتوبر ۱۵۷۵ء

کو آگرے سے روانہ ہو کر سورت پہونچا جہاں ایک سال تک ٹھیرنا پڑا کیونکہ پرتگالی قزاقوں کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ حج سے واپسی پر اس قافلہ کو جہاز کے خراب ہونے کی وجہ سے ایک سال تک عدن میں مقیم رہنا پڑا جہاں ترکی گورنر کے بیہودہ سلوک کی وجہ سے قافلہ والوں کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑا جس کے نتیجہ میں سلطان مراد شاہ ترکی نے اس گورنر کو اس کی حرکت پر برطرف کر دیا۔ ۱۵۸۲ء میں گلبدن بیگم فتح پور پہونچی اور باقیماندہ زندگی عبادت، ریاضت، غربا پروری اور خیر و خیرات کے کاموں میں بسر کی شہزادی گلبدن کی سفارش پر ہی اس کے پوتے یار محمد کی مخلصی ہوئی اور یہی شہزادی سلیم کے آڑے وقت کام آئی جب اس شہزادہ نے اکبر کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔ ۸۲ برس کی عمر میں ایک مختصر سی علالت کے بعد خاندان مغلیہ کی اس عاقلہ اور تجربہ کار خاتون نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ شہنشاہ اکبر نے مرحومہ کے جنازہ کو تھوڑی دور تک کندھا دیا۔

شاہ ابرار احمد فکی

غزل

ہزار بار ہو آئینِ آگہی کا ظہور
شباب ہو نہ سکے گا کبھی جنوں سے نفور

توہمات کی پُر ہول ظلمتیں ہیں گواہ
حقیقتوں کی جوانی ہے کس قدر مجبور!

تلاشِ منزلِ دل اور سوزِ دل کے بغیر
رہے گی تیری یہ فکرِ مدام نامشکور

دلوں میں رقصِ تمنا نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ جوشِ موسمِ گل یہ بہارِ کیف و سرور

عجیب چیز ہے نیرنگیٔ تصورِ دوست
تمام عالمِ امکاں ردائے نکہت و نور

نگاہِ شوق کو سمجھا تھا شمعِ منزلِ شوق
کسی نے دور سے آواز دی "ابھی کچھ دور"!

امانتِ غمِ جاناں لطیف ہے ساجد
اسے حیات کی غمگینیوں سے رکھ کچھ دور

لطیف ساجد

۱۸۸۶ء کے حیدرآباد کی ایک جھلک

(لیڈی ڈفرن کی ڈائری کے دو ورق)

۱۰ ۲۰ نومبر ۱۸۸۶ء روز چہارشنبہ - دوپہر کے قریب ہم حیدرآباد پہنچے - وزیر اعظم نواب سر سالار جنگ ولد سر سالار جنگ ہم سے ملنے کے لئے کچھ اسٹیشن آگے تک آ گئے اور حیدرآباد میں خود اعلیٰ حضرت نظام اپنے تمام امرا کے ساتھ موجود تھے - اعلیٰ حضرت پستہ قد اور لاغر ہیں۔ سیاہ بال اور گل موچھیں رکھتے ہیں - آنکھیں سیاہ ہیں، ابھرا ابھرا نقشہ اور اداس سا چہرہ ہے۔ وہ ایک سیاہ ایرانی ٹوپی اور یوروپین کپڑے پہنے ہوئے تھے - ان کے امراء کے کپڑے اور بھی شاندار تھے - ان میں سے اکثر اونچے پورے اور قد آور ہیں - نواب سالار جنگ بھی قوی ہیکل ہیں - ان لوگوں کے لباس یونی فارم جیسے ہیں اور اگرچہ پوری طرح مشرقی نہیں، تاہم دلکش ہیں - اکثر سفید دستار اور سیاہ چست کوٹ پہنے، سونے کے بکلوس اور کنٹھیاں لگائے ہوئے تھے -

مسٹر کورڈری ریزیڈنٹ اسٹیشن پر موجود تھے اور ہم یہاں سے سوار ہو کر ان کے گھر گئے - سرکاری گاڑیاں گہری زرد ہیں اور اعلیٰ حضرت نظام کی بگھیاں زرد اور روپہلی ہیں - یہ سب چست و چالاک اور مستعد معلوم ہوتے ہیں۔

ریذیڈنسی ایک نہایت نفیس مکان میں واقع ہے - یہ کلکتہ کی ہماری قیام گاہ کے نمونے پر بنایا گیا ہے، لیکن چار بازوؤں کی جگہ صرف دو بازو ہیں، درمیانی ہال چھت تک چلا گیا ہے جس میں ایک گیلری اور کھمبوں پر دو منزلیں اور ایک نہایت خوبصورت کمرہ ہے -

۵ ۲ر نومبر پنجشنبہ - حضور نظام کے لئے دربار آج صبح میں منعقد ہوا - میں بڑے ہال کے اطراف کی گیلری میں پہنچی، جس کا حال میں تمہیں بتا چکی ہوں - یہاں سے حضور نظام کی آمد اور اس کے بعد ہونے والے تمام مراسم اچھی طرح دکھائی دیتے تھے - دریچے سے جو نظارہ دکھائی دیتا تھا وہ بڑا دلکش تھا - ریذیڈنسی کا باغ گھر کے بالکل سامنے ہے اور اس کے احاطے میں بعض نہایت عمدہ درخت ہیں - آج یہ ساری جگہ سپاہیوں سے بھری ہوئی ہے - ایک انگریزی گارڈ ان سیڑھیوں کے سامنے کھڑا ہے جو ایک چوڑے برآمدے پر جاتی ہیں - یہ برآمدہ ایک کمرے کی طرح سجایا گیا ہے اور دربار ہال کے بالکل سامنے ہے - باغ میں عمارت تک سوارہ فوج قطار باندھے کھڑی ہے - حضور نظام اپنی زرد رنگ کی بگھی میں تشریف لائے جس میں چار سُرنگ گھوڑے جتے ہوئے تھے - کوچ مین اور سائیس بھی زرد وردی میں تھے - وہ کل کی بہ نسبت آج زیادہ چست و چاق اور زیادہ مشرقی معلوم ہوتے تھے - سیاہ لباس، اس پر "اسٹار آف انڈیا" کا نشان اور ان کو چمکانے والی نیلی ربن ——— یہ ان کا لباس تھا - دیکھنے میں تو دربار بڑا شاندار معلوم ہوتا تھا، لیکن جو لوگ اس میں مصروف ہوتے ہیں انھیں یہ ہمیشہ نہایت غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے - حضور نظام اور والسرائے دونوں ایک طرح کی ڈائس پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھ گئے - اس کے بعد ہتوں والی سونے کی کرسیاں دہری قطار میں باب الداخلہ سے تخت تک نیم دائرہ کی شکل میں رکھی گئی تھیں - دربار برخواست ہوا تو ڈفرن حضور نظام کو پہنچانے کے لئے دروازے تک گئے، اور وہ جلوس کی صورت میں تشریف لے گئے - آج دوپہر میں ملاقات باز دید تھی، لیکن افسوس ہے کہ میں اس کا تماشا نہ دیکھ سکی - لوگ کہتے ہیں کہ وہ ایک بالکل مختلف اور بہت ہی شاندار چیز تھی - حضور نظام کے باڈی گارڈ عرب ہیں اور ان کے ملازموں کے لباس بڑے حیرت انگیز ہیں -

آج ہم ایک نواب صاحب کے بچوں سے اپنے گھر پر ملے۔ میں نے ان سے زیادہ پیارے بچے کہیں نہیں دیکھے۔ سب سے بڑی ایک آٹھ سالہ لڑکی ہے اور بس کچھ ہی دنوں میں پردے میں بٹھائی جانے والی ہے۔ یہ سن کر وہ کہتی ہے "کاش میں غلطی سے بھی ہو کر نہ پیدا ہوئی ہوتی"۔ بقیہ تین لڑکے ہیں۔ یہ سب کے سب ہیرے جواہرات کے مالے اور سونے کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ آنکھیں ان کی بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ سب کے سب بڑے حسین اور ملنسار تھے۔ دو سال کا بچہ بھی انگریزی سمجھ سکتا تھا اور دوسرے تو اچھی طرح اس میں گفتگو کرتے تھے۔ یہ چھوٹے بچے میری گھڑی کو کھول کھول کر خوش ہوتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ میں ان سے دوستی کرنے میں کامیاب رہی۔ لڑکی مجھے اپنا پہلا انگریزی خط لکھنے والی ہے۔ ان بچوں کی نگران بلغاسٹ کی رہنے والی ہے اور ڈفرن نے ایک مرتبہ اس کے باپ سے کچھ سلوک کیا تھا۔ اس عورت کو اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اس کے شاگرد اپنے آپ کو اتنی اچھی طرح پیش کر سکے۔ میں ان کی ماں سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔ اس کے بعد میں اور بہت سے لوگوں سے ملی۔ ایک پارسی خاتون جنہوں نے میرا ایک کام کر دیا تھا۔ سیول سرجن اور دو لیڈی ڈاکٹر۔ ان میں سے ایک مشنری لگتی تھی۔ دوسری مسز وائٹ حضور نظام کی ملازم ہیں اور کئی برسوں سے اپنی خدمات حسن و خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ ڈاکٹر کی حیثیت سے وہ بہت نیک نام اور بہت ہر دل عزیز ہیں۔

دوپہر ڈھلے اسپورٹس تھے۔ لیکن اتنی جلدی اندھیرا ہو گیا کہ ہم اپنا پروگرام ختم نہ کر سکے۔ "ٹنٹ پگنگ" کے علاوہ رسہ کشی بھی تھی —— ایک ہاتھی اور اس کے مقابلے میں ستر آدمی۔ میرا خیال ہے کہ ہاتھی جیت جاتا لیکن رسی ٹوٹ گئی۔ چونکہ یہ دیو اس قسم کے کھیل میں حصہ لینے پر مجبور کرنے سے خفا سا ہو گیا تھا، اس لئے یہ تجربہ دہرایا نہیں گیا۔ ہم نے ہاتھیوں کی دوڑ بھی دیکھی۔ یہ بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ یہ بڑے بڑے جانور بہت تیزی سے لڑھک رہے تھے، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اس کے بعد اونٹوں کی دوڑ ہوئی۔ دوڑ کے دوران میں ایک دفعہ اونٹوں کو لٹا دیا گیا۔ ان کے سواروں نے ان پر لدی ہوئی بندوقوں کو کوہانوں پر رکھ کر تین باڑیں ماریں، پھر سوار ہو کر چل پڑے۔ حضور نظام نے خود ایک انعام پایا۔ وہ تنہا شخص تھے جنہوں نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اپنے بھالے کی نوک سے زمین پر رکھی ہوئی ایک انگوٹھی کو اٹھانے میں کامیابی حاصل کی۔ یہ اسپورٹس گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو رہے تھے۔ بازار سے نکلتے ہی آپ ایک کھلے حصے پر پہنچ جاتے ہیں جس میں سبز گھاس کا فرش بچھا ہوا ہے۔ یہ میدان بڑا ہی خوبصورت ہے۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نفیس اسٹانڈ بنا ہوا ہے۔ تماشائیوں کا ایک بے پناہ ہجوم باڑ کے دونوں طرف جمع تھا، جو خود بھی بڑا دلچسپ تھا۔

شام میں حضور نظام نے ہمیں واقعتاً نہایت شاندار ڈنر پیش کیا۔ ہم ایک کھلی گاڑی میں سوار ہو کر روشنی کا تماشا دیکھنے نکلے۔ سارا شہر چراغاں ہو رہا تھا اور جہاں ہماری دعوت تھی اس مقام پر خوب ہی روشنی تھی۔ سڑکوں پر لنتر ہانڈیوں میں روشنی کا سامان کیا گیا تھا۔ چاروں طرف اور نیچے اوپر ہزاروں آدمی تماشا دیکھنے جمع تھے۔ کمانیں بڑی زبردست تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اصلی عمارتوں میں روشنی کی گئی ہے۔ سڑکوں پر دو طرفہ فوج کا پہرہ تھا اور رہ رہ کر "گاڈ سیو دی کوئین" کا راگ بجایا جاتا تھا، یہاں تک کہ ہم محل تک پہنچ گئے۔

یہ اطالوی طرز کی ایک نہایت نفیس عمارت ہے جس کے اطراف دو بڑے بڑے قطعات یا باغ ہیں۔

دونوں میں خوب روشنی کی گئی تھی۔ عمارت کے اوپر بھی روشنی تھی اور گلاب کے تختے بھی منور تھے۔ ہمارا استقبال محل کے اس حصہ میں کیا گیا جو دو قطعات کے درمیان واقع ہے۔ ہم چہل قدمی کرتے ہوئے دوسرے باغ میں سے ہوکر کمرہ طعام میں پہنچے۔ ایک ایوان میں جو ایک ہزار فیٹ سے بھی زیادہ ہوگا، دو سو مہمان ڈنر پر بیٹھے۔ درمیان میں بیٹھنے کی وجہ سے میں دونوں سرے نہ دیکھ سکی۔ میز سونے کی رکابیوں سے ڈھکا ہوا تھا جن میں پھول رکھے تھے۔ ہم منور اور روشن باغ کی طرف دیکھتے رہے۔ انتظام نہایت عمدہ تھا اور میرا خیال ہے کہ ڈنر ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ تک جاری نہیں رہا۔ حضور نظام میرے اور ڈفرن کے درمیان بیٹھے تھے۔ والسرائے نے ان کا جام صحت ایک نہایت عمدہ تقریر اور ایک بلند آواز میں تجویز کیا۔ حضور نظام نے جواب میں فرمایا "میں لارڈ اور لیڈی ڈفرن کا جام صحت تجویز کرتا ہوں"۔ اس کے بعد ہم باغ میں آتش بازی کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک گھنٹے تک معروف رہے۔ ہمارے مقابل پانی میں ڈفرن کا، میرا اور حضور نظام کا عکس نظر آرہا تھا۔ دونوں مرد ہاتھ ملا رہے تھے۔ اور میں گھاس کی طرح سبز لباس میں ملبوس کھڑی تھی۔ تھوڑے سے فاصلے سے یہ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں تمہیں آتش بازی کی ساری تفصیلات بتا بھی سکوں گی۔ کیونکہ یہ ایک دوسرے سے بہت مشابہ ہیں۔ ان میں آواز نہیں ہوتی، یہ نیچے سے اوپر اٹھتے ہیں، اوپر جاکر پھلجھڑی سی چھوڑتے ہیں اور آخر میں بہت بڑے "خوش آمدید" پر ختم ہوتے ہیں جو آسمان پر لکھا نظر آتا ہے۔

جمعہ ۲۶ء۔ بارہ بجے تک والسرائے کو کام تھا۔ میں نے برار کے ایک وفد سے ملاقات کی جو میرے فنڈ کے سلسلے میں آیا تھا۔ پھر ان چھے طلبہ کو دیکھنے کے لئے گئی جو طبی کام کے لئے تربیت حاصل کر رہے ہیں پھر ہم باہر نکلے۔ سکندرآباد اور بلارم سے ہوتے ہوئے کوئی گیارہ میل گئے ہوں گے۔ سکندرآباد میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ ہال کی سیڑھیوں پر ناچنے والی لڑکیاں ہاتھ میں جلتی شمع لئے گاتی کھڑی تھیں۔ یہ ایک قدیم اور رمزیاتی رواج ہے۔ ان کے بعد ایک مقامی مدرسے کی لڑکیاں اور ایک فوجی یتیم خانے کے بچے تھے۔ ایڈریس کے ساتھ ایک پلیٹ بھی پیش کی گئی اور اس کا خوبصورت ڈبہ ایک چاندی کی کشتی میں پیش ہوا۔ واپسی پر ہم ایک بڑے تالاب کے بند پر سے حیدرآباد کنٹیجنٹ کے مس ہاؤز پہنچے تک ہم کئی عمدہ پارکوں کے سامنے سے گزرے۔ کرنل ملی یہاں کے کمانڈنگ افسر ہیں۔ عہدہ داروں نے اپنے ناچ کے خوبصورت کمرے میں ہمیں ایک نہایت عمدہ لنچ دیا۔ ڈفرن نے کنٹیجنٹ کا جام صحت تجویز کیا اور ہم دوسری مصروفیات کے انجام دینے کے لئے روانہ ہوگئے۔ سالارجنگ نے ہمیں تالاب میرعالم پر چائے پر مدعو کیا تھا اور آفتاب غروب ہونے سے پہلے ہمیں گھوڑے دوڑاتے پندرہ میل جانا تھا۔ بالآخر یہاں پہنچنے کے بعد ایک گھنٹہ نہایت پرلطف طریقے پر گزرا۔ تالاب مصنوعی ہے اور ایک بند کے ذریعے پانی کو روکا گیا ہے جو عام اصولوں پر نہیں بنایا گیا ہے۔ یہ ایک طویل ریلوے پل سے مشابہ ہے۔ کمانیں تالاب کی سمت میں اندر کی طرف مڑی ہوئی ہیں اور ان کا پشتہ میدان کی طرف ہے۔ یہ بند تالاب کا نہایت حسین کنارہ معلوم ہوتا ہے۔ اس پشتے سے اپنی نظر میں ہٹالو تو یقین نہیں آتا کہ یہ تالاب مصنوعی ہے کیونکہ یہ اتنا حسین ہے۔ ارضیاتی مرکبات کے یہاں عجیب عجیب تماشے نظر آتے ہیں۔ حیدرآباد کے چاروں طرف پتھر اور چٹانوں کے ڈھیر کے ڈھیر کچھ عجیب طرح بکھرے پڑے ہیں۔ جیسے کسی دیو نے انہیں برسایا ہو، یا جیسے زمین اتنی بہہ گئی ہو کہ آخر میں صرف پتھر ہی پتھر

رہ جائیں۔ اس تالاب میں ایسی بہت سی پہاڑیاں ہیں جن پر جھاڑیاں اور گھاس اگی ہوئی ہے۔ یہ نہایت ہی حسین جزیرے معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑی پہاڑی پر ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں بیٹھ گئے جہاں حضور نظام بھی ہم سے آملے۔ تالاب کا ایک چکر لگایا اور غروب آفتاب کا منظر دیکھا، جس سے ہم بہت ہی محظوظ ہوئے۔

گھر پہنچنے کے لئے ہمیں ڈنر کے لئے بس کپڑے ہی بدلنے کی مہلت مل سکی۔ ہم شہر میں سے ہو کر گزرے جسے پھر چراغاں کیا گیا تھا۔ مسٹر گورڈری نے اپنے نفیس کمرے میں ناچ کا انتظام کیا تھا جس میں حضور نظام اور ان کے بہت سے امرا موجود تھے۔ اعلیٰ حضرت نے وقت کا زیادہ حصہ گیلری میں بیٹھے ناچ دیکھتے ہوئے گزارا۔ ڈکرن بہت جلد غائب ہو گئے لیکن میں سپر کے بعد بھی موجود رہی۔

شنبہ ۲۷ ر۔ صبح میں سارے مرد بھالوں سے چیتے کا شکار کرنے گئے تھے اور دو کا شکار کر لائے۔ غریب حیوانوں کو پنجروں سے چھوڑتے ہیں اور شکاری بھالے لئے گھوڑوں پر سوار ہو کر ان کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ للّڈ ولیم نے ایک چیتے کا شکار کیا۔ وہ اور ان کا گھوڑا لوٹ پوٹ ہو گئے لیکن خیر ہوئی کہ چیتے کو صرف فرار کی فکر تھی۔ اگر قریب آکر ان کی یہ ہیئت کذائی دیکھتا تو مزا آجاتا۔ میرے حکم سے وائسرائے کو ایک ہاتھی پر نہایت حفاظت کے ساتھ سوار کر دیا گیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ شکار کا تماشا اچھی طرح نہ دیکھ سکے ہوں گے، تاہم وہ صحیح سلامت گھر واپس آئے جس کے لئے میں اتنی فکرمند تھی۔

آج وہ بہت مصروف تھے اور حیدرآباد کے تمام معاملات نبٹ لینا چاہتے ہیں۔ ریذیڈنٹ، وزیر خارجہ حضور نظام اور سالار جنگ سے طویل ملاقاتیں رہیں۔ ان کے نتائج سے وہ بہت خوش تھے لیکن چونکہ کوئی پبلک بیان اس موضوع پر نہیں دیا گیا ہے اس لئے میں تمہیں کوئی بات نہیں بتاؤں گی۔

صبح میں میں دواخانہ دیکھنے گئی اور لنچ کے بعد ان حیدرآبادی نواب صاحب کی بیوی سے ملی جن کے بچوں کے بارے میں میں نے کل تمہیں بتایا تھا۔ وہ اپنے دیوان خانے میں تھیں، خود ان کے اندرونی گھر میں نہیں۔ نواب صاحب ہماری ملاقات کے وقت موجود تھے۔ اسی طرح وہ سارا زندہ دل کنبہ بھی موجود تھا۔ وہ ایک حسین بی بی ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور اس ادا سے سرخ اور سنہری رنگ کی ساڑی میں وہ لپٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھوں اور سر پر ہیرے اتنے تھے جیسے لاد دیا گیا ہو۔ وہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھتی ہیں اور کچھ الفاظ کہنے کی کوشش بھی کی۔

اس کے بعد دوپہر میں ڈکرن اور میں ایک اور صاحب کے مکان پر گئے جو حیدرآباد کے بہت بڑے امرا میں شمار ہوتے ہیں۔ حضور نظام یہاں بھی آئے تھے۔ یہاں ہم نے چائے پی اور "امیزان گارڈ" کو دیکھا جو پوری وردی میں حبشی عورتوں پر مشتمل تھا۔ پھر کچھ آدمی ہمارے آگے چلنے لگے۔ سوار اور گھوڑے دونوں بہت بے آرام اور بے کل نظر آتے تھے۔

ہمارا دن ریذیڈنسی میں ایک دعوت کے ساتھ ختم ہوا۔ حضور نظام کو پھر میرے اور وائسرائے کے درمیان جگہ دی گئی۔ میرے دوسرے بازو پر سر ہنری پینڈر گھاسٹ تھے۔

دس بجے کے قریب ہم اسٹیشن پہنچے اور رات اپنی ریل کے ڈبوں میں گزاری۔ اس کے بعد ہمیں پورے دو دن ریل میں گزارنے ہیں، صبح چار بجے سے لے کر ۹ بجے رات تک اور ہم دوشنبہ ۳۰ ر کی دوپہر میں میسور پہنچ جائیں گے۔

سید مبارز الدین رفعت

اس شمارے سے ہم نے یہ تہیہ کیا ہے کہ سوال وجواب کا ایک مستقل سلسلہ سب رس میں شروع کیا جائے۔ اس عنوان کے تحت ہمارے خریداروں کے ایسے سوالات کا حتی الوسع جواب دیا جائے گا جو ادبی یا علمی قسم کے ہوں، یا ان سے عام معلومات میں اضافہ ہونے کا قرینہ ہو۔ مجلس ادارت سب رس کے مطالعہ کرنے والوں سے اس قسم کے سوالات کو بخوشی قبول کرنے اور ان کے جواب دینے کے لئے تیار رہے گی۔

عنقا

سوال۔ اردو شاعری میں اکثر عنقا کا ذکر آتا ہے، کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کون جانور ہے؟ درحقیقت اس کی کوئی اصلیت ہے بھی یا محض قیاسی وجود رکھتا ہے؟ عبدالستار

جواب۔ عنقا سے مراد ایک ایسا قیاسی پرندہ ہے جس کے وجود پر قدیم زمانے کے لوگ نہ صرف یقین رکھتے تھے بلکہ کئی سیاحوں اور مورخوں نے اس کے دیکھنے کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ عنقا کو یونانی زبان میں (PHŒNIX) کہتے ہیں یعنی "چمکدار رنگت والا جانور" گو بعض وقت اس لفظ سے "پام کا درخت" بھی مراد لی جاتی ہے۔

۵۰۰ ق م کے بعد کی تحریروں میں اس جانور کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً زمانہ قدیم میں ہیروڈوٹس HERODOTUS اور ازمنہ وسطیٰ میں اسحاق تازی نے اس کا ذکر کیا ہے۔ ان لوگوں کے لحاظ سے قدیم مصریوں میں اس جانور سے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں، مثلاً ان کے نزدیک عنقا ایک ایسا جانور تھا جس کا نچلا دھڑ خنزیر جیسا اور اوپری حصہ پرند کا ہوتا تھا، یہ پرند جو اپنی خوبصورتی میں تمام دنیا کے جانوروں میں یکتا خیال کیا جاتا تھا، نہایت مقدس بھی سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ مصری تناسخ پر یقین رکھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ مرنے کے بعد روح عنقا کا روپ اختیار کرلیتی ہے۔ چنانچہ اسی لئے وہ اپنے بادشاہوں کی قبروں میں اس پرند کے لئے غذا اور خوش بو دار اشیاء کو چھوڑتے تھے۔

بعض عنقا کو خوبصورت ارغوانی رنگ کا ایک ایسا پرند سمجھتے تھے، جس کا قد عقاب کے برابر ہوتا تھا، اور گردن سنہری رنگ کے پروں سے مزین ہوتی تھی، اس کے علاوہ اس کے سر پر پروں کا ایک تاج ہوتا اور آنکھیں اس قدر روشن ہوتیں کہ ان پر ستاروں کا گمان ہوتا تھا۔

اس پرند کی پیدائش کے متعلق بھی طرح طرح کی باتیں بیان کی جاتی تھیں مثلاً یہ کہ جب عنقا ۵۰۰ یا ۶۰۰ سال زندہ رہنے کے بعد ضعیفی کے آثار محسوس کرنے لگتا، (بعض مصنفین نے اس کی عمر ۱۲ سے ۱۴ سو سال تک بھی بیان کی ہے) تو جنگل سے خوش بو دار لکڑیاں جمع کر لاتا تھا اور پھر ان کے ڈھیر کو آگ لگا کر خود اس پر بیٹھ جاتا تھا۔

بعد میں اس خاک سے ایک اور عنقا کیڑے یا پرند کی شکل میں نمودار ہوتا تھا، اور جب یہ نوزائیدہ پرند اڑنے کے قابل ہو جاتا تو اپنے باپ کے ڈھانچے کو چونچ میں لے کر مصر کے شہر ہیلو پولیس (HELIPOLIS -) کی جانب پرواز کرتا، اس شہر میں سورج کے دیوتا کا مندر تھا اور یہاں ہمیشہ آگ سلگتی رہتی تھی، چنانچہ وہ اس ڈھانچے کو اس مقدس آگ میں جلنے کے لئے ڈال دیتا تھا۔

بعض لوگوں کا یہ بھی اعتقاد تھا کہ عنقا ہر پانچ یا دس سال میں ایک مرتبہ عربستان سے ہیلو پولس کی جانب اڑکر آتا ہے، چنانچہ پلائنی نے ایسے عینی شواہد کا ذکر کیا ہے جو اس کی رائے میں معتبر تھے۔ ایک مصری ماہر کہتا ہے کہ شہر (HELIPOLIS) میں سارس یا کلنگ کی قسم کا ایک پرند جس کا نام بنو یا بینو تھا، آفتاب کی پرستش کے ساتھ پوجا جاتا تھا، اور چونکہ بینو "پام" کے درخت کو بھی کہتے ہیں اس لئے ان کا خیال ہے کہ غالباً یہی پرند مصریوں کا "عنقاد" ہوگا۔ لیکن قدیم مصریوں کی روایتوں میں عنقا کو عرب، شام، ہندوستان یا حبش کا باشندہ کہا گیا ہے، نیز بینو کی جو تصاویر قدیم مصری

مقابر میں موجود ہیں ان سے عنقا کا سراپا بھی نہایت مختلف ہے۔

بعض محققین کا یہ بھی خیال ہے کہ عنقا مشتری سیارے کا نام ہے جو صبح کا ستارہ ہونے کی حیثیت سے آفتاب کا رہبر سمجھا جاتا تھا۔

عربوں میں عنقا کے متعلق کئی افواہیں مشہور تھیں، بعض اس کو پرند بعض حشرات کی قسم کا جانور سمجھتے تھے، نیز یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ اسبسطوس عنقا کے پروں سے تیار کیا جاتا ہے اس لئے کہ اس پر آگ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

عبداللہ یافعی نے مراۃ الخیال سے نقل کیا ہے کہ جوار اصحاب الرس میں ایک میل اونچا پہاڑ تھا، جس میں ہر طرح کے طیور رہا کرتے تھے، ایک دفعہ کسی برس میں ایک پرند بزرگ خلقت، طویل العنق، جس کا منہ آدمیوں کا سا اور اعضاء میں ہر ایک جانور کی مشابہت پائی جاتی تھی، اس پہاڑ پر آ نکلا، اول اول ان جانوروں کو ستانا اور ہلاک کرنا شروع کیا، پھر وہاں کے آدمیوں کے بچوں پر چوٹ کرنے اور پکڑ پکڑ کر کھانے لگا، ساکنان اصحاب الرس اس پرند کو عنقائے مغرب کہا کرتے تھے، جب اس جانور نے حد سے زیادہ ستانے پر کمر باندھی تو سب جمع ہو کر اپنے پیغمبر حنظلہ بن صفوان علیہ الرحمۃ والرضوان کے پاس گئے، پیغمبر کی دعا کے سبب اس آفت سے نجات پائی، کہتے ہیں جب سے یہ جانور کسی جزیرہ میں چلا گیا ہے۔

غالباً ایرانیوں کا قیاسی پرندہ سیمرغ، الف لیلیٰ اور مارکوپولو کے تذکروں کے سب پرندے بھی عنقا کی خصوصیت کے حامل تھے۔

بہر حال بعد میں رفتہ رفتہ دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ عنقا کا وجود محض فرضی ہے، اس لئے کہ اکثر نایاب، ناپید یا قیاسی اشیاء کو عنقا کہنے لگے، چنانچہ اردو کا محاورہ "عنقا ہونا" فارسی کے "عنقا شدن" کا لفظی ترجمہ ہے مثلاً ؎

سایہ کو پتہ نہ تھا شجر کا   عنقا تھا نام جانور کا   (مثنوی گلزار نسیم)

چاند

سوال ۔ کیا چاند میں آبادی ہے؟ اور اگر آبادی ہے تو کس قسم کے لوگ یہاں بستے ہیں؟   پریم ناتھ

جواب ۔ اگر زندگی سے ہماری مراد وہ حیات ہے جس کے مختلف مظاہر ہم ہماری دنیا میں دیکھنے کے عادی ہیں تو چاند میں اس قسم کی کسی شئے کے وجود کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ چاند میں "ہوا اور پانی" کا فقدان ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ ہوا یا فضائی گیس اور پانی زندگی کے لوازم ہیں۔ آج سے تین چار سو سال قبل تک بھی لوگ یہ سمجھتے رہے کہ چاند میں زندگی کے آثار ہوں گے، چنانچہ جرمنی کا مشہور سائنس داں کیپلر چاند میں نظر آنے والے آتش فشاں پہاڑوں کے متعلق غلطی سے یہ قیاس کرتا رہا کہ وہ چاند میں رہنے والے انسانوں کی بنائی ہوئی فصیلیں ہوں گی، لیکن بہت زمانہ بعد معلوم ہوا کہ یہ مردہ آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے ہیں۔

ہوا اور پانی کی عدم موجودگی کے علاوہ چاند کا ایک حصہ ہمیشہ آفتاب کی تیز شعاعوں کی زد میں آتا ہے اور دوسرا اس سے چھپا رہتا ہے، اس لئے ہوا نہ ہونے کی وجہ سے یہاں اس قدر سخت گرمی اور سردی پڑتی ہوگی کہ چاند میں کسی قسم کی حیات کے وجود کا قیاس ہی نہیں کیا جا سکتا تو بعض ماہرین اب تک یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں کی بعض گہری وادیوں میں اب بھی کچھ نہ کچھ فضائی گیسیں باقی ہوں گی جن کی وجہ سے ممکن ہے ان مقامات پر ادنیٰ قسم کے بعض نباتات پیدا ہوتے ہوں گے۔

لیکن اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ چاند ایک ایسی "دنیا" ہے جس میں جانور تو جانور پودوں کا بھی وجود نہیں البتہ اس "زمین" پر اونچے اونچے پہاڑوں کے ایسے سلسلے میلوں تک چلے گئے ہیں، جن کے ساتھ گہری تاریک وادیاں ہیں ان پہاڑی علاقوں کو ہم دوربین کی مدد سے اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں۔

م - ر - س

EGYPTIAN MYTH & LEGEND DA'MECKENZIE

(۱) دیکھئے صفحہ (۱۸۸)

(۲) دیکھئے فرہنگ آصفیہ جلد دوم صفحہ (۲۹۰)

تنقید و تبصرہ

زہراب

مترجمہ محمود احمد خاں ایم اے، دہلوی حجم ۹۵ صفحے۔ قیمت ۸ر۔ ناشر خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی

"زہراب" محمود احمد خاں صاحب نے ترجمہ کیا ہے ہینگ ویدرکے ایک ناولسٹ کا۔ اور اس کا مقدمہ جناب صادق الخیری نے لکھا ہے جو خود ایک بہت اچھے اور کافی پرانے مترجم ہیں۔ کہانی کا پس منظر مصر ہے۔ جس کی سرزمین پر ہزار واقعات کی جنم بھوم ہے۔ قصہ کافی دلچسپ ہے اور غم انگیز بھی "بھوک" کیسے تمناؤں کو پامال کرتی ہے۔ جذبات کو کچلتی ہے اور احساسات کو مجرم بناتی ہے۔ اور قسمت کے عجیب و غریب کھیل انسانی کھلونے سے کیونکر کھیلتے ہیں۔ یہ المیہ کہانی انہی حقائق کو بے نقاب کرتی ہے۔

دل کے آنسو

رئیس احمد جعفری حجم ۹۶ صفحے قیمت عہ۔ ناشر۔ مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳ ٹائٹل کے لحاظ سے موزوں خوبصورت گردپوش۔

رئیس احمد جعفری نے چھ مختصر افسانے لکھے ہیں۔ پلاٹ تقریباً ہر افسانے کا اچھا ہے اور دلچسپ بھی۔ لیکن جعفری صاحب افسانے کا خاتمہ ناقص طور پر کرتے ہیں۔ جس سے افسانے کی خوبی باقی نہیں رہتی۔ ابتدا اور عروج کافی اچھے ہوں لیکن اختتام چابکدستی سے نہ کیا جائے تو افسانے کا اثر مٹ جاتا ہے۔ اس کے لئے ابھی مشق کی ضرورت ہے۔ ویسے یہ افسانے عام پڑھنے والوں کے لئے دلچسپ ثابت ہوں گے۔

بیل بوٹے

از مظفر حسین شمیم حجم ۱۴۴ صفحے۔ قیمت عا۔ ناشر مکتبۂ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳ رنگین گردپوش۔

زیر نظر مجموعہ بیل بوٹے شمیم صاحب کے لکھے ہوئے مختلف مضامین، افسانوں، تبصرہ اور مقالوں کا مجموعہ ہے۔ مختلف عنوانات پر مختلف چیزیں موصوف نے لکھی ہیں اختصار کا بہت زیادہ لحاظ رکھا ہے۔ ان میں سے تقریباً سب مضامین ہندوستان کے عام پرچوں رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

لیکن اس قسم کے مجموعے کی اشاعت نہ اردو ادب کے لئے نفع بخش ہے نہ اردو داں طبقے پر کوئی احسان۔ آج کل ادیب بننا اور چند کتابوں کا مصنف بن جانا نہایت آسان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ادب کی خدمت کا صحیح طریقہ بہت کم ادیب جانتے ہیں۔ اور ذمہ داری کا احساس تو بہت ہی کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ شمیم صاحب واقعی کوئی اچھی چیز پیش کرنے کی کوشش کریں گے

شمس بازغہ

آنسہ محمودہ رضویہ صاحبہ مدیرہ مجلہ شیع حجم ۹۷ صفحے۔ قیمت ۸ر۔ مقام اشاعت انجمن ترقی اردو کراچی سندھ۔

محترمہ محمودہ رضویہ نے کئی ایک کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں سے ایک شمس بازغہ بھی ہے۔ آنحضرت صلعم کے مختلف واقعات زندگی محترمہ نے اپنے مخصوص طرز میں بیان کئے ہیں۔ باوجود کئی ایک کتابیں لکھنے کے ان کی ادبی ترقی کی رفتار پسندیدہ ہے۔ اچھا ہوتا اگر وہ فسانوی کتابیں لکھنے کی بجائے علمی اور تاریخی لکھتیں۔

گاؤں سدھار کے گیت

ماسٹر محمد شفیع الدین نیر حجم (۸۰) صفحے قیمت درج نہیں ناشر۔ آزاد بک ڈپو کوچہ چیلاں۔ دہلی۔

نیر صاحب بچوں کے شاعر ہونے کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں یہ گیت بھی ان کی نظموں کی طرح عام فہم اور ستھرے ہیں۔ لیکن بچوں کی بجائے ان کے مخاطب گاؤں کے باسی "دیہاتی بھائی" ہیں۔ دیہات کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا۔ لیکن دیہاتیوں کے لئے

یہ اپنے رنگ کی پہلی اور کامیاب کوشش ہے۔ دیہات سدھار کا یہ منظوم، معلومات آفریں اور دلچسپ طریقہ یقیناً فائدہ مند ثابت ہوگا۔

شمع فروزاں

مترجمہ صادق الخیری ایم اے۔ حجم ۱۰۸ صفحے قیمت ۱۲؍ مقام اشاعت خاتون کتاب گھر۔ دہلی۔

امریکہ کی نوبل پرائز یافتہ خاتون مسز پرل بک کے ایک انگریزی ناول کا ترجمہ لائق مترجم صادق الخیری صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا پورا پورا حق ادا کیا ہے "شمع فروزاں" ایک قدامت پرست چینی گھرانے کی تصویر ہے جسے ایک انگریزی تہذیب سے متاثر لڑکے نے اجاڑ دیا۔ یہ ایک فرض شناس ماں، خدمت گزار بہو، وفادار بیوی اور غیور و کم سخن عورت کی کہانی ہے۔ جس نے بہار کے انتظار میں سات سال تک آرزوؤں، امیدوں کے چمنستان کی آبیاری کی۔ لیکن خزاں کے ایک ہی جھونکے نے جسے پامال کردیا اور جب تمنائیں مردہ، آرزوئیں بے کام ثابت ہوئیں تو اس نے موت کے دامن میں پناہ لی۔

زبان شستہ و پاکیزہ ہے۔ داستان الم انگیز بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ چینی زندگی کو جیتا جاگتا دکھایا گیا ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ادبی ترجمے ہمارے ادب کے لئے بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

اچھی لڑکی

مصنفہ راحت النساء بیگم انصاریہ معلمہ مدرسہ صنعت و حرفت نسواں سرکار عالی۔ حجم ۹۶ صفحے قیمت ۸؍۔ ملنے کا پتہ۔ اندرون دبیر پورا۔ محاذی مسجد اثنا عشری مکان میر تراب علی صاحب مدرس نمبری (۵ ۲ ۳)

محترمہ راحت النساء بیگم صاحبہ نے لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل ایک بڑی اچھی کتاب لکھی ہے۔ اس میں ایک سلیقہ مند اور ایک پھوہڑ لڑکی کا بہت اچھی طرح مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ لڑکیوں کو اچھی تعلیم اور صحیح تربیت کی کتنی شدید ضرورت ہے۔ تاکہ آئندہ زندگی میں وہ اچھی بیوی، اچھی بہو اور اچھی ماں ثابت ہو۔ نیک، سلیقہ مند اور تعلیم یافتہ لڑکیاں خود بھی آرام پاتی ہیں اور دوسروں کو بھی آرام دیتی ہیں۔ زبان سلیس اور عام فہم ہے اور کہانی کی دلچسپی شروع سے آخر تک برابر قائم رہتی ہے۔ کم عمر لڑکیوں کو ضرور یہ کتاب پڑھنی چاہئے تاکہ وہ خود اس سے سبق لے سکیں۔ موصوفہ اگر آئندہ بھی بچیوں کے لئے ایسی کتابیں لکھیں تو اچھا ہو۔ کتاب کی ظاہری شکل و صورت، اپنی سیرت جتنی اچھی نہیں۔ اگر گرد پوش اچھا بنایا جاتا تو پھر کتاب ہر طرح دلکش ہوتی۔

۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے

مرتبہ۔ عبادت بریلوی حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت عال ناشر۔ حلقۂ ارباب دانش۔ کتاب خانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

عبادت بریلوی ایم اے۔ سکریٹری حلقۂ ارباب دانش لکھنؤ نے اردو ادب کے نوچوٹی کے لکھنے والوں کے افسانوں کو ایک جا کیا ہے۔ اس سے پہلے ہر سال بہترین نظمیں شایع ہوتی رہی ہیں۔ لیکن افسانوں کا یہ مجموعہ اپنی نوعیت کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس سے پہلے بہترین افسانے اور پسندیدہ افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن نئے ادب کی رفتار کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں افسانوی ارتقاء کی یہ مکمل تاریخ ہے۔ آئندہ اگر ہر سال کے افسانے یونہی شایع ہوتے رہیں۔ تو بہتر سے بہتر افسانوی ادب کی تدوین آسانی سے ہوتی رہے گی۔

افسانوں کا انتخاب تین ادیبوں نے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے معیاری افسانوں کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن عوام خود مطالعہ کے بعد معلوم کرسکتے ہیں کہ واقعی یہ کہاں تک ۱۹۴۳ء کے بہترین افسانے ہیں۔

"1"

۱۴۱۔ مرزا محمود حسین بیگ
۱۴۳۔ سید محمود علی
۱۴۶۔ شیخ محبوب
۱۴۷۔ عبدالحفیظ
۱۵۰۔ سید الطاف حسین
۱۵۲۔ سید عبدالکریم
۱۵۳۔ محمد حسین
۱۵۸۔ شاہ محمد صالح
۱۶۱۔ سیف الدین
۱۶۹۔ صلاح الدین
۱۷۰۔ محمد بشیر خاں
۱۷۶۔ عبداللہ بن عمر
۱۷۸۔ سید رسول
۱۷۹۔ محمد خاں
۱۸۰۔ منور حسین
۱۸۱۔ شیخ فرید
۱۸۲۔ شیخ حسین
۱۸۳۔ راجیا
۱۸۴۔ سید عبدالغنی
۱۸۵۔ شیخ محبوب
۱۸۶۔ سید بشیر علی
۱۸۷۔ شیخ حیدر
۱۸۸۔ سید مومن علی
۱۸۹۔ محمد چاند
۱۹۰۔ عبدالرؤف
۱۹۱۔ غلام غوث
۱۹۲۔ محمد خواجہ حسین
۱۹۳۔ سید معین الدین
۱۹۴۔ شیخ عبدالمجید
۱۹۵۔ محمد غوث

۱۹۶۔ اکبر علی خاں
۱۹۷۔ محمد عبدالرحیم
۲۰۲۔ اکبرالدین خاں
۲۰۳۔ میر عطا علی
۲۰۴۔ غلام مصطفےٰ خاں
۲۰۵۔ محمد یوسف
۲۰۶۔ رحمت حسین
۲۰۷۔ محمد برہان
۲۰۸۔ رام شنکر
۲۰۹۔ محمود علی
۲۱۱۔ عبدالحمید شاہ خاں
۲۱۲۔ وزیر شاہ خاں
۲۱۳۔ محمد عبدالقادر
۲۱۴۔ محمد برہان
۲۱۵۔ محمد رحمت علی
۲۱۶۔ سوامی داس
۲۱۷۔ محمد یوسف شریف
۲۱۸۔ محمد شہاب الدین
۲۱۹۔ موہن سنگھ
۲۲۱۔ محمد عبدالکریم خاں
۲۲۵۔ محمد عبدالمجید خاں
۲۲۸۔ محمد کریم الدین
۲۳۳۔ ابراہیم خاں
۲۳۴۔ سید ضیاءالدین
۲۳۷۔ داؤد خاں
۲۳۸۔ عبدالوحید خاں
۲۳۹۔ قطب الدین
۲۴۰۔ حاجی شریف
۲۴۲۔ سالم
۲۴۳۔ عبداللہ

۲۴۴۔ محمد
۲۴۶۔ محبوب
۲۴۷۔ فیروز
۲۴۸۔ سعید
۲۴۹۔ عبدالقادر
۲۵۰۔ عبداللہ
۲۵۱۔ سلیمان
۲۵۲۔ عبدالرحمن
۲۵۳۔ حسین
۲۵۵۔ سالم
۲۵۶۔ محبوب
۲۵۷۔ محمد بن آدم
۲۵۸۔ محمد بن حسن
۲۶۰۔ متیا
۲۶۱۔ سید رضی الدین احمد
۲۶۲۔ سید عبدالقیوم شاہ آبادی
۲۶۴۔ امیر علی
۲۶۶۔ احمد حسین
۲۶۷۔ سید محبوب حسین
۲۶۸۔ میاں خاں
۲۶۹۔ سید یٰسین
۲۷۰۔ بجرنگ سنگھ
۲۷۱۔ حسین علی
۲۷۲۔ مرزا احمد بیگ
۲۷۳۔ معین الدین
۲۷۶۔ سید عبدالحی
۲۷۷۔ عبدالرحیم
۲۷۸۔ قادر خاں
۲۷۹۔ مصطفےٰ حسین
۲۸۰۔ امیر حسین

۲۸۱۔ مرزا مصطفےٰ بیگ
۲۸۲۔ سید سلطان
۲۸۳۔ محمد بن سالم
۲۸۴۔ محمد یوسف
۲۸۶۔ جنگیا
۲۸۷۔ سید جعفر
۲۸۸۔ حمید بیگ
۲۸۹۔ میر ارشد علی
۲۹۰۔ مظفر حسین
۲۹۲۔ سید خواجہ حسین
۲۹۳۔ سید خواجہ معین الدین
۲۹۵۔ سرور خاں
۲۹۶۔ دستگیر شاہ
۲۹۷۔ عبدالعزیز
۲۹۸۔ میر اسمٰعیل علی
۳۰۱۔ گل محمد خاں
۳۰۳۔ عبداللہ
۳۰۴۔ سید وجیہ الدین
۳۰۵۔ سردار خاں
۳۰۶۔ شیخ احمد
۳۰۸۔ عبدالغنی خاں
۳۰۹۔ محمد نور خاں
۳۱۰۔ احمد
۳۱۲۔ غلام احمد خاں
۳۱۳۔ عمر خاں
۳۱۴۔ محمد معین الدین
۳۱۵۔ اکبر حسین
۳۱۶۔ غلام افضل خاں
۳۱۷۔ دلاور حسین
۳۱۸۔ ایوب خاں

۳۱۹۔ سید حافظ
۳۲۰۔ محمد نصیر الدین
۳۲۱۔ غلام محمد خاں
۳۲۲۔ یعقوب علی خاں
۳۲۳۔ عبد الرشید خاں
۳۲۴۔ سالم بن عبد اللہ
۳۲۵۔ میر اشرف علی
۳۲۷۔ صاحب حسین

مرکز مومن آباد فوج

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۳۲۹۔ محمد قتان
۳۳۰۔ عبد المجید خاں
۳۳۲۔ میر کاظم علی
۳۳۳۔ عبد العظیم خاں
۳۳۹۔ فدا محمد
۳۴۰۔ محمد وزیر الدین
۳۵۷۔ شیخ اسمٰعیل
۳۶۹۔ عبد الغنی
۳۷۰۔ عثمان خاں
(کامیاب)
۳۲۸۔ محمد غوث
۳۳۱۔ محمد ظہور خاں
۳۳۴۔ سلامت اللہ خاں
۳۳۵۔ عبد الغنی
۳۳۶۔ سید محی الدین
۳۳۷۔ محمد حسن الدین
۳۳۸۔ عبد الرزاق
۳۴۴۔ محمد جہانگیر
۳۴۵۔ محمد مخدوم حسین
۳۴۶۔ عثمان خاں
۳۴۷۔ احمد حسین
۳۴۸۔ نیاز علی خاں
۳۴۹۔ فضل احمد خاں
۳۵۰۔ بسم اللہ خاں
۳۵۱۔ عبد الجبار خاں
۳۵۲۔ عبد الغفور
۳۵۵۔ شیخ مولانا
۳۵۶۔ رام موہن سنگھ
۳۵۸۔ عبد الرزاق
۳۶۰۔ محمد محبوب
۳۶۱۔ عبد الکریم
۳۶۲۔ شکور خاں
۳۶۳۔ محمد ابراہیم
۳۶۵۔ شیخ کریم
۳۶۶۔ حسن شریف
۳۶۷۔ شریف محمد
۳۶۸۔ شیخ رحیم
۳۷۱۔ امام علی خاں

مرکز بشیر آباد (ذکور)

(کامیاب)
۳۷۳۔ سید سعید الدین احمد
۳۷۴۔ محمد عبد الرفیع
۳۷۷۔ محمد امین الدین
۳۷۹۔ اننت راؤ
۳۸۲۔ سوامی
۳۸۳۔ سید نظام الدین
۳۸۵۔ سید رفیع الدین حسین نسیم

مرکز بشیر آباد (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۰۴۔ مہر النساء بیگم
(کامیاب)
۳۸۷۔ رحیم النساء بیگم
۳۸۹۔ اختر جہاں بیگم
۳۹۰۔ آمنہ بیگم
۳۹۱۔ اصغری بیگم
۳۹۲۔ امت اللہ بیگم
۳۹۳۔ اختر النساء بیگم
۳۹۴ منور خاتون
۳۹۵۔ احمد النساء بیگم
۳۹۶۔ بلقیس بیگم
۳۹۷۔ ضامن خاتون
۳۹۸۔ ممتاز جہاں بیگم
۳۹۹۔ رحمت بانو
۴۰۰۔ سکینہ بیگم
۴۰۱۔ بیگم جانی
۴۰۲۔ رقیہ بیگم
۴۰۳۔ چاند بیگم
۴۰۵۔ شاہ جہاں بیگم

مرکز بمبئی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۱۸۔ جدو پرشاد
۴۴۶۔ عبد الرزاق
۴۵۰۔ قاسم
(کامیاب)
۴۱۰۔ اسمٰعیل
۴۱۲۔ اسمٰعیل بھائی
۴۱۳۔ امام الدین
۴۱۶۔ بدر الدین
۴۲۱۔ حاتم بھائی
۴۲۳۔ خوشحال داس
۴۲۵۔ رام چندر
۴۲۷۔ رمضان علی
۴۳۱۔ سید نواب علی
۴۳۲۔ بشیر احمد
۴۳۵۔ شیخ داؤد
۴۳۹۔ شیخ محمد قاسم
۴۴۰۔ شیخ ولی محمد
۴۴۱۔ عباس
۴۵۲۔ کرشنا
۴۵۴۔ گردھر لال
۴۵۷۔ محمد خالد
۴۶۵۔ نصیب اللہ خاں
۴۶۹۔ ہارون
۴۷۰۔ ہدایت اللہ
۴۷۱۔ دتاترے
۴۷۲۔ منوہر
۴۷۳۔ پربھاکر
۴۷۴۔ وسنت

مرکز بمبئی (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
۴۸۲۔ مسز دھرم وتی
۴۸۶۔ مس لیلا
(کامیاب)

۶۰۲۔ راجندر
۶۰۴۔ مادھوراؤ
۶۰۵۔ محمد حبیب اللہ خاں
۶۰۹۔ حفیظ اللہ خاں
۶۱۲۔ محمد ظہیر الدین
۶۱۷۔ سید وہاب الدین
۶۲۱۔ واحد الحق

مرکز دیگلور (اناث)

(کامیاب با امتیاز)

۶۲۴۔ اقبال النساء بیگم
۶۲۸۔ رضیہ بیگم

(کامیاب)

۶۲۳۔ فضیلت النساء بیگم
۶۲۵۔ قمر سلطانہ خاتون
۶۲۶۔ اختر بانو
۶۲۷۔ وحیدہ بانو

مرکز ناگر کرنول (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)

۶۲۹۔ محبت علی خاں
۶۴۲۔ نور خاں
۶۴۷۔ عبود بن صالح

(کامیاب)

۶۳۲۔ محمد اسمٰعیل خان
۶۳۵۔ عبد الحمید
۶۳۶۔ رام سنگم
۶۳۷۔ واحد خاں
۶۳۸۔ شیخ بالے
۶۴۰۔ محمد حسین
۶۴۱۔ محمد ابراہیم
۶۴۳۔ داؤد خاں
۶۴۴۔ امین الدین
۶۴۶۔ اسد اللہ خاں
۶۴۸۔ محمد جعفر علی
۶۵۰۔ مرزا حسن علی بیگ
۶۵۱۔ بسم اللہ خاں
۶۵۲۔ محمد اکبر علی
۶۵۵۔ حبیب خاں

مرکز ناگر کرنول (اناث)

(کامیاب با امتیاز)

۶۷۰۔ طیبہ بیگم صدیقی (دوم)

(کامیاب)

۶۷۸۔ محبوب بیگم
۶۷۹۔ حلیمہ بیگم

مرکز نظام آباد (ذکور)

(کامیاب با امتیاز)

۶۶۱۔ محمد حسین
۶۶۳۔ بشیر احمد
۶۶۴۔ محمد عبد الرحیم
۶۶۶۔ محمد عثمان خاں
۶۸۰۔ نرسلو
۶۸۲۔ بی اشتنا
۶۸۴۔ بی پربھو راجم

(کامیاب)

۶۵۸۔ سید محبوب علی
۶۵۹۔ عبد الستار
۶۶۰۔ شیخ علی
۶۶۲۔ محمد بدیع الدین
۶۶۸۔ کاشی ناتھ راؤ
۶۶۹۔ جنار دھن راؤ
۶۷۰۔ رانگولو
۶۷۱۔ کے گوبند والا
۶۷۳۔ وینکٹ نرسیا
۶۷۴۔ کے راجندر
۶۷۵۔ وی وینکٹیشم
۶۷۶۔ کے۔ وینکٹیشم
۶۷۷۔ شنکر
۶۷۹۔ اروتی راؤ
۶۸۱۔ ایم لمکیا
۶۸۳۔ دتا ریڈی

مرکز نظام آباد (اناث)

(کامیاب با امتیاز)

۶۸۶۔ جمیل النساء بیگم
۶۸۷۔ سیدہ حجاب النور ہاشمی
۶۸۸۔ کریم النساء بیگم
۷۰۱۔ عائشہ بی

(کامیاب)

۶۸۵۔ شمس النساء بیگم
۶۸۹۔ جعفری بیگم
۶۹۰۔ نظام خاتون
۶۹۱۔ سلیم النساء بیگم
۶۹۲۔ حلیمہ بیگم
۶۹۳۔ فرید بی
۶۹۴۔ خورشید النساء بیگم
۶۹۶۔ صاحب النساء بیگم
۶۹۷۔ غفور النساء بیگم
۶۹۸۔ حامد النساء بیگم
۶۹۹۔ سیدہ تہذیب النساء بیگم
۷۰۲۔ امیر النساء بیگم

مرکز ہنگولی (ذکور)

(کامیاب)

۷۰۴۔ رادھے شیام
۷۰۷۔ شیو داس
۷۰۸۔ پرسرام
۷۱۰۔ سید لیاقت علی
۷۱۱۔ محمد ابراہیم
۷۱۲۔ محمد ہاشم
۷۱۳۔ خواجہ معین الدین خاں
۷۱۴۔ میر حمایت علی
۷۱۵۔ محمد اسمٰعیل خاں
۷۱۶۔ محمد عبد الحق
۷۱۷۔ محمد عبد الوہاب
۷۲۱۔ محمد ثناء اللہ خاں
۷۵۷۔ پنڈرت راؤ
۷۵۹۔ بالکشن
۷۶۰۔ نارائن
۷۶۲۔ نارائن
۷۶۳۔ ایرپا

مرکز ہنگولی (اناث)

(کامیاب)

۷۲۲۔ طاہرہ بیگم
۷۲۳۔ عابدہ بیگم
۷۲۴۔ عابدہ بیگم

۲۵. شہزادی بیگم	۳۰. قمر النساء بیگم	۳۸. زینت النساء بیگم	۴۳. زینب بیگم
۲۶. اختر النساء بیگم	۳۳. قمر النساء بیگم	۳۹. حفیظ النساء بیگم	۴۴. شاہجہان بیگم
۲۷. عابد النساء بیگم	۳۴. سرور النساء بیگم	۴۰. سروری بیگم	
۲۸. زاہدہ بیگم	۳۵. صفیہ بیگم	۴۱. عابدہ بیگم	
۲۹. مشیر النساء بیگم	۳۶. ہاجرہ بیگم	۴۲. عزیز النساء بیگم	
	۳۷. عزیز النساء بیگم		

شعبۂ تعلیم بالغان و اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن شاخ بنگلور اور ننجن گوڈ کا قیام

اردو تحریک کی ریاست میسور کے اضلاع میں اردو زبان اور ادب کے مطالعہ کے ذوق کی ترقی اور توسیع کے سلسلے میں بنگلور اور ننجن گوڈ میں شعبۂ تعلیم بالغان و اردو امتحانات ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا قیام عمل میں آیا ہے اور ہر جگہ پر ممتاز مقامی کارکنوں پر مشتمل مجلس انتظامی کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔

بنگلور صدر۔ جناب ایم عبدالوہاب صاحب ایم اے بار ایٹ لا صدر مدرسہ فوقانیہ، فورٹ بنگلور۔

نائب صدر (۱) جناب متولی جے یس ظفر عادل صاحب۔

(۲) جناب بی، عبدالرؤف صاحب قریشی۔

معتمد۔ جناب بی عبدالجلیل صاحب ایم اے۔

شریک معتمد۔ جناب محمد ابراہیم صاحب۔

خازن جناب عبدالرزاق صاحب۔

ارکان۔ آر، او، جبار خاں صاحب۔ جے عبدالقادر صاحب۔ جناب خلیل اللہ شریف صاحب۔ جناب محمد غوث صاحب۔ جناب عبدالرسول صاحب۔ جناب محمد صالح صاحب۔ جناب عبدالقدوس۔ جناب عبدالجلیل صاحب۔ جناب عبدالصمد صاحب۔ جناب سید بابا صاحب۔ جناب عبدالصمد خاں صاحب۔

ننجن گوڈ صدر۔ جناب سید یٰسین صاحب۔

معتمد۔ جناب محمد عبدالمجید خاں صاحب۔

ارکان۔ جناب محمد غیب صاحب۔ جناب اکبر شریف صاحب۔ جناب بی محمد غیب صاحب۔ جناب سید اسد اللہ صاحب۔ جناب مولوی سید حامد عماد الدین صاحب۔

روداد شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام رفعت منزل تاریخ ۲۰ آذر ۱۳۵۴ف صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا جس میں حسب ذیل ارکان نے شرکت کی۔

۱۔ محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ۔
۲۔ " بشیر النساء بیگم صاحبہ
۳۔ " جہاں بانو بیگم صاحبہ
۴۔ " تہنیت النساء بیگم صاحبہ
۵۔ " سعید النساء بیگم صاحبہ
۶۔ " عظمت النساء بیگم صاحبہ (مسز قیوم)
۷۔ " رفیعہ سلطانہ بیگم صاحبہ
۸۔ " سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ

محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ نے شرکت سے معذرت کا پیام بھیجا اور تصدق فاطمہ بیگم نے بوجہ ناسازئی مزاج شرکت نہ کی۔

سابقہ اجلاس کی روداد کی سماعت و توثیق کے بعد اس سے متعلق امور پر غور کیا گیا۔

(۱) بزم ادب کے جلسہ کے لئے لطیف النساء بیگم صاحبہ سے یہ طے ہوا تھا کہ ذیقعدہ میں یہ جلسہ ترتیب دیا جائے لیکن لطیف النساء بیگم صاحبہ نے کہلا بھیجا کہ لیڈی ٹوانٹیم اور وائسرائن کے لئے مدرسہ محبوبیہ میں خاص تیاریوں کی وجہ مصروفیت زیادہ

ہے اس پر بھی محکمہ کوشش کی جارہی ہے اگر ہو سکے تو آخر ذیقعدہ تک جلسہ کر دیا جائے گا۔

(۲) مدرسۂ اطفال کی معلمہ اور خادمہ کی درخواستوں کو گزشتہ اجلاس پر پیش کرنے پر یہ تصفیہ ہو چکا تھا کہ سرکاری امداد کی اجرائی کے بعد اس کا تصفیہ کیا جائے گا لیکن مگر انکار صاحب نے اس پر مزید توجہ دلاتے ہوئے اس کے فوری تصفیہ کی درخواست کی۔

بالآخر یہ طے پایا کہ معلمہ کو پانچ روپے اور خادمہ کو تین روپے بطور الاؤنس ماہ آذر ۱۳۵۴ف سے دیئے جائیں لیکن ان کی اجرائی حصول امداد کے بعد ہوگی۔

چندہ سالانہ سے جمع شدہ رقم مبلغ (للعہ) روپے چھ آنے مسز عبدالقیوم صاحب نے معتمد کے حوالے کئے۔

اس کے بعد دستور العمل اور اس کے قواعد زیر بحث آئے ارکان کی بھی بعض تجویزیں سنائی گئیں اور ان پر غور کیا گیا۔

قاعدہ نمبر ۲ فقرہ ۲ (متعلق مدت رکنیت) جہاں بانو بیگم اور عظمت النساء بیگم کا خیال تھا کہ سہ سالہ ہونا زیادہ مناسب ہوتا لیکن کیونکہ قاعدہ کی رو سے دوبارہ منتخب ہونے کی گنجائش موجود تھی اس لئے کثرت رائے ان کے خلاف تھی اور دو سالہ رکنیت برقرار رکھی گئی۔

قاعدہ نمبر ۲ کے تیسرے فقرے کی مسز قیوم اور تہنیت النساء بیگم نے قید اٹھا دینے کی سفارش کی تھی اور دوسرے رکن کی طرح عہدہ دار کو بھی دوبارہ نامزد کئے جانے کی تجویز کی تھی جس کی تائید بشیر النساء بیگم صاحبہ۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور سعید النساء بیگم صاحبہ نے بھی کی لیکن معتمد نے اصول کے لحاظ سے اس فقرہ کی منظوری کی درخواست کی اس کی ضرورت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی ترمیم سے اپنا اختلاف ظاہر کیا۔ کثرت رائے چونکہ معتمد کے خلاف تھی اس لئے تصفیہ کو مجلس انتظامی کی صوابدید پر چھوڑنے کی رائے ہوئی۔

بقیہ قاعدے بکثرت آراء منظور ہوئے اور دستور العمل بحیثیت موجودہ صرف قاعدہ نمبر ۲ فقرہ ۳ کی ترمیم کے ساتھ منظوری مجلس انتظامی نافذ کروا دینے کی اجازت ارکان سے حاصل کی گئی۔

کیونکہ یہ اجلاس بطور خاص دستور العمل کی منظوری و نفاذ کے متعلق تھا۔ اس لئے اس کے بعد دوسری کوئی کارروائی نہ ہوئی اور مجلس برخاست کی گئی۔

(نوٹ) اجلاس کے ختم پر محترمہ عظمت النساء بیگم صاحبہ کی پیش کردہ تحریک تعزیت منظور کی گئی جو حسب ذیل ہے۔

شعبۂ نسواں ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی منعقدہ ۲۸ آذر ۱۳۵۴ف م ۲ نومبر ۱۹۴۴ء میں خلیفۃ المسلمین سلطان عبدالمجید خاں ثانی کی وفات حسرت آیات پر جو قرار داد تعزیت متفقہ طور پر منظور کی گئی اس کو حسب تصفیہ مجلس علیا حضرت شہزادی ہر ہائنس درشہوار رعدوانہ بیگم صاحبہ شہزادی برار کی خدمت اقدس میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جاتی ہے۔

"خلیفۃ المسلمین اعلیٰحضرت سلطان عبدالمجید خاں مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسواں کی یہ مجلس انتظامی اپنے دلی رنج والم کا اظہار کرتی ہے سلطان مرحوم اس عثمانی خاندان کے چشم و چراغ اور جلیل القدر سلطان تھے جس نے اسلام کی خدمت کے علاوہ علم و فضل کی بھی صدیوں سرپرستی کی ہے۔ ان کی وفات سے مسلمانان عالم کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ خاص کر ہر ہائنس حضرت علیا شہزادی صاحبہ برار کو اپنے پدر محترم کی مفارقت کا جو دلی صدمہ ہوا ہے اس سے یوں تو جملہ خواتین اسلام متاثر ہوئیں لیکن خاص کر دکن کی خواتین اس سے بیحد غمگین ہیں۔ ہماری دلی دعا ہے کہ باری تعالیٰ سلطان مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور علیا حضرت شہزادی صاحبہ کو اس جانگداز سانحہ میں صبر و استقامت عطا فرمائے۔"

——— معتمد شعبۂ نسواں

تاریخ دکن کانفرنس

ادارہ کے شعبۂ تاریخ کی تحریک پر جو تاریخ دکن کانفرنس منعقد ہو رہی ہے اس کی رکنیت استقبالیہ کیلئے عالیجناب نواب علی یاور جنگ بہادر نے حسب ذیل دعوت نامہ لکھا ہے:

جناب والا.

سرزمین دکن اور خاص کر مملکت حیدرآباد کی تاریخ اپنی گوناگوں خصوصیات اور اہمیت کی وجہ سے ماہرین تاریخ کا مرکز نظر بنی رہی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر مورخین اور سرکاری و خانگی ادارے کام کرتے آئے ہیں۔ یہ کام اب ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے جبکہ شعبۂ تاریخ ادارۂ ادبیات اردو نے محسوس کیا کہ تاریخ دکن سے متعلق ماہرین تاریخ اور صاحبان ذوق ایک مرکز پر مجتمع ہوں اور دکن کی تاریخ کے کام کو آگے بڑھانے میں ایک دوسرے سے استفادہ کریں۔ نیز اس سے دلچسپی رکھنے والوں کے آپس کے میل ملاپ اور ذہنی تعلقات میں اضافہ ہو۔

اس تخیل کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو کی تحریک اور شعبۂ تاریخ جامعۂ عثمانیہ۔ انجمن تاریخ و اثریات حیدرآباد۔ دفتر دیوانی و مال سرکار عالی۔ محکمۂ آثار قدیمہ۔ بزم تاریخ جامعۂ عثمانیہ اور ہسٹری یونین نظام کالج کے اشتراک سے طے پایا کہ ایک ایسی تاریخ دکن سوسائٹی قائم کی جائے جو ہر دو سال میں کسی نہ کسی مقام پر اپنی ایک کانفرنس بھی منعقد کرتی رہے چنانچہ اس کی پہلی کانفرنس اپریل ۱۹۳۸ء میں منعقد کی جائیگی جس میں مختلف جامعات اور اداروں کے ماہرین تاریخ کے علاوہ ایسے اصحاب بھی شرکت کریں گے جو تاریخ دکن کے متعلق کام کر رہے ہیں یا اس سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس انجمن اور کانفرنس کی سرپرستی اعلیٰحضرت بندگان سلطان العلوم خسرو دکن و برار نے ازراہ معارف پروری قبول فرما کر عزت بخشی ہے۔ آنریبل سر اکبر حیدری صدر المہام مال حکومت سرکار عالی نے انجمن کی پہلی کانفرنس کی صدارت قبول فرمائی ہے اور ہز ایکسلنسی نواب صاحب چھتاری صدر اعظم دولت آصفیہ ازراہ علم دوستی اس کا افتتاح فرمائیں گے۔

کانفرنس کی اس پہلی نشست حیدرآباد میں مختلف اجلاسوں کی صدارت اور ان میں شرکت اور مقالے پیش کرنے کے لئے دکن اور ہندوستان کے مشہور ماہرین تاریخ کو مدعو کیا گیا ہے اور اکثر نے اس دعوت کو قبول بھی کر لیا ہے۔

کانفرنس کے سلسلہ میں دکن کے تاریخی آثار، مخطوطات اور مطبوعات نیز تاریخی کاغذات کی ایک اعلیٰ پایہ کی نمائش بھی منعقد کی جائیگی جو اہل ملک میں تاریخ دکن کا ذوق بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔

انعقاد کانفرنس کے انتظامات ایک مشترکہ مجلس استقبالیہ کے سپرد ہیں جو اس امر کی متمنی ہے کہ اس مفید تحریک کو کامیاب بنانے میں دکن اور اس کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جملہ اصحاب خاطر خواہ اعانت فرمائیں گے۔

کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی رکنیت کے لئے دس روپیہ چندہ مقرر کیا گیا ہے لیکن امید ہے کہ آپ اپنی جانب سے کوئی عطیہ بھی ارسال فرمائیں گے۔ رکن مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے کانفرنس کے عام اجلاسوں میں شرکت کے مجاز ہونے کے علاوہ آپ کی خدمت میں وہ کتاب بھی بطور تحفہ ارسال کی جائیگی جس میں اس اجتماع کے خطبے، مقالے، تجویزیں اور روداد شائع ہوگی۔

مجلس استقبالیہ کی رکنیت کا چندہ اور عطیہ براہ کرم مجلس انتظامی کے معتمد مولوی عبد المجید صاحب صدیقی یا معتمد ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ کے نام دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد کے پتہ پر ارسال فرمایا جائے۔

علی یاور جنگ

مرکز ناگر کرنول

بتاریخ ۵ ماہ دے سنہ ۱۳۵۵ف ۹ بجے سویرے کاچی گوڑہ اسٹیشن سے راہی ناگر کرنول ہوا۔ ناگر کرنول جانے کے لئے جڑچرلہ اسٹیشن پر اترنا پڑتا ہے۔ اسٹیشن پر اتر کر سیدھے بس گیا جو چلا گیا۔ خوش قسمتی سے مولوی امیر الدین صاحب معزز تحصیلدار ناگر کرنول سے بس میں ملاقات ہوئی اور اس ناہموار راستہ کی تکلیف مولوی صاحب موصوف سے دلچسپ گفتگو میں محسوس نہ ہو سکی اور پونے گیارہ بجے منزل مقصود پر پہنچا۔

ہم دونوں جناب دوم تعلقدار صاحب کے مکان پہنچا اور تحصیلدار صاحب نے صاحب ممدوح سے میرا تعارف کرایا۔ میرے پہنچنے کے دوسرے ہی دن کلب میں مشاعرہ تھا اور بلدہ سے جناب نظر، ساجد اور ادیب صاحب بھی تشریف لانے والے تھے۔ ان حضرات کو میرے ہمراہ نہ پاکر جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنی تشویش کا اظہار فرمایا۔ لیکن اسی روز شب میں ½۱۰ بجے شعرائے کرام اپنے دوسرے احباب کے ساتھ رونق افروز ہوئے۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے اطمینان کا سانس لیا اور میں نے بھی اپنی دلچسپی میں ایک اضافہ محسوس کیا۔

دوسرے دن صبح ناشتہ سے پہلے میں نے امتحان گاہ کا معائنہ کیا جو جناب دوم تعلقدار صاحب کے دولتخانہ کے بالکل محاذی واقع انجمن امداد باہمی کے وسیع ہال میں مقرر کیا گیا تھا۔ اسی ہال کے پچھلے حصہ میں اناث کے لئے انتظام کیا گیا تھا۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنی موٹر کے ذریعہ لڑکیوں اور صدر معلمہ صاحبہ کو لانے اور لیجانے کا انتظام کیا تھا۔ اناث کی نگرانی کے لئے صدر معلمہ صاحبہ مدرسہ نسواں اور بیگم صاحبہ مددگار مہتمم پولیس کا انتخاب کیا گیا تھا۔ طبقۂ ذکور کی نگرانکاری کے لئے مولوی احمد حسین علی صاحب وکیل و مولوی مظفر الدین صاحب پیشکار اور مولوی محمد رسول خان صاحب انتخاب ہوئے تھے۔ ذکور میں (۲۱) امیدواروں کے منجملہ (۹) امیدوار غیر حاضر رہے۔ طبقۂ اناث میں حاضری برابر تھی۔ میقات دوم میں اناث کی حاضری برابر رہی اور ذکور میں (۱۱) امیدوار غیر حاضر رہے۔ خارجی طور پر یہ معلوم کرکے مجھے افسوس ہوا کہ غیر حاضر امیدوار کچھ تو سررشتہ پولیس اور کچھ سررشتہ مال سے تعلق رکھتے ہیں اور بے چاروں کو عین امتحان ہی کے روز ڈیوٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔ میں ادارۂ ادبیات اردو سے پرزور الفاظ میں یہ استدعا کروں گا کہ ادارہ اپنی طرف سے عام طور پر آئندہ کے لئے ان عہدہ داران متعلقہ کو توجہ دلائے کہ امتحان کے روز ان امیدواروں کو جنھوں نے امتحان میں شرکت کی ہو کسی سرکاری کام یا خانگی ڈیوٹی پر نہ بھجوایا کریں۔ اس سے نہ صرف علم دوستی مقصود ہوگی بلکہ ملک اور قوم کی ایک بے بہا خدمت انجام پائے گی۔

دوران امتحان میں جناب دوم تعلقدار صاحب نے امتحان گاہ تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی اور کافی عرصے تک وہاں ٹھیرے رہے۔ اسی اثناء میں صاحب موصوف نے اپنی طرف سے ناگر کرنول کی سمت میں طبقۂ اناث و ذکور سے اول آنے والے امیدوار کو ایک ایک نقرئی تمغہ دینے کا اعلان فرمایا۔ جناب دوم تعلقدار صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ سید محمود حسن صاحب بی اے ایل ایل بی منصف ناگر کرنول نے ادارہ کی صدارت قبول فرمائی ہے اور مولوی حفیظ حسن صاحب مددگار مہتمم پولیس نے معتمدی قبول کی ہے۔ جناب مددگار صاحب مہتمم پولیس سے کچھ دیر ملاقات رہی۔ میں نے صاحب موصوف کو ایک سچا ہمدرد اور قوی ارادہ رکھنے والا انسان پایا۔

یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ اکثر امیدواروں کی فیس امتحان جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنی جیب خاص سے خود عنایت کی ہے۔ یہ ہے قومی کام اور اسی کا نام ہے قومی خدمت۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سبھوں کا دل مولوی عارف الدین حسن صاحب جیسا بنا دے جن کا دل و دماغ غریبوں اور بیکسوں کے لئے وقف ہے۔

زبانی امتحان سوا پانچ بجے تک جاری رہا۔ حسب قاعدہ تمام امور کی تکمیل کرکے میں جناب دوم تعلقدار صاحب کے گھر لوٹ آیا۔ چائے پی کر شعرائے کرام کے ساتھ جناب دوم تعلقدار صاحب کی رہبری میں بستی کی طرف چلے۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے ایک دار المطالعہ کا اور اسی سے متعلق ایک کلب کا معائنہ کرایا جہاں اکثر ملکی اور اردو کتابیں اور رسائل پائے گئے۔ یہ دار المطالعہ اور کلب جناب دوم تعلقدار صاحب ہی کا قائم کردہ ہے۔ صاحب ممدوح کو ناگر کرنول

آنے ہوئے صرف ۱½ ماہ کا عرصہ ہوتا ہے کس قلیل ترعرصہ میں صاحب موصوف نے رعایا کے دل کی گہرائیوں میں جو جگہ حاصل کی ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ دارالمطالعہ سے چلتے وقت جناب دوم تعلقدار صاحب کی خواہش پر جناب نظر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی اور ان دیہاتی بھائیوں میں سے جو اکثر ہندو تھے ایک صاحب نے بھی تقریر کی۔ جناب دوم تعلقدار صاحب نے اپنے گرانمایہ پند و نصائح سے ہم سب کو مستفید فرمایا۔ سرشام ہم سب آفیسرس کلب واپس ہوئے جہاں ہمارے لئے عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا اور مشاعرہ بھی مقرر تھا۔ ۹½ بجے کھانے سے فارغ ہو گئے اور مشاعرہ کی دلچسپ محفل آراستہ ہوئی۔ جناب حمید صاحب جو ناگر کرنول کے سرکل انسپکٹر پولس ہیں میر مشاعرہ بنائے گئے اور پہلی نظم ساجد حیدرآبادی نے سنائی اور مقامی شعراء میں قتیل صاحب نے پیکر نظر حیدرآبادی کی پرکیف نظم کے سب مزے لے رہے تھے ان کے بعد ادیب صاحب نے گہر افشانی شروع کی۔ اس کے بعد کمترین بھی مشاعرہ کی زد سے نہ بچ سکا۔ یعنی خود تو شاعر نہیں البتہ جناب دوم تعلقدار صاحب کے اصرار پر بعض اساتذہ کا کلام سنانے کی عزت حاصل ہوئی۔ میر مشاعرہ نے اپنا فارسی کلام سنا کر سب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ غرض یہ دلچسپ صحبت شب کے ایک بجے کے قریب ختم ہوئی ہم سب ۱۷؍ دے کو صبح کی موٹر سے راہی بلدہ ہوئے۔

میں مخصوصاً جناب مولوی عارف الدین حسن صاحب دوم تعلقدار ناگر کرنول کا دل سے ممنون ہوں جنھوں نے میرے طعام و قیام کے لئے انتہائی سہولت بخش انتظام فرمایا۔ اور ساتھ ہی میں ان حضرات کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے دوران امتحان میں ہر طرح میری مدد فرمائی۔

مظہر الدین

قیام شاخ قصبہ ٹاکلی

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے پرخلوص کارکنوں کی مساعی جمیلہ برگ و بار لائے بغیر نہیں رہیں۔ یہی اسباب تھے کہ ٹاکلی جیسے دور اور الگ تھلگ مقام تک بھی اس کی صدائے حق پہنچی اور سونے والوں کو بیدار کیا۔ چنانچہ ارباب ٹاکلی نے گوش حق نیوش سے کارکنان شاخ ادارۂ ٹاکلی کی آواز سنی۔ اور اس کو باضابطہ اجازت نامہ مرحمت ہوا۔ آئندہ اس شاخ کا فریضہ ہوگا کہ اردو کی ترویج میں حصہ لے اور قرب و جوار کے دیہاتوں میں اشاعت تعلیم اردو کو ضروری سمجھے۔

جلسہ عام میں بالاتفاق حسب ذیل امور طے ہوئے :-

(۱) جناب مولوی شیخ فضل صاحب بی ایس سی، ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ اورنگ آباد سرپرست شاخ ادارۂ ادبیات اردو قرار پائے اور آنجناب نے سرپرستی قبول فرماکر بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔

(۲) صدارت شاخ ادارہ ہذا کو جناب مولوی محمد حنیف صاحب تحصیلدار قصبہ ٹاکلی نے قبول فرماکر رہین منت فرمایا۔

(۳) ارکان انتظامی میں جناب مولوی سید محمد حسین صاحب و جناب مولوی قاضی تاج الدین صاحب منتخب کئے گئے اور ہر دو حضرات نے اس کے لئے اپنی خدمات پیش فرماکر کرم بخشی کی۔

(۴) خدمت معتمدی کے لئے مجھ پر اس بار گراں کو رکھا گیا میں اس بوجھ کو سہارنے کی اپنے خدا سے دعا کرتا ہوں۔

محمد نذیر خاں معتمد

شاخ چیتاپور کی تجدید تنظیم

مولوی محبوب خاں صاحب یوسف زئی بی اے معتمد شاخ ہذا کے تبادلہ کے سبب چیتاپور کی ادبی سرگرمیوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ موصوف زبان اردو کے بہی خواہ تھے۔

محمد عبدالعزیز مجاہدی مدرس مدرسہ سلطانیہ عسکریہ نے اپنے ادبی ذوق کی سبب ادارہ کی خدمت کو اپنا فرض اولین سمجھا اور مقامی عہدہ داران اور دیگر علم دوست اصحاب سے گفت و شنید کی۔ مولوی مرزا غوث بیگ صاحب ڈیکل افسر علاقہ جاگیر اور مولوی مشائخ صاحب عارف کی سعی مسلسل مولوی اظہر الحق صاحب بی اے دوم تعلقدار اور مولوی محمد عبدالقادر خاں صاحب ناصر تحصیلدار علاقہ پائیگاہ کی علم دوستی اور حسن توجہ نے ادارہ کی شاخ کی ڈوبتی

ہوئی تاکہ رسائل پر لگانے میں بے صد مدد ملی اور اپنی سابقہ عنایات کا وعدہ فرمایا۔ اسی سلسلہ میں ایک جلسہ عام بتاریخ ۲ امرداد ۱۳۵۵ف زیر صدارت مولوی اظہر الحق صاحب دوم تعلقدار محبوب نگر کی تیلم منعقد ہوا جس میں محمد عبدالعزیز مجاہدی نے اردو کی ہمہ گیری اور ادارہ کے بنیادی مقصد پر روشنی ڈالتے ہوئے بیان کیا کہ اردو زبان اور ادب کی خدمت ایک مرکزی اجتماعیت کے ذریعہ عمل میں آنی چاہئے اور مقامی نوجوانوں کی قابلیت کو اجاگر کر کے ان میں اردو زبان کی خدمت کا ذوق پیدا کیا جائے۔ اصحاب ذوق سے استدعا کی یہاں کے بلند ماضی کے پیش نظر بلند تر مستقبل کے تعمیر کی رہبری فرمائیں ورنہ خوف ہے کہ ہمارا مستقبل ماضی کی دھندلی یادگار بن کر رہ جائے گا۔

صدر جلسہ نے اردو کی تاریخ بیان فرماتے ہوئے زبان اردو کی اہمیت اور خوبیوں کو گنوایا اور فرمایا کہ ایک زندہ زبان ایک قوم کو زندہ رکھنے کی ضامن ہے۔ زبان کی زندگی اس کی ہمہ گیری ہر جہتی، ادائے مطالب کی قوت کا پیدا کرنا، شستہ بیانی، سلیم المذاقی اور قادر الکلامی کا حامل ہوتا اور معتدبہ ذخیرۂ علم و ادب کا فراہم ہونا ہے۔ اور آخر میں فرمایا کہ اردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہندو مسلم اتحاد کی ایک خوشگوار یادگار رہے۔ بعد ازاں ادارہ کے جدید عہدہ داروں کے انتخابات عمل میں آئے جو حسب ذیل ہیں۔

صدر۔ مولوی اظہر الحق صاحب بی اے۔ دوم تعلقدار جاگیر

نائب صدر۔ مولوی محمد عبدالقادر خاں صاحب ناظر تحصیلدار تعلقہ پایا

معتمد۔ محمد عبدالعزیز مجاہدی مدرس مدرسہ وسطانیہ عسکریہ۔

خازن۔ مولوی محمد عبدالقادر صاحب سوداگر

ارکان۔ مولوی مرزا غوث بیگ صاحب تحصیل افسر مولوی میر صدیق علی صاحب صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ۔ مولوی اعز الدین صاحب وکیل ہائیکورٹ۔ مولوی معین الدین صاحب اوورسیر۔ مولوی محمد شفیع صاحب عارف چیتاپوری۔ مسٹر شرنپ گوڑ صاحب وکیل۔

تنظیم دار المطالعہ سے متعلق گفتگو کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

جلسہ تقسیم اسناد

بتاریخ ۲۰ شہریور ۱۳۵۵ف بوقت ۵ ساعت شام مولوی مرزا غوث بیگ صاحب اور مسٹر عارف چیتاپوری کی مساعی جمیلہ سے شاخ ہذا کے زیر اہتمام مولوی اظہر الحق صاحب دوم تعلقدار کی صدارت میں جلسہ تقسیم اسناد بہت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا جس میں علم دوست حضرات وکلا اور دیگر صاحبان کے علاوہ عہدہ داران مقامی جناب غلام مہدی صاحب کورٹ انسپکٹر، مولوی مرزا محمد بیگ صاحب منتظم پولیس، مولوی غلام دستگیر صاحب سررشتہ دار وغیرہ نے شرکت کی۔ اور مولوی میر صدیق علی صاحب بی اے، ایل ایل بی، ڈپ ایڈ صدر مدرس مدرسہ وسطانیہ نے اپنے جملہ اسٹاف مدرسہ اور طلبہ کے ساتھ شرکت فرماکر اپنی علم دوستی اور کارکنان ادارہ کے ساتھ اشتراک عمل کا ثبوت دیا۔

جلسہ کی کارروائی قرأت سے شروع کی گئی۔ محمد عبدالرحیم صاحب و محمد معز الدین صاحب متعلم مدرسہ اسلامیہ کی حمد کے بعد صدر جلسہ نے کرسی صدارت کو رونق بخشی بعد ازاں معتمد ادارہ نے رپورٹ سالانہ سنائی۔ اور مولوی حمید الدین صاحب کلیانوی اور مولوی محمد عبدالجبار خاں صاحب اردو معلم نے اردو سے متعلق نظمیں پڑھیں۔ مولوی عارف چیتاپوری نے اپنا پر مغز مقالہ "چیتاپور میں اردو کی ترقی" کے عنوان سے پڑھا۔ صدر جلسہ سے اسناد تقسیم کرنے کی استدعا کی گئی۔ کامیاب امیدواروں نے اسناد حاصل کی۔ آخر میں صدر جلسہ نے کامیاب امیدواروں کو مبارکبادی اور اردو سے متعلق ایک پر جوش تقریر فرمائی اور زبان اردو کو ایک مکمل زبان ثابت کیا۔ اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندوستان میں اس کی ترقی اور نشو و نما کے حالات بیان کئے۔ معتمد کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست کیا گیا۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو الوٹ محل

شاخ الوٹ محل اردو زبان کی ترقی کے لئے ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کا ایک دار المطالعہ بھی ہے جہاں کافی تعداد میں ناظرین روزانہ پابندی سے آتے ہیں۔

شاخ کی طرف سے ایوت محل ضلع مسلم کانفرنس کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان مشاعرہ بصدارت جناب پروفیسر شور صاحب ترتیب دیا گیا تھا جو بہت کامیاب رہا۔ ارکان شاخ کی جانب سے ایوت محل ضلع مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

یہ اجلاس ضلع میں اردو مدارس کی معتدبہ تعداد کے پیش نظر ضلع بورڈ ایوت محل سے درخواست کرتا ہے کہ نہ صرف بہ خیال تناسب آبادی بلکہ ماتحت اردو مدارس کے ساتھ دفتری مراسلت وغیرہ میں سہولت کے خیال سے بھی ضلع بورڈ اور اس کے ماتحت ہر لوکل بورڈ کے آفس میں ایک اردو داں مسلم کلرک کا تقرر عمل میں لایا جائے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ ایوت محل اور میونسپل کمیٹی ایوت محل کے اس سرکلر کے خلاف سخت احتجاج بلند کرتا ہے جس کی رو سے اردو مدارس تک کے تمام رجسٹروں کے اندراجات کا مرہٹی زبان میں ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

یہ اجلاس ضلع بورڈ کے اس اقدام کو اردو زبان کی ترویج و اشاعت و افادیت اور اردو مدارس کے قدرتی حق پر ضرب کاری سمجھتا ہے۔ لہذا یہ اجلاس حکومت سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس سرکلر کو جہاں تک اس کا اردو مدارس سے تعلق ہے کالعدم ٹھیرائے۔

یہ اجلاس ڈی سلوا اسکیم کے مطابق اردو زبان کے جملاتی طریقہ تعلیم کی غیر افادیت بلکہ مضرت کے متعلق اساتذہ اردو کی پیہم شکایات کو مناسب اہمیت دیتے ہوئے پراونشل انجمن ترقی اردو ناگپور کو توجہ دلاتا ہے کہ وہ جملاتی طریقہ تعلیم کے متعلق ڈاکٹر عبدالحق صاحب، ڈاکٹر زور صاحب، ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سجاد مرزا صاحب جیسے مستند ماہرین تعلیم سے استصواب رائے کر کے غور کرے اور اردو داں پبلک کے لئے اس باب میں صحیح راہ عمل پیش کرے۔

شاخ اندولہ ضلع گلبرگہ

صدر۔ ڈاکٹر منگن گرڈہ صاحب وکیل۔ کتبخانہ دار مولوی حکیم محمد عبداللہ شریف صاحب۔ طبیب یونانی اندولہ۔

خازن۔ نرسنگ راؤ صاحب پٹواری اندولہ۔

معتمد۔ سید عثمان صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ اندولہ۔

شاخ کلیانی

شاخ ادارہ کلیانی کا جلسہ تقسیم اسناد بابتہ [illegible] فصلی بتاریخ ۲ تیر [illegible] زیر صدارت عالیجناب فیضمآب نواب سید محمد جمال الدین حسین خاں بہادر دام اقبالہٗ والی اسٹیٹ کلیانی منعقد ہوا جس میں جناب نواب سید محمد مظہر حسین خاں صاحب برادرزادہ نواب صاحب ممدوح اور مولوی شیخ خلیل اللہ صاحب بی اے۔ ایل ایل بی تعلقدار اسٹیٹ کلیانی مولوی سید سبط نبی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی منصف۔ مولوی نظام علیخاں صاحب مددگار۔ مولوی اکبر شمس الدین صاحب ناظم کوتوالی اور دیگر معززین شریک تھے یہ جلسہ اندرون قلعہ حوض چاندنی چبوترہ کے متصل منایا گیا جہاں ایک پنڈال تیار کیا گیا تھا۔ جلسہ کا آغاز مشاعرہ سے ہوا جس میں جناب منصف، مرزا، مائل، حبیب، عطا، نقیج نے اپنا غیر طرحی کلام سنا کر جلسہ کو محظوظ فرمایا۔ آخر میں صدر آرائے بزم عالیجناب نواب صاحب بہادر کی نظم "نجارہ ل" پڑھی گئی جو بہت پرلطف تھی۔ مشاعرہ کے خاتمہ پر مولوی غلام معین الدین صاحب رکن تشہیر نے شاخ کی کارگزاری کی سالانہ رپورٹ سنائی۔ مولوی سید تاج الدین صاحب منشی فاضل نے "نذر عقیدت" کے عنوان سے ایک مضمون سنایا جس میں نواب صاحب بہادر کے تابناک عہد کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مولوی شہاب الدین صاحب نے اپنی تقریر میں اردو زبان کی اہمیت اور اس کی مختصر تاریخ بیان کی آخر میں نواب صاحب ممدوح نے شرکائے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے کلیانی میں علمی مذاق کی ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا اور اکبر الہ آبادی کا ایک شعر پڑھ کر طلبہ کو اس پست و ذلیل ذہنیت سے بچنے کی بطور خاص نصیحت کی کہ وہ جب تعلیم سے بہرہ مند ہو کر نکلتے ہیں تو اپنے ان پڑھ اور غریب والدین کو نہ صرف حقیر نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں بلکہ انھیں والدین ماننے میں بھی تامل ہونے لگتا ہے۔ تقسیم اسناد کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

محمد عطا اللہ عطا
معتمد

شعبہ نسواں شاخ ہنگولی

اجلاس تقسیم اسناد شعبہ نسواں ادارہ ادبیات اردو شاخ

ہنگولی بتاریخ ۸ امرداد ۱۳۵۴ف بوقت ۲ ساعت دن بمقام مدرسہ تحتانیہ مرکزی صدر بازار ہنگولی زیر صدارت محترمہ مسز نجم الدین صاحب انصاری دوم تعلقدار منعقد ہوا اس جلسہ میں تقریباً ۱۰۰ سے زائد ہندو اور مسلم خواتین موجود تھیں۔

شہزادی بیگم صاحبہ کی قرارت کے بعد حمیدہ بیگم خورشید معتمد شعبہ نسواں نے سالانہ رپورٹ سنائی خواتین اور طالبات نے تقریریں کیں اور اچھی اچھی نظمیں سنائیں معتمد شعبہ نسواں نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا صریہ سارا کام عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو اردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں منہمک ہیں ایک اور شخصیت محمد عثمان خاں صاحب کمالی کی ہے۔ صاحب موصوف ہی کی کوشش سے ۱۲ آذر ۱۳۵۲ف سے اس شعبہ کا قیام عمل میں آیا تیسری اہم شخصیت محترمہ قمر النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کی صدارت اور نگرانی میں یہ ادارہ چل رہا ہے یہی ہستیاں شکریہ کے قابل ہیں۔

گزشتہ سال کے نتائج صدفی صدر رہے اس سال اردو فاضل میں ایک شریک ایک کامیاب۔ اردو عالم، شریک ۵ کامیاب اردو دانی میں ۱۱ شریک ۱۱ کامیاب اس طرح نتیجہ ۹۰-۹۵ فیصد رہا۔ اس سال گزشتہ سالوں سے زیادہ طالبات شریک ہیں۔ گنگو بائی صاحبہ صدر معلمہ نسواں مرہٹی ہنگولی نے تعلیم نسواں کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے بیان کیا کہ اصلاحات کے تحت ملکی طبقہ نسواں کو اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے نمائندے منتخب کرنے ہوں گے۔ لیکن جب تک ہم تعلیم حاصل نہ کریں اور اتنی صلاحیت نہ پیدا کریں کس طرح اپنے طبقہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ زبان اردو ہر ہندوستانی کی اور زبان ہے کسی خاص قوم یا فرقہ کی نہیں۔ چنانچہ سر سپرو، مسٹر راج گوپال چاری، مسز کمرو جنی نائیڈو، اندرا نہرو جیسی ممتاز ہستیاں بھی زبان اردو کی حامی ہیں اردو ادب پر ہندو مولفین نے بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔

میں ادارہ کی معلمات کی شکر گزار ہوں جنہوں نے نسوانی ہمدردی کے تحت بہت کچھ کام کیا ہے۔ محترمہ صدر جلسہ مسز نجم الدین صاحب انصاری نے اپنے خطبہ صدارت میں ارشاد فرمایا کہ اس ادارے سے مجھے ذاتی دلچسپی ہے کیونکہ یہ ایک ایسی زبان کی ترقی میں مصروف ہے جو ہندو مسلمان دونوں کی مشترکہ ملکیت اور ان کے اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے محترمہ موصوفہ نے فرمایا کہ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں میں دوسری ادبی سرگرمیاں مثلاً مجلس مناظرہ تصنیف و تالیف کی کوشش جاری کی جائے گی۔ سر رشتہ ہنگولی کی ایک جامع تاریخ کی تیاری کی جانب ادارہ کو توجہ کرنی چاہیئے اس کے علاوہ خواندگی کی مہم کو تیزی کے ساتھ جاری رکھا جائے: ہماری بہت سی بہنیں لکھنا پڑھنا نہ آنے کی وجہ سے نہ صرف زمانے کی رفتار سے ناواقف ہوتی ہیں بلکہ گھریلو زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اپنا نقصان کر لیتی ہیں۔ ادبیات اردو کے شعبہ نسواں کو چاہیئے کہ گھر گھر پھر کر ان پڑھ لڑکیوں اور ماؤں کو لکھنے پڑھنے سے واقف کرائیں۔ مجھے توقع ہے کہ شعبہ نسواں اس کی جانب عملی قدم اٹھائے گا۔ میں خود اپنے فرصت کے اوقات کو اس خدمت کے لئے پیش کرتی ہوں امید کہ دیگر معزز خواتین بھی اس کی جانب توجہ کریں گی۔ آخر میں میں اعلیحضرت سلطان العلوم کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتی ہوں جن کی بدولت دوسرے علوم کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔

تقسیم اسناد کے بعد کامیاب ہونے والی طالبات کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے بعد ازاں خواتین نے عصرانہ میں شرکت کی۔ بعد ختم عصرانہ صدر جلسہ نے بطور خاص شعبہ نسواں کی امداد کے لئے خواتین کی توجہ منعطف کرائی۔ فہرست مرتب کیجا کر صدر جلسہ اور مسز حامد علی صاحب منصف نے ایک ایک روپیہ نقد عنایت فرمایا۔

حمیدہ بیگم خورشید

روئداد قیام شاخ اچم پیٹھ

بصدارت جناب مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مددگار تعلقدار

زیر اہتمام ادارۂ ادبیات اردو قیام شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی کمیٹی منعقد کی گئی۔ اولاً مولوی عارف الدین حسن صاحب نے اغراض و مقاصد ادارۂ ادبیات اردو بیان کئے۔ جناب مولوی محمد مرزا ابراہیم بیگ صاحب، جناب مسٹر بھاچاری صاحب وکیل تعلقہ اچم پیٹھ نے مستقر اچم پیٹھ پر قیام شاخ کی اہم ضرورت پر تحریک فرمائی۔ جس کی دیگر اصحاب نے بھی تائید فرمائی۔ اور ۱۲ اسفندار ۱۳۴۹ف سے مستقر اچم پیٹھ پر قیام شاخ منظور کی گئی۔ منظوری کے لئے صدر ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کو بہ ترسیل نقل روئداد جلسہ امروزہ تحریک کیجائے۔ شاخ کے عہدہ داران و ارکان مجلس انتظامی بہ اتفاق آرا منتخب ہوئے۔

صدر۔ پنڈت ہنمنت راؤ صاحب مالوی کر تحصیلدار

شریک صدر۔ مولوی محمد ابوالقاسم صاحب بی اے ایل ایل بی مجسٹریٹ ضلع

نائب صدر۔ مولوی مرزا ابراہیم صاحب وکیل۔

معتمد۔ پنڈت بھاچاری صاحب وکیل۔

ارکان انتظامی:۔ مولوی باقر نواز صاحب اوورسیر تعمیرات

مولوی نصرت علی صاحب سب انسپکٹر آبکاری۔

مولوی حسن علی صاحب مہاجر آفیسر تعمیرات راتب بندی

مسٹر یہ ہمیا صاحب وکیل۔

مولوی احمد علی صاحب صدر مدرس

" محمد عبدالمجید صاحب مددگار صدر مدرس

" محمد علیخاں صاحب پیشکار تحصیل

یہ تحریک باتفاق آرا طے و منظور کرلی گئی کہ امتحان ۱۳۴۵ء کے لئے مرکز اچم پیٹھ ہی قرار دیا جائے۔

روئداد جلسہ سالانہ دارالمطالعہ شعبۂ طلبہ نارائن کھیڑ

دارالمطالعہ شعبۂ طلبہ کا پہلا سالانہ جلسہ عام بصدارت جناب راجہ سنجیون لال صاحب جاگیردار بتاریخ ۲۰ بہمن ۱۳۴۹ف روز یکشنبہ بوقت ۸ ساعت شب مدرسہ وسطانیہ نارائن کھیڑ کے وسیع ہال میں منایا گیا۔ جلسہ گاہ کو شاندار پیمانہ پر سجایا گیا تھا جس میں ڈیڑھ ہزار سے زائد اشخاص نے شرکت کی۔ معزز وکلا، عہدہ داران سرکاری و ساہوکار شریک جلسہ تھے۔ جونہی صدر محترم موٹر سے اترے، بیانڈ نوازی شروع ہوئی۔ اور ارکان و صدر و معتمد شعبہ نے پرجوش استقبال کیا اور ٹھیک ۸ ساعت شب تحریک و تائید صدارت کے بعد ترانۂ دکن سے جلسہ کا آغاز ہوا اور مولوی سید عبدالواحد صاحب نے خطبۂ استقبالیہ پڑھا۔ عبدالسلیم شمیم نے پیامات سنائے اور حسب ذیل اصحاب نے مطالعہ پر تقریریں کیں:۔ ابوالبرکات محمد سلطان الدین خاں صاحب حمید، اپا راؤ صاحب وکیل، ناگ لنگیا صاحب وکیل، اقبال احمد صاحب، عبدالغفار خاں صاحب، نذیر احمد صاحب نشتر، میر محمد علی صاحب، ہنمانڈلو صاحب، عبدالقیوم صاحب، وٹھل ریڈی صاحب، عبدالسلیم شمیم اور مندرجہ ذیل اصحاب نے خوش الحانی کے ساتھ نظمیں سنائیں!

عبدالسلیم صاحب خنجر، عبداللطیف صاحب عشق، عابد اللہ بیگ صاحب زار۔ خواجہ خلیل الرحمن صاحب عاصی، احمد محی الدین محمد قاسم صاحب شیدا۔ یوسف علی حسن صاحب۔ بعد ازاں صدر محترم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا علم و ادب کی ترقی کے لئے ایسی انجمن کی سخت ضرورت ہے تاکہ ادبی شوق کو بڑھانے اور اس کو اعلیٰ معیار پر پہنچانے میں صحیح رہنمائی ہو سکے۔ یہی ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے قیام کا بنیادی مقصد ہے اور اب تک کئی مفید کتابیں ملک کے سامنے پیش کر چکا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ اب اس ادارہ نے اپنے ملک کے طلبہ کی ذہنی تربیت کیلئے شعبۂ طلبہ قایم کیا ہے جس کی ایک شاخ نارائن کھیڑ میں بھی یہاں کے نوجوانوں نے قایم کی ہے۔ جس کا مقصد طلبہ میں مضمون نگاری اور فن تقریر کی طرف توجہ دلانا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی مروجہ و مشترکہ زبان ہے اور روز افزوں ترقی پا رہی ہے۔ اور قوی امید ہے کہ ایسی کوششوں کے باعث مزید ترقی کرے گی۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ

دارالمطالعہ شعبۂ طلبۂ نارائن گوڑہ میں کتب کا کافی ذخیرہ نوجوانوں نے فراہم کرلیا ہے۔ میں ارکان شعبہ طلبہ سے امید کرتا ہوں کہ اس کی اور ترقی کی کوشش فرمائیں گے۔ شعبہ طلبہ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ اپنے مقصد میں پورے کامیاب رہیں۔ تقریر جاری رکھتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ آخر میں میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتا ہوں کہ جو کچھ ترقی ہماری ریاست ابد مدت میں ہو رہی ہے وہ سب ہمارے آقائے ولی نعمت پیر و مرشد حضرت بندگان عالی کی نیک صفات و خاص توجہ کا باعث ہے۔ ہم سب حضرت بندگان عالی مدظلہ العالی و شہزادگان و شہزادیان کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کرتے ہیں۔

آخر میں آپ نے دارالمطالعہ شعبۂ طلبۂ نارائن گوڑہ کی عمارت کی تعمیر کیلئے دو سو روپیہ کا گراں قدر عطیہ عطا فرمایا۔ اس کے بعد میر محمد علی صاحب صدر شعبۂ طلبہ نے معزز صدر و حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اور جلسہ ۱۲ بجے شب کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

پیام عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب

شعبہ طلبہ نارائن گوڑہ کے سالانہ جلسہ کا دعوت نامہ وصول ہوا۔ میں آپ کے اس جلسہ میں ضرور شریک ہوتا لیکن بعض اہم کاموں کی وجہ سے ان دنوں میرا بلدہ میں رہنا بہت ضروری ہے۔ میں اپنی عدم شرکت کی آپ اور آپ کے جلسہ کے صدر راجہ سنجیون راؤ صاحب جاگیردار سے معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے قوی توقع ہے کہ آپ جیسے ہونہار نوجوان اپنے لائق صدر کی رہنمائی میں اردو زبان اور ادب کی بھی خدمات انجام دیں گے۔

اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا سنگم ہونے کے علاوہ ہمارے ملک کی سرکاری اور ابنائے وطن کی مادری زبان ہے۔ اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے ممکنہ کوشش ہر بہی خواہ ملک کا مقدس فریضہ ہے۔ آپ کے جلسہ کی کامیابی کے لئے میری بہترین تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

پیام جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد

جناب نے اپنے شعبہ طلبہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کی دعوت دیکر میری جو عزت افزائی فرمائی اس کے لئے میں آپ کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں مجھے بے انتہا افسوس ہے کہ بعض ناگزیر وجوہ کی وجہ سے اس جلسہ میں شریک نہ ہوسکوں گا۔ آپ میری طرف سے اپنے صدر راجہ سنجیون راؤ صاحب جاگیردار سے معذرت چاہیئے۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اردو زبان کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے میں آپ کی تمام سرگرمیوں میں غائبانہ شریک ہوں۔ اور آپ کی ہر اچھی تحریک سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ اردو زبان ہندو مسلم اتحاد کا نتیجہ ہے اور یہی وہ واحد ذریعہ ہے جو اہل ملک کو قریب سے قریب تر کرسکتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ آپ نوجوان اپنے بزرگوں کی رہنمائی میں اپنی زبان کی صحیح معنوں میں خدمت انجام دیں۔

ہندستانی تمدن

تاریخ ہند کے اکثر طالب علم پروفیسر ایشوری پرشاد اٹھوریا کی ان قابل قدر کتابوں سے واقف ہوں گے جو انگریزی میں شائع ہوکر اونچے علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے تاریخ ہند کا مطالعہ ایک خاص نقطۂ نظر سے کیا ہے۔

ہندستانی تمدن اسی مصنف کی ایک ضخیم کتاب کا پہلا حصہ ہے جس میں انھوں نے ہڑپا اور موہنجو دارو کے قدیم ہندی تمدن سے لیکر گپت خاندان کے تمدنی کارناموں تک کی عمرانی، مذہبی، سیاسی اور فنی محرکات کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اسی تمدنی پس منظر میں کرنے کے عادی ہوجائیں تو سب سے پہلے ہمارے سامنے جو چیز آئے گی وہ اس کی بوقلمونی ہے کس طرح مختلف قومی اور تمدنی قوتیں ملیں۔ ان میں ربط ضبط پیدا ہوا اور اس ربط ضبط نے رنگ برنگ کے رد عمل پیدا کئے اور پھر کس طرح ہزاروں برس کی عمرانی، مذہبی، سیاسی اور فنی تحریکوں نے مل جل کر مستقل تمدنی سرمایہ مہیا کرنے میں حصہ لیا۔ اگر ہماری نظر ان سب چیزوں کا احاطہ کرسکے تو تاریخ ہمارے لئے سب سے بڑا اخلاقی درس بن جائے۔

موضوع اس قدر ٹھوس ہے پھر بھی کتاب کے انداز بیان میں خشکی یا بوجھل پن نہیں:

از رسالہ آجکل بابت ماہ جنوری ۱۹۴۵ء

عمارتِ ادارہ

نومبر کے سب رس میں عمارت ادارہ کی تعمیر کے لئے فراہمی رقم کی جو اپیل شائع ہوئی ہے اس کا ملک اور بیرون ملک میں فراخدلی سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے چنانچہ علم دوست اصحاب سرزمین دکن کے اس علمی اور ادبی مرکز کی تعمیر میں ادارۂ ادبیات اردو کا ہاتھ بٹا رہے ہیں ان کی فہرستیں رقموں کی تفصیل کے ساتھ سب رس میں شائع ہوتی رہیں گی۔ اس سلسلے میں اردو کے بہی خواہوں کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ تعلقہ گنگاکھیڑ کے ایک جوان آبکاری نے اپنی قلیل تنخواہ میں سے ہر مہینے ایک روپیہ کا عطیہ دینے کا پیش کش اپنے حسب ذیل کارڈ کے ذریعہ سے کیا ہے۔

"حضرت قبلہ السلام علیک

بعد از قدمبوسی عرض ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ادارہ کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے جسکے لیے رقم چندہ وصول کیجا رہی ہے۔ اگر ارباب ادارہ میری یہ گزارش قبول فرمائیں تو میں ہر ماہ بغرض تعمیر عمارت ادارۂ ادبیات اردو اپنی تنخواہ سے ایک روپیہ ادا کرتا رہوں گا۔

جواب کا منتظر خادم محمد برہان الدین اردو عالم

جوان آبکاری گنگاکھیڑ"

یہ کارڈ ادارہ کے ایک علم دوست اور سرگرم رفیق مولوی عارف الدین حسن صاحب ڈویژن آفسر آگر کرنول کے نام آیا تھا جس کو انھوں نے حسب ذیل تحریر کے ساتھ دفتر ادارہ پر ایصال فرمایا ہے۔

"مسٹر برہان الدین اردو عالم کامیاب جوان آبکاری ضلع پربھنی کا کارڈ ملفوف کر رہا ہوں کہ آپکے ادارہ کی تعلیم نے صرف مادۂ علمیت ہی نہیں بڑھایا بلکہ جذبۂ ایثار و خدمت گزاری ملک بھی پیدا کیا۔ میں اس سے نہایت متاثر ہوا۔ جناب اس کا جواب انھیں راست عطا فرمادیں۔"

یہ تو حیدرآباد کے ایک غریب بہی خواہ اردو کا ایثار تھا اب بیرون ریاست کے ایک علم دوست کی تحریر کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"میں نے سوچا کہ اس موقع پر ادارہ کی کچھ خدمت کروں۔ لہٰذا میں نے طے کیا کہ جب تک ادارہ کی عمارت تعمیر نہ ہوگی اسوقت تک سالانہ پچیس ۲۵ روپیہ اپنی آمدنی سے اس فنڈ میں ادا کرتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور ادارہ میری اس حقیر پیش کش کو قبول فرمائیں گے۔"

یہ مولوی فیض انصاری صاحب معتمد انجمن اشاعت اردو ناگپور کے خط کا اقتباس تھا اس کے ساتھ صاحب موصوف نے پچیس ۲۵ روپے کا چک بھی ایصال فرمایا ہے۔

ہم ان دونوں صاحب ایثار علم دوستوں اور اردو کے بہی خواہوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور متوقع ہیں کہ ادارہ کو ایسے ہی سیکڑوں بہی خواہ حاصل ہوں گے۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
من کی بیتا ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب ...	۹۴	۰	۸	۰
نظام الملک ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ ...	۳۳۰	۳	۸	۰
رنگ نو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب ...	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں ...	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں ...	۱۶	۰	۲	۰
سر سالار جنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
مسجد کی چھاؤں ...	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر ...	۱۶۸		۴	۰
سائنس کے کرشمے ...	۱۱۲		۰	۰
شعرائے عثمانیہ ...	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی ...	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ ...	۲۰۰	۱	۰	۰
ارسطو جاہ ...	۹۵	۰	۶	۰
عماد الملک ...	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۶۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد ...	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ ...	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر ...	۶۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن ...	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندوستانی تمدن ...	۳۴۰	۲	۸	۰
پودوں کی کہانی ...	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا ...	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی ...	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ ...	۳۱۰	۲	۸	۰
سلک گوہر ...	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو ...	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈسورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن ...	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال ...	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں ...	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں ...	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان ...	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سحر کا جادو ..	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات ...	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن ...	۲۲۴	۲	۱۲	۰
کیف سخن ...	۲۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن ...	۱۲۷	۰	۱۲	۰
ساز سخن ...	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن ..	۱۲۵	۰	۱۲	۰
نقش سخن ...	۴۳	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن ...	۱۷۵	۱	۰	۰
[illegible]	[illegible]	۲	۸	۰
[illegible] ...	۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر [illegible] دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵		۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۰	۰
[illegible] نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
[illegible]	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم ..	۳۰۰	۱	۴	۰
دیہی معلومات ...	۵۶	۰	۶	۰
آندوز کشمیر اور سرینگر	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۳۳	۱	۲	۰
نمود زندگی ...	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ .	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۶	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات ...	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری ...	۱۵۰	۱	۰	۰
جیوتی (۱۶) تصاویر	۱۱۹	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش ثانی (۳) تصاویر	۰۰	۰	۱۰	۰
کارستان دتاتی ...	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا ...	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ ...	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت ...	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سنہ ۱۹۳۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ ...	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

فروری ۵۷ء

(ماہ نامہ)

سب رس

۱۹۵۷

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس الگ روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ ر

جلد ۸ — بابت فروری ۱۹۴۵ء — شمارہ ۲

نمبر	عنوان		مصنف	صفحہ
۱	اداریہ		ادارہ	۲
۲	اقبال میری نظر میں		منظور النساء بیگم	۳
۳	غزل		حسرت ترمذی	۵
۴	نادی بربریت		میر حامد علیخاں بی اے (عثمانیہ)	۶
۵	غزل		فطرت صدیقی	۸
۶	ضروری نوٹ	(ڈراما)	فیض محمد صدیقی بی اے ایم ایڈ	۹
۷	عرض نیاز	(نظم)	پروفیسر منظور حسین شور (علیگ)	۱۷
۸	محمد گیسو دراز		جہانگیر علی خاں لکچرار گلبرگہ کالج	۱۸
۹	جھجک	(نظم)	سلیمان اریب	۲۲
۱۰	زلزلے	(افسانہ)	انجم صہبائی	۲۳
۱۱	غزل		لطیف ساجد (عثمانیہ)	۲۵
۱۲	سوال و جواب		م، د، س	۲۶
۱۳	تاثرات		م، ح، ب	۲۷
۱۴	تلاش	(نظم)	تمکین سروری	۲۸
۱۵	صحت گاہ اننت گیری		محمد ابراہیم ایم ایس سی بی ای، ایم آئی ای انجینئر صحتگاہ	۲۹
۱۶	شمس الامراء کے سائنسی کارنامے		خواجہ حمید الدین ایم اے	۳۳
۱۷	تنقید و تبصرہ		"ز س"	۴۱
۱۸	نئی کتابیں		نواب مرزا سیف علیخاں	۴۵
۱۹	نغمۂ نو	(نظم)	جلال الدین اشک بی اے ایل ایل بی	۴۶
۲۰	غزل		تمکین سرمست	۴۶
۲۱	تصاویر	(ہیزلٹ اور رابرٹ برجس)		۴۷
۲۲	ادارۂ ادبیات اردو دنیائے اردو کی نظر میں		ادارہ	۴۹

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ ایوان اردو (؟) منزل خیریت آباد سے شائع ہوا.

اداریہ

اس سال ماہ اپریل میں پہلی مرتبہ تاریخ دکن کانفرنس کا اجلاس بلدہ حیدرآباد دکن میں منعقد کیا جارہا ہے۔ اس سے فن سے دلچسپی رکھنے والے یہ محسوس کریں گے کہ یہ نہایت ہی مستحسن اور برموقع اقدام ہے اور اس سے ایسے دوررس نتائج کے حاصل ہونے کی توقع ہے جو نہ صرف دکن کی گزشتہ تاریخی عظمت کو بےنقاب کریں گے بلکہ ان شاندار روایات سے بھی دنیا کو روشناس کرائیں گے جن پر اس ملک کے باشندوں کو بجا طور پر ناز رہا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ بندھیاچل سے نیچے بسنے والے ہر زمانہ اور ہر دور میں اپنی ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ اپنی ایک علحدہ تاریخ رکھی ہے۔ اسی خطۂ ملک پر حکومت کرنے والے راجہ پلی کیشن نے قنوج کے فرمانروا ہرش وردھن کی فوجوں کو شکست دےکر شمالی ہند کی آریائی تہذیب کی بڑھتی ہوئی قوت کو نربدا کے اس پار روک دیا تھا اور اسی خاندان کے جانشینوں نے اورنگ آباد کی پرفضا پہاڑیوں میں وہ مشہور مناور تعمیر کئے جنھیں ایلورہ کہتے ہیں اور جن کی سنگ تراشی کے نمونے آج بھی دنیا کی نظروں کو خیرہ کئے دیتے ہیں۔

مسلمانوں کے دور حکومت میں بہمنیوں اور اس کے بعد پانچ اسلامی سلطنتوں نے دکن کو اپنی سرپرستی میں علوم و فنون کا مرکز بنا دیا اور ایک ایسی تہذیب کی بنیاد قائم کی جسے بجا طور پر ہندوستانی تہذیب کہنا چاہیے ان معنوں میں کہ وہ حقیقتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کی ملی جلی تہذیب کی نمائندہ تھی اور اپنی رواداری سے ہندو مسلم اتحاد کا ایک ایسا خوشگوار رابطہ پیدا کیا کہ آج تک اس ملک کے باشندے اس کو اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں۔ ان ریاستوں کے بادشاہوں نے اپنی رعایا پروری اور انصاف پسندی سے وہ شہرت حاصل کی اور اپنی حکمت عملی سے رعایا کے دل موہ لینے کا کچھ ایسا ڈھنگ اختیار کیا کہ ملک میں وہ حکمران یا آقا کی بجائے جگت گرو، انا[1]، سوامی یا باپ کے نام سے مشہور ہوگئے۔

اس حصۂ ملک نے وجیانگر جیسی عظیم الشان سلطنت کے زرین دور دیکھے جس کے درباروں کی شان و شوکت نے بیرونی سیاحوں کی آنکھوں کو متحیر کردیا۔

اس زمین پر حضرت آصفجاہ اول نے اس سلطنت ابد مدت کی بنیاد ڈالی جس کی علم پروری کے شہرے اقطاع ہند کے دور دراز حصوں تک پہونچ گئے اور جس نے دلی کے اجڑنے کے بعد بگھری ندری اردو کو اپنے سایۂ عاطفت میں اماں دی۔ اور جو آج بھی حضرت سلطان العلوم آصف سابع خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کی علم نوازیوں کے طفیل ہندوستان میں ممتاز ہورہی ہے۔

اس قدر شاندار اور متنوع روایات کی حامل سرزمین یقیناً تاریخ ہند میں ایک علحدہ اور بسیط باب کی متقاضی ہے چنانچہ ملک کے مورخین اور محققین کی یہ کوشش ہر لحاظ سے قابل مبارکباد ہے۔

ادارہ

---

[1] انا۔ تلنگی میں برادر بزرگ کو کہتے ہیں اور بعض قدیم کتبوں میں شاہوں کے متعلق یہ لفظ تحریر ہوا ہے۔

خریدار اصحاب ملاحظہ فرمائیں

نیا سال شروع ہوچکا ہے۔ سب رس تقسیم کرنے والے کے باضابطہ مطبوعہ نمبری رسید حاصل فرما کر چندہ عنایت فرمایئے۔ بغیر مطبوعہ رسید چندہ دیجئے تو ادارہ اس کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ مہتمم

اقبال میری نظر میں

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سے انکار؟ الٰہی توبہ! ادب کی شریعت میں کفر نہیں تو اور کیا ہے۔ کسی منکرِ ادب نے ایسی جسارت کی ہو تو ہو بھی سکتا ہے لیکن ایک بندۂ ادب تو اس خیال ہی سے کانپ اٹھتا ہے۔ اقبال یعنی شاعرِ آخرالزماں، جس نے میر کا سوز، مومن کی باریک بینی اور غالب کے تعمق کو معراج پر پہنچا دیا اور جس نے ہندوستان کی الہامی کتاب "دیوانِ غالب" (بقول علامہ بجنوری) کا رنگ پھیکا کر دیا۔ آخری دور کا وہ سب سے بڑا شاعر ہے۔ جس کا مقابل ہندوستانی شاعروں میں تو اور بات ہے کسی غیر زبان اور پرائے ملک میں بھی مشکل سے ملے گا۔ مشرقی اور مغربی فلسفہ کا مطالعہ، مولوی روم سے والہانہ محبت، نطشے، ہیگل، برگساں، الگزنڈر، میدام دی گاں، پوپ، ماگناٹن بیلفرانسیس اسی سی، نٹ آگسٹن، افلاطون جیسے بلند پایہ فلسفیوں سے واقفیت اور مشرقی صوفیوں میں غزالی، جامی، حافظ، ہندی فلسفیوں میں شنکراچاریہ، ابجنانند اور دیگر کا مطالعہ، اقبال کی فلسفیانہ طبیعت اور شاعرانہ مزاج کو تپا کر کندن کر دیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں تعمق، فلسفیانہ نکات اور شاعرانہ ذوقِ جستجو پایا جاتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال، غالب سے کچھ آگے نکل جاتا ہے۔ ہم یہاں منہ تکتے ہی رہ جاتے ہیں اور حالی جیسا بلند پایہ ناقد منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر چپ سادھ لیتا ہے کہ "اقبال کیا کہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا" ہاں ٹھیک ہے اقبال یقیناً حالی کی سمجھ سے باہر ہے اور وہ مجبور۔ حالی نے شاعری کو جہاں چھوڑا تھا، وہ رہ گزار تھا۔ لیکن اقبال اس کو اس منزل کی طرف لئے جا رہا تھا جہاں چاند اور تاروں کی بلندی بھی پانی بھرتی ہے۔ اب وہ مناجاتیں نہیں کرتا۔ ٹھورے نہیں جاتا، مایوس ہو کر ہاتھ ملتا نہیں رہ جاتا۔ بلکہ خالق سے ہمسرانہ انداز میں "شکوہ" کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک حسن کار ہے اور حسن کار بھی تو خالق ہے پھر خالق خالق کے آگے سر پٹکے اور شور مچائے؟

ہاں تو میں کہہ رہی تھی اقبال، غالب اور حالی کو پیچھے چھوڑ بہت آگے نکل گیا تھا گویا یوں کہئے اقبال کی ابتدا غالب کی انتہا اور غالب کا انجام اقبال کا آغاز ہے۔ اسی لئے تو علامہ ابوظفر نے کہا ہے: "اقبال کی شاعری غالب کی شاعری کا تتمہ ہے" لیکن سچ تو یہ ہے کہ اقبال غالب سے آگے نکل جانے کے باوجود غالب سے کم رتبہ ہی ہیں۔ ہاں ایک ذرا کی ذرا اس بات پر بھی تو دھیان دیجئے کہ بیچارہ غالب جو صرف اردو اور فارسی ہی میں دستگاہ رکھتا تھا دنیا کے بڑے بڑے فلسفیوں کے نام تک نہ جانتا ہوگا۔ ان کے خیالات سے واقف ہونا اور عبور پیدا کرنا تو اور بات ہے، ڈارون نے یورپ میں نظریۂ ارتقاء پیش کیا لیکن غالب اس سے کلیتاً بے خبر پھر بھی اس کے کلام میں ایک نہیں ایسے کئی ایک اشعار ملیں گے جن میں انھوں نے نظریۂ ارتقاء کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے اب آپ ہی فیصلہ کیجئے۔ غالب میں کتنی اپج، کتنی جدت طرازی تھی اور کیسا فلسفیانہ دماغ پایا تھا۔ یہ اپج اور جدت محض نتیجہ ہے ذہنِ رسا اور فکرِ صادق کا جو کسی اکتسابی علم کا شرمندۂ احسان نہیں۔ اس کے خلاف اقبال کا تمام فلسفہ اور تعمق کثرتِ مطالعہ اور غیر معمولی قابلیت کا نتیجہ ہے۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے شاعرانہ بزرگی کا سہرا کس کے سر رہا۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال نے جہاں کہیں فلسفی بننے کی کوشش کی ہے، شعریت کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے اور شعرِ پند و نصائح کی خشکی سے اپنی فطری شگفتگی اور بانکپن کھو بیٹھے ہیں لیکن غالب نے کبھی ایسی غلطی نہیں کی۔ اس نے فلسفہ، حکمت، تصوف وغیرہ کو شاعری پر ترجیح نہیں دی اور ترجیح دینے کی چیز بھی تو نہیں۔

اسی لئے میری نظر میں غالب کی وقعت اقبال سے بہت زیادہ ہے یہ اور بات ہے کہ کوئی ہر خود غلط ناقد اس کے کلام کا سب رس نکالنے کے لئے بے رس کر دے۔ لیکن حقیقت پر پردہ ڈالنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اقبال کی شاعرانہ عظمت اور بزرگی سے انکار کرتی ہوں۔ نہیں اقبال بہت بڑا شاعر ہے۔

اس نے زندگی کی بیمار نبضوں میں خون دوڑایا اور شاعری کے مفلوج جسم میں حرکت کی لہر دوڑا دی ہے۔ لفظی الٹ پھیر، زبان کی گھلاوٹ، محاوروں کی بھرمار، عشق و عاشقی کے فرسودہ مضامین، گل و بلبل کے روایتی تذکروں سے تحمل کر اس نے حیات، زندگی اور انسان کو اپنا موضوع بنایا۔ روایات کا چولا نکال پھینکا اور "بے خودی" کی اوڑھنی اوڑھ لی۔ شعر میں زندگی کی دہڑکنیں بھر دیں۔ خیال میں اپنے خون دل سے رنگ بھر دیا اور اس قافلے کو جو سر رہ گزار پڑا سو رہا تھا۔ بر کس جرت بجا بجا کر بیدار کیا۔ صدی خوانی کر کر کے منزل کی طرف لے چلا اور خودی کو بیدار کر کے ٹوٹی ہوئی ہمت بندھا۔ غرض وہ زندگی کا شاعر تھا۔ لیکن پھر بھی ایک مخصوص گروہ ایک مخصوص جماعت اور ایک مخصوص قوم کے لئے۔ اس کا پیام محدود ہے۔ وہ مسلمانوں کا شاعر ہے انسانیت کا نہیں۔ اس کا دل دکھتا ہے تو مسلمانوں کے لئے گھنٹوں تنہائی میں آنسو بہاتا ہے تو مسلمانوں کے مستقبل کو تاریک دیکھ کر اور ہمت بندھاتا ہے تو ان کی۔ اس کے اس پیام اس ہمدردی اور اس آہ سحری میں سوائے مسلمانوں کے کوئی اور شریک نہیں۔ ہم بانگ درا کے قوم پرست اقبال کو بین الاقوامی شاعر بلکہ انسانیت کا شاعر دیکھنا چاہتے تھے۔ جانے بعبتان فرنگ نے اس پہ ایسا کون جادو کر دیا کہ وہ ملت پرست ہو گیا۔ اور اس کی شاعری حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ پر جوش ہے، زیادہ خیالی ہے۔ اس ماضی کے عشق میں جو اپنے مردے کبھی کا دفن کر چکا ہے، اقبال اسلام کے ریخ و محن کے ترانے گاتے ہیں۔ ایک ناممکن اور بے معنی پین اسلامزم (Pan Islamism) کی دعوت دیتے ہیں۔ اور چیختے، چلاتے روتے، دھمکاتے قدیم گل و بلبل کے گیت گاتے اس مرکز کی طرف آجاتے ہیں جو بڑی حد تک اس قسم کی شاعری کے وجود اور الہام کا بانی مبانی رہتا ہے یعنی اسرار خودی لیکن باوجود سیکڑوں شکووں اور ان کے جوابات کے، باوجود آہ و بکا اور آنسوؤں اور التجاؤں کے وہ جو تھا کبھی واپس نہیں آسکتا۔

ٹیگور اور اقبال کی شاعری بیماروں کی طرح زندگی سے گریز کرتی ہے اور حقیقت کو بھلانے کی خواہش سے پیدا ہوتی ہے اور باوجود اپنی خوبصورتی کے محض خواب و خیال ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ ہماری قوت تنقید کو جگانے، بجائے اس کے کہ وہ ترقی کی ان قوتوں کو مدد دے جو مختلف سماجوں میں کام کر رہی ہیں، یہ ہم کو صرف غیر عملی اور بے حرکتی کی طرف کھینچتی ہے۔ اور اس سے زیادہ رجعت پسندانہ ہے۔ یہ ایک ایسا ادب ہے جو زندگی کی وسعتوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آرٹ میں بھی یہی مذہب اور معرفتی رجحان دکھائی دیتا ہے وہی اپنی زندگی کے اصلی اور اہم مسئلوں سے دور بھاگتا ہے۔"

ٹیگور اور اقبال میں صرف اتنا فرق ہے کہ وہ ایک ہی نظر میں آسمان والے معلوم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اقبال ایک ذرا ہیر پھیر سے عالم روحانیت میں داخل ہوتے ہیں اور جہاں کہیں اقبال زندگی سے نبرد آزما ہیں مجبور ہیں۔ انھیں زندہ رہنا بھی عزیز ہے۔ اقتدار اور جبروت بھی ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ برانہ مانیے تو کہوں گی: "اسلامی فسطائی" ہیں۔ ان کی سیدھی جانب مولانا روم ہیں اور بائیں جانب نطشے اور وہ ان دونوں کے جلو میں۔ ان کے ہاں رومی کا تصوف اور نطشے کا اقتدار اور قوت دونوں پائے جاتے ہیں۔ اس لئے گمان ہونے لگتا ہے کہ اقبال کا مطالعہ کرنے والا کہیں اس دوراہے پر گم نہ ہو جائے اور منزل سے دور نہ جا پڑے۔ موجودہ دور ایک ایسے دوراہے پر ہے جس میں انسانی برادری زیادہ وسیع زیادہ منظم اور زیادہ قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اس دور میں "ملت" پرستی گویا ماضی پر آنسو بہانا ہے اس لئے ہمیں ایسے نظام کی کوئی ضرورت نہیں جس میں خود غرضانہ اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کارفرما ہو۔ بہرحال ماضی ختم ہو چکا جو لوگ اب بھی اس سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں ماضی ہی کے ساتھ فنا بھی ہو جائیں گے۔ فاسطیت ہو کہ سرمایہ داری چاہے فسطائی ادیب ہو کہ سرمایہ دارانہ نظام کا نمائندہ۔ اس دور میں قومیت اور ملیت دونوں غیر اہم ہوتی جا رہی ہیں۔ اس لئے کہ عالمگیر

الغرض، جہالت اور غلامی نے مجبور کر دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ حکومت اور قومی تفوق کی گرتی ہوئی دیوار کو پہلے ہی گرا دیا جائے۔ اس سے قبل کہ وہ گرے اور انسانیت کی ہلاکت کا باعث ہو۔ وطنیت کے مخالف ہوتے ہوئے بھی اقبال قومیت کا اسی طرح قائل ہے جس طرح مسولینی اگر فرق ہے تو اتنا کہ ایک کے نزدیک قوم کا مفہوم نسلی ہے اور دوسرے کے پاس مذہبی۔"

اس لئے مستقبل قریب میں اقبال، مسولینی اور ہٹلر سبھی کا طریقۂ تفوق چاہے ملی ہو کہ قومی فنا ہو جائے گا۔ اور اس خاکدان پر مساوات اور آزادی کا راج ہوگا۔ نہ فوق البشر کا وجود باقی رہے گا اور نہ خیر البشر کا۔ یہی آپ اور ہم ہوں گے اس مادی دنیا میں بسنے والے جو امن، آزادی اور مساوات کے متوالے پریم پریت کے گن گا گا کر انسانیت کا پرچم بلند کریں گے۔

منظور النساء بیگم

غزل

رنج سہتے رہے، زخم کھاتے رہے — ہم ترے حکم پر سر جھکاتے رہے
جادۂ زندگی سخت دشوار تھا — ہر قدم پر قدم ڈگمگاتے رہے
زندگی اک نیا رخ بدلتی رہی — مٹنے والے فسانہ سناتے رہے
آپ کو بھول جانا بھی ممکن نہ تھا — آپ آتے رہے آپ جاتے رہے
عشق مجبور تھا، حسن مجبور تھا — خود وہ مٹتے رہے جو مٹاتے رہے
جیسے کانٹے نہ تھے جیسے صحرا نہ تھا — پھول کھلتے رہے، مسکراتے رہے
ساری دنیا ترے غم میں تاریک تھی — چند تارے مگر جھلملاتے رہے
کیا یہ آنسو نہ تھے، کیا یہ آہیں نہ تھیں — کیا حقیقت میں تم مسکراتے رہے

ان سے حسرت شکایت بھی کیا کیجئے
ہم سے بڑھ کر جو صدمے اٹھاتے رہے

حسرت ترمذی

نازی بربریت

ہٹلر نے اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل کی خاطر اور عالمی اقتدار کے لئے امن و تہذیب کی اشاعت کا نام لے کر تمدن اور تہذیب کو جس درندگی اور بہیمیت سے تباہ کیا ہے وہ تاریخ یورپ کا ایک المناک باب ہے۔ یورپی ممالک نے صدیوں سے تہذیب و تمدن کے جن ذخیروں کو محفوظ رکھا تھا، ہٹلر نے آج اسے بڑی طرح برباد کر ڈالا ہے۔ گزشتہ چار پانچ سالوں میں نازیوں نے صدہا قصبوں اور شہروں کو نذر آتش کیا۔ جامعات، کلیسا، قصر اور عجائب گھروں کو لوٹا اور عظیم الشان عمارتوں کو مسمار کیا۔ ہٹلر کی ستم رانیوں اور چنگیزی کے باعث مقبوضہ یورپ کی ایک ایک انچ زمین بے گناہ باشندوں کے خون سے سرخ ہو چکی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کے علمبرداروں کے لئے ہٹلر نے قتل و ہلاکت کے لئے سارے ملک میں پھانسی اور دار کا جال بچھا دیا ہے۔ ہزاروں عورت مرد بچے اور بوڑھے اپنی سفاکیوں کا نشانہ ہوئے۔ ہٹلر نے کہا تھا کہ وہ یورپی ثقافت و تہذیب کا محافظ اور واحد علمبردار ہے اور اسی لئے وہ اپنی عظیم تر ثقافت و تہذیب کی سارے یورپ میں اشاعت چاہتا ہے۔ لیکن اس کے عمل نے ان دعووں کی تردید کی اور اس جھوٹی حقیقت کو بے نقاب کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہٹلر نے اس دور جہالت کی یاد دلائی ہے جب کہ یونانیوں نے اپنے اقتدار کی خاطر کمزور ممالک کے باشندوں کو اپنا غلام بنا کر انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی تھیں۔

جرمنی کی گیتی نے ان شہرۂ آفاق مفکروں اور عالموں کو بھی جنم دیا ہے جنھوں نے اپنے افکار سے دنیا کی ترقی میں نئے باب والے ہیں۔ تاریخ گیٹے (Goethe) ہائنے (Heine) کانٹ۔ ہیگل۔ مارکس اور اینگلز کا نام کبھی فراموش نہیں کر سکے گی جنھوں نے بزم دہر میں اجالا کیا ہے لیکن ہٹلر نے اپنے عہد میں برلن، میونخ، ڈرسڈن اور فرینکفورٹ کی شاہراہوں پر ان مفکروں کی تصانیف کو آگ میں جھونک دیا اور اس کا یہ عمل محض اس لئے تھا کہ جرمن تہذیب ان مفکروں کے علوم و فنون سے پاک رہے۔ ہٹلر کے برسر اقتدار ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد دو کروڑ سے زائد کتابیں جلادی گئیں۔ بارہ ہزار سے زائد تصاویر مرقع اور نقوش عجائب خانوں اور نمائش گاہوں سے محض اس لئے نکال دیئے گئے کہ یہ آریائی تصورات کے منافی تھے۔ ہٹلر کے فیوہرر ہونے سے پیشتر جرمنی میں پانچ ہزار سے زائد پروفیسر اور ایک لاکھ بیس ہزار سے زائد طلبا ایسے تھے جو اعلیٰ تعلیم میں مشغول تھے۔ لیکن ہٹلر کے اقتدار کے ابتدائی پانچ سالوں میں یہ تعداد نصف تک گھٹ چکی تقریباً ڈیڑھ ہزار پروفیسر اس علم دشمنی کے باعث جرمنی سے فرار ہو کر دوسرے ممالک میں پناہ گزیں ہوئے۔ جب ہٹلر نے یہ خبر سنی تو کہا کہ "یہ صاحبان علم معاشرہ کا فاسد مادہ ہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ان عالم جانوروں کو تباہ و برباد کریں" وہ ادیب اور شاعر جو فرار نہ ہو سکے انھیں یا تو پھانسی دی گئی یا نظربند کیمپ میں قید کر دیا گیا۔ چنانچہ مشہور مصنف کارل استسکی (Karlassielsky) اور شہرۂ آفاق شاعر ایرچ موہام (Erich Muham) انہی مظالم کا شکار ہوئے۔ ہٹلر نے فوجی علم اور مشق کو آج "جرمن قوم کا قومی فلسفہ اور "جرمن اخلاقیات" کا رتبہ دیا ہے۔ چنانچہ اسکی برانگیختگی کا اظہار ہانس شیم (Hans Schemm) وزیر تعلیمات بویریا نے کیا ہے کہ ہمارا نصاب اب چار تصورات کے تابع ہو گیا ہے "نسل" "توپ" "فیوہرر" اور "ان تینوں پر اندھا اعتقاد" یہی بنیادیں ہیں جن پر جرمن قوم کی تعلیم ہو رہی ہے مس مارتھا ڈوڈ (Martha Dodd) جو امریکی سفیر متعینہ جرمنی کی صاحبزادی ہیں اپنے تمام جرمنی کے تجربات کا اظہار اپنی تصنیف (Through Embassy eye) "سفیر کے چشم دید حالات" میں یوں کیا ہے کہ "جرمنی میں قدیم جرمن آرٹ اور سائنس کا کچھ حصہ بھی اب باقی نہیں رہا ہے۔"

جب جرمنوں نے پولینڈ پر قبضہ کیا تو ان درندوں نے پولینڈ کی ساری جامعات کو بند کر دیا۔ ہٹلر نے کہا پولستانی باشندوں کو تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں چونکہ جرمنی کو مزدوروں کی ضرورت ہے۔ مشہور پولستانی شہر (Posnan) پوسنان کو جرمن شہر قرار دیکر ان لٹیروں نے پولستانی تمدن و تہذیب کے سارے خزانوں کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ پولستان کے سارے اخبارات بند کر دئے گئے تاکہ پولستانی عوام کو صحیح اطلاعات نہ مل سکیں۔ چیکوسلوواکیہ پر قبضہ کے بعد اس قدیم ترین پریگ یونیورسٹی (Prage University) کو مسدود کر دیا گیا جو چودہویں صدی سے علوم و فنون کی خدمات انجام دے رہی تھی۔ تقریباً چھ ہزار طالب علموں کو نظر بند کر دیا گیا۔ فرانس فتح کر لینے کے بعد یہاں کی قیمتی نوادرات کو جرمنی میں منتقل کیا گیا۔ مشہور عالم قصر لورے (Louvre) جس کا شمار عجائبات عالم میں کیا جاتا ہے یہاں کی تقریباً تین ہزار سے زائد نوادرات جرمنی روانہ کی گئیں۔ عالمی شہرت رکھنے والے سائنس داں ارنسٹ لینگویں (Ernest Langevin) کو گرفتار کیا گیا روس پر جب حملہ کیا گیا تو ہٹلر کے حواریوں نے جو ظلم و ستم ڈھایا ہے اس کا دردناک تذکرہ تاریخ کا وہ خونچکاں واقعہ ہے جسے بمشکل فراموش کیا جا سکے گا۔ ہزاروں معصوموں کو تہ تیغ کیا گیا۔ کنواری دوشیزاؤں کی آبرو تباہ کی گئی جوان لڑکیوں کے سہاگ کو اجاڑا گیا اور جو مادی نقصانات کئے گئے ہیں اس کا اندازہ فی الوقت ممکن نہیں۔ سرخ فوج نے ۱۹۴۳ء کے وسط تک جن مقامات کو آزاد کیا ہے ان میں جرمنوں نے (۹۴۷) مدارس اور ایکسوانسٹھ (۱۵۹) شفاخانے اور آٹھ سو سے زائد کتب خانے عجائب گھر اور کلب تباہ و برباد کر دیئے۔

ان غارت گروں نے خصوصیت کے ساتھ روسی تمدن کے اس شاہکار مکان کو برباد کیا جس میں مشہور روسی مصنف لیو ٹالسٹائی رہتا تھا۔ حکومت روس نے ٹالسٹائی کے مکان کو بہ نظر احترام و بطور یادگار سرکاری نمائش گاہ بنایا تھا لیکن نازیوں نے اس نمائش کو بند کر دیا۔ اس گھر کو اصطبل بنایا گیا اور در و دیوار پر گرد و اور فحش تصاویر آتارے۔ شہر کلن (Klin) میں چے کاوسکی (Tchaikovsky) کے مکان کو جو عجائب گھر قرار دیا گیا تھا ان دشمنان تہذیب نے آگ لگائی۔ ٹاگنروگ میں چیخوف کے مکان کو تاراج کیا اور قصبہ آسترا (Istra) میں چیخوف نمائش گھر کو مسمار کر ڈالا۔ مشہور روسی شاعر پشکن کی قبر کی عمداً بے حرمتی کی۔

حال ہی میں اس امر کا انکشاف ہوا ہے کہ جرمن فوج میں ایک خصوصی دستہ ایسا ہے جس کے تفویض قومی اور ثقافتی خزانوں اور نوادرات کو تباہ و برباد کرنا ہے۔ یہ دستے دفتر امور خارجہ کے تحت ہیں ان واقعات کا انکشاف اس خصوصی دستے کی چوتھی جماعت کے عہدہ دار نارمن فارسٹر (Norman Forster) اور آبر اشارم فیوہرر (Ober sturm Fuhrer) نے کیا ہے۔ جو (Mozdak) مزداک کے قریب گرفتار کر لئے گئے۔ ان مظالم کی خونچکاں داستان بہت طویل ہے اڈیسہ کے مشہور کتب خانہ کو ان غارت گروں نے شعلوں کی نذر کر دیا جو روس کا ایک قدیم اور نادر کتب خانہ تھا جس میں (۲۰) لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ کیفو پٹ چارسک (Kievo-Petchorsk) کی مشہور اور قدیم عبادت گاہ کو ان غاصبوں نے بری طرح لوٹا۔ کیف کے مشہور تجربہ خانہ کے تمام آلات کو ضبط کر کے جرمنی بھیجا۔

غرض تمدن اور تہذیب کا نام لیکر جرمنوں نے جو سفاکی اور خون آشامی کی ہے اس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ یوروپی اقوام کے قدیم قیمتی ذخیروں کو تباہ و تاراج کر دیا گیا ہے اور بعض اشیاء کو جرمنی میں منتقل کیا گیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہٹلر نے ایک خونخوار اور جابر و ظالم ڈاکو کی طرح یورپ کو لوٹا ہے۔ تہذیب و تمدن کو برباد کیا ہے۔ علوم و فنون کی ترقی میں روڑے اٹکائے۔ اساتذہ اور علماء کو اذیتیں پہونچائیں۔ عجیب بات ہے کہ تہذیب تمدن اور ترقی

وہ ماخذ جن پر ترقی کا انحصار ہے ہٹلر نے انھیں کو تاراج کر ڈالا اور پھر اس بات کا مدعی ہے کہ وہ یورپ اور ساری دنیا میں اعلیٰ تہذیب و تمدن کی اشاعت چاہتا ہے۔ جنگ کے ان چار پانچ سال میں ساری دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ ہٹلری تہذیب و تمدن کا نصب العین کتنا بلند اور ارفع ہے۔ حال ہی میں با وثوق ذرایع سے اس راز کا انکشاف کیا گیا ہے کہ جنوبی پولینڈ میں لبلن (Lublin) کے قریب میڈانک میں اس قدر قتل و خون کیا گیا ہے کہ اس مقام کو "میڈانک کا کارخانہ قتل و خون" کے نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔ ہزارہا باشندگان خدا اس مقام پر ہلاک کیے گئے۔ پولستانی اور روسی تحقیقاتی کمیٹی نے تحقیق کے بعد اپنی روئداد پیش کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ جرمنوں نے تقریباً پندرہ لاکھ فرانسیسی ولندیزی، اطالوی، چیک، روسی، یونانی اور مقبوضہ یورپ کے باشندوں کا قتل و خون کیا ہے۔

ہٹلریت یا نازیت نے دنیا میں خون کی ہولی کھیلتے ہوئے جو تخریب اور بربادی کی ہے اور اقوام و ممالک کو جس طرح تاراج کیا ہے۔ اس نقصان کی تلافی صدیوں بعد ممکن ہو سکے گی۔ نازیت نے صدیوں کی روایات اور انتہائی قدیم نوادرات اور قدیم ورثہ کو بڑا نقصان پہونچایا ہے۔ جس فلسفے کی بنیاد تخریب پر رکھی گئی ہو اس کا فوری زوال قطعی اور یقینی ہے چنانچہ آج تخریب اور تباہی کے ذمہ دار نازی درندے اپنی موت آپ مر رہے ہیں ان کا انجام قریب آچکا ہے لیکن جو المناک تباہی و بربادی ان کے ہاتھوں ہوئی اس کی تلافی صدیوں کے بعد بھی مشکل سے ہو سکیگی اور تہذیب و تمدن اس خونخوار درندے کو کبھی معاف نہ کر سکیگی جس نے دنیا کی ترقی میں روڑے اٹکائے اور مزاحمت کی۔

میر عابد علیخاں (عثمانیہ)

غزل

پر کیف موسم رنگیں بہاریں
آؤ یہ موسم باہم گزاریں

اک چوٹ کھا کر مضراب غم کی
تھرائیں ساز ہستی کی تاریں

قسمت ہی جن کی بدقسمتی ہو
وہ اپنی قسمت کیونکر سنواریں

قطرے ہیں لیکن ہے فرض اپنا
موجوں کو طوفاں پر ہم ابھاریں

فردا کی کاہش دیوانگی ہے
امروز ہم کیوں رو کر گزاریں

طوفان لے کر آئی جوانی
طوفان اب یہ کیونکر گزاریں

آزردہ گل، نو دمیدہ
بجلی کے ٹکڑے ظالم نگاریں

گرداب آیا دریا میں فطرت
آؤ تو ہم بھی کشتی اتاریں

فطرت صدیقی

ضروری نوٹ

(ریڈیو ڈراما)

افراد ڈراما

ثریا - ایک سنجیدہ مضمون نگار لڑکی
سلمیٰ - شاعرہ، گفتگو کا لہجہ ظریفانہ
فیروزہ - بھولی لڑکی ہر بات کو آسانی سے قبول کر لیتی ہے باتوں میں سادگی -
لولو - فیشن پرست لڑکی، انگریزی کثرت سے اور بے تکلف بولتی ہے - باتیں تیزی سے کرتی ہے -
بوا - ایک ضعیفہ، خادمہ

زمانہ ـــــــــ موجودہ

ثریا اپنے کتاب خانے میں بیٹھی سہیلیوں کا انتظار کر رہی ہے - ریڈیو سٹ کھلا ہوا ہے - کوئی اچھا سا ریکارڈ بج رہا ہے - آواز اوسطاً بلند ہے - ثریا بوا کو آواز دیتی ہے -

ثریا - بوا بوا - کیا فیروزہ بی بی یا سلمیٰ کوئی بھی اب تک نہیں آئیں ؟

بوا - (دور سے مدھم آواز میں) ابھی کوئی نہیں آئیں بی بی

ثریا - خوب - ابھی تک کسی کا پتہ نہیں (گھڑی پانچ بجاتی ہے - ٹن - ٹن .....) یہ لو پانچ بھی بج گئے -
(اتنے میں کسی کے چاپ کی آواز سنائی دیتی ہے ٹپ ٹپ .....)

فیروزہ - (دور سے مدھم آواز میں) بوا بوا - ثریا بی بی کہاں ہیں ؟

بوا - بی بی کتاب خانے میں بیٹھی ہیں -
(فیروزہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتی ہے - دروازہ کھلنے کی آواز)

ثریا - فیروزہ بڑا انتظار دکھایا (ریڈیو کی آواز کو قدرے مدھم کر دیتی ہے)

فیروزہ - دیر کیا ہوئی - پانچ ہی بجے تو آنے کا نادری حکم ملا تھا نا -

ثریا - اوہو - اسی لئے ناچتی کودتی پھدکتی چلاتی دندناتی ریل گاڑی کی طرح چلی آ رہی ہو -

فیروزہ - اف رے تیری تنگ بندی، چار حرف لکھنا کیا آ گیا، لگی ہم ہی سے منہ آنے، کیوں بہن ؟

ثریا - (مذاق کے لہجہ میں) ارررر - فیروزہ بس اتنی سی بات پر چڑھ گئیں -

فیروزہ - میں چڑھتی کیوں - چڑھے میری بلا - اچھا یہ آج بات کیا ہے - یہ اہتمام کس بات کی تمہید ہے - کل کالج میں ملیں کچھ نہ کہا -

ثریا - کوئی خاص بات نہیں - یونہی تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا بلا لیا -

فیروزہ - نا بہن نا - تم ایسی حاتم طائی کی بیٹی تھوڑا ہی ہو جو یوں خود سے کسی کو چائے پر بلاؤ - ضرور کوئی بات ہے -
(باہر سے قدموں کی چاپ، ایک دوسری لڑکی کمرہ میں داخل ہوتی ہے دروازہ کھلنے کی آواز)

ثریا - لو سلمیٰ بھی آ گئیں -

فیروزہ (کسی قدر طنز سے) آ گئیں یہ شاعرہ - اچھا تو کیا آج یہاں کوئی مشاعرہ یا مناظرہ ہے -

سلمیٰ - نہیں مباحثہ - بکی جاؤ - تمہارے لئے تو ثریا کے گھر کی چائے قاضی کی شراب مفت ہے - کیوں کیا اکیلے اکیلے چائے اڑانے کے ارادے تھے - بہن تمہاری یہ خود غرضی تو ٹھیک نہیں -

فیروزہ بھلا اس میں خود غرضی کی کیا بات ہے اور میں نے تمہیں کیا کہا -

ثریا - (مصالحت کے انداز میں) ارے تم دونوں لڑتی کیوں ہو - دعوت تو تمہاری بھی ہے اور تمہاری بھی -
(دروازہ بہت زور سے کھلتا ہے اور ایک لڑکی زوروں سے کمرے میں داخل ہوتی ہے)

سلمیٰ - یہ کون - اوہ کیا لولو کو بھی پکڑ منگوایا ہے -

لولو Hullo, Good Evening, everybody

فیروزہ۔ آئیے آئیے، میم صاحبہ آئیے — ارے رے رے ثریا تم نے بیچاری لو لو پر بڑا ظلم کیا۔ دیکھو اس کے ہاتھ میں ٹینس راکٹ ہے اور شاید وہ اپنے ان کے ساتھ ....

لولو (بات کاٹ کر (shut up) ہمیں بناتی ہو — — تمہاری جب شادی ہوجائے گی تب معلوم ہوگا۔ ٹھیرو وہ دن دور نہیں۔

لوا — بی بی چائے تیار ہے۔

ثریا — معلوم ہوا بوا (سہیلیوں سے مخاطب ہو کر) ہاں بچیو چلو، پہلے چائے پی لیں۔

فیروزہ — کہاں —— نہیں بھئی، وہاں کون جائے۔ یہیں منگوالو۔ آسمان پر بادل بھی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم باہر نکلیں ....

سلمیٰ — اور اولے برسنے لگیں۔

(سب ہنستے ہیں)

لولو — ٹھیک ہے yes, you are rigt, feroza چائے یہیں اطمینان سے بیٹھ کر پئیں گے اور ریڈیو بھی سنیں گے۔

(ریڈیو کی آواز پہلے سے کسی قدر اونچی لیکن اس طرح سے کہ مکالمہ میں خلل پیدا نہ ہو)

ثریا۔ بہتر جیسے سب کی مرضی — لوا چائے یہیں لے آؤ۔

لوا۔ بہت اچھا بی بی۔

سلمیٰ — اچھا بہن چائے تو آتی رہے گی۔ یہ تو بتلاؤ کہ یہ گرما گرم تقریب کس لئے۔

ثریا۔ (لاپروائی سے) ہے ایک وجہ — لیکن ابھی نہیں پہلے چائے پی لو تب بتاؤں۔

فیروزہ — سلمیٰ بہن۔ بتلائیں گی کیسے۔ بات ہی کوئی ایسی ہوگی جسے منہ سے نکالتے شرم آتی ہے۔

لولو — وہ ایسی کیا بات ہے (Any secret)

فیروزہ۔ ہا ہا ہا۔ بچی تو کچھ جانتی ہی نہیں — دیکھو آج کی تقریب کے دو خاص وجوہ ہو سکتے ہیں۔ ایک ....بتلا دوں ثریا۔

ثریا۔ چپ شریر!

فیروزہ اس میں شرارت کی کیا بات ہے۔ اہا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارے ہونے والے ... ...

ثریا۔ (بات کاٹ کر) پھر وہی۔

(سب ہنس پڑتے ہیں)

فیروزہ ہاں تو وہ پہلی بات ہوگی یا پھر یہ ہوگا کہ ہمارے قلم کے دھنی نے اخبار یا رسالہ کے لئے کوئی نیا مضمون یا قصہ لکھا ہوگا اور اسے سنا کر ہماری سمع خراشی کرنا چاہتی ہوگی — کیوں ہے نا یہی بات۔

ثریا۔ بالکل غلط نہ یہ، نہ وہ — سچ پوچھو تو بات ایسی دلچسپ ہے کہ بس سن کر پھڑک اٹھو گی۔

(لوا چائے لے کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ برتنوں کی ہلکی سی آواز)

لوا۔ بی بی چائے آگئی۔

ثریا۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔ کیا لوا تم سمجھتی ہو کہ ہماری آنکھیں ابھی سے بوڑھی ہوگئی ہیں؟

لوا۔ نا بی بی۔ خدا سلامت رکھے آپ کی جوانی کو اور ان آنکھوں کے ....

ثریا۔ ہاں ہاں ہاں بس کرو تمہاری شاعری۔ بہنو چلو چائے پی لیں۔

فیروزہ۔ نہ بہن۔ چائے تو ہوتی رہے گی۔ وہ بات پہلے بتلا دو۔

سلمیٰ۔ (متانت سے) پہلے چائے تو پی لو۔ ورنہ ٹھنڈی ہوجائے گی۔ بات تو ٹھنڈی نہیں ہوسکتی۔

لولو۔ (Right) چائے پہلے پی لینی چاہئے کیونکہ مجھے ٹینس کھیلنے جانا ہے۔

ثریا۔ ٹینس۔ اچھا آج تمہاری ٹینس بند۔ چلو چپکے سے وہ راکٹ میز پر رکھ آؤ اور شریفوں کی طرح کرسی پر بیٹھ جاؤ۔

لولو۔ ارے نہیں آج میں نے ان کے فرنڈ (Friend)

ثریا فرنڈ ورنڈ کچھ نہیں۔ یہ چائے مفت بچ نہیں سکتی۔ آج تمہیں یہاں ٹھیرنا ہوگا۔

فیروزہ۔ لُو لُو آج کل ٹینس کا بہانہ خوب تراش رہی ہے۔

ثریا۔ نہیں جی وہ ٹھیرے گی — ہاں سلمیٰ بہن ذرا چائے تو بنانا۔ سلمیٰ شعر تو خوب بناتی ہے دیکھوں چائے کیسے بناتی ہے۔

سلمیٰ اچھا — پھر تو ضرور بناؤں گی۔ اس کے بعد تو ایمان لاؤ گی؟

(سلمیٰ چائے بنانے لگتی ہے۔ پیالیوں کی آواز)

فیروزہ۔ لُو لُو ذرا چھری تو دینا۔ یہ کیک تم دونوں کے لئے کاٹ دوں۔

لولو۔ اونھ — جیسے خود نہیں کھاؤ گی۔

فیروزہ نہیں کیوں۔ کھاؤں گی اور ضرور کھاؤں گی۔ ثریا کا گھر اور میرا گھر کیا جدا ہے۔

ثریا۔ ہاں ہاں جی گھر تمہارا ہے (پلیٹ اٹھا کر) یہ بسکٹ بھی لو۔ لُو لُو وہ سیب تو ویسے ہی دھرے ہیں۔ یہ آج تم سب اتنا تکلف کیوں کر رہی ہو۔

سلمیٰ۔ (متانت سے) تکلف (اور پھر ظریفانہ انداز میں) کیسا تکلف ہے کہ کیک ابھی برابر کٹا بھی نہیں اور پلیٹ صاف۔ بچپن کا سبق ابھی بھولا نہیں کہ ع اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر

لولو۔ (Fedup with your poetry سیدھی بات کرو۔ کہتی کیوں نہیں کہ فیروزہ کیک پیسٹری پر جان دیتی ہے۔

فیروزہ میں جان دیتی ہوں؟

سلمیٰ۔ اور نہیں تو کیا ہم۔ میں تو خدا سے دعا کرتی ہوں کہ اس کی شادی کسی بڑی ہوٹل کے مالک سے ہو جائے۔

فیروزہ۔ کیوں سلمیٰ ہم ہی سے؟ لولو کہہ دوں سب سے تمہارے نازک اندام پروفیسر کا ....

ثریا اور لولو۔ ہاں ہاں کیا بات ہے؟

سلمیٰ۔ کچھ نہیں بہن، فیروزہ یونہی واہی تباہی بکا کرتی ہے۔ ذرا جو موٹی ہو گئی ہے نا۔

(سب ہنستے ہیں)

ثریا۔ تم سب باتیں ہی کرتی رہو گی یا کچھ کھاؤ گی بھی۔

لولو۔ کھا بھی رہے ہیں اور باتیں بھی کر رہے ہیں۔ دم سادھنے کے لئے تھوڑا ہی آئے ہیں۔

ثریا۔ کیا کھا رہے ہو۔ سلمیٰ بہن تو چائے بنانے میں مصروف ہے۔ لولو تو بس مٹکنے میں حیران اور فیروزہ بچاری ....،......

(سب زور سے قہقہہ لگاتے ہیں)

فیروزہ اچھا اب کچھ نہ کھاؤں گی۔

ثریا بس اتنی سی بات پر ناراض ہو گئیں —— لو یہ سب کھا لو ——

فیروزہ نہیں ——

ثریا۔ نہیں میری جان کی قسم تمہیں کھانا ہوگا۔

سلمیٰ۔ شرماتی کیوں ہو کھا بھی لو۔

فیروزہ بہت کھا لیا۔ اب اور نہ کھا سکوں گی۔

لولو۔ طبیعت صاف نہیں ہے شاید — چلو فیروزہ یہ سیوڑہ کھا لو —— کھاؤ ورنہ میں گدگداتی ہوں۔

سلمیٰ۔ ہاں یہ ترکیب بڑی اچھی ہے۔

(لولو گدگداتی ہے اور فیروزہ ایک ہلکی چیخ مار کر اچھل پڑتی ہے)

فیروزہ بھئی یہ دل لگی اچھی نہیں سب ہی مجبور کرتے ہیں تو اچھا لاؤ کھا لوں گی (لولو پھر گدگداتی ہے) اور پھر وہی حرکت۔

(سب قہقہہ لگاتے ہیں)

لولو۔ ثریا لکھنے پڑھنے ہی میں نہیں ہیں بلکہ چائے پلانے میں بھی بڑا اچھا سلیقہ رکھتی ہے۔
(Wonderful taste)

سب۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں۔

فیروزہ۔ خوش قسمت ہے وہ ....

سب۔ بے شک بے شک۔

لولو۔ اچھا میں کہہ رہی تھی کہ چائے تو ہو چکی۔ اب اور بھی کوئی کام ہے یا میں ٹینس ....

ثریا۔ پھر وہی ٹینس کا خیال میں نے کہہ دیا کہ آج تمہاری ٹینس بند ....

فیروزہ۔ یہ تو خیر ٹھیک ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ..... ہاں لیکن تم نے آج کس لئے بلایا ہے۔ کچھ تو بتاؤ۔

ثریا۔ مرد سچ کہتے ہیں کہ عورت بڑی جلد باز ہوتی ہے۔ بہنو ذرا صبر تو کرو کہنے کو بلایا ہے ضرور کہوں گی۔

سلمیٰ۔ اچھی ثریا۔ بتلا بھی دو آخیں وہ کیا بات ہے۔

ثریا۔ پیاری سلمیٰ بات کچھ بھی نہیں، کل جب میں کالج سے لوٹی تو ڈاکیہ نے ایک خط دیا۔

سلمیٰ۔ (حیرت سے) خط اور کل

ثریا۔ ہاں خط اور بڑا دلچسپ خط (یہ کہہ کر وہ ذرا ہنستی ہے)

لولو۔ کس کا لیٹر (Letter) ہے؟

فیروزہ۔ ہوگا کسی نادیدہ ....

ثریا۔ چھی چھی یہ بات نہیں۔ یہ خط ہے ایک اڈیٹر کا

لولو۔ کس (paper) کے ایڈیٹر کا؟

ثریا۔ (paper) تو ابھی نہیں نکلا۔ نکلنے والا ہوگا۔

فیروزہ۔ اور اس سے پہلے وہ اڈیٹر بن گیا۔

ثریا۔ اس میں کیا ہرج ہے اجازت مل ہوگی یا ملنے والی ہوگی۔ توقع ہی پر تو لوگ اپنی دنیا بساتے ہیں۔

لولو۔ ہاں ٹھیک ہے مگر اس میں (novelty) یعنی یعنی ندرت کیا ہے۔ تمہارے یہاں تو ایسے سیکڑوں خطوط آتے ہوں گے۔

ثریا۔ آتے تو ہیں۔ مگر یہ ذرا نئی طرز کا ہے اور اسی کو سنانے کے لئے میں نے تم سب کو تکلیف دی ہے۔

سب .... سناؤ سناؤ دیکھیں کیا لکھا ہے؟

ثریا۔ لو سنو لکھا ہے "محترمہ۔ آپ کا "شمع نسواں" میں چھپا ہوا مضمون میں نے غور سے پڑھا۔ بار بار پڑھا اور جتنی دفعہ پڑھا ایک نیا لطف پایا۔ ....

فیروزہ۔ کیوں نہیں پائے گا۔ مضمون بھی تو ثریا کا لکھا ہوا تھا

ثریا ہش۔ لکھا ہے "آپ نے عورتوں کی نفسیات کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ماشاءاللہ خیالات کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ قلم کا زور کیا کہنے۔ ہندوستان میں بہت کم عورتیں اس پایہ کا مضمون لکھتی ہوں گی۔ محفل نسواں کی یقیناً آپ ایک روشن شمع ہیں"

(سلمیٰ بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

سلمیٰ۔ بے شک، بے شک

ثریا۔ کیوں سلمیٰ بے ساختہ ہنس پڑیں بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

سلمیٰ۔ نہیں نہیں (ہنسی روکتے ہوئے) بس یونہی۔

لولو۔ بس یونہی کیا معنی اس میں ہنسنے کی نہیں تو کیا رونے کی بات ہے۔

ثریا۔ اچھا اس کا تصفیہ بعد کو ہوگا۔ پہلے پورا خط سن تو لو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ دیکھو بیچ میں بولنے کی سند نہیں۔

سلمیٰ اچھا نہ بولیں گے (پھر ہنستی ہے)

ثریا ہاں تو فرماتے ہیں یہ اڈیٹر صاحب "مجھے ہندوستانی

عورتوں کی گری ہوئی حالت پر بڑا ترس
آتا ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ انھیں
اس قعر مذلت سے نکال کر متمدن ممالک کی
عورتوں کے دوش بدوش کھڑا کردوں۔
کچھ اسی مقصد کے تحت ایک رسالہ شائع
کر رہا ہوں جس کا نام آپ سن کر خوش
ہونگی .... "ترقی نسواں" ہے۔

فیروزہ - خوب خوب یہ آدمی تو بڑا نیک معلوم ہوتا ہے۔

ثریا - ہاں ہاں بہت نیک - اڈیٹر نیک نہیں تو
ہوتے کیا ہیں؟ چنانچہ لکھتے ہیں یہ تمہارے
نیک اڈیٹر صاحب - "چاہتا ہوں کہ اس
کی پہلی اشاعت میں آپ کا مضمون بھی ہو۔
بڑا ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی اولین
فرصت میں کوئی گراں قدر مضمون عنایت
فرمائیں۔

نیاز مند
ہاشم بسملی

سلمیٰ - ہاشم بسملی (ایک زوردار قہقہہ لگاتی ہے)

ثریا - کیوں سلمیٰ کیا بات ہے؟

سلمیٰ - نہیں کچھ نہیں - نام بالکل نیا اور اس کی
ترکیب کچھ عجیب سی معلوم ہوئی اس لئے ہنسی
آگئی۔

فیروزہ - ٹھیک ہے میں نے بھی کسی رسالہ میں ایسا نام
آج تک نہیں دیکھا۔

لولو - ہوگا کوئی (1945) کا
(War model) ادیب - ہندوستان
میں اڈیٹروں اور رسالوں کی کیا کمی پڑی ہے۔
ہر صبح نئے رسالے اور نئے اڈیٹر کے ساتھ
شروع ہوتی ہے مگر اس میں خاص بات
کیا ہے - خط تو ختم ہوچکا لیکن ....

ثریا - لیکن کیا - یہ کس نے کہا کہ خط ختم ہوچکا -
اصل خط تو اب شروع ہو رہا ہے۔

فیروزہ (حیرت سے) ایں! پیچھے سے

ثریا - سنو وہ دلچسپ بات خط میں نہیں بلکہ خط
کے نوٹ میں ہے۔

لولو - نوٹ میں؟

ثریا - ہاں ہاں نوٹ میں نیچے لکھا ہے "ضروری نوٹ"
لو دیکھو اور اس ضروری نوٹ کے نیچے سرخی
سے لکیر بھی کھینچی ہے۔

فیروزہ پھر تو یہ نوٹ بڑا اہم ہوگا!

(سلمیٰ پھر بے ساختہ ہنستی ہے)

سلمیٰ بے شک بڑا اہم!

ثریا - کیا بات ہے آج سلمیٰ کو بڑی ہنسی آرہی ہے:
ہاں یہی نوٹ تو ہے اس خط کی جان۔

لولو - (Yes, Read it out please)
سنیں کیا لکھا ہے؟

ثریا - لکھا ہے - مضمون کے ساتھ اپنی کوئی اچھی سی
تصویر بھی بھجوا دیجئے تاکہ مضمون کے ساتھ اس
سے بھی رسالے کو زینت دی جاسکے - اگر مضمون
دیر سے ملے تو ہرج نہیں لیکن تصویر فوراً بھیج
دیجئے گا تاکہ بلاک بنوانے اور چھپوانے میں
سہولت ہو - ہاں ایک بات اور عرض کرنی
ہے - وہ یہ کہ مجھے مصوری اور فوٹو گرافی
سے بڑی دلچسپی ہے - اجازت دیجئے تو
آپ کی تصویر کا ایک (Enlarge ment)
بھی بھیج دوں -

لولو - (Enlarge ment)

ثریا - ہاں (Enlarge ment) اور کہئے تو
آپ کے قلم پر تصویر اور خطوط کے کاغذ اور
لفافوں پر خوبصورت مانو گرام تصویر کے ساتھ

ثریا - چھی چھی - کیسی باتیں کرتی ہو، فیروزہ -

سلمیٰ ٹھیک کہتی ہے، فیروزہ، لولو کو بھلا ان باتوں کا خیال کیوں ہونے چلا - وہ تو اس منزل سے پار ہو چکی ہے نا - کوئی ڈوبے کہ کوئی تیرے - لولو کو اس سے کیا کام

لولو (بہت تیزی سے) (Nothin g that sort) میں نے اس لئے ایسا نہیں کہا - بھلا میں اور پیاری بہن ثریا کی برائی چاہوں (nonsense) اچھا سلمیٰ بہت دیر سے شیخی کر رہی ہو بتلاؤ کوئی ترکیب شاعرانہ؟

سلمیٰ - بتلائیں گے - اس گتھی کو تو بہر حال سلجھانا ہی ہوگا - لیکن ثریا تم بتلاؤ کہ کیا کریں -

ثریا - نا سلمیٰ تم بتلاؤ - تم ہی نے دونوں تجویزیں رد کی ہیں

سلمیٰ - (ہنستی ہوئی) اور شاید تیسری بھی — اچھا ثریا تم پہلے بتلاؤ پھر میں ....

ثریا - سنو - میں نے سوچا ہے کہ جب اس غریب نے تصویر مانگی ہے تو مجھے اپنی ہی تصویر بھیجنی چاہئے -

فیروزہ - پھر اپنی ہی تصویر بھیجو گی - بہن جب ایسا ہی کرنا تھا تو پھر یہ سارا بکھیڑا کیوں کیا؟

ثریا - سنو بھی تو — اپنی ہی تصویر بھیجوں گی لیکن .

فیروزہ لیکن کیا؟

ثریا - لیکن برقعہ اوڑھ کر -

(سب ہنستے ہیں)

سلمیٰ - خوب خوب - ہے نا ادیبانہ رنگ اس تجویز میں - بہن ثریا تم نے تو کمال کر دیا - اس تجویز کے آگے تو بس منہ کھولتے شرم آتی ہے -

فیروزہ بے شک اچھی صلاح ہے - جب وہ تصویر دیکھ پائے گا تو شرم سے پانی پانی ہو جائے گا — ثریا واقعی تم نے کمال کر دیا - مگر سلمیٰ بہن تم اس طرح نہ چھوٹو گی - تمہیں بھی اپنی رائے بتلانی ہوگی .

لولو - (Right) تم کو بھی کچھ کہنا ہوگا - دیکھیں تمہاری تجویز کیسے (Poeic) اوہ (Iam sorry) شاعرانہ ہوتی ہے .

سلمیٰ کہنے کی بات تو ثریا نے کہدی - اب میرے لئے کیا چھوڑا ہے جو کہوں -

فیروزہ - نہیں سلمیٰ - ایسے کام نہ چلے گا - کہو ورنہ میں .....

سلمیٰ گدگداؤگی —— ہے نا یہی بات (ہنستی ہے)

ثریا - یقیناً - اگر فیروزہ نہیں تو میں ——————

سلمیٰ - ہاں ہاں جلدی مت کرو - ابھی بتلاتی ہوں - کیا شعر ہے وہ چچا کا؟

لولو کون چچا؟

سلمیٰ اجی چچا غالب — ہاں فرماتے ہیں ہمارے چچا غالب

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہئے

بس میری رائے یہ ہے کہ نہ اپنی تصویر بھیجو اور نہ کسی اور کی بلکہ اسے بھیج دو ایک .....

فیروزہ ایک کیا؟

سلمیٰ - ایک آئینہ

سب - خوب خوب (Excellant)

فیض محمد صدیقی

پانی کی کہانی - از مولوی فیض محمد صاحب صدیقی بی اے ایم ایڈ

صفحات (۵۶) قیمت ۶/

یہ کتاب شعبۂ سائنس کی طرف سے شائع ہوئی ہے جو سائنس کے ضروری مسائل کو عام فہم اردو میں پیش کرتا ہے - اسی سلسلے کی یہ ایک کڑی ہے - اس میں پانی ہی سے اس کی کہانی کہلوائی گئی ہے جو پڑھنے والے کی دلچسپی شروع سے آخر تک قائم رکھتی ہے - پانی کے فائدے، نقصانات، استعمال کے طریقے، اس کی بناوٹ اور شکلیں غرض ہر پہلو پر تفصیلی معلومات اور تصاویر درج ہیں -

عرضِ نیاز

تیرا فسانہ میرا فسانہ — بجلی کی زد پر میرا آشیانہ
دیکھے ہیں کتنے کاشانے جلتے — پھولوں کے خرمن شعلوں میں ڈھلتے

دیر و کلیسا تیرا، تو ہم ! — سجدوں میں تیرے دونوں جہاں گم
میں وہ کہ جس کی منزل نہیں ہے — تا حدِ طوفاں ساحل نہیں ہے
تو عطر و گل میں کھوئی ہوئی سی — جاگی ہوئی سی سوئی ہوئی سی !

رنگیں دھند لکے زرّیں سویرے — سورج ہی سورج رستوں میں تیرے !

کرنوں کی نازش تیری غلامی — راتوں کے تارے تیرے پیامی
تیری کمندیں نجم و قمر پر — ٹھوکر میں تیری الماس و گوہر
پھولوں کی سانسیں تیرا تبسّم — نغموں کی موجیں تیرا تکلّم
معصوم نظریں تارِ رگِ جاں — ساحل کی ساحل طوفاں کی طوفاں

لب ہائے لعلیں رخسارِ تاباں — بے آگ شعلے، بے نوح طوفاں
جلوے شہابی عارض گلابی — نظریں خماریں آنکھیں شرابی
کلیوں کی نکہت صبحوں کا عالم — تو سر سے پا تک شعر مجسّم

آداب رنگیں پیغام رنگیں — رنگیں لبوں کا ہر جام رنگیں
گر شعر میرے سنتی ہے سُن لے — خلدِ بریں کا ہر پھول چن لے
ایسی ہوائیں، ایسی گھٹائیں — پھر کون جانے آئیں نہ آئیں
کس سے سنے گی پھر یہ فسانے — آتے نہیں پھر بیتے زمانے !

شاعر کے نغمے، نغموں کی مستی — جس دام لے لے اس دام سستی

قمور (علیگ)

چور گنبد

عیدگاہ کے بازو جانب شمال مغرب، ایک اونچے ٹیلے پر عالی شان گنبد واقع ہے۔ محل وقوع کے لحاظ سے یہ اتنی بلندی پر ہے کہ گلبرگہ کی کوئی عمارت اتنی بلندی پر واقع نہیں ہے۔ گنبد بھی محل وقوع کے شایان شان ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے چاروں گوشوں پر چار چھوٹے گنبد ہیں جن کی دیواریں سلامی ہیں۔ ان کے اطراف لوح نما منقش کنگرے اور چاروں کونوں پر گلدستے ہیں۔ یہ گنبد دو منزلہ ہیں۔ نیچے کی منزل تہ خانہ کی طرح پست ہے۔ اوپر کی منزل جو گنبد کے نیچے ہے، ۶ فٹ ۳ انچ مربع ہے۔ یہ گنبد چاروں طرف سے کھلے ہیں۔ ہر طرف محراب پر دو دو پھول ہیں۔ صرف جنوب مشرق کے گنبد کے نیچے سے بڑے گنبد کی چھت پر آنے کا راستہ ہے۔ چھت کے اطراف بڑے بڑے لوح نما کنگرے ہیں۔ ایک ایک کنگرہ ۳ ½ فٹ سے زیادہ اونچا اور ۳ فٹ سے زیادہ چوڑا ہے۔ گنبد کا ہر ضلع اندر سے ۵۰ فٹ اور باہر سے ۵۷ ½ فٹ ہے۔ بلندی کنگروں کی دیوار تک ۴۵ فٹ ہے۔ قبہ کی گولائی باہر سے ۱۸۷ فٹ ہے۔ یہ گنبد ایک سنگ بستہ چبوترے پر واقع ہے جس کی بلندی جانب جنوب ۴ فٹ ہے۔ اس پورے چبوترے پر گچ کا فرش ہے جس کا عرض تینوں طرف ۶۴ ½ فٹ اور جانب مشرق ۶۵ فٹ ہے۔ چبوترے کے تین طرف (سوائے جانب مغرب کے استونوں کے مربع نشانات پائے جاتے ہیں، ممکن ہے ان پر کمانیں ہوں۔

چبوترے کے نیچے ایک اور چبوترہ ہے جس کا عرض ہر طرف کم و بیش سو سو فٹ ہے۔ اس کے اطراف پتھر پڑے ہوئے ہیں جو شکستہ احاطہ کی دیوار کے معلوم ہوتے ہیں۔ مشرق کی طرف پھاٹک کے بھی نشان ملتے ہیں، گچ کی دو پختہ دیواروں کے درمیان اب تک بھی راستہ بنا ہوا ہے۔

زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ اس احاطہ میں اب ہل چل رہے ہیں اس کے شمالی حصے میں ایک چبوترے پر کچھ قبور ہیں۔ احاطہ کے باہر بھی کچھ چبوترے اور قبور ہیں۔ اس ٹیلے کے نیچے (جس پر گنبد واقع ہے) شمال مشرق کی طرف، ذرا ہٹ کر ایک گڑھے کے اطراف مدوّر بند ہے، یہ کٹورا تالاب ہے۔ اس میں بھی اب ہل چل رہے ہیں۔ ذرا اس زمانے کا تصور کیجیے، جب اس گنبد کے چبوترے اور احاطے اچھی حالت میں ہوں گے۔ تالاب کٹورے کی طرح پڑا چھلک رہا ہوگا اور غالباً اس سے گنبد کے احاطوں میں چمن بندی اور آبیاری کا کام لیا جاتا ہوگا۔

یہ گنبد کیسے بلند ذوق وزیر باتدبیر یا امیر کبیر کا ہوگا جس نے ایسے اونچے، پُرفضا، اور ہوادار مقام کو اپنی آخری آرام گاہ کے لئے پسند کیا (خواہ وہ اس میں دفن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو کیونکہ اس کا ہمیں آج کچھ علم نہیں ہے) یا اس مہندس (انجینیر) کے مذاق لطیف پر صد ہزار آفریں پڑھئے جس نے تجارتی نقطۂ نظر سے اس عمارت کو یہاں تعمیر کیا تاکہ کسی نائب سلطان یا وکیل السلطنت کو سپرد خاک کرنے کے لئے خرید لی جائے (آج ہم نہیں جانتے کہ ایسا ہوا بھی یا نہیں کیونکہ آج کل یہ چور گنبد کے نام سے مشہور ہے اور اس زبان زدِ خاص و عام نام کی بدولت اپنی اصلیت کو چھپائے ہوئے ہے۔

عمارت کی یہی موزونی اور محل وقوع کی یہی بے نظیری تھی جس نے آج سے چالیس برس پہلے نواب فرامرز جنگ بہادر اول تعلقدار کو اس امر پر آمادہ کیا کہ اس کو عام تفریح گاہ یا کلب گھر بنا دیا جائے، چنانچہ آبادی سے کافی فاصلے اور راستے کی دشوار گزاری کے باوجود انھوں نے نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے اس ارادے کو

نئی جامہ پہنایا۔ داغ دوزی شروع کروادی اور اندرون گنبد کی پرانی استرکاری پر نیا پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ قبہ میں بھی یہی عمل کیا گیا اور باہر کی طرف صرف مشرقی سمت میں نئی گچ کی گئی۔ اندر حسب ضرورت کچھ رنگ کا کام بھی کیا گیا۔ خود گنبد اس واقعہ کی زبان حال سے گواہی دے رہا ہے۔ اس طرح کہ چالیس سال کے بعد ہی جب نئے پلاستر کی پپڑیاں جھڑنے لگیں اور اندر سے پرانی میلی گچ اپنا جلوہ دکھانے لگی تب یہ عقدہ کھلا کہ اس عالی شان گنبد کے خط و خال اور نقش و نگار کا بھدا پن جو رہ رہ کے دل میں کھٹکتا تھا ہمارے ہی زمانے کے کاریگروں کی فن کاری کا مرہون منت ہے۔ اس نئے پلاستر کی وجہ سے اب یہ بتلانا قطعاً ناممکن ہے کہ اس کے نیچے چھپے ہوئے اصلی نقش و نگار کیا ہیں اور اب وہ کچھ باقی بھی ہیں یا مٹ مٹا گئے۔ اس کا دیکھنے والا آئندہ کا وہ شخص ہوگا جو تیس چالیس برس بعد آئے گا اور اس پورے پلاستر کے جھڑ جانے کے بعد اس کو دیکھ سکے گا۔ فی الحال جو حالت ہے میں اس کو بیان کئے دیتا ہوں۔

یہ گنبد تین منزلہ ہے۔ نیچے کی منزل میں دیواریں اور گوشے نقش و نگار یا اور کسی قسم کی آرائش سے بالکل خالی ہیں۔ ان چوڑی چوڑی دیواروں میں صرف دو دو چھوٹے طاقچے ہر طرف بنے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف چار محرابیں ہیں۔ مغربی محراب بند ہے مگر جدید استرکاری کے وقت شاید ہوا آنے کے لئے اس میں ایک بڑا سوراخ سا کر دیا گیا ہے۔ مشرقی محراب میں دروازہ ہے جس کے لئے پتھر کی خوبصورت چوکھٹ لگائی گئی ہے۔ اس چوکھٹ کا طول ۱۱ فٹ اور عرض ۸ فٹ ہے۔ شمالی اور جنوبی محرابوں میں جالی لگائی گئی ہے' یہ بھی جدید ہے۔

جنوبی محراب کے ہر دو طرف سے دوسری منزل پر یعنی گیلری میں جانے کا راستہ ہے۔ یہ چاروں محرابیں دوہری ہیں یعنی ۱½ فٹ کا عرض چھوڑ کر پیچھے ایک اور محراب بنائی گئی ہے۔ ان دونوں کے پاکھے نصف ساق تک سیدھے آئے ہیں۔ ہر محراب سامنے سے ۹ فٹ ۹ انچ چوڑا ہے۔ مغربی محراب کا جملہ عرض شرقاً غرباً ۷ فٹ ہے اور اس میں دوسرا محراب زیادہ پیچھے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ یہ محرابیں اور ان کی چھتیں نہایت خوبصورت ہیں۔ اس وضع میں اتنی خوبصورت کہیں دیکھنے میں نہیں آئے حالانکہ بالکل سادہ ہیں سوائے ڈھال نما دو دو پھولوں کے اور کسی قسم کی گلکاری اور آرائش ان پر نہیں ہے۔ اوپر کی منزل میں بھی چار محرابیں ہیں ان پر جالی لگا دی گئی ہے جو نئی معلوم ہوتی ہے۔ کونوں میں نیم محرابیں ہیں مگر نئے پلاستر میں یہ نہایت بھدے ہو گئے ہیں۔ ان تمام پر نقش و نگار کچھ نہیں ہے۔ صرف سبز رنگ کے بھدے خطوط اور بازو ڈھال نما دو دو پھول۔ اس قسم کے تمام پھولوں میں سرخ و سبز رنگ کر دیا گیا ہے۔

گیلری گنبد کی دوسری منزل پر گیلری ہے۔ بہت ممکن کہ اس میں بھول بھلیاں ہو۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم تاریکی ضرور تھی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ستر اسی برس پہلے کی بدامنی کے زمانہ میں جب کہ چور اور ڈاکو چو طرف لوٹ مار اور قتل و غارت کرتے پھرتے تھے جس میں گلبرگہ بھی بیڈروں وغیرہ کی یورشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا (زمانہ کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اسی برس پہلے بیڈر شوراپور ضلع تھا اور گلبرگہ اس کا ایک تعلقہ) بستی سے دور ہونے کی وجہ سے چور اس میں چھپ رہتے ہوں اور انھوں نے اس کو اپنا امن و مسکن بنا لیا ہو اس لئے چور گنبد اس کا نام پڑ گیا ہو۔ بہر حال یہ گیلری تاریک ضرور تھی کیونکہ ہر طرف سے بند تھی۔ اس تاریکی کو دور کرنے کے لئے ہر طرف چھوٹے چھوٹے روشن دان پھوڑ دئے گئے ہیں اور دوسری منزل میں جو چار جالدار محرابیں ہیں

ان کے مقابل کے باہر کی طرف کے چاروں محرابوں کو توڑ کر ان کے بیچ میں جو کوئی جالی لگا دی ہے۔ اب جو چاروں طرف سے باہر کی روشنی اندر آگئی اور گنبد کے نیچے سے بھی جالدار محرابوں کے ذریعے سے کچھ روشنی آئی تو گیلری کافی روشن ہوگئی۔ اب یہ سب جالیاں ٹوٹ گئی ہیں صرف جانب شمال کی باقی ہے۔ جنوب کی طرف گیلری کا جو حصہ ہے اسی میں سے ہو کر گنبد کی تیسری منزل پر پہنچنے کا راستہ ہے۔

قبہ قبہ میں سب سے پہلے چھتہ نما کٹوریوں کا دوہرا حلقہ ہے (جیسا کہ فیروز شاہ کے گنبد میں ہے) جو جدید استرکاری کی وجہ سے نہایت بدنما ہوگیا ہے۔ اس حلقہ پر لوح نما کنگرے ہیں۔ بعض کنگروں کے بیچ میں لفظ اللہ اور اطراف میں ایک ہی قسم کی گلکاری ہے جس میں شنگرفی رنگ دیا گیا ہے۔ ان کے اوپر کچھ فاصلے سے ایک آرائشی حلقہ ہے جس میں صرف گلکاری ہے۔ اس حلقہ پر چار بڑے بڑے پان بنے ہوئے ہیں۔ دو پانوں کے بیچ میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد کلمۂ طیبہ اور اطراف میں گلکاری ہے۔ باقی دو پانوں میں صرف گلکاری ہے۔ اس کے بعد قبہ کے بیچوں بیچ ایک نہایت سادہ کنول نما چھوٹا سا پھول ہے جو بہت بدنما ہوگیا ہے اور قبہ کے لحاظ سے بہت چھوٹا بھی ہے۔ ان سب میں شنگرفی رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ اس نئی استرکاری نے گنبد کے اصلی اور قدیم اندرونی حسن کو اور اس کی تمام آرائش و زیبائش کو ہماری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ گنبد کی رفعت و شان اور اس کے بعض موجودہ اجزاء کو دیکھ کر (جیسے چھتہ نما کٹوریاں) یہ خیال کرنے کی کافی وجہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق (جیسا کہ ہم دوسرے تمام گنبدوں میں دیکھتے ہیں) اس میں اعلیٰ قسم کی گلکاری اور نقش و نگار ضرور ہوں گے اور کلام شریف کی آیتیں بھی ہوں گی۔ مغربی محراب پر بھی کچھ نہ کچھ فن کا کمال صرف کیا گیا ہوگا مگر آج ہم یہ کہنے کے قابل نہیں ہیں کہ وہ باقی بھی ہیں یا ان سب کو چھیل چھال کے نیا پلاستر چڑھایا گیا ہے۔

مزید(۱) افسوس تو اس کا ہے کہ یہ سب کچھ جس مقصد سے کیا گیا اور اتنی محنت اور روپیہ جس مطلب کے لئے صرف کیا گیا وہ بھی پورا نہ ہوا اس لئے کہ گنبد میں سنگ سیلو کا فرش کرتے وقت زمین کے کھودنے میں کچھ انسانی ہڈیاں نکل آئیں اور معاً نواب فرامرز جنگ نے اس کو سیرگاہ بنانے کے خیال سے ہاتھ اٹھا لیا حالانکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا ہڈیاں کھد چکی تھیں۔ نہ معلوم انھوں نے کیا خیال کیا اور گلبرگہ ایک ایسی اچھی سیرگاہ سے محروم ہوگیا۔ ورنہ اس سے لئے جب سڑک بن جاتی تو عیدگاہ بھی آباد ہو جاتی جو بجائے خود مسلمانوں کے فن تعمیر کا ایک شہ کار ہے۔

بیرونی رخ اس گنبد کے باہر کی طرف ہر ضلع میں دس دس محرابیں ہیں پانچ اوپر اور پانچ نیچے۔ ہر محراب کے مرغوں کے روکار پر دو دو ڈھال نما پھول ہیں اور بیچ میں جہاں پلکھے ختم ہوتے ہیں گچ کی ابھری ہوئی ایک سیدھی لکیر سی چلی گئی ہے۔ سوائے مشرقی رخ کے جس طرف دروازہ ہے باقی تین طرف کی استرکاری پرانی اور قدیم ہے۔ قبہ کی استرکاری بھی باہر کی طرف پرانی اور اصلی ہے اور اب تک صحیح سالم ہے۔ قبہ گول اور نہایت خوش نما ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ عمارت مجھے عادل شاہی

---

(۱) مولوی عبدالرحیم خاں صاحب ناظر تعلیمات نے اپنی تالیف "گیزیٹیر گلبرگہ" میں بھی یہی تذکرہ کیا ہے۔ اس گزیٹیر کو نواب فرامرز جنگ بہادر اول تعلقدار گلبرگہ ہی کے ایما سے ۱۳۲۲ھ میں شائع کیا گیا تھا۔

دور کی معلوم ہوتی ہے۔ بیجاپور میں بھی ایک گنبد جو عین الملک کا کہلاتا ہے اس سے بہت مشابہ ہے بلکہ دور سے تو مجھے ہو بہو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس چور گنبد کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں آواز خوب اور بہت صاف گونجتی ہے۔

ایک اور وجہ اس کو چور گنبد کہنے کی ایک توجیہہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ قلعہ سے یہاں تک چور راستہ تھا۔ اگر دشمن محاصرہ کر لیتا تو اسی گنبد سے قلعہ میں رسد پہنچائی جاتی اور اگر کوئی برا وقت آپڑتا تو قلعہ کے لوگ یعنی بادشاہ وغیرہ چور راستے سے اس گنبد میں آتے اور یہاں سے کسی طرف نکل بھاگتے اس کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ اس کی گیلری میں بھول بھلیاں تھی۔ بھول بھلیاں کو چور راستوں سے بھی تعبیر کرتے ہیں چونکہ گلبرگہ میں یہی ایک گنبد ایسا تھا اس لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو اصل حقیقت اس بھول بھلیاں میں گم ہے۔

میر جہانگیر علی خاں

ضروری اطلاع :-

نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ براہ کرم خریدار اصحاب نئے سال کا چندہ تقسیم کنندۂ سب رس سے باضابطہ مطبوعہ رسید حاصل کر کے عنایت فرمائیں۔ اضلاع کے خریدار بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں یا وی۔ پی کرنے کے لئے دفتر کو آرڈر روانہ فرمائیں۔

نئی معیاری کتابیں

جناب محمد جمیل احمد صاحب ایم اے بریلوی کی تازہ تصانیف

تذکرۂ شاعرات اردو ابتداء سے لیکر موجودہ دور تک کی اردو شاعرہ خواتین کا مفصل مکمل تذکرہ اور انکے کلام کا انتخاب مع تنقید و تبصرہ، دور حاضر کی شاعرات کے حالات خود نوشتہ اور کلام ان کا اپنا انتخاب درج ہے۔ خواتین کی متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اس موضوع پر اب تک ایسی کتاب مرتب نہیں ہوئی مقدمہ ڈاکٹر عندلیب شادانی ایم اے۔ پی ایچ ڈی و پروفیسر محمد طاہر فاروقی ایم اے۔ کاغذ سفید قیمتی گرد پوش جلد حجم صفحے ۸۵ ۔ قیمت صرف للعہ 5/12/

ٹوٹے ہوئے دل بہترین نفسیاتی، رومانی (نئے) افسانوں کا مجموعہ۔ مقدمہ فاضلان ڈاکٹر عبادالرحمٰن خاں صاحب پی ایچ ڈی، کاغذ سفید و دیدہ زیب گرد پوش جلد صفحے ۲۲۴ قیمت صرف عالہ 2/6/9

تاثرات نہایت ہی دلدوز، حسین اور پرتاثیر ادب پاروں کا دلکش مجموعہ کاغذ سفید، مصور رنگین گرد پوش جلد حجم صفحے ۳۰ قیمت صرف عہ /10/0

میر تقی میر (زیر طبع) جناب پروفیسر خواجہ احمد صاحب فاروقی ایم اے کی ایک نفیس بہا تالیف اس کتاب کا مطالعہ ان تمام کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دے گا جو میر اور میر کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں اور میر کے متعلق بعض ایسے گوشے بھی منور ہو جائیں جو ابھی تک تشنۂ بحث تھے۔ حجم اندازاً صفحے ۱۷۵ ۔ قیمت للعہ 1/12/0

یہ اور دیگر ہر قسم کی کتابیں ملنے کا پتہ

قومی کتب خانہ بریلی

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو و فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنگان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔

صفحات ۱۲۸۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔

قیمت عالہ۔

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیریت آباد

حیدرآباد دکن

جھجک

اپنی باتوں سے دلوں میں گھر بنا سکتا ہوں میں
علم و فضل و شعر کے دریا بہا سکتا ہوں میں
ایک دو کا ذکر کیا محفل پہ چھا سکتا ہوں میں
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال
ٹوک دیتا ہوں کسی کو بھی یہ جراءت ہے مری!
کر گزرتا ہوں جو کرنا ہے، یہ ہمت ہے مری!
مسکرا دیتا ہوں مشکل میں یہ عادت ہے مری
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال
روح جیسے اک مسلسل کرب سے بے تاب ہے
دل سے ملنے کے لئے دل ماہیٔ بے آب ہے
ہو گیا سوگند سونا، آنکھ بھی بے خواب ہے
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال
یہ نہیں کچھ وہ نہیں واقف مرے حالات سے
میرا ضبط و ہوش رسوا ہے مری حرکات سے
اک طلسم عشق پیدا ہے مرے جذبات سے
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال
اس کے دل کا حال بھی اس کی نظر سے ہے عیاں
اس کی خاموشی بھی کہنا چاہتی ہے داستاں
وا کرے آغوش اپنا، اس کی یہ فطرت کہاں
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال
یوں تو اس بن کب مجھے یہ زندگی مطلوب ہے
زندگی تو زندگی کب موت ہی مرغوب ہے
جو نہیں محبوب تو دنیا ہی "نامحبوب" ہے
باوجود اس کے مگر کیوں نطق میرا ہے نڈھال — اک سراپا ناز سے کہنا ہے مجھ کو جی کا حال

سلیمان اریب

زلزلے

(زندگی کے پُر شور دریا میں رات کے وقت کتنے دیے بہے چلے جاتے ہیں! حیات انسانی کے کوہساروں میں کتنے جگنو چمکتے ہیں اور پھر ان کو ظلمتِ شب اپنی چادریں پیٹ کر نہ جانے کہاں لے جاتی ہے۔ آسمان پر کتنی بجلیاں چمکتی ہیں، اور پھر کالے بادلوں میں منہ چھپا لیتی ہیں، بادل کی گود سے ہزار مرتبہ نکلتی ہیں اور پھر اسی میں جا کر چھپ جاتی ہیں، یہ آٹھ پہر کی داستان ہے۔ گوشِ ہوش سنتا ہے اور چشمِ عبرت دیکھتی ہے، ظاہر کی تشریح بیکار اور عیاں کا بیان فضول، پھر کیجئے کیا کہ دل کے زخموں کا لطف کریدنے سے دونا ہوتا ہے۔ مسکین فاختہ اپنے زخم کو اپنے پروں سے چھپا لیتی ہے، مگر انسان زخم کو کریدتا رہتا ہے، کہ کہیں خلش کم نہ ہو جائے، خون نہ رک جائے اس زخم کی جان بہتا ہوا گرم خون! اور دُکھتا ہوا جسم ہے۔ گرم خون اگر نہ بہے تو تالاب کے پانی کی طرح میلا اور ناپاک ہو جاتا ہے۔ جسم اگر دکھے نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں، خاک ہے۔ سفر حرکت کا نام ہے اور حضر موت ہے، زندگی زخم ہے اور موت اس کا اندمال ۔ !!!) قاضی عبدالغفار

بنگال کے قحط زدہ بھائیوں کے لئے چندہ کی اپیل پر لبیک کہہ کر میں ایک امدادی شو سے گھر لوٹ رہا تھا، رات کافی بھیگ چکی تھی ۔ تاریکیٔ شب کائنات کی ہر شے کو اپنے موٹے کمبل میں چھپائے سو رہی تھی، میرے دماغ پر خیالات بجلی کی طرح چمکتے اور غائب ہوتے جا رہے تھے، بھوک شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کسی نے جلتا ہوا توا پیٹ پر رکھ دیا ہے ۔ بس گھر میں قدم رکھنے ہی والا تھا کہ کوئی لڑکھڑا کر میرے قدموں پر آ گرا اور مجھ سے لپٹ گیا، گلی کے نکڑ کے قمقمے کی بیمار سی روشنی میں میں نے دیکھا ایک ادھیڑ عمر کی عورت میرے قدموں سے لپٹی ہوئی ہے۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے تار تار تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ میں نے فوراً سہارا دے کر اس کو زمین سے اٹھا لیا۔ نحیف سی آواز میں وہ بولی "ان داتا .... تین دن سے بھوکی ہوں کچھ کھانے کو دو گے"۔ میں نے اشارے سے اسے گھر کے اندر آنے کو کہا ۔ اور جو کچھ گھر میں تھا اس کے آگے رکھ دیا وہ بھوکے شیر کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی، اس کی بیمار آنکھیں کچھ دیر بعد ہی چمکنے لگیں معلوم ہوتا تھا گویا اس کے چہرے کی سوکھی ہوئی رگوں میں خون یکایک برقی رو کی طرح دوڑنے لگا ہے ۔ پھر جب وہ پیٹ بھر کر کھا چکی تو اس کی آنکھوں سے دو بڑے آنسو ٹپک پڑے، پھر وہ میرے پیروں پر گر پڑی ــــ میں بت بنا کھڑا تھا۔ میری آواز حلق میں سوکھ چکی تھی۔ اف انسان کو سجدہ کرے، انسانیت کے دامن کا یہ دھبہ کیا کبھی دھویا جائے گا۔ بھوک نے آدمی کو کیا سے کیا بنا دیا۔ ایک دھیمی آواز میں گویا کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا، یہ خود انسانوں کے ہاتھوں لایا ہوا ظلم ہے، پھر بھری لگا ہوں کے آگے سرمایہ داروں کی بڑی بڑی توندیں گھومنے لگیں اور میری آنکھوں کو ان کے عشرت خانوں میں سونے کی اینٹیں اور زر و جواہر کے انبار نظر آنے لگے جو آہستہ آہستہ غریبوں کے خون، آنسو اور گوشت پوست کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو گئے، پھر ان زر و جواہر کی جھنکاروں میں مجھے محسوس ہوا کہ کئی روحیں آہستہ آہستہ رو رہی ہیں ــــ اس منظر میں سیکڑوں پچکے ہوئے نیم مردہ چہرے ابھر آئے ۔ جن کی آنکھیں آنسو اگل

رہی تھیں۔ میرے کپکپاتے سوکھے سے ہونٹوں سے نکلا "سرمایہ داروں کے یہ قصر، زر و جواہر کی کانیں..... نہیں نہیں غریبوں کے خون، گوشت پوست کے لوتھڑے اور استخواں کا مارکٹ، ایک دن ان غریبوں کی فریاد، نالۂ و شیون، آہ و بکا کو کوئی سنے گا۔ میں یکایک چونک پڑا ــ "خدا تجھے خوش رکھے بیٹا" اس کے ان تشکرانہ الفاظ پر میرے جسم کی رگ رگ میں ایک عجیب و غریب مسرت کھلکھلا اٹھی، مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آج میں نے ملک کے تمام بھوکوں کو گرسنگی کی اذیت سے بچا لیا ہے لیکن یہ تو محض میرا خیال خام تھا۔ وہ چلی گئی اور میرے خیالات کی سرزمین پر زلزلوں کا تانتا بندھ گیا ــــــ

ہندوستان جو کبھی "سونے کی چڑیا" "قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ" اور نہ جانے کن کن ناموں سے پکارا جاتا تھا، آج بھوکوں اور ننگوں کا وطن کہلاتا ہے، بھوک کتنا روکھا پھیکا لفظ ہے، کتنی تباہ کاریاں اور ہلاکت خیزیاں اپنے دامن میں سمیٹے ہند کی سرزمین پر وبا کی طرح تسلط ہے۔ اس طرح روح فرسا خیال سے میرے ذہن و دماغ پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں، تاریک اور موہوم دائرے میری آنکھوں کے آگے رقص کرنے لگے۔ پھر میرے کانوں میں کچھ ایسی آوازیں سرسرانے لگیں، جیسے دور بہت دور کچھ گدھ کسی مردہ جانور پر لڑ رہے ہوں "بھوک........ آہ خدایا...... مرا..... مرا" پھر کچھ ہڈیوں کے پنجر، بے جان سے انسان، پچکے ہوئے گال، بے نور سی آنکھیں، سوکھے پتوں سے خزاں رسیدہ لب، چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے ابھرے، ان کے پیٹ خالی تھے جیسے بھوک نے کچھ مار مار کر ان میں گڑھے ڈال دیے ہوں، جیسے کسی فقیر کی جھولی جس میں کچھ نہ ہو، ان خالی خولی گوشت پوست کے لوتھڑوں میں سڑی گلی آنتیں، سینوں میں سوکھے ہوئے ششش اور نیم مردہ دل، ڈراؤنی آنکھیں، بھوک سے خشک لب جن پر کچھ شکوہ و شکایت کچھ فریاد۔

پھر میرے دماغ میں بہت دیر تک عجیب و غریب خیالات، سیاہ بادلوں کی طرح امنڈ امنڈ کر آتے رہے پھر بنگال اور قحط کے الفاظ میری آنکھوں کے آگے بھنور کی طرح تیزی سے گھومنے لگے۔ مجھے کائنات کی ہر چیز گھومتی ہوئی معلوم ہوئی اور خود میرا اپنا وجود بھی ـ تحت الشعور سے آواز آئی بنگال، قحط ـ انسانوں کی ہولی، کتنی بھیانک ہولی، کس نے رچائی یہ ہولی کسے معلوم، کون جانتا ہے۔

اخباروں کی بے شمار سرخیاں میری نظروں کے آگے فلمی تصاویر کی طرح رقصاں ہو گئیں ـــــ

یہ وہی ہندوستان ہے جو کبھی نہ صرف اپنا کفیل تھا بلکہ بیرون ملک بھی اس کا غلہ جاتا تھا اور آج اسی ہند اسی دولت مند ہند، اسی خوش حال ہند کے لوگ ایک ایک دانہ کے لئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کے اژدہے کے آگے سسک رہے ہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے، اس کا کون ذمہ دار ہے؟

بنگال کی سرزمین راگ اور شعر کی جنم بھومی ـ ٹیگور کا وطن، قاضی نذر السلام کا گھر، اب کس مصیبت کا شکار ہے، خدا کی پناہ، بنگال ...... بنگال پھر میری نظروں کے آگے بنگال کے فاقہ زدہ انسانوں کے چہرے پھر گئے، جن کی آنکھوں میں مایوسی تھی، جن کے حلق سوکھ چکے تھے۔ جن کے جسموں سے کسی نے گوشت پوست نوچ لیا تھا، جن کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں، جیسے بھوکے کتوں کی زبانیں، تشنگی اور بھوک کی شدت میں باہر نکل پڑتی ہیں۔ کس نے ابن آدم کے بیٹوں کی یہ گت بنائی۔

کتنی انسانیت سوز داستانیں، خون کے آنسو رلا دینے والے افسانے، بنگال کی سرزمین نے کیا کبھی دیکھے اور

سنے ہیں، ایسے ہلاکت خیز اور عبرت انگیز افسانے کیا کسی نے کبھی دیکھے ہیں اور کیا کبھی کانوں نے اتنی خونیں داستانیں سنی ہیں۔

مائیں اپنے جگر گوشوں کو فروخت کر رہی ہیں، ان سے ممتا کس نے چھین لی، عورت کی فطرت کو کس نے اُچک لیا۔ سائنس نے اتنی ترقی کی، قدرت کے عناصر پر آج وہ راج کر رہی ہے، لیکن سائنس کی وہ کرشمہ سازیاں کس کام کی وہ تہذیب و تمدن ہی کیا جس میں خود انسان کو ایک دانہ نہ مل سکے، یہ تہذیب کی بلندی ہے یا اس کی پستی۔

انسان لپکتے ہوئے شعلوں میں کود سکتا ہے، دہکتے ہوئے انگاروں پر چل سکتا ہے، چمکتی ہوئی تلواروں کے سایہ میں، گولیوں کی بارش میں سانس لے سکتا ہے، سمندر پر طوفانوں کو نیچا دکھا سکتا ہے۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار زہرہ و مشتری کو چوم سکتا ہے اور مریخ کی خبریں لا سکتا ہے، لیکن اس خاکدان میں 'پیٹ'، بھوک اور قحط کے آگے سپر ڈال دیتا ہے۔ اس زہریلی ناگن کے ڈسے کا علاج موت ہے، دنیا کی ہلاکت خیزیاں اور جاں گسل بیماریاں ایک طرف اور بھوک اور قحط ایک طرف!

بنگالیوں کو بھی اسی ناگن نے ڈسا، وہ ایک ایک دانے کے لئے ترس گئے۔ بنگال میں جب یہ زہریلی ناگن، آدم خور گدھ کے مانند دیوانہ وار منڈلانے لگی تو بنگالیوں نے بھوک کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ ان کے انمول اور بیش قیمت خزانے — حریت، مذہب، ضمیر، عزت، اولاد، عصمت سب کچھ پیٹ کے دوزخ بھرنے کے لئے فروخت ہو گئے۔ آہ! بھوک تیرے آگے انسان کس قدر کمزور و ناتواں ہے۔

انجم صہبائی

غزل

سانسوں سے جھڑتے تھے شرارے | عشق نے ایسے دن بھی گزارے
عزتِ رسوائی نے دیئے ہیں | میری تمناؤں کو سہارے
ہنستے ہوئے دیکھے ہیں جہاں نے | روتی ہوئی آنکھوں کے اشارے
تیرا بھی کیا نام نہ لیتے ——؟ | جینے والے غم کے سہارے
میرے نغموں کی مستی سے | چرخ پہ رقصاں چاند ستارے
عشرتِ ساحل کو تکتے ہیں! | دریاؤں کے بھوکے دھارے

دیکھ رہا ہوں راہ کسی کی
ڈوب رہے ہیں چاند ستارے

لطیف ساجد

سوال و جواب

جرأت

سوال:۔ اردو کے شاعر جرأت کہاں پیدا ہوئے، اپنے موقرہ نامے میں ان کے حالات زندگی پر روشنی ڈالی جائے تو مناسب ہوگا، کیا یہ صحیح ہے کہ وہ اندھے تھے۔ اطہر رضا

جواب:۔ میاں جرأت کا اصلی نام یحیٰی امان تھا لیکن شیخ قلندر بخش کے نام سے مشہور ہوئے، باپ کا نام حافظ امان تھا جو خاص دہلی کے رہنے والے تھے، کہتے ہیں کہ ان کے اجداد میں رائے امان، نادری حملے کے دوران میں قتل ہوئے۔

جرأت، سید انشا اور شیخ مصحفی کے ہم عصر ہیں، لیکن انشا کے ساتھ ان کا بڑا اخلاط تھا۔ مولنا آزاد نے انھیں جعفر علی حسرت کا شاگرد لکھا ہے، ابتدا میں نواب محبت خاں رئیس بریلی کے یہاں نوکر رہے، پھر لکھنؤ پہونچ کر مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔

یہ صحیح ہے کہ وہ اندھے تھے۔ لیکن مادر زاد نہیں، بلکہ عین عالم شباب میں چیچک کی بیماری نے انھیں آنکھوں سے معذور کر دیا، مگر چشم بصیرت کی بینائی میں فرق نہیں آیا۔ شعر خوب کہتے تھے خصوصاً عاشقانہ طرز کلام میں وہ اپنے رنگ کے استاد مانے جاتے ہیں، اصناف سخن میں ان کے یہاں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے، قصائد سے عمداً اجتناب کیا ہے، البتہ خاص خاص موقع پر ہجو لکھی ہے، اپنی خوش مزاجی، خوش گفتاری اور بذلہ سنجی سے ہم عصروں میں نہایت ہر دل عزیز تھے۔ چنانچہ مولنا آزاد، سید انشا، مرزا قتیل اور جرأت کے متعلق لکھتے ہیں۔

"گھر میں رہنے نہ پاتے تھے، آج ایک امیر کے ہاں، دوسرے دن دوسرے امیر آتے، سوار کیا اور ساتھ لے گئے، چار پانچ دن وہاں رہے، کوئی اور نواب آئے۔ وہاں سے وہ لے گئے۔"

عربی اور فارسی کی استعداد واجبی واجبی تھی، لیکن طبیعت اس قدر موزوں اور مناسب پائی تھی کہ محاوروں کی چستی، زبان کی صفائی اور مضمون آفرینی میں قابل ہم عصروں میں اپنا پلہ کبھی نیچا نہ ہونے دیتے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کی شگفتہ بیانی کو کوئی نہ پہونچتا تھا۔

مولنا آزاد نے ان کے متعلق ایک لطیفہ اپنی زندہ جاوید کتاب "آب حیات" میں درج کیا ہے، جو نہایت دلچسپ ہے، لطیفہ یہ ہے:۔

"ایک دن میر انشاء اللہ خاں، جرأت کی ملاقات کو آئے، دیکھا تو سر جھکائے بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا کہ کس فکر میں بیٹھے ہو؟ جرأت نے کہا کہ ایک مصرع خیال میں آیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے، انھوں نے پوچھا کہ کیا ہے؟ جرأت نے کہا کہ خوب مصرع ہے مگر جب تک دوسرا مصرع نہ ہوگا تب تک نہ سناؤں گا، نہیں تو تم مصرع لگا کر اسے بھی چھین لوگے، سید انشاء نے بہت اصرار کیا آخر جرأت نے پڑھ دیا ع

اس زلف پہ پھبتی شب دیجور کی سوجھی

سید انشاء نے فوراً کہا کہ ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی

جرأت ہنس پڑے اور اپنی لکڑی اٹھا کر مارنے کو دوڑے، دیر تک سید انشاء آگے آگے بھاگتے پھرے اور یہ

پیچھے پیچھے ٹٹولتے پھرے۔ اللہ اکبر! کیا شگفتہ مزاج لوگ تھے کیا خوش دلی اور فارغ البالی کے زمانے تھے"۔

ان کے کلام سے چند اشعار یہاں نقل کر دیتے ہیں لیکن یاد رہے یہ انتخاب ان کے پورے سرمایۂ سخن پر حاوی نہیں، تفصیل دیکھنی ہو تو ان کا کلیات دیکھئے یا مولنٰا آزاد کی مذکورہ کتاب کا مطالعہ فرمائیے :۔

یہ شکل مہر ہی گردش ہے ہم کو سارے دن　　گر خدا ہی یہ بگڑے ہوئے سنوارے دن
رہے تھا ہم سے ہم آغوش جب کہ وہ پیارا　　عجب تھیں لطف کی راتیں عجب تھے پیارے دن
کبھی وہ چاند کا ٹکڑا ادھر بھی آنکلے!　　ذرا تو دیکھ منجم مرے ستارے دن
لگایا روگ جوانی میں کیوں میاں جرأت　　ابھی تو کھیل تماشے کے تھے تمہارے دن

لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے　　ہے کس کا جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے

کس روز اشک خونی سے تر آستیں نہیں　　پہلو میں کیا کہیں جگر و دل کا کیا ہے رنگ
گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں　　اس بن جہاں کچھ نظر آتا ہی اور ہے

خراب کیونکہ نہ ہو شہر دل کی آبادی　　ہمیشہ لوٹنے والے ہی اس دیار میں آئے
نہ پوچھ مجھ سے وہ عالم کہ صبح نیند سے اٹھ　　جب انکھڑیوں کو ملتے ہوئے خمار آئے
اٹھے جہاں سے نہ جرأت اٹھا کے درد فراق　　الٰہی موت بھی آئے تو وصل یار میں آئے

نوک مژگاں پہ دل پژمردہ ہے یوں سرنگوں　　شاخ پر جھک آئے ہے جوں پھول مرجھایا ہوا

جس رنگ مرے چشم سے برسے ہے پڑا خوب　　اس رنگ کی دیکھی نہیں برسات کہیں اور

گھر میں بے یار ہے شکل اپنی یہ دل کے ہمراہ　　وہ گنہگار ہوں جوں قید میں جھلائے ہوئے
پیرہن چاک ترے در پہ جو کل کرتا تھا　　آج لوگ اس کو لئے جاتے ہیں کفنائے ہوئے
ابر تصویر کی مانند ہم اس محفل میں　　رو نہیں سکتے پہ آنکھوں میں ہیں اشک آئے ہوئے

م۔ ر۔ س

ہندوستانی تمدن :۔ از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۴۴۰) قیمت ہے

سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

تاثرات

سینے میں جیسے پھانس کھٹکتی ہے دمبدم تیرا خیال دردِ جگر بن کے رہ گیا

'عاصمہ' جو محبت کی ایک نظر اور موانست کا ایک لمحہ چاہتی تھی صرف اس لئے کہ وہ سنگدل محمود کو اپنی کیفیات قلب سنائے، کچھ اپنے جذبات دل عرض کرے کچھ اپنے حسیات و تاثرات پیش کرے۔ جب اس نے دیکھا کہ محمود کی محبت بے اعتنائی سے بدل رہی ہے، دم بخود رہ گئی۔ عاصمہ اپنے سینے میں نازک دل رکھتی تھی، محمود کی اس بے اعتنائی کی تاب نہ لاسکی، اس کا دل بھر آیا آنکھوں میں آنسو آگئے، آرزوئیں پامال ہوگئیں۔ اس کی تمنائیں دم توڑنے لگیں، مایوسیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے اپنی وفاداری اور محمود کی بے اعتنائی کا اندازہ کرنے لگی۔ کیا اسی روز کے لئے اس نے محبت کا دعویٰ کیا تھا، کیا محبت یہی رنگین دھوکا ہے جب ان عہد و پیمان کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا تو محمود نے کس خوبی سے منہ پھیر لیا۔ کیا خوب دلیلیں پیش کیں۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ مرد بے وفا ہوتا ہے، وہ عورت کے دل کو کھلونا بنا کر کھیلتا ہے۔ اس کے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ وہ نہیں جانتا کہ عورت کا نازک دل اس کی تاب نہ لاسکے گا۔ عاصمہ کے دماغ میں یہی خیالات موجزن تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بالکل غافل دنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی۔ جو خیال اس کے دل میں محبت کا روح پرور نغمہ بن کر سمایا تھا اب وہ درد بن کر تڑپا رہا ہے۔ ان ہی خیالات میں وہ منہمک تھی، یکایک اس کو ایک غیبی آواز نے چونکا دیا۔ اگر تم اذیت میں ہو، اس لئے کہ تم محبت کرتی ہو تو اور زیادہ محبت کرو کیونکہ محبت میں مرجانا محبت کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ یہ تھے دکھے ہوئے دل کے تاثرات۔ اسی طرح زمانہ گزرتا گیا۔ اس کا دل درد و کرب کی آماجگاہ بنا رہا۔ وہ بظاہر اب ہنسی خوشی سے اس تکلیف کو برداشت کرنے لگی لیکن دل کی خلش کسی طرح کم نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے، اس کی آواز گلوگیر ہوگئی، اس کے ہاتھ ڈھیلے پڑگئے، خدائے قدوس کو اس کے حالِ زار پر رحم آگیا۔ فرشتہ نے اس کی آواز پر لبیک کہہ موت نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا جہاں وہ ابدی اور میٹھی نیند سو رہی ہے ؎

محتاجِ اجل کیوں ہے خود اپنی قضا ہو جا غیرت ہے تو مرنے سے پہلے ہی فنا ہو جا

م ۔ ح ۔ ب

تلاش

جس جگہ بجھ نہ سکے سوزِ محبت کا چراغ | جس جگہ پھول کے مانند شگفتہ ہو دماغ
جس جگہ ہوش میں لاتا ہو امنگوں کا ایاغ | ایسی دنیا مجھے درکار ہے جینے کے لئے

جس جگہ چرخ نہ ہو، صبح نہ ہو، شام نہ ہو | غم نہ ہو، آہ نہ ہو، یورشِ آلام نہ ہو
کوئی صیّاد نہ ہو، کوئی تہِ دام نہ ہو | ایسی دنیا مجھے دکار ہے جینے کے لئے

تحسین سروری

صحت گاہ اننت گری

"دیر آید درست آید" کا مشہور مقولہ اگر لفظ بہ لفظ کسی پر صادق آسکتا ہے تو وہ حیدرآباد پر۔ چند سال قبل ہم اور سب یہی سوچتے تھے کہ اس کے سکون وجمود میں کب اور کس طرح حرکت پیدا ہوگی؟ مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت حکیم والیاست نے اس مملکت کے قالب بے جان میں ایسی روح پھونک دی کہ جس نے حرکت کے ساتھ رفتار اور اسراع بھی پیدا کر دیا۔ آج ہم نے حیات کے تمام شعبوں میں تلافی مافات کر کے ایسی ترقی کی ہے اور کر رہے ہیں کہ اب ہماری ریاست سارے ہندوستان کے لئے جاذب نظر اور مرکز توجہ بنتی جا رہی ہے۔

زندگی کو خوشگوار بنانے اور عام امراض سے محفوظ رہنے کے لئے دواخانۂ عثمانیہ اور شفاخانۂ یونانی نظامیہ کی شاندار عمارتوں اور ان کے عمدہ انتظامات نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرض جذام کے معقول علاج کے لئے دواخانہ ڈچ پلی شہرۂ آفاق ہو چکا ہے۔ امراض دق وسل کے لئے شہر میں علحدہ دواخانے موجود ہیں۔ اور اپنا کام پوری قابلیت سے کئے جا رہے ہیں۔ مگر یہ ضرورت ایک زمانہ سے محسوس کی جا رہی تھی کہ ہماری سلطنت ابد مدت میں ایک شایان شان صحت گاہ تعمیر کی جائے تاکہ یہاں کے رہنے اور بسنے والوں کو مدن پلی، بنگلور وغیرہ کی صحت گاہوں تک دوڑنے کی صعوبتیں اور مایوسیاں نہ اٹھانی پڑیں۔ یہ خبر تمام اہل ملک کے لئے باعث مسرت وشادمانی ہوگی کہ اس خوبصورت صحت گاہ کی تعمیر کا کام جو اننت گری کے صحت بخش مقام پر شروع کیا گیا تھا اب قریب الختم ہے۔ اس قدر اہم اور ضروری شعبہ کے قائم کرنے اور اس کے لئے ایک عمارت بنانے میں اس قدر کیوں تاخیر کی گئی؟ ایک ایسا سوال ہے جو ہر ایک کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ایک وسیع اراضی پر ایک شاندار عمارت بنا دینا کافی نہیں بلکہ ایسے مقام کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو ہر لحاظ اور ہر نقطۂ نظر سے اس کے لئے موزوں ہو۔ ایک ایسا مقام جو کافی بلند، بالا اور مسطح ہو۔ جہاں کی آب وہوا صحت بخش وروح پرور ہو اور حسن کے قدرتی مناظر زندگی کو متحرک کرتے ہوں۔ سطح مرتفع حیدرآباد کو قدرت نے ایسے بہت سے مقاموں سے نوازا ہے، ان میں سے کم از کم چار ایسے ہیں جن کی پوری طرح چھان بین کی گئی اور ان کے متعلق پورا مواد جمع کیا گیا۔ ضلع اورنگ آباد میں بھینس مال اور کنکورا کے نام سے دو پہاڑی مقامات ہیں جو سطح سمندر سے تقریباً (۲۸۰۰) فیٹ بلند ہیں، اور یہ کافی مسطح ہیں اور ان کی آب وہوا عمدہ ہے۔ وہاں انتہائی درجۂ حرارت ۹۵ اور ۱۰۰ کے درمیان ہوتا ہے۔ لیکن ملک کے ایک گوشہ میں واقع ہونے کی وجہ بُعد مسافت کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مرہٹواڑی کی امتیازی خصوصیت یعنی ہرے بھرے جنگل اور لہلہاتے سبزہ زاروں کی کمی یہاں بھی موجود ہے۔ اس لئے یہ مقامات دیگر تفریحی اغراض کے لئے مختص کر دئے گئے ہیں۔ ان کے بعد فرح آباد ہے جو ضلع محبوب نگر میں واقع ہے۔ یہ بھی مندرجۂ بالا صفات کا حامل ہے۔ البتہ تلنگانہ میں واقع ہونے کی وجہ جنگل اور سبزہ زاروں کی اس قدر کثرت ہے کہ آب وہوا کچھ مرطوب سی ہوگئی ہے۔ یہ بھی ملک کے ایک دوسرے گوشہ میں واقع ہونے کی وجہ دوری کے اعتراض سے خالی نہیں۔ یہاں سرکار عالی کے چند عہدہ دار ایک بستی بسانا چاہتے ہیں۔

اس کے بعد کوہ اننت گری ہے جو بلندی میں تو مندرجۂ بالا مقامات سے کچھ کم ہے یعنی یہ سطح سمندر سے ۲۳۰۰ فیٹ بلند ہے مگر یہ حیدرآباد سے صرف ۴۵ میل اور ریلوے اسٹیشن وقارآباد سے تین میل دور واقع ہے مگر اس کو ریلوے بس سے ملایا گیا ہے۔ تلنگانہ اور مرہٹواڑی کے خط اتصال پر واقع ہونے کی وجہ ہر دو کی امتیازی خصوصیات کا حامل ہے۔ یہ پہاڑ اس قدر مسطح ہے کہ اس کے قدرتی ہونے پر شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اس کے سدا بہار جنگل اور خوبصورت وادیاں دعوت نظارہ دیتی ہیں اور کھلے میدانوں کے ہرے بھرے سبزہ زار اور لہلہاتے کھیت دل میں امنگیں پیدا کرتے ہیں۔ یہ مقام صرف خاص مبارک کا شکارگاہ ہونے کی وجہ، چیتل، سانبھر، نیل گائے، جنگلی بکری اور چکاروں کا مامن ہے جن کو زمان ومکاں کی قید سے آزاد پھرتے ہوئے دیکھ کر آدمی خود کو فطرت کے زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔ صحت گاہ کے لئے اس سے بہتر شاید ہی کوئی اور مقام منتخب کیا جا سکتا تھا۔ حکومت حیدرآباد نے اس کام کے لئے فی الحال اٹھارہ لاکھ کی خطیر رقم منظور کی ہے اور عمارتوں کے وضع کرنے اور ان کو ترتیب دینے میں نواب زین یار جنگ بہادر کی لطیف اور سلیقہ شعار طبیعت نے اپنی فن کاری کے خوبصورت جوہر دکھلائے ہیں۔ جب یہ تمام عمارتیں تیار ہو جائیں گی تو یہ صحت گاہ ہر لحاظ سے مشرق قریب وبعید میں آپ اپنی نظیر ہوگی (صفحہ ۳۱ کے نظری خاکے سے عمارتوں وغیرہ کی ترتیب کا ایک سرسری اندازہ ہو جائے گا۔

کوہ اننت گری کوئی نامانوس مقام نہیں۔ یہاں اننت سوامی کے نام کا ایک دیول ہے جو اس پہاڑ کی وجہ تسمیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ سال میں دو دفعہ جاترا ہوتی ہے جس میں اطراف واکناف کے بہت سارے معتقدین شرکت کرتے ہیں۔ دیول اور اس سے متعلقہ سرائے مغلوں کی فن تعمیر کی یادگار ہیں۔ میں نے بوڑھے پجاری سے اس کی وجہ معلوم کرنی چاہی۔ پجاری نے کہا کہ "یہ دیول اور اس سے متعلقہ سرائیں عہد شاہجہانی میں تعمیر ہوئی ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دیول سے متعلق جو سند اس کے خاندان میں چلی آئی وہ شہنشاہ شاہجہاں کی ہی عطا کردہ ہے اور اب یہ دستاویز دفتر پائیگاہ وقار الامرا میں

کھودا ہے۔ اس نے بیان کیا کہ اس دیول کی تاریخ آج سے کوئی پانچ ہزار برس قبل سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں مارکنڈ نامی ایک رشی تپسیا کیا کرتے تھے۔ ریاضت سے انھوں نے اپنی روحانی قوت اس قدر بڑھائی تھی کہ وہ ہر صبح یہاں سے گنگا جا کر اشنان کرتے اور پوجا کے لئے لوٹ آتے مگر ہر سال اکادسی کا دن ایسا آتا کہ نہا کر واپس ہونے تک پوجا کا وقت نکل جاتا اس لئے ایک ایسے موقع پر رشی مہاراج پرماتما سے روٹھ گئے نہانے اور پوجا کا خیال کیا۔ پرماتما نے اپنے اس مقبول بندے کی دلجوئی کے لئے گنگا ہی کو یہاں بھجوا دیا چنانچہ یہ دونوں گنڈ وہی ہیں جن میں اب تک زائرین خوش اعتقادی سے اشنان کیا کرتے ہیں۔ رشی مہاراج اپنی اس سرفرازی سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے پرماتما سے پرارتھنا کی کہ ان کے پیروؤں کی شانتی کا بھی کوئی انتظام ہو۔ یہ اچھا بھی پوری ہوئی اور پرماتما نے دو سونے کی مورتیاں ان کو بخشیں۔ زمانے نے کروٹ لی اور اس کے بعد کے دور پر ایک پردہ پڑا رہا۔ مغلیہ عہد میں اننت سوامی نامی ایک اور رشی پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی تپسیا اور استغراق کے لئے اس رنگین پہاڑی کے خاموش کنج کو پسند کیا۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ مغلوں کا ایک فوجی سردار کسی معرکے میں زخمی ہو کر اپنی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ اس پہاڑ پر پناہ گزیں ہوا۔ اس نے اپنے گھوڑوں کے لئے روزانہ ہری گھاس کے ملنے پر اظہار تعجب کیا چنانچہ سائیسوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس وادی میں ایک چشمہ رواں ہے وہاں سے روز گھاس کاٹی جاتی ہے۔ لیکن لطف یہ کہ وہ روزانہ اسی قدر بلند اور ہری بھری ہو جاتی ہے۔ سردار نے خود اس کا مشاہدہ کیا اور جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے خیال کیا کہ ضرور یہاں کوئی ولی اور مرتاض دفن ہیں۔ اس نے منت کی کہ اگر اس کے زخم اچھے ہو جائیں تو وہ نیاز کرے گا۔ دوسرے دن وہ بھلا چنگا ہو گیا اور اس نے نیاز کی تیاری شروع کی۔ جب بکروں کے ذبح کا وقت آیا تو قریب سے اننت سوامی مہاراج بحالت جذب برآمد ہوئے، انھوں نے ذبح کو منع کیا اور اسی چشمہ میں غوطہ لگا کر وہی وہ مورتیاں نکالیں جو کسی زمانے میں مارکنڈ رشی کو دی گئی تھیں۔ مغل سردار نے اپنی تاریخی رواداری کا مظاہرہ کیا اور اپنی منت کو پورا کرنے کے لئے دیول اور دو تین سرائیں اور ایک بڑا کنواں تیار کروایا" اس روایت اور اس توجیہہ پر کوئی تبصرہ غیر ضروری ہے

وقار آباد نواب وقار الامراء بہادر کی پائیگاہ ہے۔ اسی لئے ایک زمانے میں یہ پہاڑ بھی انہی کے علاقہ میں تھا۔ ناممکن تھا کہ اس خوبصورت خطۂ زمین پر نواب صاحب کی باریک بیں نگاہیں نہ پڑتیں۔ ایک پُر فضا چمن، دو شاندار بنگلے اور کچھ منظر ہیں کے آثار اب بھی باقی ہیں۔ ایک پختہ اور سوا سو فٹ گہرا کنواں جو اس زمانے میں بنایا گیا تھا اب بھی اچھی حالت میں ہے اور یہ اس زمانہ کی ضروریات کے لئے بہت کافی تھا۔ مگر اب صحت گاہ کے لئے ایک بڑا دواخانہ، کئی وارڈ، ڈاکٹروں اور تیمارداروں کے رہائشی مکانات اور چمن کے لئے تو ایسے کئی کنویں بھی ناکافی ہوں گے اس لئے یہ ضروری تھا کہ آبرسانی کا معقول انتظام کیا جاتا۔

آب رسانی | معقول ذرائع آب کے لئے اس سطح مرتفع کے قرب و جوار میں تحقیق و تلاش کی گئی اور یہاں سے تین میل دور موضع اننت گری ہی کے قریب رودِ موسیٰ کی وادی میں افراطِ آب کے آثار پائے گئے، چنانچہ اسی مقام کا انتخاب کیا گیا۔ یہاں ایک پندرہ فٹ قطر کی اور پینتیس فٹ عمیق پختہ باؤلی تیار کی گئی اور اس کو ایک تیس فٹ گہری، آٹھ فٹ چوڑی اور ساڑھے چار سو فٹ لمبی خندق کے ساتھ اس طرح متصل کیا گیا کہ اس خندق کا سارا پانی ریت اور کنکریوں میں سے مقطر ہو کر ڈھلوان پائپ میں سے ہوتا ہوا باؤلی میں داخل ہوتا ہے اور یہاں سے پمپ کے ذریعے تین سو فٹ کی بلندی پر ایک محکم کنکریٹ کے بنے ہوئے خزانۂ آب میں جو پہاڑ کی سطح زمین سے ۶۰ فٹ بلند واقع ہے پہنچایا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں اپنی وضع کا یہ ایک ہی خزانۂ آب ہے اور یہاں کے لئے ایک نشانِ ارض بنا ہوا ہے۔ یہاں سے پہاڑ کے طول و عرض میں نلوں کا جال بچھوایا گیا ہے اور ان سے ہر جگہ پانی پہنچایا جاتا ہے ...

...... صحت گاہ کی پوری آبادی کا اندازہ دو ہزار ہے۔ اس کی تمام ضروریات باغ اور چمن کے لئے روزانہ ایک لاکھ گیلن یعنی فی کس پچاس گیلن پانی کا دیا جانا ضروری تھا اور موجودہ انتظام اس کے لئے بہت کافی ہے۔ اکثر اصحاب کو اس کا بہت کم اندازہ ہوگا کہ اکثر اوقات ایک انجینیر کو کتنی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اسے بڑی ہی سنگلاخ اور دشوار وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے اور جب کہیں ایک اسکیم کی تکمیل ہوتی ہے۔ آب رسانی کی اسکیم کی تکمیل کرنا جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھا۔ اس کی راہ میں وادیاں بھی حائل تھیں اور کہسار بھی۔ جیسا کہ بتلایا گیا ہے یہ باؤلی ۱۵ فٹ قطر کی اور ۳۵ فیٹ عمیق ہے۔ اطراف سے ڈھائی فٹ موٹی دیوار بنانے اور نچلے حصے میں ڈھائی فٹ موٹی کنکریٹ کی تہ بچھانے کے لئے ضروری تھا کہ یہ ۲۲ فیٹ قطر کی ہو اور ۳۷½ فٹ گہری ۔افٹ کی کھدائی کے بعد ہی پانی نکلنا شروع ہوا اس طرح ہمیں پانی میں اور ۲۷½ فٹ عمیق کھدائی کرنی تھی۔ پانی کو خارج کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہلے ایک پمپ سے کام لیا گیا اور بعد میں تین پمپ تک بڑھانے پڑے اور اس طرح پانی کو خارج کرتے ہوئے کام جاری رکھا گیا چونکہ یہ مقام رودِ موسیٰ کی وادی میں واقع ہے اس لئے باوجود موسم گرما میں کام کرنے کے پانی اس کثرت سے نکلتا رہا کہ پمپ مسلسل چلانے پڑتے تھے۔ ہم نے غیر موسمی طغیانیوں کے خلاف یہ احتیاط کی تھی کہ اس باؤلی اور خندق کے اطراف مٹی کا ایک بند بنا لیا تھا۔ مگر ماہ نیر میں ایک دن ایسی موسلا دھار بارش ہوئی کہ ندی میں زبردست طغیانی آگئی جس نے بند کو توڑ کر ساری خندق کو لبریز کر دیا اور اس کے ساتھ پمپ کے سٹ بھی غرقاب ہو گئے دوسرے پمپوں سے پانی خارج کر کے پھر کام جاری کر دیا گیا۔ جب باؤلی کی کھدائی کا کام قریب الختم تھا تو اس وقت پھر مشکلات نے آگھیرا۔ اس میں پانی کی آمد اس بلا کی تھی کہ گویا

پرنالوں سے پانی آرہا ہے۔ مٹی جس میں باؤلی کھودی جا رہی تھی خاص مستحکم تھی۔ لیکن اس پانی کی روانی نے اس کے بھی پرخچے اڑا دئے تھے اور وہ ڈھل ڈھل کر ریت کی گاریوں کی طرح گرنا شروع ہوئی حتیٰ کہ سطح زمین پر باؤلی کا قطر ۹۰ فیٹ ہو گیا۔ صرف ڈیڑھ دو فٹ اور کھودنا باقی رہ گیا تھا اگر بیچ میں کی کھدائی کی جاتی تو ایک فٹ مٹی اطراف سے جمع ہو جاتی۔ اس کی روک تھام کے لئے ریت سے بھرے ہوئے کئی سو تھیلے اطراف جما دئے گئے اور ان کے سامنے بڑی بڑی میخیں ٹھوک کر ان کو پھسلنے سے روک دیا۔ اس انتظام کے بعد کھدائی شروع ہوئی اور شام کے چھ بجے ختم ہوئی۔ کنکریٹ کا کام علی الصباح شروع کیا جانے والا تھا مگر صبح کا نظارہ ہوش ربا تھا۔ میخیں پانی پر تیر رہی تھیں اور سارے تھیلے مرکز کے اطراف گول میز کانفرنس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ اُن کی اس معقولیت پر بڑا غصہ آیا اور ہم نے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے آستینیں چڑھائیں وہی عمل کچھ بڑے پیمانہ پر دوہرایا گیا اور شام تک پھر کھدائی کی تکمیل کر لی گئی۔ مگر اس دفعہ "آج کا کام کل پر نہ ڈال" والے مقولے پر عمل کیا گیا اور تمام رات کنکریٹ ڈالنے کا کام جاری رہا اس کے لئے ضروری تھا کہ مزدور باری باری سے کام پر چڑھائے جاتے اور چائے وغیرہ سے نہ صرف ان کی دلجوئی کی جاتی بلکہ ان کو سردی سے محفوظ رکھا جاتا۔ اس کے بعد باقی کام بالکل آسان تھا۔

عمارتیں صحت گاہ کی عمارتیں اس سلیقہ سے ترتیب دی گئی ہیں کہ زمین پر نظام شمسی کا دھوکا ہوتا ہے اور ایک خوبصورت بڑے دواخانے کے اطراف مختلف چھوٹی اور بڑی عمارتوں کے نگینے جڑ دئے گئے ہیں۔ تین عام وارڈ ہیں، ایک بچوں، ایک عورتوں اور ایک مردوں کے لئے اور پھر کئی ایک بستری دو بستری اور چار بستری خاص وارڈ ہیں اور اس طرح فی الحال ڈیڑھ سو مریضوں کی رہایش اور علاج کا انتظام ہے مرد اور عورت تیمارداروں اور نرسوں کے لئے بڑے بڑے رہایشی مکانات ہیں اور ملازمین کے لئے اے۔ بی۔ سی کلاس کی متعدد عمارتیں، بچوں کی تعلیم کے لئے ایک بڑا مدرسہ اور کھیل کود کے لئے پورے ساز و سامان کے ساتھ ایک وسیع میدان، مہتمم شفاخانہ اور ان کے پیچھے مددگاروں کے مکانات پہاڑ کی دوسری جانب ایک توازن قائم کرتے ہیں اس طرح ایک چھوٹے سے عدیم المثال ماڈل ٹاؤن کا نمونہ نظر آتا ہے۔

سڑکیں اور گلگشت اس قدر وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی عمارتوں کے باہمی ارتباط کے لئے ضروری تھا کہ کافی سڑکیں بنائی جاتیں، یہ کام بھی قریب الختم ہے۔ ان کے کنارے لگائے ہوئے گوڈ نیم، گل مہر، یوکلپٹس وغیرہ کے درخت جب اپنی بہار پر ہوں گے تو ایک نہایت ہی دل خوش کن نظارہ پیش کریں گے۔ افسردہ دل اور خستہ حال مریضوں کی تفریح کے لئے سہانے پھولوں کے گلگشت ہوں گے۔ جو ان میں بشاشت اور شادمانی بخشیں گے۔

ڈرینیج اس مختصر سی آبادی کو صاف ستھرا رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ڈرینیج کا معقول انتظام ہو۔ قدرت نے اس مقام کا محل وقوع اتنا اچھا بنایا ہے کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے میں نہ کوئی دقت پیش آئی اور نہ اس میں کسی نقص کے رہ جانے کی گنجایش رہی۔

روشنی اس آبادی کی ظاہری آرایش اور ضروریات زندگی کے قطع نظر ایک عمدہ دواخانہ کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہاں بجلی کی قوت موجود نہ ہو۔ اس قوت کو حیدرآباد سے وہاں تک پہنچانے میں کثیر اخراجات عائد ہوتے اس لئے یہ قوت مقامی طور پر ہی پیدا کر لی جائے گی جو تمام ضروریات کی تکمیل کے لئے کتفی ہوگی۔ رات کے وقت دور دراز سے اس پہاڑ کا نظارہ میسور کے "چومنڈی" پہاڑ کے نظارہ کو پس پشت ڈال دے گا۔

ٹیلی فون اسی صحت گاہوں میں وقت کا سوال نہایت اہم ہوتا ہے۔ خصوصاً دواخانہ کا تو ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہوتا ہے۔ اس لئے دواخانہ سے ڈاکٹروں کے رہایشی مکانوں اور دوسرے اہم مقاموں کو ٹیلی فون سے مربوط کر دیا جانا بے حد ضروری تھا۔

غرض ایک آدھ سال کے اندر جب اس اسکیم کی تکمیل ہو جائے گی تو یہ صحت گاہ اپنی ظاہری اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔

محمد ابراہیم

(حیدرآباد ریڈیو سے نشر ہوا)
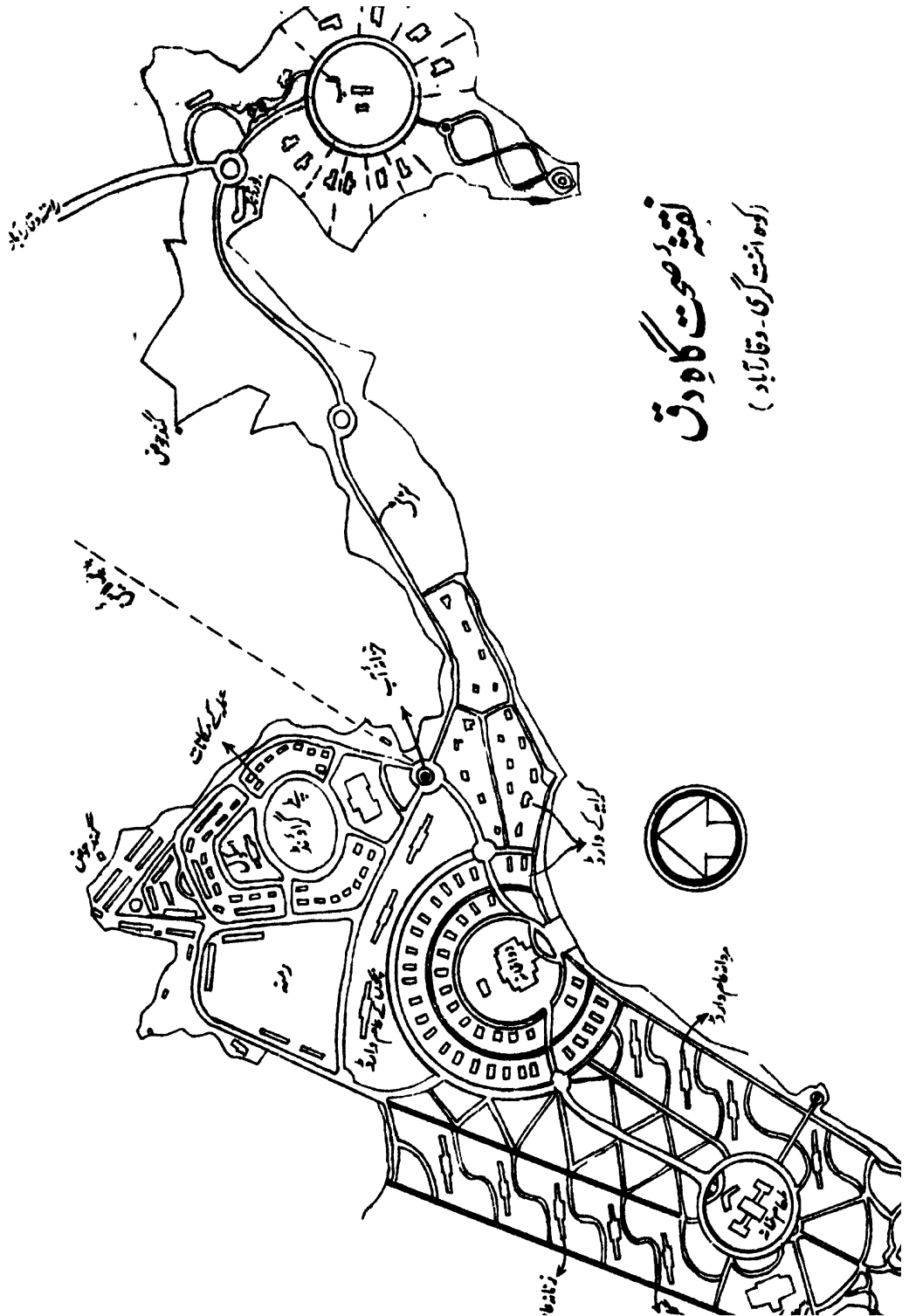
نقشۂ صحت گاہِ دق

(کوہ اننت گری - وقار آباد)

شمس الامراء کے سائنسی کارنامے

(بسلسلۂ گزشتہ)

علم برقک میں قوت جاذبہ اور قوت دافعہ، جھٹکے کی کشش اور دفع کی تاثیر، جھٹکے کے سورچے، کرۂ ہوا کے جھٹکے، زلزلہ اور حیوانات کے جھٹکے وغیرہ کی سرخیوں کے تحت متعلقہ مسائل کی تفہیم کی گئی ہے۔ گیال وی نیزم کی ابتدا گیال وانک روشنی اور اس کے مختلف تجربوں کو مثالوں کے ذریعہ سے واضح کیا گیا ہے۔ مقناطیس کی خاصیت کشش مقناطیسی اور قطب نما وغیرہ پر تفصیلی معلومات درج ہیں۔ اس کتاب کی عبارت کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔

استاد "الک ٹرافرس یونانی زبان میں اس جھٹکے کے آلے کو کہتے ہیں کہ جو بہت سہل بنے اور بہت چیزوں سے مرکب نہ ہو استعمال میں لانے کی یہ صورت ہے کہ نیچے کے ب کے تختے کو نئی فلالین یا خرگوش یا بلی کا چمڑا لیکر بالوں کی طرف سے گھسو اور جب وہ تختہ خوب قوت پاوے تو اوپر کے الف کے تختے کو اس پر رکھو اور اپنے انگشت کو اوپر کے تختے پر دھرو بعدہ دوسرے ہاتھ سے ک کے کانچ کے دستے سے اس تختہ پر علحدہ کرو پس جو کوئی اپنے مفصل انگشت کو یا لیڈن کے شیشے کی گولی کو اس کے قریب لائے گا تو اسے ایک چنگاری ملے گی......"

استاد ......"گیال وی نیزم ڈاکٹر گیال وینی کے نام سے مشہور ہوا ہے اس واسطے کہ وہ اول شخص تھا جس نے ان امتحانات کو کہ جس پر اس علم کا قاعدہ ہے ظاہر کیا۔

تلمیذ کلاں "حضرت اس صاحب نے ان امتحانات کو کیونکر پایا۔"

استاد "صورت اس کی یہ ہے کہ گیال وینی صاحب جو تشریح کے علم کا ایک مدرس تھا۔ شہر بلونا میں ایک شب جھٹکے کے چند امتحان کر رہا تھا اور اس میز پر کہ جہاں آلہ دھرا تھا چند مینڈک پوست کشیدہ واسطے امتحان تشریح کے دھرے تھے اتفاقاً ایک شخص نے مجلس سے ایک مینڈک کو لیکر اس کے اعصاب کو موصل سے دکھایا معاً اسے ایک چنگاری ملی اور اس میں بطور تشنج کے حرکت پیدا ہوئی اور گیال وینی صاحب کی زوجہ نے یہ دیکھ کر اسے اس بات پر آگاہ کی......"

تلمیذ کلاں "حضرت آپ نے ابھی ذکر کیا تھا کہ سوئی کو مقناطیس دینے کے بعد وہ جھکتی ہے کیا جھکاؤ اس کا یکساں رہتا ہے یا کچھ فرق کرتا ہے؟"

استاد "یہ قریب الفہم ہے کہ اسی حالت میں ہوگی اسی جا بے میں اور ۔ اپٹ صاحب نے کہ قطب نما بنانے والا مشہور ناروے کے ملک میں ۱۵۷۶ء میں دریافت کیا کہ جھکاؤ سوئی کا قریب ۷۱ درجے کے تھا اور اس کی تحقیق بادشاہی مدرسے میں بھی ہوئی اور یہ بات راست نکلی۔"

جن انگریزی اصطلاحوں کا ترجمہ کر لیا گیا تھا وہ حسب ذیل ہیں۔

علم برقک یعنی جھٹکے کا علم — Electricity

موصل — Conductor

کہربا — Electron

زنگ آلود — Oxideted

اکثر انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا اس لئے جگہ جگہ انگریزی الفاظ عبارت میں نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:۔

ڈسچارجر۔ آگزیڈ آگزیڈیشن۔ کیمیکل ایکشن

الکٹرا سٹیٹ واٹر اسپرٹ وغیرہ وغیرہ۔

"نے" کے استعمال میں مترجمین نے اپنے آپ کو پابند نہیں کیا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں۔

"حضرت میں اس بات کا خیال نہیں کیا تھا"

"میں اکثر اس سے کھیلا ہوں۔"

"حضرت آپ نے فرمائے تھے۔"

لفظ "انتہا" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر کو ڈانکٹر اور تلوار کو ترُوار لکھا ہے۔ ترجمے کی زبان میں وہ تمام خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جو اس سلسلے کی پہلی کتابوں کے بیان میں لکھی جا چکی ہیں (یہ سب رسالے کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہیں)

رسالہ علم و اعمال کرے کا

تقطیع ۸½ × ۵½ صفحات (۴۰۸) سنہ تالیف ۱۲۵۵ھ سنہ طباعت ۱۲۵۶ھ۔

یہ ضخیم کتاب بھی نواب شمس الامراء بہادر کی سرپرستی میں ان کے سنگی چھاپہ خانے میں طبع ہوئی۔ دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"پوشیدہ نہ رہے کہ یہ رسالہ ہے۔ کرے کے علم اور اعمال میں کہ جس کو علم اصطرلاب کروی بھی کہتے ہیں۔ ۱۲۵۵ھ نبوی میں حضرت شمس الامراء بہادر ۔۔۔۔ کے حسب الحکم مستر جوزہ اور بندہ رتن لعل نے کہ دونوں ملازم سرکار فیض آثار نواب ممدوح کے ہیں انگریزی زبان سے اردو زبان میں ترجمہ کیا اور یہ چند مسائل انتخاب کئے گئے ہیں اس کتاب سے کہ جس کو حکیم کیت صاحب نے تالیف کیا ہے اور اگرچہ وہ کتاب حاوی اکثر مسائل علم کرے کو ہے مگر اس میں سے چند مسائل ضروریہ انتخاب کرکے لکھے گئے اور سوائے اس کتاب کے چند نقشے کرے وغیرہ کے بھی طالبوں کے سمجھانے کے واسطے شریک کیے گئے کس لئے کہ اگر کرہ بالفعل موجود نہ ہو تو ان نقشوں سے اس کی صورت ذہن طالبین میں متصور ہو۔۔۔۔۔۔"

اس رسالے کی فہرست (۲۹) صفحات میں دی گئی ہے جس میں کتاب کے چاروں مقالوں کی ذیلی سرخیاں درج ہیں۔ پہلے مقالے کے تحت (۹۳) دوسرے کے تحت (۵۲)، تیسرے کے تحت (۲۱) اور چوتھے کے تحت (۱۵) ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں۔ دوسرے مقالے میں "کرہ مصنوعہ اور دوائر" کی تعریفات درج ہیں۔ دوسرے مقالے میں کرۂ ارضی کے اعمال سے متعلق سوالات اور ان کے جوابات اور قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ تیسرے مقالے میں کرۂ سماوی کے اعمال سے متعلق سوالات جوابات اور قاعدے لکھے گئے ہیں۔ چوتھے مقالے میں سیاروں اور اجرام فلکی کا بیان ہے۔ کتاب کے ختم پر "فائدہ" کی سرخی کے تحت ایک صفحہ کا نوٹ دیا گیا ہے اور (۳) صفحات میں "منازل قمر" کی جدول ہے۔ اس کی غرض و غایت کو اس طرح واضح کیا ہے:

"یہ جدول منازل قمر کے طالبوں کے فائدے کے واسطے ہے کیونکہ یہ رسالہ اعمال کرے کا ہے اور اس میں یہ فائدہ نہ تھا اور کتابوں سے اخذ کرکے لکھنے میں آیا اور جملہ منازل قمر اٹھائیس ہیں اور اس جدول میں اسمائے منازل بزبان عربی اور ہندی اور تعداد ثوابت ہر منزل اور اس کا برج اور مقامات ۔۔۔۔۔۔۔۔ کتابوں سے دریافت کرکے لکھنے میں آیا ہے۔۔۔۔۔"

اس جدول کے بعد چار صفحات کا غلط نامہ ہے۔ آخر میں (۶) صفحات پر کرۂ ارضی، کرۂ سماوی، قطب نما، محور، نصف النہار اور افق کرسی کے آٹھ نقشے دیئے گئے ہیں۔

اب یہاں ہر مقالے سے چند اقتباسات درج کیے جاتے ہیں تاکہ کتاب کے موضوع اور طرز عبارت کا اندازہ ہو سکے۔

پہلا مقالہ:- "نودویں تعریف خسوف قمر کی"

"جب زمین چاند اور سورج کے درمیان میں حائل ہوتی ہے تو زمین کا سایہ چاند پر گر کے اس کا مانع نور ہوتا ہے اسی کو خسوف قمر کہتے ہیں اور اس سبب سے خسوف قمر حالت بدر میں ہونا ضروری ہے۔"

دوسرا مقالہ:- "آٹھواں سوال کسی دو مقام فرضی کے طول بلد معلوم کا تفاوت کیونکر معلوم کرنا۔ قاعدہ دونوں کا طول بلد تیسرے سوال کے موافق معلوم کرکے دیکھنا کہ ان دونوں کا طول شرقی ہے یا غربی۔ غرض بہر تقدیر اس وقت عدد ناقص کو عدد زائد سے وضع کرنا پس وضع کے بعد جو تفاضل کہ حاصل ہوگا وہی ان دونوں کے طول کا تفاوت ہوگا اگر ایک مشرقی ہو اور

ایک مغربی تو دن دونوں کے طول کو جمع کرنا
پس جمع کے بعد جو مجموعہ کہ حاصل ہوگا وہی
تفاوت ہوگا۔"

تیسرا مقالہ:۔ "گیارہواں سوال تاریخ ماہ اور عرض بلد
معلوم کئے کے بعد آفتاب کے غروب کے بعد
کون کون سیارے بالائے افق رہتے ہیں
کیونکر معلوم کرنا۔
قاعدہ قطب کو اپنے عرض بلد کے موافق بلند
کرنا اور بعدہٗ آفتاب کا مقام طریقۃ الشمس
پر معلوم کرکے اس کو دس بارہ درجہ افق
کے نیچے لیجانا اور پھر تقویم میں دیکھنا کہ کون
کون سیارے اوپر کے برجوں میں ہیں پس
وے سب نظر آویں گے۔"

چوتھا مقالہ:۔ "مشتری کا بیان"
"یہ سیارہ تمام سیاروں سے بڑا ہے اور زمین
و آفتاب کے درمیان میں جس قدر بعد ہے اسکی
بہ نسبت یہ سیارہ بہت دور ہے اور جب اس کو
بے استعانت آلہ دوربین کے دیکھتے ہیں تو
زہرہ کی مانند نظر آتا ہے لیکن زہرہ کی طرح
روشن نہیں معلوم ہوتا ...... جب اس کا
طول آفتاب کے طول سے کم ہوتا ہے تو طلوع
آفتاب کے قبل نظر آتا ہے اس وقت اس کو
کوکب صباحی یعنی صبح کا تارا کہتے ہیں اور
جب زیادہ ہوتا ہے تو غروب آفتاب کے بعد
دکھلائی دیتا ہے اس وقت اس کو کوکب
مسائی یعنی شام کا تارا بولتے ہیں اور یہ
اپنا دورہ محوری ۹ ساعت ۵۶ دقیقے میں
تمام کرتا ہے .... اس کا حجم زمین کے
حجم سے ۱۴۰۰ مرتبہ زیادہ ہے ...... حکیم
نیوٹن صاحب نے اس کے قطبین کی طرف کے
محور کو اس کے خط استوا کی طرف کے قطر سے ایسی
نسبت دی ہے کہ جیسی نسبت نیوٹن صاحب
کے نزدیک ایسی ہے کہ جیسی نسبت $\frac{۹}{۱۴}$ کو $\frac{۱}{۱۳}$
کے ساتھ ہے۔"

(چوتھے مقالے میں جہاں ہر سیارے کے متعلق معلومات
درج کی گئی ہیں۔ وہاں اس سیارے کے اقمار کی حرکت۔ بعد۔ زمانہ
اور ان کے معلوم کرنے کی تدقیقیں جدول سے ظاہر کی گئی ہیں۔
کتاب کی عبارت عربی اور فارسی آمیز ہے۔ "علی التوالی
اور فی مابین" جیسی عربی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں۔ بعض
ممالک کے ناموں کا املا موجودہ املا سے مختلف ہے۔ مثلاً
آزیہ (ایشیا)۔ افریکہ (افریقہ)۔ پرتگیس (پرتگیز)
پاریز (پیرس) وغیرہ۔
بعض اردو الفاظ کا املا اس طرح لکھا گیا ہے جیسے
چھٹھی (چھٹی) ناٹپ (ناپ)
متروکات بھی عبارت میں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر
چند یہ ہیں۔ تسپر۔ ونہوں نے وغیرہ۔
اس کتاب کے دو نسخے ایک کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں
(نمبر $\frac{۲۲۳}{ب}$ ج) اور دوسرا ادارۂ ادبیات اردو میں (نمبر ۹۱۴)
موجود ہے۔

رسالہ منتخب البصر

تقطیع ۵/۸ صفحات (۲۱۳) سنہ تالیف [illegible]ھ۔
طباعت [illegible]ھ۔ نام مولف رتن لال۔

یہ رسالہ نواب شمس الامراء بہادر کے حکم سے مرتب کیا گیا
اور ان کے سنگی چھاپہ خانے میں چھپا۔ اس رسالے کے مولف نے
دیباچہ میں موضوع۔ سبب تالیف اور اس کے ماخذ کا جن
الفاظ میں ذکر کیا ہے اس کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔
"یہ رسالہ ہے موسوم بہ منتخب البصر بیچ علم دوربینا کے کہ اسے
علم انظار بھی کہتے ہیں اور اس علم کی معلومات سے نقشے اجسام
و سطوح کے کھینچے جاتے ہیں ...... اس علم میں اگرچہ ایک
کتاب مبسوط فارسی زبان میں موسوم بہ رفیع البصر لکھی ہوئی

صاحبزادہ بلند اقبال عالی قدر محمد رفیع الدین خاں المخاطب بہ
عمدۃ الدولہ بہادر ..... کی ہے اور وہ کتاب جامع ہے تمام
قواعد کلیہ دور نما کو اور حاوی ہے اشکال و دقایق مجسمہ کو اور
یہ بندہ عاصی پر معاصی رتن لعل ولد چنیا لعل کہ نمک خوار اس
دولت ابد مدت کا ہے وقت تیاری اس کتاب کے زبان ہدایت
بنیان صاحبزادہ موصوف سے بیان ہر شکل سے سرفراز
ہوا کرتا تھا معلومات اس علم کی حاصل کیا اس لئے معہذا
حکم نواب صاحب قبلہ ممدوح کا ہوا کہ وہ کتاب بہت بڑی
قابل منتہیوں کے ہے تو کوئی رسالہ مختصر ایسا لکھ کر گزرانے کہ
اس میں اس علم کی اصطلاحات اور اسما اور قواعد کلیہ لکھے
ہوئے ہوں تاکہ مبتدیوں کو پہلے معلومات اس کے اصطلاحات
وغیرہ کی جلد ہو جائے بعدہٗ اس کتاب کا پڑھنا مبتدیوں کو
آسان ہوگا اس واسطے اس عاصی نے حسب الحکم والا کے
اس کتاب رفیع البصر سے قواعد آسان منتخب کرکے یہ رسالہ
مختصر اردو زبان میں بطریق سوال و جواب شاگرد اور
استاذ کے مشتمل اوپر چھے مقالوں کے اپنی استعداد اور
حوصلے موافق لکھ کر ملاحظہ مبارک میں گزرانا اور سرمایہ
سعادت حاصل کیا .... شاگرد کے سوال کی جائے
علامت س کی اور استاذ کے جواب پر نشانی ج کی لکھا گیا۔"

اس رسالے کے سنہ تالیف کے متعلق رسالے کے ختم
پر حسب ذیل عبارت اور قطعہ تاریخ درج ہے:۔

"یہ رسالہ تمام ہوا بعون اللہ تعالیٰ اور حسن توفیق
الہیٰ کے اور اس کی تاریخ کا مادہ اس قطعے میں
موزوں ہے۔ قطعہ

مرتب جب ہوا یہ سب رسالہ بحق سید ابرار نامی
تجسس کی جو میں نے اس کی تاریخ
کہی کل عقل نے انظار نامی
۱۲۵۳

تمت بالخیر
و بہ نستعین"

اس رسالے میں (۶) مقالے ہیں جو ستر گفتگوؤں پر
مشتمل ہیں۔ پہلے مقالے میں علم ہندسہ کی مبادیات مثلاً نقطہ۔
خطوط۔ زاویے۔ دائرے اور مربع وغیرہ کی تعریفات اور
ان کے بنانے کے قاعدے بیان کئے گئے ہیں۔ اور تین صفحات
میں پہلے مقالے سے متعلق (۳۶) مختلف ہندسی اشکال
دی گئی ہیں۔ اس مقالہ کا اقتباس یہ ہے:۔

س۔ "حضرت قطعہ دائرے کی کیا تعریف ہے؟"
ج:۔ قطعہ دائرہ اس کو کہتے ہیں ایک خط مستقیم دائرے
کو ایسا قطع کرے کہ دائرے کے مرکز پر سے نہ گزرے
جیسا کہ اس پندرہویں شکل میں آ د کا خط دائرے
کو قطع کیا ہے۔ پس اس صورت میں اس دائرے
کے دو قطع ہوئے۔ چھوٹے قطع کو قطعہ اصغر اور بڑے
کو قطعہ اکبر کہتے ہیں اور جو خط کہ مرکز سے گزر کر دائرے
کو قطع کرتا ہے اس کے ہر قطع کو نصف دائرہ کہتے ہیں
اور اس کے نصف کو ربع دائرہ کہتے ہیں ......"

دوسرے مقالہ میں "علم دور نما کے اصول" کی سرخی کے
تحت کیفیت نظر۔ اصول نقشہ ہندسی و دور نمائی پر بحث
کی گئی ہے۔ اقتباس یہ ہے:۔

س:۔ "حضرت اگر ہم کو شکل الٹی نظر آتی ہے تو ہم کو سیدھی
کیوں نظر آتی ہے؟"
ج:۔ "ہم لوگوں کو ایک مدت سے عادت ہو گئی ہے بہ سبب
کثرت امتحان کے ذہن تمیز کرتا ہے کہ یہ سیدھی
ہے بلکہ اس کے اوپر ایک برہان ساطع یہ ہے
جو بچے شیر خوار ہیں ان کے سامنے جو شے
آتی ہے اس کو بلا شبہ پکڑ لیتے ہیں اور اس علّت
کے سبب سے اور لوگوں کے کہنے سے ان کو چند
مدت میں تمیز سیدھے الٹے کی ہوتی ہے اور اس کی
مفصل تکرار اور براہین علم مناظر میں لکھی ہوئی
ہے اور یہ علم اسی میں سے وضع ہوا ہے اس کو
علم انظار کہتے ہیں ...."

مقالے کے ختم پر متعلقہ (۹) اشکال (۲) صفحات پر دی گئی ہیں۔ تیسرے مقالے میں مستقیم الاضلاع اور دوایر کے بنانے کے طریقوں کو "سطوحات دور نمائی" کی سرخی کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ مثال کے لیئے پانچ اشکال میں ان کا عمل کرکے دکھلایا گیا ہے۔ چوتھے مقالے میں اجسام کی دور نمائی کے مسئلے کو سمجھایا گیا ہے اور حسب ذیل مسائل پر بحث کی گئی ہے:

" موشور۔ کعب۔ پرم۔ کرسی۔ ستون۔ مکان
زینہ۔ کمان اور پرندوں اور ارتفاعی اجسام
کی دور نمائی "۔ وضاحت کے لئے (۸)
اشکال میں عمل کرکے دکھلایا گیا ہے۔

پانچویں مقالے میں شعاع آفتاب۔ آفتابی سایہ اور چراغی سایہ کے متعلق معلومات درج ہیں اور وضاحت کے لئے (۱۴) اشکال دی گئی ہیں۔

چھٹے مقالے میں پانی کے عکس اور آئینوں کے عکس اور ان کی مختلف حالتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں دو اشکال دی گئی ہیں جن میں عکس کی مختلف حالتوں کو سمجھایا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں (۳) صفحات کا غلط نامہ متن سے متعلق اور ایک صفحہ کا غلط نامہ اشکال سے متعلق ہے۔

زبان اور اسلوب بیان تقریباً وہی ہے جو اس سے پہلے کی کتابوں کا ہے۔ اکثر جگہ "معلومات" کو واحد اور "قسم" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ "اونچان" کے لفظ کو بلندی کے معنوں میں استعمال کیا ہے جو خاص دکن کی اصطلاح ہے۔ جن الفاظ کی جمع خلاف قاعدہ بنائی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

" عمودات۔ وتریں۔ سطوحات قطریں وغیرہ
" نے " کا استعمال پنجابی طریقے پر کیا گیا ہے۔
مثلاً " ان سب باتوں کا لحاظ ہم نے تمام
اشکال دور نمائی میں رکھنا "۔

عبارت کا نمونہ یہ ہے:-

" س۔ حضرت عکس اجسام جو پانی میں گرتا ہے اس کے نقشے لکھنے کا کیا بیان ہے۔

ج۔ پانی اگر صاف اور شفاف ہے تو اس میں عکس اجسام کا صاف با آب رنگ نظر آئیگا اور اگر کچھ غلظت ہے تو صاف نہیں نظر آئے گا اور عکس کا ظاہر ہونا چار قسم پر ہے جس کا کہ عکس گرتا ہے وہ قائم رہے اور پانی متحرک یا جسم متحرک پانی قایم یا دونوں متحرک یا دونوں قایم پس جس وقت کہ دونوں غیر متحرک رہیں اس وقت عکس اجسام کا نقشہ اچھا لکھا جائے گا"۔

یہ کتاب ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں (۲۷۶۲) نمبر پر ہے۔

رسالہ خلاصۃ الادویہ

تقطیع ۸/۵ صفحات ۴۲۳ سنہ تصنیف ۱۸۴۵ء

سنہ طباعت ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء۔ نام مصنف ڈاکٹر ولیم میکنزی۔

یہ رسالہ بھی نواب شمس الامراء بہادر کی سرپرستی میں لکھا گیا اور ان کے سنگی چھاپہ خانہ میں طبع ہوا ہے۔ رسالہ کے آغاز میں دواؤں کے ناموں کی فہرست لاطینی تلفظ کے لحاظ سے مرتب صفحہ دی گئی ہے۔ اس فہرست کی تقسیم حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے جو (۲۸) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد دیباچہ ہے جس میں اس رسالے کی غرض و غایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

" واقفان علم حکمت اور شائقان فن طبابت
پر ظاہر ہو تاکہ یہ کتاب کان اسکیرس کا ترجمہ
جاننے والے حقیقتوں معالم طبیعی اور ہند کا
کے ڈاکٹر ولیم میکنزی صاحب مدیکل اسٹور
کیپر علاقہ نظام واسطے تعلیم اور زود فہمی
اور برابر سمجھ تک آنے نیٹیو ڈاکٹروں
علاقہ فوج سرکار دولت مدار نظام اور
افادہ خاص و عام کا فدا نام کے چھاؤنی
اوائل برس اٹھارہ سو پینتالیس عیسوی
میں صاف اور سلیس زبان ہندی میں

تصنیف کئے۔۔۔۔۔۔ اور اس کتاب کا نام خلاصۃ الادویہ رکھا گیا۔ صاحبان فضل و ہنر سے امید یہ ہے کہ اگر سہو یا خطا اس میں نظر آوے تو عیب گیری نہ کریں اور قلم اصلاح کا اس پر جاری رکھیں۔"

دیباچہ کے بعد خشک دواؤں کے تولنے کے اوزان لکھے گئے ہیں جن کو انگریزی میں "ڈرائی ویٹ" کہتے ہیں۔ پھر عرق اور تیل کے ناپنے کے اوزان دیئے گئے ہیں جن کو انگریزی میں "امپیریل میژرز" کہتے ہیں۔ اس کے بعد خشک دواؤں کے تولنے کے انگریزی اوزان کے محاذی ہندستانی اوزان درج ہیں۔

"تشخیص اور دوا دینے کی حکمت" کی سرخی کے تحت تشخیص سے متعلقہ امور کی وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً صنف۔ عمر۔ مزاج۔ موسم اور ملک کی آب و ہوا۔

اصل کتاب صفحہ ۱۴ سے شروع ہوتی ہے۔ دواؤں کے نام لاطینی اور انگریزی زبان کے تلفظ کے لحاظ سے اردو میں درج ہیں۔ اکثر دواؤں کے ناموں کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔ بعض دواؤں کے عربی اور فارسی نام بھی درج ہیں۔ ہر دوا کے نام کے بعد اس کی تاثیر۔ فائدہ اور خوراک کے متعلق تشریح کر دی گئی ہے۔ بعض مرکب دواؤں کے بنانے کی ترکیب بھی شامل ہے۔ مثال:۔

لاطن	انگریزی
پوٹاسی نیٹراس	نیٹرٹ آف پوٹاس

ہندی شورہ

تاثیر۔ پیشاب آور اور سرد ہے۔ زیادہ مقدار دینے سے جلاب لاتا ہے اوپر لگانے سے سرد۔ اور گھاؤ صاف کرنے والا ہے۔

فائدہ۔ پتھری میں۔ اور استسقی۔ اور جلندر۔ اور سوکھی کھیلی کھجلی میں۔ اور اخراج خون میں اوپر لگائے جاتا ہے۔ سوجن۔ اور جوش دماغ میں پانی میں گھول کر سر پر لگاتے ہیں اور حلق و دہن میں غرغرے کے لئے دیتے ہیں۔

خوراک۔ دس گرین سے آدھے ڈرام تک دن میں تین یا چار بار دینا۔ اور اگر ایک اونس کے مقدار ہوا تو پیچش ہو کر مرنے کی نوبت ہوتی ہے۔

اس کی زبان میں بھی قدامت نمایاں ہے۔ لیکن پہلی کتاب کی بہ نسبت زیادہ سلیس اور عام فہم ہے۔ یہاں ایسے جملے بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں جن کو ہم اب اس طرح نہیں بولتے مثلاً

"روئی کے پھائے میں کرکے (رکھ کر) چمڑے پر اس کو چڑھا کر پلاستر سریکا (پلاستر کی طرح)۔
یہ خاصیت زہر کی رکھتا ہے (اس کی خاصیت زہر ہے) کھجلاہٹ موقوف کرے گا (کھجلی دور ہو جائے گی) آتش کے جلنے پر یا انگار کے جلنے پر (آتش یا انگار سے جلے ہوئے پر) قبضیت میں (قبض کی حالت میں)۔ آنکھ کے آئے ہوئے کو (آشوب چشم کے مریض کو)۔ گھاؤ کو سکھاتی ہے (زخم کو مندمل کرتی ہے) معدے کو صاف کئے کے بعد (کرنے کے بعد)۔ دریافت ہوگا (معلوم ہوگا) وغیرہ وغیرہ

جن انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا تھا ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

کھٹائی	ایسڈ
ریوند چینی کا ست	ایکسٹراکٹ آف روبرب
چلایا ہوا سرکہ	ڈسٹل وینی گر
لوبان کا پھول	بنزویک ایسڈ
لیمو کا رس جمایا ہوا	سٹرک ایسڈ
پانی ملا ہوا نمک کا تیزاب	ڈیلیوٹڈ ہیڈرو کلارک ایسڈ
بھونی ہوئی پھٹکری	ڈرائیڈ آلم
گلاب کا پانی	روز واٹر

ولایتی پانی	سوڈا واٹر
رب السوس	ایکسٹراکٹ آف لکرس
ولایتی تیل	آلیو آئیل
گندک کا مرہم	سلفر آئنٹ منٹ
سنگ انگور کا ستا	لیوز آف بلاڈونا
مرکب پارے کی گولی	مرکیوری آل پلز
مرکب عرق سنا	کمپونڈ ٹنچر آف سنا
گیہوں کے نشاستے کا جوشاندہ	ڈکاکشن آف اسٹارچ
آسٹے کی لگدی	سمپل پولٹس
گلقند	کان فکشن آف روزس
روغن کافور	کیامفر لیمنٹ
نیلہ تھوتھہ (نیلا طوطا)	سلفٹ آف کاپر

عبارت میں کہیں کہیں متروک قدیم الفاظ بھی پائے جاتے ہیں۔ جیسے "مڑوڑا (مروڑ)۔ متلاہٹ (متلی)۔ کڑواہٹ (کڑواپن)۔ باسن (برتن)۔

بعض لفظوں کا املا اس طرح لکھا گیا ہے مثلاً۔

افیم (افیون)۔ سوکی (سوکھی)۔ ٹھنڈا (ٹھنڈا)۔

لفظ "نشہ" مونث اور "جلن" مذکر استعمال ہوا ہے۔ "سوزش دار۔ زہر دار اور ہچکی دار" اسم فاعل کے قاعدہ پر بنائے گئے ہیں۔ مرض کی جمع "مرضوں" اور چیز کی جمع "چیزاں" بنائی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں "علاج کلیہ زہر کا" کی سرخی کے تحت زہر کے علاج کے چار طریقے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے اردو زبان میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور غالباً علم الادویہ کی ابتدائی اردو کتب میں سے ہے۔

کیمسٹری کا مختصر رسالہ (قلمی)

اوراق (۵۰)
سنہ کتابت ۱۲۹۵ھ م ۱۸۷۸ء۔

یہ ایک قلمی نسخہ ہے اور معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کتاب کبھی چھپی بھی ہے یا نہیں ـــــ نواب شمس الامراء بہادر کے حکم سے ترجمہ کیا گیا تھا۔ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:۔

"یہ رسالہ مختصر علم کیمسٹری کا حسب الحکم حضرت نواب صاحب قبلہ نواب شمس الامراء بہادر امیر کبیر دام اقبالہٗ کے ترجمہ کیا گیا اور جس میں تبدیل اور ترکیب عناصر اور چند اصول علم کیمسٹری کا بیان ہے اگرچہ اس علم میں بڑی بڑی کتابیں مع دلائل انگریزی زبان میں ہیں لیکن ساکنان فرخندہ بنیاد حیدرآباد کو بالکل آگاہی نہ تھی اس واسطے ریورنڈ جان ٹائم صاحب کا مختصر رسالہ انگریزی زبان سے اردو عبارت میں لکھا گیا کہ ناواقف لوگوں کو کچھ کچھ اس علم کے اصطلاحات سے آگاہی ہووے اور یہ رسالہ مرتب ہوا۔ نواب اور سو امتحانات پر (۱۲۹۵ھ م ۱۸۷۸ء)۔"

کتاب کے شروع میں اصطلاحات کے ترجموں کی فہرست دی گئی ہے:۔

"نام دوائیوں کے انگریزی معہ ترجمہ"

سلفرک اسڈ ـــــــــ گندک کا کھٹہ
مرکری ـــــــــ پارا
سوب برٹ آف سوڈا ـــــــــ سہاگہ
نیٹرٹ آف سلور ـــــــــ سفوف نقرہ
ٹرمرک پیپر ـــــــــ ہلدی کے تیے کے رس میں بھگایا ہوا کاغذ۔

بعض انگریزی اصطلاحات مثلاً سختی سس نیلیس۔ سوڈیم اور پٹاسیم وغیرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا۔

علم کیمسٹری کی تعریف حسب ذیل الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"کیمسٹری وہ علم ہے کہ جس سے اجسام کا باہم عمل دریافت کیا جاتا ہے اور اس سے اجسام قدرتی کے اجزا نمود ہوتے ہیں۔ خواہ حالت

بساطت میں ہوں یا حالت ترکیب میں اس علم کیمیا مرکبات کی ذات کو پہنچاننے کے واسطے دو ترکیبیں ہیں۔ چنانچہ سنتیس اور انیلیس۔ سنتیس ایک لفظ ہے کہ اس کا معنی دو جسم یا زیادہ اجسام سے انفصال کیمسٹری حاصل کرنا ہے اور انیلیس وہ لفظ ہے کہ اس کا معنی ہر ایک جسم کو جدا کرنا اور جدی جدی حالت میں دکھلانا ہے۔"

یہ رسالہ کل سو "امتحانات" یعنی تجربوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک تجربہ مثال کے طور پر درج ذیل کیا جاتا ہے۔

" ایک گرین (سوڈیم) اور ایک گرین (پٹاسیم) لے کر ایک چھوری کی نوک سے دونوں کو خوب ملاؤ۔ بعدہٗ ایک قطرہ پارے کا ان کے نزدیک لیجاؤ۔ یہ دونوں جل جائیں گے اور ایک آنچ پیدا ہوگی۔"

اس کتاب کی زبان کی خصوصیات وہی ہیں جو اس دور کی دوسری کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ جملوں کی ساخت اور ترکیب قدیم اردو طرز کی ہے۔ انداز بیان اتنا سادہ اور عام فہم ہے کہ جملہ مسائل بآسانی سمجھ میں آتے ہیں۔

یہ نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

نافع الامراض

(تقطیع ۸ × ۵ ½ صفحات ۱۹۲ سنہ طباعت ۱۲۶۳ مطبوعہ سنگی چھاپہ خانہ شمس الامراء مولفہ ولیم میکنزی صاحب۔

یہ رسالہ بھی علم الادویہ سے متعلق ہے جس میں نباتات۔ نمک۔ تیزاب۔ دھات اور مشک و شہد وغیرہ کی خاصیتیں تاثیر اور فائدے سمجھائے گئے ہیں۔ دیباچہ ایک صفحہ کا ہے جس میں کتاب کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے بعد (۶) صفحات کی فہرست ہے جو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دی گئی ہے۔ کتاب کو چار ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب کی سرخی "نباتات کے بیان میں یعنی جتنے بوٹے ہیں انکی خاصیت کے ذکر میں" کے تحت (۹۳) بوٹیوں کے نام ان کی جائے پیدایش، خاصیت اور تاثیر بیان کی گئی ہے۔ جن بیماریوں میں یہ کام آتی ہیں ان کے نام اور مقدار خوراک بھی درج ہے نمونہ کے طور پر نمبر (۴۵) کی بوٹی کی عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"سنا ہندستان اور عرب میں پیدا ہوتی ہے لیکن ہندستان میں جو پیدا ہوتی ہے سو کمزور ہے جو کہ سنا تیز ہے اور اسکی پتی [illegible] ہے۔ سنا کا جلاب اچھا نرم ہے پر دست اچھی طرح لاتی ہے۔ کبھی اس سے پیٹ میں مروڑا ہوتا ہے لیکن دھنیا یا سونٹھ اس کے ساتھ ملانے سے مروڑا نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بنانے کا طور یہ ہے سنا کی پتی تین ڈرام سونٹھ آدھا ڈرام گرم پانی چار اونس میں دو گھڑی بھیگو کر چھان لیوے۔ کھانے کا مقدار دو اونس سے تین اونس تک ہے نام اسکا انفیوزن آف سنا ہے۔۔۔۔۔"

دوسرا باب نمک اور تیزابوں کے لئے وقف ہے۔ اس میں ۸ قسم کے نمک اور تیزاب کا حال لکھا گیا ہے۔ نمونہ یہ ہے:

"شورے کا تیزاب"

"شورے کا تیزاب بنانے کی ترکیب یہ ہے پہلے تیس اونس شورہ ایک آتشی شیشے کے درمیان بھرے تس پر پندرہ اونس گندک کا تیزاب ڈالے تس پیچھے شیشے کے منہ میں نلی لگاکر کے آنچ کرے جو چوکر بھبکے میں گرےگا اسکا رنگ نارنجی ہوگا جب تک شورا نہ سوکھے تب تک پکاوے بعد اس کے تیزاب کو تھوڑا گرم کرے تب رنگ صفا ہوگا اس کو شورے کا تیزاب کہتے ہیں۔۔۔۔۔ شورے کا تیزاب یعنی نیٹرک اسڈ بہت مرضوں میں فائدہ کرتا ہے جب کلیجا سو جگر درد کرے تب پلا دے۔"

تیسرے باب میں (۱۱) دھاتوں کا بیان ہے ہر ایک کی خاصیت تاثیر اور ان سے جو جو دوائیں بنائی جاتی ہیں ان کی ترکیب اور مقدار خوراک درج کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں مشک، شہد وغیرہ کی خاصیتیں اور فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد "معتاد خوراک" کی سرخی کے تحت لڑکوں، عورتوں اور بڈھوں کے لئے دواؤں کی خوراک کی مقدار درج کی گئی ہے کیونکہ کتاب میں ہر دوا کی جو مقدار خوراک بتلائی گئی ہے وہ سیانے آدمیوں کی ہے۔ کتاب کے آخر میں "تفصیل ادویہ" کی سرخی کے تحت کئی ذیلی سرخیاں قائم کی گئی ہیں مثلاً "قے کروانے کی" "جلاب کروانے کی" "پیشاب کروانے کی" وغیرہ وغیرہ ہر ذیلی سرخی کے نیچے دواؤں کے نام اور ان کے صفحات کے نمبر جن میں ان کا ذکر ہے درج کئے گئے ہیں تاکہ طلبہ کو ان کے یاد کرنے میں سہولت ہو۔

اس رسالے میں ہندی کے اکثر لفظ ملتے ہیں۔ بعض الفاظ کا املا بھی قدیم طرز کا ہے اور بعض الفاظ ایسے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جن معنوں میں اب مستعمل نہیں ہیں مثلاً "مرض بوجھ کر" (مرض کی تشخیص کر کے) "اگلانا" (اصل رنگ) صفا ندو رنگ ہوتا ہے (صاف ....)۔ "مقدار" اور "اتنا" کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ بعض دواؤں اور طبی اصطلاحوں کا اردو ترجمہ کر لیا گیا تھا جیسے

ہاڑک ـــ سکھونہ۔ گندہ فرمنہ ـــ ترپن مین۔ بکنی ـــ [illegible]

خواجہ حمید الدین

تنقید و تبصرہ

حیدرآباد کی نسوانی دنیا

مرتبہ نصیر الدین ہاشمی
حجم ۱۸۸ صفحے ۔ قیمت عہ
ناشر: ادارۂ ادب جدید حیدرآباد دکن۔

مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب دنیائے ادب میں محتاج تعارف نہیں ۔ زیر نظر مجموعے میں آپ نے اپنے پانچ مطبوعہ مضامین اور ایک غیر مطبوعہ مضمون شامل کیا ہے۔ "حیدرآباد کے تئیس ستارے" کے زیر عنوان حیدرآباد کی مشہور خواتین کے حالات مختصراً قلمبند کئے ہیں ۔ پوری کوشش کی گئی ہے کہ ان کی سیرت و کردار کے نمایاں پہلو روشن ہو جائیں ۔ بعض کے متعلق تو صرف سرسری معلومات ہیں، اور پڑھنے کے بعد کچھ اور معلوم کرنے کو جی چاہتا ہے اور بعض دفعہ پڑھتے پڑھتے پرانا واقف کار کسی ہستی کے متعلق سوچتا ہے کہ کیا حقیقت یہی ہے؟

ہاشمی صاحب کی اس نسوانی خدمت کو زیادہ سراہنا بے کار ہے ۔ وہ خواتین کے علمی کارناموں کے پرانے قدردان ہیں ۔ انہیں جتنی ہمدردی اس صنف سے ہے اور کسی ادیب کو نہیں۔

اگر صاحب موصوف زیادہ دلچسپ طریقے سے لکھتے تو بہتر تھا، بعض اوقات مضامین بہت زیادہ خشک سے ہو جاتے ہیں ۔ کتابت کی غلطیاں کافی سے زیادہ ہیں ۔ یہ بات پڑھنے والے کو ہمیشہ گراں گزرتی ہے ادارۂ ادب جدید والوں کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ صرف بہت ساری کتابیں چھاپنا ہی ادبی خدمت نہیں بلکہ ادب کو صحیح طریقے سے پیش کرنا بہت بڑی ادبی خدمت ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں امید ہے ادارہ اس امر کو ملحوظ رکھے گا۔

ٹوٹے ہوئے دل

مصنفہ رام پرتاب بہادر۔
حجم (۲۳۴) صفحے قیمت عہ
ناشر: ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد

مسٹر رام پرتاب بہادر نے اپنے بارہ افسانے اس میں جمع کئے ہیں ۔ سادگی ان افسانوں کی نمایاں خصوصیت ہے ۔ افسانے کافی دلچسپ ہیں ۔ فطرت انسانی کا اچھا مطالعہ کیا ہے ۔ شوخی جا بجا جھلکتی ہے۔

اس کتاب میں دو دیباچے بھی شامل کئے گئے ہیں ۔ ان میں موصوف نے وہی پرانے ہندی، اردو تضیہ کو چکانے کی کوشش کی ہے ۔ چونکہ یہ کام غیر جانبدارانہ نہیں کیا جا سکا، اس لئے زبان کے مسئلہ کو سلجھانے سلجھانے وہ "ہندو مسلم" مسئلہ سے الجھ گئے ہیں۔

چونکہ یہ افسانے پہلے ہندی میں لکھے گئے تھے اس لئے اکثر نامانوس ہندی الفاظ کا بھی استعمال ہوا ہے ۔ لیکن اکثر ہندی الفاظ خوبصورتی اور موزونیت سے جوڑے گئے ہیں۔

شاہد احمد صاحب مدیر ساقی اور دیگر اصحاب پر دیباچہ میں کافی اعتراضات کئے گئے ہیں اور ان اعتراضات کو پڑھنا اور ان پر غور کرنا افسانوں کی مطالعہ سے زیادہ دلچسپ ہے۔

ذہنی زلزلے

از نعیم صدیقی، مدیر معاون "کوثر"
حجم (۱۹۲) صفحے ۔ قیمت عہ
ناشر: ۔ دارالاشاعت نشاۃ الثانیہ ۔ حیدرآباد دکن۔

مولوی نعیم صدیقی صاحب نے اپنے چند ذہنی زلزلے اس کتاب میں جمع کئے ہیں ۔ مضامین اور افسانوں کو پڑھنے سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ صاحب موصوف کا ذہن ابھی تک متزلزل ہے ۔ ان زلزلوں کے بعد وہ جو کچھ پیش کریں گے وہ شاید کچھ پر سکون ہو۔

موجودہ دنیا سے صدیقی صاحب بیزار ہیں اور موجودہ نظام کو ڈھانا چاہتے ہیں ۔ اس لئے لہجہ میں ضرورت سے زیادہ تلخی اور سختی ہے ۔ ادب کسی اچھے مقصد کے لئے استعمال تو ہو سکتا ہے لیکن

ساتھ ہی خیال رہے کہ کہیں مقصد کے پیچھے
اس کی صورت ہی مسخ نہ ہو جائے۔
سنجیدہ غور و فکر اُبلتے ہوئے جوش سے
زیادہ کارآمد ہے۔ آئندہ جب وہ اپنے موضوع پر
ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو زیادہ اچھی تصنیف
پیش کرسکیں گے۔ اس مجموعہ کا افتتاحیہ افسانوں
سے زیادہ دلچسپ اور لطیف ہے۔ "لیکن" اچھا
دلچسپ مضمون ہے۔ افسانوں میں اتنی کامیابی
و دلچسپی نہیں۔
جوشیلے نوجوان جو دن رات ایک نئے
جہان کے خواب دیکھا کرتے ہیں ان میں یہ ذہنی زلزلے
کافی مقبول ہوں گے۔ زبان سلیس ہے۔ کتابت
اور طباعت کی خوبیوں کے لئے دارالاشاعت نشاۃ ثانیہ
قابل مبارک باد ہے۔

ہندوستان کا مالی نظام

از خواجہ محمد شمس الدین بی اے۔ (عثمانیہ)

ناشر:۔ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل۔ حمایت نگر حیدرآباد
حجم (۷۹) صفحے قیمت ۸؍

بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ نے معاشی مسائل
کو عام فہم بنانے میں نہایت بلیغ کوشش کی ہے۔
ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب کی زیر نگرانی مطبوعات
کی یہ ستر ھویں کڑی ہے۔
کسی ملک کی خوش حالی اور ترقی کا اندازہ
لگانے کے لئے اس کے مالی نظام کو سمجھنا بھی نہایت
ضروری ہے۔ اس کتابچہ میں مختصر اور سلیس انداز
میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ معاشیات
کے طالب علموں سے اس کے پڑھنے کی سفارش کی
جاتی ہے۔ عوام کو بھی چاہئے کہ اپنے ملک کے معاشی
حالات سے کما حقہ واقفیت پیدا کریں۔ اس کا پڑھنا
معاشی معلومات کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔ زیر نظر
کتابچہ کے سات باب ہیں۔
(۱) مالیات کی اہمیت (۲) ہندوستانی مالیات کی
تاریخ (۳) اہم محاصل کی تاریخ (۴) ۱۹۱۹ء کی
اصلاحات اور ہندوستانی مالیہ (۵) ۱۹۳۵ء کی
مالی اصلاحات اور وفاقی مالیہ (۶) ہندوستان
کے مالیہ پر جنگ کے اثرات (۷) ہندوستانی مالیہ
پر تنقید و تبصرہ، چھٹے باب میں نہایت دلچسپ اور
جری انداز میں بحث کی گئی ہے اور یہ معلوم کرکے
عوام کو مسرت ہوگی کہ ہندوستان اب دین دار
ملک کی بجائے لین دار ملک بن گیا ہے۔

زرعی پیداوار کی فروخت

از محمد تاج الدین بی اے (عثمانیہ) مانک بھٹ (عثمانیہ) کمن

ناشر:۔ ادارۂ معاشیات' فاطمہ منزل۔ حمایت نگر حیدرآباد
قیمت ۸؍ ۔ حجم (۸۰) صفحے

یہ کتابچہ سلسلہ مطبوعات بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ
کی انیسویں کڑی ہے۔ ایک اہم زرعی مسئلہ پر
روشنی ڈالی ہے۔ یوں تو ہندوستانی زراعت
کے کئی پہلو اصلاح طلب ہیں لیکن فروخت پیداوار
کے لئے آسانیاں مہیا کرنا نہایت اہم مسئلہ ہے۔
اور اس قسم کی اب تک بہت کم کوشش کی گئی ہے۔
اس کتابچہ میں موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔
موجودہ ناقص طریقوں کی اصلاح کے لئے ممکنہ تجاویز
پیش کی گئی ہیں۔ دلالوں اور ساہوکاروں کے
پنجے اور بے جا ظلم سے کاشت کار طبقے کو بچانے
کے لئے مرکزی مارکٹ کے خیال کو پیش کیا گیا ہے
کتابچہ کے سات باب ہیں:۔
(۱) زرعی اجناس کی فروخت کی اہمیت۔
(۲) موجودہ طریق فروخت (۳) اہم تجارتی فصلیں
(۴) موجودہ طریق فروخت کے نقائص (۵) حکومت
اور زرعی اجناس کی فروخت (۶) امداد باہمی اور

زرعی پیداوار کی فروخت (۷) منظم بازار

ہر باب کے تحت جامع و پرمغز انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اور انتہا ہی محکمہ زراعت اور محکمہ مارکیٹنگ کو اشتراک عمل کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ ایک فائدہ رساں لائحہ عمل مرتب کرکے عمل کریں۔ اگر ان تجاویز پر عمل کیا جائے تو کئی زرعی مشکلات حل ہو جائیں گی۔

زرعی قرضداری

از سید محمد عبد اللہ (عثمانیہ)
سلسلۂ مطبوعات بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ نمبر (۲۰) حجم (۸۰) صفحے قیمت ۸؍
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

ہندوستان زرعی ملک ہے اور ہندوستانی زیادہ تر دیہات ہی میں بستے ہیں۔ زمین ہی ان کی زندگی کا سرمایہ ہے اور روزی کی پیدائش کسان طبقہ کی محنت پر منحصر ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ کسان روز بروز زیادہ مقروض ہوتے جا رہے ہیں۔ ساہوکاروں نے انہیں اپنے سودی قرضہ سے بہت زیادہ مفلس اور اپاہج بنا دیا ہے۔ وراثت کے طور پر یہ قرضہ نسلاً بعد نسل چلتا رہتا ہے۔ اس طرح باوجود مشقت و کوشش کے وہ ایک مفلوج زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ صنعت کو ہندوستان رو ہی چکا تھا۔ اب زراعت بھی سسک رہی ہے۔ کسانوں کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ زمین پر لگا کر حالت سدھار سکیں اور سرمایہ کے حصول کا ایک ہی ذریعہ ساہوکار ہیں۔

کسان کو ساہوکار کے پنجوں سے چھڑا کر زرعی قرضداری کی بہتر سبیل نکالنا چاہئے۔ اسی پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے چھ ابواب ہیں (۱) زراعت اور قرضداری (۲) قرض کی وسعت اور مجموعی مقدار (۳) قرضداری کے اسباب (۴) قرضداری کے روکنے کے قوانین (۵) حیدرآباد میں زرعی قرضداری (۶) قرضداری کو روکنے کی موثر تدابیر۔

سید محمد عبد اللہ نے اپنے موضوع کو اچھی طرح نبھایا ہے۔

ہندوستان کا معاشرتی نظام

از حسن الدین احمد بی اے (عثمانیہ)
سلسلۂ مطبوعات بزم معاشیات جامعہ عثمانیہ (۱۸)۔ حجم (۸۰) صفحے قیمت ۸؍۔
ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن

بزم معاشیات نے اب تک جتنی کتابیں شائع کی ہیں ان سب عنوانوں میں زیادہ اہم یہی "ہندوستان کا معاشرتی نظام" ہے۔ یہ مضمون اس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے کہ معاشیات کے طالب علموں کے علاوہ عوام بھی اس کے جاننے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ کالج کے طالب علموں اور اعلیٰ ثانوی کے طلبہ کو چاہئے کہ اس کتابچہ کا مطالعہ کریں۔ یہ ان کے لئے بہت مفید ہوگا۔ ملکی مسائل سے دلچسپی لینے والے حضرات کے لئے یہ معلومات آفریں ہے۔ اس چھوٹے سے پمفلٹ میں حسن الدین صاحب نے پوری کوشش کی ہے کہ ایک آسان خاکہ ہندوستانی معاشرہ کے پڑھنے والے کے سمجھ میں آجائے اور اس بسیط مضمون کو بہت اچھی طرح انھوں نے مختصر کیا ہے۔ پانچ ابواب قائم کئے ہیں (۱) معاشرتی مسائل کے مطالعہ کی اہمیت (۲) ہندوستان کا قدیم معاشرتی نظام اور اس کی خصوصیات (۳) قدیم معاشرتی نظام میں تبدیلیاں اور ان کے اثرات (۴) ہندوستان کے موجودہ معاشرتی حالات اور ان کی اصلاح (۵) جنگ کے بعد معاشرتی مسائل کی نوعیت۔

ان ابواب کے تحت اہم مسائل پر نہایت آسان طریقے سے پوری روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً پردہ، رسم و رواج، مذہب، تعلیم نسواں، جبری تعلیم، تعلیم بالغان

اور ذات پات کی تقسیم وغیرہ۔ لیکن ایک بات جو کھٹکتی ہے وہ فوائد اور نقصانات گنتے ہوئے آنکوں کے بچوں کا سا انداز اختیار کرنا۔ دوسرے الفاظ کی مسلسل اور زیادہ تکرار حسن الدین صاحب میں مصنف بننے کی صلاحیت موجود ہے اس لئے وہ اس پر غور کریں۔

دو مشالہ — از محترمہ آمنہ نازلی صاحبہ ادیبہ فاضل
قیمت ۱۲؎ حجم (۱۳۶) ملنے کا پتہ: عصمت بکڈپو دہلی

یہ تیرہ (۱۳) مختصر ڈراموں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ سب عصمت اور دیگر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا دیباچہ محترمہ ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی نے لکھا ہے جو بجائے خود نہایت دلچسپ ہے۔ آمنہ نازلی صاحبہ نے اپنے ماحول کا نہایت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ تمام مرکزی خیال ہماری روزمرہ زندگی سے لئے ہیں اور اپنے انداز قلم سے دلکش رنگ بھرے ہیں۔ انداز مزاحیہ ہے۔ پڑھنے والے ہنستے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ لکھنے والی بھی ان میں شامل ہے۔ لیکن پتہ چلتا ہے کہ یہ ہنسی اپنے آپ پر ہنسی گئی ہے۔ ہندوستانی سماج کی ایسی بولتی ہوئی تصویریں ہمارے ادب میں بہت کم ملیں گی۔ زبان ستھری اور طرز ادا دلنشین ہے۔ فقرے چست اور محاورے فصیح ہیں۔ یوں تو ہر ڈراما اور خاکہ اپنی جگہ خاص اہمیت اور دلچسپی رکھتا ہے۔ لیکن مزاحیہ انداز میں سب سے کامیاب مکالمہ "محلہ کے ایک مکان میں" [illegible] اور طنز دونوں کو نہایت چابکدستی سے سمویا گیا ہے۔ ہندوستان کے مشترکہ خاندان اور عورت کی فطرت کی عکاسی اس مجموعے کے ہر مضمون میں ملے گی۔

سیدہ کی بیٹی — از جناب راز ق الخیری اڈیٹر عصمت دہلی
قیمت عام ۔ قسم خاص (۳؎) حجم (۱۶۱) صفحے
ملنے کا پتہ: عصمت بک ڈپو دہلی۔

اس کتاب میں محترم مصنف نے جناب حضرت زینب رضہ کے حالات زندگی نہایت تحقیق و خلوص سے لکھے ہیں۔ انداز بیان دلچسپ اور زبان بے عیب ہے۔ یہ اس دنیا کے شباب کی تاریخ بھی ہے اور ایک نیک بخت بیٹی، جاں نثار بہن، بہادر ماں اور بے مثل بیوی کا معیاری کردار بھی ہے۔ ضمناً اس زمانے کی تہذیب، معاشرت اور سیاست پر اچھی طرح روشنی ڈالی گئی ہے۔ تعصب سے کام نہیں لیا گیا۔ اور نہ صرف عقیدت ہی اس کی تخلیق کا باعث ہے۔ تاریخی شہادتیں اور عقل کی کسوٹی پر ہر واقعہ پرکھا گیا ہے۔ ہر مذہب و ملت کی لڑکیوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ کیونکہ یہ سوانح عورت کے مکمل اور مثالی کردار و سیرت پر بحث کرتی ہے۔

"ز ۔ س"

تاریخ سیاسیات — از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی استاد تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ۔ اردو زبان میں تاریخ سیاسیات پر پہلی کتاب ہے جس میں پروفیسر مجید صدیقی صاحب نے سیاسیات کی تاریخ کو اپنے خاص ماہرانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور سالہا سال کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ کالج کے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات (۲۷۲) قیمت ۳؎

معلم بالغاں — از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے۔ ایم ایڈ۔ تعلیم بالغاں ادارہ کی طرف سے شایع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جا رہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب تعلیم بالغاں کی اہمیت، بالغوں کی نفسیات، طریقۂ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ۱۲ؕ

ملنے کا پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

نئی کتابیں

۱۔ اپاہج (ناول) از قیسی رام پوری۔ قیمت عہ۔ پتہ ہندوستانی پبلشرز۔ اُردو بازار۔ دہلی

۲۔ شام و سحر (ناول) از ایم۔ اسلم۔ حجم ۵۰۰ صفحے قیمت ۵ پتہ۔ دارالبلاغ۔ محمد نگر۔ میو روڈ۔ لاہور

۳۔ بادۂ گل رنگ (افسانے) از ایم۔ اسلم۔ قیمت عہ 〃 〃 〃 〃 〃

۴۔ پھانسی (ناول) مترجمہ شاہد احمد قیمت عہ۔ پتہ خاتون کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی

۵۔ نوشابہ (ناولٹ) از رضیہ سلطانہ۔ قیمت ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۶۔ سہاگن (افسانے) از ایم۔ اسلم۔ قیمت عہ۔ پتہ۔ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی

۷۔ ہندوستان ہمارا (تاریخ) از پنڈت سری رام شرما قیمت ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۸۔ مینا (افسانہ) از ظفر قریشی دہلوی۔ قیمت ۱۲ر پتہ خاتون کتاب گھر۔ دہلی

۹۔ لغزشیں (ناولٹ) از فضل حق قریشی قیمت ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۱۰۔ پگڈنڈی (ہندی کے افسانوں کا ترجمہ) از افضل عابدی قیمت عہ۔ پتہ دکن بک ڈپو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۱۱۔ چند دن لینن کے ساتھ۔ از میکسم گورکی۔ قیمت ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۱۲۔ اسلامی تہذیب کیا ہے۔ از غلام دستگیر رشید 〃 عہ پتہ سید عبدالرزاق تاجر کتب۔ 〃 〃

۱۳۔ فکر اقبال۔ از غلام دستگیر رشید 〃 للعہ 〃 〃 〃 〃 〃

۱۴۔ روح اقبال از ڈاکٹر یوسف حسین خاں 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃 〃 〃

۱۵۔ نگارشات محمد علی از رئیس احمد جعفری 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃 〃 〃

۱۶۔ چرکے (کہانیاں) از ہاجرہ مسرور لکھنوی قیمت عہ 〃 ادارۂ ادبیات جدید۔ انارکلی۔ لاہور

۱۷۔ نئی دنیا (مجموعۂ کلام) از ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ حجم ۸۸ صفحے۔ پتہ اتمارام اینڈ سنز۔ انارکلی۔ لاہور

۱۸۔ چیانگ کائی شک (سوانح) از سردار الہام قیمت ۱۲ر پتہ ہندوستان پبلشنگ کمپنی۔ حیدرآباد دکن

۱۹۔ شاہد و مشہود (نظموں کا مجموعہ) از تصور ابن بدیع قیمت للعہ پتہ۔ ادارۂ اردو۔ 〃

۲۰۔ تصویر تصور (غزلیات) از تصور ابن بدیع 〃 عہ 〃 〃 〃 〃

۲۱۔ نئے فسانے۔ مرتبہ کرشن چندر ایم اے۔ حجم ۲۵۴ صفحے قیمت للعہ پتہ ساقی بک ڈپو۔ دہلی

۲۲۔ نئی منزلیں (افسانے اور نظمیں) مرتبہ قمر تسکین 〃 ۲۷۵ 〃 〃 عہ 〃 عالمگیر بک ڈپو۔ بازار سید مٹھا۔ لاہور

۲۳۔ لاوا (افسانے) از میرزا ادیب بی اے۔ حجم ۲۵۰ صفحے۔ قیمت عہ 〃 〃 〃 〃

۲۴۔ نئی راہیں (کہانیاں) مرتبہ قمر تسکین۔ حجم ۳۰۰ صفحے۔ قیمت عہ 〃 〃 〃 〃

۲۵۔ وہ آنکھیں (ناول) از احسان بی اے حجم ۴۰۰ صفحے 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۲۶۔ انگڑائی (افسانے) از ماہر القادری 〃 ۱۱۲ 〃 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃

۲۷۔ بازگشت (〃) از سید یوسف بخاری قیمت ۱۲ر پتہ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن

۲۸۔ تلخ و شیریں (〃) از صلاح الدین قریشی 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۲۹۔ خندۂ سحر از اختر انصاری 〃 ۱۲ر 〃 〃 〃 〃

۳۰۔ جھلکیاں از یوسف بخاری 〃 عہ 〃 〃 〃 〃

مرزا سیف علی خاں

نغمۂ نو

۱- سینۂ بحر پُرشکن صرصرِ تیز گام سے
کوند رہی ہیں بجلیاں ابرِ سیاہ فام سے
ٹوٹ رہے شہاب ہیں گردشِ بے نظام سے

۲- خاکِ چمن ہے شعلہ رنگ، شاخِ چمن ہے شعلہ بار
ذرّہ ہے وقفِ انتشار، قطرہ ہے گرمِ اضطرار
آگ لگی ہے چار سُو جذبۂ انتقام سے

۳- تنگ ہیں اب حیات پر ارض و سما کی وسعتیں
دیکھ رہی ہے چشمِ تر عقل و خرد کی لعنتیں
روح میں اضطراب ہے شورشِ علمِ خام سے

۴- دوڑ رہی ہے زندگی آگ سے کھیلتی ہوئی
وہم و گماں کی آفتیں یاس میں جھیلتی ہوئی
عقل ہے انتشار میں کوششِ ناتمام سے

۵- وقفِ ستم حیات ہے وقفِ الم حیات ہے
زخمۂ غم سے مرتعش بربطِ شش جہات ہے
کام چلے تو کچھ چلے عشقِ خجستہ کام سے

۶- ڈھونڈ تسلیاں اے دل جلوۂ صبح و شام سے
مانگ شراب لالہ رنگ، ساقیٔ لالہ فام سے
وجد میں انجمن کو لا تازگیٔ پیام سے

آشک

غزل

مانا کہ مجھ کو سہل ترا دیکھنا نہیں
لیکن یہ پوچھتا ہوں ترے بس میں کیا نہیں

اے عشقِ بے نیاز تری عمر ہو دراز
اب اہلِ غم کو موت کا بھی آسرا نہیں

بے ربطیٔ نوشتۂ تقدیر دیکھ کر
ہنسنا تو درکنار میں رو بھی سکا نہیں

اللہ رے بدنصیبیاں اس خوش نصیب کی
قسمت بری ہے جس کی مگر نارسا نہیں

مقصودِ دل تو خیر مگر اس میں شک نہیں
دل کے فریب دینے کو کعبہ برا نہیں

جی سن سے ہوگیا مرا سن کر نویدِ وصل
میں تو سمجھ رہا تھا وہ مجھ سے جدا نہیں

آگے تمہارے حسنِ کرم پر ہے منحصر
اب تک تو مجھ کو جور و جفا کا گلہ نہیں

پا کر تمہیں تو بڑھ گیا اور اضطرابِ دل
شاید تمہارا وصل بھی میری دوا نہیں

ممکن ہے حسنِ عفو پہ نیت پھسل بھی جائے
میں ورنہ یوں گناہوں سے باز آنے کا نہیں

کیونکر ہو بندگانِ محبت سے بندگی
کب بندگی میں شرکتِ خوفِ خدا نہیں

میں ہوں، وہ جانِ شوق ہے، دورِ شراب ہے
فضلِ خدا سے فرصتِ یادِ خدا نہیں

گر تم سے دیکھا جا سکے تو آؤ دیکھ لو
حالِ دل آج مجھ سے تو دیکھا گیا نہیں

اقرارِ بندگی کا خدائی کا اعتراف
تمکیں کسی کے دردِ محبت میں کیا نہیں

تمکین

جس کا صد سالہ جشن سالگرہ ۱۹۴۴ء میں منایا گیا۔ اس کا شمار اپنے زمانے کی ممتاز شخصیتوں میں کیا جاتا تھا۔ عالم، طبیب، سیاح، ادیب اور ملک الشعراء تھا۔ ایٹن کالج اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس کی تعلیم ہوئی۔ بعد کو لندن میں بارتھولومیو کے ہسپتال میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۷۴ء میں طب کی تعلیم کی تکمیل کے بعد سات سال تک دواخانوں میں کام کرتا رہا اور آخرکار ۱۸۸۲ء میں اس پیشے کو ترک کردیا۔ ابتدائی عمر سے وہ موسیقی اور شاعری کا دلدادہ تھا۔ ۱۸۷۳ء میں اس نے اپنی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔ وہ اپنی غنائی شاعری کے لئے بہت مشہور ہے جس میں وہ اپنی مختصر نظموں کی انتہائی سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ ۱۹۱۳ء میں ملک الشعراء بنایا گیا۔ ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے زمانہ میں اس نے کئی نظمیں لکھیں جو [illegible] "اکتوبر اور دوسری نظمیں" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ "ٹیسٹامنٹ آف بیوٹی" کے نام سے نظم و نثر میں ایک کتاب لکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ملک والوں کو جنگ کے زمانے میں صبر و سکون قلب حاصل ہو۔

ولیم ہیزلٹ ۱۷۷۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کا شمار انگلستان کے بڑے ادبی نقادوں اور انشاپردازوں میں ہوتا ہے۔ انقلاب فرانس کے وقت اس کی عمر ۱۱ سال کی تھی۔ انقلاب کے تعمیراتی اصول سے متاثر ہو کر اس نے اپنی تمام عمر فرانسیسیوں کی حمایت میں پُرزور مضامین لکھے۔ "ڈرامائی ادب ملکہ الزبتھ کے دور میں" اس کی ادبی تنقید کا شاہکار ہے جو ۱۸۲۰ء میں شائع ہوا [illegible] [illegible] قابل تعریف ہے۔ وہ کولرج اور ورڈزورتھ کا ہمعصر تھا۔ چارلس لیمب کا تادم زیست دوست رہا۔ ۱۸۳۰ء میں وفات پائی۔

مطبوعات شعبہ معاشیات جامعہ عثمانیہ
زیر نگرانی
ڈاکٹر انور اقبال قریشی
قیمت
۱۔ ہندوستان کے زر پر جنگ کے اثرات
۲۔ جنگ اور غذا کا مسئلہ ۱۲ر
۳۔ حیدرآباد کی صنعتوں پر جنگ کے اثرات
۴۔ حیدرآباد میں قیمتوں کی نگرانی
۵۔ جنگ اور راتب بندی
۶۔ جنگ اور ہندوستان کا قومی قرضہ
۷۔ انگلستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۸ر
۸۔ امریکہ اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۸ر
۹۔ کینیڈا اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۸ر
۱۰۔ ہندوستان اور بین الاقوامی زر کے منصوبے ۸ر
۱۱۔ حصول منافع زائد ۸ر
۱۲۔ ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل ۱۲ر
(ختم ہو چکی ہے)
قیمت
۱۳۔ ہندوستان کے زرعی مسائل
۱۴۔ ہندوستان میں امداد باہمی کی تحریک
۱۵۔ ہندوستان کی تجارت
۱۶۔ ہندوستان کے صنعتی مسائل
۱۷۔ ہندوستان کا مالی نظام
۱۸۔ ہندوستان کا معاشرتی نظام
۱۹۔ ہندوستان میں زرعی پیداوار کی فروخت
۲۰۔ ہندوستان میں زرعی قرض داری
۲۱۔ ہندوستان کا نظام بنک کاری
۲۲۔ ہندوستان کی قومی آمدنی
۲۳۔ ہندوستان کے مزدوروں کے مسائل
۲۴۔ ہندوستان کی سڑکیں اور ریلیں
مطبوعات ادارۂ معاشیات
۱۔ ہندوستان کے معاشی مسائل قیمت (ختم ہو چکی)
۲۔ ہندوستان کی آبادی مجلد
۳۔ اسلام اور سود
۴۔ ہندوستان کا نظام زر
۵۔ ہندوستان کی معیشت اور جنگ مجلد قیمت
۶۔ ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے ایک لائحہ عمل حصہ دوم مجلد ۱۲ر
۷۔ نظری اور عملی معاشیات حصہ دوم
ملنے کا پتہ
ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل جامعہ نگر حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اُردو دنیائے اُردو کی نظر میں

۱۹۴۴ء میں اُردو رسائل و جرائد نے ادارے کے علمی و ادبی کام سے متعلق جو رائیں ظاہر کیں ان کے مختصر اقتباسات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے ماہ جنوری میں ادارے نے (۱۰۰) صفحات کی ایک کتاب بہ عنوان "ادارۂ ادبیاتِ اردو ۱۹۴۳ء میں" شائع کی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار صدق نے لکھا کہ :—

" دکن کے مشہور ادارۂ ادبیات اردو کے ۱۹۴۳ء میں مختلف و متنوع کثیر اور قیمتی خدمات ادب کا مفصل و دلچسپ تذکرہ"

صدق - لکھنؤ - مئی ۱۹۴۴ء

ادارۂ ادبیات اردو نے اپنی مختلف مجلسوں، شعبوں اور شاخوں کے ذریعے سے اردو علم و ادب کی جو خدمات ۱۹۴۳ء میں انجام دیں یہ کتاب ان کا مجمل تذکرہ ہے۔ اردو زبان کی توسیع و ترقی کے لئے اس ادارے نے اپنی کوششوں کو صرف مطبوعات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اردو کے حلقے کو وسیع کرنے کے لئے تعلیم بالغان کے سلسلے میں چند امتحانات بھی قائم کئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے

(۱) اردو دانی (۲) اردو زبان دانی (۳) اردو عالم (۴) اردو فاضل (۵) خوش نویسی۔ ۱۹۴۳ء میں اردو دانی کے امتحان کے ذریعے سے (۱۶۹) اَن پڑھ آدمی پڑھے لکھے بنائے گئے۔ اس کے علاوہ اور سب سے زیادہ قابل قدر بات یہ ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو نے اردو کی ایک بنیادی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اردو انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کا بیڑا اٹھایا ہے اور اس کے لئے ایک علحدہ شعبہ قائم کیا گیا ہے۔

نوائے وقت - لاہور ۱۹۴۴ء

بڑی تقطیع کے ۱۰۰ صفحات پر پھیلا ہوا پُر از معلومات رپورٹ معہ متعدد تصاویر "ہفت راجہ با یدگفت" اس کے مطالعے سے خبر ہوگی کہ فدائیان ادب کیا کیا کر رہے ہیں۔"

ندیم - گیا - جون ۱۹۴۴ء

تذکرۂ اُردو مخطوطات (جلد اول)

کتب خانۂ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے صرف دو سو چھتر اردو مخطوطات کا تفصیلی تذکرہ ہے جس کو عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب نے بڑی تحقیق اور ماہرانہ انداز میں ترتیب فرمایا ہے۔ یہ تذکرہ (۳۹۶) صفحات پر مشتمل ہے جو ۱۹۴۳ء کے اواخر میں شائع ہوا۔ اس علمی مجموعۂ جواہر کے متعلق اُردو دنیا نے اپنے تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے۔

" اُردو مخطوطات (تذکرہ) کتب خانۂ ادارۂ ادبیاتِ اُردو (دکن) کے (۲۷۵) مخطوطات کا مفصل اور پُر معلومات تذکرہ اس عملی جائزہ میں تفسیر و حدیث سے لے کر قصہ کہانیوں تک (۱۱) مختلف علوم و فنون آ گئے ہیں۔ یہ تذکرہ ناظرین کے لئے دلچسپ اور شائقین علم و ادب کے لئے بڑے کام کا ہے۔ اردو میں اس خشک مضمون کو اس حد تک دلچسپ اور اس پیمانے پر وسیع و جامع بنا دینے کی غالباً یہ پہلی مثال ہے۔"

صدق - لکھنؤ - مئی ۱۹۴۴ء

" ادارۂ ادبیات اُردو ۱۹۳۱ء میں قائم ہوا۔ ۱۹۴۳ء تک ادارے کی لائبریری میں پندرہ سو سے زیادہ قلمی نسخے اور بارہ ہزار کے قریب مطبوعہ کتب و رسائل جمع ہو چکے تھے۔ اس کتاب میں پندرہ سو میں صرف دو سو پچھتر اردو مخطوطات کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے اور اس ضمن میں ۸۲۵ھ سے لے کر ۱۳۱۹ھ تک کے درمیانی زمانے کے تقریباً تین سو ادباء و شعرائے اردو کے حالات و تصانیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن میں سے نصف کے قریب ایسے ہیں جسے اردو دنیا بالکل بھول چکی تھی۔ اس تذکرہ کو مرتب کرنے میں ڈاکٹر محی الدین زور کو جن دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا اس کا اندازہ کچھ وہی اصحاب کر سکتے ہیں جنھیں کبھی قلمی نسخوں سے واسطہ پڑا ہو۔ محققین اور تاریخ نگاروں کو ادارۂ ادبیات اردو اور خصوصاً ڈاکٹر زور صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے جنہوں نے یہ تذکرہ مرتب کر کے ان کی مشکلوں کو ایک حد تک آسان کر دیا ہے۔

نوائے وقت - لاہور ۱۹۴۴ء

حیدرآباد کا ادارہ ادبیات اردو، جس کے روح رواں پروفیسر سید محی الدین قادری زور ہیں، تیرہ سال سے قائم ہے اور اس عرصے میں اس نے پندرہ سو سے زیادہ قلمی نسخے اور بارہ ہزار مطبوعہ کتابیں اور رسالے فراہم کر کے اپنے کتب خانے میں داخل کیے۔ علاوہ اس خدمت کے اس نے متعدد مفید کتابیں بھی شائع کیں، جن کا ذکر نگار میں وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔

" یہ کتاب کیٹلاگ ہے اسی کتب خانہ کا

جس میں (۲۷۵) مخطوطات کی تفصیل مع متعدد عکسی تصاویر کے بیان کی گئی ہے۔ اس میں قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، تاریخ و تذکرہ اور کلیات و دواوین سبھی قسم کی کتابیں نظر آتی ہیں اور نہایت سلیقہ سے ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ پروفیسر زور کی اس علمی خدمت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ فہرست مجلد شائع ہوئی ہے اور کاغذ وغیرہ سب نفیس ہے۔

نگار۔ لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۴۴ء

"ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اردو ادب کی جس قدر خدمت کی ہے اس کے اعتراف کی یہاں گنجائش نہیں، اس خدمت میں ڈاکٹر زور صاحب سب سے پیش پیش ہیں۔ زیر نظر کتاب ان بے شمار قلمی نسخوں کے نمونوں پر مشتمل ہے جو جناب زور کو حیدرآباد سے دستیاب ہوئے۔ قلمی نسخے بے حد دقت نظر اور چھان پھٹک کے محتاج ہوتے ہیں۔ کہیں مصنف کا نام نہیں تو کہیں سنہ تصنیف یا سنہ کتابت نہیں۔ ظاہر ہے کہ کتاب کی ترتیب میں جناب زور کو بے حد دیدہ ریزی اور دردسری کرنا پڑی ہوگی۔ (۲۷۵) اردو کے مخطوطات ہیں تقریباً ایک ہزار ہجری سے بارہ سو پچاس ہجری تک کی تصانیف شامل ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب اہل نظر کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ثابت ہوگی۔"

ہمایوں۔ لاہور۔ ستمبر ۱۹۴۴ء

"موجودہ زمانے میں کتب خانوں کی فہرست سائینٹفک طریقوں سے تیار کرنے کے معنی انبوہ معلومات کا یکجا کرنا ہوا۔ زور صاحب باوجود کثرت مشاغل قلیل مدت میں جس کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں وہ لائق تحسین و آفرین ہونے کے علاوہ مسرت بخش اور تعجب خیز ہے۔ خدا کرے بقیہ جلدوں کی تکمیل و اشاعت کے ذرائع جلد جلد نکلتے جائیں کہ یہ کار نمایاں سرانجام کو پہونچ کر قدردانوں کے لئے دستیاب ہوسکے۔ موقعہ موقعہ سے نوادر کے عکسی بلاک دے کر کتاب ہذا کو اور بھی قیمتی بنا دیا گیا۔ مگر معلومات کے جواہر پارے یقینی انمول ہیں۔"

ندیم۔ گیا۔ جون۔ ۱۹۴۴ء

"ادارۂ ادبیات اردو نے اردو مخطوطات کی (۲۷۵) کتابوں کا تفصیلی تذکرہ شائع کرکے ایک اہم خدمت انجام دی ہے اور اس میں فہرست مخطوطات بہ لحاظ موضوع و بہ لحاظ زمانۂ تصنیف دے کر تحقیق کرنے والوں کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ سب سے مشکل کام مولوی محی الدین صاحب نے یہ انجام دیا ہے کہ آخر میں ایک مکمل انڈکس (اشاریہ) اشخاص، کتب، رسائل و مقامات کا دیا ہے۔ محققوں کے لئے ایسے تذکروں اور فہرستوں کی روز افزوں ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دوسرے ادارے بھی اس مستحسن اقدام کی تقلید شروع کردیں گے۔"

ہندوستانی۔ الہ آباد۔ جولائی ۱۹۴۳ء

"ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد۔ اردو زبان کی جو مختلف النوع مفید خدمات انجام دے رہا ہے، وہ باخبر اصحاب سے مخفی نہیں، اس سلسلے میں اس نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے، جس کے مخطوطات کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ گئی ہے، ان میں بہت سے نادر اور تاریخی مخطوطے بھی ہیں، ادارہ کے لائق کارکنوں نے اب اس کتب خانے میں مخطوطات کی فہرست کی ترتیب کا کام شروع کیا ہے، چنانچہ اس کے فاضل معتمد ڈاکٹر محی الدین صاحب زور نے اردو مخطوطات کی پہلی جلد مرتب کی ہے، اس میں مذہبیات، قرآن و حدیث، فقہ و تصوف، مواعظ و نصائح، ادعیہ و مناجات، سیر و مناقب نبویؐ، اہل بیت و صحابۂ کرام اور دوسرے بزرگان دین کی سوانح و فضائل اور سلاطین و امراء کے حالات، منظومات، قصص و حکایات، لغت، عروض و انشاء، طب، اور بعض عقلی علوم کے (۲۷۵) مخطوطات کی مفصل فہرست ہے، جن مصنفین کے حالات معلوم ہوسکے ہیں، ان کے مختصر حالات، مخطوطہ کی کیفیت، تصنیف و کتابت کے سنین، کتابت کے شروع و آخر کی عبارت یا اشعار، ہر کتاب کے متعلق ضروری معلومات دیدیئے ہیں، لیکن مخطوطات خصوصاً غیر معروف مصنفین اور ان کی تصانیف کی فہرست کی ترتیب کا کام اتنا دشوار ہے کہ اس سے پوری طرح عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہے، تاہم لائق مرتب نے ہر کتاب کے متعلق حتی الامکان ضروری اور صحیح معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے، ان کی یہ کوشش اس حیثیت سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس فہرست کے ذریعے اردو کے بہت سے نادر مخطوطات کا علم شائقین کو ہوجائے گا، کتاب کے آخر میں اسماء اور اشخاص کے اعلام کا اشاریہ بھی دیدیا ہے، جس سے تصانیف اور مصنفین کی تلاش میں سہولت پیدا ہوگئی ہے امید ہے کہ دوسری جلد بھی جلد شائع ہوگی۔"

معارف۔ اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۴۴ء

تاریخ سیاسیات :-

پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نے سیاسیات کی تاریخ کو اپنے خاص ماہرانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور سالہا سال کے تجربوں کا نچوڑ ہے جو ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شائع کی گئی۔

معاصرین کی رایوں کے اقتباسات درج ذیل ہیں :-

"تاریخ سیاسیات پر پہلی کتاب ہے۔ موجودہ زمانے کی گرانی کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو قیمت ضرور بار خاطر ہوگی۔ مگر مواد مضمون کی اہمیت، مولف ذی مرتبت کی محنت اور مطالعہ کی افادیت کے اعتبار سے یہ کہنا بجا ہے کہ ع نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز۔ اس طرح کی ٹھوس علمی تالیفات کی تعداد جتنی بڑھتی جائے اردو کا خزانہ مالا مال ہوتا جاتا ہے۔ مگر قدردانوں کو اہم فرض نہ بھولنا چاہئے اگر اردو میں اچھی علمی تالیفات کی بڑھائی ہے تو ع جاں گرد جامہ گرد رطل گرانے پیش آر۔ کہتے ہوئے ہاتھوں ہاتھ لیجئے۔"

ندیم گیا۔ جون ۱۹۴۴ء

"یہ نچوڑ ہے وسیع مطالعہ اور برسوں کی کاوش کا۔ زبان اتنی سہل کہ معمولی پڑھا لکھا بھی ذرا سی محنت کے بعد دنیا کے ایک اہم ترین علم سے واقف ہوسکتا ہے۔

سیاسیات اور فلسفۂ سیاسیات پر انگریزی زبان میں بہت سی کتابیں ہیں لیکن ان کتابوں میں اکثریت ایسی ہے جو سیاسیات کے ارتقائی دور میں مشرق کے ملکوں کو نظر انداز کر جاتی ہے۔ اس موضوع کی بہت کم کتابوں میں دور وسطیٰ کے ابواب میں اسلام کا ذکر کیا جاتا ہے، صدیقی صاحب نے تاریخی ادوار کے اس تسلسل کو قائم رکھا ہے جسے مغربی محرر نظر انداز کر جاتے ہیں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد اس وقت تک جو سیاسی نظریے پیش ہوتے رہے ہیں ان کا ذکر نہایت خوبی اور وضاحت سے کیا گیا ہے۔"

ادب لطیف۔ لاہور۔ جون ۱۹۴۴ء

تعلیم کا مسئلہ

ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی جیسے ماہر تعلیم نے یہ کتاب لکھ کر ہمارے مروجہ تعلیم کے پیچیدہ مسائل کا حل پیش کیا ہے اور علم و فن کی صحیح تنظیم اور تشکیل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء کے اواخر میں ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی۔ ہندوستان کے بلند پایہ جرائد نے اس کتاب کے متعلق جن تاثرات کا اظہار کیا ہے وہ درج ذیل ہیں۔

"تعلیم کا مسئلہ آج کل ہمارے لئے اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کوئی اور مسئلہ ہوسکتا ہے۔ ہندوستان میں اس وقت کم و بیش نوے فی صد کا ایسے لوگ ہیں جو ان پڑھ ہونے کے باعث وقت کے تقاضوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس سے قطع نظر ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس قدر ناقص ہے کہ آج کل تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تقریباً نوے فی صد ایسے ہیں جنھیں صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ نہیں کہا جاسکتا۔ تعلیم کا اصلی مقصد کیا ہے؟ تعلیم کس قسم کی اور کس حد تک ہونی چاہیئے؟ اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین کیا ہونا چاہئے یہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس کتاب میں ان تمام مسائل پر اور ان کے علاوہ تعلیم سے متعلق دیگر مسائل پر ریاضیاتی انداز میں مفصل بحث کرکے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔"

نوائے وقت۔ لاہور۔ ۱۹۴۴ء

"باوجود یکہ جنگ اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ ابھی جاری ہے، مگر مفکرین عالم نے "تنظیم نو" پر خیال آرائیاں شروع کردی ہیں۔ شعبۂ تعلیم و تعلم اس موج افکار میں شامل نہیں ہے۔ بلکہ قوی الجثہ ہاتھ پاؤں مارنے والے کی طرح گرداب سے نکل آنے پر بہت کچھ مصر بھی اور اس کا اہل بھی۔ ایسے میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کی سعی مشکور، اطمینان بخش اور ہمت افزا ہے، ضرورت ہے ماہرین تعلیم اس وقیع تالیف کے مطالعے سے محروم نہ رہیں اور تمام ناظرین بھی اس بے حد ضروری مسئلہ کے متعلق اپنی واقفیت بڑھانے کے لئے اپنے اوقات عزیز کا ایثار فرمائیں۔"

ندیم۔ گیا۔ جون۔ ۱۹۴۴ء

"یہ مصنف کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو تعلیم پر مختلف رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان مختلف مضامین میں تعلیم و تربیت کا مقصد، مدت، موجودہ تعلیم کے نقائص، اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین، علم کی وحدت، انسانی وحدت کی تعلیم، ایمان اور علم، ابتدائی اور ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، تعلیمی منزلیں اور نصاب تعلیم وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ تعلیم کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ انہیں مضامین پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کو قابل عمل ثابت کرنے کے لئے کچھ اصول مقرر کئے ہیں جن سے مختصر بحث کی گئی ہے۔

مسئلہ تعلیم کی یہ تجویزیں عام طور پر ہر مذہب و ملت کے لئے قابل عمل ہیں، مصنف نے ثابت کیا ہے کہ تعلیم کا مقصد زندگی کے جسمانی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں کو فروغ دینا، اجتماعی زندگی میں حصہ لینا، جماعت کی خدمت کرنے کے قابل بنانا ہے۔ بہرحال مصنف کی تجاویز قابلِ عمل ہیں اور وہ مختصر مجموعے میں

تعلیم کے اکثر مسائل کا استقصا کیا گیا ہے"۔

ہندوستانی۔ صوبہ متحدہ الہ آباد۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

"جناب ڈاکٹر رضی الدین صدیقی نے اس کتاب میں تعلیمی اور قومی وملی نقطہ نظر سے مسئلہ تعلیم پر بحث کرکے مسلمانوں کے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا ہے، اور تعلیم وتربیت کی اصلی غرض و غایت ظاہر کرکے موجودہ نظامِ تعلیم کے نقائص دکھائے ہیں، اور قومی وملکی ضروریات کے مطابق ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ تینوں تعلیمی مدارج کا نظام اور نصاب پیش کیا ہے، اور جامعات کے شعبۂ فنون کی موجودہ تقسیم کے متعلق بعض تجویزیں پیش کی ہیں، اس خاکہ میں مسلمانوں کی تعلیم کا کوئی اہم اور ضروری پہلو چھوٹنے نہیں پایا ہے، اور ملکی وملی اور مذہبی ہر نقطۂ نظر سے تعلیم کے تمام اجزا وعناصر اور تعلیم سے متعلق دوسرے ضروری مسائل پر بڑی سنجیدگی اور اعتدال وتوازن کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور نصاب میں ان سب کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب مسلمانوں کی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب، اساتذہ، آزادی پسند نوجوان طلبہ اور ان کے غلط بیں والدین سب کے مطالعہ کے لائق ہے، اگرچہ یہ کتاب مسلمانوں کی تعلیم پر لکھی گئی ہے، لیکن بیشتر تعلیمی مسائل ہندو مسلمان دونوں کے مشترکہ ہیں، اس لئے یہ کتاب دونوں قوموں کیلئے مفید ہے" معارف۔ اکتوبر ۱۹۴۲ء

سرگزشت حاتم

:- ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ نے دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتمؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کے اردو فارسی کلام پر تبصرہ لکھا ہے۔ یہ کتاب ڈاکٹر صاحب کی تحقیق اور علمی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۴ء کے وسط میں شایع کی گئی، ہندوستان کے رسائل میں جو تبصرے شایع ہوئے ان کے اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"جناب سید محی الدین قادری زورؔ کو لندن میں حاتمؔ کے دیوان کا ایک قابلِ قدر نسخہ "دیوان زادہ" کے نام سے ملا، اور اس کو موصوف نے ترتیب وتحشیہ کے ساتھ شایع کرنے کا اہتمام کیا ہے، لیکن ابھی اس کے شایع ہونے میں دیر ہے، اس لئے موصوف نے زیر نظر رسالے کو جو در اصل اسی دیوان کا مقدمہ ہے "سرگزشت حاتمؔ" کے نام سے شایع کردینا مناسب سمجھا، اس میں نسخہ "دیوان زادہ" کی یہ اہمیت خاص طور پر دکھائی گئی ہے، کہ اس میں حاتمؔ نے اپنے کلام کو تاریخ وار یکجا کیا ہے اور انھیں مشق سخن کے لئے طویل زمانہ ملا، اس لئے ان کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اردو زبان درجہ بدرجہ کن ارتقائی منزلوں سے گزری اور لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں میں کیا فرق ہوتا گیا، نیز مصنف نے اس دیوان اور دوسرے تذکروں کی مدد سے حاتمؔ کی زندگی کے حالات مختلف بابوں میں پیش کئے ہیں اور تذکروں کے اختلافی بیانوں کو اپنے دلائل سے جانچا اور پرکھا اور کہیں بیانوں کی تصحیح کی ہے، کہیں تطبیق دی ہے، اردو زبان اور شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ حاتمؔ کے سوانح حیات اور ان کے کلام کی خصوصیات پر جامع اور مستند رسالہ ہے اور مطالعہ کے لائق ہے"

معارف۔ اعظم گڑھ۔ نومبر ۱۹۴۴ء

"یہ دلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتمؔ کے حالات زندگی اور ان کے اردو فارسی کلام پر تبصرہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو سے خاص شغف ہے۔ چنانچہ ان کی متعدد قابل قدر کتابوں "اردو کے اسالیب بیان"، "تنقیدی مقالات"، "مرقع سخن"، "کیف سخن"، "بادہ سخن"، "فیض سخن"، "حیات میر محمد مومن"، "حیات محمد قلی قطب شاہ اور سرگزشت غالب" وغیرہ اس کی گراں بہا شہادتیں ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

شاہ ظہور الدین حاتمؔ اردو کے بہت بڑے شاعر ہیں انھوں نے (۷۰) برس تک لگاتار اردو کی خدمت انجام دی ہے اور قابلِ قدر شاعروں کے ایک وسیع سلسلے کے استاد ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس صرف مولنا حسرتؔ موہانی کا مختصر انتخاب تھا جو شاہ صاحب کے معمولی حالات اور منتخب غزلوں پر مشتمل ہے۔ چونکہ شاہ حاتمؔ اور ان کے ہم عصروں کے حالات اس وقت تک مفصل معلوم نہیں تھے اور ہماری معلومات اس دور کے متعلق نہایت محدود ہیں اس لئے ڈاکٹر صاحب کی یہ کوشش لائق صد تحسین وآفریں ہے۔

یہ کتاب مندرجۂ ذیل مضامین پر مشتمل ہے شاعری کا آغاز، ولی کا اثر، ملازمت، استعفا، درویشی اور وفات، مذہب واخلاق، احباب وشاگرد، غزل گوئی، فارسی شاعری، دیوان زادہ، مولنا آزادؔ کی معلومات اور غلط فہمیاں" ہندوستانی۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

ہندوستانی تمدن

ڈاکٹر ایشورا ٹوپا صاحب نے ہندوستان کے مختلف تمدنوں کو وضاحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو اتنی تحقیق اور وسعت کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۰ء کے اواخر میں شائع کی گئی۔ ہندوستان کے مختلف رسائل نے جو اظہار رائے کیا ہے وہ درج ذیل ہے:-

ہندوستانی تمدن کو بڑی قابلیت اور تلاش وتجسس کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب دس ابواب میں تقسیم ہے۔ یوں تو تمام ہی کتاب سبق آموز اور پڑھنے کے قابل ہے لیکن کتاب کا نواں اور دسواں باب خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ جن میں بدھوں اور جینیوں کے زوال، برہمنیت کے احیاء اور برہمنوں کے عروج کا حال بیان کیا گیا ہے۔ کتاب میں قدیم ہندوستان کے فنون لطیفہ خصوصاً مصوری، نقاشی اور مجسمہ سازی سے بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک اپنے موضوع پر اردو زبان میں پہلی کتاب ہے جسے شائقین علم تاریخ کو ضرور پڑھنا چاہئیے۔"

زمانہ - کانپور - فروری ۱۹۴۴ء

"ہندوستان اور اس کے تمدن کی قدامت پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہاں کا تمدنی ارتقاء کسی ایک قوم کی کوششوں کا مرہون منت نہیں۔ ان سب کا جائزہ اگرچہ ایک امر محال تھا لیکن ہمیں حیرت ہے کہ جناب ایشورا ٹوپا نے نہایت کامیابی سے مختلف تمدنی تحریکات کا احاطہ کیا ہے اور ہمیں امید ہے کہ تاریخ اور بالخصوص تاریخ ہند سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ کتاب نہایت کارآمد ثابت ہوگی۔"

ہمایوں لاہور - جولائی ۱۹۴۴ء

"پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جس میں قابل مصنف نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی تمدن صرف ایک قوم کی معاشرت ہی کی پیداوار نہیں بلکہ مختلف قوموں کے افکار و خیالات کی آمیزش ہے۔ منازل ارتقاء کے مراحل کو طے کیا ہے۔ امید ہے کہ ڈاکٹر ایشورا ٹوپا صاحب اپنے عزم میں ثابت قدم رہیں گے اور اردو ادب میں وہ ہندوستانی تمدن پر چند مستند کتابیں پیش کر کے بیش بہا اضافہ کریں گے"

شاہکار - لاہور - فروری ۱۹۴۴ء

طبیعیاتی کائنات

پروفیسر محمد علی خاں صاحب نے طلبہ اور عوام کے لئے نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں مظاہر قدرت پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب بھی ۱۹۴۳ء کے اواخر میں ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ مختلف رسالوں میں جو تبصرے شائع ہوئے ان کے اقتباسات یہ ہیں:-

"اردو زبان میں طبیعیات کے متعلق یہ عام فہم کتاب لکھی گئی ہے جس میں ایسے واقعات، مشاہدات اور انکشافات کا مختصر طور پر ذکر کیا گیا ہے جو دلچسپ ہوں اور سائنس سے تعلق رکھتے ہوں۔ کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں اجسام فلکی، چاند، سورج اور ستاروں وغیرہ کا ذکر ہے۔ دوسرے میں نظریۂ تحریک موجی نظریے اور نظریۂ اضافیت کا ذکر ہے۔ تیسرے میں آواز، طیف نمائی اور مختلف قسم کی شعاعوں کا حال ہے، چوتھے حصہ میں جوہری ساخت، موجی میکانیات اور نئے نئے ذرات کے انکشافات کا مختصر بیان ہے۔ کتاب طلبہ کے لئے مفید اور معلومات آفریں ہے۔"

شاعر - آگرہ - مئی ۱۹۴۴ء

"اس چھوٹی سی کتاب میں سید محمد علی خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) اے آر سی ایس۔ بی ایس سی آنرز (لندن) پروفیسر طبیعیات نظام کالج، حیدرآباد دکن نے نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں مظاہر قدرت پر روشنی ڈالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جن مظاہر کا تعلق ریاضیات سے ہے ان کو دانستہ نظر انداز کیا گیا ہے کیونکہ کتاب پڑھنے والوں کو اعداد و شمار کے خشک موضوع سے چنداں دلچسپی نہیں ہوتی کتاب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں اجرام سماوی جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ دوسرا حصہ حرارت نظریہ تحریک موجی نظریۂ اضافیت سے متعلق ہے۔ تیسرے حصے میں آواز، طیف اور مختلف اقسام کی شعاعوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور چوتھے حصے میں جوہر، جوہر کی ساخت، میکانیات موجی اور نئے نئے ذروں کے انکشافات کو مختصر طور پر بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں انگریزی اصطلاحات کے اردو معنی کی فرہنگ کا بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ جو طلبہ کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگی۔"

زمانہ - کانپور - ستمبر ۱۹۴۴ء

"طبیعیات جیسے اہم شعبۂ سائنس کو نہایت عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے۔" امید ہے کہ سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب کارآمد ثابت ہوگی۔"

شاہکار - لاہور - فروری ۱۹۴۴ء

"حیدرآباد نے اردو کے ہر شعبہ کو معراج کمال تک پہنچانے کی ٹھان رکھی ہے۔ چنانچہ جہاں ہندوستان کے دوسرے صوبوں نے خالص ادبی کاوشوں کو مطمح نظر بنایا ہے وہاں حیدرآباد کے ادیب کائنات کے دوسرے مسائل کو بھی پیش کر رہے ہیں اور اردو کے لئے ایک مبارک اقدام ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اصحاب ذوق ہم ایسی کتابوں کا خیر مقدم کریں گے۔"

ہمایوں - لاہور - اپریل ۱۹۴۴ء

"کائنات ایک معمہ ہے اور اس معمہ کو حل کرنا تو خیر بڑا کام ہے لیکن اس کے متعلق سطحی باتیں کہنے اور سمجھنے کے لئے بھی خاص زبان اور دماغ کی ضرورت ہے۔ سید محمد علی خاں خیر دماغ کے لحاظ سے تو اس گفتگو کے مستحق تھے ہی لیکن یہ لکھ کر انھوں نے زبان کے لحاظ سے بھی اپنی اہلیت ثابت کر دی۔ اس کتاب کے چار حصے ہیں۔ اور ایسی سہل زبان میں کہ ادنیٰ غور و تامل کے بعد ہر شخص مفہوم سے قریب تر ہو جاتا ہے۔"

نگار - لکھنؤ - مارچ ۱۹۴۴ء

سچ کا جادو

مولوی علی بن عبدالجیب الحضرمی عثمانی نے بچوں کے لئے یہ اخلاقی ڈراما لکھا تھا جو ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۳ء کے اواخر میں شائع کیا گیا۔ تبصروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"علی بن عبدالجیب الحضرمی کا لکھا ہوا ڈراما جس میں عرب و مصر کے جغرافی و تاریخی حالات پر دلچسپ انداز میں بحث کی گئی ہے۔ اس کے مصنف حیدرآباد کے ایک مدرس ہیں اور یہ ڈراما کئی بار دکن کے مدارس میں اسٹیج پر دکھایا جا چکا ہے۔ بچوں کی تعلیم کے لئے اس قسم کے ڈرامے بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔"

نگار۔ لکھنؤ۔ مارچ ۱۹۴۴ء

"اس ڈرامے میں سچائی کو فتح و نصرت اور کامیابی اور کامرانی کے ذریعے ثابت کیا گیا ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ تعلیم کے ذوق کا بھی ایک دلچسپ خاکہ کھینچا گیا ہے۔ ڈراما اسکولوں اور طلبہ کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید ہے۔ جگہ جگہ نظمیں اور اشعار ہیں۔ زبان بھی صاف اور آسان ہے۔ مجموعی طور پر ڈراما اچھا ہے۔"

شاعر۔ آگرہ۔ مئی ۱۹۴۴ء

"تاریخ اسلام کو پس منظر کے طور پر پیش کرتے ہوئے ڈرامائی انداز میں ایک اخلاقی سبق دیا گیا ہے جو عنوان سے ظاہر ہے۔ یہ ڈراما بچوں کے اسٹیج کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوگا۔"

ہمایوں۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۴۴ء

"یہ ڈراما اسکول کے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ جو ہائی اسکول نرمل میں اسٹیج ہو چکا ہے اور اب کتابی صورت میں منظر عام پر لایا گیا ہے۔ ڈرامے کا ہیرو سعید نامی ایک طالب علم ہے جس کا قافلہ مصر جاتے ہوئے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا ہے۔ سعید کی راست گوئی سے متاثر ہو کر ڈاکو اپنے پیشے سے تائب ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈراما بچوں کی درستی اخلاق کے لئے رہبر اور ان کی تعلیم و تربیت کے لئے درس کا فرض ادا کرتا ہے۔"

زمانہ۔ فروری ۱۹۴۴ء

ماہ لقا اور دوسری نظمیں

پروفیسر عزیز احمد صاحب کی ڈرامائی نظموں کا مجموعہ ہے جو ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۳ء کے اواخر میں شائع کیا گیا۔ اردو ادب میں اس قسم کی نظموں کی بہت کمی ہے اور یہ کتاب ایک مفید اضافہ ہے۔ مختلف رسالوں کے تبصروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"اردو ادب میں اچھے ڈراموں کا عموماً اور ڈرامائی نظموں کا خصوصاً فقدان ہے۔ لیکن عزیز صاحب نے کسی حد تک یہ کمی پوری کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔"

شاہکار۔ لاہور۔ فروری ۱۹۴۴ء

"فاضل مصنف کی طبیعت بہت شگفتہ ہے تینوں نظمیں دلچسپ اور سبق آموز بھی ہیں۔"

زمانہ۔ کانپور۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

"ان نظموں میں ترقی پسندانہ "رمزیت و مستقبلیت، تصویریت و اظہاریت" سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ لیکن ہر چیز اپنی جگہ ٹھکانے سے ہے اور ان بے اعتدالیوں و بدلگامیوں سے علیحدہ جو آج کل کے بعض آزاد شاعروں کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ میں نے ان نظموں کو پڑھ کر محسوس کیا کہ اگر ہماری آئندہ شاعری کے رجحانات یہ رنگ اختیار کر کے اور زیادہ نکھر گئے تو وہ یقیناً ادب میں بڑا رنگین و دلکش اضافہ ہوگا۔"

نگار۔ مارچ ۱۹۴۴ء

عرب اور عربستان

محترمہ جہاں بانو بیگم ایم اے۔ لکچرار کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ نے بچوں کی دلچسپی کے لئے یہ کتاب اپنے خاص اسلوب میں تحریر فرمائی تھی جو ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۲ء میں شائع کی گئی، اخبار صدق مئی ۱۹۴۴ء کا تبصرہ درج ذیل ہے:۔

"اس میں عرب کے جغرافی، تمدنی اور معاشرتی حالات مختصراً بیان کئے گئے ہیں زبان بچوں کی استعداد کے مطابق ہے۔"

صدق۔ مئی ۱۹۴۴ء

نمود زندگی

حضرت علی منظور حیدرآباد کے کہنہ مشق اور بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ ۱۹۴۲ء میں ادارہ کی طرف سے شائع کیا گیا۔ رسالہ معارف نے فروری ۱۹۴۴ء میں اس کتاب پر اظہار خیال کیا ہے اس کا اقتباس یہ ہے:۔

"علی منظور حیدرآباد کے مشہور شاعر ہیں۔ کلام میں تخیل آرائی اور رنگینی کے بجائے واقعیت اور سادگی بیان زیادہ نمایاں ہے بلکہ یہ دونوں اوصاف ان کے کلام کا امتیازی وصف ہیں۔"

معارف۔ فروری ۱۹۴۴ء

حیدرآباد

محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے (عثمانیہ) نے عوام اور طلبہ کے لئے حیدرآباد کے متعلق ضروری معلومات کو اس کتاب میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء میں ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی۔ رسالہ معارف کی رائے درج ذیل ہے:۔

"اس رسالہ میں بچوں کے لئے حیدرآباد کے متعلق ضروری معلومات یکجا کئے گئے ہیں۔" معارف۔ اعظم گڑھ۔ نومبر ۱۹۴۳ء

پودوں کی کہانی

پروفیسر سعید الدین صاحب صدر شعبۂ نباتیات جامعہ عثمانیہ نے اس کتاب میں پودوں کی زندگی کے متعلق ایسی گراں قدر معلومات کو سادہ زبان اور دلچسپ انداز بیان میں قلمبند فرمایا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۳ء کے اواخر میں ادارہ کی طرف سے شائع ہوئی۔ ہندوستان کے بلند پایہ رسائل نے اس کے

متعلق جو اظہار خیال کیا ہے وہ درج ذیل ہے:—
"اس میں نباتیات کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر علمی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہے اور نباتیات کی عام خصوصیات غذا اور توانائی حاصل کرنے کے طریقوں نائٹروجن کے قدرتی مخزنوں اور اس کے حصول اور نباتیات کی افزائش نسل کے قدرتی نظام کو عام فہم اور سادہ طریقہ سے بیان کیا گیا ہے"

معارف ـ اعظم گڑھ ـ اپریل ۱۹۴۴ء

"یہ چھوٹی سی کتاب اردو زبان میں گویا علم النباتات کی پرائمر ہے جسے مسٹر محمد سعید الدین بی ایس سی۔ ایم اے (اڈنبرا) ایف آر ایم ایس۔ ایف ایف ایس سی ایف ایس (لندن) صدر شعبۂ نباتیات، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن نے تصنیف کیا ہے۔ اسلوب بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ پودوں کی کہانی خود ان کی زبانی سنائی گئی ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں پودوں نے اپنے رموز حیات بیان کئے ہیں۔ دوسرے باب میں یہ بتایا گیا ہے کہ پودے کس طرح غذا حاصل کرتے اور نشو ونما پاتے ہیں۔ تیسرے باب کا تعلق نائٹروجن سے ہے جو پودوں کی خاص خوراک ہے۔ چوتھے باب میں ایسی نباتیات کا بیان ہے جو عام پودوں کی امت میں تو شامل نہیں ہیں لیکن دنیائے نباتیات میں داخل ہیں جیسے کوکرمتا یا اکاس بیل وغیرہ۔ پانچویں باب میں پودوں اور درختوں کے پھلوں اور بیجوں کا ذکر ہے۔ الغرض یہ کتاب بہت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ جہاں کہیں انگریزی یا کسی غیر زبان کا لفظ یا نام آیا ہے اس کا ترجمہ لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ بیان عام فہم اور سلیس ہو۔ کتاب میں جگہ جگہ تصویریں اور نقشے دے کر سمجھایا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی افادی حیثیت کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ ضخامت چار جزو میں"

زمانہ ـ کانپور ـ ستمبر ۱۹۴۴ء

"اردو زبان میں پودوں کی کہانی اور نباتات کے متعلق کوئی عام فہم کتاب نہیں تھی صرف یہی نہیں بلکہ چند کتابوں کے علاوہ جو جامعہ عثمانیہ کے نصاب میں داخل ہیں، آپ شاید ہی نباتات پر جدید معلومات کی حامل کوئی بھی کتاب پا سکیں۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے پروفیسر سعید الدین صاحب نے نہایت سلیس زبان میں عامیوں کے لئے پودوں کی کہانی خود ان کی زبانی بتلائی ہے۔ جا بجا فوٹو کی تصاویر سے مضامین کی تکمیل کی گئی ہے۔ پودوں کی زندگی اور ان کے نشو ونما سے ہمارا اتنا گہرا تعلق ہے لیکن ہم بہت کم انھیں جان دار سمجھ کر ان کے ساتھ ویسا برتاؤ کرتے ہیں۔ پروفیسر سعید نے یہ ثابت کیا ہے کہ ان پودوں کی زندگی ہماری زندگی سے کچھ پیچیدہ نہیں۔
امید ہے کہ سعید صاحب اسی ذوق عمل سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہیں گے اور عوام ان کی مختصر کتاب کو دلچسپ پائیں گے۔"

شاہکار ـ لاہور ـ فروری ۱۹۴۴ء

"ہمارے ادب میں نباتات پر اول تو کوئی تصنیف ہے ہی نہیں اگر ہے بھی تو اس قسم کی کہ اسے مستند نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہ مختصر تصنیف اگرچہ اس سلسلے کا آغاز کر رہی ہے لیکن اگر اسے پھیلا کر ایک مکمل کتاب کی شکل میں پیش کیا جاتا تو بہتر تھا۔ تاہم یہ بھی غنیمت ہے"

ہمایوں ـ لاہور ـ جولائی ۱۹۴۴ء

"اس میں بتایا گیا ہے کہ پودوں کا نشو ونما، مسیح کا الگنا کیا حقیقت رکھتا ہے اور نباتاتی ارتقاء کی بنیاد کیا ہے۔ جا بجا نقوش کے ذریعہ سے مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے۔ زبان و انداز بیاں بہت سادہ سلیس ہے۔" نگار ـ لکھنو ـ مارچ ۱۹۴۴ء

باتیں

مولوی شجاع احمد صاحب قائد کو بچوں کی دلچسپی کی کتابیں لکھنے کا خاص ملکہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے بچوں کے لئے مزے مزے کی باتیں بیان کی ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۹۴۳ء کے اواخر میں شائع ہوئی تھی۔ اس پر جو رائیں وصول ہوئیں ان کے اقتباسات یہ ہیں:—
"چھوٹے دلچسپ اور مختصر ڈراموں کا ایک دلپذیر مجموعہ ہے جو شجاع احمد صاحب قائد کے زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ یہ مختصر ڈرامے نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ مثلاً جس ڈرامے کا عنوان 'کھانا پانی' ہے اس میں کھانے پینے کے آداب بتائے گئے ہیں۔ الغرض تمام ڈرامے بہت ہی پر لطف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ فاضل مصنف نے شروع میں بطور تمہید باتوں کی باتیں لکھی ہیں،

ان کا اسلوب بیان بھی بہت دلچسپ ہے۔"
زمانہ کانپور۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

"یہ "باتیں" باتوں ہی باتوں میں کام کی باتیں سکھاتی ہیں۔ بچوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ اس کی ہر بات دلچسپ اور مفید ہے۔ ہمارے خیال میں ہر شخص کو یہ باتیں اپنے بچوں کو ضرور سکھانی چاہیئے۔"
شاعر۔ آگرہ مئی ۱۹۴۴ء

"چھے مکالمات کا یہ مجموعہ بچوں کے لئے معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچاتا ہے۔ ڈرامائی انداز میں طلسمی آدمی، مشینوں، کھانا پانی، دعا تول وغیرہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ سلسلہ بچوں کے لئے مفید ثابت ہوگا۔"
ہمایوں۔ جولائی ۱۹۴۴ء

اشوک اعظم

اشوک اعظم ۔ اس کتاب میں ہندوستان کے مشہور فرمانروا کے حالات زندگی اور طرز حکومت پر محترمہ سیدہ مہدی جعفری صاحبہ بی اے (عثمانیہ) نے بچوں کے لئے مفید معلومات قلمبند کی ہیں جو ادارہ سے ۱۹۴۴ء میں شایع کی گئی۔ اس کتاب کے متعلق رسالہ معارف نے یہ رائے دی ہے:۔

"اشوک اعظم میں بچوں کے مطالعہ کے لئے قدیم ہندوستان کے اس نامور حکمران کے مختصر سوانح حیات اور تاریخ میں اس کے مقام کو دکھایا گیا ہے"
معارف۔ اعظم گڑھ۔ ستمبر ۱۹۴۴ء

آریائی زبانیں

آریائی زبانیں ۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما ایم اے۔ ڈی لٹ پروفیسر سنسکرت و لسانیات پرنس آف ویلز کالج جموں (کشمیر) کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب پر جو رائیں مختلف رسالوں میں شایع ہوئی تھیں وہ ادارہ ۱۹۴۳ء میں شایع ہو چکی ہیں۔ بعض رسالوں نے ۱۹۴۴ء کے آغاز میں اپنی رائیں شایع کیں جو درج ذیل ہیں:۔

"لسانیات یا فیلالوجی اپنی خشکی کے باوجود نہایت دلچسپ فن ہے۔ لیکن اردو میں اس موضوع پر مستقل کتابیں نہیں ہیں۔ بعض ادبی کتابوں میں ضمناً کچھ لسانیاتی بحثیں ملتی ہیں۔ لایق مولف نے اس کتاب میں لسانی نقطۂ نظر سے ہندوستان اور ایران کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ ان کی خصوصیات ماخذ وارتقا و عہد بہ عہد کے تغیرات ان کی باہمی حرفی و صوتی مشابہت و اختلاف وغیرہ کو دکھایا ہے۔ ہندوستان کی زبانوں پر نسبتاً زیادہ تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لایق ہے"
معارف۔ اعظم گڑھ۔ جنوری ۱۹۴۴ء

"یہ سلسلۂ ادبیات اردو میں آریائی زبانوں کے متعلق یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں چھوٹی تقطیع کے قریب سو صفحے ہیں۔ شروع میں پروفیسر سید محی الدین قادری کا دیباچہ ہے۔

رسالہ چار حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں ہندی کی تاریخ بتائی ہے ہندی سے مراد اُن زبانوں سے ہے جن میں آج کل کی ہندی اور ادبی اردو اور اَن پڑھ لوگوں کی بول چال کی ہندوستانی شامل ہیں۔ دوسرے حصے میں آریائی زبانوں کی پیدائش ترقی اور شکل پر بحث کی ہے اور ہند آریائی اور ایرانی کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

تیسرے حصے میں ہند آریائی زبانوں اور ان کی خصوصیات کا اور چوتھے میں ایرانی زبانوں کا مختصر بیان ہے۔"
ہندوستانی۔ الہ آباد جولائی ۱۹۴۴ء

یورپ جنگ سے پہلے:۔

پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی صدر شعبہ تاریخ جامعہ عثمانیہ نے اپنے سفر یورپ کا روزنامچہ مرتب فرمایا تھا جس کو ادارہ کی طرف سے ۱۹۴۴ء میں شایع کیا گیا۔ یہ کتاب اپنے دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے کہ جنگ سے پہلے کے یورپ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔
رسالہ معارف کی رائے کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

"مصنف نے ۱۹۳۸ء میں بین الاقوامی تاریخی کانگریس کے اجلاس سوئزرلینڈ میں شرکت کی تھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے چار مہینے یورپ کے مختلف ملکوں میں بسر کئے۔ اب اس سفر کا روزنامچہ کتابی شکل میں شایع ہوا ہے۔ آخر میں بین الاقوامی کانگریس کے اجلاس کی مفصل کاروائی اور ان خدمات کا ذکر کرایا ہے جو مصنف کے ہاتھوں تاریخ ہند کے متعلق اس اجلاس میں انجام پائے ہیں۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔"
معارف۔ اعظم گڑھ۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء

(ماہ نامہ)

سب رس

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
ہنس راج سکسینہ ایم ایس سی

نشان تار پتہ ۱۵۴
نشان پتہ جات ایم ۲۹۸
ٹیلیفون نمبر ۲۲۱۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۶ ؍

جلد ۸ بابت اپریل ۱۹۴۵ء شمارہ ۴

نمبر	عنوان		مصنف	صفحہ
۱	اردو میں سائنسی ادب		خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ)	۲
۲	[illegible]		پروفیسر صلاح الدین ایم اے	۵
۳	ادب اور معاش		صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)	۹
۴	بڑا آدمی کس کو کہتے ہیں	(نظم)	بادہور پر شاد مصر	۱۰
۵	ادبی تنقید کی لفظیات		ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۱۱
۶	گلستاں کی راہیں	(غزل)	عزیز احمد بی اے (عثمانیہ)	۱۵
۷	اشنان	(نظم)	علی احمد بی اے ڈپ ایڈ (عثمانیہ)	۱۵
۸	سوال و جواب		ص ۔ ا ۔ ن ۔	۱۶
۹	کالے پانی کا مفرور قیدی		گلچیں حیدرآبادی	۱۷
۱۰	اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط		ادارہ	۲۵
۱۱	سایۂ ہستی	(افسانہ)	شفقت رضوی	۲۹
۱۲	پچپن کے بعد		سید محمد تقی نائب ناظم آبکاری وظیفہ یاب	۳۲
۱۳	سویرا	(نظم)	عابدی	۳۵
۱۴	اپریل		صاحبزادہ میکش (عثمانیہ)	۳۶
۱۵	تجربہ	(نظم)	سید علی منظور	۳۹
۱۶	نظم		م ۔ ح ۔ ب	۴۰
۱۷	غزل		دامودھر ذکی	۴۰
۱۸	نشانہ اندازی کی اہمیت		پروفیسر امتیاز حسین خاں بی کام	۴۱
۱۹	ادھورے گیت		سرداسا الہام	۴۶
۲۰	غزل		عزیز حامد مدنی	۴۶
۲۱	نئی کتابیں		نواب مرزا سیف علیخاں	۴۷
۲۲	تنقید و تبصرہ		[illegible]	۴۸
۲۳	ادارے کی خبریں		ادارہ	۴۹ تا ۵۶

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ ادبیات منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اردو میں سائنسی ادب

قرآن السعدین تقطیع ۱۱×۱/۲ ۷ ہر صفحے میں دو کالم۔ یہ اخبار سرپرستی پنڈت دھرم نرائن کے اہتمام سے مطبع العلوم مدرسہ دہلی میں چھپ کر شائع ہوتا تھا۔ یہ ۱۸۴۵ء سے نکلنا شروع ہوا تھا کیونکہ اس کی دوسری جلد ہماری نظر سے گزری جس پر ۱۸۴۶ء درج تھا۔ اس اخبار پر حسب ذیل عبارت درج رہتی تھی:-

"قرآن السعدین

نمبر (۳۴) جلد ۲ قیمت ماہواری دو روپیہ اور پیشگی دے بیس روپیہ سالانہ اور گیارہ روپیہ ششماہی مورخہ ۲۴ اگست یوم شنبہ ۱۸۴۶ء"

اس کا حجم عموماً (۱۲) صفحات ہوتا تھا کبھی کبھی ایک دو صفحات کا ضمیمہ بھی شامل کر دیا جاتا تھا۔ اس اخبار میں تمام ہندوستان کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ علمی، تاریخی اور سائنسی مضامین کو بھی بطور خاص جگہ دی جاتی تھی۔ تصویریں بھی شریک رہتی تھیں جو لیتھو میں خوبصورت چھپتی تھیں۔ فلکیات، نباتات، حیوانیات وغیرہ پر اکثر اشاعتوں میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھا گیا ہے۔ اس کی افادیت کے بارے میں جلد دوم نمبر (۲۵) میں صفحہ (۴۴۹) پر جو عبارت درج ہے اس کا اقتباس یہ ہے:-

"قرآن السعدین کو جاری ہوئے دو سال گزرتا ہے۔ دھرم نارائن اس کا مہتمم یا تو سکالر یا ماسٹر مدرسہ دہلی کا ہے۔ حال کی نسل کے بہبود اور ترقی کے واسطے جمیع مفصل کے اخباروں میں سے میری دانست میں وہ بہت بہتر ہے...... اس کی زبان میں آمد ہے آورد نہیں باعث اس کا یہ ہے کہ اس کے مضامین انگریزی سے

اردو میں ترجمہ کئے جاتے ہیں...... میں اس اخبار کو چیمبرز ایڈنبرا جرنل کے ساتھ تشبیہ دیتا ہوں جو رسالہ ہر شخص کے پڑھنے کے قابل ہے۔ الراقم ٹکالین۔"

اب ہم یہاں اس اخبار کے صفحہ ۴۰۹ تا ۴۱۱ بابت ۹ اگست ۱۸۴۶ء کی عبارتیں نقل کرتے ہیں:-

بیان نباتات کا

نباتات ایسی قسم کے اسجائے دیکھنے میں آتی ہیں جو کبھی ہندوستان میں دیکھنے نصیب نہیں ہوئے۔ ثعلب ایک قسم کی نباتات ہے جو ہندوستان میں جا کر بہت قیمت پاتی ہے اور گراں قیمت سے بکتی ہے اسجائے مثل گھاس کے جابجا اس کے درخت کھڑے ہیں۔ یہی ثعلب ہندوستان میں عطاروں کے ہاتھ یہاں کے لوگ بیچتے ہیں وہ ثعلب جو اصل ولایت سے آتی ہے اس میں اور اس میں بہت فرق ہے لیکن بہ سبب شکل و شباہت کے تمیز نہیں ہو سکتی۔ ایک بوٹی اسجائے ایسی دیکھنے میں آئی کہ اس میں زہر اس قدر ہوتا ہے جیسا کہ بچھو یا سانپ کی کاٹنے میں ہوتا ہے اس کا نام بچھو ہے اس بچھو کے درخت کی یہ صورت ہے کہ وہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مادہ دوسرا نر، مادہ کا درخت چھوٹا ہوتا ہے۔ قریب آدھ گز کے اور نر بہت بڑا ہوتا ہے اگر اس کے پتے کے تئیں ہاتھ کسی کا لگ جائے فوراً ہاتھ پر آبلے پڑ جائیں اور تکلیف ایسی ہوتی ہے جس طرح بچھو کے کاٹنے میں ہوتی ہے۔ لہریں ہاتھ میں اسی طرح کی اٹھا کرتی ہیں۔ ۱۴ تاریخ جولائی کو راہ چلنے میں میرے ہاتھ اس بوٹی کا پتا لگا تھا اسی وقت آبلے پڑ گئے اور تکلیف اور سوزش اس قدر تھی کہ برداشت نہ کر سکتا تھا غرض کہ دوسرے روز تک ہاتھ میں ورم رہا اور

سوزش بھی باوجود دوا کرنے کے شام تک رہی۔ کیا قدرت
اس خدائے متعال کی ہے کہ جس جائے بچھو کا درخت پہاڑ
پر موجود ہے اس جا پہ اس کا دفعیہ بھی موجود ہے
یعنی ایک بوٹی اس کے برابر ہی ہوتی ہے اس کو پالک
کہتے ہیں جس کا آگے بیان کرتا ہوں اس کے ملنے سے
آرام ہوتا ہے۔

تحقیق درخت بچھو کے

واضح ہو کہ بچھو مسبوق الذکر کو زبان اندلس میں
حریق الملس کہتے ہیں اور عربی زبان میں حریق اور نبات
النار اور قریص بھی کہتے ہیں۔ فارسی میں انجرہ کہتے ہیں
زبان ترکی میں گجت اور ہندی میں اشنگن لاطینی میں
ارتیک پریم زبان گیلان میں ہرتیکہ۔

ماہیت اس کی

وہ ایک قسم نباتات کی ہے پتا اس کا نیم کے پتے
سے بڑا ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے کانٹے مثل روئیں
کے اس کے پتوں اور ٹہنیوں پر ہوتے ہیں اگر بدن
آدمی پر لگ جائے اسی وقت سوزش اور جلن اور خارش
پیدا ہو جائے پھول اس کا زرد ہوتا ہے تخم اس کا زرم براق
مثل تخم السی کے ہوتا ہے بہتر وہ ہے جو نگین مائل بسیاہی ہو

طبیعت

اول درجہ میں اور تیسرے میں گرم و خشک دوسرے
درجہ میں گرم لکھا ہے۔

افعال و خواص اس کے

یہ بوٹی اخلاط لزجہ مثل بلغم وغیرہ کو لطیف کر دیتی ہے
اعضا میں زخم ڈالتی ہے .... دود
بہت پیدا کرتی ہے پسینہ بہت لاتی ہے سدہ طحال اور شش

کو کھولتی ہے۔ مگر اس کے پتے کو کوٹ کر ناک میں ڈال دیں نکسیر بند ہو جاوے

....

....

...... سے جو منہ پر چھا جاتے ہیں ان کو بھی کاٹ ڈالتی ہے
خصوصاً اگر شہد میں ملا کر لیپ مسّے پر کریں تو مفید ہے۔ اگر تالو
میں ورم ہو تو اس کے جوشاندہ سے کُلّی کریں۔ تخم اس کا [illegible]
کھانسی کو اور آلات تنفس اور استسقا کو مفید ہے۔ بیماری گردہ اور قولنج
کو مفید ہے مقدار اس کے شربت کی تین درم تک ہے زیادہ پینا مضر ہوگا۔

بیان حیوانات و حشرات الارض کا

اب میں جو کچھ حال حیوانات کا لکھنا چاہتا ہوں لیکن قبل
اس کے چاہیے کہ چشمہ ہائے شر و خصلت کے پناہ اور دامن خدا
سے چاہوں اور لفظ الامان زبان پر لاؤں۔ واضح ہو کہ مچھر
پہاڑ پر ایسے کثرت سے ہوتے ہیں جن کو ٹڈی دل کہہ سکتے ہیں۔
قد یہاں کے مچھروں کا برابر مکڑے کے ہوتا ہے۔ ٹانگے ان کے برابر
ایسی ہے مکڑی کے ہوتی ہیں بروقت جلانے چراغ کے صدہا
گھر میں گھس آتے ہیں بعض وقت بہ سبب ان کے ہجوم کے
چراغ گل ہو جاتا ہے۔ پسّو اس پہاڑ پر اس کثرت سے
ہیں جس کثرت سے موسم برسات میں درمیان ہندوستان
کے حلوائیوں کے مکانوں پر مکھیاں جمع ہوا کرتی ہیں اُس سے
زیادہ ہر ایک کپڑوں میں موجود ہوتے ہیں بہ سبب ان کے
نیش زنی کے نیند نہیں آتی۔ کوئی کپڑا ایسا نہیں رہتا جس
میں حضرت پسّو کی نوج کا گزر نہ ہو۔ اسی واسطے بعض
آدمی رات کے سونے کے واسطے تھیلی سلواتے ہیں اور
تھیلی میں گھس کر سوتے ہیں جب حضرت پسّو سے
بچ سکتے ہیں اگر شام کے وقت مکان میں جھاڑو دلا
پسّو جمع کر لو یہ تکلیف صاحب لوگوں کو نہیں ہوتی۔ ہمارے ہندوستانی
اس آفت ناگہانی میں گرفتار رہتے ہیں کیونکہ ان کے مکان
بہت اچھی طرح پر واقع ہیں۔ ہندوستانیوں کے مکان سوائے
بجز چھپروں کے اور کچھ نہیں ہے۔ چونکہ جو بیماروں کے بدن پر

پر قیمت گراں ہندوستان میں لگائے جاتے ہیں اسکا یہ صفت ہر ایک آدمی کے بدون خواہش چمٹ جاتی ہے صفت میں آدمیوں کا خون پینے کو ہیں۔ واسطے ادا ر حاجت بشری کے جو شخص جنگل میں جاتا ہے یا غار میں اوترتا ہے دو چار جونک کو خون پلا آتا ہے۔ سانپ اس پہاڑ میں کوڑیالے بہت دیکھنے میں آئے اژدہا بھی بہت ہیں ایک اژدہا کہ قد اس کا قریب دو بانس کے اور دل اس کا دوا یخ دور قریب ہمارے بنگلے کے رہتا ہے۔ بسبب عدم فرصت کے اتنا ہی حال لکھا گیا جو خدمت عالی میں بھیجتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ بوقت فرصت بہت حال ضروری معہ حال نباتات اور حیوانات کے مشرح لکھ کر عرض کروں گا۔ الراقم کریم الدین از مقام کوہ منصوری۔"

اس اخبار کے صفحہ (۴۷۹) مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۸۴۸ء میں ایک نئے رسالہ "خیر خواہ ہند" کا تعارف کرایا گیا ہے جو لالہ رام چندر مدرس علوم انگریزی مدرسہ دہلی ماہانہ شائع کرتے تھے۔ صفحات (۵۰) اور چندہ ماہانہ ایک روپیہ تھا۔ یہ رسالہ ہم کو دستیاب نہ ہوسکا لیکن اس اخبار میں اس رسالے کے بعض مضامین کو نقل کیا گیا ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس رسالہ میں بھی سائنسی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ ہم یہاں ان کے اقتباسات درج کرتے ہیں:۔

"جاننا چاہیے کہ فقط وہ علوم جن سے انسان کی راحت اور نیکی زیادہ ہوسکے وہی قابلِ تحصیل اور فکر اور تامل کرنے کے ہیں منجملہ ان کے ریاضیات اور طبعیات اور سیاست مدنی اور اصول قوانین اور علم اخلاق اور تاریخ اور معرفت طبیعی اور طب وغیرہ۔۔۔۔"

"حکمائے متقدمین نے یہ دیکھ کر کہ آفتاب ہر روز مشرق سے طلوع کرکے مغرب میں غروب ہوجاتا ہے یہ قیاس کر لیا کہ وہ گرد زمین کے گردش کرتا ہے خلاف اس کے حکمائے متاخرین نے بہت سے تجربات سے قیاس بالا کے برعکس ثابت کیا۔۔۔۔ باستعانت اور باقوں کے ثابت کیا کہ زمین آفتاب کے گرد بیضوی مدار میں گردش کرتی ہے۔۔۔۔۔۔"

اخبار نمبر (۳۴) مورخہ ۲۳ اگست ۱۸۴۶ء میں ماسٹر رام کی تصنیف "عجائبات روزگار" پر ریویو کرتے ہوئے اس کی کتاب کے صفحہ (۱۲۰) کی عبارت نقل کی ہے جس کا اقتباس یہ ہے:۔

"سات ستارے اس قدر بڑے ہیں کہ بعض ان میں کے زمین سے ذرا چھوٹے ہیں اور وہ ستارے جو ذرا ذرا سے آسمان پر چمکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں فی الحقیقت اجسام مانند آفتاب کے ہیں اور ان کے گرد چھوٹے سیارے مثل کرہ زمین کے گردش کرتے ہیں اور ان سب سیاروں میں خلقت خدا کی کسی نہ کسی طرح کی بستی ہے۔۔۔۔۔۔"

صفحہ (۴۹۶) اور (۴۹۷) پر "فرد تقسیم منافع مطبع العلوم منافع فیصدی ایک روپیہ یکم نومبر ۱۸۴۲ء لغایۃ آخر اگست ۱۸۴۳ء" کی سرخی کے تحت حصہ داروں کے نام مع حصص و منافع درج ہیں جن میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

"مسٹر سپرنجر صاحب، مفتی صدر الدین خاں صاحب، رائے رام سرنداس صاحب، مولوی مملوک علی صاحب، لالہ رادھا کشن، الطاف حسین، ماسٹر نور محمد۔"

صفحہ (۴۹۶) پر ایک اور اخبار "صدر الاخبار" کا ذکر ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں بھی کیمیاتی مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس عبارت کا اقتباس یہ ہے:۔

"صدر الاخبار و تاریخ الافکار معرفہ چہارم ماہ حال۔۔۔ ماہی کے مطالعہ سے گزرا اس میں ثبوت اختلاف شکل عروسکا کا نتیجہ افکار لالہ منولال سب اسسٹنٹ سول انجنیر سے مندرج ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں شک نہیں کہ اختلاف مذکور لالہ منولال و صاحب مہتمم صدر الاخبار کے ملاحظہ سے نہ گزرا ہو اور اس کو انھوں نے اپنی ہی فکر سے نکالا ہو مگر اظہار اس امر کا کہ وہ کسی کتاب میں نہیں ہے اس بات پر دال ہے کہ انھیں وہ کتابوں پر نظر نہیں کیونکہ اگر صاحب موصوف نے تحریر اقلیدس انگریزی جو باہتمام کلکتہ بک سوسائٹی کے ۱۸۳۳ء میں طبع ہوئی ہے ملاحظہ کی ہوتی تو وہ اس امر کو نہ فرماتے۔۔۔۔"

(باقی آئندہ)

خواجہ حمید الدین

نشتر

ادبی شاہکار کی تخلیق سائنس کے لئے تخلیق حیات کی طرح ابھی ایک راز سربستہ ہے۔ حیات کی ادنیٰ ترین اور بالکل ابتدائی مثال خلیہ ہے۔ ماہرین کیمیا بآسانی خلیہ کی تحلیل اس کے عناصر ترکیبی میں کر سکتے ہیں۔ یہ عناصر نوعیت کے اعتبار سے وہی ہوتے ہیں جن سے بے جان اشیاء ترکیب پاتی ہیں۔ معمل میں بلا کسی دقت کے ان عناصر کو اسی کمی تناسب سے جو خلیہ میں پایا جاتا ہے ترکیب دیا جا سکتا ہے مگر حاصل خلیہ نہیں بلکہ ایک خلیہ نما جسم ہوتا ہے جس میں حیات کی صفت قطعاً مفقود ہوتی ہے۔ چونکہ سائنس کے اساسی اصول مانع ہیں کہ حیات کو روح یا ایک غیر مادی اور فوق الفطرت جوہر مانا جائے، اس لئے مجبوراً ماہرین سائنس اسی مفروضہ میں پناہ لیتے ہیں کہ کسی نہایت بعید زمانہ میں حرارت اور فضائی حالات کا ایسا نادر اجتماع اتفاقاً واقع ہوا کہ ان کے تحت ہی ترکیب پیدائش حیات کا باعث ہوئی اور ان حالات کا مجموعہ پھر اسی صورت میں نہ واقع ہوا اور نہ پیدا کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے اب حیات اس عناصر کی کسی مصنوعی ترکیب سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ماہرین تنقید بھی ادبی شاہکار کی کیفی تحلیل بآسانی اس کے صفات ترکیبی میں کر سکتے ہیں اور اس کی پائندہ دلکشی اور اثر و جاذبیت کا راز اس کے اسلوب بیان، طرز انشاء، زبان کی شستگی، جذبات کی لطافت، خیالات کی رفعت، موضوع کی عظمت اور اہمیت میں تلاش کرتے ہیں۔ اس کے رونما ہونے کے اسباب و علل کا پتہ مصنف کی فطری قابلیت، سابقہ تجربات اور اس کی ذہنی تشکیل میں حصہ لینے والے عوامل خاص طور پر عصری روح میں لگاتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اتنی تحلیل و تدقیق کے بعد بھی ادبی شاہکار ایک معمہ ہی بنا رہتا ہے۔ ایسے ادبی شاہکار بھی پائے جاتے ہیں جن میں تنقید کی خوردبین سے نقائص اور خامیاں بھری نظر آتی ہیں مگر جن کی طاقتور کشش سے کوئی منصف مزاج نقاد انکار نہیں کر سکتا۔ یہ کشش شائد ان نقائص ہی کے نادر اجتماع کا نتیجہ ہو۔

بہر حال اگر ہم حقیقی روح ادب کے متلاشی ہیں تو ہمیں اس دوسری قبیل کے شاہکاروں کا جو فنی آرائش و تزئین کے حشو و زوائد سے معرا ہیں بہ نظر غائر مطالعہ کرنا چاہیے۔ فن تنقید کی کسوٹی پر پرکھے ہوئے شاہکاروں میں یہ روح ہوتی ضرور ہے مگر اتنے دبیز حجابوں کے اندر کہ اس کا مشاہدہ امر محال ہے۔ اسی نکتہ کی توضیح کے لئے میں ایک ایسی کتاب کی مثال لیتا ہوں جس کو ادبی شاہکار کہتے ہوئے مجھے مطلق تامل نہیں ہوتا اگرچہ نقادان ادب اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے کی بھی شائد زحمت گوارا نہ کریں۔

کتاب کا نام "نشتر" ہے مگر اصل میں وہ نشتر نہیں جو صرف سطحی چوکے لگاتا ہے بلکہ ترکش ہے جس کا ہر تیر پڑھنے والے کے دل میں گھر کئے بغیر نہیں رہتا۔ سیدھا سادہ مختصر سا افسانہ ہے۔ تشبیہ و استعارہ کی چاشنی ہے نہ صنائع و بدائع کی رنگ آمیزی۔ اشخاص جو اس میں حصہ لیتے ہیں دنیا کی مشہور و معروف ہستیاں نہیں بلکہ متوسط طبقہ کے معمولی افراد ہیں جن میں سے کوئی بھی کسی خاص غیر معمولی صفت یا کمال سے متصف نہیں۔ واقعات جو بیان کئے گئے ہیں تاریخی اہمیت رکھنے والے حالات نہیں بلکہ انہی افراد کی روزمرہ کی خانگی زندگی سے متعلق ہیں۔ مگر ہر واقعہ ان اشخاص کی سیرت کے اندرونی پہلوؤں کو اس طرح روشن کر دیتا ہے جس طرح برق کی چمک ایک لمحہ کے لئے گرد و پیش کی اشیاء سے پردۂ ظلمت اٹھا لیتی ہے۔ جس زمانہ کی یہ کتاب پیداوار ہے اس پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنی ضرور ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ روح عصری کا اثر کس حد تک اس کی تشکیل کا ذمہ دار ہے۔ یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے اواخر یا انیسویں صدی کے آغاز کا ہے۔ جب کہ تنزل و ادبار کی گھٹائیں ہندوستان پر اور خاص طور پر مسلمانان ہند پر چھائی ہوئی تھیں۔ اولوالعزمی اور بلند حوصلگی سرے سے

غالب تھی۔ قوائے عمل شل اور ارادے کے سرچشمے خشک ہو گئے تھے تصویرِ حیات پر صرف ایک رنگ غالب تھا۔ سہل انگاری کا ربابِ زندگی سے صرف ایک سُر سنائی دیتا تھا۔ تن آسانی عدول و دماغ کے رگ و ریشے میں انحطاط کی سمیت سرایت کر چکی تھی۔ شمشیر و سناں کی جگہ طاؤس و رباب نے چھین لی تھی۔ سیاست اور کشورکشائی سے توجہ ہٹ کر ادنیٰ قسم کے عیش و عشرت پر مرکوز ہو گئی تھی۔ منتہائے نظرِ زندگی کا آرام اور معراج مسا حظِ نفس تھا۔ ایسے ناسازگار اور نامساعد زمانے میں انسان اپنے ذاتی کمال سے کتنی ہی پرواز کرے اعلیٰ معیار تک اس کی رسائی محال ہوتی ہے۔ قوم کی عام پستی کسی ذی کمال فرد کو بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیتی جس طرح موسمِ خزاں میں کوئی ایک پودا بھی بارور نہیں ہو سکتا۔ ان ناموافق حالات میں اس چھوٹی سی کتاب نے جنم لیا۔

مصنف ایک معمولی بھولا بھالا شخص ہے جس کی سادگی سادہ لوحی کی حد تک پہنچ گئی ہے جن معاملات کو وہ بیان کرتا ہے ان کے مضمرات پر اس کی نظر نہیں پڑتی جس موقع میں خود کو پاتا ہے اس کی نزاکتوں سے بے خبر رہتا ہے۔ کسی گہرے حکیمانہ نکتہ کا اس طرح سرسری ذکر کر دیتا ہے کہ گویا اس کا ذہن گہرائی میں جانے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا۔ ایک ماہرِ فن ادیب جن استادانہ چالوں اور ہنرمندانہ تدبیروں سے ناظرین کے دل کو موہ لینے کی کامیاب کوشش کرتا ہے مصنف ان سے نابلد ہے۔ اس کی نظر صرف ظاہر پر پڑتی ہے۔ مگر جو اسے نظر آتا ہے بلا کم و کاست پیش کر دیتا ہے۔ اس طرزِ نگارش سے اگرچہ اس کے فن اور ذہانت و لیاقت کی قدر ہمارے دل میں گھٹ جاتی ہے مگر اس کے خلوص اور ذہنی دیانت داری کی قدر بہت بلند ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی ہمیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ حقیقت کے اصلی خط و خال پر انشا پردازی کے رنگین پردے ڈال دیا ہے۔

کتاب "آپ بیتی" ہے اور مصنف خود ہی اس کا ہیرو ہے۔ آپ بیتی غالباً ادب کی مشکل ترین صنف ہے اور اس راہ میں مصنف کو پاؤں پھونک پھونک کر چلنا پڑتا ہے چونکہ وہ خود مرکزی مقام رکھتا ہے اسلئے لازماً اشخاص اور واقعات کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور ذاتی تعصبات اور بے بنیاد دعووں کے بیچ میں اصل حقیقت مسخ شدہ نظر آتی ہے۔ اس کی کوشش دانستہ یا نادانستہ یہی ہوتی ہے کہ اپنے عیوب کی پردہ پوشی کرے۔ اور اپنی خوبیوں کو خوب نمایاں اور اجاگر کر کے ظاہر کرے۔ مصنف کی صاف دلی اور طبعی انکسار نے اسے ان کانٹوں میں الجھنے سے بچا لیا ہے وہ اپنے محاسن کا ذکر کرتا ہے تو بے جا فخر کے بغیر جس کی وجہ سے ناظرین پر یہ تذکرہ گراں نہیں گزرتا اور بعض اوقات وہ اپنی کارگزاریوں کا بیان اس سادگی سے کرتا ہے کہ ناظرین کے تفنن طبع کا باعث ہوتا ہے۔ زمانہ حال کے آپ بیتی لکھنے والے جنھوں نے آزاد خیالی اور صاف گوئی کے مکتب میں تربیت پائی ہے عموماً ایک دوسری غلطی کا ارتکاب کرتے ہیں جو پہلی غلطی کی ضد ہوتی ہے۔ جس کو ہم فخرِ معکوس سے منسوب کرتے ہیں یہ لوگ اپنے عیوب اور خطاؤں کی کھلم کھلا بے باکی اور دیدہ دلیری سے تشہیر کرتے ہیں اور اپنی بداعمالیوں کو مزے لیکر بیان کیا کرتے ہیں۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی صاف گوئی اور رائے عامہ سے بے پروائی کا اثر ناظرین کے دل میں بٹھانے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے جذبۂ خود نمائی کی تشفی صاف سیدھے طریقے سے نہیں بلکہ چھپی ہوئی عیارانہ چال سے کر رہے ہیں مصنف کا دامن اس فخرِ معکوس کے دھبے سے بھی پاک ہے۔ وہ اپنی لغزشوں کا اظہار ندامت و انکسار کے ساتھ کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے قدرتاً اسے ہماری ہمدردی حاصل ہو جاتی ہے۔ قصہ کی ہیروئن کوئی نامور شہزادی یا امیرزادی نہیں نہ وہ کوئی باکمال عالی مرتبت خاتون ہے۔ اس کا تعلق سماج کے اس بدقسمت طبقے سے ہے جس کے متعلق عام انسان رحمت و ہمدردی کے نہیں مخالفت اور حقارت کے جذبات محسوس کرتے ہیں۔ کوئی واقف فن

افسانہ نویس اپنی ہیروئن کو ایسے حالات میں نہیں رکھتا جہاں کہ اس کے لئے ناظرین کی دلچسپی و ہمدردی حاصل کرنا نا ممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے۔ مگر یہ قصے کا کمال ہے یا مصنف کی قوت کہ بہت جلد ہماری پوری ہمدردی ہیروئن کے قبضۂ تصرف میں چلی جاتی ہے اور آخر تک اس ملکیت پر اس کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑتی۔ ہیروئن کی وقعت ہر قدم پر ہمارے دل میں بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا دل غیر معمولی طور پر حساس ہے۔ خالص محبت کی اس میں بے پایاں استعداد ہے۔ اس کی روح کی لطافت اور ذہن کی نزاکت خراج تحسین حاصل کرنے میں کبھی ناکام نہیں ہوتی۔ وہ ایک درخشاں و تاباں نگینہ ہے جو ایک بھدی اور بدرنگ انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے اور ہماری توجہ اس کی حسن و خوبی پر اس مضبوطی سے مرکوز ہو جاتی ہے کہ اس کے گرد و پیش کے ناموزوں و مکدر پیدا کرنے والے عناصر ہمارے شعور میں راہ ہی نہیں پاتے۔ اس کی سخن فہمی موقع شناسی۔ نکتہ رسی۔ بذلہ سنجی۔ شیریں کلامی خوش گفتاری بلند فکری اور سب سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نصب العین سے اس کی ہمہ تن وابستگی ناظرین کے قلوب میں احترام و محبت کا ہیجان پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کا انجام حزنیہ پر ہوتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہی انجام اس کی شوخئ طبیعت سے ایک حکیمانہ مطابقت رکھتا ہے۔ خانگی زندگی کی پرسکون راحتوں اور خاموش خوشیوں سے اسے مستفیض ہوتے تصور کرنا ہمارے لئے سخت دشوار ہے۔ شعلۂ جوالہ کی طرح ہی ختم ہوتا ہے۔ سوز سے نجات پانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ جس قسم کا شعلۂ عشق اس کالبد خاکی میں بھڑک رہا تھا اس کی آخری منزل سکون نہیں موت ہی ہو سکتی تھی۔ اور کون کہہ سکتا ہے ممکن ہے جس کو ہم آخری منزل باور کرتے ہیں وہ بھی ایک فرودگاہ بر سر راہ ہو۔ اگر اس کا انجام عام قصوں کی طرح تاہل اور خانہ داری کی زندگی پر ہوتا تو شاید ہمیں ایسا ہی عجیب معلوم ہوتا کہ گویا ہم برق کو محض فانوس میں جا گزیں دیکھ رہے ہیں یا نغمہ کو کالی بانسری سے سن رہے ہیں۔

کتاب میں اشعار کثرت سے ہیں مگر چونکہ حسن شاہ اور خانم جان کی زندگی ایک مسلسل پر ترنم نظم معلوم ہوتی ہے اس لیے اشعار اس سے کچھ اس خوبی سے ربط کھا گئے ہیں کہ تصنع یا آمد کا کہیں احساس نہیں ہونے پاتا۔ بہت سے اشعار ایسے بھی ہیں جو عام طور پر متداول ہیں اور کثرت استعمال سے پامال ہو گئے ہیں مگر حیرت ہے کہ جب ہم انہی کو اس متن میں پڑھتے ہیں تو ہم ان کو ایک نئی تازگی زیادہ گہرے معنی اور خوش گوار تلازمات سے معمور پاتے ہیں گویا ہم ان اشعار کو پہلی مرتبہ پڑھ رہے ہیں اور ان کی حسن و خوبی کا اسی لمحے ادراک کر رہے ہیں۔ زیادہ تر اشعار حافظ سے لئے گئے ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا اس لئے کہ حافظ کا رنگ تغزل کچھ ایسی شوخی اور جاذبیت رکھتا ہے اور اس کے اشعار قلب انسانی کی گہرائیوں کے اس طرح آئینہ دار ہیں کہ اس کی مثال کسی اور شاعر میں ملنی مشکل ہے۔ دیوان حافظ کی شرحیں ان گنت ہیں اور شارحین نے کبھی اپنے خیالات ان میں ٹھونسنے اور کبھی دور کے معنی ان سے کھینچ نکالنے میں ان تھک کوششیں کی ہیں۔ یہ کتاب بھی ایک اعتبار سے اشعار حافظ کی شرح ہے جو ایک الوکھے انداز سے کی گئی ہے۔ تڑپتا ہوا دل اور نازک حسیات رکھنے والے دو حقیقی انسان اپنی واقعی زندگی سے اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر مقام حافظ کے کسی نہ کسی شعر کی توضیح و تشریح کرتا اور اس کے مجرد خیال کو متمدن صورت میں پیش کرتا ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حسن شاہ اپنی سادگی یا سادہ لوحی سے خانم جان کو کھری کھری سنا دیتے ہیں۔ خانم جان رنجیدہ ہو جاتی ہے ؎

گل بہ گفت کہ از ما است نہ رنجیم و لے

ہیچ عاشق سخن تلخ بہ معشوق نا گفت

یہ بے رخی سے ہٹ جاتی ہے تو وہ حیران اور متعجب ہو جاتے ہیں ؎

آن ترک پری چہرہ کہ دوش از برما رفت
آیا چہ خطا دید کہ از راہ خطا رفت

دوسرے روز حسن شاہ خواستگار معافی ہو کر جاتے ہیں۔

تا منفعل زد عجش بیجا د بیشش
می آرم اعتراف گناہ نہ بودہ را

خانم جان کے چہرے سے خفگی مترشح ہے۔

دوشش می آمد رخسارہ برافروختہ بود
تا کجا باز دل غمزدۂ سوختہ بود

اور لوگ موجود ہوتے ہیں۔ اظہار ندامت برملا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اپنے سر کا سایہ اس کے قدموں پر ڈالتے ہیں۔ کیا انشاء پردازی کا ایک دفتر بھی اس سے زیادہ اور موثر پیرائے میں احساس ندامت کو ظاہر کر سکتا ہے۔

وہ اس وقت سایہ پر لات رسید کر تی ہے سہ

رسم عاشق کشی و شیوۂ شہر آشوبی
جامۂ بود کہ بر قامت او دوختہ بود

مگر حسن شاہ کو عتاب میں الفت کی جھلک نظر آتی ہے۔

گرچہ می گفت کہ زارت بکشم میدیدم
کہ نہانش نظرے با من دل سوختہ بود

بہت جلد عارضی عتاب پر دائمی الفت غالب آجاتی ہے اور مصالحت ہو جاتی ہے۔

گر دست زلف مشکینت خطائے رفت رفت
ور ز ہندوئے شما بر ما جفائے رفت رفت

گر دل از غمزۂ دلدار بارے برد برد
در میان جان و جاناں ماجرائے رفت رفت

حسن شاہ طلبگار نظر عنایت ہوتے ہیں۔

آنانکہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ بظاہر بے اعتنائی مگر بباطن کمال دلجوئی سے ایک الائچی ان کی طرف پھینک دیتی ہے سہ

با صبا در چمن لالہ سحر می گفتم
گفت حافظ من و تو محرم این راز نئیم

بے معرفت مباش کہ در من یزید عشق
اہل نظر معاملہ با آشنا کنند

کتاب میں بعض خطوط بھی ہیں جو حسن شاہ اور خانم جان کی باہمی مراسلت کا نتیجہ ہیں۔ خطوط میں تصنع تکلف اور آورد کا رنگ غالب ہے۔ القاب مغلق پر شکوہ اور طول آوازہ الفاظ کی ایک طولانی زنجیر معلوم ہوتا ہے۔ عام اور سطحی خیالات ہیں جن کی آرائش و زیبائش پر ان کی انشاء پردازی نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے مگر ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ افسانہ حسن شاہ کے تخیل کی پیداوار ہوتا اور وہ انشاء پردازی کے میدان میں اپنے حسب مرضی تگ و تاز کر سکتے تو وہ کیسا دلچسپی سے عاری اور لفاظی سے معمور ہوتا۔ پنج رقعہ اور رسائل طغرا کی طرح بے مقصد لفاظی اور بے معنی سخن سازی اس کی امتیازی خصوصیت ہوتی۔ مگر ایک پاک ہستی کے پاک عشق کی بدولت اور پر خلوص غم کے طفیل سے انہی کے دماغ کی پیداوار ایک ادبی شاہکار ہے جو خاص و عام کے لئے مساوی طور پر ایک طاقتور کشش رکھتا ہے۔ وہ حقیقی معنی میں زندگی اور قیمتی تجربہ سے معمور زندگی کی ایک قاش ہے۔ کتاب ایک داستان غم ہے، دستاویز الم ہے اور غم و الم سے ہر انسان گھبراتا ہے مگر یہ عجیب اور بظاہر متضاد حقیقت ہے کہ غم انسان کے لئے جو کشش رکھتا ہے مسرت میں نہیں پائی جاتی۔ اکثر زندہ جاوید افسانے الم انگیز ہی ہیں۔ طربیہ سے تھوڑی دیر کے لئے انسان دل بہلا لیتا ہے مگر حزنیہ اس کے دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتا ہے اور اسے بلند سطح پر اٹھا دیتا ہے۔ اور اس کے جذبات کا تزکیہ کرتا ہے۔ مسرت کی کنہ تک انسان پہنچ جاتا ہے مگر غم کی کنہ اس کی دسترس سے باہر ہے۔ غم اگر حقیقی عظمت رکھتا ہے تو انسان اس کے آگے حیران اور ششدر اور مبہوت ہو کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے جذبی انداز میں احترام بھی شامل ہوتا ہے۔ وہ احترام جو ایک ماورائے فہم انسانی حقیقت ہی پیدا کر سکتی ہے۔ شاید مسرت کے مقام سے غم کا مقام قلب کائنات سے قریب تر ہے اس کا ثبوت حافظ کے اس نغمے سے سہ

چہ شہیداں کہ اندر این ہمہ خونیں کفناں
از مے لعل حکایت کن و سیمیں ذقناں

صلاح الدین

ادب اور معاش

ادب اور معاش کی طرح ادب اور بدمعاش بھی ایک مستقل مضمون کا موضوع بن سکتا ہے لیکن مجھے اعتماد ہے کہ ہمارے ادب کو بدمعاشی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ فرشتہ خیالی کی بجائے اگر نظام زندگی کے کسی شعبے پر خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کی بنیاد اور اس کی نشوونما معاشیات کے تابع ہوگی۔ بھوک نفس کشی کا ذریعہ سہی لیکن اس سے زندگی اپنی توانائی کھو بیٹھتی ہے۔ دمشق میں جب قحط سالی ہوئی تو عشق پیشہ دیوانے بھی پندار محبت کو بھول گئے تھے۔ غرض یہ کہ دنیا کے اور لوگوں کی طرح ادیبوں کو بھی ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جہاں انھیں معاشی سکون ہو۔ پراگندہ روزی رہ کر اگر وہ پراگندہ دل ہو جائیں تو ان کا انتشار خیال ایک ذہنی علالت سے کم نہیں ہوتا۔ ان ادیبوں کو چھوڑئیے جو ادبی کام کے لئے اپنے دوسرے معاشی ذرائع سے ایک فراغت حاصل کرتے ہیں بلکہ ان کے متعلق غور کیجئے جنھوں نے ادبی کام کو بحیثیت پیشہ اختیار کیا ہے۔ ایسے ادیبوں کے لئے 'پیشہ ور' کا لفظ استعمال کرنا زیادتی ہوگا۔ تاہم میں اظہار کی سہولت کے لئے معافی چاہتے ہوئے انہیں پیشہ ور ادیب ہی کہوں گا۔ مجھے کہنا یہ ہے اردو کا یہ دور بھی جس میں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں پیشہ ور ادیبوں کے لئے سازگار نہیں۔ ہماری صحافت اتنی مالدار نہیں اور نہ اس کے شعبے میں اتنی وسعت ہے کہ وہ بے روزگار ادیبوں کے لئے ایک معاشی طمانیت کا ذریعہ بن جائے۔ البتہ نشرگاہوں سے ایک حد تک ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اس کا اعتراف ایک دوست نے اپنے ایک مضمون میں کیا تھا جس کا عنوان "ادب اور معاش" تھا۔ اس کے خلاف ایک گوشے سے یہ آواز بلند ہوئی ہے کہ نشرگاہوں کے نزدیک مغنی لڑکیاں، ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ معاوضہ پانے کی مستحق قرار دی جاتی ہیں اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نشرگاہوں میں بر خود غلط اور حاسد کارکن جمع ہو گئے ہیں۔ تنقید کی اس تلخی میں کہاں تک صداقت ہے اس کے متعلق ہم اس لئے کچھ کہنا نہیں چاہتے کہ اس کے ڈانڈے ذاتیات سے ملے ہوئے ہیں۔ بعض وقت شخصی مایوسی، تنقید کو یک رخی بنا دیتی ہے۔ یہاں ایک اصول کے طور پر یہ دیکھنا ہے کہ نشرگاہوں میں ادیب کا کیا مقام ہے اور فنکار کا کیا مقام۔ موسیقی اور ادب دونوں کا تعلق فنون لطیفہ سے ہے اور اس کے باوجود کہ موسیقی اور رقص کے ذریعے تعمیر حیات میں عوامل کا کام لیا جا سکتا ہے میں ادب کو حسین تر آرٹ کہوں گا۔ نشرگاہیں بلاشبہ فنکار کو ادیب کے مقابلے میں کم معاوضہ دیتی ہیں لیکن وہ فنکار سے ادیب کے مقابلے میں زیادہ کام بھی لیتی ہیں۔ کوئی شاعر دو گھنٹوں تک اپنا کلام سنانا پسند کرے گا اور نہ سننے والے اسی توانائی اور تازگی سے دو گھنٹے تک اسے برداشت کر سکیں گے لیکن ایک فنکار مسلسل گھنٹوں گاتا ہے اور اسی طرح شوق سے سنا جاتا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ موسیقی جذبات انسانی پر راست اثر کرتی ہے لیکن شعر غور و فکر کا توسط ڈھونڈتا ہے۔ موسیقی دل کی راہ سے دماغ کو بیدار کرتی ہے لیکن شعر دماغ سے ہو کے دلوں کو گرماتا ہے۔ اس لئے عوام کا (جو ریڈیو سنتے ہیں) ذہنی معیار بہت کم شعر کی بلندی کا حریف ہو سکتا ہے۔ ریڈیو والوں کے نزدیک جس طرح فنکاروں کے معیاری اعتبار سے مختلف درجے ہیں، اسی طرح شاعروں کے مرتبوں کو بھی انھوں نے متعین کیا ہے۔ اسی معیار اور مرتبے کے اعتبار سے وہ معاوضے بھی ادا کرتے ہیں اور جب کوئی شاعر محض فنکار ہی ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو دو معیارات سے جانچنا پڑتا ہے۔ شاعر کی حیثیت سے وہ صفر ہوتا ہے اور فنکار کی حیثیت سے وہ آفتاب موسیقی نہیں ہوتا اس طرح اس کی حالت قابل رحم ہو جاتی ہے اور اس سے ہمدردی کرنے کو جی چاہتا ہے۔

میکش

بڑا آدمی کس کو کہتے ہیں

(ہندی نظم)

(۱)

اپنے کو جو کہے بڑا، وہ بڑا نہ جگ میں کہلاتا
اور لوگ جس کو کہتے ہیں بڑا وہی سمجھا جاتا
بڑا نہیں ہوتا کوئی بھی دھن دولت کے پانے سے
نہیں بڑا بنتا ہے نر[1] کچھ اونچے محل چنانے سے

(۲)

سچ پوچھو تو بڑا آدمی ہونا سب سے ٹیڑھا کام
بڑے گنوں کے بنا نہ ہوتا کبھی بڑے لوگوں میں نام
جو تم ہونا بڑا چاہتے، تو اس کا ہے ایک اُپائے[2]
دُربل[3]، دِین[4]، اناتھ[5] جنوں کی تن من، دھن سے کرو سہائے

(۳)

بھلے برے کا گیان نہ جس کو اہنکار[6] میں رہتا چور
اپنی آپ بڑائی کرتا، کرودھ، لوبھ جس میں بھرپور
ایسا منش[7] دھنی بھی ہو، تو بڑا نہ وہ کہلاوے گا
سمجھدار لوگوں کے آگے، چھوٹا سمجھا جاوے گا

(۴)

سدگن سے جو بڑے بنے ہیں، بڑے وہی کہلاتے ہیں
بدھیمان[8]، وِدوان جنوں میں سارے آدر پاتے ہیں
پڑھیے پاٹھک[9]! جو بڑا بننا چاہو تو تج کر سب انیائے[10]
سب سے چھوٹے بنو، یہی ہے سب سے سُندر سیدھی رائے[11]

مادھو پرشاد مصر

---

[1] آدمی [2] تدبیر [3] کمزور [4] مفلس [5] یتیم [6] انانیت [7] آدمی [8] عقلمند [9] قاری [10] ظلم، نا انصافی [11] ...

ادبی تنقید کی لفظیات

ہماری زبان میں صحیح قسم کے تنقیدی ادب کی ابتدا بہت بعد میں ہوئی ہے۔ اس لئے کہ ادب اور شاعری
سے متعلق جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان کے لئے زیادہ تر فارسی زبان کو استعمال کیا گیا ہے حالانکہ ان کتابوں
کے مصنف خود اردو کے شاعر تھے اور ان میں سے بعض آبرو، میر اور میر حسن جیسے باکمال استاد سخن بھی ہیں۔
یہ اصلیت ہے کہ بعض شعرا نے اپنے کلام میں نقد شعر سے متعلق بہت اہم بحثیں کی ہیں اور ان میں
سب سے پہلے گولکنڈہ کے ملک الشعرا ملا وجہی نے آج سے تقریباً ساڑھے تین سو سال قبل اپنی کتاب "قطب مشتری"
کے دیباچہ میں بڑی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے اور اس کے بعد کئی شاعروں مثلاً ابن نشاطی ملک الشعرا
نصرتی اور شاہ حاتم نے بھی اپنے کلام میں نقد شعر کے اصول پیش کئے لیکن یہ سب نظم کے پیرایہ میں تھا اور ضرورت شعری کی
خاطر ہمارے شعرا مجبور تھے کہ شاعری کے عام اسلوب سے سرگرداں نہ ہوں اسی لئے ادبی تنقید کی لفظیات کے ارتقا میں
ان کے اس قسم کے اشعار سے زیادہ مدد نہیں مل سکتی۔ مجبوراً ہمیں نثر کی کتابوں کی طرف توجہ کرنی پڑتی ہے۔

اردو نثر میں ہماری شاعری کا پہلا تذکرہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل مرزا علی لطف نے مرتب کیا تھا
اور یہ تذکرہ بھی ایک اور فارسی تذکرے "گلزار ابراہیم" پر مبنی ہے لیکن لطف نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ تالیف کی یعنی "گلزار ابراہیم"
کے مصنف نواب علی ابراہیم خاں کی مختصر اور مجمل عبارتوں کو مرزا علی لطف نے اپنی ذاتی معلومات اور تحقیق و کاوش کی بنا پر
اس شرح و بسط کے ساتھ اردو میں منتقل کیا ہے کہ اکثر و بیشتر مقامات پر جہاں علی ابراہیم صرف دو چار سطریں لکھ سکتے تھے علی لطف نے
دو چار صفحوں کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح علی لطف کا تذکرہ گلشن ہند بجائے خود ایک جداگانہ کتاب بن گیا ہے اور اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۱ء
سمجھا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں اگرچہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی تحریک پر فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں سہل اور آسان اردو نثر لکھنے
کا آغاز ہو چکا تھا لیکن علی لطف کی عبارتیں قدیم اردو نثر کی طرز میں بالعموم مقفیٰ اور مسجع ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی
دو عبارتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اردو میں پہلے پہلے ادبی تنقید کا کیا ڈھنگ تھا اور اس کی
لفظیات کس قسم کی اصطلاحوں پر مشتمل تھی۔

دہلی کے ایک ابتدائی شاعر محمد شاکر ناجی کے سلسلے میں علی لطف لکھتے ہیں :-

"محمد شاہ فردوس آرامگاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے اور بطور قدما کے طرز ایہام
میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا اور عالم کی ہجو
کرنا شعار رکھتا تھا۔ شیوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے"

اردو کے سرتاج شعرا میر تقی میر کی نسبت علی لطف نے یہ رائے ظاہر کی ہے:-

"غرض اس تردد سے زبان قلم کی اور خراش سے عارض رقم کی مراد یہ ہے کہ ناقدر دانی سے
اغنیا کی اور ناسمجھی سے اہل دنیا کی اب بازار سخن سازی اس درجہ کا سرد ہے اور ہوائے
شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد کہ میر سا شاعر جو کر سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے
خیال کا اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے
اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے"

یہ عبارتیں اصل میں اردو ادبی تنقید کا پہلا نمونہ ہیں اور ان کے مصنف نے فارسی عبارتوں کی تقلید میں

قافیے کا خاص طور پر لحاظ رکھا ہے اور اس لئے تصنع اور آورد کا دخل بہت زیادہ ہو گیا ہے ۔ اس کتاب کی ترتیب کے تقریباً پچاس سال بعد دہلی میں مولوی کریم الدین نے اردو شعرا کا ایک اور تذکرہ "طبقات شعرائے ہند" مرتب کیا۔ یہ بھی "گلشن ہند" کی طرح ایک اور کتاب پر مبنی ہے ۔لیکن اس میں بھی مولف نے اپنی جانب سے معلومات کا اضافہ کیا ہے یہ کتاب در اصل گارساں دتاسی کی " استوار دیلا لترا چور اینددی اے ایندوستانی " کا ایک آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں کریم الدین نے علی لطف کی طرح قافیوں اور سجع کا التزام نہیں کیا ۔بلکہ سادہ اور روزمرہ کی زبان استعمال کی ہے ۔ لیکن وہ بھی موجودہ ادبی اردو سے بہت مغائرت رکھتی ہے ۔مثال کے طور پر اس کی بھی دو عبارتیں پیش ہیں ۔پہلے محمد شاکر ناجی ہی کے متعلق مولوی کریم الدین کی تنقید ملاحظہ ہو ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"بہت شوخ مزاج تھا ہر کسی کی ہجو کرتا تھا۔ راہ چلتے سے لڑتا تھا۔ ہر ایک سے بھڑتا تھا۔ اس سے ہر ایک کو نجات پانی مشکل تھی ،بجائے ناجی کے اگر ہاجی تخلص اختیار کرتا تو میرے نزدیک بہت بہتر تھا ۔"

"گلشن ہند" سے میر تقی میر کے متعلق رائے اوپر نقل ہو چکی ہے اب کریم الدین کی زبان سے اسی باکمال شاعر کا حال معلوم کیجئے ۔

"شعر اس کا تمام شعرائے سابقین و متاخرین سے بے شک بہت اچھا ہے ۔ تمام فنون نظم وہ جانتا تھا۔خصوصاً غزل اور مثنوی اس کی سب سے بہتر ہے ۔آج کے زمانہ تک تمام شعراء اس کے اچھے ہونے میں شک نہیں کرتے ۔یہ شاعر واقع میں ایسا ہے کہ اگر اس کو بادشاہ شعراء کہیں تو بجا ہے ۔"

ان دو کتابوں کی عبارتوں کے مقابلے سے معلوم ہوگا کہ پچاس سال کے عرصے میں اردو کی ادبی تحریروں میں کیا فرق پیدا ہوا تھا اور ادبی تنقید کی لفظیات کس طرح تبدیل ہوتی جارہی تھی ۔ یہ ایک عجیب اتفاق کی بات ہے کہ طبقات شعرا کے بھی ٹھیک پچاس سال بعد محمد حسین آزاد نے " آب حیات " لکھی جو اردو کی تیسری تنقیدی کتاب سمجھی جاسکتی ہے ۔لیکن اس کتاب کی تالیف کے بعد ہی واقعہ یہ ہے کہ اردو تنقید نگاری صحیح معنوں میں عالم وجود میں آئی ۔ محمد حسین آزاد نے زبان میں ایسی شگفتگی اور الفاظ کے مطالب میں ایسی قطعیت پیدا کر دی کہ تنقید لکھنے والوں کا راستہ بہت کچھ صاف ہو گیا ۔ انھوں نے بھی محمد شاکر ناجی کی ہجو گوئی کا ذکر کیا ہے لیکن معلوم ہوگا کہ زبان میں کتنی علمیت پیدا ہو گئی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"تیز مزاج اور شوخ طبع بہت تھے ۔راہ چلتے سے الجھتے تھے اور جس کے گرد ہوتے تھے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا"

میر تقی میر کی نسبت آزاد نے جو رائے ظاہر کی ہے اس کا نمونہ پیش کرنا بھی ضروری ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوگا کہ آزاد نے ادبی تنقید کی لفظیات کو کتنا معین اور شائستہ بنا دیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"میر صاحب کی زبان شستہ ،کلام صاف ،بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں ۔دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورہ کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر دیتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں۔

اسی واسطے ان میں بہ نسبت اور شعرا کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے"

محمد حسین آزاد کے بعد حالی اور شبلی نے ادبی تنقید کی ایسی عمدہ خدمت کی کہ اب یہ ایک ایسی شاہراہ بن گئی ہے کہ جس پر ہر کس و ناکس بلا خوف و خطر چل سکتا ہے۔ حالی اردو کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی کی تنقیدی کتب و مضامین کا اردو میں چربہ اتارا۔ ان کا مقدمۂ شعر و شاعری اردو ادبی تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں یورپ کے شاعروں اور ناقدوں کے خیالات سے استفادہ کیا گیا ہے اور ادبی تنقید کی لفظیات اور اصول کے متعین کرنے میں مدد لی گئی ہے۔ حالی کا اسلوب بیان آزاد اور شبلی دونوں کے مقابلہ میں زیادہ سہل اور سادہ تھا اور اسی اسلوب میں انھوں نے مقدمۂ شعر و شاعری کے علاوہ "حیات سعدی" "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی بلند پایہ کتابیں مرتب کیں جن کے بعض حصے ادبی تنقید کے شہ پارے سمجھے جاتے ہیں۔

شبلی کا اسلوب بیان اپنی رنگینی اور عالمانہ شوکت کے باعث اردو کے تنقیدی ادب میں خاص کر قابل ذکر ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شبلی کے بعد سے اب تک اردو کے جتنے انشا پردازوں نے بھی تنقیدی ادب لکھنے کی کوشش کی وہ سب شبلی ہی کے اسلوب سے متاثر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے نہ تو محمد حسین آزاد کی طرح روز مرہ اور محاورہ کی چاشنی کے ذریعے سے اپنی تحریروں کو بامزہ بنانے کی کوشش کی اور نہ حالی کی طرح اتنی سادگی اور سلاست اختیار کی کہ عبارتیں بے رنگ ہو جائیں۔ انھوں نے ایک درمیانی راستہ اختیار کیا اور صحیح معنوں میں اس علمی و ادبی تحریر کو معراج کمال پر پہنچا دیا جو آج اردو کی ایک معیاری علمی تحریر سمجھی جاتی ہے اور جس میں عہد حاضر کے بڑے سے بڑے ادیب اور نقاد مثلاً مولوی عبدالحق، مولانا سلیمان ندوی، نیاز فتحپوری، ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریا بادی اور قاضی عبدالغفار، اعلیٰ سے اعلیٰ تنقیدی مضامین اور کتابیں تحریر کر رہے ہیں۔

شبلی کی شعر العجم اور موازنۂ شعر و شاعری اردو کی وہ تنقیدی کتابیں ہیں جن کا اسلوب اور زبان ابھی عرصے تک نمونے کا کام دیتے رہیں گے۔ شبلی اور حالی کے اسلوب میں جو فرق ہے وہ ان مثالوں کے ذریعے سے واضح ہو سکے گا۔

حالی اپنے مقدمۂ شعر و شاعری میں اردو غزل کے عشقیہ مضامین کی بحث میں لکھتے ہیں:-

"ذوق کی غزل میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے۔ مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں۔ ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روز مرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔ داغ کی غزل میں باوجود زبان کی صفائی، روز مرہ کی پابندی اور محاورہ کی بہتات کے طرز ادا میں ایک شوخی اور بانکپن ہے، جو اسی شخص کا حصہ ہے"

شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں صنائع و بدائع کی سرخی کے تحت میر انیس کی یوں مدافعت کی ہے۔

"میر انیس جس زمانے میں تھے شاعری کا مدار صنائع و بدائع پر رہ گیا تھا۔ مبالغہ، ایہام اور مناسبات لفظی یہی چیزیں شاعری کا کمال خیال کی جاتی تھیں۔ میر انیس کو انہی لوگوں میں رہنا سہنا تھا۔ انہی سے داد سخن لینی تھی اور سچ تو یہ ہے کہ انہی کی قدر دانی پر معاش اور ضروریات زندگی کا انحصار تھا۔ ایسی حالت میں کیونکر ممکن تھا کہ وہ

زمانہ کی حکومت سے آزاد رہتے۔ وہ جانتے تھے کہ جس شاعری کو وہ منضبط کرنا چاہتے ہیں صنائع و بدائع اس کے چہرے کے داغ ہیں لیکن انھوں نے مجبوراً اس کو گوارا کیا۔"

اگرچہ دو چار سطروں کے اقتباسات سے ٹھیک طور پر پتہ نہیں چل سکتا کہ ادبی تنقید کی نظریات میں کس طرح ارتقاء ہوتا چلا آرہا ہے تاہم ان خیالوں سے ایک سرسری اندازہ ہو سکتا ہے کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کے عرصہ میں ادبی تنقید کا اسلوب اور اس کی نظریات کس طرح واضح ہوتی آرہی ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر بجائے خود ایک مبسوط کتاب لکھی جا سکتی ہے اور ممکن ہے کہ آئندہ ہماری زبان کا کوئی صاحب ذوق نوجوان اس جانب پر محنت کر کے شرح و بسط کے ساتھ ان تمام مدارج کو قلمبند کرے جو اردو میں تنقید نگاری کے نشو و نما کا باعث ہوئے اور جن کی بنا پر آج ہماری زبان اس قابل ہے کہ اس میں اچھی سے اچھی تنقیدی کتابیں اور مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔

اسی سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جب سے اردو میں ترقی پسند ادب کی تحریک شروع ہوئی ہے ہماری ادبی تنقید کی نظریات میں معتدبہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور چونکہ یہ تحریک ابھی ایک عبوری حیثیت رکھتی ہے اور اس کے لکھنے والے مغربی زبانوں کی بعض علمی و فنی اصطلاحات کے لئے ہر وقت نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کر رہے ہیں اس لئے جب تک یہ عبوری دور ختم نہ ہو اور ترقی پسند ادیبوں میں حالی اور شبلی جیسے اعلیٰ پایہ کے نقاد پیدا نہ ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہماری ادبی تنقید کی نظریات میں کس حد تک اضافہ ہوا اور یہ اضافہ ہمارے ادب اور تنقید پر کس قسم کا اثر ڈالے گا۔

سید محی الدین قادری زور

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا۔ ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند، جامعہ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کیا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۴۷۲) قیمت ۸ ؎

سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور ان کے فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد دلچسپ انداز میں قلمبند فرمایا ہے اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔

تذکرہ گلشن اردو کے محققین کے لئے یہ تحفہ کم نہیں ہے۔

صفحات ۱۲۰ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت ۱۲؍

گلستاں کی راہیں

ادھر آؤ ہم سے ملاؤ نگاہیں
بلاتی ہیں تم کو محبت کی راہیں

نہ آئے کبھی بھول کر بھی نہ آئے
ترستی رہیں ایک مدت سے بانہیں

ٹھکانا بھی ہے میری محرومیوں کا
نگاہوں میں حسرت لبوں پر ہیں آہیں

لبوں میں کھٹک ہے تو دل میں تڑپ ہے
تمہاری ہیں یہ چشم و دل بارگاہیں

خراماں خراماں جو تم آ رہی تھیں
جھکالی تھی نرگس نے اپنی نگاہیں

یہی مشغلے اب ہیں بے تابیوں کے
کبھی اشکباری کبھی سرد آہیں

کرشمہ تمہاری نگاہوں کا ہے یہ
بہاروں میں ویران ہیں خانقاہیں

جو تاباں تھے اپنی مقدر کے تارے
نہ دن کو تھے نالے نہ شب کو تھیں آہیں

نگاہوں میں میری جو تم بس رہی ہو
تمناؤں کی دنیا ہے میری نگاہیں

چٹکتے ہیں غنچے بکھرتی ہے نکہت
بہت منتظر ہیں گلستاں کی راہیں

عزیز احمد

اشنان

سحر افق سے نکل رہی تھی — جوانی شب کی پگھل رہی تھی
نسیم بہک بہک کے مچل رہی تھی — تھکی دنیا سنبھل رہی تھی

فضا میں ہوتا تھا حل دھندلکا
کہر تھا شبنم کا ہلکا ہلکا

ان آخری ساعتوں میں شب کی — نکھر رہی تھی کنواری ندی
ندی پہ اک نوجوان لڑکی — نہا کے زلفیں جھٹک رہی تھی

کلائی میں چوڑی بج رہی تھی
جوانی بے خوف سج رہی تھی

نگاہ میں بادۂ شبانہ — جبیں پہ بجلی کا آشیانہ
لبوں کی خاموشیاں غنا — ہر ایک انداز شاعرانہ

اشارہ فطرت کا پا گیا میں
کچھ اور نزدیک آ گیا میں

مجھے جو اس نے قریب پایا — نظر جھکایا، بدن چرایا
سمجھ میں کچھ اور تو نہ آیا — جھجک کے فوراً گھڑا اٹھایا

سمٹی کچھ اس ادا سے ساری
سمٹ گئی کائنات ساری

علی احمد

سوال و جواب

سوال: ۔ جب ہم سوتے ہیں تو کیا ہمارا دماغ بھی سوجاتا ہے ؟ ص۔ا

جواب ۔ ہمارے دماغ کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ہمیشہ بیدار رہتا ہے خواہ ہم سو رہے ہوں یا جاگتے ہوں، اور اگر یہ حصہ اپنا کام کرنا بند کردے اور سو جائے تو ایسی نیند اور موت میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

دماغ کا یہ ایسا حصہ جس کے متعلق ہم کو راست کوئی احساس نہیں ہوتا اور نہ اس کو ادراک یا عقل سے کوئی تعلق ہوتا ہے، تمام دماغی حصوں کے نیچے واقع ہوتا ہے اور حرکت قلب اور تنفس پر قابو رکھتا ہے۔ دماغ کا سب سے بالائی حصہ جو ادراک اور قوت غور و فکر کا مبدا ہے، سوائے کم عمر یا دودھ پیتے بچوں کے مکمل طور پر کبھی نہیں سوتا، لیکن باقی تمام دماغ بالکل اسی طرح آرام کرتا ہے جس طرح کہ ہمارے جسم کے دیگر حصے۔ نیند جس قدر گہری ہوگی اسی قدر صحت کے لئے اہم اور قیمتی ہوگی۔

خواب اور سپنے اس بات کی دلیل ہیں کہ ہماری نیند کے وقت بھی دماغ کے کچھ حصے کام کرتے رہتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ہم کئی تجربوں سے یہ بھی ثابت کرسکتے ہیں کہ ہمارے سو جانے کے بعد دماغ کا بالائی حصہ بغیر کسی رکاوٹ کے مصروف رہتا ہے، مثلاً اکثر ایسا ہوا ہے کہ رات میں کسی سائینس داں نے کام کرتے کرتے کسی تجربے کو تشنہ چھوڑ رکھا ہو، کسی شاعر نے کوئی نظم ادھوری رکھ دی ہو، کسی مہندس نے کوئی ریاضی کا مسئلہ حل کئے بغیر ہی رکھ دیا ہو، اور صبح ہوتے ہوتے سائینس داں اپنا تجربہ ٹھیک کرلیتا، شاعر اپنی نظم مکمل کرلیتا اور مہندس اپنا مسئلہ حل کرچکتا ہے، ظاہر ہے کہ جسم کے دیگر حصوں کے سوتے وقت دماغ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ دماغ کو آرام کی ضرورت نہیں، انسانی جسم میں دماغ ایک موٹر کار کی بیاٹری کے مماثل ہے اور اس بیاٹری کو ہر مرتبہ چارج ہوتے رہنا چاہئے ورنہ وہ کسی کام کی نہیں رہتی، دماغ کو سکون اور آرام پہونچانا دراصل اس کو دوبارہ برقانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوکر اٹھنے کے بعد ہم خود کو بہت ہی بشاش محسوس کرتے ہیں۔ کہا گیا ہے کہ دنیا میں سب سے طاقتور مفرح شئے نیند ہے اور یہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔

ن۔ھ

معلّم بالغاں

از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے۔ ایم ایڈ

تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جارہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ادارہ کی طرف سے شایع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغاں کی اہمیت، بالغوں کی نفسیات، طریقۂ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ۱۲؍

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل خیرت آباد۔ حیدرآباد دکن

کالے پانی کا مفرور قیدی

(بہ سلسلۂ گزشتہ)

شاید مارسل کو اسی موقع کی تلاش تھی۔ وہ عقاب کی طرح جیسی پر جھپٹا اور اس سے پیشتر کہ بے چارا اس خطرے سے آگاہ ہوتا، تیز چھرا اس کے قلب کو چیرتا ہوا نکل گیا، جیسی کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر آ رہا اور ایک ہی تشنجی جھٹکے کے بعد اس کا جسم بے حرکت ہو گیا، اس قدر زمانہ دراز کے بعد آج بھی اس بھیانک سین کی ہر ایک تفصیل میرے ذہن میں اس طرح محفوظ ہے گویا یہ واقعہ کل ہی ہوا تھا۔

مارسل کے بھائی ڈی ڈے نے تحریک کی کہ رات کے کھانے پر جیسی کی ٹانگ کا بھونا ہوا گوشت ضرور ہونا چاہیے اور اس تحریک کی مارسیل نے بھی فوراً تائید کی، اس نے کہا " جیسی ایک درندہ تھا اور درندے کا گوشت کھایا جا سکتا ہے"

دوسروں نے بھی اس کا ساتھ دیا، چنانچہ آدھ گھنٹے کے اندر اندر جیسی کا جگر ایک لکڑی میں چھید کر کباب کیا جانے لگا اور اس مکروہ پکوان کے لئے جیسی کی ٹانگ ہی کو جلا کر آگ تیار کی گئی، رات میں جب سب مل کر اس کو کھانے کے لئے بیٹھ گئے تو مجھے بھی طوعاً و کرہاً اس میں شریک ہو جانا پڑا اس لئے کہ انکار یا اعتراض کی مجھ میں جرأت نہ تھی اور نہ اس کا موقع ہی تھا۔

ان واقعات کا سب پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ رات میں کسی نے بات چیت کی کوشش تک نہ کی، ہمارے ساتھیوں میں سب سے شقی القلب آدمی بھی اس منحوس دن کے ہیبت ناک واقعات کو اپنے ذہن سے بھلا نہ سکتا تھا، آزادی کی اس راہ میں ہم تین لاشوں کو اپنے پیچھے چھوڑ رہے تھے،

دو دن کے مسلسل سفر کے بعد ہم افتاں و خیزاں امریکی ہندیوں کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں داخل ہوئے، امریکیوں کی یہ آبادی دریائے مارونی کے کنارے واقع تھی اور یہاں ہمیں کھانے پینے کو کچھ مل بھی گیا لیکن سفر کی تکان سے چور ہو کر جب ہم بے خبر سو گئے تو ان ظالموں نے ہماری آمد کی اطلاع ولندیزی حاکموں کو دے دی چنانچہ جب آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ چار ولندیزی سپاہی پستول ہاتھ میں لئے ہماری نگرانی کر رہے ہیں۔

اس مرتبہ مجھے پھر تادیبی کیمپ بھیج دیا گیا، جہاں میرا نام غیر اصلاح پذیر اشخاص کی فہرست میں درج ہو گیا قیدیوں کے اس بدقسمت گروہ کا تادیبی کیمپ چارویں میں واقع تھا جس جگہ سال کے بارہ مہینے ملیریا اور پیچش کا دور دورہ رہتا۔ اور جہاں تقریباً مادر زاد ننگے قیدی نیم وحشی انسانوں کی صورت میں مچھروں اور دوسرے زہریلے کیڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیئے جاتے۔ لیکن اس مرتبہ پھر اللہ نے مجھ پر فضل کیا۔ اس لئے کہ ایک نئے گورنر کی وجہ سے جسے میں نے نہایت رقت آمیز خط لکھا تھا مجھے اسّی دنوں کی سخت عقوبت کے بعد ایک اچھے مقام پر بھیج دیا گیا۔

فرانسیسی گیانا میں میری بود و باش کے دوران میں میں نے مزید دو مرتبہ بھاگ نکلنے کی ناکام کوششیں کیں۔ چنانچہ اس کی پاداش میں مجھے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا ——— رائل اس کالے پانی کے ان تین خوفناک جزیروں میں سے ایک ہے جہاں جا کر کوئی قیدی زندہ واپس آنے کی توقع نہیں کرتے اس سلسلہ کے دوسرے دو سینٹ جوزف اور ڈیولس آئیلانڈ (شیطان کا جزیرہ) ہیں جہاں سخت عادی مجرم اور قومی غدار رکھے جاتے ہیں۔

رائل کے جزیرہ میں مجھے لاکا سے اوتو کی اس مشہور بارک میں داخل کیا گیا جہاں تعزیری بستی کے چھٹے ہوئے قیدی رکھے جاتے ہیں۔ ان بارکوں کی زندگی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ان کا صحن تقریباً ہر روز

تازہ خون سے آلود رہتا۔ قتل اور خون یہاں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور نہ کوئی اس کی پرواہ کرتا تھا، ہر روز صبح قید خانے کے محافظ صحن میں جھانک کر دیکھتے کہ کوئی نعش تو پڑی ہوئی نہیں ہے اور اگر انھیں کوئی مردہ مل جاتا تو کھینچ کر چپ چاپ سمندر میں پھینک آتے، اس لئے کہ ان سیکڑوں قتل کی وارداتوں میں جو آئے دن ہوتی رہتیں کبھی کوئی ثبوت مہیا کرتا۔ اکثر رات گئے اپنے کمرے کو واپس ہوتے ہوئے اندھیرے میں میں نے ایسی لاشیں روندی ہیں جن کے جسم سے ابھی تک گرم گرم خون جاری تھا اور اکثر میں نے اپنے برہنہ پیروں سے چپچپے خون کے دھبے چھڑائے ہیں۔

ان جزیروں میں کسی باہر کے آدمی کو آنے کی اجازت نہیں ہے چنانچہ سوائے بستی کے حکام کے دوسرے بہت کم ـــ لوگوں نے اس جزیرہ کو دیکھا ہے۔ یہاں میں نے وہ عقوبتیں برداشت کیں جنھیں الفاظ بیان نہیں کر سکتے، پھر بھی میری زندگی باقی تھی اس لئے کہ گو میرے اطراف لوگ دھڑا دھڑ مرتے رہے اور خون کی ندیاں بہتی رہیں، لیکن میں جیتا ہی رہا۔

اس کے بعد سینٹ جوزف کے جزیرہ میں مجھے قید تنہائی کی سزا ملی، ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں جسے یہاں کے قیدی "سوکھی سولی" کہتے تھے مجھے رکھا گیا تھا، روشنی اور دھوپ کے سوا اس غار میں ایک قیدی دن کے (۲۳) گھنٹے پڑا سڑتا ہے۔ نہ یہاں اسے کوئی کام دیا جاتا ہے نہ کوئی کتاب پڑھنے کو ملتی ہے اور سوائے سمندر کی موجوں کی مسلسل سسکیوں یا کسی بدنصیب قیدی کی جگر خراش چیخوں کے اس کے کان کوئی اور آواز نہیں سن سکتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اچھے خاصے ہوشمند انسانوں کو کچھ دنوں میں مخبوط الحواس بنا دیا جاتا ہے تاکہ پریس یا اعلیٰ فرانسیسی حکام تک ظلم و ستم کی یہ رپورٹیں پہونچ ہی نہ سکیں اور اگر بفرض محال ان کی رسائی بھی ہو جائے تو وہ بآسانی دیوانوں کی وہم آلود داستانیں ثابت کی جاسکیں۔

اسی تادیبی قید خانے میں مسلسل چھے سال گزارنے کے بعد نومبر ۱۹۲۶ء میں مجھے پہلی مرتبہ کاکین منتقل کردیا گیا۔ اس عرصے میں مجھے کالے پانی کی اس زندگی کا کافی تجربہ ہوچکا تھا اس کے علاوہ یہاں کے نظام حکومت کے اندرونی حالات سے بھی میں بہت کچھ واقف ہوگیا تھا، مجھے معلوم تھا کہ کس طرح صرف (۲۵) فرانک کی رشوت کے عوض قیدی بہت سا عیش و آرام حاصل کرسکتے تھے۔ کس طرح یہاں کے عہدہ دار سرکاری کپڑوں اور کمبلوں کو غیروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ـــــــ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ سال کے بارہ مہینے بے چارے قیدیوں کو تقریباً برہنہ رہنا پڑتا ـــــــ میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس بستی کے محافظ قیدیوں کے تام سے کیسی رنگ رلیاں منانے کے عادی تھے، اور سچ تو یہ ہے کہ اس قید خانے کی سختیوں سے کہیں زیادہ یہی تکلیف دہ مشاہدے مجھے بغاوت پر آمادہ کرتے تھے، کیونکہ عادی سے عادی مجرم کا دل بھی ان ذلیل حرکتوں کو دیکھ کر جو بے یار و مددگار قیدیوں کے ساتھ روا رکھی جاتیں، برافروختہ ہوجاتا تھا، کاکین کو دیکھنا گویا انسانیت کے تنزل یا اس دنیا کے اسفل السافلین کو دیکھنا ہے۔ یہ ایک ایسی نوآبادی کا صدر مقام ہے جو فرانسیسی مقبوضات میں سب سے قدیم ہوتے ہوئے بھی سوائے سکھائے ہوئے تتلیوں یا بھُس بھرے ہوئے بندروں کے کسی چیز کی تجارت نہیں کرسکتی، نپولین سوم کے زمانے میں جب اس نوآبادی کو بسایا گیا تو خیال یہ تھا کہ اپنی مدت قید گزارنے کے بعد قیدی اس نوآبادی میں آزاد کردئے جائیں گے اور انھیں ایسی سہولتیں بہم پہونچائی جاسکیں گی کہ وہ شادی بیاہ کرکے گھر سنسار جوڑلیں اور ان کی طاقتور اولاد سے فرانس کا یہ مقبوضہ رفتہ رفتہ ترقی کرتا جائے۔

اسی منشاء کے تحت سزائے کرر کا قانون نافذ کیا گیا تھا یعنی یہ کہ ہر مجرم کو قید سے آزاد ہونے کے بعد مساوی مدت تک ان نوآبادیوں میں جلاوطن ہو کر رہنا پڑتا تھا۔

لیکن یہ ایک خیال خام ہی رہا۔ اس لئے کہ نوآبادی کا کوئی آدمی ان قیدیوں سے کسی قسم کا واسطہ رکھنا ہی نہیں چاہتا تھا حتیٰ کہ یہاں کی دیسی عورتیں تک ان مجرموں سے شادی کرنے کو اپنی توہین خیال کرتی تھیں، فرانس کے ان من چلے تاجروں کو بھی جو دیگر دور دراز ممالک میں جا کر قسمت آزمائی کرتے اس نوآبادی کے نام سے نفرت تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں میں یہ حصۂ ملک نکبت بہیمیت اور بے آئینی کے لئے مثال ہو گیا۔

آج بھی فرانسیسی گیانا، بے کاری، بے راہ روی اور افلاس کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہے اس قدر وسیع ملک ہوتے ہوئے بھی یہاں پچاس میل سے کم سڑکیں ہیں نہ کوئی تجارت ہے نہ کسی صنعت کا نام و نشان ہے نہ کوئی فیکٹری ہے نہ کارخانہ، ہر مہینہ ایک سامان سے لدا ہوا جہاز اس کے ساحل آکر ٹھیرتا ہے اور اپنا بار اتار کر خالی ہی واپس چلا جاتا ہے۔

ایک زمانہ قبل سے ہی فرانسیسی حکومت کو اس نوآبادی کی ناکامی کا علم ہو چکا ہے چنانچہ ہر وہ گورنر جو یہاں بھیجا جاتا ہے اس کو ترقی دینے کی مقدور بھر کوشش کرتا، بعض کاشی اگانا چاہتے تو بعض کوکو پیدا کرنے کی سعی کرتے اور کئی گورنروں نے تو یہاں تک ہاتھ پاؤں مارے کہ فرانس سے لوگوں کو ترغیبیں دے دے کر بلوایا۔ لیکن یہ تمام کوششیں ہمیشہ نقش برآب ہی رہیں۔ اس دارالخلافے کی آبادی تقریباً گیارہ ہزار ہے جس میں (۰۰) کے قریب قیدی اور (۳۰۰) آزاد مجرم ہیں۔ قیدیوں کو بظاہر کافی آزادی میسر ہے اس لئے کہ دن بھر وہ شہر میں مارے مارے پھرتے ہیں لیکن رات کو واپس آکر انھیں کال کوٹھڑیوں میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔

جزیرے میں اپنی بود و باش کے معاملات میں وہاں کے مفصل حالات قلم بند کرتا رہا، اور بعد میں ان کاغذات کو نوآبادی کے نو وارد گورنر موسیو سیڈو کے یہاں رازمیں روانہ کر دیا، میری یہ محنت اکارت نہیں گئی اس لئے کہ ان کاغذات کو دیکھ کر نئے گورنر کو مجھ سے دلچسپی ہو گئی اور جب مجھے کاٹین منتقل کر دیا گیا تو اس نے ازراہ عنایت نوآبادی کے محافظ خانے کی ترتیب کا کام میرے ذمے کر دیا۔

اس دفتر میں میں نے کئی ماہ تک سخت محنت سے کام کیا، ہزاروں مثلیں دیکھیں، کئی کتابوں، مضمونوں اور مجرموں کی رپورٹوں کا تفصیلی مطالعہ کیا، نظم و نسق کی روداد، قیدیوں کی غذا، لباس یا دیگر سہولتوں کی فہرست اور طبی امداد کے بجٹ کی تفصیلیں پڑھیں اور ان سب سے جی کھول کر استفادہ کیا اور وہ مواد حاصل کیا جو بعد میں اس جہنم آباد کے رازہائے درون پردہ کے طشت ازبام کرنے میں میرے کام آیا۔

میں گورنر سیڈو کا بڑا مداح تھا، اپنے زمانہ حکومت میں نوآبادی کی حالت سدھارنے کے لئے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حاکم کر سکتا تھا، لیکن نوآبادی کی کمیٹی ہر قدم پر اس کی راہ میں نئی رکاوٹیں پیدا کرتی رہتی تھی، خود میرے لئے اس کا وجود ایک رحمت سے کم نہ تھا، اس لئے کہ اس کے تبادلے کے بعد ہی مجھے دوبارہ قید تنہائی کی بقیہ سزا بھگتنے کے لئے رائل کے جزیرے کو بھیج دیا گیا یہاں میں نے اپنی قید کے سب سے بدترین تین سال گزارے۔

ہر شام جب فضاء خاموش ہونے لگتی تو میں اندازہ لگا لیتا کہ رات آرہی ہے۔ اس لئے کہ اس غار نما کوٹھڑی میں جہاں ہر وقت تقریباً اندھیرا ہی رہتا، روشنی سے صبح یا شام کا اندازہ لگانا مشکل تھا، چنانچہ ہر روز جب سمندری پرندوں کی چیخوں سے مجھے آفتاب کے طلوع ہونے کا پتہ لگ جاتا تو میں کوٹھڑی کی دیوار پر اپنے ناخن سے ایک نشان بنا دیتا،

تاکہ اس طرح تاریخوں کا حساب رکھنے میں سہولت ہو سکے۔

۳ر نومبر ۱۹۳۴ء کو یعنی اس جہنم آباد میں میرے داخل ہونے کے ٹھیک پندرہ سال بعد کمرے کے زنگ آلود قفل میں مجھے کسی کے کنجی لگانے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور محافظ نہایت لاپروائی کے ساتھ ایک دستاویز میرے حوالے کر کے چلا گیا، لیکن اندھیرے میں رہتے رہتے میری بصارت اس قدر کمزور ہوگئی تھی کہ میں اسے مطلق نہ پڑھ سکا، بہرحال معلوم ہوا کہ اس دستاویز کی رو سے میں آئندہ ایک "آزاد مجرم" تھا۔

آزاد مجرم! یعنی میں بے گھر بے در راستہ کے آوارہ کتے کی طرح زندہ رہنے کے لئے آزاد تھا، جنگل جنگل مارے مارے پھرنے اور درندوں کا شکار بننے کے لئے آزاد تھا، لیکن نو آبادی کی حدود اور کائین کے دروازے دس سال کے لئے مجھ پر بند تھے ۔۔۔ میں آزاد تھا ۔۔۔ مگر دنیا میں نہ میرے لئے آذوقے کا کوئی سہارا تھا ۔۔۔ نہ زندہ رہنے کی کوئی سبیل۔

میں نے بھی وہی پیشے اختیار کئے جو آزاد مجرم اپنے پیٹ کی آگ بجھانے اختیار کرتے ہیں۔ میں نے جنگل میں ایک جھونپڑا ڈال لیا اور یہاں رہ کر میں یا تو تیتریاں پکڑتا یا جنگل کے درختوں سے ربر جمع کر کے اس سے طرح طرح کے کھلونے تیار کرتا اور انھیں شہر کے کباڑیوں کے ہاتھ بیچ ڈالتا، اس نیم وحشی زندگی میں مجھ پر کیا کیا گزری اس کا اندازہ کچھ میں ہی کرسکتا ہوں، بڑے دن کے تہوار پر اور کچھ نہ ملا تو میں نے طوطے بھون لئے، آرماڈی لو کے کباب پر سال نو کا جشن اور ایسٹر کی عید پام کے گودے اور گوہ کے قلیے پر منائی، میرا جسم گوچڑیوں اور جوؤں کا مستقل کیمپ بن چکا تھا اور میرے پیر جونکوں کے زخموں سے چھلنی ہو چکے تھے۔

روپے کی مجھے سخت ضرورت تھی اور میرے پاس ایک حبہ بھی نہیں تھا، اس لئے کہ اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لئے کم از کم ایک ڈونگی تو ضروری تھی اور ایک معمولی ڈونگی بھی سو فرانک سے کم میں نہ مل سکتی تھی اور پھر سمندر میں پندرہ روز کے راشن کے لئے پچاس فرانک تو خرچ ہو ہی جاتے۔

ایک روز میں سینٹ لارین میں بیٹھا ہوا اپنی قسمت کو رو رہا تھا کہ ایک سیاح نے جو موٹی سن ہیٹ پہنے ہوئے تھا، اشارے سے مجھے بلایا۔

"کیا میاں کوئی ایسا قیدی مجھے مل سکتا ہے جو انگریزی بات کرسکتا ہو؟" اس نے ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں مجھ سے پوچھا۔

"تھوڑی بہت تو میں بھی بول لیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

"میں اس جزیرے میں ایک قیدی مسمی بل بی نائے کو تلاش کر رہا ہوں" اس نے انگریزی میں بات کرتے ہوئے دریافت کیا "یہ وہ شخص ہے جس کا تذکرہ "شیطانی جزیرے" کی مصنفہ بلاٹر نائل نے اپنی کتاب میں کیا ہے (بات یہ ہے کہ کئی سال قبل جب اس خاتون نے اس جزیرے کی سیاحت کی تھی تو میں نے اپنے روزناموں کے مسودے چند فرانک کے عوض اس کے ہاتھ فروخت کر دئے تھے، چنانچہ اس مشہور ناول کی بنیادیں انھیں روزناموں پر رکھی گئی تھیں)

میں نے کہا "کہئے میرا نام ہی بل بی نائے ہے؟"

معلوم ہوا کہ یہ اجنبی کسی امریکی فلم کمپنی کے کرتا دھرتاؤں میں سے تھا، اور یہ لوگ ایک ایسا فلم بنانے کی دھن میں تھے جس کا قصہ اس شیطانی جزیرے سے متعلق تھا اور اس میں ایک ایسا منظر بھی آتا تھا جس میں

ایک قیدی اس جہنم قید سے جان بچا کر نکل بھاگتا تھا چنانچہ فلم کمپنی کے دیگر عہدہ داروں نے اس آدمی کو یہاں اس لئے بھیجا تھا کہ وہ جزیرے کے حالات سے ذاتی طور پر واقفیت حاصل کر سکے۔

پھر وہ مجھ سے پوچھنے لگا "اگر کوئی قیدی اس مقام سے بھاگ نکلے تو وہ کونسا راستہ اختیار کرے گا۔ اور اس اقدام میں اُسے کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی" وغیرہ وغیرہ۔

رات بھر میں اس کے سوالات کا جواب دیتا رہا، اس دوران میں میں نے اس آدمی کے لئے قید خانوں کے نقشے، بارکوں کے سرسری خاکے، سزا کے تختوں کی تصویریں کھینچ کر دیں۔ غرض جس قدر بھی معلومات مجھ سے ہو سکتی تھیں بہم پہنچائیں۔ ان کے ساتھ ساتھ میں اپنی پچھلی فراری کی ناکام کوششوں اور ذاتی تجربوں کو بھی بیان کرتا جاتا تھا، جن کا اقتباس وہ اپنی ڈائری میں کرتا جاتا تھا۔

جب اجالا ہوا تو میں نے دیکھا کہ اس کا طیارہ جو اسے اس جزیرے میں لایا تھا اُسے لے جانے کے لئے کھڑا ہے، لیکن جانے سے پہلے اس نے میرے ہاتھ میں (۲۰۰) ڈالر کے نوٹ رکھ دئے ——— یہ روپیہ میں اپنی فراری کے چوتھے اقدام میں صرف کرنا چاہتا تھا۔

"اس مرتبہ تو میں آزاد ہو کر ہی رہوں گا۔ نہ جانے کتنی بار میں نے اس جملے کو اپنے دل میں دہرایا۔

کئی دنوں تک میں اپنے ساتھیوں کی تلاش میں قید خانے کی بستی کا کونا کونا چھانتا رہا، مجھے ایسے لوگوں کی تلاش تھی جو نہ صرف جسمانی حیثیت سے فولاد کی طرح مضبوط ہوں بلکہ جن کے دلوں میں آزادی کی لگن بھی آگ کی طرح بھڑک رہی ہو، بہر حال بڑی تلاش کے بعد مجھے پانچ ایسے ساتھی مل گئے جو میری مطلب کے تھے اور خوش قسمتی سے ان میں کا ایک آدمی جہاں دیدہ ملاح بھی تھا۔

۲/ مارچ ۱۹۳۵ء کی شب کو ہم ایک مقررہ مقام پر جمع ہوئے اور رات کی تاریکی میں ساحل کے ایک ویران مقام کی جانب روانہ ہوگئے، جہاں ایک چینی تاجر نے ہمارے لئے ناؤ کے چھپا رکھنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن جب ہم اس جگہ پہونچے تو ہم نے دیکھا کہ یہاں ایک بہت چھوٹی سی ڈونگی جو مطلوبہ ناؤ کی نصف بھی نہ ہوتی تھی، پڑی ہوئی ہے اور اس میں رکھا ہوا سامان بھی اتنا نہیں ہے جتنے کے لئے ہم سے روپیہ لیا گیا تھا، ظاہر ہے کہ اس بدمعاش نے ہمیں دھوکا دیا تھا اور عین اس وقت جب ہمارے لئے قدم پیچھے ہٹانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس نئی افتاد سے میں پریشان ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا ہماری مہم شروع ہونے سے قبل ہی ناکام ہوگئی۔

لیکن نہ جانے وہ کونسی چیز تھی جو ہمیں واپسی سے روکتی تھی، ہم نے کہا "ہرچہ بادا باد" اور بسم اللہ کا نام لے کر کشتی پر سوار ہوگئے اور ہوا کے رخ چلنے لگے، دریا کے دہانے پر پہونچ کر ہمارے ساتھی ملاح شفلو نے کہا "اب ہم کو پال کھول دینا چاہئے" اور پھر وہ خود پتوار کا ڈنڈا سنبھال کر بیٹھ گیا۔

سچ جانئے معمولی حالات میں کوئی کوتاہ سے کوتاہ عقل انسان بھی اس قسم کے سفر کی جرات نہ کرتا لیکن ہم پر آزادی کا بھوت کچھ ایسا سوار تھا کہ اس اقدام میں کوئی بڑے سے بڑا خطرہ بھی ہماری نظروں میں رتی برابر اہمیت نہ رکھتا تھا، رات بھر ہم اسی طرح اندھیرے میں کشتی کھیتے رہے اور جب صبح ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ ہماری کشتی بہت دور سمندر میں نکل گئی ہے اور ہمارا پیچھا کرنے والا ابھی کوئی نہیں ہے۔

میں نے ایک مٹی کے تیل کے ڈبے میں کوئلے جلائے اور اس پر چائے تیار کرنے لگا، یہی گھری چائے ہمارا صبح کا ناشتہ تھی، اس لئے کہ ہمارے ساتھ اس بدمعاش چینی نے جو سامان خورد و نوش رکھا تھا وہ بہت ہی کم تھا اور ہم اسے نہایت سخت ضرورت کے وقت استعمال کرنا چاہتے تھے، چنانچہ کسی نے بھی ناشتہ نہ ملنے کی

شکایت نہیں کی، بلکہ اسی سادھی سیدھی کسیلی چائے کو ہم ہنس ہنس کر پینے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کسی آزاد ملک کی بے فکر فضا میں چند دوست صبح کے ناشتے میں مشغول ہیں۔

لیکن تیسری رات کے آتے آتے تک ہماری دوستی اس قدر پکی نہیں رہی، دھوپ، سمندر کی چوندھیا دینے والی روشنی اور نمکین پانی کے چھپاکوں نے ہمیں چڑچڑا بنا دیا تھا، خیال کیجئے پچاس گھنٹوں تک ہم ایک دوسرے سے لگے ہوئے دوستوں کی طرح پرُامید باتیں کرتے رہے تھے ——— لیکن اب ہر ایک آدمی دوسرے کا عیب نکالنے لگا تھا، سمندر کی موجیں چونکہ نہایت پرُشور تھیں اس لئے ہم کوئی راستہ بھی قائم نہیں رکھ سکتے تھے، اور ہر آن کشتی کے الٹ جانے کا ڈر الگ لگا رہتا تھا، افراتفری میں ایک پرُشور موج کے تھپیڑے سے میں اس قدر حواس باختہ ہوا کہ میرے ہاتھ سے سمت نما آلہ بے اختیار چھوٹ گیا، اور سمندر کی گہرائیوں نے اسے آناً فاناً نگل لیا، یعنی اس مصیبت کا ساتھ دینے والا یہ سہارا بھی ہم سے چھن گیا۔

چوتھے دن صبح ہوئی تو ہم سب بھیگ کر شرابور ہوچکے تھے، ہمارے جسم بری طرح اکڑ چکے تھے، اور بھوک پیاس سے ہمارا حال برا ہو رہا تھا، میں نے دیکھا کہ کشتی میں رکھی ہوئی پانی کی ٹانکی میں سمندر کا پانی چلا گیا ہے، چنانچہ یہ تجویز ہوئی کہ اس کے کھارے پن کو دور کرنے کے لئے اس میں منجمد دودھ ملا دیا جائے۔ لیکن میرے ساتھی اس کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے نہ اتار سکتے تھے،

"اب تو سلامتی اسی میں ہے کہ ہم واپس ہو جائیں" داور نے کہا "کم از کم جنگل میں پانی تو ملے گا۔ پیاسے مرنے سے تو پانی پی کر مرنا اچھا ہے"

"بھائیو! ہمیں نکل کر ابھی تین دن تو ہوئے ہیں" میں نے کہا "اور چلتے وقت ہی میں نے تم لوگوں سے کہا تھا کہ ہم واپسی کا نام نہیں لیں گے، اگر ہماری کشتی ٹری نی ڈاڈ پہونچ گئی، تو ہماری آزادی یقینی ہے۔ لیکن اگر جزیرے پر کہیں بھی ہم نے اترنے کی کوشش کی تو ہماری دوبارہ گرفتاری کو کوئی چیز روک نہیں سکتی اور اس کے بعد عمر بھر چھٹکارا نا ممکن ہے"

اس طرح ہم دن بھر اور رات بھر لڑتے رہے اور ان جھگڑوں نے ہمیں اور بھی بدمزاج بنا دیا

"واللہ اب مجھ سے زیادہ سہا نہیں جاتا" بے برت نے کشتی کے ایک کونے سے چلا کر کہا "راستہ بدل ڈالو، خواہ کچھ ہو ہم جزیرے پر ہی اتر جائیں گے"

"ٹھیرو! میں نے داور کو بادبان کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا "تمہیں میرا حکم ماننا ہی پڑے گا" میرے ہاتھ میں یہ پستول ہے اور اس میں چھے گولیاں ہیں، تم مجھ پر حملہ کرسکتے ہو لیکن یاد رکھو میں اس کشتی میں کسی کو زندہ واپس نہیں ہونے دوں گا"

"بادبان کھینچ دو" بابرت نے میری دھمکی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے شفلو سے کہا لیکن اسی وقت داور بھی میرے ہاتھ سے تفنچہ چھین لینے کی نیت سے میری طرف لپکا، مگر راستہ میں اس کی ٹکر شفلو سے ہوگئی اور وہ دونوں لڑھکتے ہوئے کشتی کے فرش پر آ گرے، یہ ابھی سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کیا سکٹ کے چیخنے کی آواز نے ہم سب کو گویا خواب سے بیدار کر دیا، وہ پکار رہا تھا "وہ دیکھو زمین! وہ دیکھو زمین!! مجھے کوئی ساحل صاف نظر آرہا ہے" سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگے لیکن میں اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ یہ سوچ کر کہ کہیں مجھے غافل کرنے کی نیت سے یہ ترکیب بھی نکالی نہ گئی ہو"

"اوہو یہ تو ٹری ڈاڈ ہی ہے" میرے ساتھیوں نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا "بل بی تائے ادھر دیکھو وہ

اونچے پہاڑ ٹری نی ڈاڈ کے ہی ہو سکتے ہیں"

نہایت احتیاط اور شستہ انداز میں میں نے ان کی دکھلائی ہوئی سمت کی طرف نظریں اٹھائیں واقعی دور کے دھندلکے میں پہاڑوں کی چوٹیاں، سبز اور زمردیں صاف نظر آرہی تھیں۔ ہمارے مخالفانہ جذبات اور اختلافات اس منظر کے ساتھ ہی ختم ہوگئے اور ہم فرط خوشی سے بچوں کی طرح ناچنے اور چلّانے لگے۔

چودہ دنوں کی طویل مدت کے بعد ہماری کشتی کو ساحل کا وصال نصیب ہوا، جب ہم قریب پہونچے تو ہمارے ساتھیوں نے چاہا کہ کود کر چمکتے ہوئے ریتیلے ساحل پر جا نکلیں۔ لیکن وہ اس قدر کمزور اور ناتواں ہوچکے تھے کہ وہ سیدھے چل نہیں سکتے تھے، بلکہ انھیں ریت پر گر مچھوں کی طرح رینگنا پڑ رہا تھا،

خشکی پر پہونچنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ماہی گیروں کی ایک جھونپڑی میں دو ایک ہانڈیاں رکھی ہوئی ہیں اور ان میں خشک اور نمکین مچھلی بھری ہوئی ہے، ہم نے سمجھا کہ یہ اللہ کی دین ہے اور اپنی مٹھیاں بھر بھر کر کھانے لگے اور جب بھوکے جانوروں کی طرح پیٹ بھر کھا چکے تو تھکاوٹ اور نیند نے ہمیں آ دبوچا ——— جس کے بعد نہ معلوم کب تک ہم سوتے رہے۔

بہت دن چڑھے ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے ایک گاؤں کا رُخ کیا، یہاں کے انگریز حاکموں نے جو گیانا کے فرانسیسی شیطانوں سے نفرت کرتے تھے، ہمارا افسانہ نہایت ہمدردی سے سنا، ہمیں کھانا اور کپڑا دیا گیا اور جب ہم ایک روز آرام کر چکے تو ایک کشتی بھی یہ کہہ کر ہمارے حوالے کی گئی کہ اگر ہم چاہیں تو بھاگ کر کسی اور جزیرے میں اپنی جانیں چھپا سکتے ہیں۔

۱۰ر جون کو ایک انگریزی اگن بوٹ کے ذریعے ہماری کشتی کو کھینچ کر سمندر میں پہونچا دیا گیا، اس سے مدعا یہ تھا کہ ہم ان لاتعداد انگریزوں کے مقبوضہ جزیروں سے ہوتے ہوئے جو اس سمندر میں ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح سلسلہ بنائے ہیں میامی پہونچ جائیں۔

اس کے بعد کچھ دنوں تک تو ہم ایک جزیرے سے دوسرے جزیرے تک سفر کرتے رہے لیکن آخری مرتبہ جب ہم نے ایک جزیرہ چھوڑا تو ہم سمندر میں بھٹک گئے، اور اس طرح چھے دنوں تک مسلسل بہتے رہنے کے بعد ہم نے یقین کر لیا کہ اب خدا ہی ہمیں کسی ساحل کی صورت دکھلا سکتا ہے پھر ایک بار وہی اگلی مصیبتوں نے ہمیں آگھیرا ہماری غذا ختم ہونے لگی اور پانی کا قطرہ قطرہ بچایا جانے لگا، لیکن سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ ہم لوگ پھر ایک مرتبہ اپنا صبر کھونے لگے تھے،

ٹری نی ڈاڈ سے نکلنے کے ٹھیک سولھویں روز بعد ایک سمندری طوفان نے ہماری کشتی کو ایک ایسے ویران ساحل پر پٹک دیا، جس سے ہم واقف نہ تھے، کشتی ایکسپرس ٹرین کی رفتار کے ساتھ ساحل سے ٹکرائی اور ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، اس گڑبڑ میں ہمارا سامان سمندر کی موجوں کے حوالے ہوگیا اور ہم بے یار و مددگار گرم گرم ساحلی ریت پر پھینک دئے گئے۔

اس آسمانی عذاب سے ہم سنبھلنے بھی نہیں پائے تھے کہ جنگل کے کسی نامعلوم گوشے سے چند امریکی ہندی تیر، کمان اور برچھے لئے ہوئے ہم پر ٹوٹ پڑے، اور ہمارے رہے سہے سامان کا زبردستی جائزہ لینے لگے، جب ہم نے انھیں روکنے کی کوشش کی تو ان کی دھمکیاں سنجیدہ ہوتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اس لوٹ مار میں انھوں نے ہماری ہر شے ادھیڑ کر رکھ دی اور جب واپس جانے لگے تو ہمارے کپڑے تک اتروائے۔

بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ لٹیرے، امریکی ہندیوں کی ایک خاص نسل سے تعلق رکھتے تھے جنھیں امریکہ میں "سینڈھ کھانے والے ہندی" کہتے ہیں، بہرحال انھوں نے اپنی مہربانیوں سے ہمیں علائق دنیوی سے اس قدر بے نیاز کر دیا کہ اب نہ ہمارے پاس پہننے کے لئے تن پر ایک چیتھڑا ہی تھا، نہ پانی پینے کے لئے ایک گلاس
ع نے غم دزد و نے غم کالا۔

گرم گرم تپتی ہوئی ریت پر ہم کسی نامعلوم مقام کی طرف چلنے لگے، اس سفر میں چار روز تک ہمیں کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ راستے میں کبھی کبھی ہم چقماق کی مدد سے آگ روشن کر لیتے اور مینڈک یا کیکڑوں کو پکڑ کر ان پر بھون لیتے۔ یہی ہماری غذا تھی اور انھیں پر ہمارا گزارا تھا، راستے کی ناہمواری سے ہمارے پیروں میں جگہ جگہ آبلے پڑ گئے تھے اور ہمارے جسم مچھروں اور زہریلے کیڑوں کے کاٹنے سے سرخ ہو گئے تھے، لیکن اس پر بھی ہماری ہمتیں بندھی ہوئی تھیں اس لئے کہ اللہ کے فضل سے اب ہم میں کسی قسم کا جھگڑا یا مخالفت نہ تھی، محض خوف اور جان کے خطرے نے ہمیں متحد کر دیا تھا۔

اس سفر کے چوتھے روز جب آفتاب غروب ہونے لگا تھا اور ہم رات کے بسیرے کے لئے چو طرف نگاہیں دوڑا رہے تھے، ہمیں کچھ فاصلے پر گھاس کی چند جھونپڑیاں نظر آئیں۔ ہم نے غور سے دیکھا تو ان کے سامنے ماہی گیروں کے بڑے بڑے جال بھی لٹکتے ہوئے نظر آئے، بھوک اور آرام کے اشتیاق میں ہم ان جھونپڑیوں کی طرف دیوانہ وار دوڑنے لگے اور جب ان کے قریب پہونچے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ کیونکہ یہاں کوئی آدمی یا آدم زاد کا نام نہ تھا ——— شائد یہ ماہی گیروں کی عارضی آرام گاہیں تھیں اور وہ اپنے شکار کی تلاش میں بجرے لے کر چلے گئے تھے، بہرحال یہاں ہمیں ایک بڑی تانبیل جھونپڑی کی چھت سے لٹکتی ہوئی مل گئی اور جب ہم اسے آناً فاناً بھون کر چٹ کر چکے، تو لباس کی تلاش میں ان جھونپڑیوں کا جائزہ لینے لگے۔ مگر یہاں سوائے چند بوسیدہ چیتھڑوں کے کچھ نہ تھا اور ہم لباس کی کسی توقع سے ہاتھ اٹھا ہی چکے تھے کہ ایک ساتھی نے کسی جھونپڑی سے آواز دی، معلوم ہوا کہ اسے وہاں چند مچھلی پکڑنے والیوں کے لہنگے مل گئے تھے، اور انھیں پاکر وہ خوشی سے ناچ رہا تھا۔

بے برٹ نے کہا "کچھ نہ پہننے سے تو یہی لہنگے غنیمت ہیں" اور پھر وہ انھیں ایسے شوق سے پہننے لگا جیسے کوئی غیر فرانسیسی اجنبی پیرس کے سلے ہوئے کپڑے پہن کر خوش ہوتا ہے۔ کچھ ہو اس لباس کا ایک فوری فائدہ تو ہم نے محسوس کیا وہ یہ کہ اب مچھر اور کیڑے ہم کو اس قدر دق نہ کرتے تھے۔

دوسرے روز اس ہیئت کذائی میں ہم مارے مارے پھر رہے تھے کہ کولمبیا کے سپاہیوں کی ایک ٹکڑی نے ہمیں دیکھ لیا اور پیٹ پکڑ پکڑ کر قہقہہ مارنے اور ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا "ارے یار ان ڈاڑھی مونچھوں والی عورتوں کو اپنے یہاں ضرور لے چلنا چاہئے، کپتان انھیں دیکھ کر یقیناً خوش ہوگا۔ برسوں میں ایسی مخلوق نظر آتی ہے"

ایک گھنٹے کے اندر اندر ہم کولمبیا کے ساحلی شہر سانٹا مارٹا پہونچا دئے گئے، ان سپاہیوں کے افسر نے ہمارے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا، ہمیں کھانا کھلایا گیا اور کپڑے دئے گئے۔ لیکن جیسا کہ ہم کو بعد میں معلوم ہوا فرانسیسی قونصل کو ہمارے آنے کی خبر بھی کر دی گئی۔

(باقی آئندہ)

گلچیں

اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط

یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد آنجہانی کے نام مشاہیر اردو نے وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے تھے ان کو ادارہ کی طرف سے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ کی پہلی کڑی شاد اقبال کے نام سے چھپ چکی ہے۔ اردو زبان کے مشہور شاعر اکبر الہ آبادی کے بیسیوں خطوط بھی اسی سلسلہ میں مرتب ہو چکے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط ناظرین سب رس کی دلچسپی اور افادہ کی خاطر ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں۔

(۱)

الہ آباد۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء

عالی جناب مدظلہ

اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ آپ سے امیر با توقیر، اور موحد روشن ضمیر، اور عالم با عمل و تدبیر، اور حکیم صاحب شرح و تفسیر کے دل میں میری جگہ ہے۔ اگرچہ آپ وفور بیان مسائل توحید سے اپنی روحانی ترقی کرتے جاتے ہیں اور دنیاوی ترقی اس راہ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہے تاہم ایسے آثار پائے جاتے ہیں کہ آپ کے ایوان دولت کی شمعیں روشن تر ہو جائیں۔

چند روز ہوئے آپ کے بھانجے صاحب نے سرفراز فرمایا تھا۔ سبحان اللہ ان کی قابلیت ان کے دلآویز اخلاق سے دل خوش ہو گیا۔ بڑوں کے بڑے ہی ہوتے ہیں۔

دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں۔

ہجر میں اس گل کے مجھ پر سانس لینا بار ہے
زندگی ظالم مگر اب تک گلے کا ہار ہے

اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے۔

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ ع

بحمد اللہ اب خون شہید اں رنگ لایا ہے

یہ اسی وقت کہا تھا جب صرف سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی۔

دوسرا شعر صاف تھا۔

اس قدر کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر
بالآخر چرخ ان کے سرکو زیر سنگ لایا ہے۔ ایڈیٹر صاحب مساوات نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلان جنگ ہنجاب برنش ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا تاہم کلفت ہوتی ہے۔

ایڈیٹر صاحب کی یہ بھی رکاکت ہے کہ ان کے نام پرائیوٹ چٹھی آئی تھی۔ انھوں نے اس کو چھاپ دیا۔ خدا بلاؤں سے

جلد نجات دے۔ سوسائٹی کا تعلق خواہ مخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں، پہاڑوں میں بھاگ جاتا۔ مجھ کو اب کرنا کیا ہے۔

فکریں کبھی تھیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو
اب کہہ رہا ہوں یا رب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو شاید عافیت میں گزرتی۔ لیکن بہت دوری ہے۔ خدا کرے شرف حضوری میسر آئے۔ درباب مضامین تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ذرا اطمینان خاطر ہو لے۔ اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ

دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونے کا نہیں
الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

دعاگو
اکبر

(۲)

الہ آباد۔ ۲۰ اکتوبر ۱۴ء

عالی جناب

دونوں نظمیں دلکش ہیں۔

دشمن کو محبت سے مروت سے کر و زیر
نکلا ہے نہیں کام فقط تیر و تبر سے

کیا عمدہ نصیحت ہے۔

شاداب بہر خدا نغمۂ توحید سنا

اصل بات یہی ہے۔

کسی والا نامے میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ پنجاب میں جنگ و اختلاف ہے اور انہی وجوہ سے میں نے مسلک توحید و صلح کل اختیار کیا ہے۔ یہاں بھی ہندو مسلمان شیعہ سنی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے۔ توحید و صلح کل کے مسائل کو برابر بیان فرماتے رہیئے اور ان پر زور دیجئے۔ میرا خیال زیادہ تر آپ سے ملازمت حاصل کرنے کے لئے یہی تھا اور ہے کہ ان امور پر زور دیا جائے۔ اور عمدہ مضامین پیدا کئے جائیں۔

پرسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا۔ عرض کرتا ہوں شاید پسند فرمائیے

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں
جو اہل وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھیے :۔ حال ہی میں مست رہتے ہیں۔

میرا دل تو اس خیال سے بہت تسکین پاتا ہے کہ آپ ایسا ذی علم، با اثر، با اقتدار رئیس ملک توحید و صلح کل کے مسئلہ پر متوجہ ہے۔

حضور والا نے ایسے پاکیزہ اشعار موزوں فرمائے کہ حیرت ہو گئی۔ اور مرحبا و تحسین کا کلمہ بے اختیار زبان پر آیا۔ کیا کہوں بہت دور ہوں ناتواں ہوں کوئی باسلیقہ رفیق سفر ملتا تو خدمت عالی میں حاضر ہو کر چند روز غم غلط کرتا۔ میرے آرام کا اہتمام خدام والا پر کچھ بار نہ ہو۔ قبل اس کے خود جناب نے ارادہ تشریف آوری اور امید ملاقات کا اظہار فرمایا تھا۔ کاش یہ ارادہ پیدا ہو۔

اللہ آپ کو شاد کام رکھے۔

خاکسار
سید اکبر حسین

(۳)

الہ آباد۔ ۷ نومبر ۱۴ء

عالی جناب مدظلہ

آداب بجالاتا ہوں۔ صحیفۂ کرمت کا صدور باعث انبساط خاطر ہوا۔ نہایت شوق سے آپ کے مضمون کا منتظر ہوں جو اتحاد و توحید کے باب میں آپ نے پنجاب کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک۔ اسی لئے غیر خدا کو خدا بنا کر انسانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اگرچہ ہم کیا ہماری سعی کیا۔ دنیا کا مزاج ہی یہ ہے۔ خوب ہوتی تو دنیا کیوں ہوتی۔ لیکن بہرحال مسئلہ توحید پر زور دیتے رہنا عمدہ ترین شغل زندگانی ہے۔ اگرچہ میری غزل میں ایک شعر ہے۔

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کر دوں۔ ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو لیکن افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأت عرض حال کیا ہوتی نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

خواجہ صاحب سے سفر دکن کی نسبت کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ ان سے تو ملنا ہی دشوار ہو رہا ہے۔ وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب سے کنارہ کشی کو اولیٰ سمجھا ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں وہ طبیعت جن پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے بات کرنے میں عیب تکتا ہے

اگر اچھا رہا، ہمت بندھی تو خواجہ صاحب رفیق سفر کافی ہوں گے اور یوں تو آپ کی قدر دانی اور محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے تکلف استمداد کروں گا۔

اللہ آپ کو شاد و بامراد رکھے۔

خاکسار
اکبر حسین

(۴)

الہ آباد۔ ۲۲ نومبر ۱۴ء

جناب والا مدظلہ

عید سے مجھ کو کیا نسبت۔ لیکن تبریک کے تار اور کارڈ کا شکر گزار ہوں۔ پریم بچن کا مضمون خوب ہے۔ اکثر بزرگ ایک ایک کاپی لے گئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ سکھوں اور آریوں میں کیا وجہ اختلاف رہیں اور اظہار مخالفت نے کیا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

توحید پر مضامین و رسائل تحریر فرماتے رہیئے۔ بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے۔ مگر موحد کا دل ٹھکانے رہے گا۔ اور کیا کچھ ترقیاں ہوں اگر دل لگا رہے۔ خدا یا زمانے نے آپ پر یہ نعمت پیش کر دی ہے۔ زہے نصیب۔

خواجہ صاحب حیدر آباد تشریف لئے جاتے ہیں۔

خوشا خانہ کہ مہانش تو باشی

افسوس کہ مجھ کو موقع معیت نہیں مل سکا۔ لیکن جب میں آپ کے دل میں ہوں تو حاضر ہی سمجھئے۔ میرے دل کو اس سے انبساط ہے کہ آپ قدر دانی فرماتے ہیں۔

دعا گو
اکبر

(۵)

میں نے خود ہی خیال کیا تھا کہ کبھی ہمت بندی طبیعت میں توانائی پائی تو خواجہ صاحب کو اپنی معیت پر آمادہ کروں گا۔
میں آپ کی محبت اور قدردانی کے مزے لیتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔ کیا دل ہوگا جس میں اس ناچیز کی جگہ ہے۔

الٰہی در جہاں باشی باقبال جواں بخت و جواں دولت جواں سال

دعاگوئے شما
سید اکبر حسین

(۶)

الہ آباد - ۳ر ڈسمبر ۱۴ء

حضور والا

خواجہ صاحب سے یہ سن کر کہ میرے نہ آنے کا آپ کو افسوس ہوا دل بہت نازاں ہوا۔

منکہ باشم کہ در آں خاطر عاطر گزرم
لطفہا می‌کنی اے مخزنِ صد گونہ کرم

اس وقت حالت ایسی تھی کہ افسوسِ مفارقت ہی کا پہلو مفید تر تھا۔ زندگی باقی ہے۔ اللہ کو منظور ہے تو یہ امید کبھی پوری ہی ہوگی کہ آپ سے بہ اطمینان و تفصیل مکالمت و مجالست ہو۔
علالت و ناتوانی پست ہمت کئے دیتی ہے۔ دنیا کا کیا پوچھنا۔ شانِ ظہور تو یہی ہے لیکن غفلت شکن اسباب اکثر عالمِ دل کو بدل دیتے ہیں۔ رات ایک مطلع بے ساختہ ذہن میں آیا۔

سب سے بہتر کیا ہے انساں کو جو کرنا چاہیئے
موت کا خالق جو ہے بس اس پہ مرنا چاہیئے

خواجہ صاحب کی خدمت میں تسلیم۔ اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی

خواجہ سے کیونکر نہ ہوتا پادری کو سوءِ ظن
پیری بے دخل کرتا ہے سدا اقرار کو

خاکسار
اکبر

(۷)

الہ آباد - ۵ر ڈسمبر ۱۴ء

حضور والا

کرمت نامے سے سرفرازی حاصل ہوئی۔ کیا کیا شعر فرمائے ہیں۔ مرحبا صلِّ علیٰ۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار گلچین بہار تو زداماں گلہ دارد

خواجہ صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ خدمت سابقہ پر بحالی کی امید قائم ہوئی ہے۔ خدا آپ کو فائز المرام اور حاشیہ بوسانِ بساطِ دولت کو شاد کام کرے۔ آپ کا جمال باکمال اربابِ مذاق کے لئے ہر رنگ میں دلکش ہے۔ بوریا پر بیٹھئے تو دنیا مرید ہے۔ مسند پر بیٹھئے تو مصاحب ہے۔ لڑنے کو نکلئے تو جان نثار ہے۔ کچھ ارشاد ہو تو وجد میں آنے کو طیار ہے۔

میری ناتوانی اور افسردگی روز افزوں ہے۔

آپ کا خیر طلب
اکبر حسین

سازِ ہستی

"مل گئی! مل گئی!! مل گئی!!!" درخشاں کا مقبول عام ایڈیٹر ناصر بڑبڑاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ادبی دنیا کا ایک روشن ستارہ تھا۔ ادب کے لئے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ جب تک کالج میں رہا اس کی خدمات ایک محدود حلقہ تک رہیں۔ کالج چھوڑا تو تلاشِ معاش میں سرگرداں ہونے کی بجائے اس نے رسالہ یا اخبار جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ پروفیسروں اور عزیز و اقارب نے سفارش کر کے اچھے عہدے پر فائز کرانے کا وعدہ کیا مگر اس نے کسی کی نہ سنی۔ کسی سے امدادی طور پر کچھ سرمایہ لیا اور کسی سے قرضہ لیا اور اس طرح سب سے پہلے "درخشاں" ایک ماہوار رسالہ نکالا۔ رفتہ رفتہ اس کے حوصلے بڑھنے لگے۔ "درخشاں" کے علاوہ کئی اور رسالے اور ایک اخبار شائع کرنا شروع کیا۔ قرضہ ادا کر دیا اور خود بھی ایک پریس کا مالک ہو گیا۔

دوست احباب نے اور عزیز و اقارب نے خاص طور پر بوڑھی ماں نے اس کی شادی کی کوشش شروع کی مگر وہ ہمیشہ ٹالتا چلا گیا وہ یہی کہتا: "جب کسی کو پالنے کے لائق ہو جاؤں گا تو شادی بھی کر لوں گا۔ اب تو خود کو پالنے کے لالے پڑے ہیں۔" لیکن اس میدان میں آجانے کے بعد اس کے پاس دولت آگئی کہ وہ ایک کو کیا کئی کو پال سکے۔ نیز عزت اور شہرت تو اس کے قدم چومتی تھی۔ جہاں بھی وہ لڑکی مانگتا ضرور شادی ہو جاتی مگر وہ ابھی انتخاب نہ کر سکا تھا۔ ہر دوشیزہ کو جس پر اس کی نظریں پڑیں، ہر طرح سے جانچتا مگر کوئی لڑکی معیار پر نہ اترتی۔ وہ ایسی لڑکی چاہتا تھا جو زیادہ حسین نہ بھی ہو تو اپنے میں کسی قدر رعنائی رکھتی ہو۔ حسنِ سیرت کی مالک ہو اور سب سے بڑھ کر اس میں علمی اور ادبی مذاق ہو۔

یہ زمانہ ناصر کے لئے عجیب کشمکش کا تھا۔ ادھر ماں قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کا بے حد تقاضا تھا کہ جیتے جی بہو کا راج دیکھ لے۔ عزیز و اقارب الگ تنگ کر رہے تھے۔ وہ سوچتا کیا کروں اور کیا نہ کروں۔

ایک نئی افسانہ نگار خاتون "شمائل" کے اکثر افسانے اس کے پاس آتے تھے اور اکثر "درخشاں" میں چھپ بھی چکے تھے۔ اپنی غیر معمولی مصروفیات کی وجہ سے ناصر کا خیال اس طرف گیا ہی نہ تھا۔ لیکن ایک روز جبکہ وہ ڈاک دیکھ رہا تھا "شمائل" کا ایک تازہ افسانہ مع ایک طویل خط کے ملا۔ شمائل کے افسانوں کی تعریف میں اکثر خطوط اسے مل بھی چکے تھے۔ اس نئے افسانے کو دیکھ کر ناصر کا خیال اس طرف منعطف ہوا۔ پہلی بار اس نے شمائل کے متعلق سوچا "کیا یہ میری بیوی بن سکے گی۔" ادبی قابلیت اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ افسانوں کے پلاٹ سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اصلاحی سرگرمی موجود ہے۔ اس طرح ضرور وہ حسنِ سیرت کی بھی مالک ہوگی۔" اس طرح ناصر شمائل کو پرکھا گیا۔ اب سوال حسنِ صورت کا رہ گیا تھا۔ ناصر نے سوچا "اگر وہ زیادہ حسین نہ بھی ہو تو مضائقہ نہیں۔ کچھ تو رعنائی رکھتی ہوگی۔ یہ پاک و پاکیزہ خط لکھنے والی عورت حسین ہونا ہی چاہیے۔"

کئی روز تک ناصر شمائل کے خیال میں رہا۔ دل و دماغ پر عجیب سروری کیفیت طاری تھی۔ آنکھیں شوخی سے ناچ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر ہر دم تبسم کھیل رہا تھا۔ تیسرے روز شام کو وہ کمرے میں داخل ہونے سے پہلے تصفیہ کر چکا تھا کہ شمائل سے وہ ضرور شادی کرے گا۔ اس دل خوش کن تصفیہ سے وہ بے قابو ہو گیا اور پکارا "مل گئی! مل گئی!! مل گئی!!!"

اب ایک سوال رہ گیا تھا کہ آیا شمائل شادی شدہ ہے یا نہیں۔ مگر اس کا جواب بھی آسانی سے معلوم کرنے کی ایک ترکیب نکل آئی۔ ایک ماہ بعد "درخشاں" کا خصوصی نمبر نکلنے والا تھا۔ ناصر نے سوچا۔ درخشاں کے خاص لکھنے والوں کے حالات اور تصاویر بھی اس پرچہ میں شامل کر دینی چاہئیں۔ اس طرح وہ شمائل کے حالات سے بھی آگاہ ہو جائے گا اور تصویر بھی مل جائے گی۔ چنانچہ اس نے خاص خاص مضمون نگاروں سے التماس کی کہ وہ اپنے حالات اور تصویر جلد از جلد روانہ فرمائیں۔

شمائل کو اس نے خاص طور دعوت دی۔

شمائل کو خط لکھنے کے بعد ناصر کو کسی گھڑی چین نہ ملتا وہ ہمیشہ ڈاکیہ کا انتظار کرتا۔ یہ وہی ناصر تھا جو بعض اوقات افسانہ نگاروں کے ان جملوں پر جو فراق اور ہجر کی کیفیت پہ لکھے گئے ہوتے، بے اختیار ہنس دیتا۔ مگر اب ناصر کی بھی وہی حالت تھی۔ بلکہ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی حالت ان افسانے کے کرداروں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اکثر وہ اس خط سے مایوس ہو کر چاہتا کہ تخلیہ میں روئے اور خوب روئے۔

آخر دو ہفتہ بعد شمائل کا خط آیا۔ چھوٹا سا لفافہ اور اس پر شمائل کی تحریر دیکھ کر ناصر بے اختیار ہو گیا۔ دل بلیوں اچھلنے لگا۔ بار بار وہ دل سے سوال کرتا "اگر وہ شادی شدہ ہو تو" مگر دل سے کوئی جواب پا کر خاموش ہو جاتا۔ لفافہ کھولنے سے پہلے اس نے لفافہ کو دبا کر دیکھا۔

اُف! کوئی سخت سی چیز اس میں موجود تھی یعنی تصویر! ناصر کی حالت متغیر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لفافہ کھولنا چاہتا تھا مگر ہاتھ اس کی مدد نہیں کر رہے تھے۔ اس کی حالت ایسی ہی تھی جیسے کہ کسی چور کی چوری کے وقت ہوتی ہے۔ بمشکل تمام ناصر نے خط کھولا۔ ایک پری چہرہ خاتون کی تصویر اس میں موجود تھی۔ عمر سولہ اٹھارہ کی لگ بھگ تھی۔ ایک ادائے مستانہ سے باغ کی ایک روش پر کھڑی تھی۔ ہاتھ میں ایک گلدستہ تھا۔ ناصر نے آہ بھر کر تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے دل میں وہی سوال پیدا ہوا "کیا وہ شادی شدہ ہے" وہ چونک گیا۔ کاغذات کو الٹ پلٹ کر کے اس نے وہ کاغذ نکالا جس میں شمائل کے حالات تھے۔ سرسری طور پر پڑھا۔ آہ! شادی کا کہیں ذکر ہی نہیں تھا۔ یعنی وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اس کا ہاتھ خود بخود دل کی طرف گیا۔ ناصر آنکھیں بند کر کے خاموش بیٹھ گیا اور بہت دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔

وہ چاہتا تھا کہ ماں سے ذکر کرنے سے پہلے شمائل کے رجحانات معلوم کرے۔ چنانچہ اس نے شمائل کو نہایت رنگین پیرائے میں ایک خط لکھا جس میں اپنی دلی آرزو کا اشارتاً ذکر کر دیا اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

ایک ہفتہ کے بعد شمائل کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ وہ ناصر کے دل کی بات جان گئی ہے۔ ناصر نے اس کی اس دور بینی کی داد دی۔ ملنے کے بارے میں شمائل نے لکھا تھا۔

"جب آپ چاہیں اور جہاں آپ چاہیں میں ملنے تیار ہوں۔"

ناصر کو منہ مانگی مراد مل گئی۔ مگر ملنے کے مقام کا تعین ایک اہم مسئلہ تھا۔ دو روز سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا کہ "۲۳ ڈسمبر کو شام کے پانچ بجے وہ "کنگس ہوٹل" کے کمرہ نمبر ۶ میں ملے۔"

ناصر کو امید تھی کہ شمائل راضی ہو جائے گی۔ چنانچہ ہوا بھی یہی۔ اس لیے اس نے کمرہ کو ایک ہفتہ پہلے ہی کرایہ پر حاصل کر لیا۔ دن بھر ناصر اس کمرہ میں پڑا رہتا اور وہ ایسے حرکات کرتا کہ ہر دیکھنے والا اسے ضرور مفقود الحواس جانتا۔ اپنی کرسی کے سامنے وہ دوسری کرسی رکھتا اور مصروف گفتگو ہو جاتا گویا شمائل اس کے سامنے موجود ہے۔ اپنی گفتگو کو فصیح اور پر اثر بنانے کے لیے وہ ہر جملے کے بعد ضرور شعر استعمال کرتا۔

بہرحال انتہائی کشمکش کے یہ چند دن کسی طرح گزر گئے۔

۲۳ ڈسمبر کا دن آ گیا۔ پانچ بجے کا وقت مقرر کیا گیا تھا مگر ناصر وہاں حسب معمول صبح سے موجود تھا۔ خدا خدا کر کے گھڑی نے پانچ بجائے۔ ناصر کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ وہ کرسی پر سے اٹھ کر کھڑکی کے قریب گیا۔ اور ہوٹل کے پھاٹک پر نظریں گاڑ دیں۔ کسی عورت کو نہ آتے دیکھ کر دور دور تک نظریں دوڑائیں مگر وہ ناکام واپس آئیں۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس کا سارا بدن لرزاں تھا۔ اس وقت ناصر کی حالت اس بچے کی طرح تھی جو امتحان کا پرچہ کسی قدر خراب کر کے نتیجہ کا منتظر ہو جو ابھی ظاہر ہونے والا ہے۔

دروازہ پر دستک ہوئی۔ ناصر نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بوائے کھڑا تھا۔ اس نے تشتری بڑھائی جس میں ایک کارڈ تھا۔

"شمائل"

"بیٹھ جاؤ" ناصر نے کہا۔
دو منٹ کے بعد ایک برقعہ پوش خاتون اس کے کمرے میں موجود تھی۔ ناصر کو پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ شمائل پردہ کرتی ہے۔ مگر اس نے تصویر کیوں بھیجی تھی؟ مگر وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ اسے اس بات پر رنج تھا کہ اس نے ایک پردہ نشین خاتون سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔
وہ ان ہی خیالات میں غوطہ زن تھا کہ برقعہ میں سے آواز آئی۔
"فرمائیے آپ نے مجھے کیوں یاد کیا تھا۔"
"جی!" ناصر نے اپنے پراگندہ خیالات کے سلسلے کو منقطع کر کے کہا "میرا مقصد! یعنی میں یہ چاہتا تھا......
خیر! تو گویا آپ خوب لکھتی ہیں"
"شکریہ!" جواب ملا "اور کچھ"
ناصر کے سنبھلنے سے پہلے ایک اور حملہ ہوا۔
"جی! اور تو کچھ نہیں" ناصر ابھی اپنے جذبات کو قابو میں نہ لا سکا تھا "آپ ادھر کرسی پر آجائیے نا...... اور یہ برقعہ...... میرا مطلب ہے...... گرمی ہو رہی ہوگی آپ کو"
"یعنی برقعہ اتار دوں؟" "جی ہاں! میرا مطلب یہی ہے۔"
نقاب اٹھا۔ ناصر کو امید تھی کہ ایک حسن دل گداز جلوہ گر ہوگا مگر وہاں سوٹ میں ملبوس ایک نوجوان مرد کھڑا تھا۔

ناصر اس حملہ کے لئے تیار نہ تھا اس کا سر چکرانے لگا اور وہ میری مدد پر بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ جب اسے ہوش آیا کمرے میں نہ وہ نوجوان مرد تھا اور نہ برقعہ، میز پر اس کا اپنا پیڈ کھلا رکھا تھا جس میں کسی نے انتہائی عجلت سے خط لکھا تھا۔
"مکرمی! تسلیمات"
شمائل بھی اپنے خطوط کو اسی طرح شروع کرتی تھی۔ آگے تحریر تھا۔
"آپ کی یاد فرمائی کا شکریہ!"
یہ معلوم کر کے کہ آپ جیسے ادبی خادم عشق اور محبت کی پینگیں بڑھا کر شریف عورتوں پر ڈورے ڈالتے ہیں۔ بے حد افسوس ہوا آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہوگا کہ میں ہی "شمائل" کے نام سے افسانے لکھا کرتا تھا اور جو تصویر "درخشاں" کے خصوصی نمبر کے لئے روانہ کی گئی تھی وہ ایک ایکٹرس کی تھی جو بہت عرصہ پہلے کسی رسالہ میں چھپی تھی۔ اس لئے خصوصی نمبر میں جو حال ہی میں شائع ہونے والا ہے وہ تصویر نہ چھاپی جائے تو بہتر ہے۔

طالب خیر
خورشید احمد

شفقت رضوی

محبت کی چھاؤں:- مرزا اظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔
نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔
چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد عہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:- پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے، ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔
طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے، صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

بچپن کے بعد

بزمانہ حضرت غفراں مکاں محرم کے مہینہ میں خصوصاً پہلے دہے میں عجیب سوانگ اور تماشے ہوا کرتے تھے۔ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ انہیں ایام محرم میں ایک روز دیکھتا کیا ہوں کہ ایک ٹکڑی چلی آرہی ہے۔ غالباً چالیس پچاس آدمی ہوں گے۔ کوئی دس پندرہ آگے چل رہے ہیں۔ باقی باقاعدہ قطار باندھے ہوئے ان کے پیچھے آرہے ہیں۔ آگے چلنے والے کہتے تھے کہ "پچپن سال ہو گئے"۔ اس کے جواب میں دوسرے سب کے سب ایک ساتھ کہتے تھے کہ "بیٹھے بیٹھے سو گئے"۔ اس کے ساتھ ہی راستہ پر چت لیٹ جاتے تھے۔ پھر اٹھتے اور تھوڑی دور یہی نعرہ لگاتے ہوئے جاتے اور راستہ پر لیٹ جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ اسی طرح ہیچ محلہ پر سے گزرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ حضرت غفراں مکاں نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا سوانگ ہے تو عرض کیا گیا کہ حال میں پچپن سال کی جو گشتی نافذ ہوئی ہے اس کی نقل کی جارہی ہے۔ یعنی اچھا خاصا آدمی پچپن سالہ عمر ہوتے ہی بیکار ہو جاتا ہے جو مرنے کے برابر ہے۔

اس وقت تو مجھے زیادہ لطف نہیں آیا بلکہ اس لطیفہ کو سمجھ نہ سکا۔ لیکن بعد میں جب میں ملازم ہوا اور ملازمین کو وظیفہ پر علیحدہ ہوتے ہوئے دیکھا کہ کس قدر رنج و پریشانی چھائی ہوئی ہوتی ہے۔ اور توسیع کے لئے کس کس طرح کوشش کی جاتی ہے تو سمجھ میں آیا کہ یہ لوگ فطری موت تک ملازمت سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے ہیں۔ ان میں اکثر اس آنے والے وقت کے لئے بالکل تیار نہیں رہتے اور وظیفہ کو ایک بلائے ناگہانی خیال کرتے ہیں۔

وظیفہ اور پچپن سالہ عمر کی تھوڑی سی صراحت کر دینا مناسب ہے۔ سرکار نے عام رعایا کے حقوق کو پیش نظر رکھ کر ایک قاعدہ مقرر فرما دیا ہے کہ پچپن سال کی عمر یا بصورت ضرورت پچیس سالہ ملازمت پر ہر عہدہ دار کو وظیفہ دے دیا جائے تاکہ دوسرے عہدہ داروں کو بھی ترقی کا موقع ملے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وظیفہ پانے والا عہدہ دار ناکارہ ہے اور بڑھاپے کی وجہ سے کام کے قابل نہیں ہے۔ ضعیفی اور ناکارگی صرف آپ کا تخیل ہے۔ جس کو ہرگز اپنے دل میں جگہ نہ دینا چاہیے۔ آپ کی تشفی کے لئے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ بعض وقت سرکار عظمت مدار کے وظیفہ یاب عہدہ داروں کو ہماری سرکار بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات عطا کرتی ہے۔ حالانکہ وہ بھی پچپن سال پر اپنی خدمت سے وظیفہ پر علیحدہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے محض پچپن سالہ عمر انجام دہی کار کی مانع نہیں ہے۔

بہت سے ملازمین وظیفہ کے وقت مقروض رہے ہیں اور اکثر بوجہ کثرت اولاد فکر مند ہوتے ہیں کہ اب قرض کیونکر ادا ہوگا۔ بچوں کی پرورش اور لڑکیوں کی شادی کا کیا انتظام ہوگا۔ عموماً زمانہ ملازمت میں اخراجات کا اندازہ نہیں کرتے اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ پریشانی ہے۔ میرے تجربہ میں ان پریشان لوگوں میں مسلمان زیادہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ابتدائے ملازمت سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک روز ہم کو ملازمت سے علیحدہ ہونا ہے۔ لیکن اس کو پیش نظر رکھ کر اپنے اخراجات کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حصہ تنخواہ کا محفوظ نہیں کیا جاتا۔ اب تو سرکاری بیمہ میں بہت سہولت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ علاوہ اس کے دوسری معتبر بیمہ کمپنیاں بھی ہیں۔ اگر باقاعدہ کفایت شعاری کے ساتھ ایک مقررہ موازنہ پر عمل کیا جائے تو کافی بچت ہوگی اور کوئی منفعت بخش جائداد بھی وظیفہ تک خرید لی جا سکتی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے پاس بوقت وظیفہ کافی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن ان کو رنج اپنی حکومت اور اعزاز کے جانے کا رہتا ہے۔ ایک بڑے عہدہ دار جنھیں کئی بار توسیع مل چکی تھی وظیفہ کے قریب یہ کہتے سنا کہ "بھائی چالیس بلکہ

پینتالیس سال حکومت کرنے کے بعد وظیفہ ملنا ایک مصیبت ہے۔ اب جی چاہتا ہے کہ شہر سے دور کسی قصبہ میں مکان بناکر رہیں۔ تاکہ جب گھر سے باہر نکلیں تو قصبے کی رعایا ہم کو بڑا آدمی سمجھ کر ادب کے ساتھ سلام کرے اور یہ کہے "دنظم ظلہٗ" جس کے سننے سے ایک دلی مسرت ہو کہ ہم ابھی تک برسر حکومت ہیں۔ ورنہ بڑے شہر میں تو ہم کو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ ایسی شان و شوکت کے دلدادہ اور دوسرے فضول خرچ عہدہ داروں کے لئے تو حقیقت میں پچپن سالہ عمر کی قربت قیامت سے کم نہیں۔

اگر ابتدائے ملازمت ہی سے اپنے کو خادم ملک مالک و خدمت گزار رعایا سمجھیں بلکہ بلاشان و شکوہ عمل کریں تو وظیفہ کے وقت آپ کی جدائی عام طور پر ناگوار ہوگی اور آپ ہر جگہ عوام میں ہر دل عزیز رہیں گے۔

بعض عہدہ دار بعد وظیفہ کر تلاش معاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اپنے اثرات و تعلقات کی بناء پر دو تین سال کے لئے مختلف علاقوں میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔ اور بڑی تعداد میں باوجود کوشش کے ناکام رہتے ہیں۔ ان کوشش کرنے والوں میں سے بعض کمی آمدنی کو پورا کرنے کے لئے ملازمت کی جستجو کرتے ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو اپنی بیکاری کو دور کرنے اور جو کچھ تھوڑی بہت حکومت ملے اس کو حاصل کرنے کے متمنی ہوتے ہیں۔ مشکل سے سو میں ایک یا دو ایسے بھی نکلیں گے جو اپنی آمدنی پر قناعت کرکے اپنا وقت عبادت نیز خدمت ملک و قوم کے لئے وقف کرتے ہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ وظیفہ کے بعد گوشہ نشین بن جائیے اور کوئی کام نہ کیجئے۔ موقع ملے تو ضرور ملازمت کیجئے اور اپنی آمدنی میں اضافہ کیجئے۔

بعض وظیفہ یاب عہدہ دار تو غضب کرتے ہیں کہ باوجود بیماری و کمی بینائی و خرابی ہوش و حواس کے صرف طلب زر کی خاطر دوبارہ ملازمت کی تلاش میں رہتے ہیں

ایسی ذہنیت کے لوگ ملازمت حاصل کرکے اپنی عزیز عمر کو قبل از وقت ختم کر دیتے ہیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ ہر وظیفہ یاب دوبارہ ملازمت کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر وظیفہ یاب کو ایسے موقعے مل سکتے ہیں۔ میرا روئے سخن عام وظیفہ یاب عہدہ داروں سے ہے۔ ہر شخص کو اپنی صحت اور دوسرے حالات پر غور کرکے عمل کرنا مناسب ہے۔

حقیقت میں اصل کام کرنے کا وقت بشرط صحت وظیفہ کے بعد کا ہے۔ کیونکہ بچپن تو تعلیم حاصل کرنے میں صرف ہوجاتا ہے اور جوانی سے وظیفہ تک حصول تجربہ کے لئے وقف ہے۔ علم و تجربہ کے بعد عمل کا وقت وظیفہ کے بعد کا ہے جب کہ عقل پختہ اور تجربہ مکمل ہوجاتا ہے۔

وظیفہ کے بعد اگر حقیقت میں پچپن سال کی عمر ہے اور اوائل شباب و زمانہ ملازمت پاک و صاف گزرا ہے تو پھر اس کا لطف دیکھئے کیسے آرام اور چین سے آپ کی بقیہ عمر گزرتی ہے۔ اگر علم کا شوق ہو تو اس سے بہتر کونسا وقت مل سکتا ہے۔ تحریر و تقریر کے لئے بے فکری اور دلجمعی کی ضرورت ہے جو وظیفہ کے بعد ہی حاصل ہوسکتی ہے۔ زراعت و تجارت بہترین مشاغل ہیں۔ کچھ نہیں تو باغبانی صحت اور دل بہلائی کا خاصا مشغلہ ہے۔ اگر خدا نے استطاعت دی ہو تو سفر کرنے میں لطف آئے گا۔ اور معلومات میں اضافہ ہوگا۔ بہرحال بیکاری سب سے بدتر ہے جو کچھ ہوسکے کیجئے اور اپنے کو مشغول رکھئے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ بیکار وظیفہ یاب بیماریوں کا شکار بن جاتے ہیں اور بہت جلد مرجاتے ہیں۔

بعض حضرات وظیفہ کا جز سرکار کو فروخت کرکے کچھ رقم لے لیتے ہیں۔ یہ نہایت نازک کام ہے۔ سوائے اشد ضرورت اور ناگزیر حالات کے ایسا سودا کرنا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر عمر زیادہ ہوئی تو گھاٹے میں رہتے ہیں۔ ایک تو وظیفہ کے باعث نصف آمدنی ہوجاتی ہے۔ اس پر

فروخت وظیفہ سے مزید تنگی ہوتی ہے۔ خرچ تو وہی رہتا ہے لیکن آمدنی میں کمی ہوجانے سے وظیفہ یاب کی پریشانی بڑھجاتی ہے۔ دوسری ملازمت کی تلاش کا ایک سبب یہ بھی ہے۔
ابتدا میں تو کوشش ہوتی ہے کہ ہم کو اسقدر رقم مل گئی۔ سوال خرچ کا ہے۔ اگر آپ نے صحیح طور پر خرچ کیا اور آمدنی میں اضافہ کیا تو خیر مگر ایسی نظائر کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ ورنہ شادی بیاہ میں تکلفات یا مختلف طور پر روپیہ خرچ ہوجاتا ہے جس کا بدل نہیں تو اس قدر زحمت و تکلیف کا سامنا ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

وظیفہ کے بعد ہر شخص کو جلد سے جلد اپنے جدید ماحول کا خیال رکھنا چاہیے۔ کفایت کے ساتھ لباس، غذا، تفریح اور صحت کا خیال مقدم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدائی پانچ چھ ماہ تک کسی قدر تکلیف ہوگی۔ لیکن ایک پروگرام مرتب کرکے عمل کرنے سے کافی راحت ملیگی۔

اس سلسلے میں موجودہ عہدہ داروں اور ملازمین سے اپنے اور دوسرے وظیفہ یاب عہدہ داروں کے چند تجربات بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں۔ ان کا جی چاہے تو اس پر عمل کریں ورنہ ان کا اختیار۔

(۱) آپ اپنے کو کبھی عہدہ دار نہ سمجھیں۔ بلکہ خادم تصور کریں اور اس پر سختی سے عمل فرمائیں۔ کیونکہ بعد وظیفہ آپ کی یہ خصوصیت کہ آپ عہدہ دار ہیں باقی نہ رہے گی اور آپ بھی عام رعایا میں شامل رہیں گے۔

(۲) ابتدائے ملازمت سے اپنے وظیفہ کے بعد کا خیال رکھ کر کچھ نہ کچھ پس انداز کریں اور کفایت کے ساتھ زندگی بسر کریں تو وظیفہ کے وقت آپ کی پریشانی میں بہت کچھ کمی ہوگی۔

(۳) اپنے دوستوں کی تعداد بڑھائیں۔ کیونکہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض عہدہ دار اپنے عہدہ کے نشہ میں اپنے سابقہ و موجودہ دوستوں سے کنارہ کشی اختیار کرلیتے ہیں۔ اور صرف اپنے ہم رتبہ کے چند عہدہ داروں کو قابل ملاقات خیال کرکے انھیں سے ربط رکھتے ہیں۔ اہل غرض اشخاص کو اپنا خیرخواہ تصور کرتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ یہ سب آپ کی خدمت کے ختم کے ساتھ رخصت ہونے والے ہیں۔ بعد وظیفہ آپ کے سابقہ دوست آپ کے برتاؤ کے سبب آپ سے دور رہیں گے۔ اور آپ تنہا رہ جائیں گے۔

(۴) ملازمت کے زمانے سے ہی اپنا کوئی محبوب مشغلہ جس کو انگریزی میں (Hobby) کہتے ہیں جاری رکھیں تاکہ وظیفہ ملنے پر آپ کو بیکاری محسوس نہ ہو۔

ایک بڑے عہدہ دار جنکا اب انتقال ہوچکا ہے۔ مجھ سے فرماتے تھے کہ "دیکھیے کسقدر عبرت کا مقام ہے کہ میرے مکان پر سے دفتر جاتے ہوئے بعض وہ حضرات جن کا تقرر میرے ہاتھ سے ہوا ہے اور میں نے ان کو کئی ترقیاں دی ہیں، آج مجھ کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور بعض چھتری سے اپنا منہ چھپا لیتے ہیں۔ اس سے مجھ کو رنج ہوتا ہے۔ میں یہ مکان چھوڑ کر دوسرے دور کے محلہ میں مکان بنا کر رہنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ بات قابل نوٹ ہے کہ جب وظیفہ کے چند ماہ بعد ان کو دوسری خدمت ملی جو سابقہ خدمت سے اعلیٰ ترین تو یہی لوگ پھول کے ہار لیکر مبارکباد دینے حاضر ہوئے۔

آخر میں وظیفہ یاب عہدہ داروں کے لئے میری ایک تحریک ہے کہ اتحادی اصول پر ان کی ایک انجمن ہونی چاہیئے۔ اور ایک کلب۔ گو اس وقت چند کلب موجود ہیں۔ لیکن ان میں بیشتر برسر خدمت عہدہ داروں کی تعداد ہے۔ ایسے کلبوں میں زیادہ تر عہدہ داری کی شان نظر آتی ہے۔ علاوہ اسکے ہر وظیفہ یاب عہدہ دار ان کے اخراجات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اور ہمارے مقاصد کے لئے کافی نہیں ہے۔ کلب کے علاوہ ایک ماہوار رسالہ بھی ہوتا کہ کفایت شعاری کے ساتھ تفریح اور علمی مشغلہ جاری رہے۔ ہر عہدہ دار وظیفہ یاب رسالے کے ذریعے اپنے گزشتہ قیمتی تجربات سے ملک کو فائدہ پہنچائے۔

اگر ہندرہ بنل وظیفہ یاب عہدہ دار اس تحریک سے اتفاق فرمائیں تو میں اپنی ناچیز خدمات اس کی تکمیل اور کامیابی کی کوشش کے لئے پیش کر سکتا ہوں۔

(یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر کی گئی)

سیّد محمد تقی

سویرا

سجھائی دینے لگا ہے اب اس اندھیرے میں
کچھ ایسی دیر نہیں رہ گئی سویرے میں

وہ دور افق پہ سپیدی کا کھل رہا ہے نشاں
ہر ایک سمت سے آثار صبح نو ہیں عیاں

سسک رہے ہیں وہ تاریکیوں کے ہمراہی
سہم کے بیٹھ گئی راستے میں گمراہی

جو ظلمتوں میں چمکتے تھے ہو گئے بے نور
خود اپنا خون جگر پی گئی شب دیجور

نہ وہ شکار رہے اور نہ گھات میں صیاد
مٹا جہان مسلسل سے زندگی کا تضاد

جواں فضاؤں میں حل ہو گئے مثال شہاب
وہ مالکان زمیں غاصبان خانہ خراب

نئے اصول بنے ہیں نئے جہاں کے لئے
مئے حیات ہوئی عام این و آں کے لئے

عابدی

انوار :- حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر ان کی نظر بہت وسیع ہے۔
موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے اردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

تصحیح :- سب رس فروری ۱۹۴۵ء میں پروفیسر تشنہ کی ایک نظم "عرض نیاز" شایع ہوئی تھی۔ اس کے ایک مصرعہ میں "موج" کی بجائے "نوح" شایع ہو گیا۔ صحیح مصرعہ یہ ہے۔ (اے آگ شعلے، بے موج طوفاں) ادارہ

اپریل

اپریل کا مہینہ، زندہ دلی کے مظاہروں کو لئے ایک زندگی کا پیام دیتا ہے۔ قدیم روما والے اپریل کو اپریلس کہتے تھے جس کے معنی کھلنے کے ہیں، یہ نام انھوں نے غالباً اس لئے رکھا ہوگا کہ اس موسم میں کلیاں کھلتی ہیں۔ انگلستان کے پرانے باشندے اس کو ایسٹر کا مہینہ کہتے تھے۔ اس مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے قاصد ادھر ادھر بھیجنے کا رواج کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کی سنت کے طور پر شروع ہوا۔ حضرت مسیح نے اپنے قاصد اسی دن ادھر ادھر بھیجے تھے۔ حضرت مسیح کی زندگی کا یہ واقعہ از منۂ وسطیٰ میں ایک اعجازیہ کا موضوع بنا رہا جو ایسٹر کی تقریب میں کھیلا جاتا تھا۔ اس مہینہ کی پہلی تاریخ کو انجان لوگوں کے ساتھ مذاق کرنے اور ان کو بے وقوف بنانے کا رواج سارے یورپ میں عام ہوگیا۔ معلوم نہیں اس کی ابتدا کب ہوئی۔ باور کیا جاتا ہے کہ انگلستان اور جرمنی والوں نے فرانس کی تقلید میں پہلی اپریل کی تقریب منانا شروع کی۔ فرانس میں جو لوگ پہلی اپریل کو بیوقوف بنائے جاتے ہیں ان کو "اپریل کی مچھلی" کہا جاتا ہے۔ انگلستان میں انھیں "اپریل کا بیوقوف" سمجھا جاتا اور اسکاٹلینڈ میں "کوکل"۔ انگلستان میں سب سے زیادہ عام مذاق جو اس دن کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ کسی کو بے وقوفانہ کام پر لگا دیا جائے یا کسی سے ملاقات کا تصفیہ کرکے ملاقات نہ کی جائے یا پھر کسی راستہ چلنے والے سے کہا جائے کہ اس کے چہرے پر مکھی بیٹھی ہے یا کیچڑ لگی ہوئی ہے اور جب وہ کیچڑ صاف کرنے یا مکھی اڑانے کے لئے ہاتھ اٹھاتا ہے تو سب چلاتے ہیں "اپریل کا بے وقوف"۔

یورپ والے بہت مصروف زندگی بسر کرتے ہیں اس لئے انھوں نے مذاق اور بے وقوفی کے لئے ایک دن مقرر کر لیا۔ بے روزگاری اور فرصت نے ہندوستان کو بے وقوف بنا رکھا ہے اور ہندوستانیوں کی زندگی کو مذاق۔ اس لئے ہمارے ملک میں مذاق اور بے وقوفی کی وسعتیں کہیں زیادہ ہیں۔ ہم میں سے ہزاروں روزانہ بے وقوف بنتے ہیں اور اپنی بے وقوفی کو مذاق سمجھ کر ٹال دیتے ہیں۔ غرض ہماری زندگی کا ہر دن "پہلی اپریل" ہے۔ بیروزگاری اور فرصت کے سلسلے میں مجھے یہ کہنے دیجئے کہ بیروزگاری ایک صلاحیت ہے جو کام نہ کرنے والوں کو شکوہ سنج بنا دیتی ہے اور فرصت ایک وقفہ ہے جو ہم کو ہوائی محلوں کے خواب دکھاتا ہے۔ ہماری زندگیوں سے اگر بیروزگاری کی آہ اور فرصت کی واہ کو نکال دیا جائے تو پھر خواب و خیال کی دنیا ختم ہی ہو جائے گی۔ خیر تو جب تک ہمارے ملک پر یورپ کی تہذیب کا اثر نہیں پڑا تھا۔ "اپریل" کو منانا تو ایک طرف سمجھا بھی نہیں گیا تھا۔ لیکن مشرق کے لئے جب سے مغرب نے اپنے آپ میں کشش پیدا کرلی ہے ہم میں سے بعض لوگ اس رسم میں شریک ہوگئے ہیں۔ کیا برا ہے اگر اس بہانے دل میں ایک لہر اٹھے۔ اور ہونٹوں پر ایک تبسم آئے۔

یہ تو آپ جانتے ہیں کہ مذاق مذاق میں فرق ہے۔ اگر سرکس کے مسخرے کی طرح ہم قلابازیاں لگانے لگیں تو یہ ایسا ہی مذاق ہوگا جیسے ہندوستانی فلم کے ہیرو کی فراق دوست میں سنجیدگی۔ جب تک تمسخر اور مذاق میں فرق نہ کیا جائے گا قہقہوں سے منہ بگڑتے رہیں گے، ہونٹوں پر تبسم نہیں آئے گا، قہقہے تو ڈگڈگی بجا کر اور بندر نچا کر ہر مداری وصول کر لیتا ہے لیکن سچی مسکراہٹ کو دل سے ہونٹوں پر کھینچ لانا آسان کام نہیں۔ دل کو ہنسانے کے لئے ایک پاکیزہ مذاق کی ضرورت ہے اور مذاق کی پاکیزگی اپنے اطراف نازک حدیں رکھتی ہے۔ ذرا ان حدوں سے نکلے اور مذاق کرکرا ہوگیا۔ یہ تو ہوا مذاق۔ آئیے بے وقوفی کے متعلق بھی کچھ سن لیجئے۔ بیوقوفی جو کچھ بھی ہو لیکن بے وقوف بنانے والوں سے زیادہ بے وقوف بننے والوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں۔ بے وقوف بنانے والوں کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ بے وقوف بناتے وقت خود بیوقوف نہ بن جائیں۔ لیکن بے وقوف بننے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ بے وقوف بنیں۔ محسوس کریں لیکن اپنی بے وقوفی کو

چھپا ئیں۔ دنیا میں بہت کم بے وقوف ایسے ہیں جو بے وقوف بن کر خود کو عقلمند نہیں سمجھتے۔ "عقلمند بے وقوفوں" کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کو چھپا کر دوسروں کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے۔ اور دوسرے کو بے وقوفی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی ہر بے وقوفی کو عقل مندی کی سند سمجھتا ہے۔ عقلمند بیوقوف کے علاوہ بھی دنیا میں ہزاروں طرح کے مستقل بے وقوف موجود ہیں۔ ایک بے وقوف تو وہ ہے جس کو "روشنی طبع" بے وقوف بنا دیتی ہے اور وہ ہر دوسرے شخص کو اپنے مقابلے میں بے وقوف سمجھتا ہے۔ ممکن ہے دنیا ایسے بے وقوفوں سے کسی دور میں خالی نہیں رہی ہو۔ لیکن موجودہ دور جس طرح پروپگنڈے کا دور ہے اسی طرح اسے روشن طبع بے وقوفوں کا دور کہا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اگر سارے عقلمند کانفرنسیں منعقد کرنا، جلوس نکالنا، نعرے لگانا اور قرار دادیں منظور کرنا چھوڑ دیں تو دنیا اتنی بے وقوف نہ رہے جتنی کہ اب ہے۔ خیر۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کی بے وقوفی محض جاہلیت یا کم علمی ہوتی ہے۔ جب تک اس کے دیوان خانہ میں سند نہ لٹکے۔ سند کی نقلیں جب تک درخواستوں کے ساتھ منسلک نہ ہوں اور درخواستیں جب تک "بشرف ملاحظہ" سے شروع ہو کر "واجب تھا عرض کیا" پر ختم نہ ہوں اس کی بے وقوفی میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ عقل کی پیمائش سند کے بغیر ممکن نہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہے جو بے وقوف بنانے کے لئے بے وقوف بنا پھرتا ہے۔ لوگ اسے بیوقوف سمجھ کر خود بے وقوف بنتے ہیں اور وہ بے وقوفی سے اپنے سارے کام نکال لیتا ہے۔ فقیر اپنے آپ کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر بولتا ہے۔ "ایک پیسہ لوں گا ہزار دلا دوں گا۔" ہم اسے پیسے دیتے ہیں۔ لیڈر کہتا ہے "ساری دنیا خطرے میں" اور ہم اس کی پناہ میں آجاتے ہیں۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو ساری دنیا عقلمند کہتی

ہے۔ یہ بے وقوف "لال بجھکڑ" قسم کا ہوتا ہے اور "لال بجھکڑ" کے قسم کا کام کر کے عقل مند مشہور ہو جاتا ہے۔ ایک بھینس نے اپنا سر ایک مٹکے میں پھنسا لیا تھا۔ گاؤں والے پریشان ہوئے کہ اب کیا کیا جائے۔ ایک ہی حل تھا اور وہ "لال بجھکڑ" کی مدد لینا۔ چنانچہ لال بجھکڑ کو صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا گیا۔ لال بجھکڑ نے اپنی تدبیر سے فوراً مشورہ دیا کہ پہلے تو بھینس کی گردن کاٹ ڈالی جائے۔ اس طرح بھینس کا جسم نکل جائے گا۔ اب رہ گیا سر تو اس کے لئے پتھر سے مٹکا پھوڑ دیا جائے۔ ہاں تو اس قسم کے بے وقوف کی مدد سے ہر مسئلہ ایک نیا مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ اور مسائل کے ہجوم میں وہ ایک عقلمند کی طرح اپنا الو سیدھا کرتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہے جس کو حالات بے وقوف بنا دیتے ہیں۔ حالات سے بنے ہوئے بے وقوفوں میں سب سے زیادہ دلچسپ ماضی کو پوجنے والا ہوتا ہے۔ وہ ماضی میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ حال اس کے آنسوؤں میں بہہ جاتا ہے۔ اور مستقبل تو دھندلی نگاہوں کو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ حال کا بے وقوف خود فراموش ہوتا ہے۔ اسے اپنی بھی خبر نہیں ہوتی۔ خود کو دھوکہ دیتا ہے۔ دوسروں کو دھوکے میں رکھتا ہے۔ اس طرح بعض وقت بے حال اور بعض وقت بحال ہو کر حال کو بے معرف بنا دیتا ہے۔ مستقبل کا بے وقوف سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ دن کو خیال اور رات کو خواب اس کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ وہ شیخ چلی کی طرح ہوائی قلعے بنانے میں زندگی بسر کر دیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جسے مطلبی بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ یہ بے وقوف غریب مسکین بن کر آستینوں میں سانپ کی طرح کھیلتا ہے۔ اور جب مطلب نکل جاتا ہے تو شیر کی طرح جھپٹ کر اپنی بے وقوفی کا خراج وصول کر لیتا ہے۔ ایک بے وقوف وہ ہوتا ہے جس کو بے وقوفی سے فطری مناسبت ہوتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے اپنی بے وقوفی کے مظاہرے کرتا ہے اس کی بیوقوفی اکثر

لوگوں کا جی بہلاتی ہے۔ اور بعض وقت نقصان کرتی ہے۔
غرض دنیا میں ہزار طرح کے ہزار بے وقوف ہیں۔ آپ سوچیں یا نہ سوچیں، میں تو اکثر یہ سوچتا ہوں کہ میرا شمار بے وقوفوں کے کس گروہ سے ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں اگر اپنے آپ کو بے وقوف نہ سمجھوں تو دوسرے بھی مجھے بے وقوف نہ سمجھیں۔
ان سب سے علحدہ ایک ان بے وقوفوں کا گروہ ہے جس میں عقلمند سے لیکر بے وقوف تک سب نظر آتے ہیں۔ ان اصحاب کو پہلی اپریل کی خوشی میں حماقت کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ مجھے کیا آپ کو بھی ہمدردی ہے ان تمام سے جنھوں نے اس مہینے کی پہلی تاریخ کو ہوتے ہیں کوئی نہ کوئی حماقت کی۔ جھنجھلائے اور پہلی اپریل کے خیال سے ہنسنے لگے! ورمیری کیا آپ کی بھی مبارکباد ان لوگوں کے لئے جنھوں نے دوسروں کو بے وقوف بنانے میں کامیابی حاصل کی اور خود بے وقوف نہیں بنے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنگ کے زمانے میں بیوقوفی اور مذاق کا کوئی موقع نہیں ہے۔ لیکن یہ نظریہ تصویر کے صرف ایک ہی رخ کو پیش کرتا ہے۔ سچ پوچھئے تو عقلمندی سے بے وقوفی اور سنجیدگی سے مذاق بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اطالیہ نے مذاق سمجھ کر ایک کام کیا۔ نتیجے میں بے وقوفی ملی۔ جرمنی جنگ کی دنیا میں کئی دفعہ بے وقوفیاں کر چکا ہے لیکن ہر بے وقوفی کو مذاق سمجھ کر پی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بے وقوفی ہی آخر میں عقلمندی کو فتح مند بنائے گی اور دنیا آمریت کے احمقانہ مظالم سے چھٹکارا پا کر رہے گی۔

میکش

گریہ و تبسم :۔ صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔
صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام قیمت (عالی)

محبت کی چھاؤں :۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی رعنائیوں سے معمور ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لیے ایک شائستہ ذہنی تفریح ہے۔
چھوٹی تقطیع ۱۳۲ صفحات قیمت مجلد عہ

کاغذ کی ناؤ :۔ صاحبزادہ میکش کے مختصر ڈراموں کا مجموعہ ہے جن میں غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں۔ ہر ڈراما تمثیلی کرداروں کو پیش کرتا ہے اور تقریباً تمام تمثیلی کردار غریبوں کے مسائل حیات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان ڈراموں میں تمثیل نگار کی روح کی تڑپ اور دل کی دھڑکن اپنے حقیقی جذبات کو لفظی پیکر پہنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ طرز بیان انتہائی سادہ اور شگفتہ ہے۔ صفحات ۱۲۰ قیمت عہ

تجربہ

لاکھ توڑے خزاں چمن پہ غضب — ہے چمن پھر بھی اک جہانِ طرب
دشت، نذرِ غمِ تہی دستی — زربفت غنچہ اس میں پھوٹا کب
سروِ رقصاں و بیدِ لرزاں میں — ہمسری کا نہیں ہے کوئی سبب
نخلِ آہ و نہالِ باغ جدا — ہیں ایک ان سبھی قدوں کا ڈھب
گرد آلود خاک سے چہرے — چمک اٹھی جبیں طلا زر جب
اس نے پیتل کو کہہ دیا سونا! — خود دکھاتا ہے طفلکِ مکتب
فرق بد اصل و پاک گوہر میں — کیوں دکھائیں نہ بلبل و عقرب

ہیں شریف و رذیل ایسے ہی
مظہرِ لطف و رونمائے غضب

(۲)

آدمی آدمی نہیں یکساں — گرچہ فی الاصل آدمی ہیں سب
کرکے سب سے برابری کا سلوک — دل میں پچھتائے جا رہا ہوں اب
ہم محلہ ہیں میرے، شیخ گھڑو — نام سے ہے عیاں وقارِ نسب
بھائی! آداب عرض کرتا ہوں — خود کہا میں نے ان کو دیکھا جب
سبقت کی نہیں انھوں نے کبھی — گرچہ میرا عمل تھا درسِ ادب
دفعتہً کل مجھے خیال آیا — آخر اس سرکشی سے کیا مطلب
میں جو چپ آج ہو گیا عمداً — چل دیئے شیخ جی بھی مہر بہ لب

کیا قیامت ہے اے علی منظور
ہیں گھڑو صاحب* تک سلام طلب

سید علی منظور

*دکن میں صاحب کی یہی درگت بنتی ہے اور تو اور صاحب عالیشان بھی بڑے صاب کہلاتے ہیں۔

تم

زخم وہ دل پہ لگا ہے کہ دکھائے نہ بنے
اور چاہیں کہ چھپائیں تو چھپائے نہ بنے

تم میری زندگی میں بہار بن کر آئے۔ قرار بن کر دل کی اجڑی بستی بسا دی۔ اب جبکہ تم رگ رگ میں سما چکے ہو مجھے بسمل کی طرح تڑپا رہے ہو۔ تم میرے درد سے لاپروا میری تڑپ سے بیگانہ ہو گئے ہو ـــــ آرزو تو یہ تھی تم کو آنکھوں کا نور دل کا سرور بنا کر رکھتی۔ اپنی زندگی کے چند روز تمہارے سایہ میں چین سے گزارتی۔ میرا دم تمہارے قدموں پر نکل جاتا اور میری زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ لیکن فلک کج رفتار کو یہ منظور نہ ہوا ـــــ میں نے آفتاب کا طلوع بھی دیکھا اور غروب بھی۔ مگر زندگی کا روشن پہلو ہمیشہ میری نظروں کے سامنے رہا۔ میں غروب کا مقصد نہ سمجھ سکی۔ کاش انسان پہلے اپنے انجام کو سوچ لے۔ لیکن۔ تم نے مجھے سوچنے کا موقعہ بھی نہ دیا۔ شاید یہی میری تباہی کا باعث ہوا۔ ہر عروج کے ساتھ زوال اور بدر کے ساتھ ہلال ہے ـــــ لیکن میں اپنی منزل پر پہنچ بھی نہ سکی۔ پہلی ہی سیڑھی پر خزاں نے مجھے لوٹ لیا۔ اب اس کا گلہ کس سے کروں خدا سے ـــــ یا ـــــ بندہ سے ـــــ تمہاری محبت میرے دل ہی نہیں جان کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے ـــــ اب یہ جان کے ساتھ ہی جائے گی ـــــ مگر یہ جان بھی بہت سخت اور کٹھن ہے ـــــ نہ نکلتی ہے نہ چین لینے دیتی ہے ـــــ یہ تھا محبت کا آغاز ـــــ اور یہ انجام ہے ـــــ

ضبط کی تاب نہ یارائے خموشی مجھ کو
ہائے اس دردِ محبت کو چھپاؤں کیونکر

م۔ ح۔ ب

غزل

تو اور تیری عبادت گاہیں
منزل ایک ہزاروں راہیں

اٹھتیں ایسی کس کی نگاہیں
تھم گئے آنسو، رک گئیں آہیں

کیا جانیں بے چاری نگاہیں
دل کو دل سے ہوتی ہیں راہیں

دل میں شوقِ منزل لیکر
چلتا ہوں، بنتی ہیں راہیں

کون خطا کارِ الفت ہے؟
میرا دل یا تیری نگاہیں؟

پھر کیا ہے معیارِ الفت
چاہنے والے کیونکر چاہیں

شاید دل پر آنچ ہے آئی
آگ لگاتی نکلیں آہیں

درد کا ناممکن نہیں درماں
ہو سکتا ہے آپ جو چاہیں

غم کا مداوا، دل کی تسلی،
چند تبسم، چند نگاہیں

ہر ذرہ ہے حسن بداماں
کس کو چاہیں کس کو نہ چاہیں؟

ٹوٹی امیدوں کے ہیں نظارے
جلتے آنسو، ٹھنڈی آہیں

پیہم نقشِ پا کا تسلسل
پیدا کر دیتا ہے راہیں

دامودر ذکی ٹھاکر

پس اندازی کی اہمیت

ماہرین معاشیات کے متعلق یہ اکثر سننے میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات پر بہت کم قائم رہتے ہیں اور بار بار اپنی رائے بدلتے ہیں۔ کبھی وہ لوگوں کو ضروریات پر آمدنی کا زیادہ سے زیادہ حصہ صرف کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور کبھی صرف میں کمی اور زیادہ سے زیادہ پس اندازی کی تلقین کرنے لگتے ہیں۔ ماہرین کی رائے میں اس قسم کی تبدیلی حالات بدل جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ کساد بازاری کے حالات میں صرف میں اضافہ روزگار میں اضافہ کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کساد بازاری کے برے اثرات کو جلد دور کیا جا سکتا ہے۔ جنگی معیشت کا مرکزی اور متفقہ مقصد دشمن کے خلاف فتح پانا قرار پاتا ہے اور اس کے لئے زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل جنگ کے دیوتا کی بھینٹ کرنے پڑتے ہیں۔ اگر عوام اپنے صرف میں کمی نہ کریں تو حکومت آسانی سے ان وسائل کو حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لئے صرف میں کمی اور پس اندازی کا مشورہ دیا جاتا ہے۔

جنگ کے دوران میں حکومت کے مصارف کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔ ان مصارف کی پابجائی کئی مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ ان طریقوں کو اختیار کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عوام اپنے صرف میں کمی کریں۔ مختلف قسم کے محاصل میں اضافہ کر دیا جاتا ہے اور نئے نئے محاصل عائد کئے جاتے ہیں۔ لیکن قوم میں محاصل کا بار برداشت کرنے کی صلاحیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اگر جنگ کے تمام کے تمام مصارف محاصل کے ذریعے سے پورے کئے جائیں تو معاشرہ پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں اور اس لئے حکومتیں محاصل میں ممکنہ اضافے کے ساتھ ساتھ عوام اور اداروں سے زیادہ سے زیادہ قرضے حاصل کرنے کی بھی کوشش کرتی ہیں۔ حکومت کو قرض دینے والے اشخاص ضروریات کو ملتوی کر کے صرف میں کمی کرتے ہیں۔ عام طور پر حکومتیں قرضے کے اختیاری طریقے کو پسند کرتی ہیں۔ حکومت قرضے لینے کا اعلان کر دیتی ہے اور عوام کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ چاہیں تو قرضہ دیں کسی قسم کا جبر نہیں کیا جاتا۔ البتہ اخباروں، سینما، اشتہارات اور جلوس کے ذریعے سے جنگ کے دوران میں لوگوں کے قومی جذبات کو ابھار کر صرف میں کمی کرنے اور حکومت کو قرض دینے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ شہروں اور دیہات میں پس اندازی کے ہفتے منائے جاتے ہیں اور عوام کی طرف سے پس اندازی کی مہم کو منظم کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ راشن بندی اور بعض دوسرے معاشی کنٹرول (مثلاً خانگی سرمایہ کاری پر حکومت کا تسلط) قائم کر کے افراد کو صرف میں کمی پر مجبور کیا جاتا ہے۔

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قرضے حاصل کرنے کے صرف اختیاری طریقے کو اختیار کر کے کم آمدنی پانے والے اشخاص کو قرضے دینے کی ترغیب نہیں دلائی جا سکتی۔ اگر ان کے صرف میں کمی نہ کی گئی تو آمدنی بڑھنے کی وجہ سے یہ لوگ اشیا کی محدود مقداروں کو خریدنے کی کوشش کریں گے جس کا لازمی نتیجہ قیمتوں کا بڑھنا اور بالآخر افراط زر کے برے اثرات پیدا ہونا ہوگا۔ انہی حالات کو روکنے کی غرض سے انگلستان کے مشہور معاشی لارڈ کینس نے موجودہ جنگ شروع ہونے کے چند مہینوں کے بعد لازمی پس اندازی کی ایک اسکیم پیش کی تھی۔ شروع کے دو سالوں تک حکومت برطانیہ اور برطانوی عوام نے جن کے مفاد کی خاطر اصل میں یہ اسکیم تیار کی گئی تھی، اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی لیکن دو سال بعد حالات نے مجبور کیا کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ اب کم آمدنی پانے والے اشخاص بھی لازمی طور پر اپنی آمدنی کا ایک خاص فی صد حکومت کو بطور قرض

دیتے ہیں جب تک جنگ جاری ہے قرض دینے والوں کو سود ملتا رہے گا اور جنگ کے خاتمہ پر کسی موزوں وقت پر ان قرضوں کی رقم واپس کی جائے گی۔

دوسری حکومتوں کی طرح حکومت ہند کے مصارف بھی جنگ کی وجہ سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ البتہ فرق یہ ہے کہ حکومت ہند نے اپنے مصارف کو بڑی آسانی سے پورا کرلیا ہے۔ محاصل میں اضافہ ہوا ہے اور مختلف طریقوں سے اختیاری اور لازمی قرضے لئے گئے ہیں۔ حکومت ہند کے موازنہ میں توازن قائم رہنے کے باوجود اتحادی اقوام کی جنگی ضروریات پوری کرنے کی غرض سے افراط زر کی پالیسی اختیار کرنی پڑی۔ جس کی وجہ سے زر کی مقدار بڑھی اور ہندوستانی معاشرہ کو افراط زر کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ حیدرآباد کی معیشت چونکہ برطانوی ہند کی معیشت سے بالکل جدا نہیں ہے اس لئے یہاں افراط زر کے اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ حالی روپے کی مقدار میں اتنا زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ کلدار کی مقدار میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ حکومت سرکارعالی کے موازنہ میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس جنگی حالات کی وجہ سے حکومت کی آمدنی جنگ سے پہلے کے مقابلہ میں تقریباً دوچند ہوگئی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس سال کے مالیہ میں تین کروڑ کی بچت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ ہمارے یہاں سب سے اہم مسئلہ افراط زر کے حالات کو روکنا اور اس کے اثرات سے معاشرہ کے مختلف طبقات کو محفوظ رکھنا ہے۔ اس کے لئے پچھلے سال زائد منافع پر محصول عائد کیا گیا تھا۔ یہ محصول اس سال کے مالیہ میں بھی برقرار رکھا گیا ہے۔ یہاں اس کا تذکرہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محصول زائد منافع کے سلسلے میں جو بھی رقم وصول کی جائے گی اس کا ایک خاص فی صد جنگ کے بعد ادا کرنے والے اداروں اور افراد کو واپس کردیا جائے گا تاکہ جنگ کے بعد کساد بازاری کے حالات میں واپس شدہ رقم سے کاروبار کی حالت کو سدھارنے میں مدد مل سکے اس طرح سے انھیں لازمی طور پر پس انداز کرنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے۔ کم آمدنی پانے والے اشخاص کو ترغیب دلانے اور سہولت پہنچانے کی خاطر حکومت سرکارعالی کی طرف سے (Cash Certificates) جاری کئے جاتے ہیں اور بنک اور دوسرے اداروں کے لئے سرکاری ہنڈیوں کے طریقے کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی اور اجتماعی آمدنی کا ایک حصہ لازمی طور پر حکومت کے پاس بطور امانت جمع کیا جائے۔ ان امانتوں پر دو فی صد سالانہ سود دیا جائے گا اور یہ امانتیں پانچ سال کے بعد یا جنگ ختم ہونے کے ایک سال کے بعد واپس کی جائے گی۔ لازمی پس اندازی کی اسکیم کے تحت افراد اور کمپنیوں سے ایسی آمدنیوں کا ایک خاص فی صد بطور امانت طلب کیا جائے گا جو محصول زائد منافع سے مستثنیٰ ہوں۔ چھ ہزار سالانہ یا اس سے کم آمدنی پانے والے اشخاص پر اس اسکیم کا اطلاق نہیں ہوگا۔ جن اشخاص کی آمدنی چھ ہزار سے بارہ ہزار روپے سالانہ ہے انھیں دقتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خاص طور پر گنجائش رکھی گئی ہے۔ اگر وہ بیمہ یا پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی آمدنی پر ادا شدنی امانت کی شرح کے دوچند سے زائد قسطیں دیتے ہوں تو ان سے امانت کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے جیسے آمدنی میں اضافہ ہوگا آمدنی کا زیادہ فی صد لازمی پس اندازی کے سلسلے میں دینا پڑے گا۔

لازمی پس اندازی کی اسکیم کو نافذ کرکے حکومت سرکار عالی نے بالکل صحیح اقدام کیا ہے خاص طور پر جب کہ مملکت آصفی کے مالدار طبقے پر محصول آمدنی یا انکم ٹیکس عائد نہیں کیا گیا ہے۔ اب تک حکومت نے پانچ سو روپے ماہانہ سے زیادہ آمدنی پانے والوں کے لئے لازمی پس اندازی کی اسکیم جاری کی ہے۔ کم آمدنی والوں کے لئے اس قسم کی کوئی اسکیم جاری نہیں ہوئی ہے۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اس قسم کی اسکیم کو کم آمدنی والوں کے لئے انگلستان جیسے ملک میں زیادہ آسانی اور کامیابی سے چلایا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں کے حالات میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے یہاں مزدور طبقہ کے لئے لازمی قرضے کے طریقے کو اختیار کرنے میں بہت سی دقتیں پیدا ہوں گی۔ گھریلو صنعتوں کے لئے مزدور اور زرعی مزدوروں کو اس کے دائرہ میں شامل نہیں کیا جا سکتا البتہ بعض منظم صنعتوں کے مزدوروں کو جنگی تمسکات کی شکل میں انعام (Bonus) تقسیم کرکے لازمی قرضے ادا کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

زرعی طبقے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اس وقت کے حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنی زائد آمدنی کا کچھ حصہ آئندہ کے لئے بچائے۔ اس وقت کی پس انداز کی ہوئی دولت جنگ کے بعد کی ضروریات اور زمین کی ترقیات وغیرہ پر صرف کی جا سکے گی۔ اس وقت یہ دیکھا جا رہا ہے کہ زرعی طبقہ اپنی خوش حالی کا غلط اندازہ لگا کر شادی وغیرہ پر بہت زیادہ صرف کر رہا ہے۔ یا پھر یہ لوگ اپنی زائد آمدنی سے سونا اور چاندی خرید رہے ہیں۔ ان کے لئے اس طرح سے اپنی آمدنی کو خرچ کرنا کسی طرح سے بھی مفید نہیں ہے، اس وقت سونا اور چاندی کی قیمت دوسری چیزوں کی طرح کئی گنا بڑھی ہوئی ہے اور یہ ایک لازمی امر ہے کہ معمولی حالات میں ان کی قیمت موجودہ قیمت کی نصف اور تہائی بھی نہ رہے گی۔ اس لئے اپنی رقم کو ایسی چیزوں کی خریداری پر جن کی قیمت گرنے والی ہے، صرف کرنے میں سوائے نقصان کے کچھ فائدہ نہیں۔ زرعی طبقے کے لئے لازمی پس اندازی کو اس طرح سے اختیار کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت لیوی کے طور پر غلہ ان سے وصول کیا جا رہا ہے اس کی قیمت پوری کی پوری اس وقت ادا نہ کی جائے بلکہ اس کا ایک خاص حصہ مختلف طریقوں سے حکومت کی تمسکات میں لگا دیا جائے۔ بقیہ قیمت کے بدلے میں یہ تمسکات کاشتکاروں کو دیدی جائیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ زرعی اجناس کی قیمت کا تعین کرتے وقت ان کے مصارف پیدائش کا بھی خیال رہے۔ کاشتکار کو معقول قیمت ملے تاکہ وہ منافع کمانے کے قابل ہو سکے۔ زرعی طبقے کو اختیاری پس اندازی کی ترغیب بھی مختلف طریقوں کو اختیار کرکے دلائی جا سکتی ہے۔ یہ لوگ جاہل ہونے کی وجہ سے حالات سے واقف نہیں ہوتے۔ پروپگنڈا کرکے یہ چیز واضح کی جائے کہ اس وقت خرچ میں زیادہ فائدہ نہیں الٹا نقصان ہے۔ پس اندازی ہی موجودہ حالات میں ان کے لئے بہتر ہے۔ ان کے لئے ڈاک خانہ کے سیونگ بنک میں سہولتیں فراہم کرنے سے کچھ زیادہ کام نہیں نکلے گا۔ اس سلسلے میں انجمن ہائے امداد باہمی سے بہت مفید کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ انجمنیں ایسے کھاتے کھولیں جن میں کاشتکار اپنی رقم اس شرط کے ساتھ جمع کرے کہ یہ رقم جنگ کے ختم ہونے کے بعد ہی واپس کردی جائے گی۔ امریکہ میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ بعض چیزوں کی قیمتیں اقساط کی شکل میں جنگ کے دوران میں ادا کردی جائیں گی اور جنگ کے اختتام پر رقم ادا کرنے والوں کو چیزیں ملیں گی اس طریقہ کو

حیدرآباد میں زرعی طبقے کے لئے بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ کاشتکار اپنی اپنی انجمنوں میں جانور، زرعی آلات اور مشینیں خریدنے کے لئے اقساط ادا کرتے رہیں اور جنگ کے ختم ہونے پر انھیں ان کی مطلوبہ چیزیں فراہم کی جائیں۔
ایسے لوگ جن کی آمدنی پانچ سو روپے ماہوار سے کم ہے انھیں بھی پس انداز کرنے کی ترغیب دلائی جائے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ پروپگنڈے کے موزوں طریقے اختیار کرکے سیونگس بنک میں انھیں اپنی رقمیں جمع کرنے کا مشورہ دیا جائے اور یہ رقمیں جنگ کے دوران میں واپس نہ کی جائیں بلکہ جنگ کے ختم ہونے پر ادائی ہو۔ اس سے بھی کہیں زیادہ مفید طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے بیمہ کی افادیت کا چرچا زیادہ سے زیادہ کیا جائے۔ اب تک تعلیم یافتہ طبقے نے بیمہ کے فوائد کو صحیح طریقے پر سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہے اور اس لئے اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا جاتا اور بہت سے ایسے اشخاص جن کی آمدنی اچھی خاصی ہوتی ہے اپنی اولاد کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے۔ حکومت سرکار عالی نے سرکاری بیمہ کا طریقہ رائج کیا ہے لیکن اس سے بھی جو فائدہ اٹھایا جاتا ہے وہ خاطر خواہ نہیں۔ سرکاری ملازمین صرف تکمیل ضابطہ کی خاطر اس میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بیمہ کے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے تاکہ لوگوں میں پس اندازی کی عادت پیدا ہو۔
اب تک لازمی اور اختیاری پس اندازی کے جو طریقے بیان کئے گئے ہیں ان کا معاشرہ کے نقطۂ نظر سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ حکومت صرف مالدار اور سرمایہ داروں ہی کی مقروض نہیں رہے گی بلکہ دوسرے طبقات بھی قومی قرضے کے مالک بن جائیں گے اور حکومت کے مالیاتی استحکام میں مختلف افراد اور طبقات کی دلچسپی بڑھ جائے گی۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ کم آمدنی پانے والا اور متوسط الحال طبقہ گرانی کی وجہ سے ویسے ہی پریشان ہے۔ اگر اسے پس اندازی پر مجبور کیا جائے تو اس کی مشکلات میں اور بھی اضافہ ہو جائے گا لیکن یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ پس انداز نہ کرنے سے حالات اور زیادہ ابتر ہو جائیں گے جب ہر شخص یہ کوشش کرے گا کہ اشیاء کی جو حکومت کی خریداری کے بعد محدود مقدار میں باقی رہ گئی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ قیمت پر خریدے تو اس کا لازمی نتیجہ چیزوں کی قیمت کا بڑھنا اور افراط زر کے حالات میں شدت کا پیدا ہونا ہوگا۔ افراط زر سب سے زیادہ غریب طبقہ کو متاثر کرتا ہے۔ سرمایہ داروں اور مالداروں کو منافع کمانے کے اور مواقع پیدا ہو جاتے ہیں دولت کی تقسیم میں عدم مساوات بڑھ جاتی ہے۔ مزید برآں اس وقت جب کہ روپے کی قدر صرف پانچ یا چھے آنے کے برابر رہ گئی ہے چیزوں کو خریدنے میں نقصان ہے جنگ کے بعد جب کہ حالات میں دوبارہ توازن قائم ہو جائے گا اور روپیہ اپنی اصلی قدر پر آجائے گا اس وقت روپیہ صرف کرکے زیادہ مقدار میں چیزیں حاصل کی جائیں گی۔ غرض پس اندازی اور کفایت شعاری خود عوام کے نقطۂ نظر سے بھی بہت زیادہ مفید ہے اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ لوگ بھوکے مریں اور پس انداز کریں۔ کہنے سے یہ مراد ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی ضروریات ملتوی کریں، سفر کم کریں۔ دعوتیں کم دیں اور رسومات اور شادیوں وغیرہ پر زیادہ صرف نہ کریں۔ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں اور ایسی ضروریات جن کو ملتوی کیا جا سکتا ہے ملتوی کر دیں۔ جنگ کے بعد اپنی ضروریات کی تکمیل کم روپیوں سے کی جا سکے گی۔ اس وقت پس انداز کی ہوئی دولت سے جنگ کے بعد زیادہ مقدار میں

چیزیں خریدی جاسکیں گی اور معیار زندگی کو بہتر بنایا جاسکے گا۔ اب جو کارخانے جنگی ضروریات کی چیزیں تیار کرنے میں مصروف ہیں جنگ کے بعد عوام کی ضروریات پوری کرنے والی اشیاء تیار کریں گے۔ چیزوں کی مقداروں میں اضافہ ہوجائے گا اور ظاہر ہے کہ وہ سستی بھی ہوں گی۔ اس وقت محنت کی کمائی کو کام میں لانے سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا۔ غرض اس وقت کفایت شعاری اور پس اندازی افراد اور حکومت دونوں کے نقطۂ نظر سے مفید ہے۔

ہمارے ملک میں پس اندازی کے فوائد صرف جنگ کے دوران ہی تک محدود نہیں ہیں جنگ کے ختم ہونے پر پس اندازی اور کفایت شعاری کے اور بھی بہتر نتائج پیدا ہوں گے۔ حیدرآباد میں معاشی منصوبہ بندی (جس کا مرکزی مقصد عوام کا معیار زندگی بلند کرنا ہے) کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہوگی اور یہ سرمایہ جنگ کے دوران میں پس انداز کی ہوئی دولت سے حاصل کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ جنگ کے بعد لوگوں کی قوت خرید میں کمی روزگار میں کمی کی وجہ سے ہوگی۔ لیکن اس کمی کی تلافی ایک حد تک پس انداز کی ہوئی دولت سے کی جاسکے گی اور کساد بازاری (جو جنگ کے بعد عموماً پیدا ہوتی ہے) کے حالات کو روکا جاسکے گا۔ اس طرح سے سرمایہ اور قوت خرید کی کمی کو جنگ کے دوران میں بچائی ہوئی دولت کے ذریعے سے دور کیا جاسکے گا اور ملک کی صنعتی ترقی میں مدد ملے گی۔ جنگ کے دوران میں بچانے اور مختلف قسم کے کاروبار میں لگانے کا ایک اور بڑا فائدہ بھی ہوگا۔ اب تک سرمایہ کے مالک صرف چند مالدار طبقات رہے ہیں اور انہی کی دولت میں مزید اضافہ ہوتا رہا ہے۔ جب چھوٹی چھوٹی بچتیں کرنے والے اپنے سرمایہ کو مختلف کارخانوں میں لگائیں گے تو وہ بھی کارخانوں کے حصہ دار بن جائیں گے اور اس طرح سے معاشرہ کے لئے اچھے اثرات پیدا ہوں گے، دولت کی تقسیم عدم مساوات میں کمی ہو جائے گی۔ جنگ کے دوران میں افراط زر کے اثرات کو روکنے اور جنگ کے بعد صنعتی ترقی کے لئے پس اندازی بہت ضروری ہے۔ جب تک ملک میں صنعتی ترقی نہیں ہوگی اور اس کی حیثیت زرعی ملک جیسی رہے، عوام کا معیار زندگی بلند نہیں ہوسکے گا۔ اس اہم موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں افسوس کرنا پڑے۔

امتیاز حسین خاں

معلم بالغاں

از مولوی سید زاہد حسین صاحب ایم اے۔ ایم ایڈ

تعلیم بالغاں کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت دی جارہی ہے اس کے پیش نظر یہ کتاب ادارہ کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ تعلیم بالغاں کی اہمیت، بالغوں کی نفسیات، طریقہ تعلیم اور چند عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ تعلیم بالغاں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ صفحات (۵۶) قیمت ۱۲ ار

(ملنے کا پتہ) سب رس کتاب گھر۔ رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن

ادھورے گیت

بانسری کی لے میں کتنے گیت ڈھلتے ہی رہے
نت نئے روماں مچلتے ہی رہے
آسماں سے بارشِ انوار ہو
بہہ رہی ہو چاندنی
پھیل جائیں نور کی کرنوں کے جال
رقص فرما ہوں مناظر گا رہے ہوں آبشار
گونج اٹھا ہو فضاؤں میں کوئی نوخیز راگ
ایک لامحدود نغمہ، اک مسلسل گیت، اک جھنکار ہو
جیسے پائل کی صدا ——
سطحِ دریا پر اچھلتی کودتی لہروں کا رقص
تیز ہو نبضِ حیات
گا رہی ہو کائنات
رقص کرتی ہو جوانی کی بہار
وقت کے یہ کیف زا لمحے نہ گن
میں نے صدیوں کو نچھاور کر دیا ——
ان حسیں لمحات پر
انبساط و کیف سے معمور ہیں
اک سرودِ غیر فانی، ایک لطفِ جاوداں
تشنگیٔ روح آسودہ نہیں
شوق کا یہ پیچ و تاب
نوجوانی ہے سراپا اضطراب
زندگانی ہے تمنا کا سراب
ایک نامعلوم غم !
ایک نغمہ، اک فسانہ، ایک غمِ انجام یاس
سیکڑوں برسوں سے اب تک تشنۂ تکمیل ہے

سردار الہام

غزل

غباروں سے الجھ جاتا ہے راہی
ارے توبہ تری عالم پناہی
کوئی تارا فلک سے ٹوٹ جائے
لرز جاتی ہے راتوں کی سیاہی
جنوں کو کیا نشاط و غم سے مطلب
محبت میں فقیری ہے نہ شاہی
ہوس صورت گرِ ہر حق و باطل
معاذ اللہ جہانِ مرغ و ماہی
برہنہ سر برہنہ پا ہے آدم
بہت آساں ہے تیری کج کلاہی
عبادت اک فریبِ سوزِ پنہاں
ارے توبہ طلسمِ خانقاہی
زمیں کو چین ہی لینے نہ دیں گے
محبت کے یہ ہنگامے الٰہی
مری آوارگی منزل نشاں ہے
دلیلِ راہ میری بے نگاہی
کہاں وہ خوابگہ کا تیری عالم
کہاں یہ پیدا و پنہاں تباہی

عزیز حامد مدنی

نئی کتابیں

۱ - نقش امروز (مجموعۂ کلام) از علی اشرف - حجم ۱۸۴ صفحے قیمت عالہ - پتہ کتاب خانہ - عابد روڈ حیدرآباد دکن -
۲ - ہندوستان کی فیصلہ کن جنگیں از محمود خاں محمود - قیمت عالہ پتہ ملک بک ڈپو - کگّے زئیان اسٹریٹ - لاہور
۳ - انقلابات ہیں زمانے کے (تاریخی افسانے) از محمود خاں محمود 〃 〃 〃
۴ - کھیل (افسانے) از خدیجہ مستور لکھنوی قیمت عالہ - پتہ ادارۂ ادبیات جدید لاہور -
۵ - بادۂ گلرنگ (افسانے) از ایم اسلم ۲۷۲ صفحے قیمت ۱۲ پتہ کتب خانہ دارالبلاغ - محمد نگر - میو روڈ - لاہور
۶ - خط کا جواب از ایم اسلم ۲۵۶ 〃 عالہ 〃 〃 〃
۷ - حسن سوگوار (ناول) از ایم اسلم 〃 عالہ ۱۲ 〃 〃 〃
۸ - جام شکستہ (افسانے) از ایم اسلم 〃 عالہ 〃 〃 〃
۹ - برہمن کی بیٹی (ناول) از سرت چندر چیٹرجی - قیمت عالہ پتہ کتابستان اُردو - اندرون لوہاری دروازہ - لاہور
۱۰ - اندھیری گلیاں (افسانے) از منشی تیرتھ رام فیروزپوری 〃 〃 〃
۱۱ - زخم (ناول) از آغا اشرف - قیمت ۸ 〃 〃 〃
۱۲ - بے پر کی (مزاحیہ افسانے) از آوارہ حیدرآبادی - قیمت عالہ پتہ کتب خانہ علم و ادب - دہلی
۱۳ - آئینے (افسانے) از راماننَد ساگر قیمت (۲) پتہ لاجپت رائے اینڈ سنز - لاہور -
۱۴ - زنداں (نظمیں) از یوسف ظفر حجم ۱۴۴ صفحے قیمت عالہ پتہ اُردو بک اسٹال - لاہور -
۱۵ - نور مشرق (نظمیں وغیرہ) از ضیاء فتح آبادی قیمت ۶ پتہ گجندر لال سونی نمبر ۴۲ دریا گنج - دہلی
۱۶ - مضراب (مجموعہ کلام) از راجا مہدی علی خاں قیمت ۸ پتہ ساقی بک ڈپو - دہلی -
۱۷ - نیا ادب میری نظر میں از عبدالحق جعفر علی خاں اثر وغیرہ قیمت عالہ پتہ لنگارستان ایجنسی اُردو بازار - دہلی
۱۸ - گم نام خطوط (ناول) از فراق کاظمی قیمت ۸ 〃 〃 〃
۱۹ - نئی فضائیں (منتخب افسانے) قیمت عالہ پتہ خاتون کتاب گھر - اُردو بازار - دہلی
۲۰ - گھما گھمی (افسانے) از ممتاز مفتی قیمت ۱۲ 〃 〃 〃

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

ہندوستان کی تجارت

از معین الدین بلگامی بی اے عثمانیہ
قیمت ۴ر - حجم ۸۴ صفحے
مقام اشاعت - فاطمہ منزل
حمایت نگر - حیدرآباد دکن

زیر نظر پمفلٹ میں ہندوستان کی تجارت پر سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش کی گئی ہے - اور سات عنوانوں کے تحت موضوع کو واضح کیا گیا ہے - (۱) ہندوستان کی معیشت میں تجارت کی اہمیت (۲) ہندوستان کی تجارت کے اقسام (۳) اندرونی تجارت (۴) بیرونی تجارت (۵) توازن تجارت و توازن ادائی (۶) تجارتی پالیسی (۷) موجودہ جنگ کے ہندوستان کی تجارت پر اثرات -

موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے کارآمد کتاب ثابت ہوگی -

ہندوستان کے زرعی مسائل

از شفیق الرحمن بی اے عثمانیہ قیمت ۴ر حجم ۸۲
مقام اشاعت - فاطمہ منزل - حمایت نگر - حیدرآباد دکن

ہندوستان زراعتی ملک ہے - اور اس کی ترقی کا انحصار محض زرعی ترقیوں پر ہے - گیارہ عنوانات کے تحت زراعت کے معاملات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے (۱) تاریخی پس منظر (۲) زرعی ترقی میں حکومت کا حصہ (۳) زمین کی زرخیزی (۴) کھاد کا استعمال (۵) ذرائع آب پاشی (۶) زمین کٹاؤ (۷) تقسیم و انتشار اراضی (۸) زرعی آلات (۹) مویشی (۱۰) زراعت دوران جنگ میں (۱۱) زرعی ترقی کا مستقبل -

زارعین کے لئے نہایت مفید معلومات یکجا کئے گئے ہیں اور نہایت اچھی طرح زراعت کے مستقبل پر روشنی ڈالی گئی ہے - ضمناً مویشیوں سے بھی بحث کی گئی ہے -

ہندوستان میں امدادِ باہمی کی تحریک

از محمد طاہر حامد عثمانیہ
قیمت ۴ر حجم ۸۰
ناشر:- ادارۂ معاشیات، فاطمہ منزل، حمایت نگر، حیدرآباد دکن

زیر نظر کتابچہ کے سات باب ہیں (۱) امداد باہمی کی تعریف (۲) مختلف ممالک میں امداد باہمی (۳) امداد باہمی کی ضرورت (۴) ہندوستان میں امداد باہمی کا نشو و نما (۵) امداد باہمی کے ادارے (۶) ریزرو بنک اور امداد باہمی (۷) امدادِ باہمی کا عملی پہلو اور مستقبل -

کافی اچھا مطالعہ ہے - اس تحریک سے ہندوستان میں ناکامی کے اسباب بیان کئے گئے ہیں اور اس کی امید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر اس کو صحیح اصولوں پر چلایا جائے تو بہت مفید ہوگی -

ہندوستان کی قومی آمدنی

از توفیق محمد خاں بی اے عثمانیہ قیمت ۴ر حجم ۸۰ صفحے
پتہ - فاطمہ منزل حمایت نگر - حیدرآباد دکن -

مضمون کو چار فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے - (۱) قومی آمدنی سے کیا مراد ہے ؟ (۲) ہندوستان کی قومی آمدنی کے مختلف اندازے (۳) قومی آمدنی معلوم کرنے کے طریقے (۴) قومی آمدنی میں اضافہ کی تجاویز -

معاشیات کے طالب علم یا معاشی مسائل سے دلچسپی رکھنے والے ضرور پڑھیں -

ہندوستان کا نظام بنک کاری

از رام اوتار بی اے عثمانیہ
قیمت ۴ر - حجم ۸۰ صفحے
پتہ - فاطمہ منزل - حمایت نگر - حیدرآباد دکن -

چار عنوانات کے تحت بنک کاری پر بحث کی گئی ہے (۱) بنکوں کی اہمیت (۲) ہندوستان میں بنک کاری کی تاریخ (۳) ہندوستانی بازارِ زر (۴) ریزرو بنک -

اس چھوٹے سے کتابچہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے - "ز س"

اطلاع - براہ کرم اپنے ذمے کا چندہ روانہ فرما کر شکریہ کا موقعہ عطا کیجئے -

ادارے کی خبریں

مرکز اردو امتحانات بمبئی کا جلسۂ تقسیم اسناد

۱۵ اپریل اتوار کے دن شام کو ۶ بجے انجمن اسلام ہال میں ایک جلسہ ہوا جس میں ان طلبہ کو جو ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے اردو امتحانات میں بمبئی مرکز سے کامیاب ہوئے سندیں دی گئیں۔ جلسہ کی صدارت جناب ڈاکٹر بدل الرحمٰن صاحب پرنسپل اسمٰعیل کالج نے فرمائی اور جناب پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب طلبہ کو مخاطب کیا۔

جلسہ کی ابتدا پنڈت کیفی کی مشہور نظم "ہماری زبان" سے جس کو ایک طالب علم نے نہایت خوش الحانی سے پڑھا، کی گئی۔ اس کے بعد انجمن اسلام کے مددگار معتمد اعزازی نے امتحانات کی رپورٹ پڑھ کر سنائی۔ سندوں کی تقسیم کے بعد ہر امتحان میں بمبئی مرکز سے درجۂ اول میں کامیاب ہونے والے امیدواروں کو کتابیں بطور انعام دی گئیں۔ یہ انعامات انجمن اسلام کو شہر بمبئی کی انجمن ترقی اردو کی طرف سے وصول ہوئی تھیں۔

پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی نے کامیاب امیدواروں کو مبارک باد دینے کے بعد ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کی ضرورت و اہمیت پر ایک مختصر گر جامع تقریر فرمائی۔ صاحب موصوف نے فرمایا کہ اگر ہندوستان ایک ہونا چاہتا ہے اور اگر ہندوستانی ایک دوسرے کی باتوں کو نہیں بلکہ دلوں کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کا تنہا حل یہی ہے کہ سارے ملک کی زبان ایک ہو جائے۔ پھر جناب موصوف نے بتایا کہ اردو ہی ہر حیثیت سے ہندوستان کی مشترکہ زبان بننے کی اہل اور حقدار ہے۔

جناب صدر نے اپنی تقریر میں کامیاب طلبہ کو اور آگے قدم بڑھانے کی ترغیب دلائی اور یہ امید ظاہر کی کہ یہ امتحانات اردو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد ثابت ہوں گے۔

مددگار معتمد اعزازی انجمن اسلام بمبئی

مرکز اردو امتحانات بمبئی کی رپورٹ

(جو ۱۵ اپریل کے جلسۂ تقسیم اسناد میں پڑھی گئی)

جناب صدر!

بمبئی میں تعلیم بالغان کا کام ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کے تحت ایک عرصے سے جاری ہے۔ اسی طرح بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں تعلیم یافتہ حضرات کو دوسری زبانوں کے ساتھ اردو پڑھانے کا کام بھی ایک مدت سے انجام پا رہا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں تعلیم ایک بہت محدود معیار پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی اور دوسری صورت میں کوئی باضابطہ نصاب اور معیار مقرر نہیں تھا۔ چند نوجوانوں کی جنھیں اردو زبان سے بہت دلچسپی ہے، ایک بہت ہی مختصر سی جماعت نے یہ طے کیا کہ دونوں صورتوں کی اصلاح کی جائے اور اس کے لئے مناسب یہ سمجھا گیا کہ ان تمام لوگوں کے لئے جو مختلف کلاسوں میں تعلیم حاصل کرتے ہوں امتحانات مقرر کئے جائیں۔ خوش قسمتی سے ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی سرپرستی میں تین چار سال سے باضابطہ نصاب و معیار کے تحت اردو امتحانات ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ان اردو دوست نوجوانوں نے ادارہ سے درخواست کی کہ بمبئی میں بھی ان امتحانات کا مرکز قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ ادارہ نے بڑی خوشی سے مرکز بنانے کی اجازت دی اور بمبئی میں اس سلسلہ کا پہلا امتحان دسمبر ۱۹۴۳ء میں ہوا۔

ادارہ کی طرف سے یہ امتحانات سال میں دو بار یعنی جولائی اور دسمبر میں ہوا کرتے ہیں۔ جولائی میں چار امتحانات یعنی اردو دانی، اردو زباں دانی، اردو عالم اردو فاضل ہوا کرتے ہیں۔ لیکن دسمبر میں صرف ابتدائی یعنی اردو دانی کا امتحان ہوتا ہے۔ چنانچہ دسمبر [illegible]

میں جب بمبئی میں پہلے پہل مرکز قائم ہوا تو صرف اردو دانی کا امتحان ہوا جس میں ۲۷ امیدوار شریک ہوئے اور ان میں ۲۱ کامیاب ہوئے۔

بانیان مرکز نے یہ محسوس کرکے کہ یہ ایک نہایت مفید اور اہم کام ہے اور چند افراد اس کو باضابطہ طور پر انجام نہیں دے سکتے اس کو انجمن اسلام کے سپرد کردیا تاکہ ایک پبلک ادارہ کی سرپرستی میں یہ مفید و اہم کام بہتر طور پر انجام پاسکے۔ چنانچہ اس سلسلے کا دوسرا امتحان جولائی ۱۹۴۴ء میں انجمن کی سرپرستی میں ہوا۔ اس دفعہ مختلف امتحانات میں امیدوار شریک ہوئے جن کی تعداد حسب ذیل ہے :-

اردو عالم	-	اردو زباں دانی	-	اردو دانی
۴ امیدوار	-	۱۰ امیدوار	-	۵۶ امیدوار

ان امتحانات کا نتیجہ حسب ذیل رہا :-

اردو عالم -	۴	امیدواروں میں	۴ کامیاب
اردو زباں دانی -	۱۰	"	۸ "
اردو دانی -	۵۶	"	۲۷ "

اردو دانی کے امتحان میں ایک خاتون بھی شریک تھیں اور یہی مرکز میں اول آئیں۔

اردو دانی کے امتحان میں دو تعلیم یافتہ ہندو حضرات بھی شریک تھے۔

اسی سال کا دوسرا امتحان دسمبر ۱۹۴۴ء میں ہوا اور حسب معمول صرف اردو دانی کا امتحان ہوا۔ اب کے بار ۵۸ امیدوار امتحان میں شریک ہوئے جن میں ۳۹ کامیاب ہوئے۔

امیدواروں میں ۱۳ تعلیم یافتہ خواتین بھی تھیں جن میں ایک پارسی اور ۱۲ ہندو تھیں۔ یہ تمام خواتین امتحان میں کامیاب ہوئیں اور دو امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئیں۔

مرد امیدواروں میں ۶ تعلیم یافتہ ہندو بھی تھے۔ ان میں چار کامیاب ہوئے اور ایک نہ صرف امتیاز کے ساتھ کامیاب ہوئے بلکہ مرکز میں اول آئے۔

یہاں ہم بمبئی ایڈلٹ ایجوکیشن کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس نے ہماری درخواست پر اپنی کلاسوں میں ہمارے نصاب کے مطابق تعلیم دینا منظور کیا اور طلبہ کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی۔

ہم لٹریسی کلاسوں کے سپروائزر صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ لوگ اس سلسلہ میں انجمن کا ہاتھ بٹاتے رہے ہیں۔

ہم جناب تصدق حسین صاحب ہیڈ ماسٹر میونسپل کرلا اینگلو اردو ہائی اسکول، جناب سید شہاب الدین دسنوی صاحب سکریٹری صابو صدیق انسٹی ٹیوٹ اور جناب انصار علی صاحب، مدرس انجمن اسلام ہائی اسکول کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان حضرات نے گزشتہ امتحانات کے موقعہ پر زبانی امتحان کے سلسلے میں ہماری مدد فرمائی۔

ادارۂ ادبیات اردو امتحانات کے سلسلے میں ہم کو اکثر مراعات دیا کرتا ہے۔ ہم اس کے لئے ادارہ کے شکر گزار ہیں۔

معتمد اعزازی - انجمن اسلام، بمبئی

روئداد مجلس عاملہ شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام دفتر ادارہ - رفعت منزل بتاریخ ۱۶/ اسفندار ۱۳۵۴ف صبح ساڑھے دس بجے منعقد ہوا - حسب ذیل ارکان نے شرکت کی -

۱- محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ	۴- محترمہ بلقیس بانو صاحبہ
۲- " عظمت النساء بیگم صاحبہ	۵- " سعید النساء بیگم صاحبہ
۳- " تہنیت النساء بیگم صاحبہ	۶- " بشیر النساء بیگم صاحبہ

محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ نے بذریعہ خط شرکت سے معذوری ظاہر فرمائی اور محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ اورنگ آباد میں ہیں۔ بذریعہ ٹیلیفون یہ اطلاع ملی کہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسواں کا مزاج ناساز ہے اور وہ تشریف نہیں لاسکیں - اس لئے

صدر صاحبہ نے معتمد صاحبہ سے ٹیلی فون پر گفتگو فرمائی اور ضروری امور میں باہمی مشورے کے بعد معتمد صاحبہ ہی کے ایما اور ہدایت کے مطابق اجلاس کی کارروائی شروع کی گئی ۔

سابقہ روئداد کی سماعت اور توثیق کے بعد مطلع کیا گیا کہ شعبۂ نسواں کی جانب سے جو قرار داد تعزیت حضرت شہزادی صاحبہ برار کی خدمت میں پیش کی گئی تھی اس کے جواب میں شہزادی صاحبہ نے شکریہ فرمایا ہے ۔

اس کے بعد حسب ذیل امور زیر غور رہے ۔

(۱) ذیلی مجالس کی روئداد (۲) بزم ادب کا سہ ماہی جلسہ ۔
(۳) مدرسہ بالغات کی سرکاری امداد سے دست برداری ۔
(۴) چندۂ رکنیت کی وصولی کا انتظام ۔
(۵) حساب آمدنی و خرچ شعبہ ۔

(۱) ذیلی مجالس کے معتمدین میں سے صرف محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ معتمد "مجلس ادب نسواں" نے مطلع کیا ہے کہ ان کی مجلس کی تشکیل اور نظام العمل کی ترتیب کا کام تقریباً ختم ہو چکا ہے اور ارکان مجلس نے شعبۂ نسواں کی رکنیت بھی قبول کی ہے جن کے نام پڑھ کر سنائے گئے اور ان کی ایک فہرست ادارے کے دفتر کو روانہ کی گئی تاکہ ان تمام کی خدمت میں شکریے کے ساتھ رکنیت کے فارم روانہ کئے جائیں ۔

(۲) محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ نے بزم ادب کا سہ ماہی جلسہ محبوبیہ گرلز اسکول میں منعقد کرنے کا وعدہ فرمایا تھا اور پھر وائسرائن کی تشریف آوری کے سلسلے میں مصروفیت کا عذر کرتے ہوئے مطلع کیا تھا کہ جلسہ جلد سے جلد منعقد کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے گی مگر اس کے بعد مزید کوئی اطلاع نہیں ملی اس لئے طے پایا کہ محترمہ کی خدمت میں اس جلسے کے متعلق یاد دہانی کرتے ہوئے یہ استدعا کی جائے کہ بعجلت ممکنہ اس کا انتظام فرمائیں اور اگر ربیع الاول کے مہینے میں مقرر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے ۔

(۳) مدرسۂ بالغات (اڈک میٹ) کو مبلغ (للعہ/۱۴) جو سرکاری امداد ملتی ہے اس کے متعلق یہ وضاحت کی گئی کہ تعمیل نصاب کی پابندیاں وغیرہ شعبے کے اغراض و مقاصد کو متاثر کرتی ہیں اس لئے یہ تجویز ہوئی کہ ایسی صورت میں اس امداد سے دست بردار ہو جانا زیادہ مناسب ہے ۔ دیر تک غور و بحث کے بعد یہ تصفیہ ہوا کہ اس معاملہ کو معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں کے سپرد کیا جائے اور انھیں اختیار ہوگا کہ اگر مناسب سمجھیں تو دست بردار ہو جانے کی کارروائی فرمائیں۔ ان کی رائے سے ارکان مجلس کو بہر صورت اتفاق رہے گا ۔ اس تجویز کو جملہ ارکان نے متفقہ طور پر پسند کرتے ہوئے منظور کیا ۔

(۴) چندہ رکنیت کے لئے طے پایا کہ حسب سال گزشتہ اس دفعہ بھی محترمہ مسز قیوم صاحبہ کو ذمہ دار بنایا جائے کہ وہ گزشتہ سال کا بقایا اور ۱۹۴۵ء کا چندہ وصول کرکے معتمد صاحبہ کے یہاں روانہ فرمائیں ۔

(۵) معتمد صاحبہ شعبۂ نسواں کا مراسلہ گوشوارہ جمع و خرچ صدر صاحبہ نے پڑھ کر سنایا ارکان کو شعبہ کی آمدنی اور خرچ سے مطلع کیا گیا اور اس کے بعد اجلاس برخاست ہوا ۔

رپورٹ دورۂ نرمل

خورداد ۱۳۵۲ف میں ادارہ کی طرف سے ایک وفد اضلاع کی شاخوں کے دورے پر روانہ ہوا تھا ۔ اس وفد کو اپنے دورے کے سلسلے میں نرمل پر کچھ دیر ٹھیرنا پڑا ۔ اس زمانے میں ملا فخرالحسن صاحب مدرسہ فوقانیہ کی صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔ صاحب موصوف سے ملاقات کے بعد یہ طے پایا کہ نرمل میں بھی ادارے کی ایک شاخ قائم کی جائے ۔ چنانچہ ارکان وفد نے دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں نرمل کے اکثر اصحاب سے ملاقات کی

اور شام میں ایک جلسہ منعقد کرکے ادارہ کے مقاصد کو واضح کرتے ہوئے قیام شاخ کی تحریک کی جو بہ غلبۂ آرا منظور ہوئی۔ اسی جلسہ میں ایک مجلس انتظامی بھی تشکیل دی گئی اور توقع تھی کہ اضلاع کی دیگر شاخوں کی طرح شاخ زرل بھی اردو زبان کی خدمت انجام دے گی اور زرل میں تعلیم بالغان کی مہم کا آغاز کیا جائے گا۔ لیکن اس شاخ کا قیام ایسی منحوس گھڑی میں عمل میں آیا کہ آج تک اس نے کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا اور حرف غلط کی طرح مٹ کر رہ گئی تھی۔ مجھے اس کا بڑا قلق تھا اور جب کبھی اس کا خیال آتا تو ایک روحانی تکلیف ہوتی۔ میں موقعہ کا متلاشی تھا کہ کسی طرح اس شاخ کو پھر سے زندہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ میرے ایک دوست اور جامعہ کے ممتاز فارغ التحصیل مولوی محمد بن علی باوزیر صاحب بی اے زرل کے تحصیلدار منتخب ہوئے۔ میں نے صاحب موصوف سے زرل کی شاخ کا حال بیان کیا اور انھیں توجہ دلائی کہ کسی طرح زرل کی شاخ کا احیاء کیا جائے۔ تحصیلدار صاحب نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے اس وقت تو آمادگی ظاہر نہ کی لیکن مستقبل قریب میں اس کام کے پورا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ حسن اتفاق سے میرے ایک دوست مسٹر شوکت علی خاں ایم اے زرل کے دوم تعلقدار ہوکر آئے۔ صاحب معز کو اردو علم و ادب سے خاص دلچسپی ہے اور تحصیلدار صاحب کے توجہ دلانے پر انھوں نے بھی اس کام میں دلچسپی لینے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ تحصیلدار صاحب نے ...... مورخہ ۱۶ / اردی بہشت ۱۳۵۸ف میں مجھے زرل آنے کی دعوت دی تاکہ شاخ کا احیاء ہو اور ایک دارالمطالعہ اور مدرسہ شبینہ کا افتتاح کیا جائے۔

میں ۱۰ / اردی بہشت ۱۳۵۸ف کو شام کے ۸ بجے کی ٹرین سے نظام آباد روانہ ہوا۔ ٹرین نظام آباد پر دس بجے پہنچی اور میں نے رات وہیں گزاری۔ صبح مولوی سید غوث صاحب ایم اے دوم تعلقدار و معتمد شاخ ادارۂ ادبیات اردو دوم کنڈہ سے ملاقات ہوئی جو ایک سرکاری کانفرنس کے سلسلے میں نظام آباد تشریف لائے تھے۔ صاحب موصوف سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ میں آپ کی علمی قابلیت، ملک و قوم کی خدمت کے جذبات اور حسن اخلاق سے بے حد متاثر ہوا۔ ساڑھے گیارہ بجے کی بس سے روانہ ہوکر ساڑھے تین بجے زرل پہنچا۔ جناب تحصیلدار صاحب نے اپنے مکان پر میرے قیام کا انتظام کیا تھا۔ صاحب موصوف میرے منتظر ہی تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر تھوڑی دیر آرام کیا جلسہ دوسرے دن شام کو رکھا گیا تھا۔ شام میں ۶ بجے دوم تعلقدار صاحب میری ملاقات کے لئے تشریف لائے اور تھوڑی دیر بعد مولوی عبدالجبار صاحب سبحانی صدر مدرس بھی آگئے۔ ان اصحاب سے ملاقات رہی۔ دوم تعلقدار صاحب نے قیام شاخ اور ادارے کے متعلق تبادلۂ خیال فرمایا۔ یہ صحبت تقریباً دو گھنٹے رہی۔ دوم تعلقدار صاحب نے رات کے کھانے پر مدعو فرمایا۔ حسن اتفاق سے اس دعوت میں مولوی عبدالقیوم خاں صاحب مینیجنگ ڈائرکٹر کارپوریشن، مولوی سید حسین صاحب زیدی مہتمم کوتوالی عادل آباد، مولوی سرتاج بیگ خاں صاحب دوم تعلقدار عادل آباد اور مولوی شرف الدین صاحب وکیل نظام آباد بھی شریک تھے۔ منصف صاحب اور مہتمم صاحب تعمیرات سے بھی ملاقات ہوئی۔

دوسرے دن دوپہر میں صدر مدرس صاحب نے کھانے پر مدعو فرمایا۔ شام میں ۶ بجے عالی جناب مولوی شوکت علی خاں صاحب ایم اے دوم تعلقدار کی صدارت میں جلسہ منعقد ہوا۔ جس میں عوام کے علاوہ جناب منصف صاحب، جناب مہتمم صاحب تعمیرات سیٹھ لوڈورام صاحب، سیٹھ سوپ کرن صاحب اور وکلا صاحبین شریک تھے۔ جناب تحصیلدار صاحب نے

اس جلسہ کی غرض و غایت پر نہایت ہی موثر الفاظ میں روشنی ڈالتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔ اس کے بعد میں نے ایک مختصر تقریر کی جس میں ادارہ کے مقاصد اور تعلیم بالغاں کی اہمیت و ضرورت کو بیان کیا اور یہ بتایا کہ موجودہ دَور میں تعلیم بالغاں کو کیا اہمیت حاصل ہے اور زبان کی خدمت در اصل ایک قومی خدمت ہے۔ اُردو زبان ہی ہندو مسلم اتحاد کا سنگم قرار دی جا سکتی ہے۔

ابھی چند دن پہلے ہندوستان کی عام زبان کا فیصلہ کرنے کے لئے واردھا میں گاندھی جی کی صدارت میں ایک کمیٹی منعقد ہوئی تھی جس میں ڈاکٹر تارا چند، مولانا سلیمان ندوی، ڈاکٹر عبدالحق وغیرہ شریک تھے۔ ان حضرات نے اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ تصفیہ کیا کہ ہندوستان کی عام زبان ہندوستانی ہو سکتی ہے۔ جو اردو اور ناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ اردو لکھنے والوں کو ناگری اور ناگری لکھنے والوں کو اردو رسم الخط سیکھنا چاہئے۔ بہر حال اب یہ طے پا گیا کہ ہمارے ملک کی عام زبان اردو ہو گی۔ اس لئے ہندوستان کے ہر خطہ میں رہنے والوں کو خواہ ان کا تعلق کسی مذہب یا فرقے سے ہو اردو کی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہئے کیونکہ یہی ہماری قومی زبان ہے۔ میں اپنی تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا کیونکہ باتیں تو بہت کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس کا قائل ہوں کہ باتیں کم ہوں اور کام زیادہ۔ تو اس لئے میں زرل کے رہنے والوں سے استدعا کروں گا کہ اپنی زبان کو پھیلانے اور اس کو ترقی دینے کے لئے ممکنہ مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور وہ لوگ جو لکھنے پڑھنے سے محروم ہیں ان کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ حضرات میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج کل کسی کو لکھنا پڑھنا سکھانا بہت بڑی نیکی ہے۔ مجھے آپ سے بڑی بڑی توقعات ہیں۔ امید کہ آپ میری اس گزارش پر ضرور توجہ فرمائیں گے اور اس بات کا پکا ارادہ کر کے یہاں سے اٹھیں گے کہ زرل میں کوئی شخص اَن پڑھ نہ رہے گا۔

اس کے بعد عالی جناب دوم تعلقدار صاحب نے میری تقریر پر تبصرہ فرماتے ہوئے جن الفاظ میں میرا تعارف کرایا شاید میں اس کا مستحق نہ تھا۔ یہ محض صاحب موصوف کی عالی ظرفی، حسن اخلاق اور خلوص تھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ادارۂ ادبیات اردو کئی سال سے ملک میں اردو کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس کے بانی ڈاکٹر زورؔ صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور گورنمنٹ کی امداد کے بغیر ادارہ قائم کیا اور اسے کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ یوں تو ہندوستان میں اور کئی ادارے ہیں جن کو ہماری حکومت کی طرف سے رقمی امداد ملتی ہے۔ لیکن ادارۂ ادبیات اردو کی ہم سب کو مدد کرنی چاہئے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہا۔ میں تمام باشندگان زرل کی طرف سے شاہدؔ صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ زرل کی شاخ اردو زبان کی خدمت کرے گی کیونکہ یہ ہماری مادری اور سرکاری زبان ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے اب ایک یادگار کام کی طرف قدم اٹھایا ہے اور وہ اس کی ذاتی عمارت ہے۔ غالباً شاہدؔ نے عمداً اس کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ادارہ کا مسلک دست سوال دراز کرنا نہیں ہے لیکن میں اس کام کی اہمیت کے پیش نظر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اہل ملک کو ادارہ کی عمارت کے لئے دل کھول کر مدد کرنی چاہئے۔ یہ ایک یادگار عمارت ہوگی۔ عمارت فنڈ کے لئے عالی جناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات و نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے اپیل شائع ہوئی ہے عمارت کا مجوزہ نقشہ بھی اس میں شریک ہے۔ یہ عمارت سلطان العلوم کے عہد میمنت مہد کی ایک مہتم بالشان یادگار ہوگی۔

خدائے تعالیٰ نے جن لوگوں کو دولت عطا فرمائی ہے وہ ضرور ملک کے اس اہم کام میں رقمی امداد فرمائیں گے تاکہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے اس درخشاں کارنامے پر فخر کریں - میں نہایت مسرت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہوں کہ سیٹھ لوڈورام صاحب نے عمارت کے لئے ایک سو روپے کا گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا ہے۔

جناب صدر نے شاخ نرمل کی مجلس انتظامی کے عہدہ داروں کے انتخاب کے لئے تحریکیں پیش کرنے کی اجازت عطا فرمائی اور مندرجۂ ذیل اصحاب بہ اتفاق آراء منتخب ہوئے -

صدر - مولوی شوکت علی خاں صاحب دوم تعلقدار

نائب صدر ،، عبدالجبار سبحانی صاحب صدر مدرس مدرسۂ فوقانیہ نرمل

معتمد - مولوی امام بخش کھل صاحب ایم اے (علیگ)

خازن مولوی محمد بن علی باوہاب صاحب تحصیل دار

اراکان مجلس انتظامی کا انتخاب جناب صدر صاحب دیگر عہدہ داروں کے مشورہ سے فرمائیں گے -

اس کے بعد میں نے صدر جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور سیٹھ لوڈورام صاحب کے عطیہ کا منجانب ادارہ شکریہ ادا کرتے ہوئے عمارت فنڈ میں حصہ لینے کے لئے حاضرین جلسہ سے استدعا کی - جناب مولوی محمد بن علی باوہاب صاحب تحصیل دار نے جناب صدر اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور یہ پر لطف صحبت ۸ بجے برخاست ہوئی -

جناب تحصیل دار صاحب نے شام کے کھانے پر مقامی عہدہ داروں کو مدعو فرمایا تھا - مختلف اصحاب سے تبادلۂ خیال کیا گیا اور یہ دعوت رات کے ۱۲ بجے ختم ہوئی -

خواجہ حمید الدین

کلیات سلطان محمد قلی قطب شاہ

حیدرآباد کے بانی اور اردو کے پہلے صاحب دیوان کا مجموعۂ کلام جو برسوں کی محنت اور تحقیق کے بعد جمع کیا گیا ہے - محمد قلی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ - مقدمہ میں اس کے کلام اور سوانح حیات پر عالمانہ بحث کی گئی ہے - یہ کلیات پہلی دفعہ ہزاروں روپے کے صرفہ سے شائع ہوا ہے - کئی کمیاب قلمی تصاویر بھی پہلی دفعہ اس مجموعہ میں شائع ہوئی ہیں - صفحات (۱۰۶۸) قیمت مجلد ۱۸ روپے

میر محمد مومن

عہد محمد قلی قطب شاہ و سلطان محمد قطب شاہ میں پیشوائے سلطنت اور وزیر مطلق تھے - دنیوی عروج کے علاوہ ان کی مذہبی سیادت و فضیلت بھی بہت مشہور ہے - انھوں نے ہزار ہا روپے کے صرفے سے ایک دائرہ بنایا تھا جس میں خاک کربلائے معلی بچھادی تھی اور یہ دائرہ اب تک "دائرہ میر مومن" کے نام سے حیدرآباد میں مشہور و معروف ہے - میر محمد مومن صاحب اعلیٰ پایہ کے فارسی شاعر تھے اور حیدرآباد آنے سے قبل شاہ ایران کے استاد بھی رہ چکے تھے - ان کے نہایت تفصیلی اور تحقیقی حالاتِ زندگی اس کتاب میں جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے اپنے دلچسپ اور مقبولِ عام اسلوب میں تحریر فرمائے ہیں - تقریباً ۳۰۰ سو صفحات مع تصاویر قیمت عہ

دلچسپ اَدبی کتابیں

قدیم اور جدید طرز سخن کے نوادر

گریہ و تبسم | صاحبزادہ میکش کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔ جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچۂ عمومی اور جناب پروفیسر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شایع ہوا ہے۔ جدید شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم جلد پر سنہری نام۔ قیمت عا۱

نمود زندگی | مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کے کلام کا مجموعہ ہے جو نہایت سلیقہ سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس میں (۱۰۱) نظمیں (۱۷) غزلیں اور (۵) رباعیات ہیں۔ سید علی منظور صاحب حیدرآباد کے پختہ مشق مشہور شاعروں میں سے ہیں۔ ان کی شاعری کے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں اُردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپی ہوں اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالے میں نقل کی جاتی ہیں۔ علی منظور صاحب عہد حاضر کے ان چند کامیاب شاعروں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے کلام میں زندگی کی صحیح ترجمانی کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی صفحات (۲۱۲) قیمت عہ

انوار | حضرت علی اختر حیدرآبادی کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جو نہایت ہی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ علی اختر صاحب ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں میں اپنا بلند مقام رکھتے ہیں۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز اور تجربات زندگی کی سچی تصویر ہے۔ وہ نہ صرف ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں بلکہ حیات اور شباب پر اُن کی نظر بہت وسیع ہے۔ ان کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہر شعر ان کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز ہے۔ موجودہ زمانے میں سوائے جوش کے کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں۔ اس مجموعے کی اشاعت سے جدید اُردو شاعری میں ایک گراں بہا اضافہ ہوا ہے صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

ارمغان جذب | پنڈت راگھویندر راؤ صاحب جذب (عالم پوری) کی رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے سنسکرت اور بھاشا کی شاعری کے اخلاقی اور ناصحانہ پہلو کو اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ اکثر رباعیاں سنسکرت اور بھاشا کے شعرا کے خیالات کا عکس ہیں اور بعض خود ان کے دل و دماغ کی فکر و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ سادگی، سلاست، خیالات سلجھے ہوئے اور طرز بیان اس قدر سادہ اور بے تکلف کے معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکے۔ ہر رباعی دل کی دھڑکن ہے جو شعر مجسم بن گئی ہے ابتدا میں جناب ماہر القادری صاحب کا ایک بسیط اور معلومات آفریں مقدمہ ہے جس میں انھوں نے سنسکرت اور ہندی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ صفحات (۱۲۰) قیمت مجلد ۱۲ار

ماہ لقا | یہ مولوی عزیز احمد صاحب بی اے آنرز (لندن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ و معتمد شہزادی در شہوار کی طویل نظموں کا مجموعہ ہے جن میں یورپ کی شاعری کے مفید اثرات جلوہ گر ہیں۔ جدید یا ترقی پسند اردو شاعری کے دلدادہ اس کا ضرور مطالعہ کریں۔ صفحات ۱۰۰ قیمت عہ

سراج سخن | شاہ سراج اورنگ آبادی اُردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے سراج کے کلام کا پاکیزہ انتخاب کیا ہے۔ اگرچہ ان کا زمانہ دو سو سال پہلے کا ہے لیکن ان کا کلام بہت صاف ہے جس کا یہ دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ پروفیسر سروری صاحب کے محققانہ اور پُر از معلومات مقدمہ سے اس مجموعہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ جو اصحاب پاکیزہ اور سلیس و سادہ شاعری کے دلدادہ ہیں وہ اس بہترین انتخاب کی قدر کریں گے صفحات ۱۵۲ قیمت ۱۲ار

ایمان سخن | مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو نے عہد آصفی ثانی کے ملک الشعراء شیر محمد خاں ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے جس کے ساتھ ان کا بلند پایہ مقدمہ بھی ہے جس میں انھوں نے ایمان کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔ ایمان اردو کے اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے ہیں اور ان کے کلام اور قصائد کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں

تعداد صفحات (۱۲۰) قیمت ۱۲ ار

فیض سخن | میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد مانے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحب دل بزرگ تھے۔ ان کا کلام ان کے دل کی آواز ہے۔ وہ ایک خاص مکتب شاعری کے بانی بن گئے تھے جو عاشقانہ شاعری میں تصوف کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا بہترین انتخاب شائع کیا ہے۔ اس کے ساتھ ان کا ایک بصیرت افروز مقدمہ بھی ہے جس میں فیض کی حیات اور شاعری پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

اس کتاب میں غزلیات کے علاوہ فیض کی مثنویوں اور دیگر کلام کا بھی انتخاب شامل ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ میر درد اور شاہ سراج اورنگ آبادی کے بعد تصوف و عرفان اور شعر و سخن کا امتزاج جتنا اچھا حضرت فیض کے کلام میں موجود ہے کسی اور اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتا۔ تعداد صفحات (۱۴۴) مع تصویر مرقد حضرت فیض قیمت ۱۲ ار

بادۂ سخن | ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بے تکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا معرکتہ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۱ ار

کیف سخن | حضرت کیفی ایک بوقلموں طبیعت کے سخن گو تھے۔ آزاد منشی، لطیفہ سنجی ان کے کلام میں جا بجا جھلکتی ہے وہ حیدرآباد کے جدید خانۂ ادب کے بلند بانگ طرح اندازوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات آفریں مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے اردو شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ حضرت کیفی دکن کے عالی ہیں اور اس انتخاب میں ان کی چند نظموں کے اقتباسات بھی شامل ہیں۔

متاع سخن | نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز داغ دہلوی کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے شاعری اور زبان کا مذاق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔
تعداد صفحات /۱۲۶) مع تصویر شاعر قیمت ۱۲ ار

مرقع سخن جلد اول | یہ دکن کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبہ فارغین اور اہل قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرے کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام دیدئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایانِ دکن اور قدردانانِ ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ ۵۰۰ صفحے ۵۵ تصویر قیمت ہے

مرقع سخن جلد دوم | پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے۔ ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ صفحے ۴۴۸۔ تصاویر ۵۰ قیمت ہے

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بیتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۰	۱۲	۰
سوتیلی ماں	۴۸	۰	۴	۰
سر سید احمد خاں	۱۶	۰	۲	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
ارسطو جاہ	۶۵	۰	۶	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۶۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰	۰
مہ لقا	۱۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۱	۴	۰
ورڈس ورتھ اور اسکی شاعری	۱۸۴	۱	۴	۰
ہوش کے ناخن	۹۴	۱	۰	۰
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹	۱	۰	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶۰	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۹	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۱۱۸	۱	۸	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۸	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خان	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

مئی

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ر

سب رس

جلد ۸ بابت مئی ۱۹۴۵ء شمارہ ۵

۱	طبیعت آدمی کی ہے کبھی کیسی کبھی کیسی (غزلیں)	سید علی منظور	۲
۲	کمال الدین بہزاد	امجد علی	۳
۳	اردو میں سائنٹفی ادب	خواجہ حمید الدین ایم اے (عثمانیہ)	۶
۴	حالی کی ترقی پسندی	ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۹
۵	مجبوریاں (نظم)	سعادت علی خاں	۱۲
۶	مذہب (نظم)	علی اشرف ایڈیٹر تنظیم	۱۳
۷	چھوٹے روضہ کا گنبد	میر جہانگیر علی خاں لکچرار گلبرگہ کالج	۱۴
۸	کالے پانی کا مفرور قیدی	گلچیں حیدرآبادی	۱۷
۹	سویرا (نظم)	سلیمان اریب	۲۰
۱۰	رونمائی (ایک ایکٹ کا ڈراما)	تلاوت یداللہی	۲۱
۱۱	اکبر الہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط	ادارہ	۲۵
۱۲	مٹھائی (افسانہ)	خان بہادر عبدالرحمن چغتائی	۳۳
۱۳	سلطان یاد جنگ	سیدہ اولی طالع	۴۱
۱۴	ہم تم (نظم)	پروفیسر منظور حسین شور ایم اے (علیگ)	۴۷
۱۵	میری مرغیاں	زینت ساجدہ بی اے (عثمانیہ)	۵۰
۱۶	تنقید و تبصرہ	ز۔ س۔ س۔ ق۔	۵۱
۱۷	تاثرات (قطعات)	احمد ندیم قاسمی بی اے	۵۶

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

طبیعت آدمی کی ہے کبھی کیسی کبھی کیسی

سازِ دل

بشر کا حسن ستاروں کے گلستاں میں نہیں
یہاں کے سرو رواں صحنِ آسماں میں نہیں
میں ان کے نام سے منسوب اسے کروں، توبہ
مری جبیں کی جلا بھی جس آستاں میں نہیں
حسین لوگ ستمگر ہیں سب کے سب لیکن
ستمگری کی صفت میرے مہرباں میں نہیں
بدل چکا ہوں میں سرکار کے خیال کی رو
یہ وصف اور کسی کے مزاجداں میں نہیں
میں کر رہا ہوں ابھی سے بہار کا ساماں
خزاں کا خوف مجھے موسمِ خزاں میں نہیں
مری مراد کی کلیاں ہیں جس کے دامن میں
وہ گلبدن ہی کہے! پھول گلستاں میں نہیں!
کھلائیں لاکھ شگوفے سبک خرام ادھر
بہارِ صبح زمیں شامِ آسماں میں نہیں
لہک لہک کے سناتا ہوں آپ بیتی میں
مزا اسی میں ہے اوروں کی داستاں میں نہیں

سوزِ دل

سرورِ ضبطِ الم شیون و فغاں میں نہیں
متاعِ ضبط مگر قلبِ ناتواں میں نہیں
نہ مطمئن ہیں مسافر نہ کارواں سالار
کہ علمِ غیب کسی کو بھی کارواں میں نہیں
نشاطِ روح غمِ انتظارِ دوست میں ہے
مزا نہیں ہوسِ مرگِ ناگہاں میں نہیں
حریفِ آبِ رواں ہے روانیِ خوں کیا؟
کہ چین سے مرا دل کشتیِ رواں میں نہیں
کبھی میں کھول کے جی شرحِ غم بھی کرتا ہوں
گرفتگی مرے دل کی مری زباں میں نہیں
چھپاؤں دل میں تو چہرہ سے ہو نمودِ ملال
نہاں رہے؟ یہ صفت ہی غمِ نہاں میں نہیں
ذلیل ہوں سرِ بازار یہ بھی مثلِ گہر؟
سرشکِ غم ہی مری چشمِ خونفشاں میں نہیں
خلش جگر میں، خلش میں مزا، مزہ میں ثبات
یہ سلسلہ ہے یہیں دوسرے جہاں میں نہیں

خلوصِ دل ہی بنائے اثر ہے اے منظور
خلوصِ دل میں نہیں تو اثر زباں میں نہیں

علی منظور

کمال الدین بہزاد

بہزاد پندرھویں صدی کے نصف اول میں پیدا ہوا۔ زادگان شیخ صفی کے عروج اور تیموری خاندان کے زوال و انتشار کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ ساسانیوں کے بعد یہی ایرانی نژاد پہلا خاندان تھا جس نے ایران پر اقتدار حاصل کیا۔ مصوروں کے سوانح حیات کو نظر انداز کر جانا، ایرانیوں کی عادت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بہزاد کے حقیقی حالاتِ زندگی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مزید برآں یہ بھی واقعہ ہے کہ اس زمانہ کے اہلِ قلم اس قدر ڈرپوک واقع ہوئے تھے کہ متعصب علماء کی قوت، ان سے بے چون و چرا اپنے احکام کی پابندی کرا رہی تھی۔ فنِ مصوری کو مردود ٹھیرانے والے فتووں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تو رہا ایک طرف، زبان تک ہلانے کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ ان علماء نے نہایت فخر کے ساتھ اپنے سلاطین کے کارناموں کا دل کھول کر ذکر کیا ہے۔ لیکن مصوروں کے بارے میں، خواہ وہ کتنا ہی مایۂ ناز حسن کار کیوں نہ ہو، ایک لفظ بھی لکھنا انھیں ہرگز گوارا نہ ہوتا تھا۔ یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ جب تک کوئی مصور، شاعر یا خطاط (خوش نویس) نہ ہوتا، اس کو شہرت بھی نصیب نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن حسن کاروں کو عوام سے متعارف کروانے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، انھیں حسن کار کی بجائے شاعر یا خطاط ہی کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا ہے۔ البتہ تاریخ السیر کا ایک ہی مصنف خوندمیر ایسا دکھائی دیتا ہے، جو بڑی جرأت کے ساتھ علی الاعلان فنونِ لطیفہ کی مدح سرائی کرتا ہے۔ اسی مورخ نے استاد بہزاد کے کچھ حالاتِ زندگی بھی ضبطِ قلم کئے ہیں۔ لیکن پھر بھی ان حالات سے اس کی حقیقی زندگی پر جیسی پڑنا چاہیے، ویسی روشنی نہیں پڑتی۔ خوندمیر کی تحریر کی وقعت پرجوش قصیدے سے زیادہ نہیں۔ تاہم بہزاد کے بارے میں، ہمارے پاس صرف یہی ایک مستند حوالہ موجود ہے، جو یوں رقمطراز ہے کہ

"استاد کمال الدین بہزاد، فنِ تصویر کے بے نظیر شکلوں اور نوادر کو ہمارے پیشِ نظر کرتا ہے۔ اس کی نقاشی مانی کے موقلم کی طرح، دنیا کے مصوروں کے سارے کارناموں کو ماند کر دیتی ہے۔ اس کی انگلیوں میں ایسی معجزنما قوت ودیعت ہوئی تھی کہ ان کی کارستانیوں نے اولادِ آدم میں سارے مصوروں کے کارناموں کو ماند کر دیا۔ اس کے موقلم کا ایک بال، بے جان پیکر میں جان ڈال دیتا ہے۔ امیر نظام الدین علی شیر کی مہربانیوں اور شفقت آمیز سرپرستیوں نے استاد محترم کو بڑے رتبہ پر پہنچا دیا تھا۔ نیز شاہ خاقان، سلطان حسین بیغارہ نے اپنی خاص نوازشات اور عنایات بیغایات سے، اسے خوب نوازا ہے۔ اب تک بھی اس صادق العقیدہ، یگانۂ روزگار استاد کو سلاطینِ عالم کی فیض رسانی کی عزت حاصل ہے۔ شاہانِ اسلام کی بے پایاں توجہ اس کے شاملِ حال ہے، اور یقیناً ہمیشہ رہے گی۔"

مذکورۃ الصدر ستائش سے بہزاد کی عظمت کا پتہ ہی نہیں چلتا، بلکہ اس امر کا بھی مستحکم ثبوت مل جاتا ہے کہ ابتدائی زمانے سے آخر دم تک، اس کو کسی نہ کسی مربی کی سرپرستی ضرور حاصل رہی۔ استاد گنگ کے کتب میں تربیت پانے کے بعد سلطان حسین مرزا کے ہاں، جو زادگان تیمور سے تھا، ملازمت اختیار کر لی۔ اس سلطان کی وفات کے بعد، شاہ اسمٰعیل صفوی کا درباری مصور مقرر ہوا۔ نیز طویل مدت تک شاہ طہماسپ کی دوستانہ صحبت سے فیض اٹھاتا رہا۔ بہزاد کی نسبت ایک روایت مشہور ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صفویوں کے پہلے بادشاہ کی نظر میں اس کی بیحد قدر و منزلت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ لڑائی کی ایک مہم میں بادشاہ سلامت بذاتِ خود، فوج کی

کمان کا قصد رکھتے تھے۔ مہم پر روانہ ہونے سے قبل فرمایا کہ "خدانخواستہ مجھے شکست ہو یا دار السلطنت پر قبضہ ہو جائے تو مجھے یہ ہرگز گوارا نہ ہوگا کہ شاہ محمد نیشاپوری اور استاد بہزاد میرے دشمنوں کے ہاتھ لگ جائیں"۔ چنانچہ اسی خوف سے انھیں روپوش بھی کر دیا تاکہ دشمن ان پر اپنا ہاتھ نہ ڈال سکے۔ جنگ سے کامران لوٹتے ہی بادشاہ نے پہلا سوال یہی کیا تھا "کیا استاد بہزاد بخیر و عافیت ہیں"۔ بابر، شہنشاہ ہند نے اپنی خود نوشت تزک میں بہزاد کو "تمام مصوروں میں برگزیدہ ہستی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ رائج الوقت کتب میں ایسے بے شمار حوالے پائے جاتے ہیں۔

کارنامے:۔ بہزاد کو زبردست شہرت اور بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ عوام بہزاد کے آرٹ کے بے حد شیدائی تھے۔ یہاں تک غلو کر جاتے تھے کہ کسی اچھی تصویر پر بہزاد کا نام لکھ کر یہ باور کرانے کی کوشش کرتے کہ ان کے ہاں بہزاد کے قلم کا بنایا ہوا کارنامہ ہے۔ حالانکہ وہ تصویر کسی دوسرے مصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہوتی۔ عوام کی ایسی مبالغہ آمیز و مجنونانہ حرکات کی وجہ سے بہزاد کے قلم کی بنی ہوئی اصلی تصویروں کی شناخت کوئی آسان کام نہ رہا۔ بڑی ماہرانہ جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ ذیل کی چند تصاویر بہزاد ہی سے منسوب کی جاتی ہیں۔

۱۔ درویش
۲۔ کوچک درویش (ذخیرۂ گلوبوف)
۳۔ یک درویش (قومی کتب خانہ پیرس)
۴۔ بغدادی درویش کی شبیہ
۵۔ حسین مرزا کی شبیہ کا چربہ (بوسٹن میوزیم)
۶۔ تیر انداز گھوڑے سوار
۷۔ ایک امیر کی شبیہ۔ اس پر بہزاد کے دستخط ثبت ہیں، لیکن تصویر بہزادی مکتب کے کسی مصور نے بنائی ہے۔
۸۔ شخصے دست در پا لہنگ" کی شبیہ۔ یہ تصویر عرصہ سے طویل بحثوں کا موضوع بنی ہوئی ہے کہ آیا یہ بہزاد کا اصلی کارنامہ ہے یا نہیں۔

بہزاد سے منسوب کئے جانے والے مسودات یا قلمی نسخے۔

(۱) ظفر نامہ۔ تیمور گورگاں کی سرگزشت مصنفہ شرف الدین علی یزدی مورخہ ۸۲۸ھ (۱۴۲۴ء) جس کی نقل شیر علی نے کی ہے۔ یہ نسخہ کسی زمانہ میں شاہان مغلیہ کے قبضے میں تھا، جو اس وقت گیرٹ ذخیرے (Garret collection) میں پایا جاتا ہے۔

(۲) نظامی صاحب کی تصنیف ہفت پیکر کی تصویریں جو پہلے مسٹر کوراچ کی ملک تھیں، اس میں تیموری دبستاں کی ابتدائی طرز کا کام پایا جاتا ہے۔

(۳) بوستان سعدی کی چھ بڑی تصویریں بنائی تھیں ان میں کی ایک تصویر اس وقت خدیو مصر کے کتب خانہ قاہرہ میں محفوظ ہے۔

(۴) خمسۂ امیر خسرو دہلوی۔ مورخہ ۹۰۰ھ (۱۴۸۵ء) میں (۱۳) تصویریں منسلک ہیں اس وقت مسٹر چسٹر بیاٹی (Chester Beatty) کے ہاں موجود ہے۔

(۵) نظامی صاحب کا نسخہ مورخہ ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں (۲۰) تصویریں بنائی گئی ہیں۔ برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے۔ جس میں اعلیٰ ترین فرہنگی کے آخری مظاہرات کا عکس نظر آتا ہے۔

(۶) کچھ عرصہ بعد کی بہزاد کے قلم سے بنی ہوئی چند تصویریں سینٹ پیٹرس برگ (حالیہ لینن یا اسٹالن گراڈ) کے کتب خانہ کی زینت بنی ہوئی تھیں۔

کثرت سے اس حسن کار کے کارنامے مختلف ذخیروں میں پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت یہ سارے کارنامے اس کے قلم کے رہین منت نہ بھی ہوں، تب بھی یہ ضرور ہے کہ اس کی اتباع کرنے والے مصوروں نے انھیں بہزادی طرز

میں ڈھالا ہے۔

ایرانی فنِ تصویر میں، بہزاد نے جن محاسن اور خوبیوں کا اضافہ کیا ہے، ان کے متعلق اظہارِ رائے کرنے میں مبالغہ آرائیوں سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس قدر جتلا دینا کافی ہوگا کہ اس کے شاہکاروں میں زبردست استادانہ تخیل کاری اور دست اندازی کی ماہرانہ قابلیت پائی جاتی ہے، جو فن کی تکمیل پر اپنی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ کتابی تمثیل نگار اور شبیہ ساز دونوں حیثیتوں سے بہزاد اس بلندی پر پہنچ چکا تھا جہاں تک اس کے قبل یا بعد کا کوئی مصور پرواز نہیں کر سکا۔ اسی بناء پر اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ایرانی آرٹ کا ترفع دنیا کے ہر آرٹ کے مقابلہ میں، اس کے دوش بدوش کھڑے رہنے کے قابل ہے۔

ایرانی آرٹ میں بہزاد کی قدر و منزلت کے متعلق جہاں تک ہم غور کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ عزت اپنی تخیل کاری کے لازمی نتیجے کے طور پر حاصل نہیں کی تھی بلکہ عوام کے قلب پر اپنی تو ارثی رومان پرستی (تصوف) کا سکہ بٹھا کر پیدا کی تھی۔ آرٹ میں عشقِ الٰہی کے عنصر کو شامل کرنے سے خیال ہوتا ہے کہ بہزاد صوفیائے کرام کے مسلک سے بے حد متاثر ہو چکا تھا۔ اس کی ولادت اور تعلیم و تربیت کے زمانے میں تصوف ایران کے طول و عرض میں مقبولِ خاص و عام تھا۔ اس طرح تصوف فنونِ لطیفہ میں روحانی کشف و القاء کا باعث ثابت ہوتا ہے۔ حضرت جلال الدین رومی، ایران کے مایۂ ناز متصوفین شعراء میں سے تھے، آپ کا انتقال ہو کر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ خدا کے متوالے حافظ شیرازی نے تخیلات و وجدانیات کی انتہائی باریکیوں پر کامیابی سے قابو پا لیا تھا۔ ایرانی شاعری کی کیف پرور موسیقی، حافظ سے پیشتر اس طرح کبھی نغمہ سرا نہ ہوئی تھی۔ جامی تو عشقِ حقیقی کی شمع پر مثلِ پروانہ اپنی جان دیتے تھے۔ ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ اس زمانے کی فضا مذہبی سرگرمیوں سے مالامال تھی۔ تصوفی رموز پسندی، ایرانی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔

صوفیا کا ایقان تھا کہ تکوین سے پہلے بھی روح کا وجود تھا۔ جب تک عالمِ علوی کے اعلیٰ ترین حسن کی حقیقت سے کما حقہٗ واقفیت حاصل نہ کی جائے حسن کی کاملیت کا ادراک ممکن نہیں۔ یہ بھی وثوق کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ روح اور جسم کے درمیان مادیت کا پردہ حائل ہے۔ باوجود اس کے ہم روح کو سمجھ سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں۔ روح کی حقیقت سے آگاہی، اور عشقِ الٰہی کی وجد آفریں ریاضتوں کی مدد سے رموزِ الٰہی کا سمجھنا ممکن ہے۔ کائنات کی تکوین کو مظہرِ حسنِ اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ الٰہی صفاتِ حسنہ کا ظہور انسان ہے اور زندگی میں اس کا کام خدا شناسی ہے۔

ایسا زمانہ جس میں مذہبی جوش کا یہ عالم ہو، ممکن بہزاد ان صوفیائے کرام کی صحبتوں میں شریک ہو کر ان سے فیض اٹھاتا تھا۔ اور یہ خدا پرست لوگ جن خوش آئند خوابوں (رویا و کشف) کو قصے کی شکل میں بیان کرتے تھے۔ سن کر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ الٰہیت کی تفہیمی کے مقصد اعظم ([illegible]) کی فسول سازی اور فطرتِ مذہبیت کی ہیجان آفرینی کے زیرِ اثر اس نے صوفیانہ تخیلات کو یہاں تک نشو و نما دی کہ آخر کار اس کی دلی آرزو پوری ہو گئی اور اسی روحانی قوت کا مظاہرہ صدیوں سے آج تک اس کے آرٹ کے سخت ترین نقادوں کی مادی نظروں کو خیرہ کئے ہوئے ہے۔ ان شاہکاروں کے ایک ہی نظارے سے تماشائی مجسمۂ حیرت بن جاتا ہے۔

اور جن عمیق روحانی تجربات کو ان کارناموں میں لباسِ مجاز میں مقید کیا گیا ہے۔ ان کو سلجھے ہوئے طریقہ پر بیان کرنے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ اس لئے ایسے حسن سے لطف اندوز ہونے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ اس کی تعریف ہی نہ کی جائے بلکہ اسی کو اپنی تعریف آپ کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ہماری روح پر منکشف ہو کر ہماری باطنی قوتوں اور جذبات کی دنیا کو پیدا کرے، جن کی واقفیت پر آرٹ کی سچی مسرت کا دار و مدار ہے۔

امجد علی

اردو میں سائنسی ادب

(اخبارات و رسائل)

(سلسلہ گزشتہ)

فوائد الناظرین

تقطیع ۱۱½/½ ، دو کالم۔ یہ اخبار "دہلی اردو اخبار" کا ضمیمہ ہے جو مہینے میں دو بار (۴) صفحات پر پنڈت موتی لال کے پریس سے شایع ہوتا تھا۔ غالباً مارچ سنہ ۱۸۴۵ء سے جاری ہوا کیونکہ جو اخبار ہماری نظر سے گزرا اس پر نمبر (۱) اور مارچ ۱۸۴۵ء تک کے پرچوں کے آخر میں حسب ذیل عبارت درج ہے:۔

"باہتمام صاحبان مجمع فوائد العام اندرون مکان مولوی محمد باقر بیچ پریس پنڈت موتی لعل پرنٹر اور پبلشر اردو اخبار کے چھاپا ہوا"

اس کے بعد کی اشاعتوں یعنی جنوری ۱۸۴۷ء تک اخبار کے ختم پر یہ عبارت درج ہے:۔

"باہتمام ماسٹر رامچندر بیچ چھاپہ خانہ دہلی اردو اخبار کے دلی میں چھاپا گیا۔
پنڈت موتی لعل پرنٹر مکان مولوی محمد باقر"

مولوی محمد باقر محمد حسین آزاد کے والد تھے۔ دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر اور پریس کے مالک تھے۔ فوائد الناظرین بطور ضمیمہ شایع کرتے تھے۔ ستمبر ۱۸۴۶ء تک یہ رسالہ ایک کمیٹی کی ادارت میں شایع ہوتا تھا اور بعد کو ماسٹر رامچندر اسے مرتب کرتے تھے۔ اس اخبار میں گورنمنٹ کے حالات کے علاوہ صرف علمی، فنی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے رہیں۔ مارچ ۱۸۴۵ء تا جنوری ۱۸۴۸ء کی اشاعتوں میں جو مضامین علوم و فنون سے متعلق ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔

"طبیعیات، جر ثقیل، ایر پمپ، کسوف اور خسوف۔ دخانی کل، ہیپوپوٹیمس، حال عجیب قسم کی چیونٹیوں کا، حال درخت بڑ کا" وغیرہ وغیرہ۔

ان مضامین پر معترضین کے اعتراضات اور ان کے جوابات بھی شایع کئے جاتے تھے۔ اگر سائنس سے متعلق کسی کو کوئی امر دریافت کرنا ہوتا تو اس کا سوال شایع کرکے ناظرین سے جواب لکھ بھیجنے کی درخواست کی جاتی تھی۔ سائنس کے مضامین کو تجربے اور اشکال کے ذریعہ سے سمجھایا جاتا تھا۔ مضامین کے آخر میں مضمون نگار کا نام درج نہیں ہوتا تھا۔ اسی طرح سوالات اور اعتراضات کرنے والے بھی اپنے نام پوشیدہ رکھتے تھے۔ بعض نے اپنا فرضی نام بتلایا ہے۔ مثلاً "راستی دوست، شایق علم ریاضی، نعقالحق وغیرہ"۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ سائنس کے مسائل پر کھلم کھلا بحث کرنے سے ڈرتے تھے۔

زبان کی خصوصیات تقریباً وہی ہیں جو دہلی کالج کی مطبوعات کے ضمن میں بیان ہو چکی ہیں۔ حکمیاتی مضامین کی زبان جس انداز کی ہوتی ہے بس وہی ہے۔ حسب ذیل کلمات کی ساخت اور ترکیب سے قدامت کا اندازہ ہو سکتا ہے:۔

"علاج واسطے بچنے وبائے ہیضہ سے"
"ترکیبیں اوٹھانے اور بلندیوں پر لیجانے بھاری بڑے وزنوں کی"

بعض انگریزی الفاظ کے ساتھ فارسی الفاظ لگا کر اسم فاعل اور اسم صفت بنائے گئے تھے جیسے:۔

"الکٹریسٹی نما، اجسام الکٹریسٹی دار" وغیرہ..... (Baloon) کا ترجمہ برج ہوا یا غبارہ کیا گیا تھا۔ الکٹریسٹی کا ترجمہ بجلی کیا گیا مگر اس کا استعمال نہیں ہوا اور الکٹریسٹی جا بجا استعمال کیا گیا جن انگریزی اصطلاحات کا ترجمہ نہیں کیا گیا تھا ان کو اسی طرح اردو میں منتقل کر لیا گیا۔ مثلاً "کنڈکٹر۔ ایر پمپ۔ ریسیور۔ ٹیلیگراف۔ الکٹرومیٹر" وغیرہ نمبر (number) کو اردو میں "نمبر" بنا لیا گیا تھا۔ عبارت کے نمونے کے لئے مختلف صفحات کے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

"جن اشیاء میں سے یہ سیال گزر سکتا ہے ان کو اصطلاح میں فرنگ میں کنڈکٹر کہتے ہیں۔ اگر ایک شئے الکٹریسٹی سے بھری ہو اور تم اسکے پاس

ایک ٹکڑا لوہے کا لے جاؤ تو تم دیکھو گے کہ اس شیشے سے لوہے میں چنگاریاں مثل بجلی کے آویں گی۔"

"واسطے تحقیقات اور ثبوت بعض مسئلوں علم طبیعی کے یہ بات ضرور ہوتی ہے کہ کسی خاص برتن میں سے ہوا کو جہاں تک بنے وہاں تک نکال لیں یعنی برتن مذکور میں خلا کے قریب قریب موجود ہو جائے گو وہاں بالکل خلا نہ ہو۔ اس واسطے اس مطلب کے ایک آلہ ایجاد ہوا ہے اور اس کا نام ایر پمپ ہے۔"

"حال ایک عجیب قسم کے چیونٹوں کا۔"

"یہ جانور مانند چیونٹوں کے قریب ایک چوتھائی انچ کے طول میں ہوتے ہیں...... جو مکان اور گھر وہ واسطے اپنی بود و باش کے بناتے ہیں وہ صنعب اور حکمت میں انسان کی عمارتوں سے بھی شرف لے گئے ہیں۔ بعضے ان جانوروں میں سے ایسی عمارتیں بناتے ہیں جن کی شکلیں قریب قریب مطابق مخروط طول مقطع یعنی گاجروں کے ہوتے ہیں اور بعضے عمارتیں بہ شکل استوانوں کے یعنی بہ شکل ڈھولوں کے کہ ان کے اوپر چھپر سے پڑے رہتے ہیں...... اگر ان عمارتوں کو اندر سے دیکھو تو نہایت اچھے کمرے اور دالان اور دیوان خانے وغیرہ نظر آتے ہیں...... اگر کوئی شخص ان کے مکان پر جا کر اس میں سوراخ کرے تو دیکھا گیا ہے کہ فوراً اس سوراخ میں چند سپاہی کیڑے نظر آتے ہیں اور وہ کچھ غل کرتے ہیں اور خفا معلوم ہوتے ہیں...... یہ کیڑے ملک افریقہ یعنی حبش میں پائے جاتے ہیں اور ان کو حبشی لوگ کھایا کرتے ہیں۔ یہ کیڑے مکانات اور درختوں اور اشیاء کو تھوڑی دیر میں غارت کر ڈالتے ہیں۔"

"یہ درخت بڑ کا ملک گجرات میں کنارہ دریائے نربدا پر واقع ہے اور کہتے ہیں کہ کوئی بڑ کا درخت اس قدر بڑا سطح زمین پر نہیں پایا جاتا ہے گو حال میں اس کی بہت سی شاخیں گر گئی ہیں پھر بھی محیط اس درخت کا قریب سات سو گز کے ہے...... ہنود بطریق جاترا کے درخت کے پاس جاتے ہیں اور اس کے نیچے مقام کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سات ہزار سے زیادہ آدمی اس درخت کے نیچے آرام سے مقام کر سکتے ہیں۔"

یکم دسمبر ۱۸۴۵ء کے اخبار میں لالہ ہردیو سنگھ کی کتاب "رسالہ چاپنگ بوسیلہ ہیٹ و لائٹ" اور ۲۹ دسمبر ۱۸۴۵ء کے پرچے میں ماسٹر رام چندر کی کتاب "جبر و مقابلہ" پر تبصرے شایع ہوئے ہیں۔

مذکورہ دونوں اخباروں کی کئی جلدیں نواب ظہیر یار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

رسالہ تہذیب الاخلاق

:- یہ ماہوار رسالہ سر سید احمد خاں کی ادارت میں ۱۰ / ۸ کی تقطیع پر دو کالم میں ہر ماہ ہلالی کی پہلی تاریخ شایع ہوتا تھا۔ اس کا حجم عموماً (۲۰) صفحات رہتا تھا۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ پریس میں ٹائپ میں چھپتا تھا۔ سر سید نے اپنے سفر لندن سے واپس آکر یہ رسالہ جاری کیا جس کا پہلا شمارہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء مطابق یکم شوال ۱۲۸۷ھ کو شایع ہوا۔ اس رسالے کی اشاعت نے اردو صحافت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اردو زبان میں مذہبی، علمی و فنی اور دیگر مفید مضامین کا اضافہ ہوا۔ اس کی طرز نگارش مقبول خاص و عام ہوئی اور علمی حلقوں میں اس نے اپنا ایک وقار حاصل کر لیا تھا۔ اس کا معیار بہت ہی بلند تھا اور یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ آج تک اردو کا کوئی رسالہ اس معیار کو نہ پہنچ سکا۔ تہذیب الاخلاق کی زندگی کے تین دور قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ پہلی دفعہ ۱۸۷۰ء م ۱۲۸۷ھ سے ۱۸۷۶ء م ۱۲۹۳ھ تک جاری رہا اور پھر تین سال کے وقفہ کے بعد دوسری دفعہ ۱۸۷۹ء م ۱۲۹۶ھ سے ۱۸۸۱ء م ۱۲۹۹ھ تک شایع ہوتا رہا۔ تقریباً ۱۲ سال تک اس کی اشاعت بند رہی اور آخری دفعہ ۱۸۹۴ء م ۱۳۱۱ھ سے ۱۸۹۶ء م ۱۳۱۴ھ تک جاری رہ کر ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

اس رسالے کے پرچے اب کمیاب ہیں۔ اگر کبھی کسی کو

ایک آدھ جلد مل جائے تو منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے۔ اس کے لکھنے والوں میں سرسید کے علاوہ نواب محسن الملک مہدی علیخاں، نواب وقارالملک مولوی محمد مشتاق حسین۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی۔ نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان بزرگوں نے ملک و قوم کی اصلاح کے لئے محققانہ اجد و تلگد از مضامین لکھے۔ مغربی علوم و فنون کے ترجموں اور حکیمانہ مضامین سے اردو زبان میں وسعت اور ہمہ گیری پیدا کر دی۔ بالخصوص سرسید نے نئے نئے مفید و دلچسپ عنوانوں پر مضامین لکھکر ایک جدید اسلوب کی بنا ر ڈالی۔ ہم کو تہذیب الاخلاق کی حسب ذیل اشاعتوں کے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔

(۱) من ابتدائے ماہ جمادی الاول لغایتہ ماہ رمضان ۱۲۹۶ھ

(۲) من ابتدائے شوال ۱۳۱۱ھ لغایتہ یکم رمضان ۱۳۱۲ھ

(۳) من ابتدائے یکم شوال ۱۳۱۲ھ لغایتہ یکم رمضان ۱۳۱۳ھ

مذکورہ بالا جلدوں میں سائنس پر جو مضامین شایع ہوئے ہیں ان پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

۱۲۹۶ھ کی جلد میں محمد ابوالحسن نے "قدیم اور جدید علوم" پر ایک طویل مضمون قلمبند کیا ہے جس میں قدیم اور جدید علوم کا موازنہ کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ علوم حکمیہ قدیم سے چلے آتے ہیں اور یونانی ان کے موجد ہیں۔ لارڈ میکالے کی ایک کتاب کے حوالے سے جو لارڈ بیکن کی زندگی کے حالات پر لکھی گئی تھی یہ بتلایا ہے کہ قدیم زمانے میں علوم حکمیہ کی غایت کیا تھی اور زمانہ جدید میں ان کی کیا غایت قرار پائی ہے۔ علم طبیعیات و فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے علم ہیئت کے متعلق بحث کی ہے جس کا اقتباس یہ ہے:-

"یہ علم منجملہ ان علوم کے ہے جن کے سیکھنے کی افلاطون نے اپنے شاگردوں کو بالخصوص ہدایت کی تھی..... سقراط کے نزدیک اجرام فلکی کے واقعی حرکات کا علم چنداں وقعت نہیں رکھتا ہے۔ وہ صورتیں جو رات کے وقت آسمان کو زیب و زینت بخشتی ہیں ان کی تشبیہ کس نے ان اشکال سے دی ہے جو کوئی مہندس زمین پر کھینچ لے گویا وہ مثالیں ہیں اور ضعیف دماغوں کے واسطے ایک محض اعانت ہیں..... ہم کو ایک ایسا علم ہیئت حاصل کرنا چاہیے جو حقیقی ستاروں سے ایسا ہی خارج ہے جیسا کہ ہندسی صدق کسی بد صورت شکل کے اضلاع و خطوط سے خارج یا مستغنی ہوتا ہے......"

یکم ربیع الثانی ۱۳۱۲ھ کے پرچے میں عنایت اللہ کا ایک مضمون "نیچرل سینز کے عجائبات" کی سرخی کے تحت شایع ہوا ہے جس میں ہوا۔ آفتاب۔ چاند اور زمین متعلق مفید معلومات بیان کی گئی ہیں۔ عبارت کا نمونہ درج کیا جاتا ہے:-

"ہم اپنی دوربینوں کے ذریعہ سے جواب کمال کے درجے کو پہونچ گئی ہیں۔ چاند کی مفصل کیفیت اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں اور اس کا ایسا امتحان کر سکتے ہیں جیسے زمین پر کسی دور کی چیز کو دیکھیں۔ اس لئے ہم ایک خاص حد تک اس کی طبعی کیفیت (جیالوجیکل) کو بخوبی معلوم کر سکتے ہیں۔"

یکم ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ کے پرچے میں شمس العلما مولوی ذکاءاللہ کا ایک مضمون "حرکت زمین کا معائنہ عینی" کے عنوان سے شایع ہوا ہے جس میں نظام بطلیموسی کی تردید کرتے ہوئے نظام کوپرنیکس کے مطابق زمین کی گردش ثابت کی گئی ہے۔ اپنی دلیلوں کے اثبات میں پورے ایک صفحہ پر تین اشکال دی گئی ہیں جو پتھر میں طبع ہوئی ہیں۔ ان کی ایک دلیل یہ ہے:-

"شکل میں (ا۔ س) ایک بلند مینار ہے۔ زمین کا مرکز (ع) ہے جس کی طرف خط شاقولی (ا۔ س) کھنچا ہوا ہے۔ اور (ا) سے ایک گیند مرکز زمین کی طرف پھینکی گئی ہے۔ اب فرض کرو کہ جتنی دیر میں زمین پر گیند آئی زمین گردش کر کے زاویہ (س ع س) کو طے کرے۔ پس جس وقت کہ گیند زمین پر پہنچے گی مینار کا مقام (ا۔ س) پر ہوگا۔ اب گیند میں ایک حرکت مشرق کی طرف بہ سبب حرکت زمین کے اسوقت تھی جب وہ (ا) سے چھوڑی گئی تھی وہ اس کے سبب سے زمین کے مشرق کی طرف اس مسافت کو طے کرتی جو (۱۱) کے برابر ہوتا لیکن (۱۱) بڑا بہ نسبت (س س) کے ہے تو جس فاصلہ پر (س) سے مشرق کیطرف گیند زمین پر گرے گی وہ ضرور بڑا (س س) سے بقدر فرق (۱۱) اور (س س) کے ہوگا۔ پس اگر (س ب) ان دونوں قوسوں کے درمیان ہوگا جن کو سر مینار اور پائے مینار طے کریں گے۔ مگر فاصلہ (س ب) نہایت ہی چھوٹا ہے اس لئے اس کا ناپنا دشوار ہوتا ہے اسلئے ہمیشہ یہ مانا گیا تھا کہ جب مینار یا مستول سے پتھر کو پھینکتے ہیں تو وہ اسکی جڑ ہی میں گرتا ہے۔"

(یہ جلدیں کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں موجود ہیں)

خواجہ حمیدالدین

حالی کی ترقی پسندی

(انجمن ترقی پسند مصنفین حیدرآباد دکن کی طرف سے مارچ ۱۹۴۳ء میں جشن یوم حالی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا تھا۔ اس جلسہ کی صدارت عالیجناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے فرمائی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی خواہش پر عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے یہ مقالہ اس جلسے میں پڑھا جو بیحد پسند کیا گیا۔ ادارہ سب رس ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گزار ہے کہ اسے شائع کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ ادارہ)

حالی اپنے عہد کے ایک ترقی پسند ادیب تھے اور زمانہ حال کے ترقی پسند ادیبوں کے خلاف کچھ عرصہ سے اعتراضات اور طعن و تشنیع کا جو طوفان برپا ہے بالکل ویسا ہی طوفان حالی کے خلاف بھی اٹھا تھا۔

حالی کی ترقی پسندی اور حال کی ترقی پسندی میں اگر کوئی اہم فرق نظر آتا ہے تو وہ صرف زمانہ کا ہے حالی اپنے عہد کے نمائندے تھے اور موجودہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اپنے زمانہ کی پیداوار ہیں۔ حالی کی نشو و نما جس ماحول میں ہوئی تھی اس وقت معاشرے کا جو اخلاقی معیار تھا اور ان کے زمانے میں جو سیاسی اور سماجی انقلاب رو نما ہو رہے تھے وہ سب حالی کی حیات اور ترقی پسندی پر اثر انداز تھے۔

حالی کے بعد سے اب تک ہماری معاشرت اور ہمارے اخلاقی معیار میں کافی فرق پیدا ہو چکا ہے اور وقت کے سیاسی و سماجی رجحانات بھی بالکل بدل چکے ہیں اسی لیے عہد حاضر کے ترقی پسندوں کے افکار اور اعمال بھی بدلے ہوئے ہیں۔ اور ان کی بعض سرگرمیاں اور تحریریں ہمارے مروجہ معیار اخلاق سے گری ہوئی نظر آتی ہیں۔

جس طرح حالی ہندوستانیوں کی سیاسی و ادبی زندگی کے ایک موڑ پر کھڑے تھے موجودہ ادیب اور شاعر کے راستے میں بھی ایک ایسا ہی موڑ آ گیا ہے۔ دونوں کی نظر اپنے ساتھیوں اور ہمچشموں کی نظروں سے دور اپنے ماحول سے ہٹ کر اپنے زمانے سے کچھ آگے کو دیکھتی ہے اسی لئے مخالفت اور اعتراضات کا ہدف بننا دونوں کے لئے ناگزیر ہے۔

لیکن حالی کی ترقی پسندی اور موجودہ ترقی پسندی کی مہم میں ایک فرق یہ ہے کہ عہد حاضر میں ترقی پسندی ایک وبا کی طرح نازل ہو رہی ہے۔ اور ہر ناقص شاعر اور نا اہل ادیب ترقی پسندی کے روپ میں اپنی کم علمی، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپانا چاہتا ہے۔ اور ایسے نام نہاد ترقی پسندوں سے اس مفید تحریک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس سے سچے اور مخلص ترقی پسند بھی ناواقف نہیں ہیں۔ اور اگر وہ بہت جلد اپنی ایک احتسابی جماعت نہ بنا لیں اور موقع بہ موقع ان نام نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ نہ لیتے رہیں اور ان کی نسبت اپنی صریحی رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ نہ کریں تو یقین ہے کہ نہ صرف اس تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا زنگ چڑھ جائے گا جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اس طرح حالی کی ترقی پسندی آج جن مستحسن نگاہوں سے دیکھی جا رہی ہے اور اس امر کا اعتراف کیا جا رہا ہے کہ انھوں نے اردو کی نثر و نظم کو ترقی کی شاہراہ پر پہنچا دیا اس کے بالکل برعکس عہد حاضر کے ترقی پسندوں اور ترقی پسندی کی مہم چلانے والوں پر ناعاقبت اندیشی اور گمراہی کا الزام لگایا جائے گا۔ کیونکہ ان کی موجودہ لاپروائی اردو ادب کی تاریخ میں ایک ایسا بدنما داغ بن جائے گی جو مٹائے نہ مٹ سکے گا۔ ان کو اپنی اس کامیابی پر فخر نہیں کرنا چاہئے کہ ہر نوجوان ان کی تقلید

کر رہا ہے اور ترقی پسندی رفتہ رفتہ ایک فیشن بنتی جا رہی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نقطۂ نظر سے موجودہ ترقی پسند ادیب حالی کے مقابلے میں بہت خوش نصیب ہیں کیونکہ حالی کو ان کی زندگی میں ایسے جوشیلے پیرو اور اس کثیر تعداد میں شاگرد نصیب ہوئے لیکن یہ خوش بختی احتساب اور اعتدال کے بغیر ایک بلائے بے درماں بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

میری نظر میں یہ ایک فال نیک ہے کہ حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین نے جشن یادِ حالی منا کر اپنی خوش ذوقی اور سلامت روی کا ثبوت دیا۔ حالی کی حیات اور کارنامے ہر عہد کے ترقی پسند شاعر اور ادیب کے لئے چراغِ راہ کا کام دیتے رہیں گے جس کی روشنی میں محسوس ہوگا کہ ترقی پسندی میں کامیابی کا پہلا راز سلامت روی میں مضمر ہے۔ ترقی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ بگٹٹ دوڑنے لگیں جن نام نہاد ترقی پسندوں نے ترقی پسندی اور بے لگامی کو لازم و ملزوم سمجھ لیا ہے ان کی خاطر ضروری تھا کہ مولانا حالی جیسے ترقی پسند شاعر کی شخصیت کو پیش نظر رکھا جاتا۔

حالی کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دے گا کہ ترقی پسندی کا ایک لازمی جزو شائستگی اور پاکیزہ خوئی بھی ہے اور اس معاملہ میں حالی ایک بہترین نمونے کا کام دے سکتے ہیں۔ انھوں نے اپنے بڑے سے بڑے مخالف کے جواب میں بھی بدمزاجی اور ترش روئی سے کام نہیں لیا۔

حالی کی زندگی کا ایک سرسری مطالعہ بھی ظاہر کر دے گا کہ ان کے ہمعصروں نے ان کی ترقی پسندانہ روش کے خلاف کیسے کیسے سبک اور ذلیل حملے کئے تھے۔ کسی نے ان کو ایک بگڑا شاعر قرار دیا اور کسی نے ان کی شاعری کو وعظ و نصیحت سے تشبیہ دی۔ بعضوں نے ان کی دردمندانہ قومی نظموں کو مرثیہ گوئی کہہ کر ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کی۔ چنانچہ خود حالی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ؎

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں

ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کراتے تھے کہ یہ المناک بیان اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے گا۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے کئی موقعوں پر کیا تھا۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

رونے میں تیرے حالی لذت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گل فشانیاں ہیں

حالی کے مخالفین عام طور پر یہ طنز کیا کرتے تھے کہ مولانا قوم کے مصلح اور رہبر بننا چاہتے ہیں اور اسی لئے ہر وقت قوم کا ماتم کیا کرتے ہیں۔ حالی نے اس طعن و تشنیع کا جواب جس دردمندانہ انداز میں دیا ہے وہ عہد حاضر کے "ادب برائے زندگی" کا ادعا کرنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ اس نظریے کو انھوں نے کس لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے ؎

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر
دردمند ان کے نہ ان کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر
نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

حالی ہماری زبان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نہ فقط اپنی شاعری کے ذریعہ سے "ادب برائے زندگی" کے نظریے کی تبلیغ کی بلکہ مقدمۂ شعر و شاعری میں بھی شعر و سخن کی افادیت پر نہایت علمی اور سنجیدہ انداز میں بحث کی۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی کی اس بلند پایہ کتاب کی اشاعت کے ساتھ ہی اردو شاعری میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ اور اسی کے اثر سے وہ فضا پیدا ہو گئی جس کے گل سرسبد کے طور پر ہمارے ملک کو اقبال جیسا عالی مرتبت اور صاحب نظر شاعر نصیب ہو سکا۔

حالی کی دردمندی اور حقائق حیات کی نمائندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ ان کی صحیح عظمت ان کی زندگی ہی میں محسوس کی جانے لگی اور جو لوگ انھیں پہلے پہل خاطر میں نہ لاتے تھے،

وہ بھی آخر کار ان کی طرف مائل ہو گئے اور اس شاعر مستقبل کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی کہ ؎

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

ایک اور جگہ انھوں نے لکھا تھا ؎

سُر تھے وہی اور تان وہی پر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں

جیسے جیسے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا، حالی کے بعض حاسدوں کے حملے اور بھی وزنی اور سنجیدہ ہوتے گئے۔ چنانچہ ان کی مقبولیت اور ان کے کلام کے اثر کو گھٹانے کے لئے ان کے بعض ہمعصروں نے اہل زبان کے دقیانوسی حربے سے کام لینا چاہا۔ انھوں نے یہ الزام لگایا کہ حالی چونکہ دلی میں پیدا نہیں ہوئے اس لئے وہ اہل زبان نہیں ہیں اور کوئی غیر اہل زبان کبھی اعلیٰ شاعر نہیں ہو سکتا۔

یہ اعتراض آج اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنی کہ مولانا حالی کے زمانے میں اس کو حاصل تھی۔ اب تو بقول مولانا سلیم اردو زبان دہلی اور لکھنو میں محدود نہیں رہی ہے۔ وہ کبھی کے ان حدوں کو توڑ کر باہر نکل چکی ہے۔ بہرحال وقت کے اقتضاء اور عام معتقدات کی اہمیت کی بناء پر حالی کو اسی اعتراض نے سب سے زیادہ مجروح کیا۔ اور وہ اس سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی ایک نظم کے ذریعے سے اس کا جواب دیئے بغیر نہ رہ سکے۔ لیکن یہ جواب بھی جس انوکھے اور پاکیزہ انداز میں دیا ہے وہ عہد حال کے بعض تلخ گو ترقی پسندوں کے لئے ایک بہترین نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ مولانا نے لکھا ؎

اک دوست نے حالی سے کہا از رہِ انصاف
کرتے ہیں پسند اہل زباں اس کے سخن کو
چند اہل زباں جن کو کہ دعویٰ ہے سخن کا
بولے کہ نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہل زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اس کے دہن کو
معلوم ہے حالی کا جو ہے مولد و منشاء
اردو سے بھلا واسطہ حضرت کے وطن کو
اردو کے وہ ہیں جو دلی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ پورب نہ دکن کو
بلبل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
کیا عالم گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بہ مثل نہر لبن ہو
خالص نہ ہو تو کیجئے کیا لے کے لبن کو
ہر چند کہ صنعت سے بنائے کوئی نافہ
پہنچے گا نہ وہ نافۂ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے بے ساختہ پن اس کے بیاں میں
کیا پھونکئے اس ساختہ بے ساختہ پن کو
یہ دوست نے حالی کے سنی جب کہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد ان کے پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں صاحب عزت اسی اردوئے ہی فن کو
سچ یہ ہے کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح عہد حال کے ترقی پسند شاعر نے سرمایہ دارانہ اقتدار اور صنف نازک پر مردوں کے جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کی اور عورت کی مظلومیوں اور غلامانہ بے ثمریوں کو اپنی رمز نگاری کا ایک آلۂ کار بنانا چاہا، حالی کی ترقی پسندی نے بھی عورت کی طرف خاص طور پر توجہ کی۔ چنانچہ اس موضوع پر ان سے پہلے اردو کے کسی شاعر نے ایسی طویل اور

اثر انداز نظمیں نہیں لکھی تھیں۔ لیکن حالی کے اور عہد حال کے کسی ترقی پسند شاعر کے نا ویۂ نظر اور اظہارِ خیال میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور یہ فرق نہ صرف زمانے کے اختلاف کا نتیجہ ہے بلکہ دونوں کی مختلف ذہنی نشو ونما اور افتادِ طبع کی وجہ سے بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں حالی نے عورت کو ماں، بہن، اور بیٹی کے روپ میں دیکھا۔ جدید ترقی پسند ادیب اور شاعر اس کو محض ایک مشغلۂ وطلو العت یا واشتہ کی شکل میں دیکھتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمانۂ حال کی ذہنی کشمکش اور سوسائٹی کی ستم ظریفی اور کمزوریوں کے خلاف جذبات کی شدت نے ہمارے بعض جدید شاعروں کی تلخ نوائی اور دشنام طرازی میں ایک ایسی بے حجابی پیدا کر دی ہے جو گندگی اچھالنے اور غلاظت پھیلانے میں بھی جھجک محسوس نہیں کرتی۔ ان حالات کے تحت زمانۂ حال کا کوئی نوجوان شاعر عورت کو مولانا حالی کی طرح "اے ماؤ بہنو بیٹیو" سے مخاطب نہیں کر سکتا۔

مولانا حالی نے عورت کے موضوع پر بہت لکھا ہے اور نہایت دردناک پیرائے میں لکھا ہے ان کی نظمیں بیوہ کی مناجات اور چپ کی داد اب تک بڑا اثر رکھتی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ انھوں نے جس پیرائے میں لکھا اسی کی زمانۂ حال میں بھی تقلید کی جائے۔ تاہم جدید ترقی پسند ادیب اور شاعر ان کے مطالعہ سے فائدہ حاصل کئے بغیر رہ سکیں گے کیونکہ انھیں محسوس ہوگا کہ شہوانی جذبات کے جائے بجا اظہار اور جوانی کی سرمستیوں کو عریاں کئے بغیر بھی اپنی اور عورت کی مظلومی اور بے بسی کا اظہار کی جا سکتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور

مجبوریاں

یہ میرا دل جو تمھیں دیکھ کر دھڑکتا ہے
تمھاری یاد جو اکثر مجھے ستاتی ہے

تمھاری آنکھوں میں جلوے جو رقص کرتے ہیں
مرے بدن میں جو بجلی سی دوڑ جاتی ہے

وہ شعریت جو تمھاری نگاہ میں ہے نہاں
وہ شعریت جو مرے دل کو گدگداتی ہے

کبھی جو چاندنی راتوں میں تم سے ملتا ہوں
حسین رات مرا صبر آزماتی ہے

تمھیں بتاؤں میں کیسے وہ آرزو کیا ہے
وہ آرزو جو مجھے رات بھر جگاتی ہے

وہ داستان سناؤں بھلا تمھیں کیونکر
چمن میں جس کو کلی سن کے مسکراتی ہے

وہ راز کیا ہے میں تم کو سنا نہیں سکتا
بتانا چاہتا ہوں پر بتا نہیں سکتا

سعادت علیخاں

مذہب

"کہا کرتے ہیں اکثر مارکس اور لینن کے شیدائی
کہ قوموں کے لیے افیون ہے اور زہر ہے مذہب"

"تھپک کر جو سلا دیتی ہے انساں کے تفکر کو
سرود و نشہ کی اٹھتی ہوئی وہ لہر ہے مذہب"

"نکلتے ہی نہیں گمراہ اب بھی اس کی سرحد سے
ہزاروں وسوسوں کا اک طلسمی شہر ہے مذہب"

"سکھاتا ہے یہ شوقِ بندگی و درسِ مجبوری
جلال و عظمتِ آدم کے حق میں قہر ہے مذہب"

مگر ان عقل کے پتلوں کو کوئی کیسے سمجھائے
کہ تشنوں کے لیے پانی کی میٹھی نہر ہے مذہب"

ہزاروں سال سے پیتے رہے ہیں سب ہی جام اس کا
کبھی رک بھی سکا ہے آج تک یہ فیضِ عام اس کا

بہت سے نقش ابھرے اس زمیں پر مٹ گئے لیکن
زمانہ کی جبیں پر ثبت ہے نقشِ دوام اس کا

بہت سے انقلاب آئے گئے اس بزمِ ہستی میں
مگر قائم رہا ہے آج تک محکم نظام اس کا

وہ نغمہ روح کی تابندگی جس سے عبارت ہے
بڑی اونچی ہے لے اس کی، بہت پیارا ہے نام اس کا

رہے ہوں میکدے گر مختلف تو اس سے کیا مطلب
مگر پیتے رہے ہیں پینے والے سب ہی جام اس کا

وہ اک احساسِ فطرت کارفرما ہے جو مدت سے
وہ اک تنظیم عرفِ عام میں مذہب ہے نام اس کا

ازل ہی سے شعور و فہمِ انسانی میں پنہاں تھا
یہ جذبِ اندروں ہمراہیٔ تقدیرِ انساں تھا

یوں ہی جلتا رہے گا لمعۂ احساسِ انسانی
چراغ اس کعبۂ فطرت میں جل سکتا نہیں کوئی

یہ مذہب جو بجائے خود ہی اک افسونِ کامل ہے
پھر اس کے سامنے افسون چل سکتا نہیں کوئی

یہ بے دینی کا ذکرِ عام، یہ ترغیبِ گمراہی
یقیں رکھیے کہ ان کے ساتھ چل سکتا نہیں کوئی

یہ مذہب سے بغاوت اپنی فطرت سے بغاوت ہے
کبھی انسان کی طینت بدل سکتا نہیں کوئی

غرض مذہب کا یہ ادراک آدم کی جبلت ہے
یہ طرزِ امتیازِ خاص ہے یہ آدمیت ہے

علی اشرف

چھوٹے روضہ کا گنبد

اس احاطہ کا سب سے بڑا گنبد حضرت شاہ قبول اللہ حسینیؒ (قبول اللہ حسینی) گنج بخش کا ہے۔ آپ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے پوتے اور حضرت اصغر حسینیؒ کے صاحبزادے ہیں۔ اس گنبد مبارک کا طرز تعمیر بھی فیروز شاہی ہے مگر نقش ونگار کی فراوانی اور عمدگی میں فیروز شاہی جوڑواں گنبد کے دوسرے گنبد سے بھی بدرجہا بڑھا ہوا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ لاجواب ہے۔ دو چیزوں میں یہ اس سے مختلف ہے ایک تو یہ کہ اس کی اندرونی آٹھ کمانوں میں وہ موٹے موٹے اور لانبے لانبے چار چار کنگرے نہیں ہیں جو فیروز شاہی دور کی ایجاد ہیں اور حضرت خواجۂ بزرگؒ کے گنبد میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی کسی کمان میں بھی آرائشی ستون استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ یہ گنبد حضرت خواجۂ بزرگؒ کے گنبد سے بلندی میں بھی کم ہے اور وسعت میں بھی چنانچہ اندر سے اس کا ہر ضلع ۴۹ فٹ چار انچ اور باہر سے ۴، فٹ نو انچ ہے۔

دوسرے بڑے گنبدوں کے مانند یہ بھی دوہرا ہے۔ اوپر کی منزل اپنی اصلی حالت میں ہے۔ نچلی منزل کی رنگ آمیزی نئی ہے مگر ذرا سلیقہ سے کی گئی ہے۔ نقوش کو مختلف رنگوں سے رنگا گیا ہے۔

کمانوں اور طاقچوں وغیرہ پر سورتیں اور آیتیں گچ کے ابھرے ہوئے حروف میں اور ایک طرزِ خاص کے عربی رسم الخط میں ہیں۔ مغربی محراب جو بہت ہی خوشنما ہے اس کے اوپر سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص لکھی ہوئی ہے اور نیچے حسب ذیل درود شریف تحریر ہے۔

اللّٰھم صلِّ علےٰ محمدٍ وعلیٰ آلِ محمدٍ وبارِک وسلِّم علےٰ جمیع الانبیاءِ والمرسلین والملائکۃ المقرّبین وعلیٰ عبادک الصالحین وعلیٰ کلِ ملَکٍ بفضلک یاذوالفضلِ العظیم وسلِّم تسلیماً کثیراً برحمتک یا ارحم الرّاحمین۔ یا اللّٰہ۔

اس محراب کے اندر پیچھے کی طرف ایک طاقچہ ہے جس کی گہرائی ایک فٹ آٹھ انچ، اونچائی ۵ فٹ اور چوڑائی ۲ فٹ دو انچ ہے۔ اس کے اوپر لکھا ہوا ہے بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم۔ لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہٗ واشھد ان محمداً عبدہٗ ورسولہٗ۔ جتنے ایسے طاقچے ہیں وہ سب تقریباً اسی ناپ کے ہیں جن پر اب خوبصورت کواڑ لگا دیئے گئے ہیں۔

مغربی محراب کی سیدھی طرف جو کمان ہے اس پر لکھا ہوا ہے۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم قُلِ اللّٰھم مالکَ الملکِ تؤتی الملکَ من تشاءُ وتنزعُ الملکَ ممّن تشاءُ وتعزُّ من تشاءُ وتذلُّ من تشاءُ بیدک الخیر انک علیٰ کلِ شیٍٔ قدیرٌ برحمتک یا ارحم الراحمین۔ اس کمان کے نیچے لکھا ہوا ہے۔ شھدَ اللّٰہ انہٗ لا الٰہ الا ھو والملائکۃ واولو العلم قائماً بالقسطِ لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم انّ الدینَ عند اللّٰہ الاسلام صدق اللّٰہ (اس کا بقیہ حصہ بائیں کمان کے طاقچہ پر ہے۔)

اس محراب کے اندر جو طاقچہ ہے اس پر یہ آیت تحریر ہے سُبحانَ ربّکَ ربِّ العزّۃ عمّا یصفون وسلامٌ علےٰ المرسلین والحمد للّٰہ ربِّ العالمین ۞

مغربی محراب کی بائیں طرف جو کمان ہے اس کے اوپر سورۂ کافرون کے بعد ربّنا آتنا فی الدنیا حسنۃً وفی الآخرۃ حسنۃً وقِنا عذابَ النّار اور نیچے سورہ فلق اور سورہ ناس لکھی ہوئی ہے۔ اس کمان کے اندر جو طاقچہ ہے اس پر سیدھی طرف کے مذکورۂ بالا طاقچہ کی بقیہ عبارت العلیّ العظیم وصدق رسولہٗ النبیّ الکریم ونحن علیٰ ذالک من الشاھدین اللّٰھم انفعنا بالقرآنِ الکریم۔ تحریر ہے۔ ان کے علاوہ اور جتنی محرابیں کمانیں اور ان کے اندر کے طاقچے ہیں مختلف نقوش اور

گلکاری سے آراستہ ہیں۔ اس نچلی منزل کی محرابوں پر تقریباً پون فٹ کا ایک مربع حلقہ قائم کرکے اس پر چار کمانوں اور چار نیم محرابوں کی ایک دوسری منزل قائم کی گئی ہے۔ اس مربع حلقہ پر پوری یٰس شریف لکھی گئی ہے جو گوشۂ شمال مغرب سے شروع ہوتی ہے۔ اس حلقہ پر پرانا سرخ رنگ ہی باقی رکھا گیا ہے اور قبہ میں بھی اوپر تک یہی شنگرفی رنگ دیا گیا ہے جو اب بہت مدھم ہو گیا ہے۔

اوپر کی منزل کی مغربی محراب پر لکھا ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ انا فتحنا لک فتحاً مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطاً مستقیماً وینصرک اللہ نصراً عزیزاً۔ اس کے اندر کی کمان پر پوری سورۂ نصر لکھی ہوئی ہے۔ باقی تمام کمانیں اور نیم محرابیں مختلف نقوش سے آراستہ ہیں اور ان کے سراول پر پھول کے اندر لفظ اللہ لکھا ہوا ہے۔ نیم محرابوں میں بڑے بڑے منقش پان ہیں۔ ہر دو منزل کی تمام کمانوں نیم محرابوں اور طاقچوں پر دو دو ڈھال نما پھول ہیں۔ جن میں مختلف نقش ہیں۔ چونکہ اس گنبد کی بلندی حضرت خواجۂ بزرگ رح کے گنبد سے کم ہے اس لئے اس کی تمام محرابیں اور طاقچے بھی اس گنبد کی محرابوں اور طاقچوں سے قدرے پست ہیں۔

دوسری منزل کے ختم پر مثلث نما کنگروں کا دوہرا حلقہ ہے اس کے اوپر اس قسم کا حلقہ ہے۔ اور ان کے اطراف گلکاری ہے۔ اس کے اوپر لہردار مثلث نما کنگروں کا حلقہ ہے اور اس پر تکونی کنگرے ہیں۔ وہ بھی سب منقش ہیں۔ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک حلقہ ہے جس میں سرخ زمین پر سفید حروف میں لکھا ہوا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو عالم الغیب والشھادۃ ھو الرحمن الرحیم۔ ھو اللہ الذی لا الٰہ الا ھو الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق الباری المصور الغفار الوھاب۔ چنانچہ اسی طرح اسمائے حسنیٰ کا سلسلہ چلا گیا ہے۔ ان کے ختم پر حلقہ کے آخر میں لکھا ہے۔ الذی لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر حسبی اللہ نعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر محمد الرسول اللہ سید الصادق المصدق الامین برحمتک یا ارحم الراحمین

اس حلقہ میں یہ جو کچھ لکھا ہوا ہے۔ گچ کے ابھرے ہوئے حروف میں نہیں ہے بلکہ روشنائی سے لکھا ہے۔ اس کا خط بھی کچھ ایسا عمدہ نہیں ہے اور اس گنبد کے دوسرے کتبوں سے اس کا رسم الخط بھی مختلف ہے اس لئے میں خیال کرتا ہوں کہ یہ بعد کی تحریر ہوگی۔ سوائے اس حلقہ کے باقی تمام تحریریں گچ کے ابھرے ہوئے حروف میں ہیں۔

اس حلقہ پر آٹھ پان ہیں جن میں مختلف نقش کرکے شنگرفی رنگ دیا گیا ہے۔ اس سے کچھ فاصلہ پر چھ حلقے ہیں۔ پہلے تین حلقے بہترین گلکاری کے ہیں۔ ان کے بعد کے دو حلقوں میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد پوری آیۃ الکرسی اور اس کے بعد لا اکراہ فی الدین سے ھم فیھا خالدون تک گچ کے ابھرے ہوئے حروف میں تحریر ہے۔ پھر ایک حلقہ گلکاری کا ہے اور اس کے بعد بیچوں بیچ ایک گول پھول یہ پھول اور تمام حلقے نقش اور نگار (تحریر) دونوں اعتبار سے اعلیٰ قسم کے ہیں۔ رنگ بھی جاذب نظر دئے گئے ہیں اور یہ سب اب تک صحیح اور اچھی حالت میں ہیں۔

بیرونی منظر

باہر بھی ہر طرف کمانوں کی دو منزلیں قائم کی گئی ہیں۔ ہر کمان کے سرے پر ایک بڑا چوڑا پھول اور مرغول کے رو کار دو ڈھال نما پھول ہیں۔ اوپر کی منزل میں ہر کمان میں اندر کی طرف کچھ گل کاری اور بیچ میں ایک ایک خوبصورت پھول زنجیر سے لٹک رہا ہے (یہ صرف جنوبی سمت میں ہے) مگر یہ تمام نقوش ہر سال کی آہک پاشی سے خراب

ہو گئے ہیں اور اکثر تو مٹ گئے ہیں۔

پہلے اس گنبد کا ایک ہی دروازہ صاحب مزار کے پائیں میں جانب جنوب تھا۔ مگر نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار کے زمانہ میں شمال اور مشرق کی طرف بھی دو دروازے نکالے گئے جس سے گنبد روشن اور ہوا دار ہو گیا ہے۔ لیکن قابل ذکر دروازہ تو قدیم ہی ہے۔ اس پر پتھر کی چوکھٹ لگی ہوئی ہے اس کا طول ۸ فٹ اور عرض ۴ فٹ سات انچ ہے۔ چوکھٹ کے اوپر خوشنما جال ہے اور اس پر جو کمان بنی ہوئی ہے۔ اس کے پاکھوں پر غالباً کوئی دعا لکھی ہوئی تھی جو اب جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی ہے جس کی ابتدا اس طرح سے ہوئی ہے۔ سبحانک لا الہ الا انت ۔ اس کمان کے دو ڈھال نما پھول ہیں جن میں نصر من اللہ و فتح قریب الٰہ اور سید ہا کئی مرتبہ لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کمان کے سرے پر جو چوڑا پھول ہے اس میں یا مفتح الابواب بہ طرز طغرا سید ہا اور اللہ لکھا ہوا ہے۔

چوکھٹ کے پہلوؤں میں تین کتبے ہیں۔ پہلے کتبہ کے ابتدائی حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدیث شریف ہے مگر یہ پوری پڑھی نہیں جا سکتی۔ تیسرا کتبہ اس قدر پیچیدہ اور اس کے حروف کی بانی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ دیدہ ریزی کے باوجود بھی میں پڑھنے سے قاصر رہا۔ ان دونوں کے درمیان کا کتبہ صاف ہے۔ فارسی کے چار مصرعے عربی رسم الخط میں تحریر ہیں جن میں صاحب مزار حضرت شاہ ید اللہ حسینیؒ (قبولا حسینی) کے اد ہائے تاریخ ولادت و وفات دونوں موجود ہیں۔ آپ ان مصرعوں کی فصاحت، بندش کی چستی اور موزونی پر نظر نہ ڈالئے صرف تاریخی مادوں سے سروکار رکھئے جو حسب ذیل ہیں۔

ز مولود شاہ ید اللہ حسینی۔ سوم مصرعی نامہ تاریخ دانی۔ شاہ ید اللہ طبل ہم فلک زد۔ مؤرخ وفات اے شہنشاہ یقینی۔ اس میں تیز

مصرعہ سے تاریخ ولادت ۱۰۳۰ھ اور چوتھے مصرعہ کے آخری ٹکڑے "اے شہنشاہ یقینی" سے تاریخ وفات ۔ یہ تینوں کتبے کچھ کے ابھرے ہوئے حروف میں عربی رسم الخط میں ہیں۔ ۱۰۴۵ھ نکلتی ہے۔

دوسری منزل کی کمان چوکھٹ پر کی کمان سے زیادہ خوبصورت ہے، پوری گلکار ہے۔ اطراف خوشنما کتابی حاشیہ ہے، سرے پر چوڑا پھول اور مرغول کے روکار پر دو ڈھال نما پھول، ان کے بازو دو چھوٹے چھوٹے پان نما پھول نہایت خوبصورت۔ اس کمان کے اندر ایک چھوٹی سی خوشنما کمان ہے اس پر بھی کتابی حاشیہ اور پھول وغیرہ بنے ہیں۔ اوپر کے حصہ میں خوبصورت جالی اور نیچے پتھر کی چوکھٹ اندر گیلری میں جانے کے لئے۔ اس چوکھٹ کے فرش بازو دو خوب صورت پان۔ بہرحال یہ پوری محراب اپنی آرائش کی وجہ سے حسن کاری کا ایک ایسا اچھا نمونہ ہے جس کی نظیر گلبرگہ کے کسی گنبد میں نہیں۔ اگرچہ فیروز شاہی طرز کی کمانیں حضرت خواجہ بزرگ رحؒ کے گنبد میں بھی استعمال ہوئی ہیں مگر یہاں بہت زیادہ ترقی یافتہ صورت میں ہونے کی وجہ سے نہایت خوبصورت ہیں اور ان پر نقش و نگار سونے پر سہاگہ ہے۔ ہر طرف ایسی دس دس کمانیں ہیں۔ اوپر کی منزل کی کمانوں پر چوطرف اس قسم کے پھولوں کا حلقہ ہے۔ ہر پھول میں ایک طاقچہ ہے۔

اس حلقہ کے اوپر لہردار مثلث نما کیکر کی پھلی جیسے کنگروں کی ایک گوٹ ہے اور اس پر تکونی کنگرے قائم کئے گئے ہیں جو پانچ پانچ فٹ اونچے اور سب منقش ہیں۔ قبہ کا طرف میٹے کے سرے پر تکونی کنگروں کا حلقہ ہے اور قبہ کی چوٹی پر شاندار کلس ہے جس پر ایک تاج نما حلقہ ہے۔ اس حلقہ کے بیچ میں برقی روشنی کا گولا ہے جو رات کو تارے کی طرح چمکتا ہے۔ صوبہ دار عزیز نواز جنگ بہادر کے زمانے میں گنبد کے اندر بھی نہایت عمدہ قسم کی برقی روشنی کا انتظام کیا گیا اور

سمنٹ کی نقشی اینٹوں کا خوبصورت فرش کیا گیا ہے۔

میر جہانگیر علیخاں

کالے پانی کا مفرور قیدی

(بسلسلۂ گزشتہ)

دوسرے روز جب ہم نہایت اطمینان سے سو کر اٹھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم آزاد نہیں گرفتار ہیں۔ چنانچہ دوپہر تک ہم کو بڑی بڑی دیواروں سے گھرے ہوئے ایک قید خانے میں منتقل کر دیا گیا، تاکہ جلد از جلد کسی فرانسیسی جہاز کے ذریعے ہمیں دوبارہ اسی شیطانی جزیرے کو پہونچا دیا جائے، ان پھوٹے نصیبوں کو کیا کہیے ——— ع اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔ اس تازہ آفت سے ہمارے ساتھی اس قدر بد دل اور برافروختہ ہوئے کہ وہ ایک دوسرے کو اس مصیبت کا ذمہ دار ٹھہرانے لگے اور اس جھگڑے نے اس قدر شدت اختیار کی کہ محافظوں کو اندر داخل ہو کر اس بڑھتی ہوئی لڑائی کو رفع دفع کرنا پڑا۔ لیکن اس افراتفری میں نہ معلوم کیوں مجھے علاحدہ کر کے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔

اسی رات جیل کا منتظم میری کوٹھڑی کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنسل اور کچھ کاغذات تھے دریچے کے پاس جھک کر نہایت دھیمی آواز میں وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”بل بی تائے ہم لوگوں نے طے کیا ہے کہ تم کو اس قید سے آزاد کر دیا جائے۔ آج آدھی رات کے بعد تمہارے کمرے کا قفل کھلا ہوا رہے گا۔ لیکن یاد رہے تم اکیلے ہی بھاگ جا سکتے ہو، اس لئے کہ دوسروں کا معاملہ تم سے مختلف ہے وہ لوگ بہت زیادہ سنگین جرائم کے مرتکب ہوئے تھے“۔

میں اس غیر متوقع اور خصوصی مہربانی کا مطلب نہ سمجھ سکا اور شاید وہ لوگ بھی نہ سمجھ سکیں جنھوں نے جنوبی امریکہ کے باشندوں کی عجیب و غریب فطرت کا مطالعہ نہیں کیا ہے، جاتے جاتے پنسل اور کاغذات حوالے کرتے ہوئے وہ کہنے لگا ”اگر تم چاہو تو ان کاغذوں پر لا پرنسا (La prensa) کے ماہنامے کے لئے مضامین لکھ سکتے ہو۔ تمہیں ان کا معاوضہ بھی مل جائے گا“۔

دن بھر میں ان کاغذوں پر فرانسیسی گیانا کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھتا رہا اور جب رات ہوئی تو ڈان پزرینا ماہنامہ لاپرنسا کا ایڈیٹر میرے کمرے میں آیا، میں نے مضامین کا پلندہ اس کے حوالے کر دیا اور وہ انھیں پڑھ کر اس قدر خوش ہوا کہ جاتے وقت مجھے مقررہ معاوضہ سے ڈیڑھ گنا زیادہ دیتا گیا۔

جب آدھی رات ہو چکی اور چاروں طرف اندھیرا ہو گیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے دروازے کو ذرا سا دھکا دیا اور وہ کھل گیا ——— میں آزاد تھا اور قدرت نے مجھے پھر ایک بار آزاد کر دیا تھا ——— میرے غریب ساتھی — بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان بدنصیبوں کو دوبارہ اس زندہ جہنم میں پہونچا دیا گیا۔

روح ہمیشہ مادے پر فتح پاتی ہے ——— جو شے مجھے آزادی سے روشناس کرا سکی وہ میری قوت بازو نہیں تھی اس لئے کہ میں نسبتاً نہایت نحیف و ناتوان واقع ہوا ہوں، نہ ہی راستے کی تفصیلات میری ممد و معاون ہو سکیں، اس لئے کہ ان سے میں مطلق واقف نہ تھا، نہ جنگلی اقوام کا علم ہی میری مدد کر سکا کیونکہ کولمبیا کی جنگلی نسلیں میرے لئے بھی اسی قدر نئی تھیں جتنی کہ کسی اور فرد کے لئے ہو سکتی ہیں لیکن جو چیز میری ہمت بندھاتی رہی، وہ میری روح کی مسلسل آواز تھی کہ وہ آزاد ہو کر رہے گی اور میرا یہ پکا ارادہ تھا کہ میں آزادی کے گھر یعنی ریاستہائے امریکہ پہونچ کر ہی رہوں گا۔

اس کے بعد پناما کے جنگل میں میں نے کئی ماہ تک طرح طرح کی مصیبتیں جھیلیں اور ایک عرصہ تک کوتا قوم کے وحشیوں کے ساتھ خانہ بدوش زندگی بسر کرتا رہا "ان جنگلوں میں اپنی روزی کے لئے میں تتلیاں پکڑ لیتا اور انھیں سکھا کر پناما شہر میں بیچ آتا، لیکن ہمیشہ پروانۂ راہ داری کی عدم موجودگی میں مجھے گرفتاری کا خدشہ لگا رہتا، بہرحال بچتا بچاتا میں کوسٹاریکا، نکاراگوا، ہنڈورا سے ہوتا ہوا سانتو ڈارپہونچ گیا۔
سانتو ڈار کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ —— لابیرٹاڈ —— میں مجھے معلوم ہوا کہ ایک تجارتی جہاز شمال کی طرف جا رہا ہے۔ میرے یہاں نہ پاس پورٹ تھا نہ جہاز کے کرائے کے لئے پیسے تھے —— لیکن ریاستہائے امریکہ پہونچنے کے لئے مجھے اس جہاز پر سفر کرنا ضروری تھا، —— جوئندہ یابندہ۔ رات میں بندرگاہ پہونچا تو مجھے ایک موقع ہاتھ آگیا۔
گودی کے قلیوں نے سامان چڑھانے کی مشین کو بندرگاہ پر کھلا چھوڑ دیا تھا اور وہ ساحل اور جہاز کے درمیان ایک رستے کے پل کی طرح کھڑی ہوئی تھی، رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر میں اس پر چڑھ گیا اور ایک چور دروازے کے ذریعے جہاز کے نچلے گودام میں داخل ہوگیا۔ گودام میں گھپ اندھیرا تھا، اس قدر کہ ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا، لیکن یہی تاریکی میری محافظ ہوگئی —— نہ جانے کب تک میں اس گرم اور متعفن گودام میں پڑا رہا۔ اتنا مجھے یاد ہے کہ وقت کی کسی ساعت میں انجنوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے یہ اندازہ ہوا تھا کہ باہر روشنی ہے اور جہاز چل رہا ہے۔ اسی حالت میں غالباً دو روز گزر گئے۔ اور اب بھوک کی شدت مجھے پریشان کرنے لگی، میرے پانی کی بوتل بھی اب بالکل خالی ہو چکی تھی اور پیاس سے میرا حلق خشک ہوا جا رہا تھا، میں نے سوچا باہر نکل کر دیکھوں تو سہی، اگر رات ہو تو کچھ کھانے پینے کی کوشش کی جاسکے۔
گودام کی سیڑھیوں پر احتیاط سے چڑھ کر میں نے چور دروازہ کو اٹھا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ میری خوش قسمتی دیکھئے کہ باہر رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور قریب میں جہاز کے عرشے پر ایک بڑے سے تھال میں کتے کے لئے تھوڑا سا کھانا اور ایک ٹین کے کنٹر میں پانی رکھا ہوا تھا۔ اس کے کچھ فاصلے پر ایک بڑا البیر کتا گیند سے کھیل رہا تھا، بھوک کی شدت اس قدر تھی کہ میں نے نہ غلیظ کھانے کی پرواہ کی نہ کتے کے بھونکنے کے خطرات و عواقب کا خیال کیا۔ رینگتے ہوئے اس کھانے اور پانی کو اٹھا لایا اور بھوکے کتے کی طرح کھانے لگا۔
نہ معلوم اس گودام میں میں کتنے دن پڑا رہا۔ البتہ اس قدر یاد ہے کہ بھوک اور پیاس کی تکلیف سے تنگ آکر میں نے اور دو مرتبہ کتے کا کھانا چرایا تھا —— دن اسی طرح گزرتے گئے حتیٰ کہ ایک روز میں نے جہاز کی سیٹی کی آواز سنی —— ہم کسی بندرگاہ کے قریب پہونچ رہے تھے —— میں نے گودام کا دروازہ اٹھا کر دیکھا، باہر تیز دھوپ تھی اور اس دھوپ میں دو وردی پوش آدمی جہاز کے پل پر کھڑے ہوئے ساحل پر اترنے والے ملاحوں کی حاضری لے رہے تھے، بہت دیر تک میں یوں ہی چھپا ہوا موقع کی تلاش کر رہا تھا کہ مجھے چند افسر ساحل کی طرف جاتے ہوئے نظر آئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ کوئی بڑے عہدہ دار تھے، اس لئے کہ وردی پوش جوانوں نے بڑے ادب سے انھیں سلام کیا اور ان کے لئے ہٹ کر راستہ بنانے لگے میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور تیزی سے بڑھتا ہوا ان کے ساتھ اس طرح چلنے لگا

گویا میں ان کا خانگی ملازم ہوں، وردی پوشوں نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی اور......... مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف کی سل رکھ دی ہے، لیکن خدا کا فضل شامل حال تھا۔ اس لئے کہ ان لوگوں نے مجھے ٹوکنے کی جرأت نہیں کی، اور میں ساحل پر اتر گیا۔

خشکی پر آنے کے بعد قلیوں سے مجھے معلوم ہوا کہ یہ ملک کیلی فورنیا ہے نیز مہینے کی بارہ تاریخ اور منگل کا روز ہے۔

لیکن سب سے زیادہ خوشی یہ سن کر ہوئی کہ میں آزاد انسانوں کے ایک ایسے ملک میں پہونچ گیا ہوں جو دوسروں کی آزادی چھین کر خوش نہیں ہوتے۔

میں آزاد تھا، لیکن جس قیمت میں مجھے آزادی نصیب ہوئی تھی اس کا اندازہ میری حالت سے ہوسکتا تھا —— یعنی میرے دونوں پیروں میں رعشہ اور ایک میں لنگ پیدا ہوگیا تھا —— میرے دانت جھڑ چکے تھے اور میری بینائی خراب ہوگئی تھی —— اس کے علاوہ جسم پر صرف ایک پتلون اور ایک پھٹا ہوا قمیص رہ گیا تھا —— لیکن مجھے اب کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی —— میں آزاد تھا —— اور آزادوں کے ملک میں تھا،

سویرا

نہ اٹھنا چمک کر، نہ چوروں کا پھیرا   گیا ڈر تمہارا، گیا خوف میرا
ہوا چاک آخر سیاہی کا ڈیرا   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ دھوکے کی ٹٹی، نہ آنکھوں کا دھوکا   نہ سیسہ ہے چاندی، نہ پیتل ہے سونا
نہ سیپی ہی موتی، نہ پتھر ہے ہیرا   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ اندھیر نگری، نہ چوپٹ ہے راجا   نہ کوئی بڑا ہے، نہ کوئی ہے چھوٹا
مساوات کا اڑ رہا ہے پھریرا   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ مہتاب اور اس کی مانگے کی دولت   نہ احساسِ پستی، نہ پرویں کی رفعت
نہ چھاؤں میں تاروں کی پوشیدہ ظلمت   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ عشرت کدوں کے بھیانک مناظر   نہ مسجد کے اندر مسلماں ہی کافر
نہ عصیاں فروشی کے اڈے، منادر   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ رستہ بھٹکنا، نہ منزل سے دوری   نہ پھنسنا بھنور میں، نہ ساحل سے دوری
نہ بجلی کا کھٹکا، نہ حاصل سے دوری   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

نہ شب خون ماریں، نہ ہم ہار جائیں   ہنسے کوئی اور ہم نہ آنسو بہائیں
کسی کے چراغاں نہ ہم دکھ اٹھائیں   وہ پھوٹی کرن، لو ہوا وہ سویرا

سلیمان اریب

رونمائی

(ایک ایکٹ کا مزاحیہ ڈراما)

—— افراد تمثیل ——

۱- صاحب خانہ (زمیندار یوسف کے والد)
۲- بی حمیدہ (" کی بیوی)
۳- فرید (تعلیم یافتہ نوجوان یوسف کا دوست)
۴- نرگس (بی حمیدہ کی باندی)

—— پہلا منظر ——

شادیانے بج رہے ہیں......

بی حمیدہ (چلاتی ہوئی) اری نرگس - خدا تیرا بھلا کرے...... ذرا پھرتی سے کام لے کب تک دولہا میاں کو دسترخوان پر ایک ایک چیز کا انتظار کرنا ہوگا۔ ان کی تو بڑھاپے میں عقل سٹھیا گئی - ابھی دسترخوان چنا بھی نہ تھا کہ "دیر ہوگی" "دیر ہوگی" چلاتے ہوئے دولہا میاں کو خالی دسترخوان پر لا بٹھائے۔

نرگس - بی بی! آپ خفا کیوں ہوتی ہیں یہ میٹھے کی پلیٹ بالکل آخری ہے تمام لوازمات دسترخوان پر پہنچ چکے۔

بی حمیدہ - رونمائی کے لئے داماد گھر آیا ہے دسترخوان کی بدسلیقگی کو دیکھ کر ہمیں بدسلیقہ گنوار جانے کیا کیا خیال کرتا ہوگا!

نرگس - (ٹیلی فون کی گھنٹی سن کر) ہلو...... ہاں ہاں - سرکار ہیں - جی ہاں دیوان خانے میں تشریف فرما ہیں - جی! لیکن وہ اس وقت فون پر نہیں آسکتے - بہت مصروف ہیں - اچھا کوشش کرتی ہوں -

بی حمیدہ - کس کا فون ہے؟

نرگس - خان صاحب سرکار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

بی حمیدہ - اس وقت؟

نرگس - جی ہاں - کہتے ہیں بہت ضروری کام ہے ایک منٹ کے لئے بھیج دیجئے۔

بی حمیدہ - منٹ کے لئے بھیج دیجئے - خاک پڑے ایسے لوگوں پر وقت دیکھا نہ ساعت بس لگے اپنی بے وقت کی راگنی الاپنے - اب تو دولہا میاں کو ہماری بدتمیزی کا پورا پورا یقین ہو جائے گا - جی چاہتا ہے اس نامعقول ٹیلی فون کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں۔

(" ایک بڑی آواز کا بتدریج کم ہونے والا ساز)

صاحب خانہ - بیٹا فرید میاں - بسم اللہ کیجئے۔

فرید - میں چاہتا ہوں مسٹر یوسف کا کچھ دیر اور انتظار کریں -

صاحب خانہ - نہیں نہیں میاں کافی دیر ہو چکی وہ جہاں جاتے ہیں وہیں کے ہو رہتے ہیں یہ ان کی بڑی بری عادت ہے۔

فرید - خیر تو آپ بھی ارادہ فرمائیے -

صاحب خانہ - مجھے معاف کرو ؟ افسوس کہ میں دسترخوان کی کوئی چیز نہیں کھا سکتا سخت پرہیز ہے -

نرگس (آکر) سرکار!

صاحب خانہ - کیوں نرگس ؟ کچھ کہنا ہے ؟

نرگس - جی ہاں سرکار آپ کا فون آیا ہے۔

صاحب خانہ - کہہ دیا ہوتا میں اس وقت مصروف ہوں۔

نرگس - کہا تو تھا سرکار لیکن خاں صاحب کہتے ہیں بہت ضروری کام ہے۔

فرید - بہتر ہے آپ فون تک چلے جائیں ممکن ہے اس وقت تک یوسف میاں بھی آجائیں -

صاحب خانہ - (ہنس کر) اچھا اچھا - (اندر آنے کی آواز) دیکھو جی سنتی ہو ؟ کہاں ہو ؟

بی حمیدہ - فرمائیے -

صاحب خانہ - میں نے کہا فرید میاں باہر اکیلے بیٹھے ہیں تم

پردے کے قریب سے باتیں کرسکتی ہو میں ٹیلی فون
کی خبر سے آتا ہوں! خدا جانے وہ یوسف کہاں
مرگیا۔
بی حمیدہ۔ مریں اس کے دشمن تم جاؤ میں دولہا میاں
سے باتیں کرتی ہوں۔ (پردے کے قریب آکر) بیٹیا
فرید میاں۔
فرید جی خالہ جان! قدمبوسی عرض کرتا ہوں۔
بی حمیدہ۔ جیتے رہو خدا چاند سورج کی حیات کرے
تمہاری والدہ تو اچھی ہیں بابا؟
فرید۔ جی ہاں۔ خدا کا فضل ہے۔
بی حمیدہ۔ کیا ہی اچھا ہوتا اس موقع پر وہ بھی آجاتیں
فرید۔ آنا تو ان کی عین خوشی تھی لیکن صحت کے خیال
سے میں نے انھیں بڑی مشکل سے روکا
بی حمیدہ۔ خدا ان کی مصیبت کو دفع کرے بڑی نیک
بی بی ہیں وہ —— اور بیٹیا تم ابھی تک چپ
چاپ بیٹھے ہو شروع کرو بڑی دیر ہو گی۔
فرید۔ میں چاہتا ہوں کہ یوسف میاں آجائیں۔
بی حمیدہ۔ ان کا کیا ٹھکانہ بیٹیا تم شروع کرو کھانا ٹھنڈا
ہورہا ہے۔
فرید۔ (ہنس کر) سوچ رہا ہوں اکیلا اتنی چیزیں کیسے
کھاؤں گا ایک ایک لقمہ بھی لوں تو پیٹ بھر
جائے گا چیزیں ختم نہ ہوں گیں شائد
یوسف میاں کے ساتھ زیادہ کھا سکوں گا۔
بی حمیدہ۔ یا اللہ کیا غذائیں ہیں باوا تم لوگوں کی۔
نظر بد دور جب تمہارے خسر تمہاری عمر میں تھے
تو اس سے تین گنا کھاتے تھے ماشاءاللہ
سے اب بھی غذا کم نہیں۔ لیکن پیٹ کی بیماریوں
نے ان کے منہ کو باندھ دیا ہے۔
فرید۔ جی ہاں! پہلے کے لوگوں کی بات ہی اور ہے
بی حمیدہ۔ خیر بیٹیا شروع کرو اگر بچ رہے تو میں
تمہاری اماں کو کھلاؤں گی۔
فرید۔ جی نہیں انھیں تو ان تمام چیزوں سے پرہیز ہوگا۔
بی حمیدہ۔ پرہیز ورہیز میرے یہاں نہیں ہوگا یہ
تم اپنے گھر سے جاکر کرا سکتے ہو۔
فرید۔ (پریشان ہوکر) نہیں نہیں ایسا غضب نہ کیجئے
وہ بالکل نہیں کھا سکتیں۔
بی حمیدہ۔ کیوں نہیں کھائے گی۔ اس کو کھانا پڑیگا۔
ہاتھ پکڑ کر کھلاؤں گی۔
فرید۔ (سنجیدہ ہوکر) ایسا نہیں ہوگا آپ ایسی جرأت
نہیں کرسکتیں۔
بی حمیدہ۔ اوہو! تم اس کا دماغ خراب کر رہے ہو؟
اب تو میں اس نگوڑی کو چٹیا پکڑ کر ضرور پیٹوں گی۔
فرید (بگڑ کر) میں کہتا ہوں آپ کو کوئی اختیار نہیں
بی حمیدہ۔ لو بوا نرگس سنو، ہمارے ہونے والے داماد
کیا فرما رہے ہیں۔ تو ہی بتا کیا میرا حق نہیں
اس نگوڑی پر؟
نرگس۔ کیوں نہیں بی بی آپ کو پورا پورا حق ہے۔
دولہا میاں آپ سے مذاق کر رہے ہیں۔
فرید۔ بس بس بوا نرگس زبان کو لگام دو؟ میں اس
گھر کا داماد نہ بنوں گا۔ زرخرید غلام نہیں۔
بی حمیدہ۔ ہیں ہیں۔ بیٹیا تمہیں کیا ہوگیا اتنی سی بات
پر اتنا بگڑنے کی کیا ضرورت ہے۔
فرید۔ مجھے معاف کیجئے میں اب سن نہیں سکتا! جا رہا ہوں
لیکن سن لیجئے میں مجبور ہوں کہ آپ لوگوں سے
کوئی رشتہ قائم کروں (تیز تیز چلنے کی آواز)
نرگس۔ بی بی! سچ مچ وہ چلے۔
بی حمیدہ۔ ارے ارے بیٹا۔ فرید میاں۔ فرید میاں
کہاں چلے۔ ٹھیرو!!
(فرید خاموش چلا جاتا ہے۔)
بی حمیدہ۔ ارے تمہیں کیا ہوگیا تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟

فرید۔ خدا حافظ (چلے جاتا ہے)
بی حمیدہ۔ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے (ایک ساز)
صاحب خانہ۔ تم نے کچھ کہا ہوگا۔ ضرور کہا ہوگا تمہیں تو بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں۔
بی حمیدہ۔ یا اللہ اب کیسے سمجھاؤں۔ میرا اعتبار نہیں تو نرگس سے پوچھ لو۔
نرگس۔ میں خود بیگم صاحبہ کے ساتھ تھی سرکار۔ بیگم صاحبہ نے جو کچھ کہا ہما بٹیا کو کہا۔
صاحب خانہ۔ چپ مردار میں سب سمجھتا ہوں۔
بی حمیدہ۔ بہ خدا میں سچ کہتی ہوں میں نے اپنی بیٹی کو کہا۔
صاحب خانہ۔ پھر اسے اتنے بگڑنے کی کیا وجہ تھی؟
بی حمیدہ۔ جانے کیا سمجھ بیٹھا۔ خدا کے لئے اس کو واپس لاؤ۔ .... پاس پڑوس والوں کو معلوم ہوجائے گا تو من گھڑت قصے بنا بنا کر میری بٹیا کو بدنام کریں گے پھر بیا ہنے کون آئے گا (رونے لگتی ہے) جاؤ خدا کے لئے جلدی کرو۔ ارر۔ تم رو تی کیوں ہو؟ میں ابھی فرید کو واپس لاتا ہوں تم اطمینان رکھو اس کو ضرور غلط فہمی ہوئی
بی حمیدہ۔ جاؤ۔ جلدی جاؤ۔ خدا کے لئے جلدی جاؤ جس طرح بھی ہوسکے لے آؤ؟
صاحب خانہ۔ اتنی حیرانی کی بات ہی کیا ہے۔ جا ہی تو رہا ہوں۔ جانے کی آواز .... ایک ساز
صاحب خانہ۔ فرید میاں.... فرید میاں ذرا ٹھہرنا (قریب آ جاتا ہے)
فرید۔ فرمائیے۔
صاحب خانہ۔ مکان میں کہہ رہی تھیں تم خفا ہو کر کھانا چھوڑے جا رہے ہو۔
فرید۔ جی ہاں میرے ساتھ طرز گفتگو کچھ اس قسم کا تھا۔
صاحب خانہ۔ آخر انھوں نے کیا کہا؟

فرید۔ جانے دیجئے..... لیکن بزرگوں کو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا بھی خیال رکھنا چاہئے دوسروں کی بھی عزت ہوتی ہے۔
صاحب خانہ۔ درست ہے بیٹیا۔ لیکن یقین مانو وہ تمہیں اپنے بچے جیسا چاہتی ہیں ممکن ہے ان سے کوئی غلطی ہوگئی ہو یا تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہو اس لئے تھوڑی سی تکلیف گوارا کرتے ہوئے میرے ساتھ چلو مجھے تشفی ہو جائے گی کیونکہ ان کا بیان کچھ اور ہے۔

فرید۔ اچھا۔ آپ کی تشفی کی خاطر چلتا ہوں مگر یقین کیجئے انھوں نے آپ کو غلط باور کرایا ہے۔
صاحب خانہ۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتی بیٹیا تمہیں ضرور غلط فہمی ہوئی۔ ورنہ وہ اور میں تمہیں اپنا خالق سمجھتے ہیں۔
فرید۔ (پریشان ہو کر) اجی یا خالق۔ میں آپ کا خالق ہوں۔ کیا فرماتے ہیں آپ؟
صاحب خانہ۔ ہاں ہاں بیٹیا میں تمہیں اپنا خالق سمجھتا ہوں
فرید۔ بندے کو اتنی فوقیت نہ دیجئے بندہ صرف بندہ ہے۔
صاحب خانہ۔ ارے نہیں بیٹیا ایسا نہ کہو تم اور خالق دونوں میرے لئے برابر ہیں۔
فرید۔ معاف کیجئے آپ انکساری کے جوش میں انسان کے مرتبے کو بھول جاتے ہیں۔
صاحب خانہ۔ کیا کہتے ہو بیٹیا میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں کہی۔
فرید۔ مجھے آپ کی بزرگی کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔
صاحب خانہ۔ بیٹیا! یہ تم کیا کہہ رہے ہو جانے تم نے کیا سمجھ لیا۔
فرید۔ میرے ہوش و حواس بالکل درست ہیں۔ سمجھے آپ خدا حافظ (تیز تیز چلنے کی آواز)
صاحب خانہ۔ ارے ارے فرید۔ فرید۔ فرید میاں عجیب آدمی ہے۔

(ایک ساز)

یوسف۔ ابا جان! امی کہہ رہی تھیں فرید خفا ہو کر چلے گئے۔

صاحب خانہ۔ ہاں مجھے تو پاگل معلوم ہوتا ہے۔ کم بخت اچھا سمجھتا ہے نہ برا۔

یوسف۔ نہیں، نہیں بڑا معقول آدمی ہے۔ آپ گھر تشریف لے جائیے میں۔ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں

صاحب خانہ۔ اس کا دماغ خراب ہو چکا ہے اب ہر کوشش بے کار ہے۔

یوسف۔ مجھے بھی تو کوشش کا موقع دیجئے میرا دوست ہے دل کی بات بتا دے گا۔ ممکن ہے غلط فہمی ہوئی ہو گی۔

صاحب خانہ۔ جاؤ کوشش کر کے دیکھو.... (ایک ساز)

یوسف۔ (چلاتے ہوئے) مسٹر فرید، مسٹر فرید!! ٹھیرو بھی یار۔

فرید۔ اب آپ کیا گل کھلانا چاہتے ہیں؟

یوسف۔ جی بہت کچھ۔

فرید۔ جی میرے پاس وقت نہیں۔

یوسف۔ آخر ہوا کیا پاگل تو نہیں ہو گئے؟

فرید۔ کچھ بھی سمجھو لیکن مجھے آپ سے رشتہ ناتا قائم کرنا نہیں ہے۔

یوسف۔ خیر آپ کی مرضی کم از کم ہماری دعوت کو نہ ٹھکرایا ہوتا۔

فرید۔ مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔

یوسف۔ اچھا بتاؤ میرے والدین کی دعوت بار گراں سہی لیکن میرا گھر تو آپ کا ہے۔ مجھے خدمت کا موقع دیجئے۔

فرید۔ مجھے انکار نہیں لیکن یہ بتائیے کہ آپ میری خاطر مدارات میں صرف کہانے ہی رکھائیں گے یا کچھ اور بھی

یوسف۔ آپ چلئے تو سہی۔ اگر دل و جگر کاٹ کر نہ کھلا دوں تو مجھے یوسف نہیں کچھ اور کہہ لینا۔

فرید۔ ہوں۔ شروع ہو گیا وہی پاگل پن۔

یوسف۔ (تعجب سے) کیسا پاگل پن؟ کیا کسی کی مہمان نوازی کرنا پاگل پن ہے؟

فرید۔ یہ تو نہیں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ آپ کے یہاں کا ہر فرد پاگل اور پورا گھر پاگل خانہ ہے۔

یوسف۔ ابا نے سچ کہا تھا تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں ہم آپ پر جان چھڑک رہے ہیں اور آپ ہم کو گالیاں سناتے ہیں بڑے افسوس کی بات ہے۔

فرید۔ گالیاں میں سنا رہا ہوں یا تم لوگ۔ سچ ہے پاگل کو ساری دنیا پاگل دکھائی دیتی ہے بس جانا چاہتا ہوں

یوسف۔ نہیں۔ تم کو بتانا ہوگا آخر ہم نے کیا پاگل پن کیا

فرید۔ میں پاگلوں کے ساتھ پاگل بننا نہیں چاہتا میرے پاس وقت نہیں۔

یوسف۔ دیکھو فرید۔ میں دوستی کا لحاظ کر رہا ہوں بات بگڑتی جا رہی ہے۔

فرید۔ کیا مصیبت ہے۔ اچھا بابا یہ بتاؤ تم میری ضیافت میں کیا کاٹنے والے تھے۔

یوسف۔ دل اور جگر۔

فرید۔ یہ تم کاٹ سکو گے؟

یوسف۔ کیوں نہیں۔ اجی صاحب میں اس قسم کا ذلیل آدمی نہیں ہوں جو بولتا ہوں کر دکھاتا ہوں۔

فرید۔ تم نہیں کاٹ سکتے

یوسف۔ عجیب ہو تم میں کہتا ہوں مجھے ڈر کس بات کا میں ان کا مالک و مختار ہوں میں نے انھیں چھوٹے سے بڑا کیا ہے۔ یہ آخر کس دن کے لئے۔

فرید۔ یوسف میاں خدا رحم کرے تم لوگوں کی عقل یہ پاگل پن تمہاری خاندانی خصوصیت ہے۔

یوسف۔ دیکھو فرید زبان سنبھالو میں برداشت نہیں کر سکتا۔

فرید۔ اپنا دل و جگر کاٹ کر کھلا دینا یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟ بے وقوف داس ایسا کرنے سے انسان زندہ رہ سکتا ہے

(سلسلے کے لئے صفحہ (۶۴) دیکھئے)

اکبر الٰہ آبادی کے غیر مطبوعہ خطوط (بسلسلہ گزشتہ)

(۸)

الٰہ آباد ۲۶ر دسمبر ۱۹۱۴ء

حضور والا

صحیفۂ عالی کے صدور سے پہلے ہی یہ شعر میرے ذہن میں آیا تھا۔ امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں۔

شاد را دیدیم بالاتر ز اوج پیشکار
ذوق در وتیشی است او را ہست باورش کا

آپ کے خیالات سے مجھ کو تمام تر اتفاق ہے۔ اگر یہ خیالات نہ ہوتے تو افسوس ہوتا۔

نیا سال مبارک ہو

میں نزلے اور دانتوں کے درد میں مبتلا ہوں۔

نیاز مند شکر گزار قدر افزائی

اکبر حسین

(۹)

الٰہ آباد ۵ر جنوری ۱۹۱۵ء

اللہ سلامت رکھے

مدت سے آپ کو عریضہ نہیں لکھا۔ نئے سال کی مبارک باد بھی رہ گئی۔ اچھا نہیں تھا۔ طبیعت کو انتشار رہتا ہے۔ جینے سے جی اکتا گیا ہے۔

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا
بت کے بندے ملے اللہ کا بندا نہ ملا

اللہ آپ تک پہونچانے میری عین آرزو ہے۔ میں آپ کو کیا خوش کروں گا۔ آپ البتہ مجھ کو خوش کریں گے۔ جیتا رہا، سفر کے قابل رہا، موسم موافق ہوا تو انشاء اللہ حاضر ہوں گا۔ میرا دل بڑھتا ہے، ناز کرتا ہے کہ آپ ایسے امیر باتوقیر اور دبیر بے نظیر ایسے شوق و محبت سے مجھ کو یاد فرماتے ہیں۔

خواجہ صاحب بہت زندہ دل اور خاطر نواز بزرگ ہیں۔ ان کے پولٹیکل اور سوشل آب ورنگ کا اثر بلحاظ میرے مسکن و ماوی کے تعلقات کے البتہ میرے حق میں ناموافق ہو گیا ہے۔ کل وہ دہلی تشریف لے گئے۔

اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیے۔

آپ کا نیاز مند

سید اکبر حسین

آپ کو میں کچھ زیادہ لکھتا مگر اس وقت نہ لکھ سکا۔

(۱۰)

الہ آباد۔ ۲۷؍ جنوری ۱۵ء

عالی جناب مدظلہ

آداب گزارش کرتا ہوں۔ زیادہ خموشی شاید ناشکری کا ملزم ٹھہرائے۔ لہٰذا یہ عریضہ بہ دریافت خیریت مزاج پیش کرتا ہوں۔

زندگی نے رخصت اور توانائی نے مایوس نہ کیا تو آرزوئے ملازمت انشاء اللہ بر آئے گی۔ کیا عرض کروں کس عالم میں رہتا ہوں۔ شکستہ دلی ایک طرف ترددات ایک طرف۔ خواجہ صاحب ان روزوں احمد آباد میں ہیں۔

سپاس گزار یاد آوری کا ہے

اکبر

معلوم نہیں حیدرآباد میں کون موسم ہم لوگوں کے لئے بہتر ہے۔

(۱۱)

الہ آباد۔ ۱۰؍ مارچ ۱۵ء

عالی جناب مدظلہ

در فروری سے اس وقت تک میں نہایت غیر معمولی پریشانی میں جس کی تفصیل بھی نہیں کر سکتا مبتلا ہوں۔ اس وجہ سے نیاز نامہ نہیں لکھ سکا۔ دل میں ہر وقت آپ سے ملنے کا شوق قایم ہے۔ لیکن خدا اس پریشانی سے نجات دے۔ اور آزادی حاصل ہو۔

۵؍ مارچ کو ہز آنر نے یاد فرمایا ہے۔ میں دنیا سے بالکل بے تعلق ہوگیا ہوں۔ بایں ہمہ اوروں کے تعلقات الجھا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جلد فراغ خاطر نصیب کرے۔

۱۵؍ مارچ کے بعد انشاء اللہ بشرط زندگی پھر عریضہ لکھوں گا۔ یہ نیاز نامہ اس غرض سے لکھا کہ زیادہ غیر حاضری احسان فراموشی نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت آپ کا کرم و احسان ہے کہ آپ مجھ شکستہ دل اور بے ہنر کی قدر دانی فرماتے ہیں۔

تزک خیال کے مضامین خوب ہیں۔

خاکسار۔ اکبر حسین

(۱۲)

۱۸؍ اپریل ۱۵ء

الٰہی در جہاں باشی بہ اقبال جواں بخت و جواں دولت جواں سال

حضور والا۔

جن تاریخوں میں مقدس ہر دوار میں قیام کی تاریخیں متعین فرمائیں ان کی اطلاع مجھ کو بھی ملے۔ سرفرازنامے کا شکر گزار رہوں گا۔

۵ ار کو ہز آنر سے ملا۔ موجودہ مباحث کی طرف متوجہ ہیں اور ہونا ہی چاہیئے۔

خاکسار۔ اکبر

(نوٹ۔ اس خط کے بعد دو اور خط تھے جن کے نمبروں ۲۳۔۴۴ کے چٹ فائل میں لگے ہیں۔ مگر خط موجود نہیں ہیں۔ مرتب)

(۱۳)

الہ آباد ۱۳؍ جون ۱۵ء

حضور والا ۔ اللہ شاد و بامراد رکھے ۔

اس شدت کی گرمی تھی کہ حواس بجا نہ تھے ۔ عریضہ نہ لکھ سکا ۔ آپ بے مثل شخص ہیں کہ آپ نے باوجود اس قابلیت اور اقتدار کے ہم ایسے گوشہ نشینوں اور دل شکستوں کو مہربانیوں خوش اخلاقیوں اور دلنوازیوں سے ایسا وابستۂ دامن دولت کر رکھا ہے کہ آپ سے مراسلت میں ایک انبساط قلب محسوس ہوتا ہے ۔

بڑائی اور بزرگی اور اعلیٰ قابلیت کی یہی پہچان ہے ۔

یوں تو آپ کے ہر خط کی عبارت دلاویز ہوتی ہے لیکن ایک دفعہ آپ نے ایک فقرہ تحریر فرمایا تھا کہ " آئیے ہم آپ کے دل کی سنیں آپ میرے دل کی سنیں "

وہ اب تک یاد ہے اور ابھارتا اور اکساتا رہتا ہے کہ شرف ملازمت حاصل ہو ۔ سچ یہ ہے کہ مجھے سب ضرورت اس کی ہے ۔ میری ایک نو تصنیف غزل کا ایک شعر یہ ہے ۔

گفتنی ہے دل پر درد کا قصہ لیکن
کس سے کہیے کوئی مستفسر حالات تو ہو

چونکہ آپ ذی علم اور صاحب دل ہیں اگر آپ سے ملنا ہو تو سنئے کہ کیا کیا مصائب گزرے اور گزر رہے ہیں ۔ فلک کے ہاتھ سے ، ابنائے جنس کے ہاتھ سے ، وقت موجودہ کے ہاتھ سے ، خود اپنی نازک خوئی کے ہاتھ سے ۔ اگرچہ دنیا سے بہت دل برداشتہ ہوں تاہم کسی ہمدرد کا ملنا نعمت ہے ۔ دیکھیے کب موقع ملتا ہے ۔ بہر کیف دعا فرماتے رہیے کہ سکون خاطر میسر ہو ۔ اصل چیز یہی ہے ۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ ایک حصہ اپنے وقت کا اپنے خالق کے دھیان میں بسر کرتے ہوں گے ۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ حیدرآباد میں افواہ ہے کہ آپ وزارت پر سرفراز ہوں گے ۔ خدا وہ کرے جو آپ کے حق میں بہتر ہو ۔

خاکسار ۔ اکبر

خواجہ صاحب حیدرآباد جانے والے ہیں ۔

(۱۴)

الہ آباد ۔ ۵؍ جولائی ۱۵ء

عالی جناب دام ظلہ

آداب بجا لاتا ہوں ۔ ڈیڑھ مہینے سے ڈاڑھ اور مسوڑھے کے درد میں مبتلا ہوں ۔ کبھی تخفیف ہوئی کبھی زیادتی ۔ لیکن اب چھ دن سے ایسی شدت ہے کہ سجدہ نہیں کر سکتا ۔ اشارے سے سجدہ ادا کرتا ہوں ۔ کھانا چھوٹ گیا ہے ۔ مشکل سے کچھ کھا پی سکتا ہوں ۔ ناتوانی زیادہ ہے ۔

والا نامہ جب صادر ہوا تو مجھ کو خیال آیا کہ دل کو دل سے راہ ہے ۔ کیونکہ میں ایک نیاز نامہ روانہ کر چکا تھا جو غالباً پہونچا ہو گا ۔ میں آپ کی توجہ کو اپنے حق میں ایک نعمت پاتا ہوں ۔ کاش آپ سے مکالمت و مجالست کا موقع ملتا تو میری زندگی ہو جاتی ۔ اس وقت مردوں سے بدتر ہوں ۔

چند عرصے سے میں اپنے اشعار اخباروں میں نہیں بھیجتا۔ بلحاظ حالات دل ہی نہیں ابھرتا۔ خرافات کا ذخیرہ ہوگیا ہے۔ کبھی حواس درست ہوئے تو پیش کروں گا۔ دل سے تو اب ایسے ہی اشعار نکلتے ہیں۔

اب کیا میں طلب دنیا کی کروں کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے
دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کے دن کے لیے اور کس کے لئے

یہ گوش و زبان و چشم چمن غوغائے جہاں سے فارغ ہیں
کرتا ہوں دعائیں گل کے لئے سوسن کے لیے نرگس کے لئے

ہو تم کو مبارک شوق نمود افسردہ پڑا رہنے دو مجھے
بیکس کو ہے کافی داغ جگر تم شمع بنو محفل کے لئے

خود گوارا نہیں فریاد کا یہ جوشش مجھے
کر بھی چکتی اجل آکر کہیں خاموش مجھے

عقل کچھ کر نہ سکی قدر شناسی جنوں
بزم ہستی میں مبارک نہ ہوا ہوش مجھے

حالت قابل فریاد کے سب ہیں شاہد
اس سے کیا ہوتا ہے کر دیجئے خاموش مجھے

تاب نظارۂ گلزار میں کیا لاؤں گا
رت بدلنا ہی کیئے دیتا ہے بے ہوش مجھے

بت پرستی میں بھی پردے کا ہوں حامی اکبر
بخش ہی دے گا خداوند خطا پوش مجھے

خرافات شوخی قلم بھی ملاحظہ ہو۔

بہت سے عہدے بھی لے چکا ہے ملی ہے کونسل کی ممبری بھی
پھر اس پہ کہتا ہے ہوں تیں بھو کا یہ پیٹ ٹیٹو کا ہے کہ مٹکا

سنوارے خود آپ ہی نے پتلے اور ان میں کنجی لگائی غرض
بگے وہ جب ناچنے تو خود ہی کسی کو پھینکا کسی کو پٹکا

پھر بھی یاد فرمایئے گا۔ زندہ رہا تو آداب و تسلیم بجالاؤں گا۔ خاکسار۔ اکبر

(۱۵)

الہ آباد ۲۰ اگست ۱۵ء

حضور والا۔
مسند اقبال پر متمکن اور مجلس حق اندیشی کے صدر رہئے۔ مدت سے میں نے عریضہ نہیں لکھا۔ مبارکباد عید کا شکر گزار ہوں۔

پیش نظر ہمارے ہے شام شب فراق
اس کی سحر جو ہو تو ہماری بھی عید ہے

آپ کے خطوں میں نہایت ہی فصیح و بلیغ وہ خط تھا آپ کو ثواب ملا مجھ کو مدد ملی۔

خیریت مزاج سے مطلع فرمایا جاؤں۔
خاکسار۔ اکبر

واللہ خدا یہ تماشا دیکھئے۔ یہ خط لفافے میں رکھ کر بند کرنا چاہتا تھا کہ والانامہ موصول ہوا۔ باوجود افسردگی اور ضعف کے ایک وجد کی حالت طاری ہوئی۔ شاد ہم شخصیت۔ جواب لکھوں گا۔

(۱۶)

الہ آباد ۲۰ دسمبر ۱۹۱۵ء

عالی جناب مدظلہٗ۔

مدت سے نیاز نامہ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ امید ہے کہ آپ خیروعافیت سے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نیا سال اپنے امیدواروں کو مبارک کرے۔ صبر اور اعمال صالح کی توفیق عطا فرمائے۔
آپ کی محبت و قدر دانی کے خیال سے دل کو لذت ملا کرتی ہے۔ خدا دیدار بھی نصیب کرے۔
اپنا کیا حال کہوں۔ نہ صحت اچھی نہ دل کو اطمینان۔ اکثر امور باعث انتشار خاطر ہیں۔

آپ کا دعاگو
اکبر

یہ مطلع ملاحظہ ہو۔

وہی زندہ ہیں جو قوت سے صرف عقل کرتے ہیں
ہماری زندگی کیا زندگی کی نقل کرتے ہیں

تقریباً ۲ سال سے خواجہ صاحب سے ملنا نہیں ہوا۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مشتاق ہوں۔

(۱۷)

الہ آباد ۹ جنوری ۱۹۱۶ء

حضور عالی جاہ سلمہٗ اللہ۔

یاد رکھئے گا کہ میں بھی ہوں دعاگو آپ کا۔

ذخیرہ میں آپ کا مضمون خوب تھا۔ یہ زندہ دلی مبارک ہو۔ کیا کہوں شکایات لاحقہ سے معذوری محسوس ہوتی ہے اور غم غلط کرنے کے لیے آپ کی حضوری بہت موثر ہوئی۔ خیر زندگی ہے تو دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو رعایا و گورنمنٹ کی باہمی کشمکش نے ہم ایسوں کو سخت قلق میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ادھر جنگ کی مصیبت ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔
نیا سال آپ کو مبارک ہو۔ میرا تو یہ خیال ہے۔

وہی زندہ ہیں قوت سے جو صرف عقل کرتے ہیں
ہماری زندگی کیا زندگی کی نقل کرتے ہیں

بندہ محبت و کرم
اکبر

(۱۸)

الہ آباد۔ ۱۱؍ جنوری سنہ ۱۲ء

میرے مخدوم و مکرم اللہ آپکو خوش رکھے۔

اس وقت اتفاق سے رسالہ سیر پنجاب المباری میں ملا۔ شروع کے ۱۰۔۱۵ صفحے پڑھ .. آپ کی یاد دل میں تازہ ہو گئی۔ یہ دل و دماغ و نظر آپ ہی کا حصہ ہے۔

میں نے غالباً کئی نیاز نامے لکھے جن کا جواب نہیں ملا۔ تعلق خاطر ہے۔ قیاس کرتا ہوں کہ آپ کے دل میں میری جگہ ہے۔ ورنہ باوجود اس افسردگی اور عزلت پسندی کے کیوں آپ کے خیال سے ایک شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔

بزم توحید کو آپ سے رونق ہے۔ یہی خوب ہے۔

تا زمیخانہ و مئے نام و نشاں خواہد بود
سرِ ما خاک رہ پیر مغاں خواہد بود

خاکسار۔ اکبر

(۱۹)

الہ آباد۔ ۲۷؍ جنوری سنہ ۱۲ء

حضور والا

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار یہ شعر زبان سے ٹپک پڑا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ کے درشن ہو جائیں
برہمن شیخ ہوں اور شیخ برہمن ہو جائیں

کملی کے ذکر نے مجھ کو آپ کا اور بھی مشتاق کر دیا۔ میرا یہی حال ہے۔

خودی کی حس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر
کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتا نہ چلے

آپ میں اللہ نے بڑا رنگ عرفاں بھر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اجلا پن اور زبان آوری۔

افسوس بہت کمزور ہوں۔ دل شکستہ ہوں۔ مغموم ہوں۔ متردد ہوں۔ اللہ فضل کرے ہی گا۔ لہ الحمد فی الاولیٰ والآخرۃ ولہ الحکم والیہ ترجعون۔ یاد فرماتے رہیئے دل بڑھاتے رہیئے۔

خاکسار دعاگو
اکبر

آپ سے ملنا ہو تو کچھ کام کی باتیں ہوں۔

اکبر کے جو مرجانے کی خبر ساقی نے سنی تو خوب کہا
مرنا تو ضروری تھا ہی اسے رندوں کیلئے کچھ کر بھی گیا

(۲۰)

الہ آباد۔ ۱۰ فروری ۱۹۱۶ء

مخدومی و مکرمی سلمہٗ اللہ تعالیٰ

کچھ یاد نہیں کہ سرفراز نامے کا جواب لکھا یا نہیں۔ ناتندرستی اور انتشار نے حواس کی خوبی بہت کم کر دی ہے۔ میں بھی اسی کے ساتھ گھٹ رہا ہے۔

ملت ہی رہے گی۔ یہ غزل آپ نے خوب لکھی ہے۔

آئینۂ توحید ہے۔

موجودہ حالات پر آپ کا آرٹکل بھی نہایت عمدہ اور بزرگانہ ہے۔ داد کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں۔

پاکٹ بک میں دو شعر نظر آئے۔ یہ اوقات مختلف لکھے لئے تھے۔ اسوقت خیال آیا کہ گوش گزار کر دوں۔

جو دشمن شاد کا ہے وہ رہِ باطل کا سالک ہے
موحد کا مقابل ہے اگر کوئی تو مشرک ہے

ہیں شاد داد وہ بھی اور صاحب سخن بھی
ہیں صدر انجمن بھی اور شمع انجمن بھی

آپ کا نیاز مند
اکبر

(۲۱)

الہ آباد۔ ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء

عالی جناب مدظلہ

اپنے نسبی اور قومی بزرگوں سے استناد اور ان سے محبت ایک نیچرل بات ہے۔ لیکن بلا قید نسب و قوم و ملک تمام بزرگانِ دین اور عارفانِ الٰہی کا احترام کرنا خدا پرستی و خدا شناسی اور بلندی طبیعت کی دلیل ہے۔

آپ کی تصنیفات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے۔ بجا کہا گیا ہے کہ آپ کا ارشاد سن کر اور مذاقِ طبع دیکھ کر

برہمن شیخ ہوا اور شیخ برہمن ہو جائے

یعنی ایک دوسرے کے بزرگوں کا ادب اور ذکر خیر کرنے لگیں۔

ہمارے خواجہ حسن نظامی صاحب اسی رنگ کے پروفیسر ہیں۔ خدا ان کے کاموں میں برکت دے۔ اور آپ کو مسندِ جاہ پر متمکن رکھے۔

کیا پوچھتا ہے رشتہ کیا دیکھتا ہے صورت
اللہ کی گلی میں جو ہی ملے وہ اپنا

خاکسار
اکبر

(۲۲)

پرتاب گڈھ ۱۰ فروری ۱۹۱۸ء

حضور والا

نامۂ عالی صادر ہوا۔ قطعۂ وحدت خوب ہے۔ بہت صحیح ہے۔ اللہ اسی پر آپ کو قایم رکھے۔ میں نہیں سمجھا کہ آپ بمبئی کیوں تشریف لے گئے اور کب تک کے لئے۔ طبیعت کو تعلق ہے۔
میں دو چار دن کو یا جب تک اللہ کی مرضی ہو عشرت کے پاس آیا ہوں۔ دل گھبرایا کرتا ہے۔ اہل دل سے دور ہوں۔ اللہ اللہ کیا کرتا ہوں۔ اللہ ٹھکانے لگا ہی دے گا۔

فلک سے شکوۂ جور و ستم کیا
زمیں پکڑیں جب خود ہے تو ہم کیا

آپ سے مراسلت نہ صرف باعث عزت ہے بلکہ غذائے روح ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ اکبر

(۲۳)

الٰہ آباد ۳/۱۰ ۱۸ء

جناب عالی

والا نامہ مورخہ جمادی الاول ۱۳۳۶ھ اس قابل ہے کہ طبع ہو کر مشتہر ہو جائے۔
آپ نے جو شعر تحریر فرمایا ہے خوب ہے۔ میری زبان پر وہ شعر یوں ہے۔

ہمہ شہر پر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدخو نہ کند بہ کس نگاہے

معلوم نہیں کہ آپ کا قیام بمبئی میں کب تک ہوگا۔ افسوس ہے کہ مجھ کو نہایت ضعف محسوس ہوتا ہے۔ ۲ سال سے دلی کا ارادہ کر کے رہ جاتا ہوں۔ راہ میں شاید ۲۔۴ جگہ قیام کر کے پہونچ سکوں۔ لیکن ہر منزل میں اسباب راحت کا اہتمام اور خلاف معمول سے بچنے کا انتظام دشوار ہے۔
بہر حال اللہ اللہ کرتا ہوں اگر یہ بامعنی ہے تو سب کچھ ایک نہ ایک دن مشکل آسان ہو ہی جائے گی۔

دعائے خیر کا امیدوار
اکبر

(۲۴)

۱۹۱۸ء (؟)

حال اکبر پر وہ لطف حضرت شاؔد اب کہاں
عرض کر دیتا ہوں شعر اب بھی مگر داد اب کہاں

آفتاب دولت و اقبال تاباں باد
اکبر

(تاریخ وصولی [illegible]، ۲۷ف۔ مرتب)

بینائی

اشتراکیت کی ناکامی کا باعث خود اشتراکی ہی تو ہے۔ جیسے یہ کہا جائے کہ چودھری بدھو خود اپنی ناکامی کا باعث ہوا۔"

میری اور چودھری بدھو کی دیرینہ دوستی تھی وہ مجھ سے اکثر مختلف مسائل پر گفتگو کیا کرتا تھا۔ خصوصیت سے ان مسائل پر جن میں اسے کچھ الجھن سی پیش آجاتی تھی۔ میں اس کی الجھنوں کا حل اسے کیا بتا سکتا تھا اس کے لئے میرا مشورہ حقیقت ہی کیا رکھتا تھا۔ میری بساط ہی کیا تھی کہ میں اس کے ذاتی معاملات میں دخل دے سکتا۔ لیکن یہ اس کے وقار کا ایک ادنیٰ نمونہ تھا کہ جب اسے کوئی مشکل پیش آجاتی تو وہ مجھ سے مشورہ ضرور کرتا اور جہاں تک تجربہ ہے اس کا مشورہ کرنا محض ایک بہانہ ہوتا تھا کیونکہ اکثر اوقات دوران گفتگو میں وہ خود ہی کسی ایسے نتیجے پر پہنچ جاتا جس سے عمل پیرا ہو سکے۔ اس وقت وہ خوش فہمی کے طور پر بول اٹھتا۔ "تمہارے نیک مشورے اور معاملہ فہمی نے مجھے ایک اہم نتیجے پر پہنچا دیا ہے۔" لیکن اب کے معاملہ محض ضد کا تھا جو بڑھتے بڑھتے کہیں سے کہیں جا پہنچا تھا۔ چودھری بدھو کو بھی ضد ہو گئی تھی اس کی ضد خاندانی ضد تھی اور جب ضد کا معاملہ آپڑتا تھا تو اس کا تمکنت سے پھول جاتا تھا۔ اور وہ بھول جاتا تھا کہ کسی سے مشورہ کرنا دور اندیشی میں شامل بھی ہے یا نہیں بڑی بڑی الجھنوں میں بھی چودھری بدھو یہ بات کبھی نہ بھولتا تھا کہ اس کی کہی ہوئی بات پتھر پر کھنچی ہوئی لکیر سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے معاملہ مخالفت کا ہو یا موافقت کا جو کچھ اس کی سمجھ میں آتا وہ اسی کو بہتر پاتا تھا۔ جہاں تک ذاتیات کا تعلق ہے انسان اسی طرح جھنجھلا اٹھتا ہے جیسے چودھری بدھو بھی کبھی غصے میں جھنجھلا اٹھتا تھا۔"

چودھری بدھو کی سمجھ میں اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا تھا کہ وہ سوچتا بہت تھا اور سوچتے سوچتے برسوں اور صدیوں کے متعلق سوچتا تھا وہ اس بات کو کبھی ہاتھ سے نہ دیتا تھا کہ جو دلائل وہ ظاہر کر رہا ہے اس کا اس کی ذات سے کیا تعلق ہے اور اس میں اس کی ذاتی حیثیت کیا ہے۔ اگر اس کی نیت پر حملہ نہ کیا جائے اور ہر معاملے میں اسے راستی پر سمجھا جائے تو یہی کہنا ہوگا کہ اس کے لئے یہ امتیاز کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ جو کچھ وہ سوچتا اور کہتا ہے اس میں کسی کے برے اور بھلے کو بھی دخل ہے۔ اسے تو عادت ہو گئی تھی اور وہ عادت سے مجبور تھا کہ ہر معاملہ کو اپنے نقطۂ نگاہ سے ناپے اور وہی کچھ کرے جو اس کے آبا و اجداد نے کیا تھا۔ چنانچہ یہی سبب تھا کہ اس نے موروثی خود اعتمادی پر فیصلہ کر لیا تھا کہ مارو کی شادی رمضی کی لڑکی سے ہرگز ہرگز نہ ہونے دیگا۔ چودھری بدھو گاؤں بھر کا چودھری۔ خاندانی دولت اور ثروت سے مالا مال کسی کا محتاج نہ تھا۔

رمضی کی لڑکی آسو اور مارو نے خدا اور اس کی کتاب کو ضامن کرکے عہد باندھا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے ضرور شادی کریں گے اور ان کی شادی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہ سکے گی۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ ایک غیر معمولی واقعہ رونما ہو رہا تھا جس کا عہد آسو اور مارو نے خدا اور اس کی کتاب کو ضامن کرکے باندھا تھا۔ ممکن ہے اس مٹی نے صدیوں پہلے ایسے خود سر لڑکے اور لڑکیوں نے جنم لیا ہو اور انھوں نے گاؤں کی فضا میں ہلچل ڈال دی ہو لیکن گاؤں کے جہاں دیدہ بڈھے اور بوڑھیاں آسو اور مارو کے اس فعل سے کوئی ہمدردی نہ رکھتے تھے ورنہ اس غیر معمولی واقعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ گاؤں کے لوگ ایام زمانہ کے ساتھ ساتھ کیا کچھ فراموش کر چکے تھے۔ یہ چودھری بدھو جانتا تھا اس کی کرشمہ سازیوں سے گاؤں والے بے خبر تھے اور اگر کوئی صاحب نظر انھیں کبھی کسی بات کی طرف توجہ بھی دلاتا تھا تو وہ یہ کہہ کر [illegible] حاصل کر لیتے تھے۔ بلند نظری کی ضرورت نہ ہے یہ وقت

نہیں کہ مخالفت کو بڑھایا جائے اور غیر ضروری باتوں پر غور کیا جائے اور انہیں اتنی اہمیت دی جائے کہ گاؤں کے امن میں کسی قسم کا فرق آجائے۔ اگرچہ گاؤں والوں کے ہاں چوری ڈاکہ زنی اور کشمکش حیات ابھی تک موجود تھی ہر روز قرب و جوار میں ان کے بھائی بندوں کے حقوق پر دن دھاڑے ڈاکہ ڈالا جاتا تھا ان کو بے دردی سے کچلا جاتا تھا لیکن پھر بھی وہ سب کے سب چودھری بدھو کا منہ تکتے رہتے تھے وہ اس کی مدد کے محتاج تھے اور کہتے تھے۔ ہمارے چودھری سے دھرتی کا توازن قائم ہے۔

آسو اور مارو ہر قسم کی مخالفت پر کمربستہ تھے خواہ ان کا مقابل چودھری بدھو ہو یا گاؤں کا کوئی اور فرد انھیں اس سے غرض نہ تھی۔ انھوں نے جو نقطۂ نگاہ پیش کیا تھا وہ کتنا ہی انوکھا اور مختلف کیوں نہ ہو۔ بہا سے سمجھنے اور ماننے کے لئے کوئی تیار نہ تھا۔ گاؤں والے تو چودھری کی ہاں میں ہاں ملانا جانتے تھے اور جو کچھ چودھری کہتا تھا اس پر ایمان رکھتے تھے۔ وہ آسو اور مارو کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ ادھر آسو اور مارو بھی تمام گاؤں کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے وہ مٹنے اور مٹانے پر تلے ہوئے تھے۔ فریقین کے جذبات میں بند آنکھ اور کھلی آنکھ کا فرق تھا۔ اور واقعات کی صورت بھی ایسی تھی کہ کوئی ایک دوسرے کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا اور نہ کسی کو سمجھ آتی تھی کہ آخر ان اختلافات میں جو امتیازی فرق فساد کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے، اسے سلجھانے کا کوئی حل ہے بھی یا نہیں۔

چودھری بدھو کی ضد ذاتیات ہی پر کیوں نہ مبنی ہو اس کا نظریہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، مگر یہ حقیقت تھی کہ اس سے چودھری کے وقار کو زبردست دھکا لگتا تھا چودھری ہر روز مساوات مساوات کی رٹ لگاتا رہتا تھا اور کہتا رہتا تھا شہر میں یہ بلند نظری ہے کہاں بھائی بندی اور مساوات کا بہترین نمونہ ہم اور ہمارے گاؤں ہیں۔ وہ انسانی ہمدردی اور مساوات کو محض اپنی دولت شخصیت اور خاندانی وقار سے ناپ رہا تھا۔ غریب لالو۔ تھنا۔ لاجا۔ مادھو۔ ہیرا سب چودھری پر جان دیتے تھے وہ سب اس کا دم بھرتے تھے۔ وہ دم بھرتے بھی کیوں نہ ان سب کو اس کے ہاں اناج دودھ، چھاچھ، بیج، اور دیگر ضروریات زندگی جو میسر آتی تھیں۔ مساوات کا وہ نقشہ جو چودھری بدھو نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے تیار کر رکھا تھا ان کے لئے اتنا تسکین ثابت ہوا تھا کہ وہ سب کچھ بھول کر چودھری کے اشارے پر ناچنے کو تیار رہتے تھے۔ چودھری بدھو نے بھی ان کے دل بہلانے کے لئے ایسے ایسے دلفریب سامان مہیا کر رکھے تھے کہ انھیں اپنی عقل کا امتحان کرنے اور اپنے حقوق کے لئے کبھی کسی مظاہرے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی ——— مارو سے ان کی مخالفت محض چودھری تھا۔ ان کے دل میں قطعی طور یہ نہ آتا تھا کہ مارو کو بھی اپنی جوانی رنگین بنانے کا حق حاصل ہے۔ وہ بھی اس گاؤں کا رہنے والا ہے اس کو بھی گاؤں کی مٹی نے افتادگی بخشی ہے۔

مارو تنہائی میں اکثر سوچا کرتا۔ ایک نہ ایک دن آسو اس کی ہو کر رہے گی۔ اس کی دنیا بدل جائے گی۔ وہ کسی ایسے مقام پر جا بسیں گے جہاں سوائے ان حسین خوابوں کے کچھ نہیں ہوتا جن کی تعبیر ایک نوجوان لڑکی اور اس کے محبوب کے دوسرا بیان نہیں کرسکتا۔ آسو اگر مارو سے بیاہی گئی اگر وہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہو گئے اگر گاؤں بھر کی مخالفت اس بلند مرتبہ جوڑے کا کچھ نہ کر سکی تو انھیں ایک ایسی زندگی مل جائے گی جس سے گاؤں کا ہر نوجوان محروم اور زندگی کا ہر ہنگامہ بے لذت ہے۔ پھر آسو اور مارو ساتھ ساتھ دوش بدوش کھیتوں میں ہل چلایا کریں گے ان کی گردنیں شانوں سے بلند اٹھی ہوں گی پیشانی پر تجلیاں بیتاب نظر آئیں گی۔ ان کے ابھرے ہوئے سینوں کے اندر سانس زور زور سے چل رہا ہو گی۔ وہ تن کر اپنی مٹی پر چلا کریں گے۔ انھیں ایک دوسرے پر پورا پورا اعتماد حاصل ہو گا اور جب دھان کی پنیری لگانے اور

لہلہاتے اور پکے ہوئے کھیتوں کو کاٹنے کی ضرورت محسوس ہوگی تو وہ کس فخر اور غرور سے اپنے سرخ اور بھاری بھاری لبوں میں حقے کی نال دبائے فسوں ساز نگاہوں سے کہے گا۔ آسو آؤ یہ کریں وہ کریں اس میں ہمارا بھلا ہے۔ یہ دھان یہ کھیت یہ دنیا سب کچھ تمہارا ہے۔ اور خود مارو بھی تمہارا ہے۔

مارو کے مدنظر چودہری بدہو کے وقار پر ایک کاری ضرب بھی لگانا مقصود تھا ایک ایسی ضرب جو چودہری بدہو کو دین و دنیا سے بدحواس بنادے اور وہ نشہ جو اس نے لالو، ٹھنے، ہیرے، مادھوا اور اسی طرح ان کے باقی گاؤں والے بھائی بندوں کو پلا رکھا ہے، ہرن ہوجائے۔ وہ چاہتا تھا اپنے عمل سے چودہری کے وقار اور بھرم کو ایک ایسا ناقابل برداشت ریلا دے کہ وہ گاؤں والوں کے ذہن سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اتر جائے اور وہ خود بھی اس مساوات کے دائرے سے نکل جائے جسے چودہری بدہو کے مریدوں نے قانون کی صورت میں رائج کر رکھا تھا۔

مارو امیر تھا اور نہ تعلیم یافتہ اور نہ اسے یہ یاد تھا کہ اسے خاندانی ورثے میں کیا کچھ ملا تھا۔ آسو سے ملتے ہی اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ مرنے مارنے پر تیار ہوگیا تھا۔ جو چاہتا تھا وہ انجام پاکر موانہ دیکھ کر تلملا اٹھتا اور کہتا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم اپنی جوانی کی دل شکنی نہ ہونے دیں۔ یہ لالو اور ٹھنا کیا جانیں جوانی کیا ہوتی ہے۔ یہ تو مارو ہی جان سکتا ہے۔ جب کبھی بیکار اور بھوکا ہوتا تھا تو مستقبل اندھیر نظر آتا تھا۔ لیکن پھر بھی ہمیشہ ارادے بڑے بڑے باندھتا تھا اور کھیتوں میں اس طرح ادہر ادہر پھرنے نکلتا تھا جیسے جنگلوں میں دھاڑنے والا شیر ابھی ابھی بند کردیا گیا ہو۔

جب گاؤں کی من موہنی لڑکیوں اور سندر ناریں کو جن پر بہاریں آوازے کستی سنائی دیتی تھیں، نہر کے کنارے کنارے پگڈنڈیوں سے بے نیاز چلتے ہوئے ہچکولے کھاتے بساط سے زیادہ کھل کھیلتے دیکھتا تو خود بھی کھل جاتا

اور چاہتا پہروں ان کی ہمکلامی کا فخر حاصل کرے اور ان سے یہ کہتے کہتے اس کے لب خشک ہوجائیں۔ "آسو کو تم جانتی ہو وہ جذبے والی ہے اس کی گردن چلنے میں اس طرح اٹھتی ہے جیسے مور اور سانپ چاندنی میں ناچتے ہیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جنگلی ہرن کی طرح ہیں جن سے وہ میرے بغیر کسی کو نہیں دیکھتی۔ اس کے سرخ سرخ ہونٹ سوائے عہد باندھنے کے اور اپنے الفاظ پر قائم رہنے کے کچھ نہیں جانتے۔" اور پھر جب نہر کے کنارے جانے والی لڑکیوں کے عکس پانی میں ہلتے ہوئے دیکھتا تو چونک اٹھتا اور سہم جاتا۔ اور اپنے آپ بول اٹھتا کہیں ایسا نہ ہو کہ آسو ان درختوں کے سایوں کی طرح ڈھل جائے جو ابھی ابھی کھیتوں پر پڑ رہے تھے اور جن سے یہ سکوت افزا سماں دلکشی اختیار کرگیا تھا۔ کہیں آسو چودہری کے وقار کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ کیونکہ چودہری کتنے اعتماد سے کہتا ہے۔ "یہ ہرے بھرے کھیت تو کیا ان نہروں کا پانی بھی اسی کی طفیل ہے اور آسو تو اس کے گھر کی ہاتھ باندھی لونڈی ہے۔" لیکن جب خیال کرتا کہ آسو جوان ہے وہ جوانی پر ریجھ گئی ہے۔ اپنے برے بھلے کی خود مختار ہے تو خودستائی پر اتر آتا۔ پھر کسی کے وقار اور رتبے کو تصور میں لانا بھی گناہ خیال کرتا۔ اس وقت مٹی کو ٹھکرا کر کہتا۔ تیرے سینے پر ہل چلانا جوانوں کا حصہ ہے۔ گاؤں کا سب کچھ گاؤں کی مٹی ہی سے تو بنا ہے اس میں چودہری کا کیا اجارہ ہے۔ وقت آنے پر اس سے نپٹ لوں گا۔

مارو چودہری کو دیکھ کر بھی ڈرتا نہ تھا۔ پھر گاؤں والوں کے چہروں پر افکار و حوادث کے آثار دیکھ کر ضرور سہم جاتا تھا۔ انھیں جو ملامت کرنا چاہتا تھا وہ ملامت اپنے آپ پر بھیج کر اطمینان حاصل کرلیتا تھا اس نے ان لوگوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا جو بھیڑ بکری اور بیلوں کی طرح ہر روز کھیتوں کو آتے جاتے چوپال کے سامنے کھڑے چودہری سے اپنے سلام کا جواب حاصل کرنے کے لئے زندگی ختم

کرتے دیکھتے تھے گھر کی بینائی کم ہو گئی تھی اور اکثر چودھری کی مار
دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے تھے۔

یہ واقعات دیکھ کر آسو بیتاب ہو جاتا تھا اور اپنی بے چینی
کو دور کرنے کے لئے بیلوں کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیتا اور کہتا
"ابکی ہم نے بہت محنت کرنی ہے" سختی بھوک ترشی ہر آنے
والے وقت کا اس نے مقابلہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس پر ایسے
ایسے وقت بھی آ چکے تھے کہ وہ دنوں بھوکا پڑا محنت کے
میٹھے پھل کا تصور کرتا رہتا اور کوئی اتنا بھی نہ پوچھتا کہ وہ
گاؤں کے رہنے والوں میں سے ہے بھی یا نہیں ــــ شام
کو کھیتوں سے گھر واپس آتا تھا تو راستہ میں چودھری کا
مکان پڑتا تھا۔ اس بلند اقبال حویلی کو دیکھ کر ہر راہ گیر چودھری کے
اقبال کا قائل تھا۔ حویلی کی پیشانی پر کچھ لکھا ہوا تھا جس کا
مطلب بغیر پڑھے ہی مارو کے ذہن میں موجود تھا۔ وہ حویلی
دیکھ کر نظر پھیر لیتا اور کبھی خیال نہ کرتا کہ اس کا مالک
میرا دشمن ہے۔ آسو کو تو اس بات کی دھن سی لگ گئی تھی کہ
گاؤں کو چودھری کے پنجے سے بچانا فرض ہے۔ چودھری جو
اپنے آپ کو گاؤں کا نجات دہندہ سمجھتا ہے، ہرگز گاؤں
کی نجات کا حل نہیں ہے۔ اس کی یہ منطق اس کی ذہنی محنت
کا نتیجہ ہے کیونکہ مساوات کا خاکہ جو چودھری کے آباؤ اجداد
نے تیار کیا تھا۔ مع اپنے ... کے آنا سالم ہو چکا ہے کہ اب ان
بڑے بڑے عہدوں کے باوجود اس کے متعلق کسی قسم کا احساس
نہیں کیا جا سکتا۔ مارو کہتا میرا معاملہ کوئی ذاتی تھوڑا ہی ہے
یہ تمام گاؤں کا معاملہ ہے۔ لالو، نغفا، لاجا، مادھو اگر
نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں وہ اپنے ساتھ انصاف کرنا نہیں
چاہتے تو نہ کریں مگر وہ اپنے ساتھ تمام گاؤں کو تو نہ لے
ڈوبیں۔ میں کہتا ہوں اپنے آپ سے انصاف نہ کرنے کا یہ
مطلب نہیں کہ میں جھوٹا ہوں اور میرا مطالبہ مفت کی سینہ
زوری ہے۔"

گاؤں میں ایک مدرسہ اسکول تھا جو مدتوں سے چودھری
کے دستِ کرم کا محتاج ہو کر بڑا چل رہا تھا۔ گاؤں کے اکثر جوانوں
نے بچپن میں یہاں میاں جی سے الف۔ بے سیکھا تھا آسو نے
بھی چند روز وہاں قدم دیے تھے۔ پڑھنا لکھنا تو اس کی قسمت
میں نہ تھا۔ لیکن مزدور کا بیٹا مزدور جس کی دنیا کالی ہو چکی ہے
تھوں جیسا احساس ضرور رکھتا تھا۔ جب کبھی علم حاصل
نہ کرنے کے متعلق خیال کرتا تو گردن جھک جاتی اور چوڑے چوڑے
شانے اوپر اٹھ جاتے دل بیٹھنے لگتا آنسو خود بخود نکل آتے۔
آسمان کے تارے توڑ لانے والا اور کسی کو نگاہوں میں نہ
لانے والا دل ہار کر بیٹھ جاتا ــــ

رمضی آسو کا باپ چودھری بدھو کا داماد تھا۔ آسو چودھری
بدھو کی نواسی لگتی تھی۔ چودھری بدھو اپنے داماد رمضی سے
بڑی محبت رکھتا تھا۔ رمضی کو بھی چودھری کی عزت کا پاس
تھا اسے اس کا احترام تھا۔ چودھری اکثر اسے بڑے بڑے
قصے اور کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ خصوصیت سے جب وہ
موج میں ہوتا تھا ــــ دیگر اوصاف کے علاوہ چودھری
ایک اچھا واقعہ نگار بھی تھا اس کو خاندانی روایات ازبر یاد
تھیں اور وہ انہیں اس طرح دہرایا کرتا تھا گویا دنیا کی تاریخ
ان کے بغیر ادھوری ہے۔ وہ ہمیشہ رمضی کو اس بات کا یقین
دلاتا رہتا ہماری بستی اور اس کا وجود ہمارے اپنے نام اور
وقار سے ہے وہ ساتھ ساتھ اسے یہ بھی سکھلاتا رہتا۔ ہماری
غیرت کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ یہ مارو یہ کل کا چھوکرا ہماری
عزت اور دولت پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس
چودھری کا داماد رمضی اپنی بیٹی آسو کے قریب تھا مارو
اسے ذرا بھی برا نہ لگتا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ اچھی نگاہ سے دیکھتا
اور کہتا گاؤں بھر میں وہی تو ہمدردی کے قابل نظر آتا ہے۔

آسو اور مارو سے میل جول اور دانا پانی بند کرنے کا
حکم ابھی چودھری کی طرف سے صادر نہ ہوا تھا مگر چوپال میں
یہ افواہ پھیل چکی تھی اور گاؤں والے اس افواہ پر اپنی پیشگوئیاں
کرتے اور مختلف ارادے باندھتے تھے کہ اگر مارو اور آسو
ذرا بھی ڈگمگا جاتے یا ہمت چھوڑ دیتے تو ان کا دم ناک میں آ جاتا
اور وہ گاؤں کی حدود میں ایک پل کے لئے بھی نہ ٹھہر سکتے۔

یا تو وہ بھاگ جاتے یا ان افواہوں کے باعث گھٹ گھٹ کر مر جاتے۔ وہ اپنے حقوق کی حفاظت چاہتے تھے ان کا اپنا قانون تھا اور وہ افواہیں جو ان کے متعلق پھیلائی جاتی تھیں ان کی نظروں میں ذرا بھی وقعت نہ رکھتی تھیں وہ اپنی دھن پر سرگرمی سے عمل پیرا تھے۔

تنگ آئے ہوئے لوگوں کے لئے زندگی موت کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مار دا اس ذریعے کو چودھری بد ہوا اور اس کی ضد کی بھینٹ چڑھا دینا چاہتا تھا۔ وہ ذرا تن کر کھڑا ہو گیا اس نے زندگی میں پہلی بار چودھری کے مکان کی طرف حقارت سے دیکھتے ہوئے تھوکا اور کہا یہ بھی مٹی کا ڈھیر ہے ایک دن یہ شان یہ شوکت یہ وقار سب کچھ مٹی ہو کر رہ جائے گا۔

چودھری کی حویلی کا دروازہ آج غیر معمولی طور پر بند تھا۔ آنے والی شام کا دھندلکا تمام گاؤں پر چھا جانے والا تھا۔ باہر مشرقی دیوار کے سامنے جو چبوترہ تھا اس پر رمضی چودھری کا داماد چودھری کے سامنے دو زانو بیٹھا تھا۔ ہمیشہ کی طرح چودھری اپنی جادو بیانی کے کرشمے دکھا رہا تھا۔ وہ اس پر ہر سمت سے چھا گیا تھا اس نے اس پر کافی سے زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا۔ اسے اتنی بھی جرأت نہ تھی کہ وہ گردن اٹھا کر چودھری کے چہرے کا جائزہ لے سکتا اور آنکھ سے آنکھ ملا سکتا اور سینہ سپر ہو کر کہہ سکتا کہ آخر اسے بھی آسو کے متعلق کچھ کرنا اور کہنا ہے۔ حویلی کے اندر آسو چودھری بدھو کی نواسی دو صحن میں بیٹھی ان تمام واقعات پر غور کر رہی تھی جو اس کے سامنے دہرائے جا رہے تھے اور یہ امید کی جا رہی تھی کہ وہ اپنی تمام آرزوؤں کو ان کے وقار پر قربان کر ڈالے گی اور بول اٹھے گی۔ اسے تو وہی کچھ کرنا ہے جس سے اس کے خاندانی وقار میں سرمو فرق نہ آئے۔ صحن میں دوسرے گھرانوں کی عورتیں بھی جمع تھیں اور اس بات پر مصر تھیں کہ آسو چودھرانی کے قدموں پر سر رکھ دے تاکہ چودھری گاؤں کو پھر ایک بار اپنی مساوات والی حکمت عملی کے ساتھ اس آنے والی افتاد سے بچا لے۔ چودھرانی آسو کی پشت پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ پاس ادب سے آسو کا سر جھکا ہوا تھا۔ شان دلکشی کی میں وہ دلہن معلوم ہوتی تھی۔ سب چھوٹے بڑوں کی نظر میں سمائی جا رہی تھی۔ ہر کوئی متاثر نظر آتا تھا۔ پر آسو چپ تھی۔ اس کی ہم عمر لڑکیاں جب اس کا منہ تکتے تکتے تھک جاتیں تو پھر اپنے چرخوں کو گھمانا شروع کر دیتیں۔ کسی کو بھی جرأت نہ ہوتی تھی کہ کوئی پوچھے آخر آسو نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ چودھرانی کا چہرہ تمتمایا ہوا دیکھ کر تمام چرخے ایک دم رک گئے۔ سب چھوٹی بڑی عورتیں اور لڑکیاں جو وہاں موجود تھیں چودھرانی کا چہرہ تکنے لگیں اس وقت ان کی پیشانیاں دانائی سے روشن تھیں چودھرانی کا چہرہ طلائی مہر بنا ہوا تھا عمر کے تمام نشان گم تھے گلاب پھول رہا تھا۔ صحن میں رمضی بھی آ گیا تھا اس نے آسو کی طرف دیکھا اور سہم گیا۔ سانس تک سنائی نہ دیتا تھا ڈرتا تھا کہیں آسو ڈگمگا نہ جائے۔ "گاؤں کی قسمت کا ستارہ میری بچی اور کی دلہن" رمضی نے آواز دی آسو آسو اس کی آواز میں اعتماد تھا اور پھیلاؤ تھا چودھرانی نے آسو کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور اس کی چمکتی ہوئی پیشانی کو چوم لیا وہ مطمئن تھی کہ آسو گاؤں اور چودھری کی عزت بچا لیگی وہ اپنے نانا کی لاج رکھ لیگی۔ آسو باپ کے پاس سے ہو کر باہر نکل گئی۔ رمضی آسو کا باپ بیٹی کے عزم کو سمجھتے ہوئے شام کے دھندلکے میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

چودھری کی بلند اقبال حویلی ماتم کدہ میں تبدیل ہو گئی چھوٹے بڑے حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے تھے۔ کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ کوئی ان کے ہاتھ سے ہاتھ چھو لیتا یا ان کا سامنا کر لیتا۔ چودھری بڑے طمطراق سے اپنا عصا ہاتھ میں لئے اپنے آپ کو اس کے سہارے وزن کر کے کھڑا ہو گیا پر طبیعت پر قابو نہ رکھتا تھا "اس کا عصا کوئی موسیٰ کا عصا تھوڑا ہی تھا" کندھوں پر چادر ڈال چودھری بھی گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ تین خدمتگار بغیر کچھ کہے سنے اور بغیر کچھ سوچے سمجھے اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ ان کو یہ پوچھنے کی جرأت بھی نہ تھی کہ چودھری کہاں جائے گا اس کی منزل مقصو

کہاں ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے اور اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔

چودھری کی عمر کوئی ساٹھ کے لگ بھگ تھی تمام عمر عیش و عشرت میں گزری تھی دنیا کا کوئی عیب نہ تھا جس کی لذت اس نے چکھی نہ ہو اور کوئی گناہ نہ تھا جو اس نے کر کے دیکھا نہ ہو۔ اس بوڑھاپے میں بھی سر تیں جوان رکھتا تھا شراب اور عورت کا تصور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ مگر ہر ظاہر داری اور شرافت کا پاس بھی ضرور رکھتا تھا۔ کسی کو گمان بھی نہ ہو سکتا تھا کہ چودھری نے بھی زمانے بھر کی خاک چھانی ہے۔ ذرا سے کھٹکے پر چودھری جنگلی ہرن کی طرح چوکس ہو جاتا تھا۔ بلند گردن۔ کھلے فراخ شانے بغیر کسی خمیدگی کے جب دیکھو تازہ دم نظر آتا تھا۔ آنکھیں کھیت کی مٹی میں اٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے کی مانند چمکتی تھیں۔ اس کی انگوٹھی کا نگینہ بھی ویسا ہی چمکتا تھا۔ اس انمول عقیق کے نگینے کے متعلق اگر کوئی کہتا چودھری جی یہ چاندی کی انگوٹھی اور معمولی نگینہ آپ کے شایان شان نہیں تو کہتا "یہ میری ملکیت کب ہے۔ یہ باپ کی یادگار ہے۔ میرے باپ کو بھی کسی ولی اللہ نے بخشش کے طور پر دی تھی اس معمولی نگینے کو دیکھ کر بھول میں نہ رہنا دنیا میں اپنی قسم کا یہ ایک ہی تو ہے"

چودھری نے شاہین اور باز پال رکھے تھے ان کی طرف دیکھ پاتا تھا تو ان شکاری جانوروں کی نظریں بھی پھر جاتیں کس کی مجال تھی کہ کوئی چودھری کی آنکھ سے آنکھ ملا سکتا۔

چودھری بہت بڑا شکاری تھا اسے شکار کی لت جوانی ہی سے تھی اس کے خاندان میں یہ شوق پشت ہا پشت سے پایا جاتا تھا اس عمر میں بھی چودھری کی ہمت کا یہ عالم تھا کہ شکار کے پیچھے کوسوں پیدل چلا جاتا اور سواری کا خیال تک نہ لاتا۔ ارادے کا پکا کتنا ہی ضدی اور وضعداری کا پابند کیوں نہ ہو لیکن کج بحث نہ تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا اس کا امیرانہ ٹھاٹھ دیکھ کر سیکڑوں گاؤں کے مالک بھی اس کی زندگی پر رشک کرتے تھے کیونکہ چودھری بدھو خاندانی چودھری تھا۔

چودھری بدھو دراز قد شکل و صورت سے ایک جری سپاہی نظر آتا تھا ہاتھ میں ہر وقت بھاری عصا رکھتا تھا کیا مجال تھی کہ کوئی اس سے کھل کر بات بھی کر سکتا۔ چودھری کو آتا دیکھ کر راہ گزر راستے کا رخ بدل کر چلنا شروع کر دیتے تھے۔ اس کے کھانسنے اور گھورنے میں بھی ایک وقار ہوتا تھا پاس بیٹھنے والے سہمے رہتے تھے۔ کیونکہ اس کا وقار محض نمائشی نہ تھا وہ ارادے کا پکا اور ہٹ کا مضبوط گاؤں بھر کا چودھری تھا: وہ آسو کی شادی مارو سے نہ ہونے دے گا" یہ اسی چودھری کے الفاظ تھے اور ارادہ لئے ہوئے ثروت اور وقار سے لبریز پر معنی الفاظ تھے۔

چودھری کے کان بج رہے تھے عصا ہاتھ میں تھا چلا جا رہا تھا۔ مارو اسے بھیڑ بکری کی مانند نظر آ رہا تھا اس کا یقین تھا اس کا ایک وار مارو کا کام تمام کر دے گا۔ وہ بغیر کسی جھجک کے چلا جا رہا تھا۔ چاہتا تھا رمضی مل جائے مگر وہ دور تک نظر نہ آیا نہ معلوم آسو اور رمضی کہاں چلے گئے تھے۔ شام کے سناٹے میں بہت دور چوپال کی طرف کچھ شور سنائی دے رہا تھا بھاؤں کی کھلی فضا میں یہ شور چودھری کے کانوں کو اجنبی معلوم دیا بدن کا رواں رواں کان بن گیا اور آنکھیں ایک لمحہ کے اندر اندر گاؤں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم آئیں۔ اپنے آپ پر بڑا اعتماد کرتا تھا پر نگاہوں کو وہ نظر نہ آتا تھا جسے دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہا تھا۔ اسے تو ایک ہی دھن تھی کہ وقار بچ جائے اور وہ مساوات زدہ قانون جو اس کے وارثوں نے بنا رکھا ہے اس میں سر مو فرق نہ آئے اس لئے بغیر سوچے سمجھے منہ اٹھائے کشاں کشاں چوپال کی طرف چلنے لگا چوپال دور تھا۔ راستہ میں اسکول پڑتا تھا۔ سنہ کا رہٹ اور کنواں اور اس کی وان کٹیا بھی تھی۔ اسکول کے احاطہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا دروازے پر نہایت قدیم مری کینس قسم کی لالٹین جل رہی تھی وہ اس طرح ٹمٹما رہی تھی گویا اس طرح جلنے کی اسے عادت پڑ گئی ہے۔ اسکول کا انتظام

چودہری کے سپرد تھا وہ اسکول کا پروہان بھی تھا۔ آخری لمحوں پر ٹمٹماتی ہوئی لالٹین کو دیکھ کر غصے سے لال پیلا ہو گیا اودھر اودھر دیکھا پر کوئی نظر نہ آیا اسکول کے سامنے برگد کا بہت بڑا پرانا درخت تھا اس کے مغرب کی طرف ایک چبوترہ بنا ہوا تھا یہاں کبھی سادھوؤں کا ڈیرا رہا تھا۔ چبوترہ بالکل شکستہ حالت میں تھا برگد کے درخت کی موٹی موٹی شاخیں زمین کی طرف جھکی ہوئی تھیں اور تنا کچھ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے ساتھ ساتھ قبریں بنی ہوئی ہوں۔

اسکول کی عمارت اور درخت اس وقت چودہری بدھو کو عجیب و غریب دکھائی دئیے قدم رک رک کر اٹھنے لگے ارادے کا مضبوط انسان کمزوری محسوس کرنے لگا لیکن برابر چلتا رہا۔ چوپال نزدیک آرہا تھا چوپال سے آوازیں آرہی تھیں یہ شور پہلے کی نسبت زیادہ بڑھ گیا تھا۔۔۔۔

چودہری نے غصے کی حالت میں راستہ امید سے زیادہ طے کر لیا تھا۔ بنیا دوکان میں سمٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ چودہری کو بےوقت آتے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا عادت کے مطابق ہاتھ جوڑ دیئے اور زیر لب مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ کتنی ہی بناوٹی کیوں نہ ہو۔ وہ ہمیشہ مسکراتا ہی نظر آتا تھا کیونکہ برسوں کے تجربے اور بے محل مسکراہٹ سے اس کے چہرے پر ایسے نشان بن گئے تھے جیسے وہ ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہے۔ ایک نخستہ ہنسی اس کی یہ طنز آمیز مسکراہٹ دیوی لکشمی کا دان تھا بنیا دو قدم آگے بڑھ کر چودہری سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا خیر تو ہے میرے داتا اس وقت کیسے آنا ہوا کدھر کا قصد ہے پھر بنیا پاس ادب اور چودہری کے رتبے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ساتھ ساتھ قدم بہ قدم چلتا گیا۔ مگر چودہری کی زبان سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔

شور جس سے چودہری کی حالت لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر ہوتی جارہی تھی بڑھتا جارہا تھا۔ چودہری بالکل غافل نہ تھا اس کی آنکھیں شاہین کی مانند چمک رہی تھیں یہ معلوم دیتا تھا ابھی کسی نہ کسی پر جھپٹ پڑے گا۔ بنیا گھبرا اٹھا اس کی حالت دگرگوں ہو رہی تھی وہ ہمیشہ ایسے شور سن کر گھبرا جایا کرتا تھا اس نے چاہا چودہری کا پیچھا چھوڑ کر اپنی دان کٹیا کی طرف بھاگ اٹھے اور یہ بہانہ تراش لے کہ اسے آج رات لکشمی دیوی کی پوجا کرنی ہے اسے دیوی کو وہ ہار پہنانا ہے جو اس نے پچھلے سال دیوالی کے تہوار پر خریدا تھا۔ دراصل لکشمی دیوی کے ہار اور چراغوں کی اتنی ہوس نہیں تھی جتنا اسے بنئے کے ہاں ٹھیرنا بھاتا ہے۔ وہ دیوی ہے اور وہ بنیا ہے جو اسے بڑے بڑے غلاف اور تہوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔

چودہری کو اپنے سانس پر پورا پورا ضبط حاصل تھا تن کر چلا جارہا تھا اس کے عصا کی آواز کبھی کبھی ضرورت سے زیادہ بلند ہو جاتی تھی جو اسے ہوشیار بنا دیتی تھی۔ بنیا بولا چودہری جی چوپال دور ہے چوپال سے کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیتا وہ یہ کہہ کر رک گیا۔ مگر چودہری کی وحشت بڑھتی جاتی تھی چوپال اور اس کا راستہ۔ گاؤں کا ذرہ ذرہ ایک ایک فرد کون تھا جو چودہری کو یاد نہ تھا۔ چوپال کی طرف سے شور کی آواز نزدیک آتی جارہی تھی شور تھا کہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جارہا تھا۔ بنیا گھبرایا ہوا بولا چودہری جی چوپال پر کچھ بلوہ تو نہیں ہو گیا۔ چودہری نے عصا زمین پر زور سے مارتے ہوئے کہا۔ "چودہری نے بھی تو یہی دیکھنا ہے"۔ بنیا شور سن کر بے حال سا ہو رہا تھا مگر چودہری کو اس سے غرض نہ تھی وہ بنئے سے بے خبر چوپال کی طرف چلا جارہا تھا۔ اسے کچھ اور یاد ہو یا نہ ہو لیکن اسے یہ ضرور یاد تھا کہ دو اور آتو نے اس کی مرضی اس کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف ایک عہد باندھا تھا کہ وہ شادی کریں گے اور وہ شادی چودہری کے قانون کے خلاف اس کی مرضی کے خلاف اور گاؤں کی ریت کے خلاف اور اس کی ضد کے خلاف ہو گی۔ خدمت گار پیچھے پیچھے آرہے تھے جو ہمیشہ اس کی ہاں میں ہاں ملانا جانتے تھے ذرا جرأت کر کے کھانسے۔ انھوں نے آگے بڑھ کر اپنی موجودگی کا اظہار کیا۔ چودہری نے سب کو ذلت سے جھٹک دیا اور کہنے لگا تم سب ضمیر فروش ہو وہ سب کے سب، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور اپنی وفاداری کا یقین دلاتے ہوئے مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ مگر چودہری کو ان پر ذرا بھی اعتماد نہ تھا چودہری کے تیور بدلے ہوئے دیکھ کر وہ دم بخود رہ گئے۔ شور قریب آتا

جا رہا تھا۔ عدالت کا ممل غنہ چلا کر کہا چودھری جی بجنے کی دان
کٹیا میں چھپ جائیے۔ وہ سب کے سب ادھر ہی آ رہے ہیں۔
بجنے کے استھان میں چھپ جائیے وہ دیوی کا استھان ہے
وہ امن کی جگہ ہے۔ مگر چودھری نے کچھ نہ سنا۔ خاندانی وقار کا وارث
اور بھی سینہ سپر ہو کر تن کر کھڑا ہو گیا اور عصا کو زور سے
زمین پر مارا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں غرور اور خاندانی
غیرت جھلا رہی تھی۔ وہ شعلوں کی مانند چمک رہی تھیں چودھری
بولا چوپال کا راستہ صاف ہے وہ ضرور چوپال کو جائے گا۔
اس نے عصا اٹھا کر کندھے پر رکھ لیا اور بے دھڑک چوپال
کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

ہا، ہو اور قہقہوں کا شور اب بہت نزدیک آ گیا
تھا۔ چودھری چوپال کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ شور میں سے
ایک آواز سنائی دی "چودھری ادھر آ رہا ہے"

— ہاں ادھر ہی آ رہا ہے۔ آنکھیں تو دیکھو کوئلوں کی طرح
دہک رہی ہیں۔

— انتقام پر اتر آیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔

— زندگی کی بار نظر آ رہی ہے اسے۔

— لاش ہے جو چل پھر رہی ہے۔ اس کا وقار اور ثروت
لٹ چکی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے زندہ مر چکا ہے۔

— یہ شکست اس کے لئے ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے۔

— اس خاندان میں یہ پہلا واقعہ ہے — بغاوت
وقار کے خون سے رنگین ہے۔

— ناکامی کے احساس نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اسے خونخوار
بھیڑیے کی مانند بپھرا چلا آ رہا ہے۔

چودھری کے قدموں میں ذرا بھی لرزش نہ آئی تھی۔ پورے
اعتماد اور بھروسے سے چل رہا تھا گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ جب
چوپال کے قریب آ گیا تو عصا کندھے سے اٹھا کر زمین پر
رکھ دیا۔ ہجوم کے آگے آگے رمضی داماد آ رہا تھا۔ رمضی کو اس نے
اور رمضی نے اس کو پہچان لیا تھا۔ چودھری کی شکست جواب
دے گئی تھی اس کا دم پھول رہا تھا۔ داماد محبت کے ساتھ چودھری
سے لپٹ گیا۔ ہجوم کا جوش کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ رمضی چودھری
سے آنسو اور مارو کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا جوش محبت میں
اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔

ہجوم چودھری بدھو کو چیرتا ہوا نکل گیا۔ چودھری عصا
تو لئے ہی رہا لیکن وہ اس قدر بھاری ہو چکا تھا کہ اس سے اٹھ
نہ سکا۔ گاؤں کی دنیا بدل گئی تھی۔ چودھری کے قانون کا خاتمہ
ہو گیا تھا کیونکہ آنسو اور مارو نے جو عہد باندھا تھا وہ ہر انسانی
قانون پر بازی لے گیا تھا۔

چودھری بدھو کے گاؤں میں اکثر شادیاں اب آنسو اور
مارو کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق طے پاتی ہیں۔ کہتے ہیں
گاؤں میں قدیم مساوات کا نظریہ بدل چکا ہے۔ چودھری کے
خاندان کی لڑکیاں بھی اب گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح
اپنے خاوندوں کے ساتھ پنیری لگاتی اور کھیت کاٹتی ہیں۔
چودھری ابھی تک زندہ ہے اس کی یاد جواب دے چکی ہے۔
اب اس کی ضد کی کوئی وقعت نہیں۔ مدت ہوئی اس کا داماد
رمضی مر چکا ہے۔ اور وہ خود دیوانوں کی طرح گاؤں کے باہر
مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ جب کبھی وہ گاؤں کی تنگ و تاریک اور
گندگی بھری گلیوں میں مع اپنے بھاری عصا کے آ نکلتا ہے تو
بچے اس پر پتھر پھینکنے لگتے ہیں اور گالیاں دیتے ہیں۔
چودھری قدم قدم پر لڑکھڑا جاتا ہے اور عصا کو اپنی
طرف کھینچ لیتا ہے۔ اس وقت وہ اپنا وزن کرتے ہوئے
اور اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے یہ کہتا سنا جاتا ہے "میری
بینائی کھو گئی ہے"

چغتائی

سلطان یاور جنگ

میر منور علی نام۔ خان بہادر۔ نواب سلطان یاور جنگ خطابات ہیں۔ آپ کے جد اعلیٰ مولوی میر سید علی خاں قرا ول حضرت نظام الملک آصفجاہ اول کی فوج کے ایک ممتاز افسر تھے اور دہلی سے بعزم دکن حضرت آصفجاہ اول کے ہمراہ رکاب تھے۔ جنگ کھرڈلہ ۱۲۱۰ھ کے موقع پر انھوں نے باغیوں اور مرہٹوں کے خلاف اپنی جان نثاری اور وفاداری کے وہ جوہر دکھائے کہ حضرت مغفرت آب نے خوشنودی اور قدردانی کا اظہار فرمایا۔

نواب سلطان یاور جنگ بماہ ربیع الثانی ۱۲۶۶ھ بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے اور اپنے والد مولوی میر یوسف علی کے سایہ عاطفت میں علوم مذہبی اور فنون سپاہ گری کی تکمیل کی۔ گھوڑے کی سواری سے خاص دلچسپی تھی۔ چنانچہ بعد فراغ تعلیم و تربیت (۲۶) سال کی عمر میں اپنے فطری ذوق اور موروثی جذبہ کے تحت دولت آصفیہ کی فوجی خدمات کے لئے خود کو پیش کیا اور ۴ اردی بہشت ۱۲۸۲ف کو فوج باقاعدہ تھرڈ لانسرز سرکار عالی کی خدمت رسالداری پر مامور ہوگئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے جنگی کرتبوں اور فوجی تنظیمات میں ایسی مستعدی دکھلائی کہ نواب اکبر الملک کوتوال بلدہ کی دوررس نظروں نے سررشتہ کوتوالی کی تعلیم و تنظیم کے لئے ان کو منتخب کرلیا۔ ابتداً سررشتہ کوتوالی میں سرگروہ کی خدمت پر منتقل ہوئے لیکن خداداد قابلیت و صلاحیت کی وجہ سے بہت جلد ترقی کرکے دوم مددگار کوتوال بلدہ کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔ زمانۂ مددگاری میں اپنے مفوضہ فرائض کو بڑی خوش اسلوبی اور مستعدی، دیانت داری اور جانفشانی سے انجام دیا۔ خلاف وقت دفتر غیر معمولی محنت و مشقت برداشت کرکے دفتری اور انتظامی استحکام کو اپنی خاص نگرانی سے پاک و صاف کرکے سررشتہ کوتوالی کی اصلاح کی مختصر یہ کہ وہ زمانہ مددگاری سے ہی ملک و مالک کے سچے بہی خواہ اور بالخصوص سررشتۂ پولیس کے لئے تو نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئے۔

ان کی ہمہ جہتی قابلیت اور دیانتدارانہ صلح کل پالیسی کا ہی ثبوت ہے کہ جب ۵ خورداد ۱۳۱۴ف م ۲ صفر ۱۳۲۳ھ کو چند ماہ کی علالت کے بعد نواب اکبر الملک کوتوال بلدہ کا انتقال ہوا تو اعلیٰ حضرت شہریار دکن آصفجاہ سادس کی مردم شناسی نے سلطان یاور جنگ جیسے منتظم اور مدبر، متفنن اور امین، وفادار اور جان نثار ہستی کا کوتوالی بلدہ کی خدمت جلیلہ پر انتخاب فرمایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عہد میں پولس کے عمدہ انتظام کی بدولت چوری، خونریزی اور مردم آزاری وغیرہ کا پورا پورا انسداد ہو کر نہ صرف آصفی رعایا مامون و مصئون رہی بلکہ ملک اور بیرون ملک میں بھی اس کی دھاک بیٹھ گئی تھی حالانکہ اس عہد میں جملہ ملازمین پولس کی تعداد حسب تفصیل حاشیہ (۳۰۹۶) اور سالانہ خرچ ۳۳۹،۴۸۰ روپیہ تھا اور کوتوالی بلدہ کے زیر انتظام شہری (۲۰) ربع میل آبادی تھی جس کی مردم شماری (۴۴۰،۶۶۶) نفوس پر مشتمل تھی اس لحاظ سے فی جوان (۱۴۳،۴۶) نفوس کا اوسط پڑتا ہے جو شہر کی کثرت آبادی اور اس زمانہ کے تنگ و تاریک پیچیدہ راستوں کے مدنظر قیام امن و انسداد جرائم اور نگرانی امور سیاسی کے تحت جو انتظامات کو پیش نظر رکھا جائے تو کسندرجہ حاشیہ تعداد جمعیت قطعاً ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے جس غیر معمولی انہماک اور غیر متزلزل وفاداری سے حالات پر قابو رکھا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔

یہاں یہ واضح کردینا بھی دلچسپی کا باعث ہوگا کہ دراصل قیام امن و انسداد جرائم اور نگرانی امور سیاسی کے لئے ہی اس سررشتہ کو وضع کرنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ اسلامی تاریخ سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ ان ہی اغراض کے تحت اس کی داغ بیل خلفائے بنی امیہ کے عہد حکومت میں پڑی اور اس کا

	تعداد	عہدہ داران	جوانان
عام پولس	۲۵۹۱	۴۴	[illegible]
سواران	۵۰	۲	۴۸
خفیہ پولس	۳۰	۲	۲۸
ہراول	۳۲۵	۵۸	۲۶۷
عرب	۱۰۰	۱۰	۹۰
جملہ تعداد جمعیت	۳۰۹۶	۱۰۶	۲۹۹۰

اعلیٰ عہدہ دار شرطہ کے لقب سے ملقب تھا۔ ہندوستان میں عہد قطب شاہیہ میں اور سلاطین مغلیہ کے دور حکومت میں یہ عہدہ کوتوال کے نام سے موسوم تھا اور سلطنت آصفیہ میں ابتداءً شحنہ اور مہوتہ کے نام سے موسوم تھا لیکن اعلیٰ حضرت ناصر الدولہ بہادر غفران منزل آصف جاہ چہارم کے زمانۂ فرمانروائی میں یہ عہدہ کوتوال کے نام سے موسوم ہو گیا جو تقریباً ایک صدی گزرنے کے بعد بھی اسی لقب سے ملقب ہے۔

اصلاحات

جناب سلطان یار جنگ نے اس اہم خدمت کا جائزہ حاصل فرماتے ہی سب سے پہلے انسداد جرائم اور اصلاح دفتر کی طرف خاص توجہ مبذول فرمائی۔ چنانچہ جرائم کا صیغہ بہ نسبت اپنی نگرانی میں رکھا جس پر نہایت سختی سے نگرانی کراتے تھے۔ حراست جائز سے فرار ہونے کے جرائم میں جو محض محافظین کی غفلت اور عہدہ داروں کی عدم نگرانی کے باعث وقوع میں آتے تھے نہ صرف ان ملازمین پولس کی نسبت جن کی غفلت اور لاپروائی سے ملزمین کو فرار ہونے کے مواقع ملتے تھے ...... سخت سزائیں دیں بلکہ ان کے بالادست عہدہ داروں سے بھی بازپرس کر کے سختی کے ساتھ متنبہ فرمایا جس کی وجہ سے محافظین اپنے فرائض کو نہایت مستعدی کے ساتھ انجام دینے لگے اور عہدہ دار بھی نگرانی سے غافل نہیں رہے۔

صدر محکمۂ کوتوالی بلدہ میں صیغہ حساب محض برائے نام تھا۔ دفتری کارروائیوں کا بالکلیہ تعلق صیغہ انشاء سے تھا۔ چونکہ صیغہ انشاء کے اہلکار حساب سے واقف نہیں ہوتے تھے اس لئے تقریباً ہر کارروائی میں صیغہ حساب سے مشورہ اور کیفیت طلب کرنی پڑتی تھی اور اس کے بعد کوتوالی بلدہ کی پیشی سے منظوری حاصل کی جاتی تھی۔ ان حالات میں کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ صیغہ حساب کا منشاء کچھ اور ہوتا تھا اور صیغۂ انشاء سے کارروائی کچھ اور رخ پر ہوتی تھی۔ بہرحال یہ ایک طول عمل ہونے کے علاوہ تضییع اوقات کا باعث بھی تھا جس کی وجہ سے کارروائیوں میں پیچیدگیاں

اور خرابیاں پیدا ہو جاتی تھیں اس لئے آپ نے صیغہ حساب میں ہی صیغۂ انشاء (کلیات حساب) قائم کر کے صیغہ حساب سے متعلقہ تمام کارروائیوں کا تعلق محاسبی سے کر دیا اور محاسب کو ملاحظت اپنی گزارشات پیش کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ اس انتظام سے اکثر دفتری نقائص دور ہو کر کارروائیاں جلد از جلد تصفیہ پانے لگیں۔

بہرحال ان کا وجود پولس بلدہ کی اصلاح کے لئے غیر معمولی طور پر مفید ثابت ہوا۔ ان کی انتظامی قابلیت کا بلاقید ملت ہر طبقہ مداح تھا۔ ان کی پالیسی بالکل صلح کل رہی۔ ان کے یہی وہ سیاسی اور سماجی اصول تھے جو ایک طرف سرکار رحمت مدار کی خوشنودی کا باعث ہوئے تو دوسری طرف سرکار عظمت مدار کی جانب سے صدائے استحسان سنائی دیتی رہی۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

چنانچہ بزمانۂ تشریف آوری گورنر مدراس جملہ انتظامات پولس کو ملاحظہ کر کے صاحب عالیشان آنریبل مسٹر بیکلی رزیڈنٹ بہادر (۲۵ رفروری ۱۹۰۵ء تا ۱۵ رمارچ ۱۹۰۷ء) نے شہریار دکن کی خدمت میں بذریعہ مکتوب حسب ذیل اظہار فرمایا۔

" After long experience of many, native states, I have never seen arrangements more carefully thought and smoothed "

ترجمہ: متعدد دیسی ریاستوں کے وسیع تجربہ کی بناء پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایسے انتظامات جو نہایت احتیاط اور عمدگی سے کئے گئے تھے میں نے کہیں نہیں دیکھے۔

صاحب عالیشان کے اس مکتوب کے جواب میں اعلیٰحضرت بندگان عالی نے شکریہ ادا فرما کر اس کی نقل نواب سلطان یار جنگ کو مرحمت فرمائی۔

قیامت صغریٰ طغیانی رود موسیٰ — غرّہ رمضان ۱۳۲۶ھ

مطابق ۲۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء دوشنبہ کا دن حیدرآباد کی تاریخ میں موجودہ اور آئندہ نسلوں کے واسطے ہمیشہ کے لیے یادگار رہیگا۔ وقت بھی عجیب تھا کہ مسلسل (۳۶) گھنٹہ کی، آتش بارش شہر حیدرآباد کے لیے نمونہ قیامت بن کر آئی۔ رود موسیٰ کی بلاخیز طغیانی اور سیلاب ایک ایسا جگر خراش اور دلگداز واقعہ ہے کہ جس کو نہ کبھی آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سنا بندگان خدا کو جن المناک دشواریوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوا ہے ان کے بیان کرنے سے زبان قلم قاصر ہے۔ کچھ عجیب طرح کی بے بسی اور بیکسی کا عالم تھا۔ جدہر دیکھو آسمان اور پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا! عفیفہ و پاکدامن بیبیاں جنھوں نے اپنے مکان کی دہلیز تک نہ دیکھی تھی سڑکوں پر غیر محرم لوگوں کے سامنے بحالت پریشانی دوڑی دوڑی پھرتی تھیں۔ غرضکہ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی ہر شخص کو اپنی ہی جان کے لالے پڑے تھے۔ سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں مردے مثل مرغابیوں کے بہتے ہوئے جارہے تھے۔ جو لوگ چھپروں، چھتوں اور درختوں پر زندہ بیٹھے نظر آرہے تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے آپس میں ٹکرا کر موت کے گھاٹ اتر رہے تھے۔ ایسے نازک موقع پر جن بہادر دلوں نے اپنی جان پر کھیل کر (نواب سلطان یاور جنگ اور چند دیگر حضرات) دوسروں کی جانوں کو یعنی بہت سارے ڈوبتے ہوئے اور بہتے ہوئے آدمیوں کو کمال رحم دلی اور ہمدردی سے نکالا اور اپنی مردانگی و جوانمردی کا عملی ثبوت دیا ان کے کارنامے اس قابل ہیں کہ تاریخ کے صفحات میں جلی اور سنہری حروف میں لکھے جائیں تاکہ آنے والی نسلوں کے لیے پیغام عمل ثابت ہوں اور خود انھیں بقائے دوام ملے۔ ایسے چند حضرات کی قابل قدر خدمات کے اعتراف میں اعلیٰحضرت بندگان عالی متعالی خلد اللہ ملکہٗ نے حسب ذیل فرمان واجب الاذعان صادر شدہ بتاریخ ۲ر ذی قعدہ ۱۳۲۶ھ کے ذریعہ اپنی خوشنودی کا اظہار فرماتے ہوئے حکومت کی جانب سے شکریہ ادا فرمایا۔

"رود موسیٰ کی طغیانی کے وقت میں جن صاحبوں نے اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے خلایق کی جانیں بچانے کی کوشش کی ان کی کارگزاری کی رپورٹیں آپ کی (مدارالمہام) یادداشت معروضہ ۲۹ر شوال المکرم ۱۳۲۶ھ کے ساتھ ملاحظہ کی گئیں۔ انھوں نے انسانی ہمدردی جو کی ہے اس کی میں بہت قدر کرتا ہوں۔ ان کو میری خوشنودی کی اطلاع دیکر آپ میری گورنمنٹ کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کریں۔ یہ رپورٹیں رزیڈنٹ صاحب کے پاس ان کے حسب الطلب بھیجی جاسکتی ہیں" یہ

حسب فرمان واجب الاذعان خداوندی مندرجۂ ذیل صاحبوں کی انسانی ہمدردی کی نسبت بندگان حضرت کا اظہار قدردانی و خوشنودی اور حضور اقدس کی گورنمنٹ کی جانب سے ان کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔

۱۔ کرنل نواب افسر الملک کے، سی، آئی، ای، یم، وی، او، اے ڈی، سی بندگان حضرت۔
۲۔ نواب ناصر نواز الدولہ اے، ڈی، سی بندگان حضرت۔
۳۔ نواب افضل نواز جنگ۔
۴۔ مولوی محمد فاضل غلام حسین مہراج معتمد تعمیرات عامہ و صفائی۔
۵۔ نواب سلطان یاور جنگ کوتوال اندرون و بیرون بلدہ۔
۶۔ مسٹر جی یم دارنر مہتمم صفائی چادر گھاٹ۔
۷۔ لفٹننٹ ایچ بیلی علاقہ توپخانہ افواج باقاعدہ سرکار عالی۔
۸۔ لفٹننٹ قادر بیگ فرسٹ لانسرز حیدرآباد امپیریل سروس ٹروپس۔
۹۔ لفٹننٹ جے گارڈنر وٹرنری سرجن افواج باقاعدہ سرکار عالی۔

(ملاحظہ ہو بہار و خزاں حیدرآباد صفحہ ۱۲۹ و ۱۳۰ مصنفہ سید محمد حسین صاحب الطبیؔ)

غرض ایسے نازک وقت میں نواب سلطان یاور جنگ نے جس محنت و مشقت اور لیاقت و قابلیت سے اپنے مفوضہ فرائض کو

سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ رود موسیٰ سے ایک سکنڈ میں ۴۲۵۰۰۰ ہزار مکعب فیٹ پانی گزرتا تھا اور تقریباً ۲۰ ہزار مکانات نذر سیلاب ہوئے۔

علاوہ کامل انسانی ہمدردی کو کام میں لایا وہ بے شبہ قابل تحسین اور لائق آفرین ہے۔ طغیانی فرد ہونے کے بعد انھوں نے طغیانی زدہ مقامات کو حاجی محمد حمید اللہ خاں المخاطب بہ نواب سربلند جنگ میر مجلس عدالت العالیہ اور مولوی سید ہمایوں مرزا بیرسٹر کی ہمراہی میں بچشم خود ملاحظہ فرمایا اور نہایت بیدار مغزی سے نگرانی کرکے بے خانماؤں کی نہ صرف تشفی اور دلجوئی کی بلکہ جہاں کھانا وغیرہ تقسیم ہوتا تھا ان مقامات پر بذات خود تشریف لے جاکر تقسیم طعام کی نگرانی بھی کی ان فرائض کو صرف ملازمت سرکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی نیکی اور ہمدردی، خداترسی اور رحم دلی کی وجہ سے پابندی کے ساتھ مسلسل ادا کرتے رہے بہرحال خداترسی اور خدمت گزاری مصیبت زدگاں میں انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جس کا ثبوت اس وقت کے اخبارات مشیر دکن حیدرآباد اور مخبر دکن مدراس کے مطالعہ سے بخوبی ملتا ہے۔

سرفرازیاں

۱۔ ۱۲ رجب المرجب ۱۳۱۷ھ ۱۸۹۹ء کو جو تہنیت جشن سالگرہ مبارک کی مسعود تقریب کے موقع پر حضرت ظل سبحانی غفران مکان نے بمراحم خسروانہ ان کو خطاب خانی • بہادری سے ممتاز و سرفراز فرمایا۔

۲۔ یکم ذی قعدہ ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء کو تبقریب دربار جشن جہل سالہ اعلیحضرت آصفجاہ سادس غفران مکان "سلطان یار جنگ" خطاب سے سرفراز ہوئے۔

۳۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں ہز مجسٹی کنگ جارج پنجم بہ حیثیت پرنس آف ویلز (ولیعہد انگلستان) مع شاہزادی وکٹوریا میری پرنسس آف ویلز رونق افروز بلدہ حیدرآباد ہوئے۔ اس موقع پر پولیس کے بہترین انتظامات سے خوش ہوکر شاہزادہ ممدوح نے بوساطت شہریار دکن ایک ٹائی پن (Tie Pin) کے تحفہ سے نواب صاحب کو سرفراز فرمایا۔

۴۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ م ۱۷ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ہز امپیریل کراؤن پرنس آف جرمنی بلدہ حیدرآباد تشریف لائے۔ شاہزادہ موصوف کی تشریف آوری کے سلسلے میں اکثر انتظامات نواب صاحب ہی سے متعلق تھے جن کو انھوں نے نہایت سلیقہ اور دیانت سے انجام دیا۔ بوقت روانگی شاہزادۂ موصوف نے بھی حسن کارگزاری کے صلہ میں نواب صاحب کو ایک ٹائی پن کے تحفہ سے سرفراز فرمایا۔

راقم الحروف نے ان تحفوں کو بچشم خود دیکھا ہے۔ ان کی شکل تاج برطانیہ سے مشابہ ہے۔ قیمتی نگینے ان میں جڑے ہوئے ہیں۔ شاہوں کے عطیے ہیں اس لئے ان کی تعریف ہی غیر ضروری ہے۔

۵۔ لارڈ منٹو وائسرائے و گورنر جنرل ہند اور سر آرتھر لالی گورنر مدراس نے بھی اپنے درود بلدہ حیدرآباد کے زمانے میں بطور یادگار اپنی تصاویر نواب صاحب کو مرحمت فرمائیں۔

یہ تمام قابل قدر تحائف نواب صاحب کے خلف اکبر مولوی میر غضنفر علی صاحب وظیفہ یاب نائب کوتوال بلدہ کے پاس باحتیاط تمام محفوظ ہیں جن کو دیکھنے کا راقم کو بھی موقع ملا ہے۔

سیرت

نواب سلطان یار جنگ نہایت وجیہہ اور شکیل، شیریں کلام اور حاضر جواب، صاحب ارادہ اور باہمت، مستقل مزاج اور ہمدرد، خلیق اور ذی مروت، منتظم اور مدبر، ذہین اور نکتہ رس، غیور اور خوددار، سادہ لباس اور سادگی پسند، شریف اور رحم دل، مستعد اور کارفرما، ہردلعزیز اور صلح پسند، ملک و مالک کے بہی خواہ اور سچے جاں نثار عہدہ دار تھے۔ نواب صاحب چونکہ خود ایک پکے سپاہی تھے اس لئے فنون سپاہ گری سے خاص دلچسپی تھی۔ مردانہ کھیلوں اور کرتبوں کا بھی بہت شوق تھا اور اکثر ایسے افراد کی سرپرستی فرمایا کرتے تھے۔ غیرت اور حمیت ان کی فطرت میں تھی۔ قدیم روایات کے حامل اور وضعداری کے بہت پابند تھے۔ مسلسل کلام کرنے سے ہرگز نہیں تھکتے تھے۔ نواب صاحب گو خود تو شاعر نہیں تھے۔ مگر شعر و سخن سے دلچسپی ضرور تھی۔ اردو علم و ادب کے شائق اور دلدادہ تھے۔ خیرات و مبرات اور مہمان نوازی کی صفت بھی ان کی ذات میں موجود تھی۔ باوجودیکہ انتظامی

خدمت کے ایک بلند پایہ عہدہ پر سرفراز تھے لیکن طبیعت میں کسی قسم کا تفوق اور تکلف نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک کمترین مخلوق تصور فرماتے تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند اور بزرگان دین کی زیارت کا خاص ذوق تھا۔ حضرت شاہ آغا داؤد صاحب قبلہ المتخلص بہ صحو رحمتہ اللہ علیہ کے سچے معتقد اور مرید تھے۔ اہل کمال سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ ملتے تھے۔ عام طور پر ماتحتین کے ساتھ ان کا برتاؤ نہایت شریفانہ اور مہذب تھا لیکن اگر کبھی کسی ماتحت پر باغراض انتظامی خفگی اور غصہ کا اظہار ہوتا تو بہت جلد اس کی تلافی کی فکر میں لگے رہتے۔

مختصر یہ کہ ان کی ہمہ جہتی قابلیت کا ہر شخص مداح و ثناخواں تھا۔ ان کو انتقال کئے ہوئے تقریباً چھ سال ہوتے ہیں آج بھی اکثر واقف کار لوگ نواب مرحوم کے اخلاق کی تعریف ہی کیا کرتے ہیں۔ بقول شعر

انھیں کہتا ہے مردہ کون وہ زندوں کے زندہ ہیں
کہ جن کی خوبیاں زندہ ہیں جن کی نیکیاں باقی

سبکدوشی خدمت و وفات

مسلسل (۴۸) سال دولت آصفیہ کی سلک ملازمت میں مشرف رہے۔ ازاں جملہ عہدہ کوتوالی پر ۱۳۱۵ف سے ۲۰ تیر ۱۳۲۱ف تک (۷) سال (۱ ماہ (۱۶) یوم نہایت کامیابی اور امانت و دیانت کے ساتھ کوتوال بلدہ و بیرون کے اہم فرائض کو بجالانے کے بعد خان بہادر عبدالکریم صاحب عرف لال خاں صاحب کو اپنی خدمت کا جائزہ دیکر بتاریخ ۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۰ھ م ۲۰ تیر ۱۳۲۱ف کو وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ بلحاظ مدت ملازمت ان کے لئے سرکار عالی کی جانب سے (۵۳۲) پانچسو بتیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا تھا۔

وظیفہ حاصل کرنے کے بعد نواب صاحب نے بالکل گوشہ نشینی اختیار فرمائی تھی۔ آخر وقت تک کسی نے ان کو گھر سے باہر نکلتے نہیں دیکھا۔ ان کے بہترین اوقات اکثر مطالعہ کتب، عبادت اور بندگان خدا کی خدمت میں گزرتے تھے۔ آخر کار (۹۲) بیانوے سال کی عمر میں بعارضہ فساد معدہ و بخار چند روز مبتلا رہ کر بتاریخ ۲۵ ربیع الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ م ۸ امرداد سنہ ۱۳۴۵ف روز چہارشنبہ اس دار فانی سے رحلت کی۔ مزار اندرون احاطہ درگاہ حضرت آغا داؤد صاحب قبلہؒ بجنوب رویہ واقع ہے۔ افسوس کہ کوئی کتبہ وغیرہ نصب نہیں ہے۔

اولاد

نواب سلطان یاور جنگ مرحوم کے پانچ صاحبزادے اور دس صاحبزادیاں ہوئیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

۱۔ میر غضنفر علی۔ ۲۔ میر ریاست علی۔ ۳۔ میر یوسف علی ۴۔ میر سید علی۔ ۵۔ میر خورشید علی۔ ان میں سے جملہ خلف دوم مولوی میر ریاست علی مہتمم گروڑگیری کا انتقال ہو چکا باقی بقید حیات ہیں۔ نواب مرحوم کے خلف اکبر و ارشد مولوی میر غضنفر علی صاحب وظیفہ یاب نائب کوتوال بلدہ کی عمر اس وقت ۶۰ سال کے قریب ہے۔ اور اپنے ذاتی مکان واقع تاڑبن میں سکونت پذیر ہیں۔ صورت ظاہری اور سیرت باطنی میں ہر طرح سے لائق و فائق ہیں۔ حلم و متانت چہرہ سے ظاہر ہے۔ اخلاق و مروت اور سیرت و کردار میں اپنے پدر بزرگوار کے حقیقی جانشین اور خاندانی روایات کے پابند ہیں۔ ملک و مالک سے عقیدت اور وفاداری ان کے موروثی جوہر ہیں۔ مذہبی لگاؤ بھی ہے۔ حضرت شاہ آغا داؤد صاحب قبلہؒ سے بیعت حاصل ہے۔ ہالی مہینے کی ہر چھٹی تاریخ کی نیاز شریف بڑی احتیاط اور پابندی سے ایک مقررہ نظام العمل کے تحت ادا کرتے ہیں چنانچہ خاکسار کو بھی اس میں شرکت کا موقع ملا ہے۔

نواب سلطان یاور جنگ کی صاحبزادیوں کی تفصیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

۱۔ محل اولیٰ مولوی میر محبوب علی صاحب وظیفہ یاب مددگار صدر محکمہ کوتوالی بلدہ جن کے بطن سے مولوی میر سعادت علی صاحب موجودہ مددگار کوتوال بلدہ ہیں (۲) محل ثانی مولوی میر محبوب علی صاحب مددگار کوتوال بلدہ (۳) محل مولوی علی احمد خاں صاحب منصبدار خلف مولوی علی رضا خاں صاحب

رکن مجلس عدالت العالیہ (۴) محل مولوی ہادی حسین صاحب منصبدار (۵) محل مولوی میر کوثر علی صاحب صیغہ دار دفتر معتمدی فینانس (۶) محل مولوی میر سعادت علی صاحب منصبدار صرف خاص مبارک و سب انسپکٹر پولیس اضلاع (۷) محل کرنل سید بخش ابوطالب صاحب ناظم جمعیت صرف خاص مبارک (۸) محل مولوی محبوب الدین صاحب تحصیلدار سرکار عالی (۹) محل مولوی معین الدین خان صاحب جاگیردار خلف مولوی احمد علی خان صاحب مددگار دفتر نظامت جمعیت صرف خاص مبارک (۱۰) محل مولوی فخر الدین صاحب سرکل انسپکٹر پولیس اضلاع حال [illegible]۔

یہ مختصر مضمون نواب سلطان یاور جنگ مرحوم کی حیات کا ایک سرسری خاکہ ہے۔ انشاء اللہ اگر وقت ساتھ دے تو نواب صاحب مرحوم کے تفصیلی واقعات زندگی بھی ایک کتابی صورت میں شائع کئے جائیں گے جس میں آپ کے آباواجداد اور اولاد کے تفصیلی حالات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

سید مراد علی طالع

بقیہ صفحہ (۲۴)

یوسف۔ کیا میں اپنا دل اور جگر کاٹنے والا ہوں۔

فرید۔ نہیں تو کیا میرا کاٹنے کا ارادہ ہے۔

یوسف۔ (قہقہہ لگاتے) آہاہاہا۔ ہاہاہا۔ ارے ارے آہاہاہا۔ خدا رحم کرے۔ ہاہاہا۔ شاباش۔ خوب۔

فرید۔ یہ ہنسی کا کونسا موقع ہے۔ اب کپڑے پھاڑ لوگے۔

یوسف۔ (ہنسی ضبط کرکے) ہاہاہا... ارے بنجر دماغ پروفیسر لال۔ مگر میرے بکروں کے نام نہیں سمجھے؟

فرید۔ بکروں کے نام ہیں!

یوسف۔ جی میرے سرکار۔

فرید۔ یہ تم نے پہلے ہی کیوں نہ بتایا!

یوسف۔ کئی بار ذکر کر چکا مگر دماغ ٹھکانے ہوتا تو یاد بھی رہے۔

فرید۔ یہ میری غلطی سہی لیکن تمہارے والد کے پاگل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

یوسف۔ اچھا!

فرید۔ جی ہاں انکا خیال ہے کہ میں ان کا خالق ہوں۔

یوسف۔ ٹھیک تو ہے۔

فرید۔ کیا خاک ٹھیک ہے ایک بندے کو اپنا خالق بنانا پاگل پن نہیں تو کیا ہے۔

یوسف۔ اب کیا کہوں یار تمہیں۔ ارے بھلے مانس وہ مجھے خالق کہتے ہیں۔

فرید۔ مگر تمہارا نام تو یوسف ہے نا؟

یوسف۔ ہاں۔ لیکن خالق میرا تخلص ہے۔

فرید۔ اچھا جی! آپ شاعر بھی ہیں۔ مگر کب سے!

یوسف۔ تھوڑا عرصہ ہوا ایک مشاعرے میں چلتی ہوئی غزل کہہ دی تھی لوگ پھڑک اٹھے۔ والد صاحب بھی بہت خوش ہوئے چنانچہ اس وقت سے وہ مجھے تخلص سے مخاطب کرتے ہیں۔

فرید۔ لاحول ولا قوۃ۔ زبردست غلط فہمی ہوئی مگر جناب میرا دعویٰ ہے آپ کی والدہ ضرور پاگل ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے میری والدہ کو گالیاں دیں۔

یوسف۔ عقل کو قربان جانے کو جی چاہتا ہے میرے حضور یہی تو پاگل پن ہے۔

فرید۔ نہیں نہیں۔ وہ میری والدہ کو......

یوسف۔ سنو۔ وہ شاید ماں کہہ رہی تھیں؟

فرید۔ ہاں ہاں۔

یوسف۔ وہ ماں نہیں ہے۔ بالکل ہما ہے چونکہ ان کے دانت نہیں اس لئے آواز ہما کی بجائے ماں نکلتی ہے۔

فرید۔ یہ ہما کیا چیز تھی۔

یوسف۔ یہ وہی لڑکی ہے جو آپ سے منسوب کی گئی۔

فرید۔ توبہ۔ غلط فہمی کی حد ہو گئی۔

یوسف۔ دوسروں کو پاگل کہنے والا خود پاگل بنا۔ ہاہاہا۔

فرید۔ بھیا۔ یوسف زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ پہلے میں آپ لوگوں کو اپنے قابل نہیں سمجھتا تھا لیکن میں خود ناقابل نکلا میں گھر جانا چاہتا ہوں۔

یوسف۔ ارر۔ پھر وہی پاگل پن۔

فرید۔ میرے تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا جانے غصہ میں کیا کیا بک گیا میں آپ کے والدین کو صورت دکھانے کے لائق نہیں بھیا مجھے جانے دو۔

یوسف۔ تم اور پاگل بن رہے ہو۔ تم چلو تو سہی جس دم ان کو آپ کی غلط فہمی کا یقین ہو جائے گا وہ اپنے داماد کے کارنامے پر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ نہ ہو جائیں تو میرا ذمہ...... چلو سوچ بچار سے فائدہ نہیں۔

فرید۔ اچھا چلو۔ مگر یار بندے کی تو اس وقت یہ حالت ہے کہ جسم میں کاٹو تو خون نہ نکلے۔

یوسف۔ (ہنس کر) ایسا ہونا ہی ہے۔ میرے دوست چلو

(دونوں کے جانے کی آواز...... ساز فیڈ آوٹ)

طلاوت یداللّٰہی حیدرآبادی

ہم تم

جس کنارے سے جائیں گے ہم تم — ایک طوفاں اٹھائیں گے ہم تم

جتنا دامن بچائیں گے ہم تم — اور نزدیک آئیں گے ہم تم

حدِ برق و شرار سے باہر — اک نشیمن بنائیں گے ہم تم

اب گل و یاسمن کے قدموں پر — بجلیوں کو جھکائیں گے ہم تم

چھوڑ کر کارواں کو منزل پر — اور کچھ دور جائیں گے ہم تم

حرم و دیر کے دوراہے سے — قدم آگے بڑھائیں گے ہم تم

فتنۂ فکر و ہوش سے کچھ دور — ایک محفل سجائیں گے ہم تم

زہر جن میں بھرا ہو صدیوں کا — وہ سبو توڑ جائیں گے ہم تم

وقت کی ظلمتوں کے سازوں پر — گیت صبحوں کے گائیں گے ہم تم

آنسوؤں سے جو آگ دہکے گی — قہقہوں سے بجھائیں گے ہم تم

جتنے آنسو بہائیں گے ہم تم
اور بھی مسکرائیں گے ہم تم

آشور (علیگ)

میری مرغیاں

خدا جانے کیوں بیٹھے بٹھائے مجھے خیال آگیا کہ مرغیاں پالی جائیں۔ کٹ کٹ کرتی ادھر ادھر پھریں گی۔ آنگن بھرا بھرا لگے گا اور رونق آجائے گی۔ ادھر میرے جی میں بات آئی ادھر میں نے اعلان کر دیا کہ اب اس گھر میں مرغیاں پلیں گی۔ سب تو یونہی ہنسنے لگے کہ ابھی شوق ہو تو کوئی ڈھنگ کا ہو۔ یہ کیا تم مرغیاں پالنے چلی ہو، ہٹاؤ اسے۔ اور دادی اماں نے تو کہہ دیا کہ مرغیاں ہمارے ہاں پل ہی نہیں سکتیں۔ بس جب دیکھو تب دادی اماں کے ہاں یہی عذر موجود ہوتا ہے کہ یہ نہ کرو "راس" نہیں اور وہ نہ کرو "راس" نہیں۔ خدا جانے یہ بھی کیوں نہیں کہتیں کہ چلو زندگی ختم کر دو۔ یہ بھی "راس" نہیں۔ اب لگیں واقعات گنوانے۔ راشد نے ایک دفعہ ننھے میاں کی پیدائش سے پہلے دس بارہ مرغیاں پالی تھیں۔ وبا آئی ساری مر گئیں۔ شمسہ نے گاؤں میں سو سے زیادہ پول پال رکھی تھی۔ ایک سے ایک مرغی خوبصورت اور بانکی۔ مگر وہ ساری یا تو چوری ہو گئیں یا مر گئیں۔ اب بھلا پھر یہ جھنجھٹ کون مول لے۔ محنت اکارت جائے تو خواہ مخواہ دکھ ہو۔ مجھے سن کر غصہ ہی آگیا۔ محض اتفاق کی بات ہے کہ مرغیاں مر گئی ہوں گی۔ چلو انھوں نے قاعدہ کلیہ بنا لیا۔ میں تو پال کر ہی رہوں گی۔ ضرور پالوں گی۔ کب تک یونہی اوروں کی لاٹھی پکڑ کے راستہ ٹٹولوں۔ کچھ اپنی ہمت پر بھی بھروسہ ہونا چاہیے۔ زندگی تجربات کا نام ہے۔ اور ان تجربوں کی ابتدا یہیں سے سہی۔

خیر ارادہ تو میں نے کر لیا۔ یوں بھی ارادہ کرنا ہمارا کام ہے۔ خدا اسے پورا کر ہی دیتا ہے۔ منگل کے دن میں نے بندو کو منگل ہاٹ بھیجا۔ اور دو مرغیاں منگوائیں۔ ابتدا چھوٹے پیمانے پر کرنی مناسب معلوم ہوئی۔ یہ مرغیاں بھی شاید جنگ لڑنے جا رہی ہیں تب ہی تو اتنی مہنگی ہو گئی ہیں۔ بندو مرغیوں کی قیمت دیکھ کر ہاٹ سے دو ننھے منے چوزے لیتا آیا۔ دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ مجھے بڑا برا لگا۔ مگر میں کب ہار ماننے والی ہوں۔ میں نے بھی اطمینان اور مصنوعی خوشی ظاہر کرتے ہوئے کہا، اچھا ہوا کہ چوزے آگئے۔ بہت جلد پل جائیں گے۔ اور اگر دیکھ بھال کر پالوں گی تو دو چار دن میں بڑے ہو جائیں گے۔ بڑے پیار سے میں نے انھیں دانا کھلایا۔ نو گرفتار گھبرائے گھبرائے ادھر ادھر دوڑے دوڑے پھرتے۔ ماں کی پنکھ سے کتنی جلدی جدا ہو گئے تھے۔ قسمت انھیں کہاں کہاں کھینچ لائی۔ یہاں زمین آسمان سب ان کے لئے نئے تھے۔ اس لئے سہمے سہمے پھرتے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن سسرال آئی ہو اور ذرا سی آہٹ سے چونک جائے۔ اسی طرح پات کے کھڑکے سے اچک جاتے۔ مگر پیار میں وہ قوت ہے کہ جانور بھی پرچ جاتے ہیں۔ میں انھیں گود میں اٹھا لیتی، سینہ سے لگاتی، پیار کرتی اور ان کے دانے کا خیال رکھتی۔ وحشت رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ گھر سے مانوس ہونے لگے۔ جونہی میں قیمہ کی گولیاں بنا کر آواز دیتی دونوں دوڑے آتے۔ پر پھڑپھڑاتے۔ اپنی گردن لمبی نکال نکال کر اپنی گول گول آنکھوں سے دیکھتے جن میں اب اجنبیت نہیں تھی۔ میں انھیں وہ سب کچھ دے رہی تھی جو ایک انسان حیوان کو دے سکتا ہے۔ اس کے بدلے شاید ان کے پاس گونگی محبت تھی۔

دن گزرتے گئے۔ اللہ آمین سے دونوں پلتے رہے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں اس حاسد آسمان کی نظر نہ لگ جائے۔ اس لئے میں دعائیں مانگتی کہ یہ ہر شر سے محفوظ رہیں۔ اور ایک سے اکیس ہو جائیں۔ دیکھتے دیکھتے دونوں نے پر پرزے نکالے۔ چوزے پن کا دور سلامتی سے ختم ہو گیا۔ اب مرادوں کے دن تھے۔ ایک مرغا بنا، ایک مرغی۔ مرغا کیسے سینہ پھلائے بازو پھیلائے اکڑا اکڑا پھرتا۔ اور مرغی ڈری سہمی اس کے ساتھ ساتھ ہوتی۔ اب دانا کھاتے میں دونوں کی لڑائی نہ ہوتی۔ مرغی دانا چگتی اور مرغا فخریہ انداز سے

سینہ تانے کھڑا رہتا۔ کیوں نہ ہو آخر میرا مرغا تھا۔ سوسائٹی
کے سارے قوانین سے واقف۔ اب یہ اور بات ہے کہ میں
فدا بھی تہذیب والی نہیں۔

پہلے پہل ہمارے گھر کا بڑا بڑا کودتا پھاندتا رہا۔
غراتا رہا۔ محبت میں شرکت کسی کو گوارا نہیں۔ مگر میں نے بھی
خوب سمجھا دیا کہ بھائی ہمارے گھر میں تمھارا گزر اسی وقت
تک اچھی طرح ہو سکتا ہے کہ تم سمجھوتا اختیار کرو۔ میری مرغیوں
کے آگے آنکھیں نہ چمکاؤ۔ اگر اچھا سلوک چاہتے ہو تو ان سے
دب کے رہو۔ میں انھیں چاہنے لگی ہوں تم بھی انھیں چاہا کرو۔
بس پھر میں تم سے خوش رہوں گی۔ تمھارے معمول میں فرق
نہ پڑے گا۔ ہمارا بڑا بھی بات پہچانتا ہے۔ موقع محل جانتا ہے۔
اس نے بھی اپنی بھلائی سوچی اور سمجھوتا کرنا ہی بہتر سمجھا۔ بس
اب کیا تھا۔

تھوڑے دن یونہی گزرے۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ ایک
مرغا مرغی تو لنڈورے سے لگتے ہیں۔ ایک اور جوڑا لینا چاہیے۔
ہمارے ایک بھائی گاؤں جا رہے تھے انھیں میرے شوق کا
حال معلوم تھا۔ اس لئے آتے وقت میرے لئے وہ ایک جوڑا مرغ
کا لیتے آئے۔ مرغا تو خوب اونچا تڑنگا تھا اور مرغی بھی خاصی موٹی
تازی تھی۔ دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔ چلو دو سے چار ہوئے رونق
دوبالا ہو گئی۔ مگر لیجئے میرا وہ چین آرام عنقا ہو گیا۔ اب
رقابت کی پرچھائیاں اچھی پرسکون زندگی پر منڈلانے لگیں۔
ابھی تک وہی تھے ہیں تجھ سے خوش تو مجھ سے راضی۔ مگر اب
آنگن کی بادشاہی کے دو دعویدار ہو گئے۔ پہلے والا اپنی قدامت
کا رعب جماتا اور نیا مرغا اپنی قوت بازو پر اکڑتا۔ دونوں میں
لڑائیاں ہونے لگیں۔ دو دو چونچیں ہر وقت ہوتی رہتیں۔
میں حیران کہ آخر کیا کروں۔ دل کو روؤں کہ جگر کو پیٹوں
لاکھ سمجھاتی ہوں، پر کوئی مانتا ہی نہیں۔ ایک اکڑ کر بانگ دیتا
تو دوسرا پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے محلے کے اس سرے
تک خبر کر دیتا ہے کہ دیکھو یہاں ہم ہیں ایک "جواں مرغ"
ہمیشہ گردن پھولی رہتی اور چونچیں تیز۔ دو مرغوں میں تکرار۔
میں کبھی اسے بہلاؤں کبھی اسے پھسلاؤں۔ بھئی تم دونوں میں
سے ایک ہی دل بڑا کرے۔ وہ نیا نیا آیا ہے۔ طور طریق کیا
جانے تو چھوٹا ہے چپ رہ جا وہ آپ ہی سمجھ جائے گا۔ اسے
کہتی ہوں کہ بھئی دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کیا۔ تو بڑا ہے
شفقت کو شیوہ بنا درگزر سے کام لے۔

ادھر مرغیوں میں بھی جھگڑا ہونے لگا۔ خربوزہ کو دیکھ کر
خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اب ان دونوں میں جو چشمک شروع
ہوئی تو جینا دوبھر ہو گیا۔ اچھی خاصی نند بھاوج کی لڑائی تھی۔
اس کی بات پر وہ ناک بھوں چڑھائے، اس کی چال پر الگ
بیر اترائے۔ میں بہتیرا کہوں کہ بھئی تو پرانی ہے گھر کی بیٹی ہے
تو ہی غم کھالے۔ چار روز میں بہو کو آپ ہی سمجھ آجائے گی۔ اس
سے ہزار کہوں کہ تو بہو آخر بہو ٹھیری۔ گھر بار تیرا، مگر گھر کی
بیٹی سے لاگ ڈانٹ کیسی۔ اس سے نیک سلوک کرنا۔ گود پھیلا
کے دعا دے گی تو جنم جنم تمھاری نسل پھلتی پھولتی رہے گی۔
مگر قسم لے لو جو ان کے کان پر جوں بھی چلی ہو۔ دانا کھلاتے
وقت الگ آفت، شام کو ڈربے میں بند کرتے وقت الگ
مصیبت۔ ادھر سارے گھر والے میرے سر ہو گئے کہ بھئی
قصہ ختم کرو اب چھری پھیر دو گردن پر۔ پہلے ہی بچوں
کا شور کیا کم تھا جو تم نے یہ نئی آفت مول لی۔ کان پھٹے جاتے ہیں۔
صحن گندا ہوتا ہے۔ میں اکیلی آخر کس کس کو سمجھاؤں۔
پھر بھی میرا دل گردہ کہ سہے جاتی۔ سال لاکھ چھینٹے اڑائے
سمندر کا کام بردباری ہے۔ سب لاکھ جھنجلاتے مگر میں اپنا
کام کئے جاتی۔ میرے مرغا مرغی تھے میں جان دیتی تھی مگر
کوئی اور کیوں ان کے نخرے سہتا۔ ہر ایک گالیاں دیتا،
کوستا کاٹتا اور یہاں میں سہم سہم جاتی۔ انشان ابھی تھی
بڑا مرغا تو پانچ سیر وزنی ہوگا۔ سارے محلہ میں اس کا
کوئی اور گبرو مشکل سے ملے گا۔ جب دونوں مرغیوں
نے پہلے پہل انڈے دیے تو میں نے سارے گھر والوں
میں تقسیم کئے کہ نظر نہ لگے اور آئندہ جھول میں اور زیادہ
دیں۔

گھر کے اندر تو میں سو سو جتن کرتی۔ مگر گھر کے باہر تو میرا اختیار نہ تھا اور نہ یہ میرے کہنے میں ایسے تھے کہ پردہ بٹھا دیتی۔ مرغوں کی ذات جب تک ادھر ادھر ٹھونگ نہ مارے پنجہ نہ چلائے چین نہیں پڑتا۔ اتفاق سے کسی دن آنگن کا دروازہ کھلا رہ گیا اور کسی کو کیا غرض تھی کہ اس کی طرف دھیان کرتا۔ ادھر بڑا مرغا چہل قدمی کرنے کو باہر نکلا۔ ادھر کوئی لفنگا ادھر سے گزرا۔ خدا جانے کب سے نیت بری تھی۔ اب جو موقعہ ملا۔ مرغا غائب کر دیا۔ جانے قیامت میں کیا منہ دکھائے گا۔ وہ دمڑی دمڑی کو اوقات بیچنے تیار۔ موا اٹھائی گیرا۔ میں بڑبڑاتی رہی مگر وہ تو چمپت ہو گیا تھا۔ خدا جانے کاٹ کے کھا گیا یا چوک میں لے جا کر اونے پونے بیچ ڈالا۔ ان گدھوں کو زعفران کی کیا قدر!

گھر میں بھلا کون مجھ سے ہمدردی کرتا۔ لوگوں کو ہنسنے کا موقعہ ہاتھ لگا۔ کسی کا گھر جلے اور یہ آگ تاپنے پہنچ جائیں۔ دادی اماں نے تو کہہ دیا کہ "میں نہ کہتی تھی مرغیاں مت پال راس نہیں۔ لے اب چکھ مزا۔ جانے کس مفت خورے کے ہتھے چڑھا۔ کاٹ کر کھا لیتے تو چیز ہوتا۔" میں جلی بھنی بیٹھی تھی اب جو گھر والوں نے فقرہ بازی شروع کی ضد آ گئی۔ سب چھیڑنے لگے کہ چلو بھی تم تو گاؤں جا کر رہو مرغیاں پالو انڈے کھاؤ۔ اتفاق کی بات دوسرے دن منگل تھا میں نے اب کی دفعہ دو مرغیاں منگوائیں۔ مرغوں کی لڑائی چکاتے چکاتے تھک گئی تھی۔ مرغیاں لڑیں گی پھر مل جائیں گی۔ لوگ کیا چار چار بیویاں نہیں سنبھال کر رکھتے۔ مرغا بھی ڈانٹ ڈپٹ کر رعب جما کر کسی طرح قابو میں رکھے گا۔

ایک مرغی تو بڑی چست چالاک شوخ و شریر تھی۔ ابھی ادھر ابھی ادھر بجلی کی سی تڑپ تھی۔ دوسری پاؤں پری تھی اور سفید۔ بڑی سنجیدہ اور احساس حسن سے مغرور بھی۔ ایک پاؤں اٹھاتی ایک رکھتی۔ عجب بے نیازی سے ٹہلا کرتی۔ ایسی بے داغ اجلی کہ بگلا شرمائے۔ دنوں میں دونوں بڑھیں جیسے ککڑی کی بیل بڑھتی ہے۔ اب گھر والوں کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اندازہ کرتے کہ حلال کی جائے تو کتنا لطف آئے گا۔ یہاں میں ان کی سن سن کر جلی جاتی۔ خدا جانے کیسے کیسے انھوں نے دعائیں مانگیں کہ پہلے ہی جھول میں دونوں نے جھڑے کا انڈا دے دیا۔ دادی اماں کہتی ہیں کہ ایسی مرغیاں منحوس ہوتی ہیں اس لئے فوراً گلے پر چھری پھیرنی چاہیے۔ اوروں کی مراد بر آئی۔ کسی نے مجھ سے بھولے کی نہ بات پوچھی۔ ایک نے مرغیاں پکڑیں دوسرے نے چھری تیز کی اور لیجئے اللہ اکبر۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا۔

ابھی ابھی اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ ابھی خاک و خون میں لتھڑی پڑی ہیں۔ ہائے میری نازک مزاج مغرور "شاہ جادی" ہائے اللہ میری البیلی چھیلی "باجی" —

میں مرغیاں نہیں کھاتی نہ ان کی بریانی نہ ان کا سالن۔ اس لیے اوروں نے دکھا دکھا کے خوب مزے لئے۔ میں نے کھلا کھلا کے خوب موٹا کیا تھا۔ وہ لوگ مزے لے رہے تھے۔ کبھی دڑو دانے نہ ڈالے تھے لیکن اب ہضم کرنا دیکھو۔ بلدی تک نہ پھٹکری رنگ چوکھا آیا۔ جب چین سے کھا پی چکے تو میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ جی میں تھا کہ خوب کھری کھری سناؤں۔ مگر یہ سوچ چپ ہو رہی کہ مرغیاں تو ہاتھ سے گئیں۔ اب بخشش سمجھ کر ان کو احسان مند کیوں نہ بنا لوں۔ میں نے بھی حاتمی جتائی۔ مگر جی برا برا ہوتا رہا۔ کئی روز تک کھانا ٹھیک سے کھایا نہ گیا اور آنگن سونا سونا لگا۔ اب بھی دو مرغیاں ایک مرغ آنگن میں پھرتے ہیں۔ لیکن جو سب کے سب ہوتے تو کتنی رونق ہوتی۔ اب بھی کوئی نہ کوئی پوچھ لیتا ہے کہ ان تینوں کا گوشت کتنا نکلے گا۔؟

شرم نہیں آتی انھیں۔ مگر میں کہتی ہوں بکنے دو۔ اچھا ہوا ان لوگوں کو کھلا دیا۔ ورنہ زہر ہو جاتیں اور یوں بھی گھر کی بلا جانور پر ٹلتی ہے۔ بار بار دل کو سمجھاتی ہوں سمجھتے سمجھتے سمجھ جائے گا۔

اور لو یاد ہی نہ رہا۔ کل پھر منگل ہے۔ اگر کہو تو اور مرغیاں منگوا لوں۔!

زینت ساجدہ۔

تنقید و تبصرہ

نگینے :۔ از فضا کوثری۔ حجم صفحہ ۴۰ قیمت معلوم نہیں۔ خدا جانے کہاں ملتی ہے۔

جناب فضا کوثری بنگلور کے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ منتخب اشعار کا یہ مجموعہ شایع کیا ہے۔ مشق سخن جاری رہی تو اچھے شاعر بن سکیں گے۔ ان اشعار میں بھی نازک اور لطیف شعر مل جاتے ہیں مثلاً :۔

یہی عمر بھر مجھ کو حسرت اسی کی
بچا کر نظر وہ نظر دیکھ لوں

اپنا ہو کر بھی یہ نہیں اپنا ؛ کروں کس دل سے میں گلہ دل کا

اتنے چھوٹے مجموعے کے لئے قطعات تاریخ بہت زیادہ ہیں۔

کلید معرفت :۔ از محترمہ منیشرہ بانو کاؤس جی۔ حجم صفحہ ۳۲ قیمت درج نہیں۔

محترمہ منیشرہ بانو کاؤس جی نے اوستا کی چند متبرک دعاؤں کا سلیس ترجمہ کیا ہے۔ اور فارسی زبان میں چند مناجاتیں بھی درج ہیں۔ محترمہ نے دین زرتشت کی غائت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذاہب کی منزل ایک ہی ہے۔ اگر موصوفہ دین زرتشت پر تفصیل سے روشنی ڈالیں اور پارسیوں کے تہذیب و تمدن کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں تو بہتر ہوگا۔ اس موضوع پر اردو میں یہی پہلی لکھنے والی خاتون ہیں۔ زبان سلیس اور طرز ادا شستہ ہے۔

اقبال اور نونہال :۔ مرتبہ وحید الدین سلیم۔ حجم ۲۸ صفحہ۔ قیمت ۱۰ آنہ۔ ناشر ایوانِ ادب عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

بچوں کے لئے اقبال کے کلام سے چند آسان اور دلچسپ نظمیں جمع کی گئی ہیں۔ بچے ابھی سے اگر اقبال کو سمجھیں تو آئندہ انھیں اقبال کو پوری طرح پڑھنے میں دقت نہ ہوگی۔ "اختر صبح"، "ستارہ" اور "پیام اتحاد" بچوں کے لئے ذرا مشکل نظمیں ہیں۔

اقبال کے خطوط جناح کے نام :۔ ترجمہ سید مشتاق احمد چشتی۔ حجم ۲۲ صفحہ قیمت ۸ آنہ۔ ناشر ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

اقبال کے خطوط جو جناح کے نام ہیں ظاہر کرتے ہیں کہ انھیں مسلم لیگ اور پاکستان کے مسئلہ سے کتنا قریبی تعلق تھا۔ اور وہ مسلمانوں کے سیاسی مسائل میں کس قدر دلچسپی لیتے ہیں۔

قائد اعظم :۔ از سردار الہام۔ حجم ۸۰ صفحہ قیمت درج نہیں۔ ناشر ہندوستان پبلشنگ کمپنی حیدرآباد دکن۔

جناب سردار الہام نے قائد اعظم محمد علی جناح کی مختصر سوانح حیات قلمبند کی ہے۔ لیکن موصوف نے زندگی کے ہر پہلو پر روشنی نہیں ڈالی۔ صرف سیاسی پہلو سے بحث کی ہے حالانکہ ایک بڑے سیاستدان کی سیاسی زندگی کو سمجھنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ کردار کے مختلف پہلو روشن ہو جائیں۔ بہرحال اس کتابچہ میں قائد اعظم اور ان کے سیاسی تعلقات کو اچھی طرح واضح کیا گیا ہے۔

شام و سحر :۔ از پنڈت پریم ناتھ سادھو پردیسی۔ حجم ۱۹۹ صفحہ قیمت ۲ روپے۔ پبلشرز :۔ غلام محمد نور محمد تاجران کتب مہاراج گنج و بیزر گنج و نسیمہ بازار۔ امیرا کدل سری نگر۔

جناب پردیسی نے اپنے سولہ مختصر افسانوں کا مجموعہ "شام و سحر" کے نام سے شایع کیا ہے۔ افسانے بیحد دلچسپ ہیں۔ زبان اچھی ہے۔ معلوم ہوتا ہے لکھنے والے کو اس زندگی سے ہمدردی ہے جس کی وہ تصویر اتارتے ہیں۔ غریبوں کے دل میں دل ڈال کر انھوں نے حقائق حیات کو محسوس کیا ہے۔ ہر افسانہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھا ہے۔ لیکن "چوٹی" اس مجموعہ کا شاید سب سے بہترین افسانہ ہے۔ غریبوں کی دنیا کی اس سے بہتر عکاسی کیا ہوگی۔ کشمیر ان افسانوں کا پس منظر ہے لیکن حسین و جنت نظیر کشمیر نہیں۔ بلکہ غریبوں کی دکھوں کی بستی کشمیر۔ جہاں آنسو ہی آنسو ہیں۔ مسکراہٹ کا نام نہیں۔

کتاب کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بہت قلیل ہے۔ جناب عبدالحق صاحب نے مقدمہ لکھا ہے۔ اور لوگوں نے بھی اپنی اچھی رائے کا اظہار کیا ہے۔

ہندوستان کے مزدوروں کے مسائل :- از حامد محی الدین بی۔ اے عثمانیہ قیمت ۸ حجم صفحہ ۰۰ مقام اشاعت فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن۔

مزدور آج کی دنیا کا سب سے اہم کردار ہے۔ حامد محی الدین صاحب نے معاشی زاویۂ نظر سے اسے جانچا ہے اور اس کی اہمیت کا احساس کیا ہے۔ کتابچہ کے سات باب ہیں۔

۱۔ مزدوروں کے مسائل کی اہمیت۔ ۲۔ ہندوستانی مزدوروں کی چند خصوصیات۔ ۳۔ مزدوروں کے خاص مسائل ۴۔ قوانین مزدوراں۔ ۵۔ صنعتی تعلقات۔ ۶۔ جنگ اور مزدور۔ ۷۔ تنظیم مابعد جنگ اور مزدور۔

مزدور کا ماضی جو کچھ بھی رہا ہو لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس کے مستقبل کو سدھارنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ اس کی اصلاح معاشرہ کی اصلاح ہے۔ اقبال کے شعر کو معاشی سطور میں خوب نبھایا ہے۔

> اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
> مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

ہندوستان کی سڑکیں اور ریلیں :- از ارجن پرشاد عثمانیہ قیمت (۸) حجم صفحہ پتہ فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن۔

مضمون کو آٹھ مختصر عنوانوں میں پھیلا دیا گیا ہے۔

۱۔ ذرائع حمل و نقل کی اہمیت ۲۔ سڑکیں ۳۔ ہندوستان کی ریلیں۔ ۴۔ ریلوے کے کرایہ کا مسئلہ۔ ۵۔ بعد جنگ ریلوں کی منصوبہ بندی۔ ۶۔ ریلوں اور سڑکوں کی باہمی مسابقت۔ ۷۔ آبی نقل و حمل ۸۔ ذرائع نقل و حمل پر جنگ کے اثرات کتابچہ میں وہ ساری خوبیاں موجود ہیں۔ جو اس سلسلہ مطبوعات کی خصوصیت ہیں۔ بزم معاشیات اپنے ان کتابچوں کے ذریعہ ملک کے ہر اہم مسئلہ پر بحث کر رہی ہے اور روشنی ڈالتی ہے جو بہر حال مفید اور کارآمد ہے۔

چادرگھاٹ کالج میگزین مرتبہ غضنفر علی وغیرہ چندہ سالانہ ؏ پتہ معتمد مجلس ادارت چادرگھاٹ کالج میگزین۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

چادرگھاٹ کالج کو کالج بنے کچھ ہی عرصہ ہوا ہے۔ اپنی زندگی اور استقرار کا ثبوت کالج نے اس میگزین کی اشاعت سے دیا ہے۔ ہر کالج کے طلبہ کو اپنا ایک مجلہ رکھنا ضروری ہے۔ آئندہ اس سے بہتر کام کی توقع ہے۔ مضامین میں تنوع ہے۔ نظم و نثر انگریزی و اردو سب کو بہتر سے بہتر صورت میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ طلبہ کے علاوہ او مقابل اہل قلم کے مضامین کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں طلبہ ہی کو زیادہ جگہ ملنی چاہیئے۔ کیونکہ رسالہ ہی ان کا واحد ترجمان ہوتا ہے۔

ز بس

براہین وحی :- مرتبہ محمد اقبال سلمانی حجم ۲۴۴ صفحے قیمت ؏ پتہ مکتبہ امت مسلمہ امرتسر۔

زیر نظر کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۱ء میں رسالہ "البیان" کے خاص نمبر کی صورت میں شایع ہوا تھا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے۔ اس میں حقیقت وحی پر کئی مقالے اور مضامین درج کئے گئے ہیں تقریباً یہ سارے مضامین مدیر نگار کے مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریا آبادی، محمد ادریس ندوی، ڈاکٹر ایم، ڈی تاثیر، ثناء اللہ امرتسری، محمد منظور نعمانی، سید احمد اکبرآبادی، سید مقبول احمد، محمد اقبال سلمانی قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان کے صنعتی مسائل :- مرتبہ سعید احمد مینائی حجم ۰۰ صفحے قیمت ؏ پتہ ادارۂ معاشیات فاطمہ منزل۔ حمایت نگر۔ حیدرآباد دکن۔

اس رسالہ کے پہلے باب کا آغاز تاریخی پس منظر سے ہوا ہے۔ دوسرے ابواب میں گھریلو اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں بعض اہم صنعتیں، صنعتوں کے مالی مسائل، صنعتوں پر موجودہ جنگ کے اثرات اور ہندوستان کے صنعتی مستقبل وغیرہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔

یس

فن داستان گوئی :- از کلیم الدین احمد ناشر دارۂ ادب باکی پور پٹنہ۔

داستان گوئی کے موضوع پر اردو میں بعض کتابوں مثلاً دنیائے افسانہ. کردار اور افسانہ اور ناٹک ساگر وغیرہ میں اظہار خیال کیا گیا۔ اور اردو کی داستانوں کی خصوصیات اور ان کے ارتقا پر خوبی سے نظر ڈالی گئی ہے۔ اور افسوس ہے کہ زیر نظر مولف نے ان مطبوعات کی طرف نظر ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے دیباچہ میں جس کا نام انھوں نے "بس ایک بات" رکھا ہے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہیں ہے۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی جا رہی ہے۔

ہماری زبان کے جدید ادیبوں میں یہ ایک نہایت معیوب رجحان پیدا ہوتا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تصنیف یا تالیف کی اولیت ثابت کرنے کے لئے یا تو اس موضوع کی قدیم کتابوں کی طرف توجہ ہی نہیں کرنا چاہتے یا جان بوجھ کر انجان بنتے اور اردو دنیا کے ساتھ خود اپنے کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں۔

یہ ایک عیب کلیم الدین احمد صاحب میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس سے پہلے ہماری شاعری کے عنوان پر جو کتاب لکھی تھی اس میں ان تمام کتابوں سے استفادہ تو ضرور کیا جو اردو شاعری پر ان سے قبل لکھی گئی تھیں لیکن اپنی تالیف کی اہمیت جتانے کے لئے ہر کتاب کے نہ صرف نقائص بیان کئے بلکہ ان کے مصنفوں کے ساتھ بدتمیزی بھی کی۔

زیر نظر کتاب میں داستان کی ٹکنیک بیان کرنے کے بعد اردو کی دو مشہور داستانوں، طلسم ہوش ربا اور بوستان خیال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اور انہی دو کتابوں پر اتنی جگہ صرف کر دی ہے کہ یہ کتاب دراصل طلسم ہوش ربا اور بوستان خیال پر ایک تفصیلی تبصرہ بن کر رہ گئی ہے۔ آخر میں چند صفحات مختصر داستانوں اور منظوم داستانوں پر بھی لکھے ہیں لیکن یہ حصہ اتنا سطحی اور سرسری ہے کہ اس کی وجہ سے اس کتاب کو فن داستان گوئی پر ایک جامع کتاب نہیں سمجھا جا سکتا۔

عالم آشوب :- از سیماب اکبر آبادی ناشر مکتبۂ قصر الادب آگرہ۔

سیماب اکبر آبادی عہد حاضر کے ایک مشہور نظم گو ہیں اور ان کی نظم کے چند اچھے مجموعے اس سے قبل شایع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب جو چھوٹی سائز کے چار سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے دراصل سیماب کی اشاراتی اور تاریخی رباعیوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ یہ سب رباعیاں دور حاضرہ کے واقعات اور خاص کر عالمگیر جنگ کی شخصیتوں اور اس کے پیدا کردہ نتائج پر قلمبند کی گئی ہیں۔

چونکہ کتاب صوبۂ متحدہ کے قومی محاذ جنگ کے زیر اہتمام چھپی ہے اس لئے بہت دیدہ زیب ہے اور ہر صفحہ پر رنگین حاشیہ دیا گیا ہے۔

عہد حاضر میں اردو کے اکثر شعرا رباعیوں کی طرف متوجہ ہیں چنانچہ جوش نے بھی اس صنف سخن میں حال ہی میں بہت کچھ کلام لکھا ہے۔ سیماب کا یہ مجموعہ عہد حاضر کے اس رجحان کی اچھی نمائندگی کر سکتا ہے۔

مقامات :- از احسان دانش۔ ناشر مکتبۂ دانش لاہور۔

احسان دانش پنجاب کے اچھے شعراء میں سے ہیں ان کے کلام کا یہ دسواں مجموعہ ہے جس کو انھوں نے چار حصوں طاق حرم، اذان بت کدہ، اسرار اور بلندیاں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر حصہ میں متعدد نظمیں اور غزلیں ہیں۔ جو مختلف عنوانوں پر لکھی گئی ہیں۔ اس کتاب کو شاعر نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے نام معنون کیا ہے اور ابتدا میں محمد توقیر طاہر گنگوہی سے ایک دیباچہ بھی سرباب کے عنوان سے لکھوا کر شریک کیا ہے۔ اس دیباچہ میں طاہر صاحب نے لکھا ہے کہ۔

"احسان دانش کے کلام میں جہاں نظیر اکبرآبادی
اور میر انیس کی روحیں بولتی نظر آتی ہیں۔
وہیں علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی
کے اسلوب بھی پرتو فشاں ہیں جو وقتی
اور عمری تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے اصولی
طور پر ضروری ہیں۔"

اگرچہ اس رائے میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ احسان دانش کے اسلوب اور خیالات پر رفتہ رفتہ علامہ اقبال کا رنگ غالب آتا جا رہا ہے اور وہ جوش کے رنگ سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ مجلد چھپا ہے اور کتابت و طباعت بھی بہت غنیمت ہے۔

دل کی گیتا :- از خواجہ دل محمد ایم اے ناشر خواجہ بکڈپو لاہور

یہ کتاب ہندو مذہب کی مشہور مقدس نظم بھگوت گیتا کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ مترجم نے شروع میں تعارف کے طور پر گیتا اور اس کی تعلیم پر اپنے خیالات اختصار کے ساتھ ظاہر کئے ہیں۔ اصل نظم میں جہاں جہاں اشخاص کے نام یا مذہبی اصطلاحیں آگئی ہیں۔ حاشیے پر ان کی مناسب شرحیں لکھی گئی ہیں جن کی وجہ سے قدیم تاریخی واقعات اور مذہبی عقائد کے سمجھنے میں بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خواجہ دل محمد صاحب نے اس کا ایک اچھا منظوم ترجمہ شایع کیا ہے جس کی وجہ سے اہل اردو اس مشہور کتاب کے خیالات سے مستفید ہو سکیں گے۔

نظری اور عملی معاشیات :- از محمد ناصر علی ایم اے ناشر ادارۂ معاشیات حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں مولوی ناصر علی صاحب لکچرار معاشیات جامعہ عثمانیہ کے آٹھ مضامین شریک ہیں جن میں سے پہلا نظری اور عملی معاشیات سے متعلق ہے اور باقی مختلف معاشی موضوعوں پر۔

یہ چھوٹی سی کتاب ادارۂ معاشیات کے سلسلۂ مطبوعات کی ساتویں کڑی ہے اور اس کا پیش لفظ بھی ڈاکٹر انور اقبال قریشی نے لکھا ہے۔ یہ کتاب بھی معاشیات سے متعلق طلبہ اور دیگر اہل ذوق کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگی۔

صیاد اور دوسرے افسانے :- از حامد حسن قادری ناشر لکشمی نارائن اگروال آگرہ۔

یہ کتاب پروفیسر حامد حسن قادری سینٹ جانس کالج آگرہ کے سترہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جن میں بعض ترجمے ہیں چند ماخوذ اور کچھ طبعزاد۔

اس مجموعہ کے تمام افسانے محض تفریح کے طور پر وقت گزارنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے جو اصحاب فن افسانہ کی اعلیٰ تکنیک دیکھنا چاہتے ہوں ان کے لئے اس کا مطالعہ غیر ضروری ہے البتہ تفریح طبع کے لئے ان کا مطالعہ دلچسپ ثابت ہوگا۔

حامد صاحب نے انگریزی کے اچھے افسانوں کو ترجمے کے لئے منتخب کیا ہے۔ اور ان کی زبان و اسلوب بہت رواں اور شگفتہ ہے۔ یہ کتاب مجلد اور دیدہ زیب چھپی ہے کتابت و طباعت بھی بہت عمدہ ہے۔

ہماری زمین :- از محمد حسین حسان ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔

یہ چھوٹی سی بالتصویر کتاب بچوں کی زبان میں اور بچوں ہی کے لئے لکھی گئی ہے اس کے مولف جامعۂ ملیہ کے مشہور رسالے پیام تعلیم کے ایڈیٹر ہیں۔ جو بچوں اور بچیوں کے لئے شایع کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس کتاب کی زبان اور اسلوب میں بچوں کی نفسیات اور ضروریات کا نہایت کامیاب طریقے پر خیال رکھا گیا ہے۔

اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہانی کے پیرایہ میں زمین کے متعلق مفید جغرافی اور حیاتیاتی معلومات دلچسپ طور پر پیش کی گئی ہیں متعدد تصویریں بھی ہیں جو بہت

سلیقے سے منتخب کی گئی اور بنائی گئی ہیں۔ اس کتاب میں صرف ایک عیب ہے اور وہ یہ کہ عنوانات درمیان میں نہیں دیئے گئے بلکہ مسلسل کہانی لکھی گئی ہے اس ایک نقص کے باوجود یہ کتاب اس قابل ہے کہ بچوں اور بچیوں اور تھوڑی بہت تعلیم پائے ہوئے بالغوں کے لئے مفید ثابت ہوگی اور سب اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

منتخب نظمیں:- مرتبہ ادارہ ادب لطیف۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔ ماہنامہ ادب لطیف کی مجلس ادارت کی جانب سے سنہ ۱۹۴۲ء سے سال بھر کی منتخب نظموں کے انتخاب پابندی سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

زیر نظر مجموعہ سنہ ۱۹۴۴ء کی بہترین نظموں کا انتخاب ہے جس میں تقریباً نو دو نظمیں ہیں جن میں زیادہ تر جدید ترقی پسند قسم کی ہیں اور بعض واقعی بہت اچھی ہیں اور ان کے مطالعہ سے جدید اردو نظم کے رجحانات واضح ہو جاتے ہیں۔ انتخاب کا کام یوں بھی بڑی ذمہ داری کا اور مشکل کام ہے اور اس مجموعہ کے مرتب نے حتی الامکان صحیح انتخاب کی کوشش کی ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ جن شاعروں کی نظمیں پسند کی گئی ہیں ان میں اکثر و بیشتر پنجاب کے ہیں۔ اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ حیدرآباد کے ایک شاعر کو بھی اس میں جگہ نہیں دی گئی حالانکہ سال گزشتہ مخدوم محی الدین، سکندر علی وجد، سید علی منظور، شاہد صدیقی علی اختر، اور حامد اختر نظر کی بڑی پاکیزہ نظمیں حیدرآباد اور بیرون مملکت کے رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کسی نظم کی طرف مرتبین کی توجہ کا مبذول نہ ہونا ثابت کرتا ہے کہ پنجاب کے ادیب اب عصبیت کی حد سے نکل کر تعصب کے میدان میں داخل ہو چکے ہیں۔ اور یہ صوبہ واری تعصب اردو کے حق میں مفید سے زیادہ مضر ہی ثابت ہوگا۔

"ق"

تاثرات (قطعات)

(زیر طبع "رم جھم" کا ایک ورق)

عزم

ان بھیانک، جلی چٹانوں میں
زندگی کا سراغ پاؤں گا
ہم سفر، تو ٹھہر سکے تو ٹھہر
میں تو ان چوٹیوں پہ جاؤں گا

قربانی

میں اگر چاہتا تو اپنا نام
عرش کے گنبدوں پہ لکھ آتا
کاش تو دیکھتا مرا ایثار
کاش تو آشکار ہو جاتا

بے بسی

زندگی کا عذاب سہ نہ سکا
تیری حد بندیوں میں رہ نہ سکا
باوجود اس قدر بغاوت کے
میں نے جو کہنا چاہا، کہہ نہ سکا

پھول اور مقتول

کیکروں کے سفید کانٹوں پر
یوں اٹکتے ہیں پیلے پیلے پھول
جیسے نیزوں میں ہوں پروئے ہوئے
حریت دوست نوجواں مقتول

ایک راز

اس حقیقت کو فاش کرنے میں
مجھ کو واللہ کچھ ہراس نہیں
میں تو تیرا ازل کا ساتھی ہوں
تو اگر مجھ سے روشناس نہیں

زیست کا زہر

میرا ایمان ہے رضا تیری
دیکھ کس بے دلی سے جیتا ہوں
کس قدر تلخ ہے شرابِ حیات
سب سمجھتا ہوں، پھر بھی پیتا ہوں

عرفان

بحرِ جذبات میں خروش نہیں
اب عزائم میں پہلا جوش نہیں
تو مری خامیوں سے کھیلتا ہے
اور سمجھتا ہے، مجھ کو ہوش نہیں

مصلحت

کون کہتا ہے اپنے شعروں میں
زندگی سے گریز کرتا ہوں
موت کو کب پکارتا ہوں میں
زیست کی آگ تیز کرتا ہوں

احمد ندیم قاسمی

نشان ٹھپا صفحہ ۱۵۳

Reg. M. 3950

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

۳۳۳/

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	قیمت آنے	قیمت پائی
من کی بیتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۲۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالارجنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو ناصر	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
من تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰	۰
مہ لقا	۰۰		۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۰
اشوک	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۰۱	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	قیمت آنے	قیمت پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
دوم (۵۰)	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
کریم و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
ندر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر ..	۸۰	۰	۱۰	۶
کارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۰۱	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں ...	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

جون ۶۵ء

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

پیش از … علی … ۱۰/۲۰ …

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۴۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندۂ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸/

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے

جلد (۸) بابت جون ۱۹۴۵ء شمارہ (۶)

۱	بچہ اور اس کی تربیت		محمد ضیاء الدین (جامعہ ملیہ)	۲
۲	غزل		حرماں خیرآبادی	۴
۳	رضا اور ان کی شاعری		رفیعہ سلطانہ ایم اے (آخری)	۵
۴	نئی بزم نیا ساز	(نظم)	اقبال متین	۸
۵	انتقام	(فسانہ)	ابو العسکر سید عبد القادر ہاشمی (سٹی کالج)	۹
۶	حشر جذبات	(غزل)	ثاقب کانپوری	۱۲
۷	"تذکرہ شاعرات اردو پر ایک تنقیدی نظر"		نصیر الدین ہاشمی	۱۳
۸	فیروزہ	(افسانہ)	نگہت ناز	۱۶
۹	جرعے	(غزل)	ساقی صدیقی (جبل پور)	۱۹
۱۰	آواز بازگشت	(تنقید)	م - ح	۲۰
۱۱	افسانہ زندگی کا	(غزل)	میر برکت علی برکت	۲۴
۱۲	قاتل	(افسانہ)	مرزا سہام الدین	۲۵
۱۳	مقام خودی	(غزل)	عارف سیالکوٹی	۲۹
۱۴	ہنسی		حکیم دکھنی	۳۰
۱۵	مرہٹی ادب کا جائزہ		کرشنا کمار ایم اے	۳۱
۱۶	بہار آئی!	(نظم)	علی اشرف	۳۸
۱۷	سلطانہ کے ساتھ ایک ملاقات		غیاث النساء بیگم	۳۹
۱۸	رجب کا میلہ	(نظم)	سید علی منظور	۴۱
۱۹	تنقید و تبصرہ		ق	۴۲
۲۰	حقوق نسواں	(ڈراما)	شاطر حکیمی (کامٹی)	۴۶

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رنزل خیرت آباد سے شائع ہوا

بچہ اور اُس کی تربیت

ہماری تہذیب، تمدن اور معاشرت سب کچھ بدل گئی لیکن بچوں کی تربیت کا ڈھنگ اسی ڈگر پر قائم ہے جس پر آج سے برسوں پہلے تھا، گھر میں والدین سے لے کر عزیز و اقارب اور ملازمین تک بچے کی نام نہاد تربیت کے کوشاں ہوتے ہیں اور اپنی دانست میں بچے کی "تربیت" کے فرض سے عہدہ برآ بھی ہو جاتے ہیں مگر ننھے میاں بڑے ہو کر بھی ننھے ہی رہتے ہیں، بلکہ بعض اوقات نالائق، بدتمیز، اور بدچلن بھی سمجھے جاتے ہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ وہ ساری کوششیں بیکار کیوں ہوئیں؟ آئیے اس کا ذرا نفسیاتی تجزیہ کریں، بچوں کی بے معنی حرکات اپنے اندر ایک معنی رکھتی ہیں، اگر اسے سمجھ لیا جائے تو بہ آسانی سے تربیت کی جا سکتی ہے، کسی مشین کو چلانے سے پہلے اس کے کل پرزوں سے واقف ہونا ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہوتا ہے کہ سیکڑوں روپے کی مشین برباد ہو جائے گی، برخلاف اس کے بچے کو جو قدرت کی اہم اور نازک ترین مشین ہے بڑی بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ موٹر میں آئیل نہ ہو تو پرزوں میں گڑگڑاہٹ ہونے لگتی ہے، آئیل دیجئے تو یہ آواز بند ہو جاتی ہے۔ بچہ ضد کرتا ہے۔ آخر بچہ ہی تو ہے، ہمارے آگے اس کی ضد ہی کیا، ہم جبراً و قہراً اپنی بات منوا لیتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ضد بچے کی طبیعت کا ایک جزو بن جاتی ہے، اس ہر دفعہ کی ضد کو کون پورا کرے، دادی اماں کو ایک ترکیب سوجھتی ہے، کالا کپڑا اوڑھ کر بھوت بن جاتی ہیں اور کسی دروازے کی اوٹ سے جھانک کر حلق سے کچھ ایسی آواز نکالتی ہیں کہ بچہ دیکھ کر سہم جاتا ہے، آنکھیں غیر ارادی طور پر بند ہو جاتی ہیں، چلئے، بچے کی ضد سے نجات ملی، رات کو بچہ نیند میں بار بار چونکتا ہے، کبھی بے اختیار رونے لگتا ہے، اس پر اور پٹتا ہے تو بے چارہ سسکیاں بھرتے سو رہتا ہے، خدا جانے اس پر کیا بیت رہی ہوگی۔ اس خوف کا اثر ایک آدھ دن یا لڑکپن ختم ہونے تک رہتا تو زیادہ ہرج نہ تھا لیکن یہ خوف اس کی فطرت کو مستقل طور پر متاثر کر دیتا ہے، بچہ جوان ہو کر بھی رات میں اپنی پرچھائیوں سے ڈرتا ہے، ہم سب اسے بزدل اور نکما کہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ لڑکپن میں اس پر کیا گزری تھی۔ ساری زندگی کا دار و مدار لڑکپن کی تربیت پر موقوف ہے، اگر اس زمانے میں اسے اچھی فضا اچھا ماحول ملا تو بچے کی زندگی کامیاب ورنہ بیکار محض ثابت ہوتی ہے، اس لئے لڑکپن کا دور نہایت اہم دور ہے، اس زمانے میں ہماری ذرا سی لغزش بچے کی تمام زندگی کو تباہ کر دیتی ہے۔

بچے کی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ خود کچھ نہ کچھ کرے، اس عمر میں جب کہ بچے کی سمجھ بوجھ اور اعضا میں خاص مطابقت نہیں ہوتی، وہ اکثر کام بنانے کے بجائے بگاڑ دیتا ہے، گلاس اس لئے اٹھاتا ہے کہ وہ خود بھی مٹکے سے پانی اسی طرح لے جس طرح بڑے آدمی لیتے ہیں، لیکن گلاس گر کر یا مٹکے سے ٹکرا کر ٹوٹ جاتا ہے، اس پر ہمیں بہت غصہ آتا ہے، بیچارے کو گالیاں سننی پڑتی ہیں یا کوئی سزا بھگتنی پڑتی ہے، اسے سزا سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اس خیال سے کہ اسے خود کام کرنے کیوں نہیں دیا جاتا۔ میڈم مانٹی سوری بیان کرتی ہیں کہ وہ ایک دفعہ دو بچوں کو اپنے ساتھ لے کر ٹہلنے کے لئے نکلیں، ٹہلتے ٹہلتے دریا کے کنارے پہنچیں، بچے ریت اور کنکریوں سے کھیلنے لگے، تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس ہونا چاہتی تھیں تو دیکھا کہ ایک بچہ تو اپنا کھیل ختم کر چکا ہے لیکن دوسرا ابھی تک مصروف ہے، اس کی ساری کوشش یہ تھی کہ کنکریوں کو قمیص کے دامن میں بھر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈھیر کرے، میڈم نے اس خیال سے کہ اگر یہ کام وہ خود کر دے تو جلد واپس چل سکیں گے، بہت سی کنکریاں اٹھا کر وہاں رکھ دیں جہاں بچہ جمع کرنا چاہتا تھا، بچے نے یہ دیکھ کر زور زور سے رونا شروع کیا، میڈم نے اس بات کو تاڑ لیا اور فوراً کنکریاں بکھیر دیں، بچہ پھر خوشی خوشی ان کو چننے لگا اور تھوڑی دیر بعد اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے ڈھیر کو دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔

کہنے کو تو یہ ایک معمولی سی بات ہے مگر یہی چھوٹی چھوٹی باتیں آگے چل کر بچے کو ہمت، خود اعتمادی اور مستقل مزاجی کی دولت سے مالا مال کرتی ہیں، افسوس ہے کہ ہم بچے کو اکثر اس قسم کے ارادوں سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بڑا ہو کر ہر کام میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے لگتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو ایسی ذہنی پیچیدگیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ ان کا سلجھانا کوئی آسان کام نہیں۔

ہم میں سے اکثر بچوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں، "تم اتنی سی بات نہیں جانتے ہو" "اتنے بڑے ہو گئے ہو کب عقل آئے گی" یہ جملے ایک لمحہ میں ہماری زبان سے ادا ہو جاتے ہیں مگر بچے کے ذہن پر گھنٹوں بلکہ دنوں اس کا اثر رہتا ہے، وہ بار بار یہ سوچتا ہے کہ کیا واقعی یہ اتنی معمولی سی بات تھی جس کو میں نہیں جانتا؟ کیا حقیقت میں میں کم عقل ہوں؟ فرصت میں اس قسم کی ادھیڑ بن اسے بے چین رکھتی ہے، یہی خیال بڑھتے بڑھتے وہم کمتری کے مرض کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور بچہ بے تکلف سوالات کرنے سے جھجکتا ہے، وہ گویا اپنی "کم عقلی" کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، بالآخر اس کے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات تشنہ ہی رہ جاتے ہیں۔ انسانی فطرت کا خاصہ ہے کہ جس کام سے منع کیا جائے اسے ضرور کرے حضرت آدم کو دیکھئے اس قدر سخت ممانعت کے باوجود آخر گندم کی خواہش کیوں ہوئی اور اپنی اسی خواہش کی تکمیل کے لئے فردوس جیسی آرام و آسائش کی جگہ کے بدلے اس دنیا کی خاک چھانی پڑی، نہ یہ خواہش ہوتی اور نہ یہ مصیبتیں اٹھاتے پر کیا کیا جائے آدم اپنی فطرت سے مجبور ہے، اس لیے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ بچے کے سامنے انکاری پہلو نہ رکھا جائے بلکہ ہمیشہ اثباتی پہلو ہو، مثلاً کسی بچے سے یہ کہنے کی بجائے کہ "جھوٹ مت بولو" یہ کہنا مناسب ہوگا کہ "ہمیشہ سچ کہا کرو" اگر بچے کی عمر کا تقاضا ہو تو جھوٹ کے نقصانات سیدھے سادے پیرایہ میں بیان کر دینے چاہئیں۔ اگر بچہ کو کسی کام سے منع تو کیا جائے لیکن اس ممانعت کی کوئی وجہ نہ بتائی جائے (یا بچے کی سمجھ میں نہ آئے) تو بچہ بات خود اس پر عمل کر کے دیکھنے کی خواہش کرے گا اور ایسا کرنا اس کا عین فطرت ہے۔

شریر بچے عموماً پسند نہیں کئے جاتے ہیں، ان بچوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو خاموش اور الگ بیٹھے رہتے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو شرارت، بچے کی ذہنی اور جسمانی تندرستی کی علامت ہے، بھلا وہ بچہ کیا شرارت کرے گا جس کی صحت میں کوئی نقص آ گیا ہو۔ بچے میں بہت جلد سیکھنے کی صلاحیت اور غیر معمولی توانائی ہوتی ہے، اگر اس توانائی کو صرف کرنے کے لئے کوئی کام نہ ملا تو بجائے مٹی کریدنے، چیزوں کے توڑنے پھوڑنے میں ضائع کرے گا، ان شرارتوں کو کسی خوف اور ڈر سے آپ موقوف کرنا چاہیں تو یہ فطرت کے خلاف عمل ہوگا، ممکن ہے کہ وقتی طور پر بچہ اپنی شرارتوں سے باز آ جائے لیکن اپنے ارادوں کو پورا کرنے کے لئے نئی نئی راہیں سوچنے پر وہ مجبور ہے۔ کسی برتن میں متواتر بھاپ داخل ہوتی رہے اور اس کی نکاسی کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو برتن کا پھٹ جانا یقینی ہے، بالکل اسی طرح شرارت، بچے کی توانائی کا اظہار ہے، اگر آپ اسے روک دیں اور اس کا کوئی مصرف نہ نکالیں تو لازماً یہ ظرف بھی کسی دن پھٹے گا اور اس بری طرح سے پھٹے گا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

ہر بچے میں عزت نفس کا جذبہ شدت سے موجود ہوتا ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ اپنے ہم جنسوں میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرنے کی تگ و دو جاری رکھتا ہے، اگر لکھنے پڑھنے میں وہ کوئی امتیاز حاصل نہ کر سکے تو اس کی توجہ کھیل کود میں نام پیدا کرنے کی طرف مبذول ہوگی، اگر اس میں بھی ناکام رہا تو اپنے ساتھیوں پر جسمانی طاقت کا سکہ بٹھانا چاہے گا، یا جھوٹ بولنے میں کمال پیدا کرے گا یا کتابوں اور کھلونوں کو پھاڑنے توڑنے میں طاق بنے گا، غرض یہ کہ امتیاز حاصل کرنے کی مناسب راہیں جب مسدود ہو جائیں گی ۔۔۔۔۔۔۔۔

.... تو پھر غلط راستوں پر لگ کر اپنی تشکیل خود ہی چاہے گا۔ اس لئے ایک اچھے معلم کا فرض ہے کہ بچے کو عزت نفس برقرار رکھنے کے مواقع دے، اس کی صلاحیتوں کو ابھارے اور کسی لحاظ سے اسے اپنے ہم عمروں میں ایک خاص جگہ پیدا کرنے دے۔

ہر شخص کو "باپ" بننے سے پہلے اور ہر عورت کو "ماں" بننے سے پیشتر خدا کی اس امانت (بچہ) کی نگہداشت کا پورا پورا ذمہ لینا چاہیے، اس کی تعلیم و تربیت صحیح اصول پر کرنی چاہیے، ورنہ امانت میں خیانت ہو جائے گی اور اس کی تمامتر ذمہ داری والدین پر عائد ہوگی کیونکہ قوموں کو بنانے یا بگاڑنے کا انحصار ان ہی پر ہے، اچھے افراد سے اچھی جماعت بنتی ہے، افراد ناکارہ ہوں تو قوم قعر ذلت میں پڑی رہتی ہے۔

محمد ضیاء الدین

غزل

مفکر ہوں، سمجھ لینا نہ مجھ کو خوردہ کاروں میں
فلک سے کھیلتا ہوں، سانس لیتا ہوں ستاروں میں

خزاں میں خونِ دل آنکھوں سے ٹپکانا مبارک ہو
یہی رنگینیاں تحلیل ہوتی ہیں بہاروں میں

یہ آلامِ شبِ غم اور یہ ہنگامہ آرائی!
کہوں کیونکر کہ مجھ کو نیند آتی ہے ستاروں میں

بہار و برگ رقصاں، موج لرزاں، کہکشاں چنچل
غرض افلاک تک اک رمز مبہم ہے اشاروں میں

وہ نغمے سرمدی لیلائے فطرت جن کو گاتی ہے
فضاؤں میں ہیں کچھ، کچھ ڈھل رہے ہیں آبشاروں میں

ہزاروں محفلیں مہر و مہ و انجم کی چھانی ہیں
جبھی تو رہ گیا ہوں آئینہ بن کر نگاروں میں

مری ہستی کو مٹ کر آب و رنگ خلد بننا ہے
کہاں کا چین، جب تک حل نہ ہو جاؤں بہاروں میں

خس و خاشاک تڑپاتے ہیں، ذرے خوں رلاتے ہیں
کوئی اک شئے ہے میرے عشق کے پروردگاروں میں؟

وہ زلفیں ارتفاعِ دل پہ بادل بن کے جھولی ہیں
سنبھال اے کیف و مستی! اڑ رہا ہوں مرغزاروں میں

محبت سے ننھی سینوں میں شمعِ آرزومندی!
تلاش زندگانی اور خوابیدہ مزاروں میں!؟

جہانِ خاک کی یہ رودادِ سرد و گرم مت پوچھو
شگوفہ ہوں شراروں میں، گہر ہوں ریگزاروں میں!

کہیں اس شاہدِ نو کی جوانی تو نہیں حرماں
کوئی انگڑائیاں سی لے رہا ہے سبزہ زاروں میں

(آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی گئی) حرماں خیرآبادی

رضا اور ان کی شاعری

فی زمانہ جہاں مغربی تعلیم نے مشرقی ذہنیت کی کایا پلٹ دی وہیں مشرقی ثقافت و تہذیب سے تنفر کا بیج بھی بو دیا۔ اور وہ مشرق کی ہر چیز کو فطرت سے بعید اور غیر مفید سمجھنے لگے ہیں۔ چنانچہ مشرقی شاعری بھی ان کی نقادانہ کسوٹی پر پوری نہ اتری۔ مشرقی شاعری پر طرح طرح کے اعتراض کئے گئے۔ مشرقی محبوب کا مضحکہ اڑا کر شاعری کی تضحیک کی گئی۔ بالخصوص اس کی ایک صنف غزل کو بری طرح تلخ اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا۔ بالعموم مشرقی شاعری پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ ان میں اصلیت مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ شاعر کے دلی واردات کی آئینہ دار نہیں ہوتی اس میں حقیقت سے گریز اور دور از کار تخیلات کی بھرمار پائی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد جدت اور سچائی پر نہیں تقلید پر ہے۔ شاعری حیات انسانی کی آرزوؤں تمناؤں ناکامیوں اور کامیابیوں کی داستان ہے۔ اس کا کام انسان کے بنیادی جذبات کی عکاسی ہے۔ اور بعض سطح بیں حضرات کو مشرقی شاعری کا دامن ان چیزوں سے تہی نظر آتا ہے۔ سچ ہے جس کی نظریں سمندر کی سطح پر رک کر رہ جائیں وہ تہہ کے گوہروں کو نہیں دیکھ سکتیں۔ ورنہ غزل میں وہ سب چیزیں موجود ہیں۔ جن کو قلب انسانی کی کیفیات اور احساسات کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تغزل ہماری صنف شاعری کا پامال ہی لیکن محبوب موضوع ضرور ہے۔ غالب اور میر کے دیوان الفاظ کے مرقع ہیں۔ جذبات اور احساسات داستانیں اور واردات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ یہ موقتی جذبات اور جوش کے مظاہر ہیں ان کے ڈانڈے زندگی کی گہرائیوں سے مل گئے ہیں۔ یہ قلبی تسکین اور روحانی فرحت کا موجب ہیں۔ ادب کا مقصد اگر یہی قلبی خوشی اور تسکین بہم پہونچانا ہے تو ان کے مطالعے سے بوجہ احسن اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ بعض شعر تو دل کے ساز پر مضراب کا کام کرتے ہیں۔

غزل گو شعراء کے ہاں نفسیاتی ژرف بینی کی مثالیں بہت ملتی ہیں۔ زمانہ بدل گیا شاعری کے اسلوب اور نظریے بدل گئے۔ لیکن فطرت انسانی میں تغیر نہ ہو سکا لوگ میر کے "ملک" اور "تیل" سے احتراز کرتے ہیں لیکن زمانہ میر کے نشتروں کو اب تک زنگ آلودہ نہ کر سکا۔ یوں تو ہندوستان میں غزل گو شعراء کی کمی نہیں۔ حال یہ ہے کہ ہر شد بد جاننے والا اپنے آپ کو شاعر ظاہر کرتا ہے لیکن واقعی شاعر کا جن پر اطلاق کیا جا سکتا ہے وہ اتنے ہی ہیں۔ جتنے ریگستان میں سر سبز شجر ہندوستان میں غزل گو شعراء کی حیثیت سے حسرت جگر، اصغر، فانی اور جوش بہت مشہور ہیں لیکن ان کے علاوہ بہت سے شاعر ایسے ہیں جن کا کلام نہ صرف ذوق شاعری کی تسکین کرتا ہے بلکہ وجدان کی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔ دلی کیفیتوں کا اتنا صحیح عکس ان شعراء کے کلام میں پایا جاتا ہے کہ کوئی صاحب ذوق سر دھنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

رضا بھی ایک ایسا شاعر ہے۔ اس نے تغزل کو جس معراج پر پہونچایا اس کا شاہد ان کا وہ مختصر دیوان ہے۔ جو "نوائے رضا" کے نام سے ادب کے قدر دانوں میں مشہور ہے ان ہی کے الفاظ میں :-

جو ہوتا ہمسر غالب تو میں یہ کہتا کہ ہے
غزل برائے رضا اور رضا برائے غزل

کہا جاتا ہے: "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" اس کی صحیح تاویل ان کا کلام ہے جذبات کے اتنے اچھے مرقعے رضا نے کھینچے ہیں کہ بے اختیار داد دینے جی چاہتا ہے۔ کتاب دل کی تفسیریں جتنوں میں لکھی اور لکھیں گے لیکن اس مفسر نے جس طرح اس کی تاویل کی اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لطف تو یہ ہے کہ ردیف و قافیہ کی قید بند میں رہ کر ان کے شدید تخیل نے یہ جولانیاں دکھائی ہیں جو اصحاب نظم معریٰ کو اس لئے ترجیح دینا چاہتے ہیں کہ یہ اظہار جذبات کا موزوں ذریعہ ہے اور حقیقت پر اس کی بنیاد ہے انھیں

"نوائے رضا" پڑھ کر یقیناً اپنی رائے بدلنا پڑے گی
...... جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے کہ رضا تغزل کے امام ہیں۔ اسلئے میں پہلے تغزل کے بنیادی جذبے یعنی محبت کے متعلق ان کے اشعار پیش کروں گی۔ اس جذبۂ لطیف کو انھوں نے جن نرم و شیریں الفاظ میں بیان کیا ہے پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے ؎

رضا کتنی حسین و مختصر شرح محبت ہے
نہ راس آئے تو دوزخ ہے جو راس آئے تو جنت ہے

دوسرا شعر سنیئے ؎

زندگی ہو لی کے لیے دل ہے محبت کے لئے
ایک تم یاد ہو اور ایک یہ سبق یاد مجھے

محبت کے مسلک میں "یاد" اور "بھول" ایک مستقل عنوان رکھتے ہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ جب کسی شئے کے لئے اسے دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور وہ شئے اس کی رسائی سے باہر ہو تو وہ اس کی یاد سے دامن بچانا چاہتا ہے لیکن انسان بھول نہیں سکتا۔ اسی خیال کو رضا نے کتنے حسین الفاظ میں سمو لیا ہے۔

؎ وادۂ وفا کا وقت بھی ہے ایک ات سہی کچھ اور سہی
دل سے بھلانے والے ! تجھے ہم رہتے تو یاد آ نکلے

؎ تم وہ تم ہی نہ رہو بھول سکوں گر تم کو
میں وہ میں ہی نہ رہوں تم جو کر دو یاد مجھے

؎ ہاں اور جس طرح بھی ہو تڑپا لیجے مجھے
کچھ ایسا کیجئے کہ نہ یاد آ سکیے مجھے

اور ایک سنیئے ؎

نہ ٹل سکنے کا جن سے فیصلہ قسمت نے کر ڈالا
وہی اس یاس کے عالم میں پہروں یاد آئے ہیں

نفسیاتی ژرف بینی ملاحظہ ہو۔ سب اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ تسلی سے آنسو اور امنڈ آتے ہیں۔ شاعر کے الفاظ میں یہ حقیقت سنیئے ؎

اب کیوں ہے انفعال جو آنسو ٹپک پڑے
میں نے تو کہہ دیا تھا نہ سمجھایئے مجھے

امید یک بیک ٹوٹ جائے تو بڑی مشکل سے صبر آتا ہے تب ہی تو کسی شاعر نے کہا ہے ؎

؎ تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو
رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے

یہی کیفیت رضا نے بھی بیان کی ہے۔

؎ ورنہ تو اٹھا تم نے دیا تو اور بھی دامن تر کیا مجھے
ٹوٹا ہے سہارا دل کا صبر آتے آتے آئے گا

یاد ماضی کی عادت در حقیقت رفتہ رفتہ انسان کی فطرت بن چکی ہے۔ رضا نے بھی لطیف طریقے سے یہی حقیقت اشعار میں سموئی ہے ؎

اک خواب سا میں نے دیکھا تھا ہاں سچ ہے تمہیں کیوں یاد آئے
باتوں کا وہ بڑھنا راتوں میں راتوں کا وہ گھٹنا باتوں میں

معلوم ہوتا ہے الفاظ میں موسیقیت اور شیرینی گھول دی گئی ہے ؎

یہ یاس کا سناٹا تو نہ تھا جب آس لگائے سنتے تھے
مانا کہ تھا دھوکہ ہیں دھوکا ان میٹھی میٹھی باتوں میں

یا

؎ بجا ہے جو تمھارے ذکر سے ہوں میں وہ اٹھا
تمھارے واسطے ہاں بھولنے والی حکایت ہوں

محبوب کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر شکوہ تو بہت کرتے ہیں لیکن اسے برداشت کرنے کا ظرف بہت کم میں ہوتا ہے۔ یہاں رضا محبوب کے ظلم کا ذمہ دار بھی اپنے ہی کو ٹھیراتے ہیں۔ شاید فرط محبت کی وجہ ہے ؎

قسم لے لو جو شکوہ ہو تمھاری بے وفائی کا
کئے کو اپنے روتا ہوں مجھے جو صبر کھو ڈالو

اور

دل ہی تو ہے آخر بھر آیا تم ہیں یہ جبیں کیوں ہو تم سے
ہم تم کو بھلا کچھ کہتے ہیں تقدیر کا اپنی رونا ہے

جذبات نگاری ملاحظہ ہو:-

؎ جو مٹنے والی شئے تھی مٹ گئی اس کا نہیں غم ہی
مگر یاد ہی کیوں تھا آس ایسی اس کا ماتم ہی

؎ فریاد کررہی ہے یہ تری ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

؎ گھر سونا ہے بن سونا ہے ساری دنیا سونی ہے
دل کا سکہ لیجانے والے کیا نہ پلٹ کر آئیں گے

مایوسانہ جذبات کی عکاسی

؎ اداسی مجھ پہ چھائی رہتی ہے گو دو گھڑیاں کی
میں اپنے حوصلوں کی اپنے ارمانوں کی تربت ہیں

؎ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن
مر رہا ہوں یہ بھی مری محروم قسمت میں نہیں

؎ اعتبار اور ایک نااہل وفا پر اعتبار
جا خیال عہد و پیماں جا مجھے د ہو کا ہوا

؎ دل بھی نہ رہا وہ تو نہ دل بھی نہیں ہے
آنکھوں میں ہے تصویر مکاں ہے نہ مکیں ہے

مختصراً اس ساز میں نغموں کی فراوانی اور ہر نغمے کی دلاویزی کی وجہ یہ ہے کہ کلام رضا سنی سنائی باتوں کا بیان نہیں بلکہ قلب رضا کے مشاہدات کا آئینہ ہے۔ اس رباب پر دست محبت نے سارے سُر ایک ایک کرکے بجائے ہیں اور "نوائے رضا" ان ہی سروں کی صدائے بازگشت ہے۔

نئی بزم نیا ساز

اب وہ پازیب کی جھنکار سنوں گا نہ کبھی
تیری معصوم سی قلقار سنوں گا نہ کبھی

تیرے اڑتے ہوئے آنچل کا سہارا لے کر
اب نہ چوموں گا چھلکتے ہوئے پیمانوں کو
اب سنور ہی نہ سکے گی تری بکھری ہوئی لٹ
اب سے کوئی نہ سجائے گا شبستانوں کو!

تیرے فانوس سے اب اٹھ آئے گی نہ کبھی
یونہی اب جلنے نہ دوں گا کبھی پروانوں کو!
اب تری بزم میں بے ہوش نہ ہوگا کوئی
آج سے جینے نہ دوں گا ترے دیوانوں کو
اب چرا ہی نہ سکیں گی تری آنکھیں مجھ کو!
اب پلٹ کر بھی نہیں دیکھوں گا میخانوں کو
اپنی آنکھوں کی زباں عام کروں گا نہ کبھی
اشک بننے نہیں دوں گا کبھی ارمانوں کو

اب نہ آؤں گا ترے گرم شبستانوں میں
اب جلوں گا نہ تری آگ بھری تانوں میں

مسکر سا جو مرے جذبات پہ طاری کر دے
ایسی فطرت کے نظاروں کو نہیں دیکھوں گا
جن کی موجوں میں تلاطم نہ ہو طوفان نہ ہو
ایسے افسردہ کناروں کو نہیں دیکھوں گا
جو تپا بھی نہ سکیں اپنی فضاؤں کا جگر
اب میں ان سرد ستاروں کو نہیں دیکھوں گا

اپنے بجھتے ہوئے تنکوں کو جلا لوں گا نہ کبھی
اتنے بے جان شراروں کو نہیں دیکھوں گا
گھول کر رکھ دیں رگ و پے میں جو اک مستی سی
ایسی آنکھوں کے اشاروں کو نہیں دیکھوں گا
میرے احساسِ غلامی کو مٹا دیں جو کبھی
میں وطن کی وہ بہاروں کو نہیں دیکھوں گا

ایسی فطرت کا کوئی پاس نہیں ہے مجھ کو
اب ترے حسن کا احساس نہیں ہے مجھ کو

اک نئی بزم نئے ساز کی حاجت ہے مجھے
اس نئی بزم کا سامان تو کر لوں پہلے
تیرے آنچل ہی کو طوفاں میں اڑانا ہے مگر
میں تجھے تجھ سے کچھ انجان تو کر لوں پہلے
سرد تاروں کو ذرا آگ لگا دوں تو سہی
اپنی ہر موج کو طوفان تو کر لوں پہلے
وقت کی باگ کو ہاتھوں میں تھما لوں تو سہی
اپنی ہر بات کو فرمان تو کر لوں پہلے
مندمل تو کروں تہذیب کے رستے ہوئے زخم
آدمی زاد کو انسان تو کر لوں پہلے

پھر وہی بزم وہی ساز وہی ہم ہوں گے
لیکن ان باتوں کا امکان تو کر لوں پہلے
پہلے احساس کی مشعل کو جلا لوں تو سہی
اپنی زنجیرِ گراں بار گلا لوں تو سہی

اقبال متین

انتقام

پیاری عذرا!

تمہارا خط ملا، میرے سوئے ہوئے جذبات پھر بیدار ہوئے۔ میرے دلسوز اور رنجیدہ واقعات کو جان کر کیا کرو گی؟ ہاں تم کچھ کر سکتی ہو۔ میری زندگی کے واقعات سے سبق لے سکتی ہو۔ "اگلا گرا پچھلا ہشیار" سنو! آج اپنی داستان سینے پر پتھر رکھ کر تمہیں سناتی ہوں۔ اس مدفون محبت کے واقعات کو جنھیں گزرے ایک طویل عرصہ ہو چکا ہے، سننے کی تمہیں کیوں اتنی بے چینی ہے؟

شادی کے چند سال محبت و مسرت میں گزرے۔ وہ میری ہر حرکت پر مرمٹنے کے لئے تیار تھے، محبت کے دلکش قہقہے سنا کر، پیار کی میٹھی میٹھی باتوں سے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلاتے۔ کئی دن اور کئی خوشگوار راتیں اسی طرح گزر گئیں۔ اب وہ تمام واقعات میرے لئے ایک سپنے سے زیادہ نہیں۔ میں نے بھی اپنے آرام و راحت کا سرچشمہ انھیں کو سمجھا اس لئے کہ ایک ہندوستانی عورت کی خوشی، راحت اور آرام کا سرچشمہ صرف اس کا سرتاج ہی ہوتا ہے۔ اس وقت مرد کی فطرت سے بالکل ناواقف تھی۔

مرد کو عورت سے محبت ہوتی ہے لیکن وہی محبت جو ایک بھونرے کو پھول سے ہوتی ہے۔ اس وقت تک جب تک کہ پھول کی رعنائی زینتِ گلستاں ہو اور اس میں امرت موجود ہو۔ لیکن جب پھول خود بھونرے کے ہاتھوں مسل دیا جاتا ہے اور وہ رعنائی باقی نہیں رہتی تو پھر بھونرے کو تسلّی اور پھول کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن میں ان کی محبت میں اس طرح کھوئی ہوئی تھی کہ مجھے ان چیزوں کا مطلق خیال نہ آیا۔ میں ان کی محبت کے نشہ میں اس قدر مدہوش تھی کہ دوسری چیزوں کا خیال تک نہ رہا۔ لیکن یہ نشہ زیادہ دن نہ رہا۔ آنکھیں کھلیں اور ان آنکھوں نے وہ نظارہ دیکھا کہ ہمیشہ کے لئے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چند دن سے وہ کھوئے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اکثر بہت رات گئے آتے اور علی الصبح دفتر کے بہانے نکل جاتے۔ ان کی بدلی ہوئی نگاہیں اور پرشکن پیشانی سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اب اس جگہ سے نفرت ہے۔ کبھی کبھی بات کرنے کا موقع ملتا۔ میں نے اکثر اس خاموشی کا سبب پوچھا لیکن کوئی معقول جواب نہ ملا۔ مرد کو سمجھنا ہر عورت کا فرض ہے اور میں نے ان کی چکنی چپڑی محبت آمیز باتوں میں آکر اس فرض کو بھی بھلا دیا۔ کتنی بڑی غلطی کی میں نے آہ! میں یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ ان کے دل میں میرے سوا اور کسی کے لئے جگہ نہیں۔ لیکن یہ خیال خام تھا۔ میں یہ سمجھی ہوئی تھی کہ شاید دفتری کاروبار سے ان کی مصروفیت بڑھ گئی ہوگی ہم "پردہ نشین" کیا جانیں مردوں کی "بیرونی مصروفیات" کو۔ خیالات کی تبدیلی اور پریشانی کسی خاص وقت اور موقع کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ فوری اور ناگہانی احساس بن کر آتی ہے اور ہمارے ذہن پر چھا جاتی ہے۔

عذرا! میں ایک مرتبہ ان کے کمرے میں گئی۔ شام ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی نہیں آئے تھے۔ ان کے انتظار میں ایک بستر پر لیٹ گئی۔ دفعتاً میری نظر ایک لفافہ پر پڑی۔ میں نے اسے اٹھا لیا۔ لفافہ ان کے نام تھا۔ میں نے اس میں سے چٹھی نکالی اور خلافِ عادت غیر ارادی طور پر میری نظریں اس پر پڑ گئیں۔ میں نے اسے پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں خط پڑھتی گئی میرا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ خط نہیں تھا بلکہ آئینہ تھا جس میں میرے تاریک مستقبل کی بڑی ڈراؤنی صورت نظر آ رہی تھی۔ اس کاغذ کے پرزے پر کی چند سطور نے میرے نظریاتِ زندگی بدل ڈالے۔ اس وقت مجھے

احساس ہوا کہ میں عقل رکھتے ہوئے بے وقوف، آنکھیں رکھتے ہوئے اندھی اور دنیا میں رہتے ہوئے اس کے حالات سے ناواقف تھی۔ خط کیا تھا ایک مختصر سی چٹھی تھی جس نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی۔ یہ خط ایک غیر شریف عورت کا تھا۔

ڈیر طاہر!

مجھے افسوس ہے کہ کل میری طرف سے آپ کو رنج ہوا میں اپنے قدیم دوست خالد کے ساتھ چلی گئی۔ معافی چاہتی ہوں۔ لیکن وعدہ کرتی ہوں کہ آج رات ۱۰ بجے میرے بنگلے پر اسی لباس میں جسے تم پسند کرتے ہو ملبوس تمہارے خیر مقدم کے لئے تیار رہوں گی' ڈارلنگ ضرور آئیے گڈ بائی۔

ممتاز

اس خط کے پڑھنے کے بعد مجھ پر یاس و نا امیدی کا عالم چھا گیا۔ اب ان سے وفا کی امید رکھنا گویا صحرا سے پانی کی امید رکھنے کے برابر تھا۔ اب یہاں سے ہماری زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اب مجھ سے ان کی طبیعت سیر ہو چکی تھی۔ ایک اور سے وہ محبت کا رشتہ جوڑ رہے تھے۔ محبت کیوں لکھوں؟ محبت تو وہ پاک جذبہ ہے جس میں انسان اگر چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ محبت ایک زبردست جادو ہے جس کے آگے دنیا کی تمام طاقتیں بیکار ہیں۔ محبت ایک ہی سے کی جاتی ہے اور یہی وہ زینہ ہے جہاں سے انسان خدا کو پا سکتا ہے۔

پہلی مرتبہ یہ محسوس کرکے کہ میری برابری کرنے والی ایک ادنیٰ پیشہ کی عورت ہے' دل پر ایک سخت چوٹ لگی اس صدمے نے مجھ پر بے ہوشی کی حالت طاری کر دی اور اسی سوچ میں آنکھ لگ گئی لیکن یہاں بھی چین نہ تھا۔ سنہرے سپنوں کے بجائے پریشان کن واقعات مجھے ستا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ کھلی ملازمہ سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ آئے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد یہ کہہ کر چلے گئے کہ "رات دیر سے آئیں گے انتظار نہ کیا جائے"۔ عذرا اسی خیال و فکر میں رات کا ایک بڑا حصہ گزر گیا۔ وہ آئے میں جاگ رہی تھی۔ حسب معمول خندہ پیشانی سے میں نے ان کا استقبال کیا میرے دماغ کی اس وقت وہی کیفیت تھی جیسے کہ سطح سمندر پر بظاہر سکون ہو لیکن اس کے اندر ہزاروں طوفان مچل رہے ہوں میں نے اپنی اس دماغی الجھن کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ بجائے اس کے کہ اتنی رات تک جاگ کر انتظار کرنے کا شکریہ ادا کرتے الٹا کہنے لگے "اتنی دیر تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی، جاؤ سو جاؤ"۔ میرے دل پر ایک برچھی سی لگی اور میں تڑپ کر رہ گئی۔

عذرا! اب تم خود فیصلہ کر سکتی ہو کہ اس وقت میری کیا حالت ہو گی۔ میں جان چکی تھی کہ اب وہ ایک ایسے کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں جہاں سے چھٹکارا ناممکن تھا۔ ان فیشن ایبل اور بازاری عورتوں کو نوجوان دلوں کے مندر میں ارمان کے چراغ جلانے کا شوق ہوتا ہے۔ ان عورتوں کو اس سے کیا غرض کہ اس میں شریف عورتوں کی تباہی ہے۔ ان کے سینے میں وہ دل نہیں ہوتا جو اوروں کی تکلیف کا احساس رکھتا ہو بلکہ پتھر سے زیادہ سخت چیز ہوتی ہے' جو کسی حالت میں نرم نہیں ہو سکتا۔

ساری رات اسی الجھن میں گزری۔ رات بھر اس دماغی الجھن نے میری نیند حرام کر دی۔ وہ میرے قریب ہی دوسرے پلنگ پر سو رہے تھے۔ میرا دماغ مجھے انتقام کی دعوت دے رہا تھا۔ اگر میں چاہتی تو جوشِ انتقام میں انہیں ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سلا سکتی تھی لیکن نہیں ——— ایک شریف ہندوستانی

عورت کے انتقام کی نوعیت ہی الگ ہوتی ہے۔ اس کا معیار اوروں کے انتقام سے اونچا ہوتا ہے۔
بالآخر صبح ہوئی۔ وہ معمول کے مطابق تھوڑی دیر بعد "دفتر" چلے گئے۔ میرا شوہر پرست ضمیر مجھ سے اس بات کا متقاضی تھا کہ اپنے شوہر کے راحت و آرام میں خلل نہ ہونا چاہیئے۔ سارا دن....اسی کش کش میں گزرا۔ آخر ایک بڑی کش کش کے بعد میں اس بات پر راضی ہوگئی کہ خاموشی سے یہاں سے رخصت ہو جاؤں تاکہ "اس کے" آرام میں خلل نہ پڑے۔ شام تک ان کا انتظار کیا شاید ان کو پھر ایک مرتبہ دیکھ لوں لیکن وہ نہیں آئے۔ میں نے رات کی تاریکی میں چند ضروری اشیاء جو خالص میری ملکیت تھیں اور "ان کا" ایک فوٹو لے کر اس مکان کو جس میں ماضی کے چند خوشگوار دن گزارے تھے خیر باد کہا۔ ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ ایک شاندار کھلی موٹر سامنے آتی نظر آئی۔ اس کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ ان کے پہلو میں کوئی اور بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ وہی موٹر تھی جسے انھوں نے مجھے دو سال پیشتر عطیہ دیا تھا۔ وہ موٹر خریدی گئی تھی میرے لیئے لیکن اس میں بیٹھی ہوئی تھی ایک معمولی درجے کی عورت۔ وہ اس سے مسکراتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔
عذرا میں نے انھیں ایک نظر میں دیکھ لیا اور فوراً ایک طرف کو مڑ گئی۔ موٹر فرّاٹے بھرتے ہوئے میرے بازو سے نکل گئی۔ وہاں سے سیدھا اس کنج میں پہنچی اور یہیں سے کبھی کبھی وہ اپنے "نئے" ساتھی کے ہمراہ گزرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں خوش دیکھ کر خدائے تعالیٰ کا شکر کرتی ہوں اور ان کی ترقی اقبال و صحت کی دعا کرتی ہوں۔ دیکھا تم نے میرا انتقام ——— ایک شریف ہندوستانی عورت کا انتقام گو ان سے اب کوئی غرض و غایت نہیں ہے لیکن ان کا خیال ہمیشہ میرے دل میں ہے۔
چونکہ تم نے چھیڑ دیا تھا اس لیئے بے تاب خیالات آنے لگے جنھیں میں نے سپرد قلم کر دیا ہے۔ یہ ہے میرا افسانۂ محبت۔ اچھا خدا حافظ۔

ہمیشہ تمہاری　صغرا باجی

ابوالعسکر سید عبدالقادر ہاشمی

رات کا بھولا اور دیگر افسانے:۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبدالقیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

من کی دنیا:۔ حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔
صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

حشرِ جذبات

کوئی رنگینی بھی میری چشمِ حیراں میں نہیں ۔۔۔ دل یہ کہتا ہے کہ شائد وہ گلستاں میں نہیں

دے رہا ہے ہم نفس کیوں طعنہ ہائے دل خراش ۔۔۔ اب تو میرا دستِ وحشت بھی گریباں میں نہیں

غم کی راتوں میں جو میرے سوزِ دل کے کام آئے ۔۔۔ کیا وہ شادابی بھی تیرے شبنمستاں میں نہیں

پھر تجھے رنگینیٔ بت خانہ کیوں کر ہو نصیب ۔۔۔ کفر سامانی کا عالم تیرے ایماں میں نہیں

کیا کرے گا تیری فرقت میں مرا دستِ جنوں ۔۔۔ ایک بھی جب تار باقی جیب و داماں میں نہیں

کس طرح بہلاؤں میں اپنے دلِ غم ناک کو ۔۔۔ حُسن کا منظر بھی میری چشمِ حیراں میں نہیں

پھر میں ایسی نزہتِ رنگیں کو لے کر کیا کروں ۔۔۔ جب کہ تسکیں کا سبب رنگِ گلستاں میں نہیں

کائنات زندگی پر غور تُو کرتا ہے کیوں ۔۔۔ کون سا وہ راز ایسا ہے جو انساں میں نہیں

ہو چکا نذرِ محبت دل کا ہر اک ولولہ! ۔۔۔ اب کوئی جذبہ مرے جذباتِ پنہاں میں نہیں

کر تو دیتا جامۂ ہستی کو اپنے تار تار ۔۔۔ ضعف سے لیکن یہ طاقت دستِ لرزاں میں نہیں

کیا بدل سکتا نہیں ثاقب یہ نظمِ کائنات

کیا اثر اتنا بھی میری آہِ سوزاں میں نہیں

ثاقب (کانپوری)

"تذکرۂ شاعراتِ اردو" پر ایک تنقیدی نظر

یہ کتاب حال میں شائع ہوئی ہے۔ اس کے مضامین کی تفصیل حسب ذیل ہے:-
ڈاکٹر عندلیب شادانی پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی نے تعارف لکھا ہے، پروفیسر محمدؐ طاہر نے پیش لفظ قلمبند کیا ہے۔ محمد جمیل احمد مولف نے (۱۳) صفحے کا التماس اور (۹۱) صفحات کا "مقدمہ" تحریر کیا ہے، مقدمہ میں شاعرات کے کلام کی تدوین کی ضرورت، اُردو زبان کی تخلیق اور ارتقاء اور اردو شاعری کے آغاز وغیرہ پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ "بدھ" کے زمانے سے اُردو کی تخلیق کا تذکرہ کرتے ہوئے امیر خسرو کو پہلا شاعر قرار دیا ہے، اس تفصیل کے بعد شاعرات کے کلام پر نظر ڈالی گئی ہے، زیب النساء بیگم کو اُردو زبان کی پہلی شاعرہ تصور کیا ہے، پھر دہلی اسکول اور اس کے بعد لکھنؤ اسکول کی شاعرات پر تبصرہ کرنے کے بعد دورِ حاضر کی شاعرات سے بحث کی گئی ہے، اس تفصیل میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ دور میں دہلی اور لکھنؤ اسکول کے امتیازات مٹ گئے ہیں۔ غالب، اقبال، جوشؔ وغیرہ کے رنگ میں اشعار کہے جا رہے ہیں۔ تشبیہات، استعارات کی ندرت، جذبات نگاری اور فلسفیانہ مضامین ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں، اس خصوص میں مثالوں کے ذریعہ اپنے دعوے کی تائید کی ہے۔

مقدمہ کے بعد نفس مضمون شروع ہوتا ہے۔ اس میں اولاً "موجدین" کے عنوان کے تحت زیب النساء بیگم کا تعارف کرایا گیا ہے، اس کے بعد دہلی اسکول کے عنوان سے (۴۷) شاعرات کا تذکرہ (۴۴) صفحات میں اور لکھنؤ اسکول کی (۲۴) شاعرات کا بیان (۲۰) صفحے میں آیا ہے، اس کے بعد دورِ حاضر کی شاعرات کا تذکرہ ہے جو ردیف وار ہے۔ (۱۴۳) خواتین کو متعارف کیا گیا ہے۔ یہ بیان (۱۰۵-۱۶) صفحات پر مشتمل ہے، آخر پر اشاریہ بھی (۲۰) صفحے میں آیا ہے۔ یہ ہے مختصر اقتباس۔ مولف نے اس امر کا بھی اظہار کیا ہے کہ طوائفین شاعرات کو نظرانداز کر دیا گیا ہے، اور ان کے متعلق علحدہ کتاب پیش کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ جمیل احمد صاحب نے نہایت محنت سے اس کتاب کو مرتب کر کے سلیقہ کے ساتھ پیش کیا ہے، لیکن کتاب میں چند فروگذاشتیں بھی ہیں جن کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) پہلی فروگذاشت یہ ہوئی ہے کہ مولف نے شاعرات کے تذکرہ میں اپنے ماخذوں کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے اور نہ مقدمہ یا التماس میں ان کتابوں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس کی وضاحت نہ ہونے سے ہر شخص یہ تصور کرے گا کہ مولف نے بذاتِ خود شاعرات کے حالات اور کلام کو فراہم کیا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، چنانچہ حیدرآباد کی جن شاعرات کا تذکرہ ہے، ان میں سے دو کے سوا باقی جس قدر شاعرات کا تعارف کرایا گیا ہے وہ حیدرآباد کی ایک کتاب "خواتین دکن کی اردو خدمات" سے ماخوذ بلکہ لفظ بہ لفظ نقل ہے، اس کے ثبوت میں دو ایک کے حالات ملاحظہ ہوں۔

تذکرہ شاعرات اردو	خواتین دکن کی اردو خدمات
اسیر۔ رحمت بیگم المتخلص بہ اسیر، ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب حیدرآبادی کی دختر اور رحمت اللہ شریف صاحب حیدرآباد کی	اسیر۔ رحمت بیگم المتخلص بہ اسیر، ڈاکٹر عبدالوہاب صاحب کی دختر اور رحمت اللہ شریف صاحب اول تعلقدار کی

اول تعلقدار کی شریک حیات ہیں تعلیم خانگی طور سے ہوئی۔ شعرگوئی کا اچھا ذوق ہے، گو کسی سے تلمذ حاصل نہیں۔ رسالہ شہاب میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوتا ہے، پاکیزہ، سنجیدہ ہوتا ہے۔ خیالات میں بلندی اور جدت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کے مضامین پُر از معلومات اور مفید ہوتے ہیں۔ زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہوتا ہے۔ کلام کا نمونہ یہ ہے

فکر فردا ہے نہ اب ہم کو خیال دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

صفحہ (۲۵۹)

صغرا

صغرا۔ حیدرآبادی، صغرا بیگم نام اور صغرا تخلص ہے۔ آپ مرزا محمد علی خاں مرحوم سابق صوبہ دار کی چھوٹی صاحبزادی ہیں، آپ کے دادا مرزا موسیٰ خاں مرحوم سرکار آصفیہ کے پہلے ناظم تعلیمات تھے، اور چچا مرزا مہدی خاں کوکب اچھے شاعر اور حیدرآباد کے سب سے پہلے طالب علم تھے جنھوں نے یورپ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں

محترمہ صغرا بیگم کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ آپ نے محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم پائی۔ شادی کے بعد بنگال میں شانتی نکیتن کی سراپا شعر اور موسیقی کی رنگین فضاؤں میں کچھ عرصہ تک رہنا ہوا، خاندانی ماحول کے علاوہ فطری رجحان کے باعث آپ کو شعر و سخن کا ذوق ہے۔ آپ کی شادی ڈاکٹر امیر خاں المتخلص بہ ہاکنم سے ہوئی ہے۔ آپ کے کلام میں سادگی و صفائی ہے زبان سلیس لکھتی ہیں۔

خوشی سی عالم پہ جب چھا رہی تھی
میکدہ مستی سے سوئے عدم جا رہی تھی

صفحہ (۵۴۵)

شریک حیات ہیں، تعلیم خانگی طور سے ہوئی۔ شعرگوئی کا اچھا مذاق ہے۔ گو کسی سے تلمذ حاصل نہیں ہوا۔ رسالہ شہاب میں آپ کا کلام اکثر شائع ہوا کرتا ہے کلام پاکیزہ اور سنجیدہ ہوتا ہے، خیالات میں بلندی اور جدت پائی جاتی ہے، اسی طرح آپ کے مضامین پُر از معلومات اور مفید ہوتے ہیں، زبان صاف اور اسلوب بیان دلچسپ ہے، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:-

فکر فردا ہے نہ اب ہم کو خیال دوش ہے
ایک ہم ہی کیا ہیں ساری بزم ہی مدہوش ہے

صفحہ (۵۹)

صغرا بیگم

صغرا بیگم۔ مرزا محمد علی خاں مرحوم سابق صوبہ دار کی چھوٹی دختر ہیں، آپ کے دادا مرزا موسیٰ خاں مرحوم سرکار عالی کے پہلے ناظم تعلیمات تھے اور چچا مرزا مہدی خاں کوکب بہت اچھے شاعر اور حیدرآباد کے سب سے پہلے طالب علم تھے جنھوں نے یورپ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔

صغرا بیگم کی پیدائش ۱۹۱۱ء میں حیدرآباد میں ہوئی۔ محبوبیہ گرلز اسکول میں تعلیم ہوئی۔ شادی کے بعد بنگال کے شانتی نکیتن کی سراپا شعر و موسیقی کی رنگین فضا میں کچھ عرصہ تک رہنا ہوا، خاندانی ماحول اور آپ کے فطرتی رجحان کے باعث شعر و سخن سے دلچسپی ہے۔ محبوبیہ اسکول کے تعلیمی زمانہ میں لکھی ہوئی ایک نظم رسائی و شائستگی طبع کی گواہی دیتی ہے، اس کے بعد شانتی نکیتن کی رنگین فضا میں جو بادۂ ٹیگور کی سرمستیوں سے معمور ہے رہنا ہوا اور پھر اب جو شادی ڈاکٹر امیر علی خاں المتخلص بہ ہاکنم سے ہوئی ہے جو خود بھی فن شعر سے بے بہرہ نہیں تو توقع ہے کہ آپ کی شعرگوئی کو اور بھی جلا ہوگی۔

خوشی سی عالم پہ جب چھا رہی تھی
میکدہ مستی سے سوئے عدم جا رہی تھی

صفحہ (۴۴)

لیلیٰ - لیلیٰ بیگم نام اور لیلیٰ تخلص ہے - حیدرآباد کی شاعرہ ہیں، آپ سید امین الحسن صاحب ناظم عدالت حیدرآباد کی شریک حیات ہیں، شاعری کا شوق ہے - اپنے شوہر ہی سے تلمذ حاصل ہے - آپ کا کلام ادبی رسائل میں شائع ہوتا ہے - آپ کے کلام میں خیالات کی بلندی، رنگینی اور لطافت موجود ہے نمونہ کلام یہ ہے

اس انداز سے آئے غصہ میں وہ
کہ ہر اک ستم مدعا ہو گیا

صفحہ (۵۹۱)

لیلیٰ - لیلیٰ بیگم لیلیٰ تخلص، سید امین الحسن صاحب سابق ناظم عدالت خفیفہ کی شریک زندگی تھیں - شاعری کا بڑا شوق تھا - اپنے شوہر سے تلمذ حاصل تھا - رسالہ شہاب میں اکثر و بیشتر آپ کی غزلیں شائع ہوتی تھیں - خیالات کی بلندی، رنگینی اور لطافت آپ کے کلام کے جوہر تھے - افسوس ہے کہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا -

اس انداز سے آئے غصہ میں وہ
کہ ہر اک ستم مدعا ہو گیا　　صفحہ (۸۸)

مخفی نہ رہے کہ "شاعرات اردو" ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ہے اور "خواتین دکن کی اردو خدمات" ۱۹۴۰ء میں شائع ہو چکی تھی اپنے ماخذ کا حوالہ دینا ہر مصنف اور مولف کا اخلاقی فریضہ ہے، اس کو ترک کرنا صحیح نہیں ہو سکتا -

(۲) شاعرات کے حالات کی طرح مقدمہ میں بھی بعض جگہ تو حوالہ دیا گیا ہے مگر اکثر مقامات میں حوالہ نہیں دیا گیا -

(۳) اردو کی ابتدا کو "بدھ" کے زمانہ سے ہونے کا قیاس کیا گیا ہے - یہ دعویٰ ماہرین لسانیات کی تحقیق کی رو سے غلط ہے، یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ چکا ہے کہ اردو کی تخلیق مسلمانوں کی آمد سے شروع ہوتی ہے - "بدھ" کے زمانہ سے اردو کی تحقیق کے دعوے کو محققین ہرگز قبول نہیں کر سکتے -

(۴) زیب النساء بیگم دختر عالمگیر خلد آشیانی کو اردو زبان کی پہلی شاعرہ قرار دیا ہے، لیکن شہزادی کا کوئی کلام پیش نہیں کیا گیا - فاضل مولف کا خیال ہے کہ زیب النساء بیگم نہایت قابل شہزادی تھی - فارسی کی زبردست شاعرہ تھی، اردو زبان کی ابتدا اس زمانہ میں ہو چکی تھی اور پھر اردو شاعری بھی مروج تھی - بعض اصحاب نے چند اردو شعر شہزادی کی جانب منسوب بھی کئے ہیں، ان وجوہ کے مدنظر یہ خیال صحیح ہو سکتا ہے کہ ..... زیب النساء بیگم نے ضرور اردو میں شعر کہا ہوگا -

اس میں شک نہیں کہ مولف کا خیال قرین قیاس ہے، بہت ممکن ہے کہ آئندہ زیب النساء بیگم کا اردو کلام مل جائے، مگر موجودہ معلومات کی حد تک یہ خیال تسلیم نہیں کیا جا سکتا -

(۵) اگرچہ تذکرہ (۸۳۲) صفحات پر مشتمل ہے، مگر قدیم شاعرات کا تذکرہ صرف (۶۸) صفحات میں آیا ہے - کئی ایک قدیم شاعرات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، جن میں سے بعض یہ ہیں - امیر بیگم ادا اودھم بائی، بنو بی بی، جانکی بی بی، جمعیت، قمر النساء حجاب، سلطان جہاں بیگم حیا، امیر النساء بیگم غریب، گنا بیگم، نزاکت، شرف النساء، فاطمہ وغیرہ یہ سب لکھنؤ، دہلی اور دکن کی مشہور شاعرات ہیں - ان کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہو سکتا -

(۶) عصر حاضر کی شاعرات کا تذکرہ اگرچہ (۶۰۵) صفحات میں کیا گیا ہے - مگر اس کے باوجود ہندوستان کے ہر حصے کی بیسیوں شاعرات متروک ہو گئی ہیں - خصوصاً بعض تو اپنے بلند پایہ کلام

کے باعث خصوصیت رکھتی ہیں۔ ان کا تذکرہ نہ ہونا ایک بڑی خامی ہے۔ ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔
ح' ب صاحبہ مہجور مصنفہ نوائے حرم۔ زہرہ بتول صاحبہ، جاشی بی بی ناز۔ بلقیس فاطمہ بیگم بیکس۔ برجیس اکرم برقی۔ م۔ خ صاحبہ حجاب۔ صغرا فاطمہ بیگم صغرا، سلمہ مرتضیٰ وغیرہم۔

(۷) عصر حاضر کی بعض شاعرات کے کلام کے متعلق زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ اس سے دوسری شاعرات کی حق تلفی ہوتی ہے۔

(۸) بعض شاعرات کے نمونۂ کلام کو اندازے سے کہیں زیادہ پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے کتاب کا حجم تو زیادہ ہوگیا مگر بیسیوں شاعرات متروک ہوگئیں۔ اسی حجم میں اس سے زیادہ شاعرات کا تعارف ہوسکتا تھا۔ اور کسی کو شکایت کا موقع بھی نہیں رہتا۔

(۹) بعض شاعرات کا تذکرہ مکرر کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک ہی شخصیت دو جگہ علحدہ علحدہ نمایاں ہوئی ہے۔ مثلاً صفحہ (۳۱) پر سیدہ احمد النسا بیگم ثریا کا تذکرہ اور نمونۂ کلام "خواتین دکن کی اردو خدمات" سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے بعد ہی ثریا سلیم صاحبہ کے نام سے پھر ان کا تذکرہ ہوا ہے جو غالباً رسالۂ عصمت سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک ہی شخصیت دو حیثیت سے متعارف ہوگئی ہے۔

(۱۰) "خواتین دکن کی اردو خدمات میں" حیدرآباد، برار، مدراس، میسور کی (۶۰) شاعرات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور زیر نظر کتاب میں حیدرآباد اور برار کی صرف (۲۷) شاعرات کا حال ہے۔ میسور اور مدراس کی شاعرات کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے اور حیدرآباد کی (۵۴) سے زیادہ شاعرات متروک ہیں، مدراس اور میسور کی بعض شاعرات اپنے کلام کے مدنظر خصوصیت کی مالک ہیں، ان کو نظر انداز کردینا بڑی ناانصافی ہے۔ مثلاً حضرت شاکر مدراسی کی بیگم محترمہ حبیب اور ان کی دو لڑکیاں آتیمہ اور ضیاء۔

بہرحال اگر کوشش کی جاتی تو "شاعرات اردو" میں اس سے زیادہ شاعرات کا تعارف کرایا جاسکتا تھا۔ اب تو کوئی ایک کتابیں خواتین کی شاعری کے متعلق شائع ہوئی ہیں مثلاً کلام نسواں مولفہ جمیل برنی، تذکرۂ جمیل مولفہ عبدالرزاق بسمل، مشاہیر نسوان، خواتین دکن کی اردو خدمات، خواتین عہد عثمانی وغیرہ۔

اگرچہ یہ چند فروگزاشتیں نظر انداز نہیں کی جاسکتیں مگر اس سے کتاب کی اہمیت میں کمی نہیں ہوتی اور جو معلومات پیش کی گئی ہیں ان کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ کتاب دلچسپ اور معلومات آفریں ہے۔ مولف کی محنت اور کاوش قابل مبارک باد ہے۔ توقع ہے کہ نقش ثانی اور زیادہ مواد کا حامل ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی

مدراس میں اردو ۔ اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو ونما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام تفصیل سے درج ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد عہ

فیروزہ

پہلے پہل میں نے اسے کالج میں دیکھا۔ اسٹیج کے سامنے ہی وہ لجاتی ہوئی بیٹھی تھی۔ سنہری رنگت اور گلاب جیسے رخسار۔ حسین آنکھوں پر لانبی سیاہ پلکیں جن کا سایہ اس کے رخساروں پر کانپ رہا تھا۔ نیلی ساڑی میں وہ آسمانی حور معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے اپنی ٹائی درست کی اور ہلکی ہلکی سیٹی بجاتا ہوا اس کے نزدیک سے گزرا وہ پلکیں اٹھائے اسٹیج کی طرف دیکھ رہی تھی اسی وقت چینائی اپنی موٹی توند کے ساتھ اسٹیج پر نمودار ہوا اور ہال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہی تھی جیسے گلاب کا پھول کھل رہا ہے۔ میں اسے دیکھنے میں کھویا ہوا تھا کہ کسی نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ میں گھبرا کر مڑا ندیم کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مجھے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوا۔ کالج کے کیپٹن ہوتے ہوئے بھی میں اپنے فرض کو بھول رہا تھا۔ میں اور زیدی اسٹیج کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت چینائی اپنے موٹے موٹے ہاتھ ہلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ہال میں زیادہ قہقہے بلند ہو رہے تھے اس نے جلدی جلدی اپنی رٹی ہوئی تقریر ختم کی اور اسٹیج سے اتر گیا۔ جلسہ برخاست ہوا۔

میں ہال سے نکل کر اپنی موٹر کی طرف جا رہا تھا کہ اسے لائبریری کے بلند ستون سے سہارا لیے کھڑے دیکھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں؟" اس نے میری طرف دیکھا اور "جی نہیں" کہتی ہوئی چلی گئی۔ میں ناکام سا گھر لوٹا۔ رہ رہ کر اسی کا خیال آ رہا تھا۔ کون ہے یہ؟ کتنی خوبصورت ہے!

دوسرے دن جب میں کالج پہنچا تو وہ وہاں موجود تھی۔ وہ نئی نئی کالج میں داخل ہوئی تھی اور بہت شرمائی ہوئی تھی۔ میں نے کیپٹن ہونے کی حیثیت سے اس کا سب سے تعارف کروایا۔ جب تک کلاس ہوتی رہی وہ شرمائی ہوئی بیٹھی رہی۔ کچھ دنوں تک وہ ہم سب سے الگ الگ رہی مگر آخر کار میں نے اس سے دوستی کر ہی لی۔ ہماری دوستی صرف کالج ہی کی حد تک تھی۔ وہ مجھ سے کالج کے بارے میں باتیں کرتی اور بس۔

ایک شام میں اداس سا اپنے کمرہ میں بیٹھا تھا۔ ہوا کے شدید جھونکوں سے کھڑکی کے باریک پردے اڑ رہے تھے۔ میں نے گنگناتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا دور ندی کا پانی ایک روپہلے تار کی طرح چمک رہا تھا اسی وقت مجھے فیروزہ کا صبیح چہرہ یاد آیا۔ میں نے میز پر سے اس کی تصویر اٹھائی۔ کتنی حسین تھی وہ — بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن میں کنوارے پن کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی۔ حسین چہرے پر وہی دلربا مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ باہر کسی نے مجھے پکارا اور میں تصویر رکھ کر چلا گیا۔ جب واپس ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ چاندنی کی ہلکی روشنی میں باغ پراسرار نظر آ رہا تھا — میں فیروزہ کے تصور میں سو گیا۔ رات میرے خواب کی دنیا اس کے حسن سے جگمگا اٹھی۔

دن یونہی گزرتے رہے مجھے یوں محسوس ہوتا کہ میں فیروزہ کے بغیر خوش نہ رہ سکوں گا۔ وہ بھی اب مجھ سے بے تکلف ہو گئی تھی۔ ہم اکثر اکٹھے سینما دیکھنے جاتے۔ اس کے ساتھ جاتے ہوئے میں فخر محسوس کرتا۔

ایک دن میں نے اسے "مون لائٹ" پارٹی دی۔ کیونکہ ان دنوں چاندنی راتیں بہت دلفریب ہو گئی تھیں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کر لیا کہ وہ ضرور آئے گی۔ ایشیائی ممالک کی وہ حسین ترین رات تھی۔ یوکلپٹس کے تناور درختوں پر سے زرد چاند طلوع ہو رہا تھا۔ میں جس وقت فیروزہ کے گھر پہنچا اس وقت وہ بالکل تیار تھی۔ سفید زرتار ساڑی میں وہ بیحد حسین معلوم ہو رہی تھی۔

پیازی پھولوں کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کے نیچے ہماری کشتی تیار تھی۔ میں نے اسے رنگارنگ کے پھولوں سے

سجایا تھا۔ پھولوں کے درمیان بیٹھی ہوئی فیروزہ مجھے آسمانی پیکر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے سنہری بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چاند کی روپہلی کرنوں نے اس کے گرد زریں ہالا بنا دیا تھا۔ لہروں کی ہلکی موسیقی میں وہ ایک حسین تخیل معلوم ہو رہی تھی۔ میں اس کے پہلو میں نیم دراز اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار اپنی پلکیں اٹھائیں اور جونہی ہماری نظریں ملیں اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ میں نے اس سے محبت کی سرگوشی میں کہا "فیروزہ میری طرف دیکھو۔ میں تم سے محبت ——" جذبات نے مجھے بے قابو کر دیا اور میں نے اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا وہ میرے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھیر رہی تھی۔

میں نے پھر اس سے سرگوشی کی "فیروزی۔ سچ بتاؤ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ سرو کے کانپتے ہوئے نازک سایوں کی قسم میں تم سے ہمیشہ ہمیشہ محبت کرتا رہوں گا۔ حسین چاند اور نقرئی لہریں شاہد ہیں کہ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں۔ بولو کیا تم بھی —— صرف ہاں کہہ دو۔ پھر دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر سکتی ——"

فیروزہ کی جھکی ہوئی پلکیں اٹھیں۔ اُف خدایا اس کا بے پناہ حسن مجھے وارفتہ بنا دے گا۔ میں آہستہ سے جھکا اور —— میرے تشنہ لبوں نے اس کے نازک لبوں پر مہر محبت ثبت کر دی۔ نہ جانے کتنی دیر ہماری کشتی بہتی رہی ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ چاند تناور درختوں کے درمیان غروب ہو رہا تھا۔ ہوا میں اب خنکی بڑھ چلی تھی۔ فیروزہ کانپ رہی تھی۔ میں نے چپو اٹھائے اور کشتی کا رخ پھیر دیا۔

وہ رات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں سوچتا ہوں کہ زندگی مجھے اس سے پہلے اتنی حسین کیوں نہیں معلوم ہوئی تھی۔ دوسری صبح میں مسرور کالج گیا۔ واپسی پر وہ میرے ساتھ تھی۔ محبت کی پیاری روشنی سے اس کا حسین چہرہ جگمگا رہا تھا۔ ہم پھر اسی ندی کے کنارے پہنچے جہاں ہمیں زندگی ملی تھی۔ محبت کی حسین زندگی۔ وہ میرے بازوؤں کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ شفق کی سرخیاں ہم پر آخری نگاہ ڈالتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ وہ نہ جانے کیوں چپ تھی۔ لہروں کی ہلکی موسیقی مجھے پُرمسرت زندگی کا پیغام دے رہی تھی۔ میں نے جھک کر اس کے کان میں کہا "کیا سوچ رہی ہو میری فیروزی۔ آئندہ کے متعلق۔ میری طرف دیکھو میری آنکھیں آئندہ کے سندر سپنے دیکھ رہی ہیں۔ جب دنیا ہمیں نہ ٹوٹنے والے بندھن میں باندھ دے گی۔ اس وقت ہمارے دن کتنے اچھے گزریں گے۔" فیروزہ نے میرے سینے پر سر رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور دو چمکدار آنسو اس کی گھنی پلکوں میں جھلملانے لگے۔ اس نے آہستہ سے کہا "شاید ایسا نہ ہو سکے —— کیونکہ تم مسلمان ہو اور میں۔" میں نے یہ سن کر اسے تسلی دی "میرے یہ مضبوط بازو تمہیں ضرور کسی دن حاصل کر لیں گے۔ محبت میں مذہب دیکھا نہیں جاتا۔ فیروزہ تم نہیں جانتیں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر لوگ ہماری پرمسرت زندگی میں دخل دیں گے تو ہم ہمیشہ کے لئے کہیں دور چلے جائیں گے۔ دور جہاں تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں ہم تم محبت کی سرگوشیاں کریں گے۔ ساون کی ڈبڈبائی ہوئی ندی میں ایک دوسرے کا عکس دیکھیں گے۔ حسین کنج میں تم میرے ساتھ ہوگی اوہ۔ کتنے سنہرے دن ہوں گے وہ۔" میری باتوں نے اسے تسکین پہنچائی اور اس کی محبت نے مجھے طاقت بخشی۔ میں اس کے لئے سب کچھ کرنے تیار تھا۔ "میں اسے ضرور حاصل کروں گا" میں نے سوچا۔ میرے ارادوں میں استقلال تھا۔

دن اس کی محبت میں رنگین ہوتے گئے اس کی نظریں مجھے زندگی کا انوکھا پیغام دیتیں اور میں پہلے سے زیادہ امنگوں اور آرزوؤں سے اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔

امتحانات قریب تھے۔ ہم نے اگلے امتحان کی تیاری کی اور ساتھ ہی امتحان دیا۔ بحمدللہ ہم دونوں پاس ہو گئے۔

دو سال زندگی کی کشمکش میں گزر گئے۔ ایک شام میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں۔ ابا کے انتقال کے بعد سے

امی نے میری آئندہ زندگی کے خواب دیکھنے میں دن گزارے تھے اور اب جبکہ میں اس قابل ہوا تو ان کا یہ خواب ادھورا چھوٹ رہا تھا۔ میں بہت پریشان تھا۔ ایک طرف فرض تھا اور دوسری طرف محبت۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اماں کو سب کچھ بتا دوں گا وہ میری ماں ہیں مجھے کبھی تباہ نہ کریں گی۔ میں نے فیروزہ کی تصویر میز پر سے اٹھالی، اماں کے پاس گیا اور جھجکتے ہوئے ان سے سب کچھ کہہ دیا۔ وہ خاموش تھیں اور میری ملتجی نگاہیں ان کی آنکھوں میں اپنی زندگی تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے جیب سے فیروزہ کی تصویر نکال کر سامنے ڈال دی۔ وہ اسے دیکھنے لگیں ان کے چہرے پر پوشیدہ مسکراہٹ آئی اسی وقت میں نے کہنا شروع کیا کہ فیروزہ کے بغیر میں مر جاؤں گا۔ ماںتا کی کمزوری سے میں نے فائدہ اٹھایا اور آخر کار مسلسل اصرار۔ انکار۔ رنج کی دھمکیاں اور پھر کامیابی! امی مطمئن تھیں۔ فیروزہ کے حسن اور معصومیت نے انھیں جیت لیا تھا۔

اسی شام۔ میں اور فیروزہ کشتی میں بیٹھے آہستہ آہستہ نامعلوم منزل کی طرف جا رہے تھے۔ اس کا سر میرے سینے سے لگا ہوا تھا اور سنہری بالوں کی پریشان لٹیں اس کے دمکتے ہوئے چہرے کو اور حسین بنا رہی تھیں۔ اس کے نیم وا لبوں پر ایک لطیف تبسم کھیل رہا تھا۔ ہم نہ جانے کتنی دیر تک اپنے آپ کو بھولے ہوئے، آنکھوں میں مسرت کے آنسوؤں کے ساتھ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ لہروں کے سینے پر کھلے ہوئے نیلے کنول مسکرا رہے تھے۔

نکہت ناز

جرعے

آج اتنا کام لیں گے اضطرابِ دل سے ہم
تیری محفل لیکے اٹھیں گے تری محفل سے ہم

تو رہین سرخوشی مجبور دردِ دل سے ہم
ہنسنے والے رو کے اٹھے ہیں تری محفل سے ہم

خوب واقف ہیں مذاقِ غم مزاجِ دل سے ہم
حال کو تعبیر کر لیتے ہیں مستقبل سے ہم

اس کی محفل میں پہنچکر اس کی محفل کی تلاش
پوچھنے آئے ہیں منزل کا پتہ منزل سے ہم

پیش قدمی کے لئے طوفاں بڑھا موجیں اٹھیں
جب غرور و ناز سے رخصت ہوئے ساحل سے ہم

زندگی کو زندگی میں موت پر قرباں کیا
معنیٔ عشق و وفا سمجھے بڑی مشکل سے ہم

اب ذرا آساں ہوئے ہیں قیدِ بندِ زندگی
مشکلوں کے ہاتھ آئے ہیں بڑی مشکل سے ہم

آتشِ نفرت میں کیوں جلتی ہے جانِ آرزو
کیوں کسی خورشید رو کو چاہتے ہیں دل سے ہم

چاندنی راتوں میں اکثر ساقیٔ توبہ شکن
بادۂ انوار پیتے ہیں مہِ کامل سے ہم

ساقی صدیقی!

"آوازِ بازگشت"

(از بیکس)

جنابِ بیکس کے کلام کو تمام و کمال پڑھ کر پہلا اثر جو ہم لیکر اٹھتے ہیں وہ سیدھے سادھے الفاظ میں یہ ہے کہ کلام مرغوب ہے۔ جس کو انگریزی میں کہتے ہیں (The book is readable) یہ رائے بغیر کسی قسم کے خاص غور و خوض اور ناقدانہ جائزہ لیے ہوئے ہم قائم کرلیتے ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھ کر طبیعت اکتاتی نہیں، بدحظ نہیں ہوتی اور نہ بھٹکتی ہے۔ میری دانست میں یہی وہ اوصاف ہیں جن کی بنا پر ہم شاعر کے کلام کی خوبیوں پر حکم لگا سکتے ہیں۔ اسی کا نام شاعرانہ تاثیر ہے کہ سنتے ہی دل میں اتر جائے۔ تنقید و تبصرہ تو بعد کی چیزیں ہیں۔ موافق یا مخالف اثرات پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ہم انھیں کی بنا پر تنقیدی اصول وضع کرتے ہیں۔ ادب پہلے آیا ہے اصول بعد میں بنائے گئے ہیں لیکن تنقیدی الفاظ اور اصطلاحوں کے مخمصے میں نہ پڑیے۔ جذبات اور تاثرات کی قیمت الفاظ نہیں ادا کرسکتے۔ الفاظ تو محض ایک نشان، ایک معاہدہ ہیں۔ یہ معاہدہ ان گنت صدیوں سے چلا آتا ہے۔ چند روایتی عناصر ایسے ہیں جن کی بنا پر تمام ادب کی عمارت قائم ہے۔ ہماری زبان سے جب لفظ "کتاب" نکلتا ہے تو ہم اس کے معنی قلم نہیں سمجھتے حالانکہ خود لفظ "کتاب" یا "قلم" کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ نہ ان کی کوئی شکل معین کی جاسکتی ہے نہ آواز اور نہ رنگ۔ پھر بھی ہم کتاب سے کتاب ہی سمجھتے ہیں اور قلم سے قلم۔ ایسا کیوں ہے اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم لاکھوں سال سے اس قسم کے الفاظ کو ان ہی معنوں میں قبول کرتے چلے آئے ہیں اور مختلف امتیازات ہمارے ذہن نشین ہو گئے ہیں۔ ادب میں دوسرا روایتی عنصر جو پایا جاتا ہے وہ فریب یا مجاز ہے۔ مثلاً مصور تصویر میں گہرائی پیدا کرنے سے قاصر ہے مگر وہ مختلف رنگوں کے امتزاج سے ہماری نظروں کے سامنے پستی، بلندی اور گہرائی کا منظر پیش کر دیتا ہے یا جب آپ کے سامنے ناٹک کھیلا جاتا ہے تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ پوری عمر گزری چلی جارہی ہے حالانکہ دو تین گھنٹے میں سارا کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ ادب کے یہ وہ روایتی عناصر ہیں جن میں سے کسی ایک کو رد کر دیجے سے سارا ادب بے جان الفاظ کا ایک مجموعہ ہو کر رہ جائے گا اور تمام کتابیں سیاہ لکیروں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آئیں گی۔ اسی لئے میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ بڑی بڑی اصطلاح اور نئی وضع کے تنقیدی الفاظ سے بجائے مرعوب ہونے کے ہمیں پہلے خود اپنے تاثرات اور محسوسات پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ جناب بیکس کی غزلیات پڑھ کر جو تاثرات ہم مرتب کرتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ان کے کلام سے طبیعت اکتاتی نہیں، منغص نہیں ہوتی، بدحظ نہیں ہوتی۔ دوسری بار ان کے کلام کا جائزہ لینے پر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ محض اس واسطے وہ غزلیں نہیں لکھتے کہ انھوں نے طبیعت موزوں پائی ہے یا اردو ان کی مادری زبان ہے۔ وہ زبان کے رموز و فن سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں الفاظ پر کافی دسترس ہے وہ آج کل کے اکثر شعرا کی طرح اپنا مافی الضمیر گول گول الفاظ میں ادا کرنے کے عادی نہیں ہیں۔ انھیں الفاظ کی قدر و قیمت معلوم ہے وہ جانتے ہیں کہ۔

"ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد"

ان کی زبان سلیس، نکھری اور بامحاورہ ہے۔ معائب اور اسقام سے اس حد تک پاک ہے جس حد تک کہ چند نوزائیدہ شعراء کی زبان لبریز ہے۔ اس سلسلے میں ایک بات اور کہہ دینا چاہتا ہوں جناب بیکس کی زبان اس میں شک نہیں کہ نہایت پاکیزہ اور شگفتہ ہے مگر اس میں رنگینی کا عنصر زیادہ ہے اور رنگینی جب حد سے بڑھ جاتی ہے تو وہ مطالب کھو بیٹھتی ہے اور مذاقِ سلیم پر گراں گزرنے

لگتی ہے۔ بعض غزلوں میں انھوں نے بعض الفاظ صرف
اس واسطے کثرت سے استعمال کئے ہیں کہ وہ بذات خود
مترنم و دلکش اور رواں ہیں مگر مطالب کی ادائگی سے
یہ الفاظ قاصر نظر آتے ہیں۔ مقام شکر ہے کہ الفاظ کے
استعمال کرنے کا یہ غیر متوازن جذبہ ان کی معدودے چند
غزلوں سے مترشح ہوتا ہے۔ ان کی زبان لکھنؤ سے متاثر
ہوئی بھی ہے اور نہیں بھی۔ زبان کی بیساختگی، بول چال
لکھنوی ہے مگر لکھنوی مرثیت اور انفعالیت سے بڑی
حد تک خالی ہے۔ ضلع جگت اور ابتذال سے بری ہے۔

لطف بیان ملاحظہ ہو:۔

ترک جفا سے خونِ وفا کر رہے ہیں آپ
یعنی خطا معاف یہ کیا کر رہے ہیں آپ
آئینہ دیکھنے کا ارادہ نہ کیجئے
للہ باز آئیے، کیا کر رہے ہیں آپ

انجان تم بنے رہو سب جانتے ہوئے
سب کچھ تو کہہ دیا دلِ امیدوار نے

ان کے کلام پر جب تیسری نظر پڑتی ہے تو ہم واقعی تنقید کی
حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم نہ صرف زبان
کو پرکھتے ہیں بلکہ معانی و مطالب اور شاعر کے نقطۂ نظر سے
بھی ہم کو بحث کرنی پڑتی ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ
شاعر نے کون کون سے اثرات قبول کئے اور خود شاعر
کا ذاتی سرمایہ کتنا ہے۔

جناب بیکس کا کلام قدیم اور جدید دونوں ادب
سے متاثر ہوا ہے:۔

دل بہلنے کا نہیں ہجر میں ساماں کوئی
یعنی باقی نہ رہا تارِ گریباں کوئی

ان کی غزلوں میں اس رنگ کے بھی شعر ملتے ہیں اور
اس رنگ کے بھی:۔

لاکھ چلتا ہوں مگر دوریٔ منزل ہے وہی
جتنا بڑھتا ہوں ہے اتنا ہی گریزاں کوئی

دیکھا آپ نے فرق، دونوں شعر ایک ہی غزل کے ہیں
مگر دوسرے شعر کا لہجہ "پرانوں" والا نہیں ہے۔ یہ لہجہ
اور تخیل کا یہ پیرایہ، جدید ادب نے ہمیں دیا ہے۔ دوسرے
شعر کی تعریف و تشریح میں دفتر لکھا جا سکتا ہے "عنوانِ
زندگی" کے تمام مدارج کی منظر کشی کر دی گئی ہے۔ ان کی
غزلوں میں ہجر و وصل، جیب و دامن۔ برق و خرمن۔
صحرا نوردی و برہنہ پائی، گل و بلبل اور صیاد و قفس
کی پرانی علامتیں (Symbols)
بھی پائی جاتی ہیں مگر لب و لہجہ قطعاً جدید ہوتا ہے۔

رکھتا ہے قدم عالمِ طفلی سے کچھ آگے
اب نام خدا ان سے حیا کھیل رہی ہے

اردو میں یہ "ملیا کھیل رہی ہے" "گھٹنا کھیل رہی ہے"
جوش کی بدولت آیا ہے۔

بیکس صاحب کے کلام پر اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے
تو سب سے زیادہ جگر مراد آبادی کا پرتو پڑا ہے۔ وہی
طرز ادا، وہی لب و لہجہ، وہی الفاظ کی رنگینی و نشست ہی
نہیں، انھوں نے ان کی غزلوں پر غزلیں بھی کہی ہیں۔
جگر صاحب کی غزل کا مطلع:۔

بے چین ہے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دل ماہیٔ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں؟

جناب بیکس صاحب لکھتے ہیں:۔

جو دل ہے وہ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
جو چشم ہے پر آب ہے معلوم نہیں کیوں؟

اس غزل میں کیا خوب شعر نکالا ہے:۔

آغاز محبت کے فسانوں کو نہ پوچھو!
جو بات ہے اک خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟

اس کے علاوہ اور کئی غزلیں جگر کے انداز اور ان ہی کی زمینوں میں

لکھی گئی ہیں۔

مثلاً:۔ "مے عشق پیتا بلاتا چلا جا" یا

محبت ہجر میں اب اور محکم ہوتی جاتی ہے
مری ہر سانس اک سوزِ مجسم ہوتی جاتی ہے

اس زمین میں جوش اور جگر دونوں کی غزلیں ہو چکی ہیں مگر بیکس صاحب کے مطلع کی داد نہ دینا چشم پوشی ہوگی۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے جو اپنی کیفیت اور تاثیر کے لحاظ سے بہت کامیاب ہے۔

فلک پر محفلِ انجم بھی برہم ہوتی جاتی ہے
کوئی چپ ہے کسی کی آنکھیں نم ہوتی جاتی ہے

کیا مرقع کھنچ جاتا ہے اور پھر کتنا درد، کتنا غمگین سکوت اس شعر کی فضا میں پایا جاتا ہے۔ بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جگر صاحب کا رنگ ان کی غزلوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بیکس صاحب کا ذاتی کوئی رنگ نہیں ہے۔ بیکس صاحب کے یہاں جگر کا والہانہ انداز، سرمستی اور جذبات کی شدت تو بے شک نہیں ملتی مگر جگر کی "ای اوئی" "اف وہ نازک کلائیاں توبہ" والی نسائیت اور کھل کھیلنے والے رنگ سے ان کا کلام پاک ہے ان کا کلام ثقہ اور سنجیدہ ہے اور جہاں تک متانت کا سوال ہے وہ "بیکس" جگر سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ ان کا مزاج جگر کے مزاج سے مختلف ہے وہ معاملہ بندی اور عاشقانہ مضامین سے زیادہ حقائق و معارف کی طرف راغب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر زیادہ تر صوفیانہ ہے اس معاملہ میں وہ اصغر سے زیادہ ملتے ہیں۔ اصغر کی مشہور "نظمیہ غزل" ملاحظہ فرمائیے:۔

تمام دفترِ حکمت الٹ گیا ہوں میں
مگر کھلا نہ ابھی تک کہاں ہوں کیا ہوں میں
کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی
کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

کبھی یہ فخر کہ عالم بھی عکس ہے میرا
خود اپنا طرزِ نظر ہے کہ دیکھتا ہوں میں

اب اسی رنگ میں (میں اس کے مقابلہ میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصد موازنہ کرنا نہیں ہے۔ محض شاعر کا نقطۂ نظر دکھانا ہے۔) جناب بیکس کی غزل سنئیے۔

عجب فسانۂ پر درد و غم فزا ہوں میں
وہ سن سکا جسے کوئی وہ ماجرا ہوں میں

دیارِ عشق و محبت کا اک گدا ہوں میں
تجھی سے حسنِ ازل تجھ سے مانگتا ہوں میں

ہر اک میں اپنی حقیقت کو دیکھتا ہوں میں
مثالِ قطرہ سمندر سے مل گیا ہوں میں

کہاں میں اپنے کو پاؤں کدھر تلاش کروں
کوئی بتاؤ پتا اپنا پوچھتا ہوں میں

یہ فیضِ عشق ہے یا حسن کا کرم کہیے
جدھر بھی دیکھتا ہوں خود کو دیکھتا ہوں میں

بیکس صاحب کے کلام میں یہ عارفانہ تلاش و جستجو لائقِ صد تحسین ہے اس جذبے نے ان کے کلام میں ایک وزن ایک گہرائی پیدا کر دی ہے۔ ان کی نظر سطحی نہیں ہے۔

ہیں راز ہائے حقیقت مجاز میں پنہاں
مگر مجاز حقیقت نما نہیں ملتا

شعر کی معنوی خوبیوں سے قطع نظر "مجاز حقیقت نما" کی کیا تعریف ہو سکتی ہے۔ "مجاز حقیقت نما" کی قید لگا کر شاعر نے "مادیت محض" کا فرق جس طرح نمایاں کیا ہے وہ شاعر کی بالغ نظری پر دال ہے۔ بیکس صاحب ابھی اسی "مجاز حقیقت نما" کی تلاش میں ہیں ابھی وہ جس منزل سے گزر رہے ہیں وہ تذبذب و تشکک تو نہیں ہے مگر تلاش و جستجو حیرت و استعجاب کی حالت ضرور ہے وہ ہنوز "راہ و رسمِ منزلہا" سے واقف نہیں ہوئے ہیں۔ تصوف کی طرف ان کا میلان ابھی ذرا "رومانی" ہے۔

تو بشر ہے ابھی گناہ کرتا جب
توبہ بھی گاہ گاہ کرتا جب

ابھی وہ گناہ و ثواب، سزا و جزا کی پیچیدگیوں سے نہیں نکل سکے ہیں اور اس مقام پر نہیں پہنچ سکے ہیں جس کی طرف حافظؔ نے یوں اشارہ کیا ہے۔

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید

جہاں گناہ و ثواب بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ ان کا لہجہ زیادہ یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے ؎

اب وہ وفورِ شوق کی بے تابیاں کہاں
ذرّے نے خود کو دیکھ لیا آفتاب میں

بیکسؔ صاحب نے حیات و کائنات کے مسائل کی طرف بھی توجہ کی ہے ؎

دیکھو جدھر اُدھر ہیں بت، سارا جہاں ہے بتکدہ
کیسے ہو سجدۂ نیاز، کیسے ادا نماز ہو

اس شعر کو دیکھتے ہی بے ساختہ شادؔ عظیم آبادی کا شعر یاد آ گیا ؎

کہیں تو جام دھرا ہے کسی طرف ساغر
کہاں جھکائے سر انساں کہاں نماز کرے

ان کا مسلک صلح کل اور حقیقت پرستی ہے کہتے ہیں اور کس مزے سے کہتے ہیں ؎

بیکسؔ کو نہیں دیر و حرم سے کوئی مطلب
ہر گھر کو سمجھتا ہے کہ اللہ کا گھر ہے

وہ انسان کو مظہرِ ذات خدا سمجھتے ہیں ؎

مظہرِ ذاتِ خدا میرا وجود
یعنی میں عکسِ عذارِ یار ہوں

یہ وہی ہے کہ "حسنِ لیلےٰ عکسِ رخسار من است" اسی کو ایک جگہ دوسرے انداز میں بیان کرتے ہیں۔

آتا نہیں نظر کوئی اپنے سوا مجھے
شاید دکھا رہا ہے کوئی آئینہ مجھے

غرض کہ جناب بیکسؔ نے موت و حیات، ذات و صفات غیب و شہود کے موضوعات کو خاص طور پر پیشِ نظر رکھ کر قلم اٹھایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں بلندی اور سنجیدگی، صداقت اور اثر کافی پایا جاتا ہے۔ وہ جب حسن و عشق کے موضوعات پر بھی قلم اٹھاتے ہیں تو متانت کو ہاتھ سے کبھی جانے نہیں دیتے۔ ان کے تخیل میں تازگی اور رفعت دونوں ہے ایک غزل کا مطلع ملاحظہ ہو۔ بالکل انوکھے انداز میں کہا گیا ہے۔ شاعر کی نظر گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی ہے ؎

تہ زمیں اک نیا ہے عالم، ہوا کا بھی واں گزر نہیں ہے
گھرا ہے ابر سکوت ہر سو، نظامِ شمس و قمر نہیں ہے

ان کے کلام میں الفاظ اور جذبات دونوں کی موسیقی مل کر ایک نئی زمین ایک نیا آسمان پیش کر دیتی ہے ؎

گردشِ آسماں سے دور حلقۂ بزمِ ناز ہو
مجھ سا جنوں پرست ہو تم سا جنوں نواز ہو

اس شعر میں تخیل زمان و مکاں کی حدیں توڑ کر آزاد ہو گیا ہے۔ جو ایک جوا رفتگی اس شعر میں ملتی ہے وہ بیکسؔ صاحب کے وجدانِ صحیح کا آئینہ ہے۔ ان کی غزلوں میں جا بجا محاکات کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں ؎

اللہ تو ہی رکھ لے مری بیکسی کی شرم
ساحل بھی اب تو نظروں میں ہے ڈوبتا ہوا

ایک اور شعر ہے ؎

سن کے یہ حال کہ اب قصد ہے جل جائے گا
بڑھ کے منہ چوم لیا شمع نے پروانے کا

یہ ہے شاعری کا جادو جو ہمارے سامنے واردات حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویر کھڑا کر دیتا ہے۔ بالکل اسی رنگ کا ایک شعر حضرت یگانہ چنگیزی کا ہے وہ بھی خوب ہے۔

آپ اب شمع سحر بڑھ کے گلے ملتی ہے
بخت جاگا ہے بڑی دیر میں پروانے کا

جب ہم چوتھی اور آخری نظر جناب بیکسؔ کے کلام پر ڈالتے

ہیں تو پھر وہی پہلا احساس بیدار ہو جاتا ہے۔ یعنی ان کے کلام سے طبیعت اکتاتی نہیں۔ بدحظ نہیں ہوتی۔ مذاق سلیم تشنہ نہیں رہتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ سچی اور صحیح تعریف کسی شاعر کی اور نہیں ہو سکتی۔ فغاں بیکس اس بدمذاقی کے زمانے میں ہوتی فغاں بیکس معلوم ہوتی مگر اہل ذوق کے کانوں میں یہ آواز پہنچ گئی ہے۔

م ۔ ح

افسانہ زندگی کا

پھر کھول دے نظر سے میخانہ زندگی کا
ہونٹوں سے دے لگا کر پیمانہ زندگی کا

آنے لگے ہیں پھر کچھ اشکوں میں دل کے ٹکڑے
پھر جمع کر رہا ہوں افسانہ زندگی کا

پنہاں حیاتِ غم ہے اک درد کے سکوں میں
اک آہِ سرد میں ہے افسانہ زندگی کا

اب رہ گئی ہیں باقی سینے میں چند سانسیں
دو ہچکیوں میں سن لو افسانہ زندگی کا

پھر کر رہا ہوں دل میں بربادیوں کا ماتم
پھر گنگنا رہا ہوں افسانہ زندگی کا

برکتؔ کے دل کو پھر وہ ہنس ہنس کے دیکھتے ہیں
زد میں ہے بجلیوں کی کاشانہ زندگی کا

میر برکت علی برکتؔ

قاتل

ویران گھر میں شمع جلانے سے فائدہ!!!

میری دنیا دوستوں کی، میری بستی شاعروں کی، میرا وطن فسانہ نویسوں کا، میرا گھر اشعار کا گلدستہ تھا، میرے دوست مضطر ہمیشہ یہ شعر گنگنایا کرتے تھے ؎

شرمندۂ حیات ہوں لیکن برگ خزاں
ویران گھر میں شمع جلانے سے فائدہ

وہ اپنے سوز بھرے اشعار سے ذرہ ذرہ میں روح سی پھونک دیتے تھے، دن رات پریشان پریشان سے نظر آتے، جونہی ظلمت کا دخان سمندر لہریں لینے لگتا، وہ پہاڑ پر جاکر خاموش بہنے والی نہر کو اپنی درد بھری کہانی سنایا کرتے تھے۔ لیکن۔

ایک رات میں پہاڑ کی سیمیں نہر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا تھا، بندوق پاس ہی۔ کبھی کبھی درختوں کے جھنڈ میں ادھر ادھر چند کوئلیں پھدک رہی تھیں، جانے انہیں کس چیز کی تلاش تھی، یا شائد چاندنی سے لطف اٹھا رہی تھیں اور ہاں کبھی، کبھی اپنا دل سوز راگ چھیڑ کر اسی جھنڈ میں چھپے ہوئے ہرن کا پتہ دے رہی تھیں۔ جونہی میری نظر ابھی پہ پڑی میں بندوق سنبھال کھڑا ہوگیا۔ نشانہ ہی باندھ رہا تھا کہ ایک دل سوز راگ فضا میں گونجا۔ میرے بدن میں رعشہ سا پڑ گیا۔ گیا تھا شکار کرنے لیکن خود شکار ہوگیا۔ شکاری نے مجھے اپنے دلسوز راگ کے جال میں پھانس لیا، اس دلگداز اور درد بھرے راگ نے مجھ پر وہ اثر کیا جو موت جان کے ساتھ یا کفر ایمان کے ساتھ کرتا ہے۔ میرے پاؤں خود بخود اسی طرف اٹھنے لگے جس طرف راگی بیٹھا راگ الاپ رہا تھا۔ چند کھجوروں کے درخت کے پاس ایک پتھر پہ مضطر بیٹھا نظر آیا جس کی آنکھوں میں پریم کا دریا، زبان پر محبت کے گیت اور دل میں عشق کا نغمہ موجزن تھا۔ مضطر کی نظریں تصویر پہ گڑی تھیں جس کو اپنی ٹریجڈی سنا رہا تھا۔ بار بار اس تصویر کا بوسہ لیتا آنکھوں پر رکھتا اور سینہ سے لگاتا تھا۔

افسوس اس کا زخم دل اتنا گہرا تھا کہ اس کے مندمل ہونے کی اب کوئی امید نظر نہ آتی تھی! میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کیوں بھیا مضطر، مغموم کیوں ہو؟ یہ رونا کیسا آخر یہ درد بھرے اشعار سنا رہے تھے؟"

"نہیں! نہیں!!" مضطر گریہ آلود آواز میں کہنے لگا "میں خود ہی گا رہا تھا، اپنے دل کی آگ بجھا رہا تھا۔"

"لیکن تمہیں لگا ہی کیسے بھیا" میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا "کچھ میں بھی تو سنوں"

"قسمت کا لکھا ہے میرے دوست" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "پورا کیسے نہ ہوگا۔"

"ہوں" —— میں نے کہا "تدبیر کا ماحصل قسمت ہے میرے بھائی۔ سنا نہیں 'آگے تدبیر کے رسوائی تقدیر دیکھ' پھر خود کو قسمت کے حوالے کرنا محض بے وقوفی ہے"

"کچھ بھی کہو" اس نے بیزار ہو کر کہا "میری زندگی کی باگ قسمت کے ہاتھ ہے"

"اوہو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی ایک مثل تو پیش کرو؟"

"آخر وہی نا" اس نے کہا "کتے کی دم بیڑی کی ٹیڑھی تمہارا اصرار بھی عجب ہے۔ بھئی یہ انوکھی ضد ہمیں پسند نہیں مگر اب کریں بھی تو کیا، تمہارا اصرار ہے، خیر سن، ناک میں دم کرنے والے انسان"

آج سے دس سال قبل کا ذکر ہے، مجھے شاہجہاں دل سے چاہتی تھی، ہر عید برات کو تحفہ تحائف بھیج کر اپنی محبت کا اظہار کرتی۔ دن رات محبت کے نغمے الاپتی پھرتی، عشقیہ کہانیاں سنایا کرتی۔ غرض اس کی یہ حقیقی محبت تھی، وہ میری پجارن تھی، مگر —— ہائے افسوس، میں نے اس کی محبت کی قدر نہ کی، اس کے دل کی کیفیت کبھی پڑھنے کی

کوشش نہ کی، وائے قسمت، یہی تھا میرے مقدر میں لکھا۔

کچھ اوپر دو سال ہوتے ہیں کہ، یہاں ایک طوائف زادی شہناز آپہنچی، حسن و خوبصورتی کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک تھی۔ مگر پیشہ کندہ تھا وہ دولت کی بھوکی تھی۔ یہاں کے امرا اور رؤسا، دن رات اپنی دولت قربان اور اپنی بستر اس پر نچھاور کیا کرتے تھے، جب اس کے ہاں کافی دولت جمع ہوگئی تو اس نے دوسرے شہر کا قصد کیا، اس ظالم نے کسی پر ذرا بھی رحم نہ کیا، سیکڑوں عورتوں اور بچوں کو بلکتے دیکھا مگر اپنی لوٹ برابر جاری رکھی۔ ہزاروں گھروں کو تباہ و تاراج ہوتے دیکھا، مگر مسلسل برباد کرتی ہی گئی۔

اتفاقاً اس کی تیر نظر کا میں گھائل ہوگیا، اس نے مجھ سے محبت کے عہد و پیمان باندھے اور قسمیں کھا کھا کر کہا "مضطر! مجھے تم سے حقیقی اور سچی محبت ہے میں تمہاری سچی پرستار ہوں۔ میں تمہارے کہنے کے مطابق تو آج ہی سے اس ذلیل پیشہ کو ترک کئے دیتی ہوں بشرطیکہ تم میری محبت کا، محبت سے جواب دو، چلو ہم کسی دوسرے شہر میں چل رہیں، وہاں ازدواجی زندگی گزاریں گے۔ وہاں سماج کی پھٹکار نہ پڑے گی، کسی کے کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی" پہلے ہی سے میں اس حسین پھول کا طواف کیا کرتا تھا جب اس کی زبانی یہ میٹھے میٹھے بول سنے تو اس پر بے طرح فریفتہ ہوگیا۔ اور بری طرح ریجھ گیا۔ مگر ـــــ یہ ایک چال تھی ظالم کرای کی اپنے شکار کو پھانسنے کے لئے۔ ان الفاظ میں جتنی حلاوت اور شیرینی تھی اتنا ہی کڑوا پن اور تلخی مضمر تھی۔

"چلو" ـــــ میں نے جواب دیا "اگر تمہارا اتنا بھلا خیال ہے تو کل ہی کی ٹرین سے نکل کھڑے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں" اس ساحرہ نے کہا "ساتھ اپنے کچھ نقدی بھی رکھ لو تاکہ وقت ضرورت کام آئے۔"

میں دوسرے ہی دن بہت کچھ نقدی لئے آپہنچا اور اس کے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیا، تاکہ اس پر میری الفت ظاہر ہوجائے اور پھر ہم دونوں بمبئی روانہ ہوگئے۔

رات کے پرندوں کا چہچہانا، بدر کامل کی جگمگاہٹ، اور خوشگوار ہوا کی سنسناہٹ ایک عجیب سماں، باندھے ہوئے تھی۔ ہم دونوں زیر سائبان بیٹھے ایسے پرلطف موسم سے لطف اٹھا رہے تھے کہ شہناز نے کہا "مضطر! آؤ دو دو گھونٹ بادۂ احمر کے پی کر تفریح کو چلیں" جام و ساغر میز پر چنے ہوئے تھے، شراب کا ہلکا گلابی رنگ بلوریں ساغر میں چھلک رہا تھا۔ میں نے بغیر انجام کو سوچے تین چار جام چڑھا لئے جس میں سفوف بے ہوشی ملا تھا۔

جب ہوش آیا تو دیکھا مکان کی سب چیزیں غائب ہیں یہاں تک کہ اس خانہ برانداز نے برتن بھی سمیٹ لئے صرف ایک لوٹا پلنگ کے نیچے چھوٹ گیا تھا وہ بھی غلطی سے اور دو تصویریں اس نے سرہانے رکھ دی تھیں، ایک تو اپنی اور دوسری شاہجہاں کی نہ جانے کیا بات تھی جس کو میں چلتے وقت شہناز سے چھپا کے آیا تھا۔ اپنی تصویر کے نیچے اس کم ظرف نے، جلی حروف میں "تمہاری باوفا محبوبہ" لکھ چھوڑا تھا۔ اس بدکردار نے ایک بدنصیب کو خوب ہی الّو بنایا" یہ کہہ کر مضطر نے ایک تصویر نکالی۔ فی الحقیقت وہ تصویر ایک حسین و جمیل عورت کی تھی۔

اس نے اس تصویر کو لگے ہوئے فریم سے علٰحدہ کیا اور چاک کر ڈالا۔ پھر کہنے لگا "پیارے دوست اب میں اپنی درد بھری کہانی ختم کرتا ہوں، باقی کو میرے سینہ ہی میں محفوظ رہنے دو، کہیں فرط غم سے سینہ نہ پھٹ پڑے۔ اور پھر میری زبان میں اتنی سکت نہیں کہ اپنی آپ بیتی تمہیں پوری سنا سکوں، اچھا خدا حافظ" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، دوست کو روتا دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے۔ میں نے اسے تسلی و تشفی دی اور اپنا افسانۂ غم مکمل کرنے پر مجبور کر دیا۔

میری دولت، میری عزت، میری خوشی، سبھی اسی

خونخوار نے تباہ کی۔ چند دن بعد مالک مکان نے مجھے اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ افلاس و مصیبت نے مجھے آدبوچا۔ جب بھوک ستاتی درختوں کی چھال یا جنگلی پھلوں سے اپنا معدہ پُر کرتا۔ بھیک مانگنا امیروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا بعید از شرافت تھا۔ والد کے گھر جا تو سکتا نہیں تھا۔ جنگل میں ایک کٹیا بنا رکھی تھی، رات کے کوئی دو بجے ہوں گے کہ میں اپنی کٹیا سے خاموش نکل کھڑا ہوا۔ کٹیا سے قریب ہی ایک خاصا بڑا اور خوبصورت مکان تھا، نیت تو چوری ہی کی تھی، چوروں کی طرح اندر داخل ہو گیا، تجوری کا قفل توڑ ڈالا۔ اور ہزار روپیوں کے نوٹ لئے باہر آ گیا —— یکایک اس گھر کے لوگ بھی بیدار ہو گئے۔ سب چور! چور!! کہہ کر ادھر ادھر دوڑ رہے تھے، کوئی لٹھ لئے ہاتھ سے ٹارچ دبائے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کوئی بندوق سے مشتبہ مقامات پر نشانہ لگا رہا تھا۔ میں چپ چاپ مگر خوش و خرم اپنی اس عظیم الشان کامیابی پر مسکراتا ہوا اپنی جائے رہائش کو لوٹا۔ اندر گھاس کے نرم نرم بستر پر دراز ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک تو محلوں کے خواب دیکھتا رہا۔ ہزاروں ہوائی قلعے تیار کئے، مگر یکایک خیالات نے پلٹا کھایا: گھاس کا نرم نرم بستر خار سے پُر تھا۔ ضمیر ملامت کر رہا تھا "تو نے چوری کی ہی کیوں! یاد رکھ حرام دولت سے پیٹ بھرنا گناہ کبیرہ ہے، کاش تو نے یہ کام نہ کیا ہوتا۔ محنت مزدوری کرتا، حلال کی کمائی سے پیٹ بھرتا۔ اگر محنت مزدوری نہ ملتی تو اس کنج عزلت میں تڑپ تڑپ کر جان دے دیتا"۔ ان خیالات کا آنا تھا کہ میں خوف خدا سے کانپ اٹھا۔ دیا کی ہلکی روشنی کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں اٹھ بیٹھا۔ تمام نوٹوں کو ہانڈی سے نکالا جنھیں بڑے شوق سے چرا لایا تھا۔ چند نوٹوں کو ہاتھ میں لیکر چراغ کی لو سے لگا دیا۔ کاغذ جلنے لگا ان جلتے ہوئے نوٹوں کو بقیہ نوٹوں پر دھر دیا۔ چوری کی دولت دھڑا دھڑ جل رہی تھی، میرا سر گھومنے لگا، اس فعل بد سے چکر آ رہے تھے، میں سر پکڑے کٹیا سے نکلا، اور سامنے کے صاف پتھر پر سر جھکائے بیٹھ گیا، ہجوم خیالات

اور تاثرات تصورات سے زیر بار ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد سر جو اٹھایا تو ہر طرف روشنی ہی روشنی نظر آئی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے میری کٹیا میں بھی آگ لگا دی، دیکھتے دیکھتے چھپر و پھوس کی چار دیواری ایک طرف سے اس طرح جلنے لگی گویا اس پر کسی نے مٹی کا تیل چھڑک دیا ہو۔ چونکا اور اندر بھاگا۔ ادھر ادھر تلاش کر کے میں نے ایک تصویر اٹھا لی۔ باہر آ کر جو دیکھا تو بد قسمتی سے شہناز نکلی۔ باہر پھینک پھر اندر دوڑا گیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد شاہجہاں مل گئی۔ جو آدھی کے قریب جل چکی تھی۔ اس چھوٹی سی جھونپڑی میں دھواں اور آگ کا وہ زور تھا کہ باوجود لاکھ پھرتی کے باہر نکلتے نکلتے صحن میں بے ہوش گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو سر میں کسی قدر درد محسوس ہوا۔ سر پہ ہاتھ جو پھیرا تو انگلیاں کسی نوکدار شئے سے مس ہوئیں۔ متعجب، حیران، پریشان آخر اسے کھینچ ہی نکالا۔ یہ ایک شیشہ کا تیز نکیلا ٹکڑا تھا جو شہناز کی تصویر سے پھوٹ نکلا تھا۔ جھونپڑی جل کر کبھی کی سرد ہو چکی تھی، میں ان دونوں تصویروں کو لئے، آٹھ آٹھ آنسو بہاتا اس مکان کی طرف چلا جہاں رات میں نے چوری کی تھی جس کی پاداش میں میرا نشیمن برباد ہو گیا۔ خیال ہوا، خود ہی جا کر کیوں نہ اقرار کر لوں کہ رات میں نے چوری کی تھی۔ لیکن زنداں کی سختیوں کے تصور سے دل کانپ اٹھا۔ ذرا آگے بڑھا تو چند لوگ کھڑے دکھائی دیے۔ وہاں ایک نعش بھی رکھی تھی، جو سرتاپا ڈھکی ہوئی تھی۔ ایک شخص سے دریافت کیا "بھئی، یہاں پولس کیا کر رہی ہے، اور وہ نعش کیوں رکھی ہے"؟ "قصہ بہت المناک ہے" اس دربان نے کہا "پچھلی رات ایک ظالم، بدمعاش، خونخوار لٹیرا، آ گھسا یہ نوجوان لڑکی جو اب مری پڑی ہے، اس کو اسی ڈاکو نے مار ڈالا ہے۔ یہ لڑکی، یہاں اپنی سہیلی سے کچھ دریافت کرنے چلی آئی تھی۔ اسے دوست نے بہ اصرار روک لیا۔ اس لڑکی کا بھی ایک زمانہ تھا کہ ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آتی، اور ہرنوں کی طرح خانہ میں فراٹے بھرا کرتی مگر معلوم نہیں، چند دن سے، اس کے چہرہ کی رونق کیوں غائب ہو گئی، اس کے لوح دار قہقہے کیوں منقطع ہو

چہرے پر زردی کیوں چھا گئی؟ ممکن ہو کہیں دل لگ گیا ہو۔ دن بھر کچھ نہ کچھ سوچا کرتی، کسی خیال میں مستغرق رہتی، فلسفۂ زندگی اور فلسفۂ محبت سلجھایا کرتی —— سبھی پریشان تھے، آخر اس نے ایسا سا تمہ کیوں بھر رکھا ہے، حقیقت کا انکشاف کل ہوا ہے، وہ یہ کہ اس کے قتل کے بعد اسی لڑکی کے کمرے میں، ایک تصویر پڑی ملی، جو ساز میں رکھی گئی ہے۔ بڑی کمسن اور نو عمر لڑکی تھی، ابھی مرنے کے دن نہ تھے۔ ع

فدا وہ جانے والے آ مرے آنسو بہاتا جا

اے کاش کچھ اور دن زندہ رہتی، جوانی کی بہاروں اور جذبات سے آشنا ہوتی۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ اور ہاں آپ یہاں یہ کس کی تصویریں رکھے ہیں، کیا آپ آرٹسٹ ہیں بیچنے لائے ہو؟"

میں اس کے سوالوں پر توجہ دیئے بغیر ان خیالی اور دھندلے نقوش کو گہرا کر رہا تھا، جو مثل خواب کے مدھم میرے دماغ میں تراشیدہ تھے۔

"ہاں! ہاں ٹھیک۔ جب میں اپنی سعی میں کامیاب ہو کر باہر نکل رہا تھا کہ ایک لڑکی بیٹھی دکھائی دی جو رات کی ہلکی سی سنہری روشنی میں ایک تصویر سامنے رکھے رو رہی تھی اور اس خاموش تصویر سے کچھ سوالات کئے جا رہی تھی، میں اس سے چھپ کر نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس نے یکایک خلاف قیاس میری طرف پلٹ کر دیکھا۔ اور مضطر کہتی ہوئی میری طرف دوڑی آئی، میں نے خیال ہی نہیں بلکہ مصمم ارادہ کر لیا کہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہیے، کیونکہ افشائے راز کا خوف ہے، یہ تو میرے نام سے بخوبی واقف ہے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ گلا دبا دیا، اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی اور فضا میں تحلیل ہو کر رہ گئی۔" انہی خیالات میں مستغرق اور مختلف جذبات میں بہا جا رہا تھا کہ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا، میں چونک پڑا، تصویریں اس کے حوالے کر دیں، تصویریں دیکھ کر اس نے فوراً تعجب سے کہا، ارے یہ تصویر، یہ جلی ہوئی تصویر مقتول لڑکی کی ہے۔ تمہیں کہاں سے ملی۔

"تم پاگل ہو" میں نے جھنجھلا کر کہا "بھلے انسان، یہ تصویر ایک زندہ لڑکی کی ہے جو میری محبوبہ ہے۔"

"کیوں بے" اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "اس حسینہ کی شان میں تو گستاخی کرتا ہے، چل میرے مالک کے ہاں" یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور لے چلا، جب نعش کے پاس پہنچے تو میں نے دیکھا کہ سچ مچ شاہجہاں مری پڑی تھی اور میں اس کا قاتل اس کے سامنے کھڑا تھا، میں اس کی بے کسی اور بے بسی پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، میری آہ و بکا اور ماتم پر سب دوڑے آئے، پولیس کے سارجنٹ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "حضور ——" سارجنٹ مالک مکان کو مخاطب کرنا چاہتا تھا جو ہماری طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا، اور اس بے وقت کی موت پر آنسو بہا رہا تھا۔ "ہاں" مالک مکان نے پلٹتے ہوئے جواب دیا۔ "آہ میرے دل پر ایک چوٹ سی لگی، بجلی سی گری اور میں جل کر بھسم ہو گیا۔ ایک تو میں شاہجہاں کا قاتل دوسرا اسی کا گھر تھا جس نے مجھے پالا پوسا اور بڑا کیا —— وہ میرا باپ تھا ——

"جناب یہ وہی لڑکا ہے" سارجنٹ نے کہا "جس کی آپ کو تلاش تھی۔"

والد نے مجھے جوں ہی دیکھا، مجھ سے لپٹ پڑے، میں تصویر حیرت خاموش چوروں کی طرح ساکت کھڑا، پشیمان ہو رہا تھا کہ کیوں آیا۔ یوں چہرہ لٹکائے ہوئے۔ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ زبان گنگ ہو چکی تھی، انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگایا، خوشی اور غم کے خلط ملط آنسو بہائے اور زنانہ میں بھیج دیا، میرے روپوش ہو جانے پر پریشاں والد نے گھر منحوس جان کر گھر ہی نہیں شہر کو بھی بدل دیا تھا۔

غسل وغیرہ کے بعد جب میں نعش کے پاس آیا تو والد نے کمال دلسوزی سے پوچھا کہ "تمہاری حالت ایسی غیر کیوں ہوئی۔" میرے پاس ایسے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا، میں شاہجہاں کی نعش لئے اس کے گھر پہنچا، ایک طویل گریہ وزاری

کے بعد، اس حقیقی پجاری کو اس جگہ پیوند خاک کر دیا گیا۔ اس فضا میں ہاتھ سے اس نے قبر کی طرف اشارہ کیا۔ سرہانے ایک خوبصورت پتھر نصب کیا گیا تھا۔ جس پر یہ شعر کندہ تھا۔

عشق کی آگ نے پائی ہے حیات جاوید
شمع کا سوز جدا ہے تیرے جل جانے سے

کئی دفعہ بارش نے اس کندہ کئے ہوئے شعر سے گرد و غبار دور کیا اور سورج نے اپنی رنگین شعاعیں پھینک کر اس کی چمک کو دوبالا کر دیا۔ آج بھی یہ شعر سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ وہ اپنا فسانۂ غم سناتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور اس قبر سے لپٹ لپٹ کر رونے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک قطرہ بھی کا نہ تھا۔ مگر اس کے تڑپا دینے والے نالوں نے سارا پہاڑ ہلا رہا تھا۔ آخر یہ لرزتا ہوا شعلہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ موت نے اس کی دردبھری زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ اس کو راحت و چین کی نیند سلا دیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آغوش لحد کے حوالے کر دیا۔ اس پریم کے دیوانے محبت کے پروانے نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

قبر کی دائیں جانب سے ایک نہر بہہ رہی تھی، صاف و شفاف نہر۔ خاموش نہر۔ مضطر کا افسانہ رنج و الم سنتی بل کھاتی چلی جا رہی تھی، مضطر قبر سے لپٹ پڑا تھا، دائیں ہاتھ میں ممتاز شاہ جہاں کی ملی ہوئی تصویر نظر آ رہی تھی، بائیں طرف ایک تصویر کے دو ٹکڑے ایک دوسرے سے ذرا دور دور پڑے تھے، جس پر گرد و غبار کی ہلکی سی تہ دکھائی دے رہی تھی۔

مرزا اسہام الدین

مقامِ خودی

کمالِ عشق، میں اس لمحے کو سمجھتا ہوں — خوشی بھی میرے لئے جب خوشی نہیں ہوتی
خودی سے ہوتا ہے عرفاں خدا کا بندے کو — خدا سے دور کرے جو، خودی نہیں ہوتی
خموش رہ کے بھی سب کچھ ہم ان سے کہتے ہیں — ہماری خامشی بھی خامشی نہیں ہوتی
ہے انتظار میں ساحل، ہوا موافق ہے — تجھی سے ہمتِ ساحل رسی نہیں ہوتی
یونہی بھٹکتا رہے گا تلاشِ منزل میں — بشر کی راہ نما، خود روی نہیں ہوتی

بشر کو جو متکبر بنا دے اے عارف
وہ خود سری ہے، سراسر، خودی نہیں ہوتی

عارف سیالکوٹی

ہنسی

ہنسی ایک فطری فعل ہے جو تمام دوسرے فطری افعال کی طرح انسان کی تندرستی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ارسطو انسان کو ہنسنے والا جانور کہتا ہے اور حقیقتاً ہنسی بھی ایک ایسی خصوصیت ہے جو انسان کو دوسرے حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے۔ گزشتہ زمانہ میں ہمارا ملک راحت و مسرت کا گہوارہ تھا اور یہاں کے باشندوں کو ہنسنے کے زیادہ مواقع ملتے تھے اس کے نتیجہ کی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ زیادہ صحت مند ہوتے تھے اور آج کل کے مقابلہ میں طویل عمریں پاتے تھے۔ آج بھی جو ممالک مختلف حیثیتوں سے مطمئن اور خوش ہیں وہاں کے باشندے ہم لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ توانا اور طاقتور ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں ہنسنے اور قہقہہ لگانے کے بہت کم مواقع باقی رہ گئے ہیں۔ سکون و آرام کی کمی اور افکار و آلام کی زیادتی نے لوگوں کو ہنسی جیسی نعمت سے بڑی حد تک محروم کر رکھا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ہنسی اور صحت انسانی کے درمیان کیا تعلق ہے اور ہنسنا انسان کی عمر میں کس طرح اضافہ کر سکتا ہے۔ طبی نقطہ نظر سے اس کا جواب آسان ہے جب ہم ہنستے ہیں تو قلب کی انبساطی کیفیت بڑھ جاتی ہے جس کا اثر سارے نظام جسمانی میں پھیل جاتا ہے اس کے علاوہ بعض ڈاکٹروں کی رائے میں ہنسی کے وقت غشائے قلب کی بالائی اور زیریں حرکت کی وجہ سے قلب پر ایک قسم کی مالش ہوتی ہے اور اس سے قلب کے عمل میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اگر ہنسی کے اس اثر کو نظر انداز کر دیا جائے جو براہ راست قلب پر پڑتا ہے تب بھی ہنسی کے ان نتائج کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا جو پھیپھڑوں کے توسط سے نظام جسمانی کو متاثر کرتی ہے ہنسی سے پھیپھڑوں پر ایک قسم کا دباؤ پڑتا ہے اور یہ اس دباؤ کا ردعمل ہے کہ خون میں آکسیجن کی ضروری مقدار جذب کر لیتا ہے چنانچہ بعض ڈاکٹروں کی رائے میں بہت سے امراض قلب محض ہنسی کے ذریعہ سے دور کئے جا سکتے ہیں جو لوگ قلب کی حرکت کو غیر معمولی طور پر محسوس کرتے ہیں یا اختلاج قلب میں مبتلا ہیں ان کے لئے زور زور سے ہنسنا نہایت مفید اثرات پیدا کر سکتا ہے خاص نفسیاتی طور پر بھی معتدل قسم کی ہنسی روح میں ایک قسم کی بشاشت و فرحت پیدا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے ہم ایک قسم کی امنگ محسوس کرنے لگتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہت زور زور سے اور بہت دیر تک ہنستے رہنا آخر کار ایک قسم کی افسردگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہنسی سے کسی مرض کے ازالہ کا کام لینا مقصود ہو تو اس میں اعتدال کا پیش نظر رہنا ضروری ہے۔

حکیم دکھنی

تاریخ سیاسیات - از پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے۔ ایل ایل بی استاد تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ

اُردو زبان میں تاریخ سیاسیات پر پہلی کتاب ہے جس میں پروفیسر مجید صدیقی صاحب نے سیاسیات کی تاریخ کو اپنے خاص ماہرانہ انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ یہ کتاب آپ کی سیاسی معلومات اور سالہا سال کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ کالج کے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ صفحات (۲۷۲) قیمت سے

مرہٹی ادب کا جائزہ

مرہٹی ادب میں سب سے پہلی کتاب جو لکھی گئی وہ مکنداج کی تصنیف "ویوک سندھو" ہے۔ بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں بمقام موم آباد اس زمانہ کے راجہ جیت پال کو بطور نصیحت کے مکندراج نے یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کے بعد مرہٹی ادب کی دو زبردست مذہبی تحریکات کی وجہ سے نشوونما ہوئی۔ یہ سمجھنے سے پہلے مہاراشٹر کے اس زمانہ کے طرز معاشرت اور سماجی و سیاسی زندگی کا خاکہ آنکھوں کے سامنے لانا ضروری ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب دکن میں راشٹرکوٹ خاندان جس نے بمقام ملکھیڑ تقریباً دو صدی تک بہت شان و شوکت سے حکومت کی تھی، صفحہ تاریخ سے مٹ چکا تھا اور اس کی جگہ شہر کلیانی کے چالوکیہ خاندان نے لی تھی۔ انھیں راجگان چالوکیہ کے ساتھ دیوگری کے یادو خاندان نے جو پہلے چالوکیوں کے دوست کی حیثیت سے اور چالوکیوں کے عروج کے زمانہ میں خراج گزار کی حیثیت سے رہا۔ بارہویں صدی کے آخر میں ملک مہاراشٹر میں ایک خالص مرہٹہ ریاست کی بنیاد ڈالی۔ اس دور میں سنسکرت کی حیثیت ایک دفتری زبان کی تھی اور گو دکن میں پراکرت کی مروجہ شکل یعنی مہاراشٹری و نیز "اپ بھرنش" میں دیسی شعرا بالخصوص طبقہ جین کے شعرا نے طبع آزمائی کی تھی لیکن سنسکرت کے ادبی نیز مذہبی زبان ہونے کی حیثیت کو کوئی خاطر خواہ صدمہ نہیں پہونچا۔ ہندو تہذیب کی ایک نمایاں خصوصیت یعنی ذات پات کی جکڑ بندی نے مذہبی تعلیم کو چند اعلیٰ طبقات میں اور سنسکرت زبان میں محدود کر دیا تھا۔ مستورات اور شودر طبقہ کے افراد کو وید کے اصول سیکھنے کا حق نہیں تھا وہ زیادہ سے زیادہ پرانوں کے قصے جن میں زمانہ مہابھارت اور راماین کے اور اس کے قبیل کے زمانہ کے ناموروں اور اوتاروں کے قصے کہانیاں تھیں سن کر اپنی مذہبی تشنگی کو بجھا سکتے تھے۔ یہ تخیل ملک میں عام تھا۔ نیز مستورات اور شودروں کو تارک الدنیا ہو کر مذہبی زندگی گزارنے کا حق نہیں تھا گو بدھ مت اور جین مذاہب نے اس خیال پر کڑی چوٹیں لگا کر اور ملکی زبانوں میں مذہبی کتابیں لکھ کر علم و دین کا دروازہ عوام کے لئے کھول دیا تھا پھر بھی ان کے منکرانہ فلسفہ کی وجہ سے اس ملک میں ان مذاہب کو زوال آنے کے بعد ان کے مروجہ راستوں کو بھی ترک کر دیا گیا۔

بارہویں صدی کی ابتدا میں ملک مہاراشٹر میں جن دو تحریکات نے ذات پات کی پابندیوں کو آزاد کر کے قوم میں مذہب و ادب کا سرچشمہ جاری کر دیا ان کے نام یہ ہیں ایک تحریک چکردھر کے مہانو بھاؤ پنت کے نام سے موسوم ہے اور دوسری تحریک ناتھ پنت کے نام سے موسوم ہے۔ ثانی الذکر تحریک درحقیقت یو۔پی میں پیدا ہوئی۔ وحدت الوجود کے فلسفہ کو اپنا بنیادی خیال قرار دے کر دنیا میں شیو کی پرستش کی تبلیغ کی۔ ہر کس و ناکس میں...... گرکھ جن کو سائیں پیر کہیں نے یو۔پی میں اور بعد میں نیپال میں ایک آزاد زندگی کی بنیاد ڈالدی وہ ناتھ پنت کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ ان کی زبردست ہستیوں میں مچھندر ناتھ، گورکھ ناتھ کا شمار ہوتا ہے۔ ان کی ایک شاخ دکن میں تبلیغ کے لئے آئی اور اسی کڑی کا ایک آبدار موتی گیانیشور ہے جس نے تیرھویں صدی کے آخر میں مہاراشٹر کی سماجی مذہبی ادبی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔ اس کا تفصیلی تذکرہ پھر کیا جائے گا۔

چکردھر کے مہانو بھاؤ پنت کی ابتدا برار میں ہوئی۔ ان کے مذہبی اصول میں بھگوت گیتا کی پرستش، سری کرشن کی پرستش اور سری کرشن کے مزید چار اوتار..... دوارکا ناتھ راول؟..... دتاترے...... گوبند اچاریہ...... چکردھر کو ماننا ہے۔ ان کے پنتھ میں پیغمبروں کی زندگی کے ہر پہلو کو احترام کی نظر سے دیکھنا، انتہائی عدم تشدد کی حمایت کرنا اور بت پرستی کو ترک کر دینا شامل ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ خدا کی ہستی مادہ میں نہیں ہو سکتی اس لئے مادہ کی پرستش

ناجائز ہے۔ ان میں ذات پات کے جھگڑے نہیں ہیں لیکن ... تارک الدنیا ہونے میں یہ زندگی کا کمال سمجھتے ہیں۔ ستوات اور شودر طبقہ تارک الدنیا ہونے کا مستحق ہے اور نجات پانے کا مستحق ہے۔ ان خیالات کے تحت چکر دھر نے مہاراشٹر میں ایک زبردست تحریک کا آغاز کیا جس کے اثرات نہ صرف عوام پر مترتب ہوئے بلکہ یادو راجاؤں کے محلوں میں بھی پہونچ گئے۔ ان کا مرکز برار میں ردھ پور تھا، ہمیں اس مقام پر اس پنتھ کی ادبی خدمات کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ انھوں نے مہاراشٹر میں زبان مرہٹی میں ایک کثیر ادب کی اشاعت کی۔ سری کرشن کی زندگی پر ابتدا میں اسی طبقہ نے نظمیں لکھیں اور اپنے گرو چکر دھر کی زندگی جو لیلا چرتر کے نام سے موسوم ہے قلمبند کی۔ مرہٹی نثر کا یہ بالکل نقش اولین ہے۔ اس طبقہ کے لوگوں نے عوام کی جہالت کے ڈر سے اپنے رسم الخط کو ایک راز بنالیا تھا جو صرف ان کے طبقہ ہی میں مروج تھا۔ چونکہ اس طبقہ کے لوگ پنجاب اور پشاور میں بھی پائے جاتے ہیں اس لئے اپنے مذہبی عقائد کے توسط سے مرہٹی زبان کو ان دور دراز مقامات تک پہونچانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ مان بھاو پنتھ میں چکر دھر، ناگ دیو، بھاسکر بھٹ اور ویاس چوڑی کے ادیب گزرے ہیں۔ سری کرشن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے جو نظمیں لکھی ہیں انھیں مذہبی پہلو سے بڑھکر خالص ادبی پہلو نمایاں ہے۔ شادی بیاہ میں عورتیں جو گانے گاتی ہیں انہیں مرہٹی زبان میں "دھوّلی" کہتے ہیں۔ سری کرشن کی شادی برار کی راجکماری رکمنی سے ہوئی۔ اس مبارک تقریب کا ذکر کرتے ہوئے مان بھاو پنتھ کی ایک خاتون ناگامبیکا نے نہایت ہی اس بھری نظمیں لکھی ہیں جو مرہٹی میں ناگامبیکا کی دھولی کے نام سے موسوم ہیں۔ مرہٹی زبان کی یہ پہلی شاعرہ ہے جس کا زمانہ تیرھویں صدی عیسوی کا وسط قرار دیا جاسکتا ہے۔ مان بھاو پنتھ کے اکثر ادیب اس علاقہ میں پیدا ہوئے ہیں جو مرہٹواڑہ کہلاتا ہے۔ یادو خاندان کا آخری راجہ رام دیو ان لوگوں کو بطور خاص چاہتا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد جو سنہ ۱۳۱۱ء میں واقع ہوا، اس کے بیٹے شنکر دیو نے اپنے باپ کی جگہ سنبھالی۔ رام دیو کی رانیوں میں ایک نے جو مان بھاو پنتھ کی تھی، شوہر کے مرنے کے بعد اپنے عقائد مذہبی کے لحاظ سے ستی جلنے سے انکار کیا تو شنکر دیو نے اس پر جبر کیا۔ ستی جاتے وقت اس رانی نے ریاست کی تباہی کی بددعا کی۔ یوں تو رام دیو سے بھی بعض مان بھاو مرشدوں کا اختلاف ہوا تھا لیکن بیان کیا جاتا ہے کہ شنکر دیو کے زمانہ میں مان بھاؤں کی بد دلی سے ریاست کے خاتمہ کے دن بہت قریب آگئے اور دس سال کے اندر اندر مرہٹوں کا ملک مبارک خلجی کی نذر ہوگیا۔ (سنہ ۱۳۲۰ء)۔ مان بھاؤں نے جس ادب کی تخلیق کی اس پر ایک زمانہ تک مہاراشٹر کے محققین کی نظر نہیں پڑتی تھی لیکن گزشتہ ربع صدی میں بعض عالموں نے جس میں، مسٹر بھاوے آنجہانی، مسٹر نینے (ناگپور) مسٹر بھوالکر (ناگپور) پروفیسر وشنو بھکاجی کولتے، (کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی) اور مسٹر یشونت راؤ دیش پانڈے (ایوت محل) نے مرہٹی ادب کے بہترین نمونے عوام کے سامنے رکھدیئے ہیں۔ چنانچہ جامعہ بمبئی و ناگپور میں مان بھاؤ شاعر بھاسکر کولی وغیرہ شعراء کے کلام کا بطور خاص مطالعہ کیا جاتا ہے نیز مرہٹی نثر کے ابتدائی نمونوں کی حیثیت سے جو یادو دور میں رائج تھے مان بھاؤں کی نثر کو خاص اہمیت حاصل ہوچکی ہے۔

مان بھاؤں کی ادبی تخلیق کی طرف عدم توجہ کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے مذہبی عقائد کو مہاراشٹر کے دوسرے مذہبی سیلاب کے سامنے جس کے بانی گیانیشور تھے، ہٹنا پڑا۔ اس تحریک کو مرہٹی میں بھاگوت دھرم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس تحریک کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ تحریک مہاراشٹر میں گزشتہ چھ سو

سال سے مسلسل ترقی کر رہی ہے اور گیا نیشور سے جس کی ابتدا ہوئی وہ نام دیو، تکارام جیسی بزرگ ہستیوں سے لیکر راناڈے بھنڈارکر تک بھی پہونچ گئی ہے۔ اس تحریک کی اصل غرض یہ تھی کہ بلا لحاظ طبقہ ہر کس و ناکس کے پاس اس کی مادری زبان میں مذہبی اصول پہونچائیں ملک مہاراشٹر میں ایک مرکز پنڈھرپور قائم کیا گیا جہاں وشنو یا وٹھل کی پرستش میں بلا لحاظ مذہب و ملت سال میں دو دفعہ جمع ہوکر اجتماعی زندگی سے مستفید ہوں اور مہاراشٹر کے گوشہ گوشہ سے جو سماجی اور سیاسی تحریکات اٹھتی تھیں ان سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔ مذہبی تفصیلات کی پابندیوں کو توڑ کر جو سیدھے سادے اصول عوام کے سامنے رکھے گئے وہ یہ تھے۔

۱۔ وشنو کی پرستش کرنا۔ ۲۔ ہر پندرھویں روز روزہ رکھنا۔ ۳۔ سال میں دو دفعہ پنڈھرپور کی جاترا کرنا۔ ۴۔ گلے میں تلسی کی مالا پہننا۔ ۵۔ ہمیشہ خدا کا نام لینا۔ ۶۔ ان اصولوں کے ماننے والوں کو بلا لحاظ طبقہ اپنا برادر سمجھنا۔

گیا نیشور نے اس تحریک کو فلسفہ کی بنیاد پر بھی قائم کر دیا۔ سری کرشن کی مشہور نصیحت جو بھگوت گیتا کے نام سے موسوم ہے تفصیلی تبصرہ کے ساتھ مرہٹی نظم میں لانے کا سہرا گیا نیشور کے سر ہے۔ گیا نیشور کا خاندان پیرگی ضلع اورنگ آباد کا متوطن تھا۔ گیا نیشور کا باپ وٹھل پنڈت تارک الدنیا ہو کر بنارس چلا گیا لیکن نوجوانی میں گھر گرہستی کو ترک کرنے کے متعلق اس کے گرو نے بہت برا بھلا کہہ کر اسے لوٹا دیا۔ سنیاس سے واپس آنے کے بعد وٹھل پنڈت کے تین لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ نیورتی ناتھ، گیا نیشور، سوپان دیو، بھائی اور مکتا بائی بہن یہ کنبہ تھا۔ دھرم شاستر کی رو سے سنیاسی کو پھر گرہستی کا استحقاق نہیں ہے اس خیال سے پیٹن کے برہمنوں نے ان بچوں کو برادری سے خارج کر دیا اور وٹھل پنڈت کی اتنی سخت مخالفت کی کہ اس کو خودکشی کرنی پڑی۔ برہمنوں کی مخالفت سے گیا نیشور کے دل میں عوام سے ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوا۔ سنسکرت سے ناواقف اور مذہبی اصول سے بے نیاز جاہل طبقہ تک، مذہب کو پھیلانے کی گیا نیشور نے ٹھان لی۔ بھگوت گیتا پر زبان مرہٹی میں اس نے بمقام نیواسہ ضلع احمد نگر جب تبصرہ کرنا شروع کیا تو مہاراشٹر کے اعلیٰ طبقہ میں ایک ہیجان پھیل گیا۔ گیا نیشور نے پلٹ کر جواب دیا کہ سنسکرت دیوتاؤں کی زبان ہوگی لیکن مرہٹی تو چوروں کی زبان نہیں ہے۔ سنسکرت گہرے کنوئیں میں آب حیات ہوگی لیکن بغیر مرہٹی کے ڈول کے آب حیات کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ سنسکرت بہنے والی ندی ہوگی لیکن مرہٹی کے گھاٹ کے بغیر وہاں تک کوئی کیسے پہونچے۔ میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مرہٹی زبان میں، میں ایسی تصنیف کروں گا کہ لوگ یہ کہہ اٹھیں کہ گیا نیشور کا مرہٹی کلام امرت سے بھی بازی لے گیا ہے۔ مرہٹی زبان کی شان میں گیا نیشور نے جو نظمیں لکھی ہیں ان سے بہتر نظم گزشتہ چھ صدی میں کوئی نہیں لکھ سکا آج مہاراشٹر میں گیا نیشور کا تبصرہ گیتا جو گیا نیشوری کے نام سے موسوم ہے گھر گھر پڑھی جاتی ہے۔ ادبی نکتہ نظر سے گیا نیشور کو مرہٹی کا شاعر اعظم کہا جاتا ہے۔ بھگوت گیتا کی ایک ایک نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے دس دس نظمیں لکھ ڈالی ہیں اور کیا تشبیہات کیا استعارے، ہر پہلو سے گیا نیشور نے مرہٹی زبان کو ایسے زیور سے آراستہ کیا ہے کہ اس کی مثال شاذ ہی ملے۔ گیا نیشوری کو مرہٹی میں "گرنت راج" یعنی ام الکتاب کہا جاتا ہے۔ اس کتاب میں یادوا دور کے سماج کا پورا عکس جھلکتا ہے۔ کیا سماجی، کیا سیاسی، کیا مذہبی اور کیا ادبی اس کتاب کے ایک ایک پہلو پر مرہٹی میں بیسیوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ احمد نگر کی مجلس مرہٹی ادب نے گیا نیشور کی تصانیف پر اور گیا نیشور کی زندگی پر مہاراشٹر کے محققین کے عالمانہ مضامین جمع کر کے دس سال پیشتر ایک مجموعہ شائع کیا تھا جس کی ضخامت پندرہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔

گیا نیشور کا انتقال بیس سال کی عمر کے اندر ہوا لیکن مذہبی ڈھکوسلے بازی اور تکبر کا یہ پہلا باغی مہاراشٹر میں ایک ایسے مکتب خیال کی بنیاد ڈال گیا جس کے تحت

مرہٹے اپنی زبان پہ ناز کرنے لگے اور ذات پات کی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر قومی زندگی کا احساس کرنے لگے۔ گیانیشور کے بھائی، نیورتی ناتھ، سوپان دیو اور مکتا بائی نے بھی مرہٹی ادب میں اضافہ کیا ہے۔ گیانیشور کا انتقال علاء الدین خلجی کی آمد سے پہلے ہوا۔ اس کے انتقال کے پچیس سال کے اندر یادو خاندان کا چراغ گل ہو گیا اور مرہٹی ادب کو کسی رئیس کے دربار میں سہارا ملنے کے امکانات باقی نہ رہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھاگوت دھرم کی تحریک میں حصہ لینے والے معتقدین جو شعراء تھے وہ ملک کے مختلف طبقات سے پیدا ہو کر آزادانہ طور پر شعر کہنے لگے۔ مشہور شاعر نام دیو جس کا ابتدائی زمانہ گیانیشور کی صحبت میں گزرا اور جس نے اسی سال کی طویل عمر پائی پیشہ کا درزی تھا۔ اس کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ اس طرح سے ہو سکتا ہے کہ اس کے اشعار سکھوں کے گرنتھ صاحب میں شامل کئے گئے ہیں۔ نام دیو کا وطن تعلقہ ہنگولی کا قصبہ نرسی ہے۔ اس نے اور اس کی اولاد نیز دوسرے متعلقین حتیٰ کہ اس کی خادمہ جنا بائی نے جو نظمیں کہی ہیں ان کی تعداد روایتاً ایک کروڑ ہے اور خوبی یہ ہے کہ کیا گیانیشور، کیا نام دیو اور کیا تکا رام انھوں نے عوام تک اپنے کلام کو پہنچانے کے لئے نظم معرا (Blank Verse) کی دو مروجہ طرز اقسام، اووی، و ابھنگ جو چکی پیستے وقت بھی گائی جا سکتی ہیں، اپنے کلام کے لئے منتخب کیا ہے۔ نام دیو کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں تصنع نہیں ہے ایک ضدی لڑکا شفیق باپ سے جس طرح ہٹ کرتا ہے بالکل یہی طریقہ خدا سے مخاطب ہونے کے لئے نام دیو نے اختیار کیا ہے۔ اس خاندان کا ساتھ جن شعراء نے دیا ان میں ساوتا مالی، سا کن، سوم، نرسینا، سجام سا کن، بیدا، سا چوکھا میلا و مہر، جانگائی ویشنی سا کن منگل ویڈا غرضکہ ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں۔ مرہٹی ادب کی یہی خصوصیت دوسرے ادب سے اس کو ممتاز رکھتی ہے۔ ان شاعروں کے کلام میں حقیقی جذبات کا اظہار ہے، دنیا کی ہر تکلیف سے نجات پانے کے لئے دردکے ساتھ خدا سے معاون مانگنا، کبھی ان کو سخت مزاج باپ سمجھ کر، کبھی شفیق ماں سمجھ کر، کبھی دوست سمجھ کر اپنے چھوٹے بڑے دکھ درد کا اظہار کرنا، یہاں شعراء کے کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام باوجود اتنا عرصہ گزرنے کے ہر کس و ناکس کی زبان پر ہے۔

تیرہویں صدی میں گیانیشور اور چودھویں صدی میں نام دیو اگر ادبی دنیا کے درخشاں ستارے ہیں تو پندرہویں صدی میں ایکناتھ کا نام زبان پر آتا ہے۔ ایکناتھ پیٹھن کا متوطن تھا۔ اس کے گرو جنارد ن سوامی قلعہ دار دولت آباد کے پاس محاسب کی حیثیت سے تھے۔ ان کی صحبت سے ایکناتھ نے پورا فائدہ اٹھایا اور ترک ملازمت کے بعد جب انھوں نے پیٹھن میں سکونت اختیار کی تو اس نے ادبی خدمات سے ملک میں نمایاں حیثیت حاصل کر لی۔ سماجی معاملات میں ایکناتھ، گیانیشور کی روایات کا حامل ہے۔ اچھوتوں کے ساتھ اس کی ہمدردی، اور برہمن طبقہ کے اذکار رفتہ خیالات سے نفرت ایکناتھ کی زندگی میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ وہ بھی بھاگوت دھرم کا حامی تھا اور اس نے سری کرشن کی زندگی پر نیز بھاگوت کی گیارھویں جلد پر جو فلسفہ سے پر ہے نظم میں تبصرہ کیا ہے۔ اور یہ دونوں تصانیف نہایت دلچسپی سے اب تک پڑھی جاتی ہیں۔ ایکناتھ کی ادب میں دیرپائی کی وجہ ایک یہ بھی ہے کہ اس نے گیانیشوری کے متعدد نسخے جو ملک کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے اور قلمی ہونے کی وجہ سے ان میں بہت اختلافات ہو رہا تھا، ایک جگہ جمع کیا۔ اور مطالعہ و تصحیح کے بعد گیانیشوری کا نسخہ ترتیب دیا جو آج بھی مستند مانا جاتا ہے: اس نسخے کے آخر میں ایکناتھ التجا کرتا ہے کہ "خدا کے واسطے گیانیشوری میں اب مزید اضافہ کوئی نہ کریں۔ اگر کوئی ایسا کرے تو ایسے ہوگا جیسے کسی نے ہیرے کے دامن میں ناریل کا خول رکھ دیا ہو۔"

اس لحاظ سے ایکناتھ کو مرہٹی ادب کا پہلا ایڈیٹر سمجھنا چاہیے۔
ایکناتھ کا انتقال مرہٹی ادب کے ایک دور کو ختم کرتا ہے جس کی ابتدا گیانیشور سے ہوئی تھی۔ دور ہمنیس میں مہاراشٹر کی زندگی میں جو پستی پیدا ہو گئی تھی اس کی بنا پر یہ سبک ہنگام میں خدا پر بھروسہ کرکے ہر تکلیف کو برداشت کرنے کی عادت قومی زندگی کا جزو بن گئی تھی۔ بے بسی کی فضا میں خدا سے فریاد اور دعا مانگنا اعتنائیہ عبودیات اس دور کے شعراء میں پائی گئی ہیں۔ ایکناتھ کا انتقال اس زمانے میں ہوا جبکہ سلطنت احمد نگر مغلوں کی یلغار سے بچنے اور گولکنڈہ و بیجاپور سے مقابلہ کرنے کے لئے روز بروز زیادہ تعداد میں اپنی رعایا یعنی مرہٹوں کو منظم کرتی جارہی تھی۔ اگر مرہٹوں کو کسی نے جنگ کا فن سکھا کر میدان میں انھیں داخلہ دیکر سلاطین وقت کے کمزوریوں کی جھلک دکھا کر ان کے حوصلہ بڑھاتے ہیں تو اس کا سہرا ملک عنبر کے سر ہے۔ سولھویں صدی کی ابتدا سے مرہٹوں کی قومی زندگی میں حرکت شروع ہوئی جس نے جنگ تالی کوٹ کے بعد وجیانگر کی ریاست کو کرشنا کے جنوب سے ہٹا کر دکن کو ایک خطرہ سے نجات دلائی، دکن کی ریاستیں خالص دکھنی رنگ لائیں اور شاہان مغلیہ کے خلاف ایک دکھنی برادری قائم ہو گئی، اس شمال و جنوب کی مخالفت میں مغلوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں مرہٹوں نے احمد نگر، بیجاپور اور گولکنڈہ کا ساتھ دیا۔ ظاہر ہے کہ جب مرہٹہ سردار جنگ و صلح خیر و شر اور نشیب و فراز کی فضا میں ابھرنا شروع کئے تو اس تحریک کا اثر مرہٹی ادب میں بھی آگیا۔ ایکناتھ کے پوترے نے مہابھارت کے جن ابواب پر پرجوش نظمیں لکھی ہیں وہ سب جنگ مہابھارت سے متعلق ہیں، یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی، اور سولھویں صدی کا یہ زمانہ جس نے یادو خاندان کے ایک فرد لکھو جی جادھو راؤ کا حیثیت سردار احمد نگر مغلیہ عروج دیکھا اور جس نے جادھو راؤ کی بیٹی جیجا بائی کی شادی شاہ جی بھونسلے سے ہوتی ہوئی دیکھی اس نے مرہٹوں کی قومی زندگی کے محرک رام داس کی پیدائش بھی دیکھی۔ قوم کو عملی زندگی کا سبق سکھانے والے شعراء میں سوامی رام داس کی حیثیت نمایاں ہے۔ ان کا وطن موضع جامب ہے جو پرتور اسٹیشن سے قریب ہے۔ بارہ سال کی عمر میں جب اس لڑکے کی شادی ہوئی تو اسی وقت گھر چھوڑ کر بھاگ نکلا، اور بارہ سال تک اس نے ہندوستان کا کئی دفعہ سفر کیا اور زمانہ کے حالات کا عملی تجربہ اٹھایا۔ رام چندر جی کی پرستش اس کے عقائد میں تھی اور خدا اور بندہ کا رشتہ اس کی نظر میں رامچندر جی اور ہنومان جی کے رشتے کے مماثل تھا۔ خدائی خدمتگار ہو تو ہنومان کی مانند، خدا پرست بے خوف، مضبوط دل و مضبوط جسم چنانچہ مہاراشٹر میں رام داس نے جابجا ہنومان کا دیول قائم کرکے ورزش گاہ کو اس کا جزو بنایا۔ رام چندر جی کی پرستش کو قوم کے سامنے رکھ کر اس بہترین راجہ کی تمثال اس نے شیواجی کو دکھائی تھی۔ رام داس کی نظمیں رامچندر جی کی زندگی کے ہر پہلو پر مشتمل ہیں۔ اور اپنی بہترین تصنیف "داس بودھ" (خادم خدا کی نصیحت) میں رام داس نے اپنا مسلک قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کے چیلوں نے ملک میں جابجا "مٹھ" قائم کرکے ان کے توسط سے قومی و سماجی تحریک کا پرچار کیا۔ رام داس اور شیواجی کے تعلقات مرہٹوں کی تاریخ کا ایک اجاگر باب ہے۔ رام داس کے ساتھ ساتھ ان قومی تحریکوں سے ہٹ کر عوام کے دکھ سے تڑپ کر جس نے درد بھری نظمیں کہی ہیں وہ تکارام ہے۔ نیا قوم کے متوسط طبقہ کا یہ "گنوار"، آج مہاراشٹر کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اس کا کلام جو ہزاروں ابھنگوں پر مشتمل ہے جو اس دور کے مہاراشٹر کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ ... اس زمانہ کے ڈھونگی سادھوؤں کے چہرے پر سے اس نے نہایت صفائی سے نقاب اٹھائی ہے۔ وہ کہتا ہے۔

پیشانی پر چندن ہوا اور دل میں میل تو کیا فائدہ
گلے میں مالا ہو اور خیالات برے ہوں تو کیا فائدہ۔

ایک خدا کا نام لیکر باقی جملہ مذہبی پابندیوں سے دور ہوجائے تو بھی دعا خدا کے پاس قبول ہوتی ہے۔ ہزاروں ابھنگوں میں تکارام نے روزمرہ کی زندگی کے جو نقوش کھینچے ہیں وہ چوٹی کی شاعری کی دلیل ہے۔ کامیاب شاعری کے لئے حساس دل، اور زندگی کے ہر پہلو پر نظر ضروری ہے اور یہ چیزیں تکارام میں موجود تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک اس کا کلام عوام کے دلوں کے تاروں کو چھیڑتا جارہا ہے۔ شیواجی کی پیش کی ہوئی دولت کو قبول نہ کرکے تکارام نے سادگی کا اعلیٰ ثبوت دیا۔ جب اس غریب لیکن زندہ دل شاعر کا انتقال سترہویں صدی کے وسط میں ہوا تو سب نے جان لیا کہ شاعری کا یہ میدان جس میں تکارام نے طبع آزمائی کی تھی، ہمیشہ کے لئے خالی رہے گا۔ اس دور کے ایک دوسرے شاعر کا نام جس نے مرہٹی میں سری کرشن کی زندگی پر بہترین نظمیں لکھ کر مرہٹی ادب کو موسیقی تک پہونچادیا قابل ذکر ہے۔ یہ وامن پنڈت ہے۔ سری کرشن کے بچپن کے حالات اور یار دوستوں کے ساتھ اس کے کھیل کود کو انھوں نے اس قدر میٹھے پہلوؤں میں پیش کیا ہے کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر نہیں بلکہ ادب کی دیوی پیروں میں گھنگرو باندھے ناچ رہی ہے اور مرقع نگاری کا انتہائی کمال بھی یہی ہے۔ یہ شاعر عالم بھی تھا اور اس نے بھگوت گیتا پر مثل گیانیشور کے منظوم تبصرہ کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ گیانیشور کا نظریہ شنکر آچاریہ کے فلسفۂ وحدت الوجود پر مبنی تھا اور وامن پنڈت کا نظریہ مدھوا آچاریہ کے دوبیت مت پر مبنی تھا۔ اس شاعر کا وطن ناندیڑ تھا حالانکہ اس کی دونوں تصانیف میں فلسفہ و مرقع نگاری کی ہم آہنگی کا کمال دیکھ کر بعضوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس نام کے دو شاعر گزرے ہیں۔ وامن پنڈت کے قائم کردہ مکتب خیال کو جس میں منظوم تصویر کشی کا نمایاں مقام ہے، دو مرہٹی شاعر

آنند پنڈت اور رگھوناتھ پنڈت نے کمال کو پہونچایا۔ ایک نے رام کا بن باس اور دوسرے نے نل دمینتی کے حالات زندگی کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔ مرہٹی میں یہ نظمیں ہر کس وناکس کی زبان پر ہیں۔ ان کا زمانہ سترھویں صدی کا وسط قرار دیا جاتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جب مرہٹوں میں خودداری کا احساس پوری قوت کے ساتھ جاگ اٹھا تھا۔ اور قومی تحریک کی باگ سیواجی نے اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ اپنے باپ شاہ جی کے زمانۂ دربارداری میں سلاطین دکن کی کمزوریوں کو شیواجی نے بھانپ لیا تھا اور مغلوں کی بڑھتے ہوئے فوج کے سامنے جب یہ سلطنتیں پریشان حال تھیں تو ان کی مصیبتوں سے فائدہ اٹھاکر سیواجی نے ان پر حملہ کردیا۔ برسوں جدوجہد کے بعد سیواجی نے شجاعت اور تدبر کے جوہر دکھائے اور اپنی قوم کو دلیری کا سبق دیا۔ سیواجی نے مہاراشٹر میں ایک آزاد حکومت کی بنیاد ڈالی۔ اس کشمکش میں جب مہاراشٹر کی زندگی مغلوں کے طوفان میں اپنے قدموں پر ٹھیر نہیں سکتی تھی اور عالمگیری فوج کی لہریں جب دن رات اس پر تھپیڑے لگا رہی تھیں مرہٹے کے ادب میں عوام نے ایک نئے پہلو کو داخل کردیا۔ شجاعت کے مضامین کو عوام نے نظموں میں ڈھالا جو "پواڑے" (رزمیہ شاعری) کہلاتے ہیں اور عشقیہ مضامین جن میں مرہٹہ سپاہیوں نے اپنی دل بستگی کا سامان کیا۔ "لاؤنی" کہلاتے ہیں۔ فوج مہم پر ہے۔ جوش دلانے کے لئے قومی شعراء ساتھ ہیں ایک چھوٹے سے دف اور طنطنہ کے تال پر بہادروں کے کارناموں کو گیت میں گاکر جوش دلایا جارہا ہے۔ یہ ہیں پواڑے جو آج مرہٹی ادب کا بہترین زیور بن گیا ہے۔ ان پواڑوں کی تعداد جن میں سے ایک ایک تین تین چار چار سو اشعار پر مشتمل ہے پانچسو سے بھی زیادہ ہے۔ مرہٹہ سپاہیوں کے عشقیہ اشعار جو لاؤنی کہلاتے ہیں، دیہاتوں میں بہت مقبول ہیں۔ اعلیٰ طبقہ

ان کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا لیکن دیہاتی زندگی میں یہ نظمیں آبِ حیات کا کام دیتی ہیں۔ سماج سدھار کے لئے نئے مضامین منتخب کر کے حال میں بھاورکر اور ان کے ساتھیوں نے ان پواڑوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی میں مرہٹہ سپاہیوں کی زندگی کی تصویریں پواڑوں اور لاؤنیوں کے بغیر نامکمل ہے۔

سیواجی کو جہاں اپنے ملک کی آزادی کا خیال تھا وہاں زبان کی پاکیزگی کا بھی احساس تھا۔ بیجا فارسی آمیزش سے زبان کو بچانے کے خیال سے اس نے دفتر میں خالص مرہٹی کو رائج کیا اور فارسی اصطلاحات کے مماثل مرہٹی الفاظ کا ایک لغت تیار کیا۔ اس کے دربار یوں میں اکثروں نے نثر میں مرہٹوں کی تاریخیں بیان کی ہیں ان تاریخوں کو جن میں حقیقت و مبالغہ کی آمیزش ہوئی ہے، مرہٹی میں "بکھر" کہتے ہیں جو فارسی "اخبار" کا بگڑا ہوا نام ہے۔ ان اخباروں کو انگریزی میں (کرانیکل سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس سے شکسپیر نے اپنے ڈراموں کے مضامین منتخب کئے تھے۔ بکھروں کا یہ سلسلہ جس میں مرہٹہ راجگان کے حالات مندرج رہتے تھے، تقریباً ڈیڑھ سو سال تک جاری رہا۔ اس زمانے کی مرہٹی نثر کا یہ نمایاں نمونہ ہے۔ اننت کرشن کی بکھر جو سیواجی کی زندگی پر مشتمل ہے اور زمانہ مصیبت میں سیواجی کے چھوٹے بیٹے راجہ رام کو ہمت دلانے کے لئے لکھی گئی تھی۔ چٹنس کی بکھر جو راجہ شاہو کی خاطر لکھی گئی، پانی پت کی بکھر جس میں جنگ پانی پت کے واقعات مندرج ہیں۔ اس حیثیت سے نمایاں ہے کہ حساس اور تجربہ کار لوگوں نے لکھا ہے۔ اس قسم کے ایک سو سے زیادہ بکھریں مرہٹی ادب کا ایک اہم باب بنی ہوئی ہیں۔ عالمگیر کی وفات کے بعد مرہٹوں نے شمال پر دھاوا بول دیا اور تقریباً سو سال تک پنجاب سے ترچناپلی تک اور گجرات سے بنگال تک، ہندوستان پر چھا گئے تھے۔ ہزاروں نئے سپاہیوں نے مختلف مقامات پر اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ مغل، راجپوت وغیرہ مقامی رئیسوں کے ساتھ مرہٹوں کے تعلقات چولی دامن کی طرح ہوگئے تھے۔

مرہٹہ سرداروں کے آپس کی مراسلت، خطوط اخبار، جو اس وقت تک شائع ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے اس زمانہ کی دفتری مرہٹی، فارسی سے کس قدر متاثر ہوئی تھی بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مرہٹی میں فارسی الفاظ کی آمیزش پچاس ساٹھ فیصدی سے بھی بڑھ گئی تھی۔ یہ خطوط تاریخی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے بھی اس لئے نمایاں ہیں کہ ان میں اس دور کی زندگی کا پورا پورا عکس جھلکتا ہے۔ لیکن جہاں درباری مرہٹی میں فارسی کا اتنا رنگ چڑھ گیا وہاں ادبی مرہٹی بالکل پاک و صاف رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرہٹی شاعری کی باگ شاستری پنڈتوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور شاعری کے مضامین مہابھارت اور رامائن سے منتخب کئے جاتے تھے جہاں عوام کے پواڑوں اور لاؤنیوں میں فارسی سے عام لاعلمی کے باعث صرف چند الفاظ داخل ہو سکے وہاں پنڈتوں کی زبان میں فارسی کا وہ عنصر بھی باقی نہ رہا۔

اٹھارہویں صدی کا شاعر اعظم یقینی طور پر مورو پنت ہے۔ یہ بارامتی کا متوطن اور سنہ ۱۷۳۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے اتنی نظمیں لکھی ہیں کہ مرہٹی میں کلام کی کثرت کو مورو پنت کے قلم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ اس نے نظم کی ہر قسم میں طبع آزمائی کی جو دو ہے سے ملتی ہے۔ اپنی ستر سال کی عمر میں اس نے کبھی آرام نہیں لیا۔ مہابھارت کی پوری کہانی کو اس نے مرہٹی میں منتقل کیا۔ فن مکالمہ کا یہ استاد مانا جاتا ہے۔ چنانچہ ارجن اور کرن کا مکالمہ جس کو مورو پنت نے مرہٹی میں لکھا ہے، اس کے فن کا بہترین

نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اپنے آپ کو مور سے تشبیہ دے کر اور خدا کو ابر سمجھ کر باران رحمت کی تلاش میں اس نے کیکا ولی (مور کی پکار) کے عنوان سے جو اشعار لکھے ہیں۔ ان سے ہمارا شعر میں شاعری کو ناواقف ہو۔ ان اشعار میں بلا کا جذباتی رنگ بھرا ہوا ہے۔ مورو پنت کے انتقال (۱۷۹۶ء) سے مرہٹی ادب کا دورِ وسطیٰ ختم ہوتا ہے۔ اس کے انتقال کے کچھ دن بعد ہی ہمارا شہر انگریزوں کے تصرف میں چلا گیا اور زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ مرہٹی ادب پر بھی مغربی اثرات مترتب ہونے شروع ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

کرشنا کمار

بہار آئی!!

بہار آئی پینے پلانے کے دن ہیں
کہ اب نت نئے گل کھلانے کے دن ہیں

مسرت کے پرچم اڑانے کے دن ہیں
غمِ دہر پر فتح پانے کے دن ہیں

یہ رنگیں نگاہیں، یہ مستانہ راتیں
مئے ارغوانی لنڈھانے کے دن ہیں

حسینوں سے آنکھیں لڑانے کی رت ہے
محبت کا جادو جگانے کے دن ہیں

ہجوم تمنا سے معمور ہو کر
بہار جوانی لٹانے کے دن ہیں

ہیں کتنے حسیں زندگانی کے تیور
غم و یاس کو بھول جانے کے دن ہیں

نمودِ جوانی کا طرز اللہ اللہ
زمانے کی گردن جھکانے کے دن ہیں

خرد کو خرد ہی کی منزل میں رکھ کر
جنوں کو بس اب آزمانے کے دن ہیں

نہ کچھ بیمِ فردا، نہ کچھ فکرِ عقبیٰ
کہ یہ لطف رحمت اٹھانے کے دن ہیں

نمودِ بہاراں ہے صبحِ محبت
محبت کے سو گیت گانے کے دن ہیں

بہار آئی اور سازِ عشرت چھڑا ہے
دلوں کی مرادیں بر آنے کے دن ہیں

علی اشرف

سلطانہ کے ساتھ ـــــ ایک ملاقات

"سینما چلو گی ؟" رضیہ نے اپنی سہیلی سلطانہ سے رخصت ہوتے ہوئے پوچھا۔

"لیکن اب وقت کہاں باقی ہے، اور پھر مجھے آج ایک دعوت میں بھی شریک رہنا ہے۔" سلطانہ نے جواب دیا۔

رضیہ۔ ارے تمھیں تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی عذر ہی رہا کرتا ہے۔ جب دیکھو یہ کام ہے وہ کام ہے آخر تم روز بروز اتنی عدیم الفرصت کیوں ہوتی جا رہی ہو۔ اب تک سنتے تو یہ تھے کہ شادی ہونے پر ہی انسان مختلف ذمہ داریوں میں جکڑا جاتا ہے لیکن تم ـــــ

"اچھا دیکھو تو اس وقت ساڑھے چھ بجنے میں کچھ ہی منٹ باقی ہیں" سلطانہ نے رضیہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

رضیہ: کیا حرج ہے سکنڈ شو چلو۔"

"بہرحال دیکھنا ضروری ہے۔ چاہے سکنڈ شو ہی کیوں نہ ہو۔ اچھی بات ہے ـــ

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

سلطانہ نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

ٹھیک وقت پر رضیہ کی موٹر سلطانہ کے مکان پر رکی۔ دونوں سینما ہال میں داخل ہوئے۔ کھیل شروع ہونے میں چند منٹ باقی تھے۔ مردانہ حصہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور شور و غل اس غضب کا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

"ہم لوگوں میں نظم و ضبط کی کمی کا جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ حق بجانب ہے" سلطانہ نے شور و غل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رضیہ۔ ہاں ٹھیک ہے لیکن اس کی وجہ میرے خیال میں جہالت کی فراوانی اور نظامِ تعلیم کی خرابی ہے۔ ہم کو جو علم سکھایا جاتا ہے اس میں نہ اخلاق و عادات پر زور دیا جاتا ہے اور نہ نظم و ضبط کا طریقہ سکھایا جاتا ہے پھر نظم و ضبط آئے تو کیونکر آئے۔

سلطانہ۔ مجھے تمھارے خیالات پسند ہیں لیکن بعض باتوں میں اختلاف بھی ہے۔ خیر اس بحث کو پھر کسی فرصت میں طے کریں گے۔ وہ دیکھو کھیل شروع ہو گیا۔

جیسے ہی کھیل شروع ہوا ہال میں ہر طرف سناٹا چھا گیا اور ہر شخص دلچسپی کے ساتھ کھیل دیکھنے میں محو تھا۔ یہ دونوں بھی خاموشی کے ساتھ کھیل دیکھنے میں مشغول تھے۔ کھیل کے دوران میں کبھی کبھی کسی چیز کو دیکھ کر تنقید یا تعریف کرتے جاتے۔ کھیل ختم ہوا۔ دونوں نے موٹر میں سوار ہو کر گھر کی راہ لی۔

سلطانہ۔ مجھے تو ہندوستانی تصاویر سے روز بروز نفرت سی ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس میں سوائے لیلیٰ مجنوں کی داستانِ عشق کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے انگریزی تصاویر میں یہ بات نہیں۔ ان کی داستانِ عشق بھی نہایت خوبی سے پیش کی جاتی ہے اور کوئی بات ایسی نہیں ہوتی کہ دیکھنے والے کو دلچسپی نہ ہو۔

رضیہ۔ ارے تم نے تو غضب کر دیا۔ کیا ہندوستان میں سوائے لیلیٰ مجنوں کی داستان کے اور کوئی چیز موضوعِ بحث نہیں رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کثرت ان ہی تصویروں کی ہے لیکن انصاف سے دیکھا جائے تو ہندوستان آرٹ اور فلسفہ کی تصاویر بنانے میں یورپ اور دوسرے ممالک سے پیچھے نہیں۔ لیکن بدقسمتی تو یہ ہے کہ ایسی تصاویر عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر سکتیں۔ اسلئے فلمی ادارے عوام کے مذاق کے مطابق تصاویر بنانے پر مجبور ہیں۔ مثال کے طور پر اسی تصویر کو لیجئے جس کو ہم ابھی دیکھ آئے ہیں۔ اس میں عشق و عاشقی کی داستان کے ساتھ بعض اصلاحی امور پر بھی روشنی

ڈالی گئی ہے خصوصیت کے ساتھ ماحول اور معاشرہ پر جو روشنی ڈالی گئی ہے یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ یہ اور بات ہے کہ تم نے اچھی تصاویر نہ دیکھی ہوں یا چند بری ہو وہ تصاویر سے یہ اندازہ قائم کر لیا ہو کہ ہندوستان معیاری تصاویر بنا ہی نہیں سکتا۔

سلطانہ۔ بہر حال تم کو تو یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ہندوستان میں عشق و محبت پر جس انداز سے بحث کی جاتی ہے اس کی نظیر شاذ ہی کسی ملک میں ملے۔ ایک فلمی ادارے ہی پر کیا منحصر یہاں کا ہر شاعر ادیب، فلسفی عشق کی معراج پر پہنچا ہوا نظر آتا ہے۔ اور آج کل تو یہ مرض اس قدر عام ہو گیا ہے کہ ہر شخص محبت کے مرض میں مبتلا نظر آتا ہے۔ عجیب چیز ہے یہ محبت بھی۔ مجھے تو ان مریضانِ محبت پر رحم آتا ہے۔ بیچارے عشق کے مریض!!

رضیہ۔ اگر تم کو کسی سے محبت ہو جاتی تو شائد ایسے الفاظ کبھی تمہارے منہ سے نہ نکلتے۔

سلطانہ۔ محبت —— آخر یہ محبت ہے کیا بلا۔ اور یہ کیوں ہو جاتی ہے۔

رضیہ۔ اوہ کیا بھولی لڑکی ہے۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ اس سوال کا جواب تو وہی بہتر دے سکتے ہیں جن کے ساتھ تم اس روز چمن میں خوش خرامی کر رہی تھیں۔

سلطانہ۔ لیکن مجھے تو ان سے محبت نہیں۔ وہ تو میرے دوست ہیں۔

رضیہ۔ ہاں ان ہی سے پوچھو۔ وہ اچھی طرح سے اس مسئلہ کی تشریح کریں گے۔

سلطانہ۔ گر تمہاری گفتگو سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ تم بھی اس میدان کی سوار ہو۔ رضیہ نے یہ سن کر پہلے تو مسکرایا پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ موٹر سلطانہ کے گھر پہنچ گئی۔

"کیا ہو گیا تمہیں۔ آہیں کیوں بھرنے لگیں۔ اچھا ٹھنڈا پانی بھجواتی ہوں تاکہ تمہارے عشق کی آگ سرد ہو جائے" یہ کہتے ہوئے سلطانہ نے رضیہ کو خدا حافظ کیا۔

رضیہ اپنے مکان کی طرف روانہ ہو گئی۔ رات کافی بھیگ چکی تھی۔ رضیہ کے دماغ میں دیکھی ہوئی تصویر کا پلاٹ اور اپنی گزشتہ ناکام محبت —— کا تصادم ہو رہا تھا۔ اس کے دماغ میں افسردہ خیالات کا ہجوم تھا۔ اس کو اپنی حرماں نصیبی کا احساس اس تصویر کے دیکھنے کے بعد تازہ ہو گیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ تصویر میں دیکھی ہوئی محبت کتنی کامیاب ہے اور کس قدر رومان انگیز——!!

وہ ان ہی خیالات کی رو میں بہی جا رہی تھی کہ دفعتہً موٹر اس کے مکان پر رکی۔ وہ اس طرح چونک پڑی جیسے کوئی سہانا سپنا دیکھتے دیکھتے یکایک کسی مہیب آواز سے چونک پڑتا ہے۔ خیالات کے بے پناہ ہجوم میں اس کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ گھڑی نے دو بجائے۔ اس نے کھڑکی کھول کر نیند کی متوالی دنیا پر اپنی نظریں گاڑ دیں۔ بہت دیر تک وہ یونہی کھڑکی کے پاس خاموش فضا کو تکتے ہوئے کھڑی رہی۔ دور سے کوئی سہرو درد بھری لے میں گاتا ہوا جا رہا تھا۔

"محلوں میں رہ کر بھی چین نہ آئے"

غیاث النساء بیگم

اعتذار:- گزشتہ دو تین مہینے سے رسالہ بروقت شائع نہیں ہو رہا ہے جس کی وجہ سے خریدار اصحاب کو انتظار کی زحمت ہو رہی ہے۔ ادارہ کو قارئین سب رس کی اس تکلیف کا کامل احساس ہے اور حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے کہ رسالہ بروقت شائع ہو لیکن آجکل پریس میں نصابی کتابوں کی طباعت کا کام ہو رہا ہے اسی وجہ سے رسالہ چھپنے میں دیر ہو رہی ہے۔ انشاء اللہ اگسٹ کا رسالہ بروقت شائع کرنے کی کوشش کی جائیگی۔ "ادارہ"

رجب کا میلہ[1]

سچ پوچھئے تو میلے رازِ شگفتگی ہیں
بدخواہ ان کے یکسر ناکام زندگی ہیں

بعد ایک سال کے پھر میلہ بھرا رجب کا
ہے ایک ہی یہ میلہ بلدہ میں اپنے ڈھب کا

ہم شانِ طور دامنِ کوہِ شریف کا ہے
ہر ذرہ بن کے سورج جلوے دکھا رہا ہے

زمانہ کیا لگاؤں کتنے تماشے ہیں ہیں
دو ڈھائی لاکھ سے تو ہرگز یہ کم نہیں ہیں

دیکھا یہی تماشا دیکھا جدھر پلٹ کر
تھالی ہزار پھینکو گرتی نہیں زمیں پر

کاپی گوڑہ ادھر ہے لالہ گوڑہ ادھر ہے
آباد رہروؤں سے پوری یہ رہگزر ہے

ہیں رہگزر بھی گلشن گل چہرہ رہروؤں سے
پُرکیف ہو کے گزرا میں خاص راستوں سے

بے غبہ آج سلطاں بازار دیدنی ہے
خورشید طلعتوں کی ہر سمت روشنی ہے

یہ آنِ دلفریبی یہ دیدہ زیب عالم
یہ شان دیدہ زیبی یہ دلفریب چھم چھم

انساں کو بھیڑ میں جب انساں دھکیلتا ہے
ذوق آفریں تبسم چہروں پہ کھیلتا ہے

آئی نظر یہاں پر ہر قسم کی سواری!
رکشا یہ ہے وہ تانگا شکرم یہ ہے وہ لاری

بنتا پڑا ہے سنگ رہ ہر ایک زد رس کو
رتھ کے بھی پیچھے پیچھے دیکھا ہے میں نے بس کو

خود کو توال صاحب موقع پہ آرہے ہیں
امن و اماں تھے آگیں سب کو سکھا رہے ہیں

ہمدرد یاں پولس بھی اپنی دکھا رہی ہے
آرام دے رہی ہے تکلیف پا رہی ہے

ہیں خوش نما دکانیں ہر سو سجی سجائی
ہے دل گرفتگی اب پامالِ دل کشائی

ہر قسم کے کھلونے نظروں کے سامنے ہیں
باہر سے آئے ہیں کچھ کچھ اپنے دیس کے ہیں

بچوں سے کر رہے ہیں دریافت لوگ مرضی
اکثر سوال ان کے دلکش ہیں اور فرضی

فرمائشیں ہیں جتنی اتنے کہاں ہیں پیسے
خوش کر دیا کھلونے دلوا کے ایسے ویسے

مایوس ہر طرح سے ڈھب لین دین کا ہے
ہنس مکھ ہے کوئی تاجر کوئی اکھلکھرا ہے

قیمت بتا رہا ہے وہ منہ بنا بنا کر
راضی یہ ہو رہا ہے نرخ مقررہ پر

ہیں آج کل کے لڑکے ہشیار کس بلا کے
ہمراہ باپ کے اک اک ساتھ ہے چچا کے

انگلی کسی نے پکڑی دامن کسی نے تھاما
لال اس کی شیروانی اس کا ہرا ہے جامہ

ساتھ ان کے ہے جو لڑکی شان اس کی دیدنی ہے
کرتہ ہے آسمانی گلنار دامنی ہے

کیونکر نہ خوش ہوئے کر گزرا یہ بھولی بھالی
اس نے بٹن دبائی اس نے بجائی تالی

بندوق یوں بہن کو کوئی دکھا رہا ہے
گویا شکار اس کی زد میں اب آرہا ہے

اس طرح خوش ہزاروں اطفال ہو رہے ہیں
رو بھی رہے ہیں کچھ تو ضد کر کے رو رہے ہیں

دلوا کے دیکھو ان کو جی چاہے سو کھلونا
ہنس دیں یہ کھل کھلا کر خود بھول جائیں رونا

علی منظور

---

[1] بعض لوگ اس کو ننگم پلی کا میلہ بھی کہتے ہیں سرکاری جنتری میں عرس کوہِ شریف لکھا جاتا ہے اس کے لئے ۱۷ اور ۱۸ رجب کو مسلسل دو چھٹیاں ملتی ہیں۔

تنقید و تبصرہ

واجد علی شاہ:- مرتبہ محمد تقی احمد ایم اے۔ ناشر کتاب خانہ دانش محل لکھنؤ۔

اودھ کے آخری تاجدار جان عالم واجد علی شاہ کے حالات زندگی پر اس کتاب میں اجمال کے ساتھ نظر ڈالی گئی ہے۔ پہلے باب میں اودھ کی سرسری تاریخ بیان کی گئی ہے دوسرے باب میں واجد علی شاہ کے سوانح۔ تیسرے میں سیرت اور چوتھے اور پانچویں ابواب میں نظم مملکت اور سماجی حالات کا ذکر ہے۔ لیکن یہ تمام ابواب نہایت سطحی اور مختصر معلومات پر مشتمل ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف زیادہ تر ان اسباب کی وضاحت کرنا چاہتے تھے جو واجد علی شاہ کی معزولی کا باعث ہوئے اور اس نقطۂ نظر سے اس کتاب میں جو معلومات درج ہیں وہ اردو دنیا کے لئے نئی ہیں اور اگر اس کتاب کا نام واجد علی شاہ کی معزولی کے اسباب رکھا جاتا تو بہتر ہوتا

واجد علی شاہ کی زندگی سیاسی نقطۂ نظر کے علاوہ دیگر مختلف پہلوؤں سے بھی مطالعہ کے قابل ہے۔ اردو ادب اور خاص کر شعر و سخن اور ساتھ ساتھ موسیقی کی جو سرپرستی لکھنؤ کے اس آخری تاجدار نے کی ہے وہ اتنی اہم ہے اور اس کی نسبت اتنی زیادہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ ان پر بجائے خود جداگانہ کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ واجد علی شاہ خود بھی ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ ان کی مثنویاں۔ ان کے خطوط اور ان کے دیوان بجائے خود اس قابل ہیں کہ ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی جائے اس کے علاوہ ان کے دربار میں جو ادیب اور شاعر جمع تھے اور جن میں سے بعض ایسے بھی تھے کہ ان پر مولٰنا علی حیدر طبا طبائی مرحوم نے دربار واجد علی شاہ کے سبعہ سیارہ کے عنوان سے بالاقساط مضامین لکھے تھے ان سبھوں کے کارنامے اور ان کی شاہی سرپرستی پر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی۔ افسوس ہے کہ زیر نظر کتاب میں ان کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ واجد علی شاہ کے بسوط سوانح حیات مرتب کئے جائیں اور اس بادشاہ نے علم و فضل اور شعر و سخن اور مشرقی موسیقی کی جو سرپرستی کی ان سب کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا جائے۔

بہر حال یہ کتاب واجد علی شاہ کی معزولی کے متعلق مفید معلومات پر مشتمل ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کے مولف مولوی محمد تقی احمد صاحب نے آخری تاجدار اودھ کی زندگی کے اس پہلو پر قابل قدر روشنی ڈالی ہے جس کی مدد سے واجد علی شاہ کی ایک مکمل سوانح حیات کی تالیف میں آئندہ کے مورخ صحیح نتائج اخذ کر سکیں گے۔

نقش امروز:- از سید علی اشرف صاحب۔ ناشر عبدالحق اکیڈیمی حیدر آباد۔

نقش امروز حیدر آباد کے ایک نوجوان اور صاحب ذوق شاعر علی اشرف کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے جو بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا۔ علی اشرف حیدر آباد کی اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ وہ ایک سہ روزہ اخبار تنظیم کے مدیر ہیں اور حیدر آباد کے ایک صاحب علم و فضل خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے منظر عام پر آئے ہوئے علی اشرف کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل مدت میں انھوں نے اس میدان میں بھی خاصی کامیابی حاصل کرلی ہے اور دکن کے نوجوان شعراء میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

نقش امروز میں علی اشرف صاحب کی پچاس سے زیادہ نظمیں اور تقریباً پچیس غزلیں شامل ہیں۔ لیکن وہ نظم ہی کے لئے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کی نظمیں سماجی حالات کی عکاسی اور انقلابی جذبات کی ترجمانی میں عہد حاضر کے ترقی پسند شعراء کے کلام سے متاثر نظر آتی ہیں اور توقع ہے کہ وہ پختہ مشقی کے ساتھ ساتھ اپنے کلام میں رفعت تخیل اور حقائق نگاری

کی اس سے زیادہ کامیاب ترجمانی کرسکیں گے۔
نقش امروز میں جو غزلیں شامل ہیں ان میں دلی جذبات اور احساسات کو شعریت اور موسیقی کا جامہ پہنایا گیا ہے اور ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر علی اشرف نے اپنی فطری صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا تو ہندوستان کے نوجوان شعراء میں وہ اپنا ایک مقام پیدا کرلیں گے۔ اور جس طرح سے مولوی قاضی عبدالغفار صاحب نے اس مجموعہ کے مقدمہ میں لکھا ہے:-

"ابھی تو جدید شاعری کی اس روح کو
زندگی کے سوز و ساز کی بہت سی منزلیں
طے کرنی ہیں"

مال والوں کی تاریخ:- از سید مراد علی طالع

ناشر - ادارۂ ادبیات اردو

اس چھوٹی سی کتاب میں حیدرآباد کے مشہور و مخیر ہندو خاندان کے حالات اور خدمات ملک و مالک کا ایک مختصر تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے۔
مال والوں کے خاندان کے مورث اعلیٰ شہر حیدرآباد کے مالی بیٹل تھے اسی لئے ان کے خاندان کو حیدرآباد میں مال والے کہتے ہیں۔ سلاطین آصفی نے اس خاندان کے اکثر افراد کو ان کی مستحسن خدمات کے صلہ میں مناصب جاگیرات اور خطابات سے سرفراز کیا تھا۔ اس خاندان کے موجودہ چشم و چراغ آنریبل راجا دھرم کرن بہادر آصف جاہی ہیں۔ جن کے دل میں علم و ادب اور خدمت ملک کا جذبہ اپنے آباد اجداد سے کسی طرح کم نہیں ہے۔
اس تذکرہ کے مطالعہ سے ملک کی موجودہ اور آئندہ نسلیں محسوس کریں گی کہ مملکت آصفیہ کی صلح کل روایتوں کی تعمیر و ترقی میں مسلمان امرا کے ساتھ ساتھ ہندو عمائد نے بھی کس خلوص اور دلچسپی سے برابر کا حصہ لیا ہے۔

دھوپ چھاؤں:- از فضل الرحمن -

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد -

مولوی فضل الرحمن صاحب ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے اردو دنیا میں کافی طور پر متعارف ہوچکے ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے اس سے قبل چھپ چکے اور بارہا اسٹیج اور ریڈیو پر پیش کئے جاچکے ہیں۔ "ظاہر باطن" "نئی روشنی" اور "حشرات الارض" ان کے تین مزاحیہ سماجی ڈرامے ہیں جن کے پلاٹ انگریزی سے لئے گئے ہیں۔ اور "آئندہ زمانہ" اور "کارخانہ" یہ دو فضل الرحمن صاحب کے طنزیہ ڈرامے ہیں۔
ان سب ڈراموں کی وجہ سے اردو کے جدید ڈرامائی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے اور توقع تھی کہ فضل الرحمن صاحب کا کوئی اور ڈراما شایع ہوگا۔ لیکن خلاف امید ان کی نظموں کا یہ مجموعہ "دھوپ چھاؤں" اس وقت پیش نظر ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ پتہ چلا کہ فضل الرحمن صاحب کو فطرت کی طرف سے ادب و شعر کا ایک خاص ذوق نصیب ہوا ہے اور ان کی طبیعت میں اتنی زیادہ جودت اور اپج ودیعت کی گئی ہے کہ وہ ادب کے جس میدان میں قدم رکھتے ہیں کامیابی ان کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔
اس مجموعہ میں چالیس نظمیں ہیں۔ جن میں سے اکثر نظمیں شاعر کی فطری جودت اور رنگینی طبع کی نمائندہ ہیں۔ ادھر کچھ عرصے سے بعض مجلسوں میں فضل الرحمن صاحب کا کلام سنا جا رہا تھا۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا تھا کہ انھوں نے اب تک اتنا زیادہ لکھا ہے کہ ایک مجموعہ شایع ہوسکے گا۔
جدت اور اپج کے ساتھ ساتھ فضل الرحمن صاحب کے کلام میں ایک خاص سنجیدگی اور پختہ زدگی بھی نمایاں ہے۔ جس کی وجہ سے یقین ہے کہ وہ

عہد حاضر کے ایک ایسے شاعر ثابت ہوں گے جو موقتی رجحانات کے طوفان میں بہہ نہ سکے گا۔ بلکہ اپنے کلام سے شعر و سخن کی دنیا میں ایک ایسا اضافہ کرے گا جو اس دورِ گزراں کے بعد بھی زندہ رہے گا اور اردو کے ادبِ عالیہ میں جگہ پا سکے گا۔

رفیقِ اُردو داں: ازمرزا عصمت اللہ بیگ۔ ناشر ادارۂ ادبیاتِ اردو۔ حیدرآباد

اُردو میں تعلیم بالغاں کے لیے جیسی چاہیئے ویسی کوشش اب تک نہیں کی گئی۔ حیدرآباد میں گزشتہ پانچ سالوں میں مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج کی سرپرستی میں تعلیم بالغاں کی مہم شروع ہوئی ہے۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو نے بالغوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھ کر جدید نصابی اور امدادی کتابیں سجاد مرزا صاحب ہی کی نگرانی میں لکھوا کر شائع کی ہیں جو مملکت حیدرآباد کے باہر بھی مقبول ہوئی ہیں اور ان کے ذریعہ سے اب تک ہزاروں ان پڑھ پڑھے لکھے بن گئے۔ اس وقت ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک ایسی کتاب مرتب ہو جو بالغوں میں ذوقِ مطالعہ پیدا کر سکے اور جس کو پڑھ کر اپنی تعلیم جاری رکھنے کا خیال ان کے دلوں میں پیدا ہو یا کم از کم وہ اپنا پڑھا لکھا بھول نہ جائیں۔ یہ مفید اور ضروری کام مولوی مرزا عصمت اللہ بیگ صاحب نے مولوی سجاد مرزا صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا اور اس طرح یہ کتاب "رفیقِ اُردو داں" مرتب ہوئی۔ اس کو پڑھے لکھے بالغوں کی نفسیات کے مطابق مرتب کرنے میں مولف نے بڑی جانکاہی اور محنت سے کام لیا ہے اور اس کی وجہ سے اردو میں ایک ایسی قابل قدر کتاب کا اضافہ ہوا ہے جس سے تعلیم بالغاں کی مہم سے دلچسپی رکھنے والے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اس میں قصوں اور کہانیوں کے ساتھ ساتھ دلچسپ اور ضروری معلومات اور مفید اور شگفتہ نظمیں بھی شامل ہیں جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ توقع ہے کہ یہ کتاب صحیح معنوں میں اُردو دانوں کی رفیق ثابت ہوگی۔

چاند بی بی سلطان: از وزیر حسن (عثمانیہ) ناشر دکن اردو اکیڈیمی۔ حیدرآباد

اردو ادب میں ایسی کتابیں کم ہیں جن کے کردار ملک کی بہو بیٹیوں کے لئے نمونے کا کام دے سکیں۔ مولوی وزیر حسن صاحب نے دکن کی ایک ایسی ملکہ کا انتخاب کیا ہے جو نہ صرف اپنے حسن بلکہ اعلیٰ کردار کی وجہ سے دنیا کی مشہور و معروف ہستیوں کی صف اول میں جگہ پاتی ہے۔ چاند سلطانہ اپنی بہادری، عصمت مآبی اور خلوص و ایثار کی وجہ سے مکمل نسائیت کا ایک ایسا نمونہ ہے جس کے حالات زندگی صنف نسواں کے لئے ہمیشہ درس آموز ثابت ہوتے رہیں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسی عدیم المثال شخصیت کی کردار نگاری کے لئے ایک وزیر حسن جیسے اعلیٰ پائے کے ادیب ہی کی ضرورت تھی۔

چاند سلطانہ کی زندگی کا ہر پہلو بے عیب رہا۔ وہ جہاں ایک سخت مزاج اور بے مہر شوہر کی وفادار بی بی رہی، ابراہیم عادل شاہ جیسے جگت گرو بادشاہ کی مادر مہربان ثابت ہوئی حالانکہ وہ اس کے بطن سے نہیں تھا لیکن اس نے اس شہزادہ کی ایسی عمدہ نشو و نما کی کہ آج وہ دکن کا ایک عظیم الشان بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کی کم عمری کے زمانے میں چاند سلطانہ بیجاپور کی سلطنت کی باگ ڈور اس خوبی سے اپنے ہاتھ میں سنبھالے رہی کہ شاید ہی کوئی بادشاہ ایسی حکومت کر سکتا۔ آخر میں مغلوں کے ساتھ اس نے اپنے آبا و اجداد کی نظام شاہی سلطنت کی حفاظت کے لئے جو مقابلے کئے وہ تاریخ ہند میں ہمیشہ یاد رہیں گے۔ قدیم تاریخیں ان کی سیاست اور شجاعت کے تذکروں میں رطب اللسان ہیں۔ لیکن کہیں کوئی ایسا اشارہ تک نہیں ملتا کہ چاند سلطانہ نے .... اپنے دامن عفت و عصمت کو آلودہ کیا ہو۔

غرض ایک ایسے اعلیٰ موضوع پر وزیر حسن صاحب نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن کسی کتاب کی کامیابی محض موضوع پر منحصر نہیں ہوتی چاند سلطانہ پر اس سے قبل بھی اردو میں لکھا جا چکا ہے۔ لیکن وزیر حسن صاحب کی زبان اور انداز بیان اور ساتھ ہی ان کے تخیل کی رنگا رنگی نے اس زیر نظر کتاب کو اردو کے ادب عالیہ میں شامل کر دیا ہے۔

یہ کتاب بہ یک وقت تاریخ، افسانہ، ڈراما، شاعری اور موسیقی ہے۔ ان سبھوں کو مصنف نے اس خوبی سے ایک جگہ سمو دیا ہے کہ بے تحاشا مصنف کے کمال اور کامیابی کی داد دینی پڑتی ہے۔

اس کتاب میں چاند سلطانہ کے سوانح حیات ابھی مکمل نہیں ہوئے ہیں بلکہ اس کو صرف ایک بیٹی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وزیر حسن صاحب ابھی ایسے کتنے حصے قلم بند کریں گے۔ لیکن اس کی اشاعت کے بعد یقین ہے کہ اس کو جو قدر و منزلت ہو گی اس کی بنا پر وہ بہت جلد اس کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

مولوی محمد حسین آزاد نے دربار اکبری اور اپنی دوسری تحریروں میں قدیم مغلیہ عہد کی زندگی کو جس خوبی کے ساتھ قلم بند کیا تھا اس کے بعد امید نہ تھی کہ کوئی اور ادیب انشاپردازی کے اس کمال تک پہنچ سکے گا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولوی وزیر حسن صاحب نے اس ناامیدی کو اپنی اس کتاب کے ذریعہ سے دور کر دیا۔ اردو زبان اور ادب خوش قسمت ہے کہ اس میں اب بھی ایسے اعلیٰ پائے کے ادیب اور انشاپرداز موجود ہیں۔

یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہندوستان کے تمام مدارس فوقانیہ اور جامعات اپنے کتب خانوں اور طلبہ کے انعامات کے لئے خریدیں۔

"ق"

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد کے شکریہ کے ساتھ)

اعلان

بالغوں کا اخبار "رہبر" (بمبئی)

بالغوں کا یہ پندرہ روزہ اخبار مسز کلثوم سایانی کی ادارت میں تقریباً چھے سال سے پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے۔ اس کا چندہ صرف دو روپے کلدار سالانہ ہے۔ اس کی زبان سیدھی سادی ہوتی ہے اور اس میں بالغوں کی نفسیات کے لحاظ سے مختلف قسم کی معلومات درج رہتی ہیں۔ اپنی قسم کا پہلا اخبار ہے۔ جملہ مدارس بالغاں ممالک محروسہ اور بالخصوص ادارۂ ادبیات اردو کی شاخیں اور اردو امتحانات کے مراکز اپنے کتب خانوں کے لئے ضرور خریدیں۔

(پتہ) مسز کلثوم سایانی روپا ویلا کھمبالا روڈ بمبئی ع ۲۶

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحات (۱۲۸) طباعت و کتابت دیدہ زیب قیمت (عہ) ملنے کا پتہ:- سب رس کتاب گھر رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن۔

حقوقِ نسواں

(پروفیسر کنھیا لال کپور کے ایک ایکٹ کا منظوم اقتباس)

افراد

(۱) سر رتن ناتھ —— (۲) ثریا
(۳) شیلا —— (۴) احسن

(منظر)

سر رتن ناتھ کی لائبریری۔ خوش نما الماریوں میں نئی اور خوبصورت جلدیں۔ سر رتن ناتھ کی عمر تقریباً چالیس برس، بال کھچڑی اور ناک سرخ، صوفے پر نیم خوابی کی حالت میں اونگھ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں رسالہ "صنفِ نازک" کا تازہ نمبر ہے۔ وہ پڑھنا چاہتے ہیں مگر نیند کا غلبہ اس قدر ہے کہ رسالہ کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک لمبی انگڑائی لے کر صوفے پر دراز ہوا چاہتے ہیں کہ اُن کی "اُردو ٹائپسٹ" ثریا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ ثریا کوئی بیس اکیس سالہ مسلم لڑکی ہے۔

سر رتن ناتھ۔ کون ہیں۔

ثریا (نہایت شیریں آواز میں) جی میں ہوں۔

سر رتن ناتھ (آواز پہچان کر) کیا ضرورت آپ کو درپیش ہے، فرمائیے

ثریا (جس کے ہاتھ میں دو تین کھلے ہوئے خطوط ہیں) عابدہ فیروز نے "اخلاقِ نسواں" کے لیئے
پھر کوئی پیغام مانگا ہے کرم کی راہ سے
لکھتی ہیں "یہ خاص نمبر ہوگا خود اپنی مثال
آپ کا مضمون نہ آیا تو مجھے ہوگا ملال

سر رتن ناتھ۔ آخر ان پرچوں کے نمبر ختم بھی ہوں گے کبھی
ایک ہی عنوان پر لکھے کہاں تک آدمی

ثریا (ہمدردانہ لہجہ میں) آپ کا خاموش ہونا گل کھلائے گا ضرور
کیا عجب تحریکِ نسواں سے رہیں سب دور دور

سر رتن ناتھ کیا کہا؟ تحریکِ نسواں اور ہندوستان میں
خو ہے آزادی نہ آئے گی غلام انسان میں

ثریا (انکساری کے ساتھ) ہاں مگر پھر بھی جو تھوڑی سی ترقی ہو گئی

سر رتن ناتھ (بات کاٹ کر) کیا ترقی ہو گئی، کتنی ترقی ہو گئی
بیاہ کرنے کو ابھی عورت کو حق حاصل نہیں
دیکھ لو جا کر گھروں میں سل کہیں ہے دفن کہیں
میں لے جا ہا تھا سمجھے مرد عورت کا مزاج
ایسی باتوں پر توجہ دے نہیں سکتی سماج

ثریا (سنجیدگی سے) ہند والے آپ کی باتوں کو مانیں گے ضرور

سر رتن ناتھ عقل سے کچھ کام لیں اتنا کہاں ان میں شعور

ثریا چھوڑیئے اب ذکر اس کا دیر کافی ہو چکی
سوچیئے اخلاقِ نسواں کے لیئے مضمون کوئی

سر رتن ناتھ آپ جب مجبور کرتی ہیں تو لکھیئے غور سے

(ثریا لکھنا شروع کرتی ہے) عورتوں کا حق دبایا جا رہا ہے کس لیئے
صنفِ نازک دیجیئے اب کنکر کا پتھر سے جواب
اپنی مرضی سے بھی کر سکتی ہے شوہر انتخاب
چاہتا ہوں میں

(ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے) بدل دوں ہند کے رسم و رواج

(ثریا سے مخاطب ہو کر) کل لکھا دوں گا طبیعت میں ہے کچھ الجھن سی آج

ثریا آپ کا مطلب ہے حاصل ہو مکمل اختیار

سر رتن ناتھ (تشاخت سے) ہاں یہی تو میں بھی کرنا چاہتا تھا آشکار

ثریا (ایک منٹ وقفہ کے بعد) آپ کچھ تھک سے گئے ہیں

سر رتن ناتھ ٹھیک ہے

ثریا (اٹھتے ہوئے) تو کل سہی

سر رتن ناتھ میز پر رکھ جائیں کاغذات باقی ہے ابھی
اس کے ہونے سے تسلسل میں نہ ہوگا پیچ و تاب
آتے ہی کل ٹائپ کر دینا

ثریا بہت اچھا جناب

(منظر)

سر رتن ناتھ "صنفِ نازک" کھول کر پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں دو تین منٹ کے بعد رسالہ ان کے ہاتھوں سے گر پڑتا ہے اور ان کا سر صوفے کی پشت پر جا لگتا ہے۔ آدھ گھنٹہ گزر جاتا ہے۔ اچانک انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی ہے وہ ریسیور اٹھا کر سنتے ہیں۔

سر رتن ناتھ ہیلو، ہیلو، کون، شیلا، میں ہوں تم سے ہم کلام
گویا ساڑھے چار تک گھر میں رہے میرا قیام
ساتھ لا سکتی ہو اپنے دوست کو بھی شوق سے
دل مرا بھی چاہتا ہے ان سے ملنے کے لیئے

(منظر)

اب سر رتن ناتھ کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی لائبریری میں بیٹھے ہوئے ہیں اور پُر اشتیاق نگاہوں سے کبھی دروازے کی طرف اور کبھی کھڑکی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وقت کاٹنے کی خاطر اپنی عینک اتار کر اس کے شیشوں کو صاف کرتے ہیں۔ گھڑی پانچ بجاتی ہے اور اس کے ایک منٹ کے بعد ایک اٹھارہ انیس سالہ دوشیزہ ایک نوجوان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ لڑکی کا خوش رنگ جسم

ایک خوبرو خوش رنگ ساڑی میں ملفوف ہے اور نوجوان انگریزی لباس میں ملبوس
نوجوان اپنے داہنے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑے ہوئے ہے۔
سرتن ناتھ (عینک پہنتے ہوئے) تمھیں کہاں اب تک جو اتنی دیر آنے میں ہوئی
(نوجوان کی طرف رخ کرتے ہوئے) آجکل کیسی طبیعت ہے۔
احسن (نہایت ادب کے ساتھ) عنایت آپ کی
شیلا واقعی افسوس ہے ہم لوگ پہنچے دیر سے
(احسن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آپ کے گھر رک گئے تھے چائے پینے کے لئے
سرتن ناتھ مصروفیبھی خوش خلقی ہے
احسن (بیٹھتے ہوئے) بیٹھئے گا آپ سے مل کر خوشی بے حد ہوئی
غائبانہ سن چکا تھا آپ کی تعریف بھی
ناز کرنا چاہئے شیلا کو اپنے بخت پہ
دوست ہے جب آپ جیسا طالبِ علم و ہنر
احسن (شرماتا ہوا شیلا کی طرف
اشارہ کرتے ہوئے) آپ کی ذرہ نوازی ہے نہیں اس میں کلام
شیلا (بات کاٹتے ہوئے) کسر نفسی سے یقیناً آپ خود لیتے ہیں کام
سرتن ناتھ (اپنی تصنیف حقوق نسواں
احسن کے ہاتھ میں دیکھ کر) آپ کو شاید پسند آئی نہ ہو میری کتاب
احسن یہ نہیں ہے اس کے رکھنے سے مرا مقصد جناب
شیلا (بیچ میں بول اٹھتی ہے) مدعا یہ ہے بسر ہو زندگی راحت کے ساتھ
مل چکا دل، اب ملا دیں آپ ہم دونوں کے ہاتھ
سرتن ناتھ (بوکھلا کر) ناسمجھ ادلا کیا اوسان تیرے کھو گئے
شیلا اتنی جلدی آپ کیوں آپے سے باہر ہو گئے
سرتن ناتھ یہ ہے مسلم قوم کا اک مرد
شیلا .... تو پھر کیا ہوا
سرتن ناتھ اس سے تو شادی کرے گی۔
شیلا .... آخر مطلب آپ کا
سرتن ناتھ یہ مسلمان ہے۔
شیلا .... محبت ذات سے آزاد ہے
سرتن ناتھ میں نہیں سنتا۔
شیلا .... سنئے گا اگر کچھ یاد ہے
آپ کی تصنیف روشن ہے مثالِ آفتاب
(احسن سے) قبلہ گاہی کو ذرا احسن دکھانا تو کتاب
سرتن ناتھ بند کر بکواس میں نے کہدیا سو کہد یا
خون پی لوں گا جو تو لے نام احسن کا لیا
احسن (جو ابھی تک خاموش تھا) کیا یہ فقرہ ان کے منہ سے سن رہا ہوں سچ میں
جو حقوقِ صنفِ نازک کے علم بردار ہیں
سرتن ناتھ (ترش روئی سے) ایسی بے بنیاد باتوں سے کہیں چلتا ہے کام
زندگی برباد کرنا ہے عبث بے ننگ و نام
شیلا ہر جواں لڑکی کو لازم ہے کرے شوہر پسند
جس طرح ہو توڑ کر رکھدے سماجی قید و بند
سرتن ناتھ کیسی نامعقول باتیں کر رہی ہے غور کر
شیلا آپ خود قائم نہیں ہیں آج اپنی بات پر
سرتن ناتھ (غصہ میں) بات پر قائم نہیں، چل دور بھی ہو سر نہ کھا
شیلا (دلیرانہ انداز میں) اب تو احسن سے ہی ہو گی میری شادی
سرتن ناتھ .... کیا کہا
شیلا آپ جب آزاد ہیں تنگ نظری کیا ضرور
سرتن ناتھ تو مسلماں سے اگر شادی کرے گی بے شعور
شیلا اس سے کیا ہو گا،
سرتن ناتھ .... یہی بدنام ہو جاؤں گا میں
کس طرح سوسائٹی کو چہرہ دکھلاؤں گا میں
شیلا آپ حق پر ہیں، کہاں کا خوف کس کا احتمال
سرتن ناتھ دور کر نادان لڑکی دل سے یہ وہم و خیال
شیلا اس ارادہ سے کوئی مجھ کو ہٹا سکتا نہیں
سرتن ناتھ (بےقابو ہو کر) میرے قبضہ سے کوئی تجھ کو چھڑا سکتا نہیں
(پستول نکالتے ہوئے) میں اسی پستول سے کردوں گا تیرا فیصلہ
شیلا دھمکیاں بے فائدہ دینے سے مطلب آپ کا
سرتن ناتھ (پستول شیلا کی
طرف کر کے) دیکھ اب بھی اپنی ہٹ کو چھوڑ دے
شیلا .... ہرگز نہیں
سرتن ناتھ (فائر کرتے ہوئے) یہ تری ضد کی سزا ہے
شیلا رحم کرنا یا معین

(منظر)

شیلا چیخ مار کر گرتی ہے۔ احسن سرتن ناتھ سے پستول چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں چند منٹ خوب ایک دوسرے کو زدوکوب کرتے ہیں۔ آخر احسن پستول چھیننے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور سرتن ناتھ کو "ہینڈز اپ" کہتا ہے۔ مگر سرتن ناتھ نہیں مانتے۔ احسن فائر کرتا ہے۔ سرتن ناتھ ایک بلند چیخ کے ساتھ زمین پر گرتے ہیں اور اس چیخ کے ساتھ ان کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

سرتن ناتھ (ہوش میں آتے ہوئے) اف یہ کیسا خواب تھا، بچ گیا کتنا ہوں گا زندگی سے موت مقابلہ کر رہی تھی ساز باز

سرتن ناتھ ٹہلتے ٹہلتے میز کے قریب پہنچ جاتے ہیں اور میز پر رکھے ہوئے کاغذ کو اٹھا کر آہستہ آہستہ پڑھتے ہیں۔

مرد کا جو حق ہے وہ عورت کا ہونا چاہئے
فیصلہ مظلوم کی قسمت کا ہونا چاہئے

——— ویدہ ———

شاطر حکیمی

ادارۂ ادبیات اُردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
[illegible]	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۹۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے علما نمبر	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰	۰
مرقعا	۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیعہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہر	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۰
اشوب	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۱۰	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سحر کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
ملقاں	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چبوتنی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۹۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں ...	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۴
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ ر

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
ہندرراج سکسینہ ایم ایس سی

سب رس

جلد ۸ — بابت جولائی ۱۹۴۵ء — شمارہ ۷

نمبر	عنوان		مصنف	صفحہ
۱	ارمانِ مسرت	(ڈراما)	مرزا متین احمد بیگ سروش	۲
۲	دکن میں عمارت مدرسہ کی ابتدا		سید محمد بیدری	۵
۳	بات میں بات	(نظم)	سید علی منظور	۸
۴	برسات کی رات	(نظم)	عبدالعزیز فطرت	۹
۵	آنکھ مچولی	(ڈراما)	احمد ندیم قاسمی بی اے	۱۰
۶	حسنِ سوگوار	(نظم)	نجیب خیرآبادی	۲۰
۷	حشرِ جذبات	(غزل)	ثاقب کانپوری	۲۰
۸	تیموری آرٹ		امجد علی	۲۱
۹	غزل		علی اشرف	۲۴
۱۰	نیلی ساری	(افسانہ)	شاہین فاروقی	۲۵
۱۱	دو رباعیاں		تحسین سروری	۲۹
۱۲	ہماری	(نظم)	احسان دانش	۳۰
۱۳	یہ دنیا	〃	حسینی شاہد	۳۱
۱۴	گھٹائیں	(نظم)	افسر آذری (امرتسر)	۳۷
۱۵	تنقید و تبصرہ	〃	ق	۳۸
۱۶	ادارے کی خبریں		ادارہ	۴۱ تا ۴۸

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

ارمانِ مسرت

(ایک ایکٹ کا ڈراما)

(دریا کے کنارے ایک چٹان پر ایک دوشیزہ سر نیوڑائے بیٹھی ہے۔ غمگین آلودہ جبیں۔ نظر کے انہاک چہرے کے اتار چڑھاؤ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ماضی کی کسی خیالی تصویر میں محو ہے۔ اس کے پاس ہی ایک جوان کھڑا ہے جس کا رنگ سیاہی مائل اور چہرہ کشتا ہوا ہے۔ سینہ پر ایک فوجی تمغہ آویزاں ہے۔ اس کی نظریں دوشیزہ پر جمی ہوئی ہیں۔ دریا کی سطح پر سکون ہے۔ کوئل کوکو کر رہی ہے۔ گرما کا موسم ہے۔ مئی کا مہینہ مطلع صاف اور دھوپ تیز ہے۔ دریا کے کنارے جو راستہ ہے اس کی دونوں جانب جھاڑیاں پھولوں سے لدی کھڑی ہیں۔)

دوشیزہ:۔ خدا جانے وہ کیا کہے گا۔

جوان:۔ کہے گا کیا۔ آخر اتنے دنوں تک کہاں مر رہا تھا!!

دوشیزہ:۔ وہ اس سے پہلے آ ہی نہ سکتا تھا۔ ہائے اللہ! وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔

جوان:۔ اور مجھے تو تم سے دشمنی ہے نا!

دوشیزہ:۔ مجھے جنگ سے اس کی واپسی کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

جوان:۔ آخر میں بھی تو جنگ ہی پر گیا تھا!

دوشیزہ:۔ (اسے چھوتے ہوئے) آہ!

جوان:۔ کیا واقعی ...... (آواز رک جاتی ہے بولا نہیں جاتا)

دوشیزہ:۔ نہیں۔ نہیں جم! تمھاری طرح نہیں!!

جوان:۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہمت سے کام لو!

دوشیزہ:۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔

جوان:۔ کوئی پاتا ہے۔ کوئی کھوتا ہے!

دوشیزہ:۔ مجھے اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ مگر کیا معلوم تھا کہ وہ واپس آ جائے گا!

جوان:۔ (اکھڑپن سے) اس میں کیا قباحت ہے۔ صاف صاف کہہ دینا کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔

دوشیزہ:۔ کہہ تو دوں ...... لیکن ....

جوان:۔ (اس کے شانوں کو پکڑ کر) یاد رکھو ڈیزی! اگر تم نے ذرا بھی چال چلنے کی کوشش کی تو تم دونوں میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا!!!

(دوشیزہ اس کی غیظ پاش نظروں کو دیکھ کر سہم جاتی ہے اور خوشامدانہ انداز میں اس کے قریب ہوتی ہے۔) توبہ کرو جم! مجھ سے یہی امید ہے؟

جوان:۔ تو آؤ اس کے یہاں پہنچنے سے پہلے نکل چلیں۔

(وہ انکاری طور پر سر ہلاتی ہے)

جوان:۔ آخر ٹھہرنے سے فائدہ؟ دنیا کے راستے ہم پر کھلے ہوئے ہیں!

دوشیزہ:۔ اب اس وقت تو میرا جانا ناممکن ہے۔ ہاں اس کے بعد البتہ اسے بھول جانے کی کوشش کروں گی۔

جوان:۔ خدا تمھاری مدد کرے۔

دوشیزہ:۔ وقت کیا ہوگا جم؟

جوان:۔ کوئی ۴½ بجے ہوں گے۔

دوشیزہ:۔ (دریا کے کنارے والے راستہ کو مڑ کر دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔)

اس نے ۴ بجے آنے کو کہا تھا۔ اب تم جاؤ۔

جوان:۔ جاؤں کیوں۔ کیا کسی کا ڈر پڑا ہے۔ آخر وہ ہے کیا۔

دوشیزہ:۔ (بیدلی سے) اچھی طرح نہیں کہہ سکتی۔ میں نے اسے تین سال سے نہیں دیکھا ہے اور تمھاری ملاقات کے بعد تو میں نے اس کا خیال تک نہیں کیا۔

جوان:۔ آخر کچھ تو کہو۔ پست قد ہے کہ لمبا۔ دبلا ہے یا موٹا۔

دوشیزہ:۔ بس تمھاری ہی طرح ہوگا۔ اچھا اب تم چلے جاؤ۔

جوان:۔ یہ غیر ممکن ہے۔ تمھارے بغیر ہرگز نہیں جا سکتا۔ توپ کی گرج گولوں کی بوچھار تو مجھے اپنی جگہ سے ہٹا ہی نہ سکی تو پھر انسان تو انسان ہی ہے۔

دوشیزہ:۔ (اسے ملتجیانہ انداز میں دیکھ کر) جم!

جوان :- بجائے کچھ جواب دینے کے اسے سینے سے لگا لیتا ہے۔

دوشیزہ :- اگر وہ دیکھ لے تو۔

جوان :- اگر میں باہر گیا ہوتا تو کبھی اتنے دنوں تک غائب نہ رہتا اور تم دیکھتیں کہ میں وہاں سے کب کا رفوچکر ہو چکا ہوتا۔ سمجھیں مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے۔

دوشیزہ :- اچھا وعدہ کرو کہ اس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ گے۔

جوان :- ایسا ہی ہوگا۔

دوشیزہ :- نہیں وعدہ کرو۔

جوان :- اگر وہ خاموش رہا تو میں بھی کچھ نہ ہوگا۔ ورنہ اگر ذرا بھی چوں چرا کی تو ایسا مزا چکھاؤں کہ حضرت کو چھٹی کا دودھ یاد آئے۔

دوشیزہ :- ہائے اللہ کیا کروں۔

جوان :- مجھے تم سے محبت ہے میں کسی طرح تمہاری جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔

دوشیزہ :- غالباً وہ بھی یہی کہے۔

جوان :- پھر یا تو وہ رہے گا یا میں!!

دوشیزہ :- مجھے ڈر ہے کہ......

جوان :- جب تک دم میں دم ہے کس کی مجال ہے جو بال بھی بیکا کر سکے وہ اکیلا آئے یا یار دوستوں کو لے کر سب کے خون سے دریا کو رنگ دوں گا۔ کوئی ہمیں شمہ برابر بھی نقصان نہیں پہونچا سکتا (خنجر نکالتا ہے)

دوشیزہ :- نہیں جم! اس کی ضرورت نہیں لاؤ مجھے دیدو۔ (ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

جوان :- کیوں ڈر گئیں؟ (مسکرا کر) تم عورتیں ان مناظر کو دیکھ ہی نہیں سکتیں جن سے ہم مرد دن رات کھیلا کرتے ہیں۔ میں نے پانچ منٹ کے اندر ہزاروں آدمیوں کو دم توڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کی لاشیں میدان جنگ میں اس طرح بے گور و کفن پڑی تھیں جیسے کبھی مار کاغذ پر مکھیاں۔ میں خود بھی بارہا موت کے منہ سے نکلا ہوں اور دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ پھر ایک اور سہی۔ میں اس سے کچھ تعرض نہ

کروں گا۔ بشرطیکہ وہ بھی مجھے نہ چھیڑے۔ نہیں تو تم جانتی ہو میں کتنا اکھڑ ہوں وہ ہو یا کوئی اور جان ہی سے مار ڈالوں گا۔ سن رہی ہو ڈیزی! میں نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔

دوشیزہ :- ایسا سہانا وقت لڑنے کا نہیں۔ دیکھو چڑیاں بھی خوشی منا رہی ہیں۔

جوان :- یہ سب اسی پر منحصر ہے۔ میرے سینگ تو نہیں کہ خواہ مخواہ لڑتا پھروں۔ ڈیزی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری زلفوں کا اسیر۔ تمہاری آنکھوں کا متوالا ہوں۔ مجھے تمہاری ہر چیز سے محبت ہے۔

دوشیزہ :- میں بھی تمہاری پوجا کرتی ہوں جم! مجھے تم ساری دنیا سے زیادہ پیارے ہو!!

جوان :- یا اللہ تیرا شکر ہے! شاباش ڈیزی میں یہی سننا چاہتا تھا۔ آؤ مجھے پیار کرو۔

دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جاتے ہیں۔ اتنے میں دور سے کسی کے گانے کی آواز آتی ہے۔ دوشیزہ تڑپ کر الگ کھڑی ہو جاتی ہے اور مڑ کر دریا کے کنارے والے راستہ کو دیکھتی ہے۔ جوان پاس والی جھاڑی میں چھپ جاتا ہے آواز قریب تر ہو جاتی ہے۔

میخانۂ الفت میں + فردوس مسرت میں
اس شوخ حسیں کیساتھ + اب جشن مناؤں گا

دوشیزہ :- یہ وہی ہے!

جوان :- گھبراؤ نہیں! میں تو یہیں ہوں!!

گانا ختم ہو جاتا ہے ایک فوجی چٹان کی دوسری جانب سے آتا دکھائی دیتا ہے۔ سنہرے بال دھوپ میں چمک رہے ہیں۔ بھورا رنگ چھریرا بدن۔ لبوں پر مسکراہٹ۔ لیکن چہرے سے تھکن ظاہر ہوتی ہے۔

فوجی :- ہیلو ڈیری! میری پیاری ڈیزی!!

(دوشیزہ آنے والے کے مقابل راستہ روکے کھڑی ہے۔ تھوڑے سے تامل کے بعد جواب دیتی ہے)

ہلو جیک! مجھے تم سے بہت کچھ کہنا ہے۔

فوجی :- کہو کہو ڈیزی! آج کے مبارک دن کیا کہنا [illegible] بھی تم سے اتنی باتیں کہنی ہے کہ سالوں میں پوری [illegible] ڈیزی! تم مجھ سے ناراض تو نہیں؟

دوشیزہ :- تم بہت دیر سے آئے۔

فوجی :- یہ سچ ہے۔ مگر فوجی قوانین پر کس کا بس ہے۔ میں دیر سے آنے پر مجبور تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تمھیں بھول گیا تھا۔ نہیں بلکہ میں ہر وقت تمھاری ہی یاد میں مگن رہتا تھا۔ جوں جوں واپسی کا دن قریب آتا جاتا تھا۔ میری مدہوشی بڑھتی جاتی تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کہ جب یہاں سے نجات ملے گی تو تمھارے ساتھ خوب جشن مناؤں گا۔ ہنسوں گا قہقہے لگاؤں گا۔ سراپا عشرت بن جاؤں گا۔ غرض تمھارے ملنے کی خوشی مجھے دیوانہ کئے دیتی تھی۔ تمھیں یاد ہوگا، ڈیزی کہ جب جانے سے پہلے تم سے اسی جگہ رخصت ہو رہا تھا تو تم نے مجھ سے کہا تھا "جنگ سے جلد واپس آنا اور مجھ سے شادی کرنا" مجھے تمھارے یہ الفاظ آج تک یاد ہیں۔ میں فوجی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔ آؤ مجھ سے شادی کرکے میری دنیا کو عیش و مسرت سے بھر دو۔ زندگی کی کلفتوں کو محبت کے نغموں میں گم کردیں۔ آؤ میری پیاری میرے قریب آؤ۔

دوشیزہ :- نہیں!!

فوجی :- (حیران ہوکر) نہیں! کیوں نہیں؟

(جوان جھپٹ کر جھاڑی سے نکلتا ہے اور دوشیزہ کے پاس آکر کھڑا ہوجاتا ہے)

جوان :- اس لئے!

فوجی :- میں آپ کو نہیں پہچانتا۔ کون ہیں یہ ڈیزی؟

دوشیزہ :- یہ میرے منگیتر ہیں۔

فوجی :- اب سمجھا! کیا میں آپ کا عجز دیکھ سکتا ہوں۔

جوان :- (جس کے ہاتھ میں برہنہ خنجر ہے) خبردار! میرا مذاق مت اڑانا۔

فوجی :- خدا نخواستہ میں آپ کا مذاق کیوں اڑاؤں مجھے تو تمام چیزوں پر ہنسی آتی ہے خود اپنی ذات پر بھی اچھا تو آپ سے کب ملاقات ہوئی ڈیزی؟

جوان :- دل سے دل ملنے دیر نہیں لگتی۔

فوجی :- بڑی خوشی کی بات ہے! میں ڈیزی کو آپ کے حوالہ کرتا ہوں۔ اس کے دل کی حفاظت کرنا۔

جوان :- کیا بکواس ہے! ڈیزی میری ہے تم کو یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو چیز میری ہے مجھے مل کر ہی رہے گی۔ البتہ تمھیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔

فوجی :- یہی تو میں بھی عرض کر رہا ہوں جناب! آپ خواہ مخواہ الجھ رہے ہیں۔ میں نے ہر مصیبت کا نہایت خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے اور گزشتہ چار سال میں ایک مرتبہ بھی ملول نہیں ہوا آپ اپنی درشت کلامی سے میرے جذبۂ مسرت کو مٹانے کی لاکھ کوشش کریں لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ خدا حافظ

پیاری ڈیزی!

دوشیزہ فوجی کی طرف بڑھتی ہے۔

جوان :- دور رہو اس سے!

دوشیزہ ہچکچا کر رک جاتی ہے اور دفعتہً رونے لگتی ہے۔

فوجی :- ہیں یہ کیا ڈیزی! روتی کیوں ہو؟ میں نے لاکھوں دلدوز مناظر دیکھے ہیں لیکن کسی دوشیزہ کا رونا نہیں دیکھا جاتا۔ ہم میں سے کس سے شادی کروگی؟ بولو تمھیں کون پسند ہے؟

دوشیزہ :- (جوان کی طرف اشارہ کرکے) وہ

فوجی :- بس ٹھیک ہے۔ خوش رہو۔ آباد رہو۔ میری آرزو تھی کہ تم سے مل کر خوب جشن مناؤں گا سو وہ آرزو پوری ہوگئی۔ تم سے مل لیا اب خوشی مناؤں گا۔

خدا حافظ ڈیزی!

(ہنستا ہوا چلا جاتا ہے دوشیزہ اور جوان دونوں کی نگاہیں اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ یہاں تک وہ نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور صرف قہقہہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔)

جوان :- کمبخت اسے ہوکیا گیا ہے!

دوشیزہ :- دھوپ بہت تیز ہے۔ شائد........

(گالزوردی)

مرزا متین احمد بیگ

دکن میں عمارت مدرسہ کی ابتداء

یہ امر مسلمہ ہے کہ بیدر کا عروج بہمنیہ دور میں ہوا۔ اس
وقت اس شہر کی آبادی (۲۰) لاکھ سے کم نہ تھی۔ سلاطین بہمنی
نے اپنی حکمرانی کا ایسا بہتر نمونہ پیش کیا جس کی نظیر ہندوستان
کی تاریخ میں بمشکل ملتی ہے۔ ان کی سطوت و جبروت کی دھاک
تمام دکن میں جمی ہوئی تھی۔ پانچ لاکھ سے زیادہ کی جمعیت تیرہ
ہزار ہاتھی کا داخلہ جنگ میں ہوتا تھا اور ایک ہی عزم ملوکانہ
میں کئی علاقے مفتوح ہو جاتے تھے۔ بایں ہمہ متانت و سنجیدگی،
بلند حوصلگی اور خلوص نیت کا اسلامی نمونہ، انصاف و معدلت
کے ساتھ حکمرانی کرنا زراعت و صنعت و حرفت میں دلچسپی لینا یہ
تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی
کہ وہ علوم و فنون کے قدرداں تھے۔ ایران۔ عراق۔ عجم۔ عرب
مصر۔ ترکستان اور شام کے علماء شہرت سلطنت کی وجہ سے بلا
طلب جوق جوق چلے آتے تھے۔ یہاں ان کی آؤ بھگت ہوتی
تھی اور بادشاہ بے انتہا مراعات سے کام لیتے تھے۔ جن روشن
دماغ بادشاہوں کے ایسے کارنامے ہوں بھلا انھوں نے
علوم و فنون کی اشاعت و ترویج کے واسطے کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔
بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ سلاطین بہمنی نے اپنے ڈیڑھ
دو سو برس کے زمانۂ حکمرانی میں علوم و فنون کی وہ سرپرستی
کی جو شاید ہی کسی حکومت نے کی ہو۔ یہی سبب تھا کہ ممالک اسلامیہ
کے ایسے بیدار اور برگزیدہ علماء نے بیدر میں بود و باش اختیار
کی۔ جن کے فیض سے بیدر مالا مال ہو گیا اور خود بیدر میں اس پایہ
کے علماء پیدا ہوئے کہ جن کے فیوض علمی کی آبیاری سے نہ صرف
دکن بلکہ ہندوستان کی درس گاہیں سیراب ہو رہی ہیں۔
شیخ نور الدین جلال حمزہ بڑے پایہ کے عالم و فاضل گزرے
ہیں۔ آذری تخلص تھا۔ حضرت شیخ محی الدین طوسی کے مرید تھے
حضرت شاہ نور الدین کرمانی کے مصاحب بھی تھے۔ جواہر الاسرار
عجائب الدنیا، سعی الصفا، بہمن نامہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں
شہاب الدین احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر تشریف لائے۔
احمد شاہ بہمنی کے زمانہ تک آپ نے بہمن نامہ لکھا ہے اور
اس میں عمارات شاہی و قصر شاہی کے متعلق قصیدہ بھی
درج ہے آپ بڑے پایہ کے شاعر اور تصوف میں کامل تھے۔
حج حرمین شریفین سے فارغ ہو کر اسفراین سے بیدر آئے
اور ایک مدت رہ کر پھر وطن کو واپس ہوئے۔ (۸۳) برس
کی عمر میں ۸۶۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

ملا سامعی یہ بڑے زبردست شاعر اور اپنے وقت کے
علامہ ہوئے ہیں۔ آپ علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر
آئے آپ کا یہیں وصال ہوا۔ ملا سید طاہر استرآبادی علم
لغت اور نجوم میں زبردست عالم ہوئے ہیں آپ شاعر بھی
تھے علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں آپ پیدا ہوئے اور
یہیں انتقال کیا۔ محمود گاواں کے مزار کے پہلو میں مدفون ہوئے۔
ملا عبد الغنی مغنی نجم الدین یہ دونوں سلطان احمد شاہ بہمنی کے
زمانہ میں پیدا ہوئے اور بیدر میں انتقال کیا۔ ان دونوں کے
مزار بیدر میں کہاں ہیں معلوم نہ ہو سکا۔ علاء الدین بہمنی کے
زمانے میں حکیم ارزقی پیدا ہوئے۔ شعر گوئی میں بڑی مہارت
تھی اور اپنے زمانہ کے استاد تھے بہمنیہ زمانہ کے شاہی حکیم تھے۔
آپ کا مزار بیدر میں حضرت کرمانی صاحبؒ کی چوکھنڈی میں
ہے۔ ملا محمد قاسم مشہدی بڑے لائق مجتہد اور شاعر تھے دولت
بہمنیہ کے فضلائے عصر میں آپ کا پایہ ارفع و اعلیٰ تھا۔ دولت
بہمنیہ کی طرف سے حافظ شیرازی کو بلانے آپ ہی کو بھیجا گیا تھا۔
حکیم کارسی علاء الدین شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ حکیم
شاعر اور منجم تھے۔ نظام شاہ بہمنی کے اتالیق بھی تھے۔ ملا
شمس الدین محمد امام اصمعی فاضل لغت کے خاندان سے
ہیں محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں بیدر آئے۔ یہ بزرگ بڑے عالم
اور ولی کامل ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ نور سمنانیؒ حضرت شاہ فتح اللہ ملتانیؒ
حضرت شاہ محب اللہ الحسینی المشہور خواجہ ابو الفیضؒ نبیرۂ خواجہ
بندہ نوازؒ حضرت سید سادات سید حنیف صاحب قبلہ حضر

سید شاہ زین الدین گنج نشین؟ مولانا حاجی سرور... الدین تاج قندھاری؟ مولانا معین الدین؟ مولانا علاء الدین جوہری صدر العلوم۔ شیخ الاسلام خوندمیر۔ مولانا امیر محمد عرف مولانا منیر صاحب گوہیری۔ مولانا شیخ حسام الدین صاحب ادگیری مولانا سید حسن علامی دولت آبادی۔ ملا عبدالکریم ہمدانی جیسے ہزاروں علمار لاکھوں فضلا، واہل کمال نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے بیدر دکن کو علوم و فنون کا معدن بنادیا۔

پہلے زمانہ میں مدارس کے واسطے جداگانہ عمارتوں کے بنانے کی جانب ۸۷۷ھ تک مسلمانوں نے توجہ نہیں کی۔ اس زمانہ کے علمار اپنے گھروں، مسجدوں اور خانقاہوں میں تعلیم و تعلم کا کام انجام دیتے تھے اور ان کا طریقہ تعلیم بھی بجنسہٖ سیدھا سادہ ہوتا تھا۔ استاد مسجد میں بیٹھ جاتا اور اس کے گرد و پیش شاگردوں کا حلقہ بن جاتا تھا۔ اساتذہ خالصتاً للہ درس دیتے تھے اور ان کے شاگرد امیر و غریب سب چٹائیوں پر بیٹھے ہوئے تحصیل علم کرتے تھے اس کے بعد اسلامی دنیا میں سب سے پہلے نیشاپور اور بغداد میں مدرسہ کے لئے عمارتیں تیار ہوئیں اور دوسرے ملکوں میں اس کی تقلید ہونے لگی۔ دکن میں بھی وہی قدیم طریقہ ۸۷۷ھ تک جاری رہا چنانچہ حضرت شیخ زر آسمانی؟ کی خانقاہ حضرت شاہ خلیل اللہ کرمانی؟ کا آستانہ حضرت شاہ ابراہیم قادری الملتانی کی مسجد اب بھی بیدر میں موجود ہیں جن میں تشنہ کامان علم تحصیل سے سیراب ہوتے تھے۔ سلطان مراد شاہ ثانی شہنشاہ روم کا انتقال ۸۵۵ھ میں ہوا اور سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا تو قسطنطنیہ میں ۸۵۸ھ میں بیت العلوم بنانا شروع کیا تو اس کا بھائی یوسف عادل خاں بانی خاندان عادل شاہیہ بیجاپور کے مشورے سے ملک التجار خواجہ جہاں محمود گاواں وزیر اعظم دولت بہمنیہ نے سلطان السلاطین جلال الدین محمد شاہ ثانی بہمنی کے زمانہ میں بیدر میں مدرسہ کی شاندار عمارت تعمیر کرائی جس کے چپہ چپہ سے آج بھی فیضان علم کی کیفیت مترشح ہے اور جس کے در و دیوار نقش و نگار سے تعلیم و ترویج علوم و فنون کی حقیقت منکشف ہے اور اس کا یہ ثبوت ہے کہ لوح مدرسہ پر بہ آہنگ دل تعمیر مدرسہ سے آج تک یہ صدا آویزۂ گوش ہے کہ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَسِیقَ الَّذِینَ اتَّقَوْا رَبَّہُمْ اِلَی الْجَنَّۃِ زُمَرًا حَتّٰی اِذَا جَاءُوہَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُہَا وَقَالَ لَہُمْ خَزَنَتُہَا سَلَامٌ عَلَیْکُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوہَا خَالِدِینَ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی صَدَقَنَا وَعْدَہُ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّۃِ ...... وَقِیلَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ۔

۸۶۵ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۸۷۶ھ یعنی ۱۱ سال کی مدت میں اس کی تعمیر ختم ہوئی اور ۸۷۶ھ میں افتتاح مدرسہ و سلسلہ درس کا آغاز ہوا۔ تاریخ تعمیر آیت قرآن شریف ربنا تقبل منا سے ۸۷۶ھ نکلتی ہے یہ ایسی دعائیہ تاریخ ہے جس کے سبب محمود گاواں کا مدرسہ مقبول عام ہوا۔ یہ چو گوشہ مستطیل اور نہایت خوبصورت نفیس و دلفریب وضع کی عمارت ہے جس کی نقاشی اور ساخت بے نظیر ہے۔ طول (۵۰) گز اور عرض (۵۵) گز ہے۔ دو مینار اور رو کار مع چند گنبدوں کے بنوائی گئی تھی۔ میناروں کا ارتفاع (۱۲۰) فٹ ہے اور سمنان و کاشغر کی عمارتوں کی وضع پر بنائے گئے تھے۔ تعمیر مدرسہ میں سنگ سیاہ اور مضبوط اینٹ اور چونہ سے سارا کام لیا گیا ہے اور عمدہ عمدہ قدیم مسالہ سے اس کی درزبندی کی گئی ہے۔ رو کار اور مینار مدرسہ پر بہترین روغنی اور چینی نقش و نگار کا کام ہوا ہے اور نہایت نفاست سے آیات قرآنی تحریر کی گئی تھیں۔ بعض تین فٹ کے قریب حروف موٹے ہیں اور وسعت حروف ۶ انچ سے کم نہیں ہے۔ قلم اتنا خوش خط اور بے نظیر نسخ اور دوائر پر مبنی ہے کہ گھنٹوں دیکھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی اور آنکھوں میں تازگی آتی جاتی ہے اور ہر زندہ دل سیاح اور فنون لطیفہ کے شائق کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہندوستان کی ساری قدیم و جدید عمارتوں میں مدرسہ محمودیہ کے جیسی عمارت ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتی اور نہ دکن میں اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ اس کے بعد سلاطین بحری و عادل شاہی نے اپنے اپنے شہروں احمد نگر و

بیجاپور میں ایک ایک مدرسہ اسی طرز کا تعمیر کیا تھا لیکن اب صرف ان کا نام ہی نام رہ گیا ہے۔ محمود گاواں کو تعمیر مدرسہ کے بعد صرف دس سال تک اس کی خدمت کرنے کا موقع ملا اور یہی دس سال کا زمانہ مدرسہ کے عروج کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔

عہد بہمنیہ میں لاکھوں روپیہ کی آمدنی کی جاگیرات اور مختلف عطیات مدرسہ کے لئے وقف تھے۔ اس کے ذریعہ سے اس بے نظیر جامعہ کے اخراجات اور طلبہ کے طعام و قیام اور لباس کے مصارف پورے ہوتے تھے۔ سلطان محمود شاہ بہمنی کے زمانہ تک یہ مراعات جاری رہیں۔ مدرسہ کی ترمیم و آہک پاشی وغیرہ کا بھی خاص انتظام تھا اس کے لئے ہزار ہا روپیہ کی جاگیر کے علاوہ کئی ہزار تنکہ (اس زمانہ کا سکہ) نقد دیئے جاتے تھے اس کی اصلی سند راقم الحروف کے پاس موجود ہے۔

حضرت شیخ بہاء الدین سہروردیؒ کے مرید و خلیفہ حضرت شیخ جلال الدین جلالی تھے۔ اپنے مرشد کے اشارہ سے جمالی تخلص فرمانے لگے۔ دہلی سے آپ حجاز تشریف لے گئے سلطان مرزا والیٔ ہرات کے زمانہ میں ہرات پہونچے اور مولانا میر علی شیر کے توسل سے حضرت جامیؒ کے پاس تشریف لے گئے جہاں ایک عرصہ تک رہے۔ آپ نے حضرت جامی کو بیدر چلنے کے لئے توجہ دلائی اور مولانا جامی علیہ الرحمۃ نے شیخ جمالی کو جامعہ محمودیہ کی صدارت کے لئے تحریک کی لیکن زوال سلطنت بہمنیہ کے حالات سے دونوں بزرگوں نے ارادہ ترک فرمایا وہاں سے شیخ جمالیؒ ہندوستان آگئے اور بابر کی صحبت میں رہے آپ کا وصال ۹۴۲ھ میں ہوا دہلی میں مزار ہے۔ آثار صنادید میں آپ کا ذکر ہے۔

ملا داؤد بیدری قطب العصر مولانا شیخ ابراہیم قادری الملتانی شیخ ابراہیم سرہندی حافظ عبدالعزیز قادری بھی اس مدرسہ کے امام المتکلمین تھے۔ میری مرتبہ کتاب "جامعہ محمود گاواں" میں مفصل حالات درج ہیں جو ہنوز طبع نہیں ہوئی۔

مدرسۂ محمود گاواں کا نصاب تعلیم یہ تھا۔ صرف و نحو عربی زبان میں منطق۔ ریاضیات۔ ہندسہ۔ ہیئت۔ فقہ حدیث۔ علوم معقول و منقول۔ حکمت۔ ادب اور معنی میں ہوتا تھا۔ بعض درجوں میں علوم دینیات کے درس کی نشستیں تھیں اور بقیہ حصوں میں حفاظ اور تجوید قرآن اور حدیث کے طالب علم رہتے تھے۔ جہاں روزآنہ صحیح بخاری شریف کے درس سے پہلے اس کا ختم ہوتا تھا۔ اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ ابتدائی جماعتوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ایسے طلبہ "موئید" کہلاتے تھے۔

امتحانات مدرسہ محمودیہ۔ اس میں تعلیم کے دو درجے تھے۔ لازم اور مدرس۔ پہلا امتحان کامیاب ہونے پر لازم کی سند ملتی تھی اور طالب علم کا نام ایک خاص رجسٹر میں جس کو روزنامچہ ہمایوں کہتے تھے درج ہوتا تھا۔ درجہ لازم کے نصاب کے دو حصے تھے۔ پہلے میں بلاغت اور علم کلام کی انتہائی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور دوسرے میں اصول فقہ۔ قانون حدیث عقائد کی تعلیم ہوتی تھی۔ لازم صرف دوم درجوں کے شہروں کا قاضی (جج) یا نائب قاضی (اسسٹنٹ جج) ہو سکتا تھا۔

مدرس کے درجوں کے لئے کوئی خاص مضمون یا امتحان نہ تھا بلکہ ایک مدت معینہ تک لازم تھا کہ وہ اونچی جماعتوں کو خاص خاص مضامین پر لکچر دیا کرے اس مدت کے بعد اس کو ایک سند ملتی تھی۔ مدرس کو سند ملنے کے بعد ان کو سلطنت پر جلیل القدر منصب کا استحقاق ہو جاتا تھا۔ بلحاظ تعلیم مدرس کی کئی قسمیں تھیں۔ کاتب۔ منشی۔ مولوی۔ ملا۔

ملا تعلیم کا سب سے آخری درجہ تھا۔ وزارت۔ قضاۃ۔ صدارت۔ قاضی القضاۃ کی خدمتیں انھیں کو دی جاتی تھیں۔

ملا تاج اللہ قاضی القضاۃ۔ ملا راج اللہ صدر الصدور ملا سنجن۔ ملا محمود صدر جہاں کے لقب سے عہد بہمنیہ میں عرصۂ دراز تک وزیر اوقاف و عطیات رہے۔ عہد بہمنیہ میں علوم و فنون کی اشاعت اس وسیع اور مستحکم پیرایہ سے ہوئی تھی کہ چھوٹے چھوٹے قصبات اور مواضعات تک ملا نظر آتے تھے۔ ایک صدی تک ان کی یہ گرم بازاری کروڑوں مسلمانوں کے امن و امان کا باعث ہوئی اور اب بھی ہزاروں مواضعات میں پچھلے نامور ملاؤں کے خاندان کی یادگاریں کچھ نہ کچھ پائی جاتی ہیں۔ ان کی تلاش سے قدیم خاندانوں کے شجرے اور حالات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس قسم کا بہت کچھ مواد جمع کر لیا ہے۔

سید محمد بیدری

بات میں بات

ہر گلکدہ نیچر کی خوشبو سے مہکتا ہے　　ہر مزرعہ نیچر کے دامن میں لہکتا ہے
گاتی ہے صبا غزلیں نیچر کے سوا کس کی　　معمورِ لطافت ہے ہر صنفِ لطیف اس کی

بہتے ہوئے دریا کیا خاموش ہی بہتے ہیں　　بہتے ہیں تو نیچر کے کچھ راز بھی کہتے ہیں
گل پیرہنوں پر بھی نیچر کا تصرف ہے　　ہے ہے یہ جمالستاں۔ جو پھول ہی پوشاک ہے
ننھے سے جو یہ گیندے ہنستے ہیں ہیولوں میں　　کیا ان کو بھی نیچر نے پالا نہیں جھولوں میں
پھولوں کو نسیم ایسے جھولوں میں جھلاتی ہے　　تخئیل سے ہی جن کی نیند اب مجھے آتی ہے
گلشن ہی کے پھولوں میں نیچر کی جھلک ہے کیا　　نیچر ہی کا جلوہ ہے تاروں کی چمک ہے کیا
جھرمٹ میں ستاروں کے جوڑا ہے کمر بستہ　　چاند آئے گا لینے کو کس جوڑے گلدستہ
دروازہ پہ سورج کے کب چاند نے دستک دی　　سورج کی تپش نے ہی کیا چاند کو ٹھنڈک دی

ہے چاند بھی نیچر کا سورج بھی ہے نیچر کا　　نیچر کے مظاہر بھی ہیں حسن فزا کیا کیا
نیچر ہی کے دامن سے وابستہ ہے شعریت (۲)　　بے کیف نہیں ہوتا یہ عالمِ کیفیت
چلتی ہے مری دنیا نیچر کے اشاروں پر　　احساس شگفتہ ہے فی الحال بہاروں پر
نیچر میں ہوں میں بھی گم یہ گم شدگی میری　　اے تابعِ فنکاراں! محتاج نہیں تیری

جو کچھ بھی میں لیتا ہوں نیچر ہی سے لیتا ہوں　　داد ایسے عطیہ پر نیچر ہی کو دیتا ہوں
ہے سب سے بڑی مجھ میں بس ایک ہی خوبی　　تقلید نہیں کرتا دنیا میں کسی کی بھی
اشعار مرے بالکل نیچر کے مطابق ہیں　　لفظاً بھی موافق ہیں معناً بھی موافق ہیں

تو محوِ تصنع ہے نیچر پہ نظر میری　　ہاں ہاں مرے رستے سے ہے راہ جدا تیری
آتا ہے تجھے مجھ پر کیوں رشک خدا جانے　　کیا مجھ میں وہ جوہر ہے تو جس کو بھلا جانے؟!

آگاہ میں اس سے ہوں جو تیرا آتیہ ہے　　یہ لطفِ سخن یکسر قدرت کا عطیہ ہے
قدرت کے عطیہ کو اے بوالہوسِ یکتا　　تو چھین نہیں سکتا ہیں بیچ نہیں سکتا

سید علی منظور

برسات کی ایک رات

(تنقیدِ رواں)

برسات کی رات کا سماں ہے — چاند ابر کے پردہ میں نہاں ہے
بدلی جو بدل رہی ہے سو رنگ — داماںِ جمال آسماں ہے

وہ چاند نے گویا آنکھ کھولی!
سرچشمۂ نور ضو فشاں ہے

کرنیں ہیں کہ نور کے ہیں زینے — اُف کتنا قریب آسماں ہے
تارے سوئے ہوئے ہیں شائد — غائب تنویرِ کہکشاں ہے

لے دے کے ہوا تھا چاند بیدار
لو پھر وہ نگاہوں سے نہاں ہے

لیکن مرے دل کی بزمِ غم میں — تو لمعہ طراز جانِ جاں ہے
میں ہوں ترا ذکرِ دل نشیں ہے — میں ہوں تری یادِ دلستاں ہے

آنکھوں کو ہے شغلِ گریہ پیہم
دل عاشقِ نالہ و فغاں ہے

لی بدلی نے اک اور کروٹ — روئے مہتاب پھر عیاں ہے
بدلی کے کنارے ہیں منوّر — تارِ سیماب ضو فشاں ہے

یہ چاندنی کا جمالِ صد رنگ
لب بستہ سی طاقتِ بیاں ہے

پھر لکۂ ابر آ گئے — پھر عارضِ ماہ بے نشاں ہے
انوار میں امتزاجِ ظلمت — ظلمت میں نور ضو فشاں ہے

آواز اک آئی 'پی کہاں' کی
مطلب یہ کہ تیرا پی کہاں ہے؟

یہ رات - یہ نالۂ جگر دوز — خاموشی کو حسرتِ فغاں ہے
یہ رات یہ اشتیاق کا جوش — ہر جذبۂ دل مری زباں ہے

یہ رات یہ دلنواز منظر
اے داورِ حسن تو کہاں ہے

یہ رات یہ ابر و ماہ کا حسن — فطرت کا کمالِ فن عیاں ہے
گم ہیں دل و نظر کہیں اور — مجھ کو کچھ اور ہی گماں ہے

مہتاب کے عارضِ حسیں پر
شائد ترے بوسہ کا نشاں ہے

عبدالعزیز فطرت

آنکھ مچولی

[دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آتی ہے
دستک تیز ہوتی ہے تو ساتھ ہی دستک دینے
والے کی آواز بھی بلند ہو جاتی ہے]

ارشد :- ارے بھئی دروازہ کھولو ـــــ
دروازہ کھولو بھئی (آہستہ) سانپ سونگھ
گیا ہے سب کو! (بلند آواز میں) دروازہ
کھولو بھئی (آہستہ) نمبر دیکھ لوں مکان کا
(دیاسلائی جلانے کی آواز) چوبیس! یہی تو
ہے! (زور کی دستک) بھئی ـــــ
(چٹخنی کھلنے کی آواز اور پھر دروازہ
کھلنے کی)

سلیم :- (خواب آلود اور غنودہ انداز
میں ـــــ لاپروایانہ)۔ کون ہو تم؟

ارشد :- میں ـــــ

سلیم :- (بات کاٹ کر) تم کوئی بھی
ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں۔
لیکن کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ تم نے
اس شخص کی نیند اچاٹ کی جس کی زندگی
کا سہارا آج کل خواب اور محض خواب ہیں؟

ارشد :- میں ـــــ

سلیم :- (فوراً بات کاٹ کر) میں کچھ
نہیں جانتا۔ پہلے تو تمہاری وحشیانہ
دستک میرے خوابوں میں کھلتی رہی، مگر
دروازے پر تمہارے ہاتھوں کی آخری
یورش نے مجھے اس جنت سے گھسیٹ نکالا، جو میں نے
(اچانک رک جاتا ہے) ـــــ آخر تم چاہتے
کیا ہو؟

ارشد :- میں چاہتا ہوں کہ ـــــ

سلیم :- (فوراً بات کاٹ کر) تم کچھ بھی چاہو،
میرے نزدیک تم گردن زدنی ہو۔ اگر میں کسی
شہر کا حاکم ہوتا تو تمہیں لوہے کے تپتے ہوئے
ستون سے باندھ کر بازار کے چوراہے پر کھڑا
کر دیتا۔ اور وہاں سے ہر گزرنے والا تمہارے
چٹکیاں لیتا۔ تمہارے بال کھینچتا۔ تمہارا اگلا گلا گھونٹتا
اور میں ـــــ نہایت آہستہ آہستہ ـــــ بڑے
مزے سے ـــــ بہت ہولے ہولے۔ کند قینچی
سے تمہارے ہاتھ کترتا ـــــ اور جب تمہارے
ہاتھ کتر کے ہاتھ لٹکنے لگتے ـــــ جب تمہاری
رگیں ـــــ (اچانک رک جاتا ہے) ـــــ
ارے! کیا کہا تم نے؟

ارشد :- میں نے کچھ نہیں کہا۔

سلیم :- اگر تم کچھ کہتے بھی تو مجھے کیا غرض تھی۔
ہاں ـــــ تم کس سے ملنا چاہتے ہو؟

ارشد :- اس مکان میں میرے ایک دوست

سلیم :- (فوراً بات کاٹ کر) میں دوستی کا
دشمن ہوں۔ اس دنیا کا خمیر ایسے بیہودہ کرب
سے اٹھایا گیا ہے کہ یہاں دوستی نہیں ہو
سکتی۔ یہاں کی سب دوستیاں دشمنیاں ہیں۔
اور سب دشمنیاں ریاکاریاں ہیں ـــــ
سمجھے؟ ـــــ اب کوئی اور بات کرو!

ارشد :- (طنزاً) آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟

سلیم :- اگر تمہیں میرے مزاج کی پروا ہوتی
تو یوں آدھی رات کو ـــــ اس جاڑے کے
جاڑے میں ـــــ اس بادلوں بھری رات
میں گرم بستر پر سوتے رہنے دیتے۔ تم مجھ
کوئی اوباش معلوم ہوتے ہو!

ارشد :- (غصے سے) آپ ہوش میں بھی
ہیں کہ یونہی واہی تباہی بکے جا رہے ہیں؟
بات تک نہیں کرنے دیتے ـــــ آپ نے
پی تو نہیں رکھی ـــــ آخر آپ ہیں کون؟

سلیم :- (ہنس کر) عجب آدمی ہو! پوچھنا
میرا فرض تھا یا تمہارا؟ تم نے میرا دروازہ
کھٹکھٹایا۔ میری نیند میری آنکھوں سے
نوچ لی۔ مجھے اس سخت اور کرخت دنیا
میں لا ڈالا جہاں دھول اور دھوئیں
کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور پھر مجھ سے
پوچھتے ہو کہ میں ہوں کون ـــــ
(غصے میں) تم کون ہو؟

ارشد :- بات یہ ہے حضرت کہ یہاں میرے
ایک دوست ـــــ

سلیم :- (بات کاٹ کر) مجھے تمہارے
دوست سے کیا واسطہ! ـــــ میں اس
مکان میں اکیلا رہتا ہوں۔

ارشد :- نمبر کیا ہے اس مکان کا؟

سلیم :- میں نمبر یاد رکھنے کا قائل نہیں۔
اپنی محبوباؤں کی یاد سے چھٹکارا ملے
تو مکانوں کے نمبر یاد کروں!

(بادل کڑکتا ہے اور تیز ہوا چلتی ہے)

ارشد :- (لجاجت سے) دیکھیے ناصر
میرا خیال ہے آپ مجھ سے مذاق کر رہے
ہیں۔ ادھر بادل گھر آیا ہے، تیز ہوا بھی
چلنے لگی ہے۔ آپ مجھے صرف اتنا بتا دیں
کہ یہاں ایک صاحب جن کا نام ـــــ

سلیم :- (بات کاٹ کر) مجھے سوائے
ایک شخص کے کسی انسان کا نام یاد نہیں۔
اور مجھے وہ نام بھی بھول جائے تو ـــــ
(رک جاتا ہے۔ تیز ہوا سے اندر کی کھڑکی
بجتی ہے) ـــــ ٹھہرو کھڑکی بند کر لوں

(قدموں کی چاپ)

ارشد:۔ عجب غبی سے پالا پڑا ہے۔ اب یہاں ٹھیرنا تو اپنے لئے ایک نئی مصیبت خریدنا ہے۔ کہاں گیا اسد کمبخت۔

(قدموں کی چاپ اور پھر جا کر فیڈ ہو جاتی ہے)

سلیم:۔ (اندر سے بولتا ہوا آتا ہے۔ قدموں کی چاپ جو دور سے نزدیک آ کر رک جاتی ہے)۔ ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے بھی ——— ہیں؟ ——— ارے بھئی ——— (آہستہ سے) نام تک بھی نہ پوچھا ——— (بلند آواز سے) ارے بھئی ——— بھئی اجنبی؟ ——— اے مسافر میاں؟ ——— اے کسی دوست کا پتہ پوچھنے والے!

(وقفہ۔ بادل کڑکتا ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے اور بارش برسنے لگتی ہے۔)

——— چ چ چ ——— بیچارا! بھیگ جائے گا۔ ٹھٹھر جائے گا۔ کسی نالی میں گر کر اکڑ جائے گا ——— مجھے سوچنا چاہیے تھا، اپنی پریشانیوں کا شکار ایک میں ہی کیا کم ہوں کہ ایک بیچارے بھٹکے ہوئے مسافر کو ——— (رک جاتا ہے ——— دور سے پانی میں چلنے کی آواز)

بڑھا:۔ (دور سے کھانستے ہوئے) ارے بھئی اس محلے میں کوئی اللہ کا بندہ ہے کہ بھی ہے یا سب کے سب مر گئے؟ (کھانستا ہے)

سلیم:۔ میں تنہا بھی ——— میں بیٹھا رہ گیا ہوں ——— کیا بات ہے (اندر سے بڑھا نمودار ہوتا ہے۔)

بڈھا:۔ دم بھر کے لئے سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ یہ کڑاکے کا جاڑا ——— بیٹا ——— یہ ہوا ——— یہ اندھیرا ——— مر جاؤں گا میں ——— اف!

سلیم:۔ اندر آ جاؤ ——— اندر آ جاؤ ——— اندر آ کر باتیں کرو (قدموں کی چاپ ——— دونوں اندر کمرے میں) بیٹھ جاؤ۔ لکڑیاں سلگ رہی ہیں ابھی ——— تم دو ایک پھونکیں مارو ——— میں تمہارے لئے انڈے لے آؤں ابلے ہوئے ——— تم کانپ رہے ہو ٹھنڈ سے

بڈھا:۔ انڈوں ونڈوں کی ضرورت نہیں بیٹا ——— تم یہیں بیٹھو۔ خود ہی آگ سلگاؤ پوپلے منہ سے پھونکیں کیسے مار (پھونکنے کی آواز)

بوڑھا:۔ بس میرے بچے ——— اب فعلے بھڑکنے لگے ہیں ——— تم مجھے کوئی خاندانی نظر آتے ہو اس عمر میں یہ تہذیب و تہذیب ——— یہ رکھ رکھاؤ ——— یہ مسافر نوازیاں ——— خاندانی ہی تو کیا کرتے ہیں یہ ——— تم اس گھر میں اکیلے رہتے ہو بیٹا؟

سلیم:۔ بالکل اکیلا۔

بوڑھا:۔ جی نہیں اکتاتا؟

سلیم:۔ اکتاتا تھا کسی زمانے میں۔ مگر اب تو کوئی آ بھی جائے کمرے میں تو وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ چاہتا ہوں۔ بس یونہی تنہا پڑا رہوں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا۔

بوڑھا:۔ میرا آنا تمہیں ناگوار تو نہیں گزرا؟

سلیم:۔ بالکل نہیں۔ بالکل نہیں۔

بڑھا:۔ لیکن تم گھبرائے ہوئے لگتے ہو مجھے!

سلیم:۔ بات یہ ہے بڑے میاں کہ تم سے پہلے ایک شخص آیا تھا یہاں۔ کسی دوست کا پتہ پوچھتا پھر رہا تھا۔ میں دن بھر تنہا بیٹھے بیٹھے تھک جاتا ہوں۔ تو کسی سے تعلقات بڑھا کر اپنے آپ کو محبوس کر دینے کی بجائے راہ چلتوں پر پھبتیاں کستا ہوں۔ انھیں بیوقوف بناتا ہوں۔ اس طرح میرے دل کو تسلی ہوتی ہے۔ اس بیچارے سے بھی میں نے یونہی کہا۔ بات تک نہ کرنے دی۔ اسے یقین ہو چکا ہو گا کہ میں دیوانہ ہوں۔ ہوا سے یہ کھڑکی بجنے لگی۔ میں اسے بند کرنے اندر آیا۔ اور جب باہر جا کر دیکھا تو وہ غائب تھا!

بوڑھا:۔ نام کیا بتایا تھا اس نے؟

سلیم:۔ میں نے اسے نام بتانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

بوڑھا:۔ کیسا تھا؟

سلیم:۔ اندھیرے میں خاک نظر آتا۔

بڈھا:۔ آواز کیسی تھی اس کی؟

سلیم:۔ آواز؟ ——— آواز کے متعلق میں کیا کہوں ——— بس یوں سمجھ لو کہ ——— کوئی پچیس چھبیس کے لگ بھگ کی عمر والوں کی آواز میں جو ایک قسم کی ——— ایک قسم کی ٹھہراہٹ ——— یا یوں کہہ لو کہ لرزش سی کپکپاہٹ سی، جھرجھری سی ——— یعنی ——— یعنی کراری آواز تھی!

بڈھا:۔ یہ تمہیں بتایا کہ اسے کون سے

نمبر کی تلاش تھی؟

سلیم:- میرے مکان کا نمبر پوچھا تھا بیچارے نے۔ مگر میں ٹال گیا۔

بوڑھا:- تم نے ظلم کیا بیٹا۔ تمہاری موجودہ نرمی اور حلم دیکھ کر تو میں شک تک نہیں کر سکتا کہ تم ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکتیں بھی کر سکتے ہو۔ تم نے بہت برا کیا۔

سلیم:- میں بہت شرمندہ ہوں۔ دراصل میرا خیال تھا کہ جب اس کی مایوسی آخری حد تک جا پہنچے گی تو میں اسے گلے لگا لوں گا، اسے اندر لے آؤں گا، چائے پلاؤں گا، سگرٹ پیش کروں گا، اسے اس کے دوست کے گھر چھوڑ آؤں گا۔ مگر اس پر میری وحشت کا میرے اندازہ سے کہیں زیادہ اثر ہوا۔

بوڑھا:- بھٹکے ہوؤں سے مذاق نہ کیا کرو بیٹا۔ ورنہ شریر تقدیر کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں اور وہ ایسے مذاق کر گزرتی ہے کہ پچھتاوا بیکار ثابت ہوتا ہے۔ تم کیا جانو۔ میں نے تمہاری طرح کتنوں سے مذاق کیا، کتنوں پر پھبتیاں کسیں، کتنوں کو سیدھی راہ سے بھٹکایا، میں نے خود بھلا سے —— (رک کر وقفے کے بعد) تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟

سلیم:- رہنے دو ایسی باتوں کو بڑے میاں!

بوڑھا:- اس میں شرم کی کونسی بات ہے؟

سلیم:- کیا فائدہ ایسی باتوں کا۔ یونہی —— خواہ مخواہ —— بس پریشانی ہوگی مفت میں۔

بوڑھا:- تم ہاں یا نہیں میں جواب دے دو۔ تم نے کسی عورت کا بھی مذاق اڑایا ہے؟

سلیم:- خدا جانے تم کون ہو بڑے میاں۔ رات کا کوئی بھوت ہو، صبح کو چل دو گے کہیں۔ میری دکھتی رگیں ٹٹول کر تمہیں کیا ملے گا۔ میں تلخ اور کڑی حقیقتوں سے منہ موڑے خوابوں کا رسیا ہوں آج کل۔ فضول باتیں سوچتا رہتا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ یہ کارڈ جس کے دونوں سرے دیوار میں پیوست ہیں اگر چھت سے الگ ہو کر فرش اور چھت کے درمیان معلق ہو جائے۔ بولنے لگے گانے لگے —— (ہنستا ہے) اور اگر روشندانوں کی وہ رسیاں سانپوں کی طرح بل کھاتی فرش پر رینگنے لگیں۔ اور اگر یہ دری سلیمانی کہانیوں کی جادو کی دری کی طرح مجھے ساتھ لیتی اوپر فضا میں ابھر آجائے۔ اگر ——

(بوڑھا کھانستا ہے)

اگر آگ کا ایک شعلہ گول مول گیند سی بن کر میرے سر کے ارد گرد گھومنے لگے۔

بوڑھا:- یعنی سب ان ہونی باتیں میری مرضی کے مطابق ہونے لگیں۔ تو جی بہلتا ہے میرا۔

بوڑھا:- یعنی تمہارا جی دکھی ہے آج کل؟

سلیم:- میں بہت دکھی ہوں بڑے میاں بہت دکھی ہوں۔ اور آج تو —— اور بیچارا اجنبی —— کسی ماں کا لال —— بھٹکا ہوا بے کس مسافر —— ٹھٹھر رہا ہوگا کسی دکان کے چھجے تلے میں بڑا بیوقوف ہوں۔

بوڑھا:- پچھتاوا بے سود ہے میاں —— تمہارا نام کیا ہے؟

سلیم:- سلیم —— اور تمہارا؟

بوڑھا:- میرا نام کبھی محمود المظفر علی خاں تھا، مگر اب تو محمود ہی کافی ہوگا۔ مرتبے کے گھٹنے اور بڑھنے کے ساتھ ساتھ نام بھی گھٹتے رہتے ہیں۔ ایک زمانے میں سہارنپور کا مشہور ٹھیکے دار تھا۔ کوڑی لگاتا تھا اشرفی پاتا تھا۔ بڑے مزے سے گزر ہوتی رہی۔ کہ اچانک۔ (بادل بہت زور سے کڑکتا ہے)

سلیم:- بیچارا اجنبی۔

بوڑھا:- ہاں۔ تو بڑے مزے سے گزر ہوتی رہی کہ اچانک ایک ناگن ——

(رک جاتا ہے)

سلیم:- ناگن؟

بوڑھا:- یعنی عورت —— لیکن تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

سلیم:- رکھے ہوئے ناسور کو پھر سے چھیڑ دو گے بڑے میاں۔ اور پھر یہ تو تم جانتے ہو گے کہ ——

بوڑھا:- (فوراً بات کاٹ کر) کہ ناسور بہنے لگیں۔ تو بڑی مشکل سے رکتے ہیں۔

سلیم:- بالکل!

بوڑھا:- لیکن اگر پیپ بہتا رہے تو صحت کے لئے مفید رہتا ہے۔ ورنہ رگ رگ میں زہر بھر جاتا ہے اور ——

سلیم:- (بات کاٹ کر) یعنی تم میرا دکھڑا سن کر ہی دم لوگے!

بوڑھا:- شاید میں تمہارے کسی کام آسکوں۔

سلیم:- کام وام تو سب باتیں ہیں۔ کوئی کسی کے کام نہیں آتا۔ یہ دنیا خود غرضوں کی بستی ہے۔ میں کہتا ہوں مجھ سے بڑے

خدا رسیدہ بزرگ بھی خود غرضی سے محفوظ نہ رہ سکے۔

بوڑھا:- میں خدا رسیدہ نہ سہی لیکن خدا کا ایک ادنیٰ صاف دل بندہ ضرور ہوں شاید خود غرض بھی ہوں۔ لیکن وہاں میری خود غرضی کا کیا دخل۔ جہاں میری غرض اجنبی ہو!

سلیم:- بیچارا اجنبی یاد آ گیا مجھے۔ اس کا مکبرہ ٹوٹے مجھ پر!

بوڑھا:- اتنے جذباتی نہ ہو تو یہ رویہ بھی اختیار نہ کیا ہوتا!

سلیم:- وہ جذبات کی ایک رَو تھی!

بوڑھا:- اور یہ بھی جذبات کی ایک رَو ہے ____ اور پھر یہ تو تم نے پانچویں جماعت میں پڑھا ہوگا کہ رَویں گزر جاتی ہیں!

سلیم:- عجب آدمی ہو،

بوڑھا:- تمھاری عنایت ہے ____ ہاں تو کیا تم ____

سلیم:- (بات کاٹ کر) سنتا ہوں بابا، سنتا ہوں۔ کرسی آگے کھینچ لو ذرا (کرسی کی آواز) ہوں، ہاں تو کیا سوال تھا تمھارا؟

بوڑھا:- کیا کبھی تم نے کسی عورت کا مذاق اڑایا ہے؟

سلیم:- میں کسی عورت کا مذاق کیا اڑا سکتا، البتہ ایک عورت نے میرا مذاق ضرور اڑایا ہے!

بوڑھا:- کیسے؟

سلیم:- بہت ہی عام طریقے سے،

بوڑھا:- آخر محبت کیسے ہوئی؟

سلیم:- جیسے آج کل کے نوجوانوں کو ہو جاتی ہے۔ جیسے ہوا آتی ہے کلیاں جھومتی ہیں، چٹکتی ہیں۔ پھول بنتی ہیں۔ اور مرجھا جاتی ہیں!

بوڑھا:- یہ شاعری ہے! ____ ذرا آتش دان کم کر دو بھئی گرمی ہونے لگی ہے باہر بارش بھی رک گئی ہے شاید (وقفہ) رک گئی ہے، کھڑکی سے آسمان دیکھنا سلیم میاں۔

سلیم:- (قدموں اور کھڑکی کی آواز) آسمان صاف ہو رہا ہے! (واپس آ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔)

بوڑھا:- پھر میں تو تمھارا حال سن کر ہی جاؤں گا۔ معاف کرنا بھئی، مجھے ایسی باتیں کرنے کا حق تو نہیں، لیکن تمھاری نرمی اور شرافت دیکھ کر یہ جرأت کر بیٹھا ہوں۔

سلیم:- آدھ گھنٹہ پہلے تم مجھ سے ____ مگر شاید مایوس ہوتے لیکن اس بے گھر مسافر نے میرے احساسات کی دنیا بدل دی ہے، وہ بددعا دے گئے ہیں۔

بوڑھا:- کوئی گدہ گدڑا ڈھونڈ دے گا۔ تم کیوں جان ہلکان کرتے ہو، ہاں تمھیں محبت ہو گئی ایک لڑکی سے۔ کیا تھا اس لڑکی کا نام؟

سلیم:- نام وام سے تمھیں کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔

بوڑھا:- لیکن اگر تم مجھے نام بتا دو تو کیا میں ڈھنڈورا پیٹتے پھروں گا گلی گلی میں! ہم بڈھا بیچارا ____ ستر بہتر

نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت ____ نہ اپنی ____

سلیم:- (بات کاٹ کر) پروین تھا اس کا نام۔

بوڑھا:- کیا؟

سلیم:- پروین۔

بوڑھا:- ٹھیک ہے۔

سلیم:- کیا مطلب؟

بوڑھا:- یعنی اگر تم کوئی ایسا ویسا بھونڈا نام لے دیتے تو میری توقعات کا محل گر جاتا۔

سلیم:- تم مجھے خوش مزاج معلوم ہوتے ہو!

بوڑھا:- تمھاری عنایت ہے ____ ہاں تو پھر؟

سلیم:- تو وہ لڑکی تھی بڑی ____ ایسا کوئی لفظ نہیں سوجھتا جو اس کی افتادِ طبع کی صحیح ترجمانی کر سکے۔ یعنی وہ بہت ____ بہت ہی ____

بوڑھا:- شرمیلی تھی۔

سلیم:- بالکل الٹ ____ شرم تو اسے چھو تک نہیں گئی تھی۔ بس چلتی پھرتی چنگاری تھی وہ ____ ایک جگہ چین نہیں۔ پارے کی طرح تڑپ رہی ہے۔ کبھی صوفے پہ ہے تو کبھی قالین پر۔ کبھی کھڑکی میں ہے تو کبھی آتش دان کے پاس ____ یہ تصویر کس کی ہے؟ یہ پردے کتنے میں آئے ہیں؟ ریکارڈ بجاؤ ____ نہیں نہیں۔ بند کر دو ریکارڈ ____ چلو سیر کو چلیں۔ نہیں رہنے دو سیر ویر کو ____ باتیں کریں گے ____ یہ حالت تھی اس کی۔

بوڑھا :- پھر ؟

سلیم :- پھر وہ یہاں سے چلی گئی،

بوڑھا :- یعنی یہ شہر ـــــ،

سلیم :- یعنی یہ محلہ چھوڑ گئی۔ اس کے ابا کو معلوم ہو گیا سب کچھ۔ اور پھر ایک نیا مذاق بھی پیدا ہو گیا اس کا۔ محمد اسد نامی یہیں وکالت کرتا ہے کمبخت۔ سنا ہے آج کل اسی کے بس میں ہے۔ میں نے ایک بار سلام بھجوایا تو جواب ملا "اتنا اس استعمال کرو۔ طبیعت مائل ہو جائے گی"

بوڑھا :- بڑی شریر نکلی۔ اس کی کوئی نشانی ہے تمہارے پاس ؟۔

سلیم :- چند خطوط ہیں۔

بوڑھا :- چلو خط ہی سن لیں۔

سلیم :- (کھسیانی ہنسی ہنستا ہے) ہنسنے دو بڑے میاں۔ کیوں خواہ مخواہ پریشان کرتے ہو۔ اب ختم ہوئی میری کہانی۔ تمہارا ہی احسان کیا کم ہے کہ ـــــ،

بوڑھا :- میرا احسان ؟۔

سلیم :- ہاں ہاں۔ تمہارا ہی احسان کیا کم ہے کہ تم نے مجھے چند لمحوں کے لئے اس روحانی کرب سے بچائے رکھا جو اس اجنبی کے خوفناک تصور نے میری نس نس میں بھر دیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے میں نے ایک بے گناہ کا کلیجہ چبا لیا ہے۔ اور میرے ہاتھ اور دانت اور ہونٹ خون آلودہ ہو رہے ہیں ـــــ لیکن اب بارش تھم گئی ہے، چاند نکل آیا ہے، اگر اب وہ یہاں آ نکلے تو خدا کی قسم میں اٹھائے پھر دوں اسے، اگر وہ مجھ دکھیا کے ہاں پھر کیسے آئے گا ! ـــــ اگرچہ میں نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن اس کی آنسو بھری آنکھیں۔ بھیگا لباس۔ پیلا چہرہ سب کچھ نظر آ رہا ہے ـــــ اُف !

بوڑھا :- پھر وہی رٹ ؟ سلیم میاں، کیوں دلگیر ہوتے ہو خواہ مخواہ۔ اٹھاؤ وہ خط۔ تمہارا جی بہل جائے گا اور میرا وقت کٹ جائے گا۔

سلیم :- (اٹھتا ہے۔ کرسی کی گھسٹنے کی آواز آتی ہے) عجب آدمی ہو بڑے میاں! اصل میں تمہارا چہرہ اتنا نورانی۔ اور بولنے کا انداز اتنا پیارا ہے۔ کہ مجھ سے انکار نہیں بن پڑتا ـــــ لے آتا ہوں وہ خط!

[سلیم کے قدموں کی چاپ، الماری کھلنے کی آواز اور پھر سلیم کے واپس ہونے پر قدموں کی چاپ، اس دوران میں بوڑھا یونہی گنگناتا رہتا ہے۔]

سلیم :- یہ ہے ان خطوں کا بنڈل۔ پروین کو یہ معلوم نہیں شاید کہ میں ان خطوں سے اسے ساری دنیا میں ذلیل و رسوا کر سکتا ہوں۔ اصل میں اسے احساس ہی نہیں، اور اگر احساس ہو جائے اسے تو زخمی کبوتر کی طرح لوٹتی پھڑکتی میرے قدموں پر آن گرے، ـــــ صرف اگر اسے احساس ہو جائے اس کا ـــــ،

بوڑھا :- سوچیں گے۔ سوچیں گے۔ پہلے تم کوئی خط تو سناؤ۔

(کاغذ کی آواز)

سلیم :- یہ ایک خط ہے۔ بیتے ہوئے دنوں کے ہیولے تیرتے پھرتے ہیں نگاہوں میں دھندلکی ہے۔

پیارے سلیم !

میں روز تم سے ملتی ہوں لیکن نہ جانے کیا سبب ہے کہ خط لکھے کے سوا چین نہیں آتا۔ میں آج ساری رات سوچتی رہی کہ کسی طرح ـــــ ارے کہ کر اُسی سے ہم تم ہو !

(نہایت مختصر وقفہ)

سلیم :- (ہراساں اور حیران لہجے میں) ارے ! یہ کیا؟ ریوالور ؟ مجھ پر تانتے ہو یہ ریوالور ؟ جس نے تمہیں پناہ دی جس نے تمہیں ـــــ،

بوڑھا :- (بات کاٹ کر، گونجیلی غضبناک اور تیز آواز میں) میز پر رکھ دو یہ خط۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ اور پیچھے ہٹ کر دیوار سے لگ جاؤ۔ ورنہ ریوالور سے گولی نکلے گی۔ اور تمہارا بھیجا چھت سے جا چپکے گا۔

سلیم :- لیکن آخر اس کی ـــــ !

بوڑھا :- (غصے میں) میں کہتا ہوں میز پر رکھ دو یہ کاغذ ـــــ یوں ـــــ ہاتھ اٹھاؤ۔ اٹھاؤ ـــــ پیچھے ہٹو ـــــ (جوتوں کی چش چش) بس ! اگر تم نے ذرا بھی حرکت کی تو یاد رکھو۔ یہ ننھا منا ریوالور اپنے کئی دہانوں سے موت اگل دے گا تم پر ! ـــــ سمجھے ! (قدموں کی چاپ) اچھا۔ تو یہ رہا پروین کے خطوط کا بنڈل ـــــ اسے چپکے سے اندرونی جیب میں محفوظ کر لینا چاہیے۔ باہر بندا باندی کا شور ہے ـــــ بھیگ نہ جائیں یہ ناداں کی قسمت کے صحیفے !

سلیم :- (غصے میں) بڈھے تم نے میری اچھی بھلی ہمدردی کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے تم مجھ پر

سادگی سے کھیل رہے ہو۔ تم نے میری شرافت کو گیند کی طرح لڑھکا دیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

بڈھا۔ کیوں ہو رہا ہے بیٹا؟

سلیم۔ اس اجنبی کا عذاب ٹوٹا ہے مجھ پر ——— (آواز بلند ہو جاتی ہے) لیکن میں یہ خطوط نہیں دوں گا۔ میں تمھارا ممنون ہوں کہ تم انھیں بچا لائے ہو۔ مجھے ان سے کوئی کام نہیں لینا۔ یہ مجھ بے کس کی اندھیری زندگی کے چراغ ہیں۔ (آواز میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے) یہ میرے بیتے ہوئے دنوں کا قلم ہے۔ دیکھو۔ بڑے میاں۔ میں تمھارے ہاتھ جوڑتا ہوں ———

بوڑھا۔ (گرج کر) ہاتھ دھرے رہیں۔ جو کچھ کہنا ہے کہہ جاؤ۔ رات اٹھی جا رہی ہے۔

سلیم۔ (اسی حسرت بھرے لہجے میں) زندگی کے گزشتہ چھ سات سالوں میں جس چیز نے مجھے بار بار زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ وہ پروین کی محبت ہی تو ہے۔ وہ محبت مجھ سے چھن گئی۔ لیکن اس کی محبت کی یہ نشانیاں تو مجھ سے نہ چھینو۔ دیکھو بڑے میاں میں امیر آدمی ہوں۔ اس الماری میں کتابوں کے پیچھے ایک بٹوا پڑا ہے۔ اس میں کوئی دو ہزار کے نوٹ ہوں گے۔ کونے والے سوٹ کیس میں دو تین سو روپے کی نقدی ہو گی۔ تم جو چاہو لے سکتے ہو۔ یہ صوفے، یہ قالین، یہ سنہرے فریموں والی تصویریں، یہ اطلسی پردے جو چاہو لے سکتے ہو۔ تم ان خطوط کو ٹھکرا دو بڑے میاں۔ یہ محبوب کی بڑی نشانیاں ہیں۔ ان ہونٹ

باتیں ہوائی قلعے۔ (بوڑھا کھانستا ہے) تمھیں پروین کے خطوط کے لئے یہ رویہ کیسے اختیار کرنا پڑا؟ تم بوڑھے ہو۔ تمھارے بال کھچڑی بن چکے ہیں۔ تمھیں جوانوں کے ان کھیلوں سے کیا لگاؤ۔

بوڑھا۔ کچھ اور کہنا ہے تو وہ بھی کہہ ڈالو

سلیم۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ تم کہو تو میں تمھارے پیر چھو لوں۔ پر یہ خطوط۔ بڑے میاں ——— دیکھو ——— تم دیکھتے ہی نہیں میری طرف ——— تم سنتے ہی نہیں!

بوڑھا۔ میں سن چکا ہوں اور سن رہا ہوں یہ خط تمھیں نہیں مل سکتے۔ وہ بھولی بھالی لڑکی تمھارے اس کرتوت سے واقف ہو چکی ہے۔ کہ تم ان کے ذریعے اسے بدنام کرنے کی دھن میں ہو۔ اس نے روتے بسورتے مجھ سے اس کا ذکر کیا۔ سو مجھے یہ ناخوشگوار فرض ادا کرنا پڑا۔ میں یہ خطوط لئے جا رہا ہوں۔ تم اپنے دل کی رونق کے لئے یادوں کی تصویریں تیار کرو۔ آخر یادیں بھی تو محبوب کی بہت بڑی دین ہے۔

سلیم۔ مجھے شاعری سے ذرا بھی مس نہیں ایسی ———

بوڑھا۔ (بات کاٹ کر) لیکن ابھی ابھی تم نے ایک اجنبی سے کہا تھا کہ تم خوابوں کی دنیا کے بسنے والے ہو!

سلیم۔ تم نے سب کچھ سنا؟

بوڑھا۔ ہاں۔

سلیم۔ اور پھر تم نے اس بے چارے کو جانے دیا۔

بوڑھا۔ میں ذرا سی نیکی کے لئے اتنی بڑی نیکی کو کیسے فراموش کر سکتا تھا۔

سلیم۔ تو کیا اب تمھارے دل میں کسی دکھی سے ہمدردی کی ایک چنگاری تک باقی نہیں رہی؟

بوڑھا۔ میرا دل سرد ہے!

سلیم۔ کیا تم ———

بوڑھا۔ (بے پروایانہ) میں کچھ نہیں سننا چاہتا اب میں جاتا ہوں، اور تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ جذباتی نہ بنو، کیونکہ جذباتی انسان واقعات کی گردن پر سوار نہیں ہو سکتا۔ ان کے قدموں سے لپٹ پڑا رہتا ہے!

(قدموں کی چاپ)

سلیم۔ بڑے میاں (چیختا ہے) بڑے میاں!

بوڑھا۔ تمھارا گلا خوب چلتا ہے!

سلیم۔ بڑے میاں! میں پوچھتا ہوں کیا کائنات کی کوئی قوت تمھیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی!

بوڑھا۔ اس وقت کائنات کی سب سے بڑی قوت میرا ارادہ ہے! ——— چودھری محمد اسد کا ارادہ۔

سلیم۔ اسد کا؟ تم اسد ہو!

(دروازہ بند ہونے کی آواز)

سلیم۔ (پکارتا ہے) اسد۔ اسد (دروازہ کھول کر باہر آواز دیتا ہے) اسد!

(وقفہ)

سلیم۔ (زور سے دروازہ بند کرتا ہے) ظالم، وحشی، بدتمیز ——— یہ سب اسی کمبخت اجنبی کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ وہی سبز قدم میرے ہولناک افسانے کا عنوان ہے۔ قہر کرنے

اس پر ـــــ اکڑا پڑا ہو کسی نالی میں!

(وقفہ۔ قدموں کی چاپ جو قریب آ کر رک جاتی ہے)

ارشد۔ بڑے میاں

اسد۔ (یعنی بوڑھا) جی

ارشد۔ بڑے میاں نمبر چوبیس کونسی گلی میں ہوگا۔

اسد۔ یہی تو مکان نمبر چوبیس ہے ــــ لیکن چودھری محمد اسد صاحب تو مکان نمبر بیالیس۔

(وقفہ)

ارشد۔ اس شہر کے سارے باسی دیوانے تو نہیں ہو گئے!

اسد۔ تمہارا شبہ بجا ہے، لیکن شبہات غلط بھی ہو سکتے ہیں۔ تم اپنے اتنے عزیز دوست کو بھی نہیں پہچانتے۔ یہ سفید ڈاڑھی اور یہ خوفناک پگڑی تمہاری نگاہوں کو دھوکا دے رہی ہے شاید ـــــ لو ـــــ اب دیکھو،

ارشد۔ (معمولی سے وقفہ کے بعد مسرت سے) اسد بھیا۔ اسد بھیا! (وقفہ۔ وہ دونوں گلے ملتے ہیں) یہ روپ کیسے دھارا؟

اسد۔ میں تمہیں کہا کرتا تھا نا کہ محبت میں کئی روپ دھارنے پڑتے ہیں۔ سو آج وہ نظریہ حقیقت کی صورت میں تمہارے سامنے ہے، اس مکان میں رہنے والے مسٹر سلیم، جن کا دماغ تمہارے آج کل بگڑا ہوا ہے، اور جو اب سے وہ لمحہ پیشتر بہت زیادہ بگڑ چکا ہے۔ اب سے دو ور ـــــ محبت کرتے تھے ایک لڑکی سے، پروین سے، دونوں میں ـــــ،

ارشد۔ (بات کاٹ کر) آہستہ بولو۔

اسد۔ (اسی لہجہ میں) یہ ریڈیو مجھے آہستہ بولنے کی اجازت نہیں دیتا، کہتا ہے گرجو۔ دہاڑو شیروں کی طرح۔ اور سارے شہر کو سناؤ۔ کہ پروین نے اسے خط لکھے۔ اور پھر ـــــ جیسا کہ ہوتا آیا ہے، پروین نے میری طرف توجہ کی اور پھر ـــــ،

ارشد۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

اسد۔ (ہنس کر) ہاں! جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، اس نے ایک اور کو مرکز توجہ بنا لیا۔ میں نے اسے سمجھایا بجھایا۔ کہ لڑکی۔ یہ طوطا چشمی ٹھیک نہیں۔ میں بڑا کرارا انسان ہوں۔ میں خواب دیکھنے کا قائل نہیں ہوں۔ مجھے فریب دیکر تو کہیں کی نہیں رہے گی۔ مگر وہ ایک نہ مانی؟

ارشد۔ یہ آواز کیسی تھی؟

اسد۔ مجھے تو کچھ سنائی نہیں دیا۔

ارشد۔ کسی کے قدموں کی چاپ تھی شاید۔

اسد۔ سلیم صاحب گھوم رہے ہوں گے اپنی خوابگاہ میں ـــــ خیر ـــــ تو مجھے معلوم ہوا کہ اس نے سلیم کو بے شمار خطوط لکھے ہیں۔ جو سلیم کے پاس محفوظ ہیں۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان خطوط کو اپنے قبضے میں کر لوں۔ اور پروین کو یہ خوف دلا کر کہ میں اس کے سارے راز گلی گلی میں افشا کرتا پھروں گا ـــــ اسے اپنا لوں، سو میں اس بھیس میں سلیم کے ہاں آیا۔ اور اس سفید ڈاڑھی اور اس کالے ریڈیو کی مدد سے وہ خطوط حاصل کر لئے۔ میرے چغے کی اندرونی جیب میں دم رک رہے ہیں کمبخت۔

ارشد۔ تم نے اچھا نہیں کیا اسد۔

اسد۔ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ کیا تم نے اسی لئے اچھائی برائی کے پرانے فلسفے سے اپنا دامن نہیں چھڑایا۔ میں نے تمہیں مدت ہوئی کہا تھا کہ نشے پر بھروسہ، وہ تمہیں نیکی اور بدی کی دھجیاں اڑا کر دکھا دے گا۔

ارشد۔ عجیب آدمی ہو۔ سینہ زوری سے چوری کر کے مجھے قائل کرنا چاہتے ہو؟

اسد۔ تم میری باتیں نہیں سمجھو گے۔ تم ٹھٹھر رہے ہو ٹھنڈ سے، لو بھیا! یہ میرا چغہ!

ارشد۔ لیکن تم؟

اسد۔ میرے لئے سلیم صاحب نے آگ جلائی تھی۔ مجھے ٹھنڈ وَنڈ نہیں لگ رہی! میں آج بہت ہی خوش ہوں۔

ارشد۔ (چغہ اوڑھنے کا وقفہ) شکریہ! مگر بھیا تم نے غلط نمبر کیوں لکھا خط میں؟

اسد۔ جب میں نے پہلے پہل تمہیں سلیم سے باتیں کرتے سنا، تو مجھے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ تم نے نمبر پڑھنے یا یاد رکھنے میں غلطی کی ہے۔

ارشد۔ تم ہماری باتیں سنتے رہے، اور پھر مجھے یوں ہی بھٹکنے دیا؟

اسد۔ دوسرا معاملہ بہت نازک تھا۔ معمولی غلطی کر کے میں ایسی خاموش اور ابر آلود رات کھو بیٹھتا۔ بھلا کیا نمبر لکھا تھا میں نے؟

ارشد:۔ ۲۲

اسد:۔ میں نے ۲۲ لکھا تھا۔ مگر خیر یہ چکر میرے لئے مفید رہا۔ تمہارے چلے جانے سے وہ اسقدر متاثر تھا'

ارشد:۔ متاثر تھا؟

اسد:۔ ہاں! اسقدر متاثر تھا۔ کہ میری مداخلت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا' ورنہ وہ بہت مشکل سے کسی اجنبی کو اندر آنے دیتا ہے۔

ارشد:۔ عجیب اتفاق ہے ——— (وقفہ) ——— (آہستہ سے) کوئی آ رہا ہے

اسد:۔ (آہستہ سے) ادھر کونے میں آ جاؤ ——— ہٹ آؤ چاخانے سے (پاؤں کی چاپ ——— وقفہ)

اسد:۔ پروین

پروین:۔ (حیران اور خوف زدہ ہو کر) کون؟

اسد:۔ تمہارا اسد! جو سلیم کی طرف سے پہنچ کر تمہارے خطوط کا بنڈل اپنے قابو میں کئے تم سے اپنی تکلیف کے ایک ایک لمحہ کا انتقام لینے پر تلا ہوا ہے۔

پروین:۔ اسد!

اسد:۔ یہاں کیسے آئیں تم!

پروین:۔ تم مجھ سے یہ پوچھنے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

اسد:۔ تم بھی حیران ہو رہی ہو گی مجھے یہاں دیکھ کر۔ لیکن تمہاری حیرت دور کرنے کے لئے میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جس طرح الف لیلیٰ کے پرانے قصوں میں دیووں پریوں کی زندگی طوطوں اور میناؤں کے جسموں میں بند ہوتی تھی اسی طرح سلیم کی طرف تمہارے لکھے ہوئے خطوط کے بنڈل میں تمہارا مستقبل ہو کر بیٹھا ہے۔ لیکن تم یقین کرو۔ کہ اگر تم نے ———

پروین:۔ وحشی! بدمعاش۔

اسد:۔ (ہنستا ہے) چچ چچ چچ چچ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ کہ خطوط کا وہ بنڈل اب تمہارے قریب کھڑے ہوئے میرے دوست کے چغے کی اندرونی جیب میں محفوظ ہے' غزل تمہارے سامنے ہے۔ راہ میں بتا دوں گا کہ بس اب تمہارے سرگرم سفر ہونے کی دیر ہے۔ کیا خیال ہے تمہارا؟

پروین:۔ میں نہیں جانتی تھی۔ کہ تم اتنے پست بھی ہو سکتے ہو تم لڑکیوں کے جذبات سے کھیلتے ہو' اور سمجھتے ہو' کہ تم نے بڑا تیر مارا ہے!

اسد:۔ جذبات سے تم کھیلیں یا میں؟

پروین:۔ تم نے سلیم سے میرے خطوط دباؤ ڈال کر چھینے ہوں گے!

اسد:۔ سمجھ تو اسے گئے ——— سمجھی تھیں تم؟

پروین:۔ اور اب تم ناجائز طور سے مجھ پر دباؤ ڈال کر ——— (اچانک رک جاتی ہے)

اسد:۔ ہاں ہاں! اپنی شگفتہ تقریر جاری رکھو۔ تمہارے لہجے کی لچک تمہاری گفتار کی شیرینی اور تمہارے ہونٹوں کی جادو بھری جنبشوں کو لئے میں مہینوں ترسا کیا ہوں ——— اور اگر اب تمہارا لہجہ سخت اور باتیں تلخ ہیں۔ مگر ع

"ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق"

انیسویں صدی کے اسداللہ خاں نے بیسویں صدی کے چوہدری محمد اسد کے دل کی بات کہہ دی ——— ہاں۔ تو تم کیا کہہ رہی تھیں'

پروین:۔ (لہجہ سخت ہو جاتا ہے۔ آواز قدرے بلند ہو جاتی ہے) بس۔ میں تمہیں بتلا دینا چاہتی ہوں۔ کہ اگر تم نے میرے خطوط سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی تو تمہیں عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ میں تمہیں خبردار کئے دیتی ہوں۔ کہ اگر تم یہ ذلیل رویہ اختیار کر سکتے ہو تو میں بھی ———

اسد:۔ (غصے میں بات کاٹ کر) تم کیا کر سکتی ہو؟ ابھی تک تمہارے وہی ڈھنگ ہیں۔ کتنی بے خوف ہو تم ——— اور پھر کتنی عاقبت نااندیش۔ اور اگر میں گلی گلی تمہارے ان خطوط کی نقلیں چسپاں کرتا پھروں؟ پھر کس کام آئے گا تمہارا یہ طنطنہ!

پروین:۔ دیکھا جائے گا۔ میں تو فضول باتوں کے خوف سے حال کو داغدار بنانے کی قائل نہیں۔ موقع محل دیکھ کر نپٹ لیا جائے گا۔

اسد:۔ (جھنجھلاہٹ اور غصے میں) تم سانپ کی دم پہ پاؤں دھر رہی ہو کر اب یہ تمہارے بس میں ہے لیکن تم نہیں جانتیں کہ اس کے منہ پر تمہارا بس نہیں چل سکا اور یہ سانپ ہمیشہ دشمن کی طرف ہی ڈستا ہے۔

پروین :- میرے پاس ہر سانپ کے کاٹے کا منتر ہے۔

اسد :- ہاتھ لوگی پروین ؟

پروین :- (پلٹتی ہے اور جاتے ہوئے کہتی ہے) مل لوں گی۔ معمولی بات ہے۔

اسد :- (نعرے سے) اسر سرو منوگی۔

پروین :- (دعدے سے) دمن لوں گی۔ یہ طالب کی ہابی (Hobby) ہے۔

اسد :- اگر کل یہ خطوط تمھارے ہاتھوں میں نہ ہوں، تو میرا نام اسد نہیں!

پروین :- (ہیت : و رسے) کوئی دوسرا نام تجویز کر رکھو اپنے لئے۔

اسد :- عجب بڑ بولی چھوکری ہے۔

(مختصر سا وقفہ) ارشد۔ نکالنا تو رلیا الیہ۔ کمبخت چھنکی دائیں جیب میں ہو گا۔ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نہیں دیکھ سکتا کہ یہ نازک سی لڑکی مجھ ایسے منجھے کیئے نوجوان کا یوں منہ چڑاتی نکل جائے۔

ارشد :- ہوش کی دوا کرو۔ ابھی ابھی سلیم یہاں تھیں رہے تھے اب خود تمھارے منہ سے کفت جاری ہے۔

اسد :- ارشد۔ وقت ضائع نہ کرو۔

ارشد :- سبھی کچھ سوچو تو سہی۔ تم نادان لڑکی ہو کہ ان خطوط سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شائستہ کی عام سطح سے کتنے نیچے اتر جاؤ گے؟ دوستی میں تمھیں کتنا ذلیل سمجھا جائے گا اور پھر نیچے ہوئے پل ہیں وہ رس کہاں جو خود گرنے والے پھل میں ہے۔

اسد :- میرا کلیجہ اگر پتھر کا ہوتا تو شاید میں برداشت کر لیتا سب کچھ۔

ارشد :- جذبات [illegible]۔

اسد :- ارشد تم مزاج شناس ناصح نہیں۔ تم نے اچھا نہیں کیا مجھے روک کر ——— اچھا ——— چغے کی اندرونی جیب میں خطوط کا وہ منحوس بنڈل ہو گا۔ نکالو ذرا میں اپنے کوٹ میں محفوظ کر لوں۔

ارشد :- خطوط۔

اسد :- ہاں ہاں خطوط۔

ارشد :- پروین کے لکھے ہوئے خطوط!

اسد :- ہاں ہاں پروین کے لکھے ہوئے خطوط۔

ارشد :- وہ پروین کے پاس ہیں۔

اسد :- (گھبرا کر بلند آواز میں) کیا مطلب ؟

ارشد :- وہ میں نے پروین کو دے دیئے ہیں۔

اسد :- (غصے میں) کیوں !

ارشد :- تم ٹھنڈے دل سے سنو تو کہوں۔

اسد :- (گرج کر) یہ تم کیا کر رہے ہو ارشد؟

ارشد :- میں سچ کہہ رہا ہوں خطوط کا وہ بنڈل اب پروین کے پاس ہے۔ بھولی سی نادان لڑکی ہے۔ جذبات کی زد میں آ کر جو خطوط اس نے لکھے انہیں ناجائز دباؤ کا ہتھیار بنا لینا سفلہ پن ہے۔ اب وہ اپنی جگہ خوش ہو گی اور سلیم اور اسد کا روحانی بخار بھی چند دنوں میں اتر جائے گا اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

اسد :- ارشد! تم نے میرے کلیجے میں زہر بھرا خنجر گھونپ دیا ہے۔ تم نے میری امید و دل کی جنت میں شعلے بھڑکا دیئے ہیں تم نے۔

ارشد :- میں نے تمھارے بھلے کی بات کہی ہے۔

اسد :- میں تعاقب کروں گا۔ وہ ابھی گلیوں میں بھٹک رہی ہو گی۔

ارشد :- تم نہیں جا سکتے۔

اسد :- مجھے جانا ہو گا۔

ارشد :- (حکمانہ انداز میں) اسد۔

اسد :- میں تمھیں بتا دوں ارشد کہ تم نے ایک اجنبی لڑکی پر رحم کھا کر اپنے عزیز دوست پر مصیبتوں کا پہاڑ گرا دیا تم میری اخلاقی زبوں حالی سے واقف ہو پھر مجھے اپنے اخلاق کی دلدل میں پھنسانے سے فائدہ۔

ارشد :- میں نہیں چاہتا کہ تم معمولی سے جسمانی لطف کے لئے چند معصوم دل جوؤں کے احساسات سے کھیلو۔ تمھیں سلیم سے بھی صلح کر لینی چاہیے۔

اسد :- ارشد تمھارا دماغ تو نہیں پھر گیا ؟

ارشد :- جب تم سلیم سے گلے مل لو گے تب جا کر میں تمھارے ساتھ گھر چلوں گا میں اسے بلاتا ہوں۔

اسد :- ارشد میں برداشت نہیں کر سکتا۔

ارشد :- تمھیں برداشت کرنا ہو گا۔

(قدموں کی چاپ سلیم کے دوبارہ آنے پر دستک دیتا ہے)

سلیم:- (اندر سے آواز) کون؟

ارشد:- بھئی خدا دروازہ کھولنا۔

سلیم:- (وحشیانہ گرج سے) کون ہو تم؟

ارشد:- میں اس سے قبل بھی آپ کے پاس آچکا ہوں لیکن آپ نے عجیب سا برتاؤ کیا تھا مجھ سے۔ اب ——

سلیم:- (نہایت غصے میں) تم پھر آگئے؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ بدمعاش، لچے، شہدے کہیں کے۔ تمھیں کیا حق حاصل ہے کہ امن شہریوں کے آرام میں خلل ڈالتے پھرو؟ تمھاری وجہ سے —— صرف تمھاری وجہ سے ابھی ابھی میرے ماضی کا چراغ گل ہوا ہے۔

ارشد:- اس وقت اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ اگر قریب ہی دماغی امراض کا کوئی معالج ہو تو مجھے پتہ بتا دیجئے۔ میں بلا لاؤں اسے۔

سلیم:- مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ پاگل کہتے ہو مجھے؟ تم خود پاگل ہو۔ سڑی ہو —— ہو —— سنا؟ کنگلا کہیں کا۔ سر چھپانے کے لئے کوئی چھت نہیں ملتی اور چلا ہے میرے لئے ڈاکٹر بلانے —— لفنگا کہیں کا!

ارشد:- لیکن میں تو آپ سے ——

سلیم:- میں جانتا ہوں، اس دنیا میں ہر شخص کے چنے میں ریوالور چھپا ہوا ہے —— دور ہو جاؤ۔

(وقفہ)

ارشد:- (آہستہ سے) عجیب دنیا ہے اور عجیب ہیں اس دنیا میں رہنے بسنے والے۔ جذبات کے دھارے پر بہتے ہوئے تنکے۔

اسد:- ارشد تم ابھی تک بیوقوف ہو۔

ارشد:- میں یا تم!

سلیم:- کیا چلے گئے؟ —— (ہاتھ جھاڑ کر ہنسی آواز) چلے گئے۔ چلو چھٹی ہوئی۔ خس کم جہاں پاک!

(ارشد کی دھیمی سی ہنسی)

(باجازت آل انڈیا ریڈیو، پشاور)

احمد ندیم قاسمی

غزل

دل کی ٹوٹی کشتی کو اب ساحل ساحل بہنے دو — گوشۂ جاں میں چپکے سے ارمانِ طوفاں رہنے دو

اندازِ وفا کا ذکر ہی کیا یہ رسمِ جفا ہی اچھی ہے — غم کا بار اٹھانا ہو تو یہ لطفِ فراواں سہنے دو

جس نے سمجھا، جس نے جانا خود سے ہوا وہ بیگانہ — دل ہی کو وہ رازِ ازل وہ رازِ محبت کہنے دو

آغازِ کرم بھی دیکھا ہے انجامِ کرم بھی دیکھ لیا — جس سے بڑھے ناکامیٔ حسرت ایسی تسلی رہنے دو

آپ کی آنکھیں پرنم کیسی آپ کا دل کیوں بھر آیا — اشک مرے بے قیمت ہیں جب ان کو یونہی بہنے دو

رنجش ہے بے مہری کی اس جانِ تمنا سے اشرف
ترکِ محبت آپ کو سوجھے گی ایسی کرامت رہنے دو!!

علی اشرف

حسنِ سوگوار!

ایک دوشیزہ! سراپا حسرت و اندوہ و یاس!
بیوگی کے تلخ غم سے پھول سا چہرا اداس!
نرم و نازک لب مگر تیسیر تبسم کا مزار
غنچۂ نورس شکارِ گردشِ لیل و نہار
حسن کی رنگیں بہاروں پر خزاں چھائی ہوئی
اک کلی کھلنے پہ بھی پژمردہ، سنولائی ہوئی
مرکزِ جور و ستم، پامالِ غم، قلب و جگر!
کیسے دیکھوں، آہ یہ منظر! کہاں تابِ نظر!!

اشک باری، بے قراری، آہ و زاری تا کجا!
تا کجا! اے پیکرِ غم۔ سوگواری تا کجا!

مانتا ہوں یہ وہ غم ہے جس کا درماں ہی نہیں!
جو حوادث سے نہ ٹکرائے وہ انساں ہی نہیں
جانتا ہوں تجھ کو حاصل ہی نہیں صبر و سکوں!
حشر ساماں ہے ترے دل میں غم سوز دروں!!
خوب واقف ہوں! تری دنیائے ارماں لٹ گئی!
ابتدا ہی تھی کہ ـــــ! بزمِ لطف ساماں لٹ گئی
یہ بھی سچ ہے زندگی ہے اب تہ دامانِ ابر!
انتہائے حسرت و غم ہی سہی! لازم ہے صبر!
نقشِ حرماں بن کے، نازک دل پہ صدمہ رہ نہ جائے
نوجوانی! شورشِ طوفانِ غم میں بہہ نہ جائے
ہو نہ جائے تو کہیں اس درجہ بیزارِ حیات
دھندلی دھندلی سی نظر آنے لگے یہ کائنات!
غنچۂ نورس ـــــ نہ ہو جائے کہیں بے رنگ و بو
سرد پڑ جائے نہ یکسر خواہشِ ذوقِ نمو!!
کون دیگا، پھر ترے جلووں کو نظروں کا خراج!
چھین لے گا وقت جب اس حسن کی عظمت کا تاج

التجائے شوق ہے بیدار کر ذوقِ نظر
پھر باندازِ دگر دنیائے دل پامال ـــ کر

مجیب خیرآبادی

حشرِ جذبات

کہیں دنیا میں نہ تھا حسن کا ساماں پیدا
میری نظروں نے کیا جلوۂ امکاں پیدا

لاکھ دنیا میں ہوں میرے لئے زنداں پیدا
میری تخییل سے ہیں دشت و بیاباں پیدا

اب دے مجھ کو فریبِ چمن اے رنگِ بہار
میرے دامن پہ ہے اشکوں سے گلستاں پیدا

جذب ہو جائیں دو عالم کے مناظر جس میں
اتنی کر دہر میں تو وسعتِ داماں پیدا

یہ محبت کی حکایت ہے نہ ہوگی کبھی ختم
اسی عنوان سے ہوگا نیا عنواں پیدا

کیوں ابھی سے ہے تجھے جلوۂ نو کی امید
انتہا کفر کی ہو لے تو ہو ایماں پیدا

سرخ اشکوں کا برا ہو کہ کھلا عشق کا راز
سوز پنہاں ہے، مگر دولتِ داماں پیدا

تیرے ہی ذوقِ جنوں میں ہے کمی کچھ ورنہ
ذرے ذرے سے ہے اک روحِ بیاباں پیدا

دیکھ لو ثاقبِ وارفتہ کو تم غور سے آج
مدتوں ہوگا نہ پھر ایسا غزل خواں پیدا

ثاقب کانپوری

تیموری آرٹ

احمد علی صاحب کی ایک کتاب "ایرانی فنِ تصویر" عنقریب منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ اس کا ایک حصہ سب رس میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ہندوستانی تاریخ نے تیمور کی جیسی کچھ تصویر کھینچی ہے، عیاں ہے۔ اس کے ساتھ اس تصویر کا بھی مقابلہ کیجئے۔

مغلوں کے زوال کے چند ہی روز بعد، دنیا کا زبردست فاتح تیمور لنگ، وسط ایشیا کے افق پر نمودار ہو چکا تھا۔ اسی سبب سے ایران طوائف الملوکی کی فتنہ پردازیوں کا زیادہ عرصہ تک شکار نہ رہ سکا۔

تیمور ترکی نژاد تھا۔ بمقام کش پیدا ہوا۔ غالباً یہی مقام حالیہ شہر سبز کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی معرکہ آرائیوں نے ابتدا ہی سے، کچھ دنیائے عالم میں اس کے نام کا ڈنکا بجا دیا تھا۔ اور اس نے وسط ایشیا پر فتح پالی تھی۔ کئی سال تک بے خانماں پھرنے کے بعد، جس میں اسے سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا، مشرقی ترکستان اور ماوراالنہر کے علاقہ کو مسخر کر لیا۔ اسی سال اس نے ایران کی تسخیر کا بھی منصوبہ باندھ لیا تھا۔ لیکن پورے ملک کی تسخیر میں کئی سال لگ گئے۔ اگرچہ خراسان کی طرح، بعض مشرقی صوبوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی، تاہم جنوبی ایران، اس وقت تک باجگزار سلطنت نہ بن سکا، جب تک تیمور نے آذربائیجان، سیستان اور جارجیہ کے علاقوں کو چاروں طرف سے گھیر کر، ان سے اپنی طاقت کا لوہا نہ منوا لیا۔ ستر ہزار باشندوں کو تہہ تیغ کر کے، اس نے شہر اصفہان پر قبضہ کیا تھا۔ شیرازیوں نے اس خوف سے کہ کہیں ان کا بھی یہی حشر نہ ہو، تیمور کے استقبال کے لئے، پہلے ہی سے شہر کے دروازے کھول دیے تھے۔ غرض چھ سال کی مسلسل جد و جہد کے بعد، تمام جنوبی ایران اس کے زیرِ اقتدار آگیا۔ اس وقت تیمور نے سمرقند کو اپنا دارالخلافہ قرار دے کر نظم و نسق کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ باوجود اس کے تیموری فوجوں کی پیشقدمی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ حتیٰ کہ اس کی سلطنت کی حدود مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں روس کی سرحدوں سے جا ملیں۔

اس میں شک نہیں کہ تیمور ایک سخت گیر فاتح تھا۔ لیکن تہذیب و شائستگی کی خوبیوں سے بھی عاری نہ تھا۔ جس وقت بھی اس نے لوٹ کھسوٹ یا تاخت و تاراج کا بازار گرم کیا، نہایت دانشمندی اور دور اندیشی سے کام لیا۔ ناکارہ کو تباہ اور قابلِ قدر اشیاء کو محفوظ کر کے سمرقند لے جایا کرتا۔ جذبۂ حسن پرستی اس کی فطرت میں موجود تھا۔ یہی خصوصیت اسے اپنے پیشرو، سکندر اور چنگیز خاں سے ممتاز کرتی ہے۔ تیمور نے اپنے دارالسلطنت کو حقیقی معنی میں سونے کی چڑیا بنا رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باجگزار ممالک کی مختلف اقوام کے اساتذۂ فن، اس کے دربار میں کھنچے کھنچے چلے آئے تھے۔ تیموری حکومت ہی کو یہ ناز زیبا ہے کہ اس نے تصویر سازی جیسے فنِ لطیف میں ایک نئے ذوق کی تشکیل کی، اور اسی کے بابرکت دور میں، ایرانی فنِ تصویر کی نشو و نما بھی مکمل ہوئی۔

تیمور اس دارِ فانی سے رحلت کر چکا تھا۔ لیکن اس کے جانشین اس کی اتباع میں، آرٹ کی سرپرستی کئے جا رہے تھے۔ تاوقتیکہ فلکِ کج رفتار کی فتنہ پردازیوں نے، قضائے مبرم بن کر انھیں اقتدار سے محروم نہ کر دیا۔ ازواقانِ یلہ

کی فنی دلچسپیوں میں رتی برابر بھی فرق نہ آنے پایا۔ شاہان تیموریہ اس دنیا سے چل بسے، اور ان کی یاد ہمارے دماغوں سے محو ہو چکی، لیکن وہ آرٹ جو ان پرستاران فن کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا تھا، اس پر ان کے اسمائے گرامی کی مہریں ثبت ہیں۔ یہی آرٹ عرصۂ دراز تک ان شیدایان فن کے نام کو قائم و دائم رکھے گا۔

گوناگوں تہذیب و تمدن کی نمائندہ و سربرآوردہ ہستیاں، جو تیموری چتر تلے آ چکی تھیں، تیموری آرٹ میں بھی ان کی روح ایک دوسرے سے متصل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تیموری عالیشان عمارتوں میں، اندرونی اور بیرونی دیواروں کی پچی کاری، اسی روح پرور کیف کو پیش نظر کرتی ہے۔ اور یہی پچی کاری نے، اپنی ہم عصر کتابی تصویروں (Miniatures) کو بھی بڑی شدت سے متاثر کیا تھا۔ محض متاثر ہی نہیں، بلکہ اس صنف کے جوشِ عمل میں بھی اپنی روح کو جاری و ساری کر دیا تھا۔

کہتے ہیں کہ استاد گنگ، تیموری مکتب تصویر کا بانی تھا۔ اس قائد فن حسن کار کے متعلق، کچھ زیادہ واقعات نہیں ملتے۔ سوائے اس کے کہ اس نے استاد جہانگیر بخاری کو تعلیم دی تھی، جو بہرۃ المصورین کے لقب سے مشہور ہے اور استاد جہانگیر نے اپنی باری میں بہزاد کے استاد پیر سید احمد تبریزی کو فن سکھلایا تھا۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ انسانی طبائع میں جذبۂ مشاہیر پرستی کا فقدان کتنا زبردست خسارا ہوتا ہے کہ استاد گنگ، جیسی شخصیت کی زبان زد عام، زندگی کے حالات تک معلوم نہیں! جس کی وجہ سے بعض لوگ اسے محض ایک داستانی شخصیت تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت حال کچھ بھی ہو اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ تیموری مکتب کا کوئی بانی تھا یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ تیموری آرٹ ایک خاص رتبہ پر پہنچ چکا تھا۔ جس کے بعض حقیقی کارنامے ہم تک پہنچے ہیں۔ بہرحال اس مکتب کی برتری کسی صورت میں کم نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ سب افراد اس مکتب میں جذب ہو جاتے ہیں، جنہوں نے اپنی تصویروں کے ذریعہ، مادی حیثیت سے اس مکتب کی تکمیل میں حصہ لیا تھا۔

تیموری آرٹ کی باقیات۔

(۱) اس دور کی باقیات الصالحات میں، سب سے مقدم خواجوی کرمانی کا مسودہ (قلمی نسخہ) ہے، جس پر ۷۹۹ھ م ۱۳۹۶ء درج ہے۔ جنید نے اس کی تصویریں بنائی تھیں۔ یہ نسخہ اس وقت برطانوی عجائب گھر میں موجود ہے۔ تیمور کی زندگی میں، جس آرٹ کی مزاولت کی جاتی تھی، یہ حیرت انگیز کارنامہ، اسی فن کی صحیح صحیح ترجمانی کرتا ہے۔ اسی غمازی کی وجہ سے عجائب خانے کا درخشاں ستارا مانا جاتا ہے۔ اس شاہکار کے پیکروں میں ملائمت اور لچک کی کمی کو دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ مغل اثرات ہنوز زائل نہ ہوئے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی جامع التواریخ کے مانند، اس مرقع میں بھی متنوع عناصر کی کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ پیکروں کے بشرے بالکل چینی قطع ہیں۔ خالص ایرانی مناظر کو، چینی ایرانی (مخلوط) طرز کی عمارتوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔ اصول و عمل کے کلی ارتباط کی تمام خوش ادائیوں کے باوجود، کبھی تو بھونڈے پن کا احساس پیدا ہوتا ہے، اور کبھی نزاکت و لطافت ذوق کی طرف خیال منتقل ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس مخلوط احساس سے قدرت مصورہ میں نقص پیدا ہونے کے بدلے، اس کی دلکشی و دل بستگی میں مزید اضافہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

(۲) بلینی کے شہرت یافتہ مرقع کا ذکر بھی اہم ہے۔ اس مرقع کی تصویروں کو ابتدا میں سلطان احمد نے ترکستان میں جمع کیا تھا، اس میں جنٹائل بلینی کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک ترکی شہزادے کی تصویر بھی شامل کر دی گئی تھی، اس لئے اس تصویر کی نسبت سے، اس وقت سے اس البم کا نام ہی بلینی کا مرقع یا البم مشہور ہو گیا۔ یہ نسخہ کئی ہاتھوں سے گزرتا ہوا، کتابوں کے ایک شوقین

ترک کے ہاتھ لگا۔ جس کے مرنے کے بعد اس کے لڑکوں نے اس البم کے اوراق کو آپس میں بانٹ لیا۔ اس مرقع میں اپنی اہلیہ کے ساتھ شہزادے کی ایک اور تصویر بھی شامل ہے۔ اس تصویر کی اور البم کے بعض قابل دید اوراق کی عکسی تصویروں کے ساتھ "شہنشاہ چین کے دربار میں ہو مع کی آمد کا منظر" بھی، "تزئینی فنون کے عجائب خانے" میں محفوظ ہے۔ غالباً مسٹر کیٹش ([illegible]) جیسے حقیقت کے متلاشی کو اس شاہکار میں بھی رنگ رلیاں مناتے کا دلیا ہی وعیش سامان ملا ہوگا، جس کو اس نے یونانی ضمیر کی آرائش میں تلاش کیا تھا۔ چنانچہ خراماں نسیم کے سرور کن جھونکوں کے ساتھ، درختان پر برگ و بار پر غنچہ ہائے شگفتہ کا رقص، سرود نونہالان چمن پر بلبلان خوش الحان کے نغمہ سرا ہونے کی تفسیر، استادانہ زور قلم کے ساتھ منکشف کی گئی تھی جسے تماشائی کے دل میں رہ رہ کر خیال موجزن ہوتا ہے کہ یقیناً قدرت نے مصور کو رموز سربستہ سے آگاہ کرنے کی خاطر، اپنا سینہ چاک کر کے ہی نہیں دکھلایا، بلکہ ان کی عمیق ترین گہرائیوں میں ڈبو بھی دیا ہے۔

(۳) برٹش میوزیم میں سنہ ۸۱۳ھ/۱۴۱۰ء کا ایک تیموری قلمی نسخہ رکھا ہے، جس میں "قلم سیاہی و طلائی" کا بیلیں اور قلمی کتب کے حاشیوں کے فیتان بنے ہوئے ہیں، ان کی تزئینی تفاصیل کو غیر معمولی نفاست کے ساتھ بنا کر نہایت پر تکلف اور دیدہ زیب رنگوں سے آراستہ کیا گیا ہے۔

(۴) سنہ [illegible] کا مجموعہ مسودات، جو ۲۹۲ نسخوں پر مشتمل ایک کتاب کی شکل میں مجلد ہے۔ یہ، گولبن کین صاحب نے اسے محفوظ کر رکھا ہے۔ جس کو اعلیٰ حضرت سلطان السلاطین العرب والعجم، دین پناہ سلیمان سپاہ ظل اللہ قہرمان الماء والطین، عون الاسلام والمسلمین، ناصب رایات العدل والاحسان، قامع بنیان الظلم والطغیان السلطان ابو المظفر شاہ سکندر ذو القرنین ابن عمر شیخ ابن امیر تیمور گورگان بہادر خاں خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی خدمت عالی میں نذر گزرانے کی خاطر ترتیب دیا گیا تھا، تفصیل کارستانی کا حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ چونکہ اس نسخہ میں جسم عریاں بھی شامل ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ شاید اہل یورپ کو اس میں بے حد سامان دلبستگی ملے، جن کو ان کے مخصوص آرٹ میں اعلیٰ ترین احساسات و جذبات کے اظہار کا ایک بہترین وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔ بہت ممکن ہے، اس جگہ اسے ایسے ہی بدیسی اثرات کے تحت، ایرانی آرٹ کی رسمی پابندی میں بنا دیا گیا ہو۔

نادرگان تیموریہ میں سب سے نامور شہزادہ شاہرخ بہادر اپنے قبلہ دار الخلافہ ہرات سے مملکت کے نظم و نسق کو چلا رہا تھا۔ فن مصوری کے جو درخشاں ستارے اس کے دربار کی زینت بنے ہوئے تھے، جس کام کی تکمیل انھوں نے سمرقند میں نہ کی تھی، ہرات میں کی۔ یعنی تیموری دور کی ابتدا سے ایرانی آرٹ میں جن اہم ترین محاسن کا سیلاب امڈا چلا آرہا تھا، اسے اب چل کر نہایت مربوط و منتظم طریقہ پر جذب کر لیا۔ چنانچہ چینی نقاشی سے سیاہی قلم خط کشی، عراقی طرز سے طلائی و لونی پرداز کاری (Miniature) اور اطالوی نمونوں سے عہد عتیق کی لونی درخشندگی، اخذ کی گئی تھی۔ ان ماخوذہ اجزا و عناصر کا خوش آہنگ ملاپ، اس زمانے کا اسلوب کار تھا۔ اطالوی اثرات تیموری دربار میں، غالباً ان ایلچیوں کے توسط سے داخل ہوئے ہوں گے، جو اسے ایشیا کی بزرگ ہستی سمجھ کر اپنی اطاعت کیشی جتلانے کی غرض سے آتے تھے۔ گو کہیں ابھی بہزادی آرٹ کے کمال نفاست سے دوچار ہونا باقی ہے، تاہم تیموری آرٹ کے شاہرخ دور کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس زمانے کا آرٹ، کل ایرانی فن تصویر کشی، نہایت لطیف و صاف رنگ بندی (کلر اسکیم) کے نمونوں کو پیش نظر کرتا ہے۔

(۵) جانور ملک کی سیاہی قلم نقاشی کے چند نمونے ڈاکٹر سرے کے ہاں موجود ہیں۔ جن کو انھوں نے لیڈز کے شاہی

کتب خانے سے حاصل کیا تھا ان نمونوں میں یورپی اور چینی تاثرات کو نہایت خوبصورتی سے ہم آہنگ بنایا گیا ہے۔

(۶) سنہ ۸۴۰ھ کا نسخہ معراج نامہ اور سنہ ۸۴۴ھ / ۱۴۳۶ء [illegible] نظامی صاحب وہ تذکرہ جو پہلے [illegible] کی کمپنی [illegible] پیرس کے قومی کتب خانے میں موجود ہیں۔ ان دونوں بے نظیر یادگاروں سے تیموری خاندان کے متمول سلاطین کی عظمت و جبروت کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

(۷) اسی زمانے کا بنا ہوا ایک شکار کا منظر ہے۔ جس میں رنگوں کی نفاست ظاہر ہوتی ہے۔

(۸) ایک اور نسخہ [illegible] درویشان کا ہے جس کو سلطان مرزا علی گیلانی نے سنہ ۹۲۹ھ میں ترتیب دیا تھا۔ وہ سو کتابی تصویروں پر مشتمل ہے۔ کئی مصور مل جل کر ان تصویروں کو ایک ہی کتاب اور ایک ہی لونی ہم آہنگی میں بنانے کی کوشش کی ہے۔

(۹) رستم خوابیدہ کی تصویر بھی بڑی جاذب نظر ہے جو اسی زمانے کے صحیح اسلوب کار کو نمایاں کرتی ہے۔

ایرانی آرٹ کی عظمت کا یہ زریں دور زمانۂ مستقبل کے اہم بالشان کارناموں کا ایک زبردست پیش خیمہ تھا۔ ابتدا ہی سے ہم دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ ہرات و سمرقند کے اساتذہ نے حقیقت نگاری کی جکڑ بندیوں سے نکل کر عمل کاری کی پر مسرت سہولتوں کو حاصل کر لیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی "اشاروں (Symbols) کو اپنے خیالی ارتسامات سے آراستہ کرنے کے راز سربستہ کا پتہ بھی لگا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے آرٹ اپنی سکونی (Static) حالت سے ترقی کر کے دیدہ فریب کیفیات تک بلند ہو جاتا ہے۔ آنے والے واقعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے کام مستقبل کے آرٹ کے لئے ایک مستقل دستور العمل کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ گو اب بھی کہیں کہیں درشتی و کرختگی اور قدامتی آثار (Primitiveness) اپنی جھلک دکھلا رہے تھے۔ کمال مطلق ابھی تک دست رس سے باہر تھا۔ بہزاد کا ظہور ابھی نہ ہوا تھا۔

امجد علی

نیلی ساری

— گھر، گھر! ——— موٹر بس کے انجن نے موبل آئیل کے گھونٹ لئے اور دوسرے ہی لمحہ سامنے والی وسیع سڑک پر بڑی بڑی عمارتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہوگئی! ———

اور عتیق گم سم سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا، لیکن اس کی وجہ بہت دن بعد ملے ہوئے لنگوٹیا یار کی جدائی نہ تھی، پھر ——— اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کل جب دکاندار نے اسد کے سامنے ریشمی ساریاں پیش کیں، تو اس نے نیلی ساری کو کئی مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا، دبایا اور مسلا، لیکن پھر بھی اس نے پسند نہیں کیا! اس کی قیمت جارجٹ کی ساری سے صرف چند روپے زیادہ تھی اور ممکن تھا کہ کچھ بحث وتکرار کے بعد تھوڑی سی کمی ہو جاتی! مگر کس قدر حیرت ہے! اسد نے پسند ہی نہیں کیا!

شاید چند روپیوں کی بحث کے لئے ایسا کیا ہو؟

نہیں!

اس نے تو میرے بچوں کے لئے بہت سی دیہاتی مٹھائیاں اور میوے لائے تھے، کیا کنجوس آدمی ایسا کر سکتا ہے؟

اور پھر جب اُسے اپنی بہن کے بچوں کی یاد آئی تو اس نے بالوشاہی بھی خرید لی! تنگ ظرف ہرگز ایسا نہیں کر سکتا؟

پھر کل اس کے ریشمی ساری نہ خریدنے کا معمہ ———

وہ انھیں خیالات کے بے پناہ سمندر میں غوطے لگاتا ہوا دفتر پہنچا، ابھی ابھی ڈاک آئی تھی، اسے محسوس ہوا، ایک خط کے سرنامہ کی تحریر سے اس کے اندر اندر کے مضمون کا پتہ نہیں چلتا اسی طرح ایک آدمی کے دلی جذبات سے اس کی بیوی ——— دوست ——— بھائی، بہن کوئی بھی واقف نہیں ہوسکتا۔

رات بستر پر لیٹے لیٹے یہی خیال عتیق کو ستا رہا تھا ——— کیوں اسد نے ریشمی ساری نہیں خریدی؟ —

اس نے اپنی آنکھیں بند کریں، اتنے میں بچہ اس کے پاس آگیا، اس کے گال سے اپنے رخسار ملتے ہوئے کہنے لگا —

"بابا مجھے اچھی موٹر لا دیں گے نا؟"

جب عتیق نے موٹر دینی منظور کی تو بچہ خوشی خوشی سو گیا، سامنے کھونٹی پر عتیق کی شیروانی ٹنگی تھی، بہت پرانی ہوگئی تھی وہ! اسے خیال آیا ——— اب ایک شیروانی سلوانی چاہئے۔

اور ساتھ ہی اس کی نظر اپنے پہلو میں سوئے ہوئے بچے پر پڑی وہ اپنے آپ سے کہنے لگا، یہ شیروانی تو ابھی دو مہینے کام دے گی لیکن پہلے بچے کی موٹر ———!

اس خیال کے ساتھ ہی پھر اُسے اسد کی خریدی ہوئی ساری کا خیال آیا، وہ سوچتا رہا، جانے کیا کیا سوچتا رہا، تھوڑی دیر بعد نیند لگ گئی، مگر نیند میں بھی دماغی سکون میسر نہ ہوا۔

دوسرے دن بھی احساسات کا بچھو رہ رہ کر اس کے قلبی سکون پر نیش زنی کرنے لگا، اس نے اسد کو خط لکھ کر اس معاملے کی تفصیلات دریافت کرنے کا تہیہ کر لیا، لیکن اس کا ارادہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا، صبح جب وہ دفتر پہنچا تو آج کی ڈاک میں اسد کا خط تھا، سادہ کارڈ نہیں ——— اچھا خاصا وزنی لفافہ! دو آنے کے ٹکٹ چسپاں کئے گئے تھے اس پر، عتیق حیران تھا کہ اتنا بڑا خط کیا ہوگا؟ اس نے نہایت ہی عجلت اور بیم ورجا کے عالم میں لفافہ چاک کیا۔ پہلی دو چار سطریں پڑھنے کے بعد وہ بھول گیا کہ وہ دفتر میں

بیٹھا ہے،' وہ فر فر خط پڑھنے لگا ——

—— سچ تو یہ ہے کہ تمہارا مختصر سا کاروانِ حیات جنت ارضی سے کم نہ تھا' اس میں شک نہیں کہ تمہارے پاس دو دن بڑے ہی آرام سے گزرے' مدت کے بعد تم سے مل کر میں اپنے آپ کو بھول بیٹھا تھا' گر وہ نیلی ریشمی ساری والا واقعہ —— اس ساری کی قیمت صرف چودہ روپے زیادہ تھی اور تم بھی خریدنے کے لئے اصرار کر رہے تھے' لیکن میں نے تمہاری بات سنی ان سنی کر دی' تم نے خیال کیا ہوگا — آخر گاؤں والا ہے' پیسے پیسے کے لئے جی ٹوٹتا ہو تو کیا تعجب؟ لیکن عتیق' سچ کہوں؟ —— وہ بخل نہیں تھا —— کنجوسی نہ تھی' پھر ——

ساری ہاتھ میں لے کر میں نے بار بار الٹا پلٹا اور مسلا ضرور —— لیکن اس کی نفاست' چمک زرین کناری اور آڑھی ترچھی لکیریں! کتنی دلفریب تھیں۔ اس کے لمس سے ایسا محسوس ہوا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں' انتہائی بھیانک' ڈراؤنا اور بھیانک خواب! صبیحہ کی موہنی صورت میری آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی تھی! اس ساری نے بہت پرانی یاد تازہ کر دی! یاد کیسی زخمِ دل ہی کہو نا! وہ پھر رسنے لگا' ایسی نرم اور ملائم چیز پر میں نے زندگی میں صرف ایک بار ہاتھ پھیرا تھا' اسی لئے ——

وہ شام مجھے یاد ہے' ساون کا مہینہ تھا' آسمان پر کالی کالی گھٹائیں فیل بے زنجیر کی طرح گھوم رہی تھیں' ساری فضا پر ایک اداسی کا عالم تھا' ایسے میں ایک مفلوک الحال شخص ساری بیچنے کے لئے لایا' ساری پچاس روپے میں بک رہی تھی' میں تو پسینہ میں شرابور ہو گیا' سارا جسم کانپنے لگا' جیسے میرے اندر سے کسی نے زندگی چھین لی تھی' میری حالت اس شخص کی سی تھی جس کے قریب ہی کسی سوراخ سے سانپ نکل آیا ہو۔

اور یہ نیلی ریشمی ساری زمین پر' پلنگ پر' نہایت عجیب طریقے سے پھیلی ہوئی تھی' میں ہکا بکا رہ گیا' دماغ پھٹا جا رہا تھا' میں نے چیخ چیخ کر کہا —" اس سانپ کو ہٹاؤ' میری نظروں سے دور کرو!"

ممکن ہے دنیا مجھے پاگل سمجھے' عقلمند لوگ لمبے لمبے ہاتھ کر کے پکار اٹھیں گے' پریشانی کی بات ہی کیا تھی؟ ساری معمولی کپڑا ہی تو ہے! لیکن اس کاروباری دنیا سے ذرا ہٹ کر احساسات و جذبات کی دنیا میں داخل ہو جائیں تو۔؟ قومی جھنڈا' جس پر ہمارے جذبات' احساسات' محبت اور خلوص کی تہہ جمی ہوئی ہوتی ہے' ایک معمولی کپڑا ہی تو ہے! ایک ٹکڑا معمولی قیمت کا! لیکن اس کی خاطر ملک کے جانباز اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔ سیکڑوں سپہ سالاروں کو جھنڈے کی ایک لہر آزادی کا وہ پیغام دیتی ہے جس کا ہم اظہار بھی نہیں کر سکتے' اس تھوڑے سے کپڑے میں مستقبل' ماضی' تہذیب' معاشرت' مذہب اور آزادی کی زندہ تاریخ دکھائی دیتی ہے۔

میں نے جب اس ساری کو اس طرح بکتے دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے' اس ساری کے پیچھے جو روح فرسا تاریخ تھی وہ میری آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ اس میں کسی خاندان کی کتنی ہی زندگیوں کے دکھ حسرتیں' ناکامیاں چھپی ہوئی تھیں' اس میں میری زندگی کے عبرت انگیز واقعات چھپے ہوئے تھے' میرے مظالم کی داستان تھی۔ تم کہو گے مظالم اور میں؟ ہاں میں! اتنا ہیچ اور کمینہ بن گیا تھا! یہ ساری میری تباہی کی آخری سیڑھی تھی!

تم جانتے ہو، ایک زمانہ تھا، سرکار، دربار اور سماج میں میری عزت تھی، اسلاف کے عادل شاہی عہد میں حاصل کئے ہوئے امتیازات کو انگریزی حکومت نے باقی رکھا تھا، کتنے ہی گاؤں قبضے تھے، اسلاف کے خون پسینہ بہا کر حاصل کی ہوئی دولت و عزت ہمارے گھر غلامی کر رہی تھی، لیکن جب نیا نظام قائم ہوا تو عسکری قوتوں کے اظہار کا کوئی موقع نہ رہا اور اپنی صلاحیتوں کو سماجی امور میں تبدیل کرنے کا بھی کوئی طریقہ نظر نہ آیا، تعیش اور رنگ رلیاں ہی ایک شغل تھا، اس وقت کی سماجی حالت ایسی تھی کہ جوا، طوائف، شراب اور اسی قبیل کی گھناؤنی عادتوں نے اہمیت حاصل کر لی تھی، موٹروں اور بگھیوں کا ذکر کرنا فخر و مباہات کا اظہار تھا، ایسے مشاغل میں دولت بکھیرنے والا شخص ہی زیادہ کامیاب رہتا تھا۔ اس وقت یہ چیزیں سماجی اور خاندانی شرافت پر دھبہ نہ تھیں مگر آج سماج کس قدر بدل گیا ہے، محنت، شرافت اور صداقت کو اہمیت حاصل ہے، یہ کیفیت پہلے نہ تھی، اس وقت ہم راگ رنگ کو ہی زندگی سمجھتے تھے، ہماری بے اعتدالی اور ہوس پرستی ہماری مقبولیت کا ذریعہ تھی - امارت کا احساس، دولت کا نشہ اور عیش کوشی میں زندگی کے دن بڑی تیزی سے گزر رہے تھے۔ دماغ اور دل ہیجانی لہروں پر ڈول رہے تھے، جذبات میں اضطراب تھا اور سچ تو یہ ہے کہ اس وقت میرا خیال تھا —— لڑکیاں چاہے جانے ہی کے لئے پیدا کی گئیں، ان کے بدن کی ساخت، ان کے رہنے کا رنگ ڈھنگ، لمبے لمبے سیاہ بال، رسیلی آواز، سج دھج، گڑیوں کی طرح ادھر ادھر گھومنا ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کے دل میں گدگدی پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتیں ایک مسکراہٹ سے قیدی بنا لینا بھی وہ جانتی ہیں اور ہر دوشیزہ کا مینائے شباب اسی لئے ہے کہ وہ الٹ پلٹ کر توڑ دیا جائے، اب سوچتا ہوں، وہ سب ایک جوش تھا جیسے پانی میں سوڈا ڈال دیا گیا، محبت اور پیار ایک بدہضمی ہے۔ لیکن لڑکیوں کا نام سن کر ہیجان پیدا ہونے والی منزل سے بھی گزرا ہوں، اس وقت درجنوں نام یاد تھے، لیکن آج ——

چاروں طرف ایک نظر ڈالتا ہوں تو وہ سب کی سب ابھی تک پڑی سڑ رہی ہیں کسی کی اپنے شوہر کے ساتھ ایک حیثیت ضرور ہے، آدمی حیثیت والا جانور ہے! کم از کم سماج کے بنانے والے تو عقلمند تھے۔ وہ آدمی کے مقابلے میں عورت کا سر نیچا کرنا نہیں چاہتے تھے، مرد عورت پر حکومت کرتا ہے - یہ اس کی حیثیت ہے - لیکن مجھے کیا غرض؟ ہوگا کوئی سماج! وہاں آدمی رہتے ہوں گے! —— اب تو جان لیا میں نے سب!

آج سے پندرہ برس پہلے میری شادی ہوئی تھی، لیکن شادی کی مقدس ذمہ داریوں سے میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتا تھا، میں نے کبھی بیوی سے کھل کے بات نہیں کی - وہ بدصورت تھی؟ نہیں وہ حسین تھی، اس قدر کہ اگر کسی مٹی کے پتلے کو آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتی تو وہ بھی رقیب کی تلوار کا شکار بن جاتا! لیکن جب یہ حسن مجھے مسرت بخشنے کی کوشش میں تھا تو میں بازار کی گھناؤنی خوبصورتی کا شکار تھا، دل و دماغ کی بے راہ روی میں بیوی کے سکھ اور چین کی کیسے فکر؟ عورت کی زندگی کچھ اور تھی، ہم ہر قسم کی وحشت، آزادی اور بے راہ روی جائز سمجھتے تھے عورتیں زیادہ سے زیادہ مقید، محکوم اور بے زبان جانور کی طرح تھیں؛ باہر جھلک بھی نظر نہیں آتی تھی، اوروں سے میل ملاپ معیوب اور اپنے شوہر سے گفتگو میں کمتری کا اظہار معیار شرافت تھا، عورت کے جو الا مکھی کو سماج کی چٹانیں راستہ ہی نہیں دیتی تھیں، دوسری عورتوں کے رنگ محلوں میں ہی ہمارا وقت گزرتا تھا، ہمارے قہقہے، عشق و ہوس اور دل کی ساری

رنگینیاں وہیں پوری ہوتی تھیں، پھر بیویوں کا حال کون پوچھتا؟ ....

میں اکثر راتوں میں کھانے کے بعد گھر سے نکل جاتا اور صبح تک باہر ہی رہتا تھا' یہ چیز صبیحہ کے لئے ناگوار ہوتی' لیکن اپنے دکھ کے اظہار کی ہمت اس میں نہ تھی۔ اس وقت گرہستی کا مسلک یہ تھا کہ شوہر کے عیوب پر ناک بھوں نہ چڑھائے' وہ اپنی ہزاروں مصیبتوں کو اپنی' چال' ڈھال' رفتار و گفتار سے بھی ظاہر نہ ہونے دیتی تھی' وہ دل ہی دل میں غم کھاتی رہی' میں اکثر یہ اس کے چہرے سے جان لیتا تھا' لیکن اس وقت احساسات کی نزاکت ہی جل چکی تھی۔ آدمی کو اپنی زندگی کے بہت کم واقعات یاد رہتے ہیں' خیر جانے دو!

آخر کار بچہ پیدا ہوا' دو ماہ بعد وہ بچے کو ایک سفید کپڑے میں لپیٹ کر میرے پاس لے آئی' اس دن وہ کتنی خوبصورت معلوم ہو رہی تھی' کسی نے سچ کہا ہے کہ عورت ماں بننے کے بعد ایک شگفتہ پھول بن جاتی ہے۔ وہ منظر آج بھی میرے دل پر نقش ہے' یہی نیلی ساری پہنے ہوئی تھی ساری کی دلکشی سے اس کے چہرے پر مسرت کھیل اٹھی تھی یا پھر اس کے شوق کی پرچھائیاں اسے اس قدر حسین بنا رہی تھیں' بہرحال صبیحہ انتہائی مسرت و شادمانی کے عالم میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

اس دن اس نے نہایا تھا' بال کھلے چھوڑ دئے تھے' جیسے اندھیری رات کو دن کی شاخیں اٹھائے ہوئے تھیں' اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل تھا' جسم کی طرح شاید دل بھی پاک ہو گیا تھا' جسم سے' دل سے' پاکیزگی جیسے پھوٹ رہی تھی' عورت کی زندگی میں محبت ہی تو بڑا جذبہ ہے! ان دنوں جیسے وہ بہار بنی تھی' اس کی صباحت پر زردی جھوم رہی تھی۔ ایک قسم کی جاں بخش مٹھاس اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی' زندگی کی تلخیاں احساس مسرت میں ضم ہو گئی تھیں' یہ مسرت کا احساس نہ تھا' اس کی نگاہوں میں رحم و ہمدردی تھی' التجا تھی۔

بچے کو ہاتھوں میں لئے کتنی دیر تک دیکھتی رہی' اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے' میں آگے بڑھا' لڑکا پیدا ہونے سے مجھے کتنی مسرت ہوئی! لیکن اُسے روتا دیکھ کر حیرت ہوئی' پوچھا ——— "یہ کیا؟ خوشی کے وقت آنسو کیسے؟"

اس نے ایک لمبی سانس لی اور بولی ——— "ناگ پیدا ہوا ہے! کتنا زہر پھیلائے گا؟ کون جانے!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا' کتنا بڑا طنز تھا میری زندگی پر: یہ تم سمجھ سکتے ہو!

میری ہوس پرستی نے مجھے عقل و دل دونوں سے بیگانہ کر دیا' ایک ... نے مجھے دیوانہ بنا دیا' دن کا اکثر حصہ اور بیشتر راتیں میں اسی کے ہاں گزارتا تھا' ایک دن میرے دل میں خیال آیا کہ میں اپنے ہوس کے کھلونے کو اس نیلی ریشمی ساری میں ملبوس دیکھوں' یہ ساری صبیحہ کی تھی! شادی پر اس کے بھائی نے تحفہ دی تھی' اس ساری پر وہ جان دیتی تھی' اس نے شاید دو مرتبہ سے زیادہ نہیں پہنا تھا' لیکن میں نے دغا کی' ظالم بن گیا' جھوٹ گھڑی تم کہو گے لوگ جس کی اس قدر عزت کرتے تھے' وہ شخص اس قدر نیچ؟ ہاں' آج کل سارے عزت والے نیچ اور کمینے ہیں! دنیا ایک فریبی دغاباز' بدنیت اور عیار کی عزت کرتی ہے' یہ میدان اسی کے ہاتھ آتا ہے! ہمدردی' احسان اور شرافت سبھی ڈھونگ' خود غرضی کا بہروپ! غریبوں اور حاجت مندوں کا خون نچوڑ کر ان کی ہڈیوں کو چوس کر پھر انھیں کے سامنے روٹی کا ٹکڑا ڈال کر ہمدردی اور سخاوت کا دعویٰ کیسا؟ اپنے سوانگ کے نبھاؤ کا کتنا حسین طریقہ!

اور لوگ ——— دنیا کے سارے آدمیوں سے مجھے کچھ نفرت سی ہو گئی ہے' دنیا بیکار ہے! ویسے تو بیسیوں آدمی ملے' میں انھیں کچھ کچھ پہچانتا ہوں' وہ صرف آدمی تھے' اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ ان آدمیوں کے بڑے بڑے

ہجوم سے گزرا، لیکن ان کی کوئی خاص آواز نہ تھی، اور اگر تھی تو کوئی قیمت نہیں تھی، اس طرح دنیا میں کچھ لوگ ہیں، ان کے پاس دولت ہے، موٹریں ہیں اور حویلیوں میں سامانِ عیش! میں بھی تو کبھی انھیں میں تھا! —— ان کے پاس اعزاز ہے، رتبہ ہے، وہ شریف بھی کہلائے جا سکتے ہیں سماج میں ان کا زیادہ اثر ہے، لیکن کیا ان میں خلوص، ہمدردی اور انسانیت ہے؟ بس ایسی ہی جیسے ان کروڑوں آدمیوں کی آواز!! — میں بھی کتنا خوش تھا اسلاف کے کارناموں پر! پدرم سلطان بود، میرے لئے فخر تھا لیکن ان کی حمیت، خودداری اور جرأت سے میں نے مہمیز کا کام نہیں لیا، نام نہاد تہذیب اور خود ساختہ سماج کے حسین نقاب کے دھوکے میں، ویشیا، کے لئے ہر قسم کا پاپ کیا، میں نے صبیحہ سے کہا کہ میرے ایک دوست کے گھر تقریب ہے، اسے ایک اچھی ساری کی ضرورت ہے، پہلے اس نے پس وپیش کیا، لیکن مجھے مصر پا کر ساری حوالے کردی، میں نے بڑی ہی خوشی سے یہ ساری لے جا کر طوائف زادی کو دیدی اور اسے اس ساری میں ملبوس دیکھ کر بدمست ہو گیا جذبات نے مجھے ذلیل کردیا تھا!

اس کے بعد ایک دوست کی شادی میں صبیحہ گئی ہوئی تھی، وہاں اس طوائف کو گانے پر بلایا گیا تھا، وہ اس روز اسی نیلی ساری میں ملبوس تھی، صبیحہ نے طوائف کے جسم پر اپنی ساری دیکھی تو ایک چیخ مار کر بے ہوش ہوگئی، اس نے مجھ سے بات چیت بند کردی، مسلسل ڈیڑھ ماہ کی علالت کے بعد وہ پھر کبھی بیدار نہ ہوئی —

عتیق! اگر میں وہ نیلی ریشمی ساری خرید تا تو جب کبھی میری بہن اسے پہن کر میرے سامنے آتی — مجھے اپنے مفلوج ہونے کا احساس ہوتا، جو میرے لئے انتہائی روح فرسا اور جاں گسل ہوتا!

عتیق دنیا میں اندھے سے زیادہ اپاہج محتاج ہوتے ہیں —— گھر کی ملکہ کی مسکراہٹ سے ہماری زندگی کی مسرتوں کا چشمہ ابلتا ہے، بیوی سے حیوانیت کا برتاؤ کرکے کوئی خوش نہیں رہ سکتا اور پھر عورت کے دکھ! —— جو لاکھی کی طرح اندر ہی اندر ابلتے رہتے ہیں، وہ نظر نہیں آتے مگر کیا کم تکلیف دہ ہوتے ہیں! —— کیوں ہے نا؟

تمہارا اسد

شاہین فاروقی

دو رباعیاں

احساس کی زنجیر ہلا دیتا ہے جذبات میں ہلچل سی مچا دیتا ہے
دھوئے ہوئے مہتاب کی ضو پاشی میں یہ کون مری نیند اڑا دیتا ہے

منظور ہر اک ظلم کئے جاتا ہوں! سہتا ہوں الم زہر پئے جاتا ہوں!
جینے کی امید؟ اور زمانے کے یہ طور میرا ہی جگر ہے کہ جئے جاتا ہوں!

تحسین سروری

مداری

ڈھل گیا سورج تپش کم ہو گئی لیکن ابھی ! خاک کے سینوں میں سوزاں ہے مسلسل آگ سی
دوپہر ڈھل کر یہ عالم ہے در و دیوار کا موت پر ہو آسرا جیسے کسی بیمار کا
یہ محلہ جس میں نوے فی صدی مزدور ہیں سرخوشوں کو جانتے ہیں سرخوشی سے دور ہیں
آگے ملتا ہے جہاں دو تنگ کوچوں کا سرا اور وہیں سے ایک ہو کر بڑھ گیا ہے راستا

اک مداری اس طرح دکھلا رہا ہے اپنا کھیل
پڑ رہی ہے دل میں بچوں کے خوشی کی داغ بیل

ان کے بچوں کے کہ جن کی زندگی کی شاہراہ کوئی سرمایہ نہیں رکھتی بجز فریاد آہ
بے کلی نے صبر کے رستے پہ ڈالا ہے جنھیں بےبسی نے ضبط کے سانچے میں ڈھالا ہے جنھیں
جن کے حصے کا کہیں خوفِ خدا باقی نہیں منصفی میں جن کے حق کا فیصلہ باقی نہیں
جن کی مایوسی نہیں رکھتی خوشی کی آرزو ! بے طرح ارزاں ہے جن کے دست و بازو کا لہو

اے مداری گائے جا دفلی بجا کر گائے جا
ان غریبوں کے جگر پاروں کے دل بہلائے جا

جانے پھر ان کو کشاکش یہ تبسم دے نہ دے ڈگڈگی کی تال، ہنسی کا ترنم دے نہ دے
ان کے ہونٹوں پر نہ جانے پھر ہنسی آئے نہ آئے زندگی پر آب و رنگِ زندگی آئے نہ آئے؟
جانے ان کو وقت کوئی قہقہہ دے، یا نہ دے؟ خودغرض قانون محنت کا صلہ دے یا نہ دے؟
ان کی فہرستِ پریشانی میں راحت ہو نہ ہو عمر بھر پھر ان کو یوں ہنسنے کی فرصت ہو نہ ہو

ان کی ظلمت میں فرشتے روشنی لکھتے نہیں
بھول کر فردِ جوانی میں خوشی لکھتے نہیں

احسان دانش

یہ دنیا

میرا سہاگ اس وقت لٹا جب کہ بچپن شباب سے اٹھکھیلیاں کر رہا تھا اور میں عورت کہلانے سے پہلے ہی بیوہ کہلانے لگی۔

اپنے ننھے شوہر سے بچھڑے ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خالہ بی نے مجھ کو کسی اور کے ہاتھوں بیچ ڈالنے کی ٹھانیں۔ مجھے یہ سگائی پسند نہ تھی۔ اپنا پیارا ساجد رہ رہ کر یاد آنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا تھا۔ سب کی چوری اچھی اچھی چیزیں لا کھلاتا، میں اور وہ سینما میں۔۔۔ دیکھے ہوئے کردار تنہائی میں دہراتے تھے۔ میں فلم کی ہیروین اور وہ ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

لیکن بیت گئے وہ دن ——————!

ہم ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے تھے، دو ننھے دوستوں کی طرح۔ حالانکہ سماج ہمیں شادی کے بندھنوں میں باندھ چکا تھا۔ پھر بھی ہم اس کی آلائشوں سے پاک تھے۔ اس لئے کہ میں ابھی ننھی تھی اور ساجد بچہ۔

خالہ بی نے —— مجھے ایک دولت مند بوڑھے سے بیاہ دیا۔ کتنا ظلم ہے جوانی کو بڑھاپے کی آغوش میں سونپ دینا۔ وہ ہونٹ جو موت کا تلخ گھونٹ پینے کے قابل ہوں وہ کس لئے گلابی ہونٹوں سے رستی ہوئی شراب جوانی پئیں —————! اف! کتنا بڑا گناہ!!

لیکن مشرقی لڑکیوں کے منہ میں زبان ہو تو بولیں۔ ان کی زبان پر تو شرم کی مہر لگی ہوتی ہے اور دل میں سماج کی فرسودہ روایات کا خوف، وہ ہنسی خوشی اپنی آرزوؤں کو سماج کے نذر چڑھاتی ہیں۔ میں نے بھی اپنی قربانی چڑھائی، آہوں اور طوفانی اشکوں کے ساتھ۔

میرا "جوان نما" شوہر رنگین کپڑوں میں ملبے کا شیدائی تھا۔ روز داڑھی بنواتا، مونچھوں پر خضاب چڑھاتا، لمبی لمبی حنائی زلفوں میں "عروس بہار" ڈالتا اور چھیلا بنا رہتا۔ چندھیائی آنکھوں میں سرمہ لگائے، چکن کی اچکن اور تنگ مہری کا پاجامہ پہنے جیتا جیسے منہ میں گلوری دبائے مجھ سے نوجوانوں کی طرح چھیڑ کرتا۔ عمر سے ہر بات اچھی معلوم ہوتی ہے۔ بوڑھے سے اظہار محبت سن کر شرم نہیں آتی بلکہ تنفر پیدا ہوتا ہے۔ اپنے حسن کی تعریف سن کر جی خوش نہیں ہوتا بلکہ بیٹھا جاتا ہے۔ اپنے سے چھیڑ کرتے ہوئے دیکھ کر تغافل کو نہیں انتقام کو جی چاہتا ہے۔ میری حالت پنجرے میں پھنسے ہوئے پرندے کی سی تھی جسے نہ اڑنے پر ہوں اور نہ بھاگنے کے لئے جگہ۔ مجھے اس کی ہر بات نصیحت معلوم ہوتی تھی چاہے وہ ازدواجی ہی کیوں نہ ہو اور میں حافظ کے اس شعر پر عمل کرتی تھی جو شاید بچپن میں مولوی صاحب کے ہاں پڑھا تھا ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند　　جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را

وہ پیر دانا تھا۔ بخدا وہ باپ کہلانے کی تمام صلاحیتیں رکھتا تھا اور شوہر بننے کی صورت بھی نہیں۔ مجھ کو اس سے انتہائی نفرت ہو چلی تھی۔ ہر جذبے کی انتہا تضاد کیفیت پیدا کرتی ہے۔ میرا تنفر بھی محبت میں بدل گیا ——————؟

گرما کی شام تھی۔ چائے پی چکنے کے بعد اپنے گلاب کے باغیچے میں گلگشت کر رہی تھی۔ ابر پارے فضا میں کہیں کہیں اڑتے پھرتے تھے۔ ہواؤں میں کسی قدر خنکی آ چلی تھی۔ صنوبر پر مشرقی حرماں نصیب پرند چیخ رہا تھا۔

اس کی دلدوز چیخ نے میرا دل ہلا دیا اور میں بے تاب ہوگئی۔ آنکھوں سے دو نقرئی آنسو نکل پڑے۔ ساتھ ہی خشک لبوں سے سسکتی ہوئی آہ۔ طبیعت غیر ہوئی جاتی تھی، خود کو سنبھالنے کے لئے مرمریں نشست پر بیٹھنے کے لئے پلٹی ہی تھی کہ ——— ایک خوب رُو نوجوان میری طرف ٹکٹکی باندھے جانے کب سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں پریشان سی ہوگئی اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک ہی خیال تھا جو بار بار دل میں آرہا تھا کہ "میرے باغیچے میں یہ کون دیوانہ چلا آیا" ہیجانی کیفیت اس شدت سے طاری تھی کہ میں کچھ کہہ نہ سکی اجنبی نوجوان نے خود مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا "آداب عرض کرتا ہوں" میری پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر جرأت کرکے پوچھا "آپ کون؟"

"ناچیز جمیل" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"او ——— آپ ہیں جمیل میاں؟ کیوں کیسے آنا ہوا۔ اور آئے بھی تو اطلاع تک نہ دی۔ اسٹیشن پر آدمی بھیج دیا جاتا ——" میں نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا، جانے کیوں؟

وہ مسکرا پڑے اور شرارت سے کہا "اور کچھ پوچھئے گا؟ ایک ہی سانس میں اتنے سوال"

"تو ہرج ہی کیا ہے" میں نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں" وہ سنجیدہ بنتے ہوئے بولے "کالج میں چھٹیاں ہوگئیں، گھر لوٹنے کی بجائے ادھر چلا آیا" ذرا کی ذرا وہ رک گئے اور پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "اپنی نئی بھاوج کے درشن کرنے"

"تعطیلات یہیں گزاریئے گا"

"جیسی آپ کی مرضی"

وہ مشرقی لباس میں بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے پریشان اور دراز بال، ادبی لگاؤ، شاعرانہ مذاق اور رومان پسندی پر غمازی کر رہے تھے۔ سنہرے چشمے میں سے نرگسی آنکھیں چمک رہی تھیں، جوانی کے خون نے ان کی سانولی رنگت میں ایک دلکشی پیدا کردی تھی۔ ان کی جاذبیت میرے دل میں کھب گئی۔

وہ میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں انھیں گھور رہی تھی۔ نظریں نیچی ہونے سے پہلے ہی دلوں کے پار ہوگئیں ——— وہ افسانوی ہیرو معلوم ہوتے تھے۔

گرما بسر کرنے کے لئے ہم برفانی وادی "زیبان" میں آٹھیرے۔ آتشیں آفتاب نے افق کی گود میں اپنا منہ چھپا لیا تھا۔ لیلائے شب کے دراز گیسو "زیبان" کی رومان پرور فضا پر لہرانے لگے تھے اور اس کی کافوری پیشانی پر کے جھرجھر کرتے جوہر کی سنہری کرنیں صنوبر اور شمشاد کی چوٹیوں سے بوس و کنار کر رہی تھیں، میں اور جمیل میاں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ نرگس کوئی دلکش گیت گنگناتی آئی اور شربت کے بلوریں گلاس میز پر رکھ دیئے۔

میں نے سرخ سرخ شربت کا ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھتے ہوئے کہا "کیوں جمیل میاں! آج آبشار کی سیر کیسی رہے گی؟"

"بہت پرکیف" انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لیکن بھیا؟" "پڑے سوتے ہوں گے"

نرگس بول اٹھی " آبشار کی سیر کے ساتھ کشتی رانی ہو جائے تو کیا کہنے"
" واللہ لطف آجائے" جمیل تقریباً چیخ اٹھے۔
" دیکھنا نرگس ذرا ہوشیار رہو" میں نے ہدایت کرتے ہوئے کہا " صاحب بیدار ہو جائیں تو کچھ کہہ سن کر ٹال دیجو"
" تو ہم نہ چلیں" اس نے بسورتے ہوئے کہا
" کل ہمارے ساتھ چلنا، اچھی طرح سیر کرالائیں گے" جمیل میاں نے اس کو جواب دیا اس کے گالوں اور ہونٹوں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے گردن ہلا کر رضامندی ظاہر کی۔
میں جھنجھلا کر بولی " نہیں وہ آپ کے ساتھ نہ جائے گی" وہ بولے " کیوں آپ چلیں اور وہ بیچاری منہ دیکھا کرے"۔
" ہوں بےچاری ـــــ بڑا رحم آتا ہے نا آپ کو" میں خواہ مخواہ بگڑی جا رہی تھی۔ وہ مناتے ہوئے بولے " اچھا اب چلئے بھی۔ خفا ہونے کا یہ وقت بھی تو نہیں" ان کے اس جملے پر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ اپنے مضبوط ہاتھ میں میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔
عورت کتنی کوتاہ دل ہوتی ہے۔ اپنے محبوب کی نگاہ کسی اور پر پاتی ہے تو جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ بل کھاتی ہوئی ناگن کی طرح اس کے تیور زہریلے ہو جاتے ہیں۔ لیکن مرد! کتنے سادہ دل، کتنے سادہ لوح اور بھولے ہوتے ہیں۔
ہم دریائے سین کی طرف روانہ ہوگئے۔
صنوبر کے سایوں تلے ساحل پر پہونچ کر دو نشستہ طاؤسی کشتی کرایہ پر لی اور دھڑکتے دل کے ساتھ اپنا ننھا سفینہ مضطرب موجوں کے سپرد کر دیا وہ سفینہ کھے رہے تھے اور میں پانی کے نقرئی قطروں سے کھیل رہی تھی۔
" آپ نے تو چپ کی سادھ لی۔ کچھ بولئے نا" انھوں نے مجھ سے کہا۔ میں چپ کی رہی تو انھوں نے کہا " موسم بڑا سہانا ہے" " ہاں جمیل بڑی سہانی رات ہے۔ لیکن .... "
" لیکن کیا" انھوں نے فوراً سوال کیا۔
یہ مسکراتا چاند، ساکت و صامت دریا، خوابیدہ ننھی ننھی موجیں اور ہچکولے کھاتا ہوا سفینہ۔ پھر اس سفینے کے تم کھیون ہار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کسی خوابوں کے جزیرے میں اڑے جاتے ہیں" کہتے کہتے میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔
انھوں نے چپو رکھ دئے۔ " ہاں بھابی جان زندگی ایک خواب ہی تو ہے اور ہماری ـــــ خصوصاً میری زندگی تو " ایک خواب ہے کسی دیوانے کا"۔
" یہ خصوصاً میں" کے کیا معنی، بات تو ہماری ہو رہی تھی"۔
" ہاں ہو تو رہی تھی، لیکن انسان اپنے ہی متعلق کچھ کہہ سکتا ہے جو خود اپنی زندگی کی گتھیاں نہ سلجھا سکا ہو وہ کسی اور کی زندگی پر کیسے حکم لگا سکتا ہے"۔
کیوں نراس ہو اپنی زندگی سے، ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے ـــــ " میری آواز حلق میں پھنسنے لگی اور میں چپ ہو رہی وہ کہنے لگے۔

"بس جو بھی دیکھا بہت دیکھا' کاش اندھا ہوتا وہ بھی نہ دیکھ سکتا!"

کیوں بہکی بہکی باتیں کئے جا رہے ہو۔ میرا دل دھڑک رہا ہے للّٰہ ایسے شگون زبان سے نہ نکالو"

وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے کہا "اک ذرا میرے قریب آجاؤ جمیل" وہ ذرا کی ذرا جھجکے پھر قریب آگئے۔

"اور قریب آجاؤ نا' لیٹ جاؤ' تمہیں سکون کی ضرورت ہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا وہ بچوں کی طرح میری گود میں لیٹ گئے اور آنکھیں بند کرلیں۔ میں نے ان سے کہا "جمیل کوئی گیت سناؤ گے"

"نا" وہ کچھ کھوئے کھوئے انداز میں بولے۔ تو کوئی رومانی نظم ہی سہی ——— وہ "آتشکدہ" ہے نا مخدوم کی وہی سنادو" میں نے پیار بھرے انداز میں فرمائش کی۔

وہ ایک لمحہ تک ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے پھر بولے "یہ رومانی نظارے' تنہائی' قرب' شعر اور موسیقی۔! آخر!! بخدا میں اس کی تاب نہیں لاسکتا۔ کیوں امتحان لے رہی ہو میرا ——— بخدا اس ساز کو نہ چھیڑو جس میں فریاد مچل رہی ہو۔ وہ یک بہ یک اٹھ بیٹھے اور کہنے لگے "چلئے۔ اب ہمیں لوٹ جانا چاہئے"

صبح خوش گوار تھی "زیبان" میں آفتاب کی نرم اور سنہری کرنیں غذائیت کی طرح ضروری ہی نہیں بلکہ دلفریب مناظر کی جاذبیت بڑھانے کے لئے لازمی ہیں۔ دریائے "سین" کی ننھی ننھی موجیں "منزل" (میری قیام گاہ) کی سنگین دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ بادبانی کشتیاں آ اور جا رہی تھیں۔ دور سے آنے والی کشتیوں کے سفید مستول کسی ہندوستانی بیوہ کے آنچل کی طرح سسک سسک کر لہرا رہے تھے۔ رومان پسند سیاحوں کی حسین ٹولیاں گھومتی پھرتی تھیں۔ ہر طرف شادمانی ہی شادمانی تھی۔ پتے پتے اور بوٹے بوٹے پر مسرت جھلک رہی تھی۔

جمیل میاں آبنوسی دریچے کی چوکھٹ پر کہنیاں ٹیکے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ ان کے سیاہ دراز بال مچل مچل کر سانولے سلونے گالوں کی بلائیاں لے رہے تھے۔ میں قہوہ بنارہی تھی۔ جب تیار کرچکی تو وہ بھی آگئے اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "کتنی حسین ہے یہ وادی! جی میں خواہ مخواہ چاہت کی امنگ پیدا ہوتی ہے" نرگس نے جو پاس ہی کھڑی قہوہ میں شکر ملا رہی تھی، کن آنکھیوں سے مجھے تاکتے ہوئے سوال کیا "کس سے بابو صاحب"

میں جھلا کر چیخ اٹھی "تجھ سے چڑیل"

وہ سنجیدہ سی ہوگئی۔ جمیل میاں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا "اس حسین وادی' نقرئی جھیل' لہلاتے سبزے' تھرکتی موجوں' جھاگ اڑاتے ساحل' جگ مگ جگ مگ کرتے چاند' جھل مل جھل مل کرتے تاروں غرض اس خوابوں کے جزیرے کے ذرہ ذرہ کو چاہنے اور ہوسکے تو چاہے جانے کی آرزو ہے نرگس"

"او مائی درڈاز درتھ" میں نے جملہ چست کیا۔

"تو اظہار تعشق ہو رہا تھا" جمیل میاں کے بھیا نے غصہ میں کانپتے ہوئے کہا۔ شاید انھوں نے صرف آخری جملے سنے تھے"

"کیا کہہ رہے ہیں آپ" جمیل حالت استعجاب میں کہہ اٹھے۔

"میرے گھر میں میری نظروں کے سامنے اور میری بیوی سے اظہار محبت کر رہے ہو اور پوچھتے ہو کیا کہہ رہے ہیں آپ! اللہ رے بے باکی!! اپنے بھائی کے گھر پر ڈاکہ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں"

"بھیا"

"بس خاموش ــــــ جواب سے بھیا کہا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے ــــــ اسی وقت"

جمیل بھی بگڑ گئے "ہاں چلا جاؤں گا ــــــ لیکن بھیا' شرم آپ کو آنی چاہیئے نہ کہ مجھے۔ شرم اس کو آنی چاہیئے' جس نے کسی کی زندگی پر ڈاکہ ڈالا ہے' کسی کے جذبات سے کھیلا ہے اور کسی کے سازِ زندگی کو چور چور کر دیا ہے صرف اس آرزو میں کہ شاید اس سے کوئی نغمہ نکلے تو تعیش سماعت ہو۔ جس طرح رباب پر ایک فن کار ہی کی انگلیاں راگ راگنیاں پیدا کر سکتی ہیں' اسی طرح حسن کے ساز کو جوانی ہی ہم آہنگ زیست کر سکتی ہے ــــــ کاش آپ کے خشک بازو کسی کی مینائی گردن میں حمائل ہونے سے پہلے ہی شل ہو جاتے۔ آپ کے خشک ہونٹ کسی کے آتشیں لبوں کو چھیڑنے سے قبل ہی بے حس ہو جاتے اور آپ کے جذبات شہوانی' جوانی سے ہم آغوش ہونے سے پہلے ہی فنا ہو جاتے ــــــ" کہتے کہتے وہ کمرے سے چلے گئے۔ اسی شام کی گاڑی سے وہ وطن لوٹ گئے۔

وہ چاہے کس قدر ہی مختصر ہو
محبت کی جوانی زندگی ہے

محبت کا خواب کتنا سہانا اور کس قدر ناپائیدار ہوتا ہے۔ کاش زندگی ایک ننھا سا حسین خواب ہی بن جائے۔ لیکن ظالم فطرت کو کیوں قرار آنے چلا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ذوقِ فنا انگڑائیاں لیتا رہتا ہے اور شاید فطرت کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ وہ ناپائیدار ہے۔ عبدیت اور عبودیت کا بے نام فرق یہیں جا کر ختم ہوتا ہے۔ حسن کا بھی خالق' حسنِ ازل بھی خالق' اس کی مخلوق بھی فانی اس کے نقشہ کار بھی فانی ــ

نہ تو اور نہ میں اور نہ وہ جاودانی
ازل کے مصور کا ہر نقش فانی

ارے توبہ' رہنے بھی دو اس خالق و مخلوق اور بقا و فنا کی الجھنوں کو میں کہہ رہی تھی جمیل میاں کو گئے چار سال بیت گئے۔ انھوں نے بھلا دیا یہ تو میں کہہ نہیں سکتی۔ ہاں میں نے انھیں ابھی تک دل میں بسائے رکھا تھا اور اگر انھوں نے بھلا دیا ہو تو اس میں ان کا کیا قصور ا ــ

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آسکے
تم نے ہمیں بھلا دیا' ہم نہ تمہیں بھلا سکے

یوں بھی یاد اور بھول اضافی چیزیں ہیں' محبت سے ان کا تعلق؟ ہاں تو چار سال بعد کی بات ہے کہ ان کی شادی کا دعوت نامہ ملا۔ ہمیں بلایا تھا۔ میں بہت خوش تھی۔ شاید ان بیاہی لڑکی بھی آرزوئے وصل کی لطیف چٹکیوں سے دل ہی دل میں اتنا خوش نہ ہوتی ہوگی۔ کیوں نہ خوش ہوتی میرے جمیل کی شادی تھی نا۔ شادی کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو' وہ میرا محبوب ہی تو تھا۔ مجھے خود دیکھئے شادی ہوئی بڑے بھائی سے اور دل ہارا ننھے جمیل سے۔

"بوڑھے" کو میرے انبساط پر بہت اچنبھا ہوا اور انھیں یقین ہو چلا کہ مجھے جمیل سے کوئی تعلق خاطر نہیں اس لئے وہ شادی میں شریک ہونے پر راضی ہو گئے۔

سورج کی زرد شعاعیں نیم جان پتوں پر پھیل رہی تھیں۔ شہتوت اور دیوار کے دراز سائے وحشت ناک معلوم ہوتے تھے۔ خشک ٹہنیوں اور سوکھے پتوں کی رگڑ سے جو آواز نکلتی ایسا معلوم ہوتا تھا مرثیہ خوانی ہو رہی ہے۔ ہوا کے گرم جھونکے اس اداس فضا کو اور بھی بھیانک بنا دیتے تھے۔ ہر طرف وحشت اور ہر سمت خوف و ہراس طاری تھا ——— جیسے دنیا ماتم کدہ بنی ہوئی ہے۔

جمیل میاں کے مکان پر سناٹا چھایا ہوا تھا نہ در پر دربان نہ باغیچہ میں مالی، نہ چہل پہل نہ شور ہنگامہ، نوبت کی آواز نہ شہنائی کی سریلی دھن، نہ ڈھول کی تھاپ نہ ڈومنیوں کا گانا ——— پھرا ما تھا ٹھنکا۔ خشک اور بوڑھے درختوں پر الو.... چیخ اٹھا — میرا جی بیٹھ گیا، نبضیں چھوٹ گئیں۔ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ لیکن کانوں میں کسی کی جانی پہچانی آواز آ رہی تھی جیسے کوئی کہہ رہا ہو "بھابی جان ——— میری جان، تمہارا کب سے انتظار ہے۔ آبھی جاؤ، دیکھو نا ہم ایسے میں بھی تمہیں کو یاد کر رہے ہیں"۔ قدم اٹھ گئے اور میں دوڑنے لگی۔ زور سے بہت تیز۔ کبھی اتنی تیزی سے نہیں دوڑا تھا۔ وہ تو خیر گزری ڈرائنگ روم میں جمیل میاں کی ممانی گئیں اور میں سنبھل گئی۔ سانس پیٹ میں سمانے لگا تو منہ سے نکل گیا "جمیل میاں"

کہاں کا سلام کیسا پیام، کیسی خیر و عافیت اور کدھر کی مبارک سلامت۔ شاید ہونی کو حیات پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ایک آہ کھینچی، آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ کہنے لگیں ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہئے

بس اس کو تو تمہارا ہی انتظار تھا۔ "یعنی آپ کیا کہہ رہی ہیں"

"سچ کہہ رہی ہوں بیٹی" ان کی آنکھوں سے گنگا جمنا ابل پڑی اور سسکیوں کے درمیان رکتے رکتے کہا "آٹھ دن پہلے بھلا چنگا تھا۔ ادھر شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں ادھر اس کے دشمن بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں تپ دق ہے، مرض پرانا ہو چلا ہے، اندر ہی اندر گھن لگ گیا ہے۔ زندگی کی کوئی امید نہیں اور کل تو ڈاکٹر جاوید نے اے۔ پی کے بعد بالکل نراس کر دیا"۔

میں بے قابو ہو کر بولی "ان ڈاکٹروں کا کیا کہنا، یہ تو خدائی فوجدار ہیں، جسے چاہا مار ڈالا، جسے چاہا چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔ زندگی اللہ کے ہاتھ ہے، میرا معبود ضرور انھیں بچالے گا، اس اٹھتی جوانی پر ضرور ترس آ جائے گا اُسے"!

"نہیں بیٹی، موت بوڑھے اور جوان کو تھوڑا ہی دیکھتی ہے۔ بس جس کی سر گئی وہ سدھارے۔ لیکن میرا جمیل کہتا تھا کہ نہیں ڈاکٹر! میں آج نہیں مر سکتا ——— اس کے آنے تک میں زندہ رہوں گا۔ کوئی قوت مجھے نہیں مار سکتی۔ زندگی صرف چند ساعتوں کے نظام ہی کا نام تو نہیں بلکہ زندگی ایک نظام نامے کے تحت چلتی ہے۔ دیکھو میرے ذمے ایک اور کام رہ گیا ہے۔ اسے پورا کر لوں تو سدھار دوں، چاہے اس کے پورا ہونے میں کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو ——— میں نہ مروں گا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے کمرے کی طرف چل پڑیں۔

جمیل آنکھیں بند کئے بستر علالت — نہیں، نہیں بستر مرگ پر پڑے تھے۔ بس ہڈیاں ہی ہڈیاں اور اور سانس ہی سانس باقی تھی۔ قدم کی آہٹ پر انھوں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چشم شہلا، اب چشم بیمار ہو گئی تھیں۔ بخدا میں تاب نہ لا سکی۔ لیکن کیا کرتی چپ ہی رہی، وہ آہستہ آہستہ بولے۔ ع "بہت دیر کی مہرباں آتے آتے"

پھر اپنے سوکھے ہوئے ہاتھ میری طرف بڑھا دئے۔ میں اپنے آپ کو ان کی آغوش میں سونپ دیا۔ انہوں نے اپنی ناتواں انگلیاں میرے بالوں میں پھیرتے ہوئے "بھابی جان ہمیں یہ خیال ہو چلا تھا کہ کہیں ہماری روح قبر کی تاریکیوں میں میرؔ کا یہ شعر نہ دھراتی رہے ؎

بعد مرنے کے مری قبر پہ آیا وہ میرؔ
یاد آئی مرے عیسیٰ کو دوا میرے بعد

لیکن تم آ ہی گئیں۔ کتنا خیال ہے ہمارا"

انہوں نے اپنی آغوش میں مجھے بھینچ لیا۔ مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری تھی۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اس ایک لمحے کے لئے ساری کائنات میرے اختیار میں ہے اور ہماری محبت پھیلتے پھیلتے کون و مکاں پر چھا گئی ہے ——— لیکن ان کے ہونٹوں کا ارتعاش ساکت ہوگیا اور باہوں کی گرفت اور سخت، مضبوط اور روح نواز ———

حسینی شاہد

گھٹائیں

سر کہسار گھٹاؤں کا بھٹکنا توبہ!
دل میں طوفان نہ بیدار کہیں ہو جائے
آم کے پیڑ پہ کوئل کا چہکنا توبہ!
یہ نہ ہو پھر مجھے جینے کا یقیں ہو جائے
میری خوں گشتہ تمنا کا بھٹکنا توبہ
کشتیٔ عمر نہ ساحل کے قریں ہو جائے

سرِ مژگاں کوئی آنسو نہ ڈھلک آئے کہیں
اس سے پیماں ہے اسیری میں جیوں گا تا زیست
جام خود ساقیٔ فطرت ہی جو بھر لائے کہیں
نہ پیوں گا، نہ پیوں گا، نہ پیوں گا تا زیست

موج و گرداب مرے شوق کی تصویریں ہیں
ان جواں مرگ ارادوں کی تباہی توبہ!
ہائے بے بس ہوں مرے پاؤں میں زنجیریں ہیں
سر کہسار گھٹاؤں کی سیاہی توبہ!
دل میں طوفان نہ بیدار کہیں ہو جائے
یہ نہ ہو پھر مجھے جینے کا یقیں ہو جائے

افسر آذری
(امرتسر)

تنقید و تبصرہ

نادرات شاہی از شاہ عالم بادشاہ ۔ مرتبہ ۔ امتیاز علی خاں عرشی ۔ ناشر کتاب خانہ رامپور ۔

ابو المظفر جلال الدین محمد شاہ عالم ثانی ہندوستان کے آخری مغل بادشاہوں میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کی سند عطا کرکے انھوں نے اس ملک میں برطانوی سلطنت کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ ان کی زندگی بہت پریشانیوں میں گزری اور آخرکار غلام قادر خاں نے ان کو بینائی سے بھی محروم کردیا تھا۔

شاہ عالم فارسی، اُردو اور ہندی تینوں زبانوں کے ادیب اور شاعر تھے اور یہ کتاب نادرات شاہی ان کے اردو اور ہندی کلام کا ایک مجموعہ ہے، جو اصل شاہی مسودے کی ترتیب کے مطابق ہندی اور اُردو دونوں رسم الخطوں میں شایع کیا گیا ہے۔

کتب خانۂ ریاست رامپور کی دوسری مطبوعات کی طرح یہ کتاب بھی خاص اہتمام کے ساتھ اردو اور ہندی ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور ابتدا میں تقریباً ساٹھ صفحات کا ایک مقدمہ مولوی امتیاز علی عرشی نے قلم بند کیا ہے جس میں بادشاہ کے حالات اور کتاب کی خصوصیات وضاحت سے بیان کی ہیں۔ یہ کام بہت سلیقے اور تلاش و تحقیق کے ساتھ کیا گیا ہے اور اس کے لئے مرتب کی جتنی بھی قدر افزائی کی جائے کم ہے۔

اصل مجموعے میں جو غزلیں شریک ہیں وہ زیادہ تر اُردو ہی ہیں البتہ ان کو ناگری رسم الخط میں بھی لکھا گیا ہے لیکن محض رسم خط کی وجہ سے ان اردو غزلوں کو ہندی غزلیں نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ حصۂ غزلیات کے بعد جو نظمیں اور دوہے شامل ہیں وہ سب ہندی میں ہیں اور ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ عالم کو ہندی کا بھی بڑا اچھا ذوق حاصل تھا اور اس زبان پر بھی انھوں نے بڑی حد تک قابو حاصل کرلیا تھا۔

اس مجموعے کی اشاعت سے یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اکبر اور جہانگیر نے ہندو مسلم اتحاد کی جو بنا ڈالی تھی وہ مغلوں کے آخری تاجداروں کے زمانے میں بھی مستحکم تھی۔ اور مغل بادشاہ اپنی مسلمان اور ہندو رعایا دونوں کے ادب اور کلچر سے بخوبی واقفیت رکھتے تھے۔

اقوال اہل بیت نبی مختار از سید محمد حسین جعفری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن۔

یہ تقریباً پانچ سو ساٹھ صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں علامہ مجلسی کی مشہور عربی کتاب بحار الانوار کی جلد اول کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔

بحار الانوار امامیہ مذہب کی ایک بلند پایہ کتاب ہے جس میں حضرات ائمۂ معصومین کے اقوال سے مختلف دینی و دنیوی علوم اور احکام کو منضبط کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کی پہلی جلد میں زیادہ تر علم و عقل سے متعلق حضرات ائمۂ معصومین کے اقوال درج ہیں۔ بحار الانوار کی دوسری بعض جلدوں کا ترجمہ اُردو میں ہوچکا ہے لیکن پہلی جلد کا ترجمہ اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ ترجمے سے قبل مولوی محمد حسین جعفری صاحب نے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے جو بجائے خود ایک کتاب ہے اور جس میں انھوں نے ائمۂ طاہرین کے حالات اور تاریخی واقعات پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس مقدمے کے بعد خود علامہ محمد باقر مجلسی کے حالات تقریباً پچاس صفحات میں لکھے گئے ہیں اور ان تمام ابتدائی اوراق کی ترتیب میں مصنف نے بڑی محنت اور جانکاہی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا یہی ابتدائی حصہ اصل ترجمۂ بحار الانوار سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ محمد حسین جعفری صاحب کو عربی سے اردو میں ترجمہ کرنے کے لئے اتنی دقت محسوس نہیں

ہوئی ہوگی جتنی کہ اس کتاب کے مقدمے کی تالیف میں ہوئی ہے۔ مناسب ہوگا کہ آئندہ وہ اپنے مقدمے کو ایک علحدہ کتابی شکل میں شایع کریں کیونکہ اس میں جملہ ائمۂ اثنا عشر کے تفصیلی حالات شامل ہوگئے ہیں۔

موت و حیات از شاطر حکیمی۔ ناشر سی۔ پی اکیڈیمی ناگپور۔

شاطر حکیمی صوبۂ متوسط کے خوش فکر شعرا میں ایک اچھی جگہ کے مالک ہیں اور اپنے ترقی پسند رجحانات کے باعث عہد حاضر کے نوجوان اُردو شعراء کی صف میں شامل نظر آتے ہیں۔ وہ جس مقام پر پیدا ہوئے اور جہاں نشوونما پائی اس کے لحاظ سے ان کی یہ خصوصیات خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں۔ صوبۂ متوسط، دوآبۂ گنگ و جمن یا پنجاب یا دکن کی طرح اُردو زبان اور ادب کا مرکز نہیں سمجھا جاتا لیکن عہد حاضر میں اس سرزمین سے اچھے اچھے شاعر، انشاپرداز اور صحافت نگار پیدا ہوتے جارہے ہیں۔ جس کی وجہ سے یقین ہے کہ ایک روز یہ صوبہ بھی اُردو کے خدمت گزاروں کا مامن و مخزن ثابت ہوگا۔

شاطر حکیمی کا یہ مجموعۂ کلام ان کے تابناک مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ وہ نہ صرف ایک اچھے شاعر ہیں بلکہ زمانے کے رجحانات سے پوری طرح واقف بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں رنگا رنگی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ زبان پر بھی انھیں قابو حاصل ہے اور قافیوں اور ردیفوں میں ترنم پیدا کرنے کے راز سے بھی وہ بخوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی نظموں کے عنوان بھی بہت دلچسپ اور بے تکلف مقرر کئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کا یہ مجموعہ اُردو شاعری کی دنیا میں اپنی جگہ پیدا کرے گا۔

ہندوستانی معاشیات کے مبادی از شرف الدین بی اے (عثمانیہ)

ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ حیدرآباد

یہ ضخیم کتاب سلسلۂ مطبوعات انجمن طیلسانین عثمانیہ کی چودھویں کڑی ہے۔ اور اس کا پیش لفظ مولوی محمد حبیب الرحمن صاحب ناظم سررشتۂ تجارت و حرفت نے قلم بند کیا ہے۔

اس کتاب کی ترتیب میں اگرچہ انگریزی کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے لیکن برطانوی ہند کے علاوہ مملکت آصفیہ کی معاشی زندگی کے متعلق بھی جگہ جگہ حالات کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ کتاب سات ابواب پر منقسم ہے پہلا باب قدرتی ذرائع اور آبادی، دوسرا ہندوستان میں معاشی تغیر، تیسرا زراعت، چوتھا صنعتی ترقی۔ پانچواں حمل و نقل اور تجارت، چھٹا زر، قیمتیں اور بنک کاری اور ساتواں مالیات کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ بہرحال پوری کتاب علمی معاشیات کی ضروری معلومات سے مملو ہے اور چونکہ اسلوب بیان بہت سادہ اور سلیس ہے اس لئے توقع ہے کہ عام اُردو داں اس کے مطالعہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

شیرازہ از احسان دانش۔ ناشر۔ مکتبۂ دانش مزنگ لاہور۔

احسان دانش پنجاب کے مشہور شعراء میں سے ہیں اور اب تک ان کے کلام کے کئی مجموعے شایع ہوچکے ہیں۔ جن میں سے بعض پر اس رسالے میں تبصرہ بھی شائع ہوچکا ہے۔ یہ ان کا ایک جدید مجموعہ ہے جو غلام معین الدین ای سی ایس کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اس کو آتش گل، داغوں کے پھول اور جھنکارین کے عنوانات کے تحت تین حصوں پر منقسم کیا ہے۔ پہلے دو حصے نظموں پر مشتمل ہیں اور آخری حصہ غزلوں کا مجموعہ ہے۔

احسان دانش شاعر مزدور کے لقب سے مشہور ہیں اور اس وقت سے مزدوروں کی ترجمانی کرتے آئے ہیں جب کہ جدید ترقی پسند شعراء کا گروہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کے کلام میں جوش اور اثر دونوں موجود ہیں اور وہ حزن و ملال کی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کا یہ مجموعہ بھی ان کی شاعری کے جدید رجحانات کا دلچسپ نمائندہ ہے اور توقع ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

موجودہ جنگ کے اثرات قانون بین الممالک پر

از رشید صدیق حسین بی اے - ایل ایل ایم ناشر انجمن طیلسانین عثمانیہ - حیدرآباد -

یہ اس انجمن کے سلسلۂ مطبوعات کی پندرھویں کڑی ہے اور اصل وہ مقالہ ہے جو جامعۂ عثمانیہ کے امتحان ایل ایل ایم کے لئے قلم بند کیا گیا تھا - اس میں کوئی پچاس عنوانات کے تحت قانون بین الممالک سے متعلق ضروری اور تحقیقی معلومات درج ہیں اور خاص طور پر فلسطین، شام اور لبنان اور حیدرآباد میں یوروپینوں اور امریکیوں کو جو خصوصی مراعات حاصل ہیں ان کے متعلق معلومات دلچسپی کا باعث ہوں گی -

ہندوستانی ساہتیا

از برج لال - مطبوعہ چشتیہ پریس حیدرآباد -

برج لال صاحب کو اردو کی خدمت کا ایک اچھا ذوق حاصل ہے انھوں نے مختلف اصحاب کے مضامین کے مجموعے شایع کرنے شروع کئے ہیں - چنانچہ زیر نظر مجموعے میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا مضمون "ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم" کے عنوان پر اور کرشنا سوامی صاحب مدیراج کا مضمون "پربھو کی تلاش" قابل ذکر ہے - پہلا معلومات کے لحاظ سے بہت مفید ہے اور دوسرا اپنے دلچسپ اسلوب بیان کی وجہ سے دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا - آخری مضمون خود برج لال صاحب کا ہے جو "اسلام اور ہندوستان" کے عنوان پر لکھا گیا ہے - برج لال صاحب کا خیال ہے کہ ایسے ہی چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف اصحاب سے مرتب کرا کے شایع کریں - ان کی یہ کوشش قابل قدر ہے اور توقع ہے کہ ان کی قدر افزائی کی جائے تو وہ اردو کے لئے مفید خدمت انجام دے سکیں گے -

"ق"

سرگزشت حاتم

دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعراء شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے - اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے - ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا - ان کی زندگی کی طرح ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی - تشنگان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے - صفحات (۱۲۸) طباعت و کتابت دیدہ زیب قیمت عہ

ملنے کا پتہ: - سب رس کتاب گھر رفعت منزل خیرت آباد حیدر آباد دکن

ہندوستانی تمدن

از پروفیسر ڈاکٹر ایشورا ٹوپا - ڈی فل پروفیسر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے - اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی - جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہوں اس کو ضرور پڑھیں -

صفحات (۴۸۰) قیمت سے

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر رفعت منزل

خیرت آباد حیدرآباد دکن

ادارے کی خبریں

روئداد مجلس عاملہ شعبۂ نسواں

شعبۂ نسواں کی مجلس عاملہ کا اجلاس بمقام دفتر ادارہ بتاریخ ۹ اردی بہشت ۱۳۵۵ف م یکم اپریل [illegible] بروز یکشنبہ بوقت ۹ ساعت شام منعقد ہوا۔ اور حسب ذیل ارکان نے شرکت کی۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ نکہت النساء بیگم صاحبہ، محترمہ تصدق فاطمہ بیگم صاحبہ، محترمہ سعید النساء بیگم صاحبہ، محترمہ رفیعہ سلطانہ بیگم صاحبہ اور معتمد شعبہ۔

محترمہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے اس سے قبل محترمہ سلطانہ عزیز صاحبہ کا نام رکنیت شعبہ کے لئے پیش کیا تھا اس اجلاس میں انھیں لے آئیں۔ موصوفہ کی کارکردگی کے لحاظ سے معتمد نے شعبہ کی مجلس انتظامی کی رکنیت کے لئے ان کا نام پیش کیا جس کو جملہ ارکان نے بخوشی منظور کیا۔

دوسرے ارکان نے جو شریک اجلاس نہ ہو سکے تھے، معذرت کے خطوط روانہ کئے۔ اجلاس کا آغاز توثیق روئداد سابقہ کیا گیا اس کے بعد حسب ذیل امور پر غور رہے۔

مدرسہ بالغات اڈیکمیٹ کی سرکاری امداد سے دست برداری کا مسئلہ معتمد نے بتلایا کہ تنہا معتمد کا اختیاری نہیں ہو سکتا جیسا کہ سابقہ اجلاس میں طے پایا۔ اس لئے دوبارہ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ معتمد نے اپنی رائے دیتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ سردست امداد سے دست بردار نہ ہوں بلکہ اس رقم کو اس دوسرے مدرسہ کے نام منتقل کروادیں جس کے قیام کے بارے میں ارکان سے حسب ایجنڈا مشورہ لیا جانے والا ہے۔

مدرسہ کے لئے سلطانہ عزیز صاحبہ تصدق فاطمہ صاحبہ اور رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے فنڈ اکرکے رقم فراہم کرنے کا وعدہ فرمایا۔ اور رفیعہ سلطانہ صاحبہ نے چند ملکے فدیہ بھی [?] رقم جمع کرنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد حسب ذیل ایجنڈا پر غور کیا گیا۔

(۱) رپورٹ ذیلی مجالس (۲) قیام مدرسہ رکاب گنج اور سرپرستی شعبہ۔ (۳) گوشوارہ جمع و خرچ (۴) دیگر امور۔

(۱) ذیلی مجالس:- تصدق فاطمہ صاحبہ داعی بزم ادب نے معتمد کے خط کے وصول نہ ہونے کا اظہار کیا اور اسی باعث لطیف النساء بیگم صاحبہ سے بھی ملاقات نہ کر سکنے کی معذرت کی۔ رپورٹ وہ اس دفعہ پیش نہ کر سکیں کیونکہ امتحان کی وجہ بہت مصروف رہیں۔

رفیعہ سلطانہ صاحبہ داعی ادب نسواں نے آئندہ اجلاس پر اپنی روئداد پیش کرنے کا وعدہ کیا۔

سعیدہ منظور صاحبہ داعی تعلیم و ترقی نسواں بوجہ ناسازی مزاج شریک نہ ہو سکیں۔ محترمہ نصرت النساء بیگم صاحبہ کا ایک خط جو بذریعہ بشیر النساء بیگم صاحبہ معتمد کے نام وصول ہوا تھا پڑھ کر سنایا گیا جس میں موصوفہ نے ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور ارباب شعبہ سے درخواست کی تھی کہ اس کی سرپرستی قبول کریں۔ سردست مدرسہ کے لئے محترمہ بیگم صاحبہ جمعدار عبدالجبار نے اپنی ڈیوڑھی دینے کا وعدہ کیا ہے۔

غور کرنے کے بعد ارکان نے طے کیا کہ سرپرستی قبول کرلی جائے لیکن مالی امداد سے معذوری کا اظہار کردیا جائے۔

معتمد نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر نصرت النساء بیگم نے مدرسہ کو بحسن و خوبی چلا لیا تو اس رقم سے جو بالغات اڈیکمیٹ کو مل رہی ہے بجائے دست بردار ہونے کے اس مدرسہ کے نام منتقل کرنے کی کارروائی کیجائے۔ اس رائے سے جملہ ارکان نے اتفاق کیا۔ اس ضمن میں معتمد سے درخواست کی گئی کہ جلد از جلد نصرت النساء بیگم کو اطلاع دیدیں کہ شعبہ کی سرپرستی میں دوشنبہ ۹ خورداد ۱۳۵۵ف کو مدرسہ کا افتتاح مقرر کریں۔

دیگر امور:-

رفیعہ سلطانہ صاحبہ کی تحریک پر کہ چندۂ رکنیت بجائے ماہانہ

سہ ماہی کر دیا جائے پر غور کیا گیا اور طے پایا کہ چندہ سالانہ کی ادائی ارکان کی سہولت اور مرضی پر ہو کہ جس طرح وہ ادا کریں چندے کی کتاب میں نام درج کر دیے جائیں گے اور چندوں کی ادائی سہ ماہی ششماہی یا سالانہ جس طرح چاہیں ارکان کر سکیں گے۔

روئداد مجلس انتظامی اردو امتحانات

اردو امتحانات
ادارۂ ادبیات

اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس یکشنبہ ۲ خورداد ۱۳۵۴ف مطابق ۸ اپریل ۱۹۴۵ء صبح ساڑھے نو بجے نظام کالج میں منعقد ہوا۔

حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

(۱) مولوی سید علی اکبر صاحب پرنسپل نظام کالج۔ صدر
(۲) مولوی محمد سجاد مرزا صاحب پرنسپل عثمانیہ ٹریننگ کالج نائب صدر۔
(۳) مولوی فضل حق صاحب پروفیسر انگریزی نظام کالج۔
(۴) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔
(۵) مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ریڈر تاریخ جامعہ عثمانیہ۔
(۶) مولوی ملا فخر الحسن صاحب لکچرار عثمانیہ ٹریننگ کالج۔
(۷) مولوی میر محمد عالم صاحب مددگار ناظم تعلیمات۔
(۸) مسٹر شام سندر صدر انجمن پست اقوام۔
(۹) مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مددگار ناظم رجسٹریشن واسٹامپ۔
(۱۰) مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار اردو سٹی کالج۔
(۱۱) مولوی خواجہ حمید الدین صاحب ایم اے مہتمم ادارہ۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد پڑھی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔

۲۔ اردو امتحانات کے مرکز بمبئی کی یہ تحریک پیش ہوئی کہ "زبان دانی کے اختیاری مضامین میں ترجمے کے لئے گجراتی زبان کو بھی جو بمبئی کی عام زبان ہے شامل کر لیا جائے۔"

طے پایا کہ اگر مرکز بمبئی سے اس امتحان میں پچیس یا اس سے زیادہ تعداد میں ایسے امیدوار شریک ہوں جو بطور مضمون انتخابی گجراتی ترجمہ لیں تو اس کا پرچہ مرتب کیا جائے۔

۳۔ ممتحنین کے معاوضے کے سلسلے میں پرچہ مرتب کرنے اور پرچے کو جانچنے کے لئے علیحدہ علیحدہ معاوضہ مقرر کرنے کا مسئلہ زیر بحث رہا۔ اور طے پایا کہ امتحانات کی فیس چونکہ بہت قلیل رکھی گئی ہے اس لئے موجودہ معاوضے میں تبدیلی مناسب نہیں ہے۔ البتہ سال حال جملہ امیدواروں کی درخواستیں وصول ہو جانے پر اگر یہ معلوم ہو کہ ان کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے تو اس مجلس انتظامی کی ذیلی کمیٹی معاوضے کی شرح میں حسب ضرورت ترمیم کرے۔

۴۔ ۱۹۴۵ء کے پہلے امتحانات کے لئے ممتحنین کا تقرر عمل میں آیا۔

روئداد مجلس انتظامی

ادارۂ ادبیات اردو کی

مجلس انتظامی کا اجلاس بتاریخ ۱۶ خورداد ۱۳۵۴ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۵ء شام کے ساڑھے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا۔

حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر
" نواب معین نواز جنگ بہادر
" مولوی سید علی اکبر صاحب
" مولوی عبد المجید صدیقی صاحب
" مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی
" ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

مولوی محمد یونس صاحب ناظم آرائش بلدہ کو بھی عمارت ادارہ کے مقام کے تصفیے کے سلسلہ میں جناب صدر نے اس اجلاس میں شرکت کے لئے مدعو فرمایا تھا۔ اور انھوں نے بھی شرکت فرمائی۔

گزشتہ اجلاس کی روئداد سنائی گئی اور جناب صدر نے اس کی توثیق فرمائی۔ حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔

۱۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کا تعین۔

۲۔ مخزن علوم وفنون (اردو انسائیکلوپیڈیا) کے لئے

سرکاری امداد کی اسکیم۔

۳۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لئے محاسب صاحب ادارہ کی تجاویز جن کی تفصیلات اطلاع نامے کے ساتھ منسلک کی گئی تھیں۔

۴۔ کتب خانۂ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی خریدی کی نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔

۵۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں نظام کالج میں عام معلوماتی تقاریر کا انتظام۔

۱۔ گزشتہ اجلاس کی روئداد کے سلسلہ میں معتمد ادارہ نے توجہ دلائی کہ شعبۂ نسواں کے لئے جو دستور العمل منظور کیا گیا تھا اس میں ایک مسئلہ غور طلب تھا۔ جس کی طرف معتمد صاحبۂ شعبۂ نسواں نے دستور کے آخر میں خاص طور پر ایک نوٹ کے ذریعے اشارہ کیا تھا۔ اس کو پڑھ کر سنایا گیا اور کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ دستور کے فقرہ جات ۳ و ۲ کی ترمیم کرکے دستور کی منظوری کی اطلاع شعبۂ نسواں کو دی جائے۔

"قاعدہ ۳ - فقرہ ۲۔ مجلس عاملہ کے عہدہ دار اور ارکان ایک سال کے لئے نامزد کئے جائیں گے اور ختم مدت پر دوبارہ نامزد ہو سکیں گے۔"

اس تصفیے کی رو سے فقرۂ ۳ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لئے اس کو حذف کر دیا جائے۔

۲۔ عمارت ادارہ کے لئے مقام کے تعین کے سلسلے میں عالیجناب صدر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ وہ اور مولوی محمد یونس صاحب نے بعد غور و خوض طے کیا ہے کہ صرف دو ہی مقامات ایسے ہیں جو ادارے کی عمارت کے لئے موزوں ہیں۔

(۱) حسین ساگر کے کنارے وہ مقام جہاں اب محکمۂ آبکاریات واقع ہے۔

(۲) بشیر باغ کے عقب کا وہ مقام جو حسین ساگر کے بند کے ختم پر واقع ہے۔

اس سلسلہ میں مولوی محمد یونس صاحب نے نقشہ دکھا کر مقامات کی وضاحت کی۔ کافی غور و خوض کے بعد طے پایا کہ پہلا مقام ادارے کی عمارت کے لئے زیادہ موزوں ہے اور اس کے حصول کے لئے عالیجناب نواب صدر المہام بہادر سررشتۂ تعمیرات سے استدعا کی جائے۔

جناب صدر نے وعدہ فرمایا کہ اب چونکہ ایک مناسب مقام کا انتخاب مجلس انتظامی نے قطعی طور پر کر لیا ہے اس لئے نواب ظہیر یار جنگ بہادر صدر المہام متعلقہ اور عالیجناب صدر اعظم بہادر سے بہت جلد اس کے حصول کا تصفیہ کرا لیں گے نیز یہ کہ ادارے کی عمارت کا سنگ بنیاد حضرت والا شان ہز ہائینس ولیعہد بہادر شہزادۂ برار کے دست مبارک سے رکھا جائے گا اور عمارت بننے کے بعد اس کا افتتاح کرنے کی اعلیٰ حضرت بندگان عالی سے استدعا کی جائے گی۔

۳۔ مخزن علوم و فنون کے لئے سرکاری امداد کی جو اسکیم بنائی گئی ہے وہ ملتوی کر دی گئی اور طے پایا کہ آنریبل مولوی سید محمد اعظم صاحب کی موجودگی میں اس پر غور کیا جائے گا۔

۴۔ عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کا مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا اس لئے کہ آنریبل نواب لیاقت جنگ بہادر آج کے اجلاس میں شریک نہیں تھے۔

۵۔ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے کی خریدی کی نسبت جو ذیلی کمیٹی بنائی گئی تھی اس نے چونکہ اپنی کوئی سفارش اب تک پیش نہیں کی ہے اس لئے سفارش آنے تک اس مسئلہ کو ملتوی کیا گیا۔

۶۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کا اسکیم مرتب کرنے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جس میں مولوی سید علی اکبر صاحب۔ پروفیسر محمد صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی شامل رہیں گے۔ اس مسئلہ کی نسبت مولوی سید علی اکبر صاحب نے تفصیل سے وضاحت فرمائی اور اس امر کا وعدہ فرمایا کہ ان مفید اور ضروری تقریروں کا انتظام وہ اپنی نگرانی میں نظام کالج کے ہال میں فرما دیں گے۔

روئداد مجلس انتظامی :-

ادارۂ ادبیات اردو کی مجلس انتظامی کا اجلاس تاریخ ۱۲ خورداد ۱۳۵۵ ف مطابق ۲۸ اپریل ۱۹۴۶ء شام کے چھ بجے دفتر ادارہ میں منعقد ہوا حسب ذیل اصحاب نے شرکت فرمائی۔

عالیجناب آنربیل نواب لیاقت جنگ بہادر
" نواب معین نواز جنگ بہادر
" مولوی عبد المجید صدیقی صاحب
ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

عالیجناب آنربیل نواب زین یار جنگ بہادر اور مولوی سید علی اکبر صاحب نے بذریعۂ ٹیلیفون شرکت سے معذرت کی اطلاع دی۔

حسب ذیل امور شریک ایجنڈا تھے۔

۱۔ عملۂ ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لیے محاسب صاحب ادارہ کی تجاویز۔

۲۔ کتبخانہ مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے خریدی کی نسبت ذیلی کمیٹی کی سفارش۔

۳۔ تعلیم بالغان کے سلسلے میں عام معلوماتی تقاریر کی اسکیم۔

(۱) عملۂ دفتر ادارہ کے مشاہروں میں اضافے کے لیے محاسب صاحب نے جو تختہ پیش کیا تھا۔ اس کو بعد ترمیم مناسب منظور کیا گیا۔

(۲) تعلیم بالغان کے سلسلے میں جو معلوماتی تقاریر کے انتظام کے لیے ایک سب کمیٹی مولوی سید علی اکبر صاحب۔ مولوی عبد المجید صدیقی صاحب اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی پر مشتمل بنائی گئی تھی اس نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۳ خورداد ۱۳۵۵ف میں جو اسکیم مرتب کی تھی اس کو پیش کیا گیا۔ طے پایا کہ اس کی نسبت آئندہ مجلس انتظامی میں غور کیا جائے۔

(۳) مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے کتب خانے کی خریدی کے بارے میں سب کمیٹی نے ابھی کوئی قطعی رائے نہیں پیش کی ہے اس لئے کہ اس کتب خانے کا معائنہ نہیں ہو سکا لہٰذا طے پایا کہ آئندہ مجلس انتظامی تک مکمل رپورٹ تیار کرلی جائے۔

شاخ ہمناباد

بتاریخ ۱۶ خورداد ۱۳۵۵ف م ۲۰ اپریل ۱۹۴۶ء بصدارت مولوی سید اسمٰعیل صاحب بی اے ایل ایل بی تحصیلدار تعلقہ ہمناباد جلسۂ تقسیم اسناد امتحانات اردو بابتہ ۱۳۵۴ف منعقد کیا گیا اور صاحب صدر نے اسناد تقسیم فرمائے۔ اس کے بعد سید اسمٰعیل صاحب وکیل و صدر شاخ ادارہ نے یہ تحریک پیش کی کہ معتمد شاخ مولوی سید شیر زماں صاحب اپنے تجارتی کاروبار کی وجہ عدیم الفرصت رہتے ہیں اس لئے دفتری کاروبار کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ عہدہ معتمدی و صدارت میں اسطرح تبدیلی ہو تو مناسب ہے کہ صدر معتمد اور معتمد صدر ہو جائے اور ارکان میں بھی تبدیلی ہو تاکہ ادارہ کے کاروبار دفتری باضابطہ طور پر چل سکیں چنانچہ یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی اور حسب ذیل عہدہ دار و ارکان کا انتخاب عمل میں آیا۔

(۱) مولوی سید شیر زماں صاحب سوداگر افغانی۔ صدر
(۲) سید اسمٰعیل صاحب وکیل۔ معتمد
(۳) پنڈت مرد واڑپا صاحب " ۔ رکن
(۴) پنڈت بھیم راؤ صاحب " ۔ "
(۵) مولوی محمد صدیق صاحب " ۔ "
(۶) " محمد عبد الوحید صاحب " "
(۷) " محی الحسن صاحب صدر مدرس رکن
(۸) " محمد عبد الغفور صاحب سوداگر "
(۹) " سید عبد الرحمٰن صاحب " "
(۱۰) " حاجی محمد حسین صاحب سوداگر "

شاخ پرلی

۱۱ خورداد ۱۳۵۵ف مطابق یکم مئی ۱۹۴۶ء کو ادارۂ ادبیات اردو کے امیدوار فراہم کرنے کے لئے مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد مولوی ابو الظفر محی الدین صدیقی سابق معتمد شعبہ طلبہ نیل گاؤں روانہ ہوئے جہاں مولوی ہدایت علی صاحب پولس پٹیل نے امیدوار فراہم کرنے میں بڑی امداد فرمائی جس کے ہم بہت ممنون ہیں۔ بڑی

خوشی کی بات ہے کہ مولوی قاضی منیرالدین صاحب نے چند طلبہ کو تعلیم دی۔ ان طلبہ میں سے انتخاب کرکے اردو امتحانات میں شریک کرایا گیا۔ ۱۹۴۲ء کے کامیاب امیدواروں کو اسناد تقسیم کرنے تھے۔ سیل گاؤں کے چند معزز حضرات نے جلسہ کا معقول انتظام کیا۔

جلسہ تقسیم اسناد سیل گاؤں یکم مئی ۱۹۴۳ء موتی لال صاحب مارواڑی کے مکان میں ایک جلسہ عام کیا گیا۔ دیہات میں منادی کرادی گئی تھی۔ جلسہ کا آغاز ٹھیک چار بجے ہوا۔ مولوی شیخ حسین صاحب نائب معتمد، ابوالظفر محی الدین صاحب سابق معتمد کی تائید پر مسٹر ٹیچیل نے جلسہ کی صدارت کی۔ مولوی شیخ حسین صاحب مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد پر کافی روشنی ڈالی۔ آخر میں صدر جلسہ نے بھی تعلیم کی اہمیت پر مرہٹی میں تقریر کی اور کامیاب طلبہ کو اسناد تقسیم فرمائیں۔

۲ مئی ۱۹۴۳ء کو سیل گاؤں سے سون پیٹھ روانہ ہوئے جہاں مولوی شیخ بنے صاحب متاجر نے جو ایک علم دوست ہیں۔ گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے یہاں قیام و طعام کا معقول انتظام کروایا جس کے ہم بہت مشکور ہیں۔

جلسہ تقسیم اسناد سون پیٹھ جاگیر ۳ مئی ۱۹۴۳ء کو مدرسہ وسطانیہ سون پیٹھ میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا جلسہ مسٹر منوہر راؤ بخشی تحصیلدار و منصف کی صدارت میں منعقد ہوا۔ قصبہ ہذا کے حسب ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

ڈاکٹر سنبھا راؤ صاحب، منوہر راؤ صاحب بخشی اول مددگار مدرسہ ہذا۔ مولوی سید احمد صاحب جمعدار، مولوی قاضی بشیرالدین صاحب، مولوی غلام محبوب صاحب منشی ٹپہ خانہ، بابو راؤ صاحب دیسکھ، مولوی محمد ہاشم صاحب، ناگو راؤ صاحب دیسکھ، بھیما شنکر راؤ صاحب، حسین خاں صاحب مدرس، ہری بھاؤ صاحب، انت راؤ صاحب، مولوی شیخ بنے میاں صاحب متاجر جلسہ کے آغاز

پر مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کے اغراض و مقاصد بیان کئے۔ ازاں بعد صدر جلسہ نے بھی اپنے زرین خیالات سے حاضرین کو مستفید کیا۔ اور سندیں تقسیم کیں۔ جلسہ کے ختم پر طلبہ اردو امتحانات میں شریک ہوئے۔

۴ مئی ۱۹۴۳ء کو بلغار امیلیا سے دفتر ادارۂ ادبیات اردو کو مراجعت دی گئی۔

تعلیم و تدریس کا مفت انتظام اردو امتحانات کی تیاری کرائی جارہی ہے روزآنہ صبح درس ہورہے ہیں۔ خاص طور پر مولوی شیخ حسین صاحب مولوی نورالدین صاحب، مولوی منیرالدین صاحب، مولوی ابوالظفر محی الدین صاحب (جو بغرض استفادہ تعطیلات موسم گرما تشریف لائے)، خورشید النساء بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسواں اردو پہلی معتمد شاخ اور مولوی سعیدالدین صاحب درس دے رہے ہیں۔

ادارہ کے حالات مولوی شیخ حسین صاحب، مولوی نورالدین صاحب، مولوی سعیدالدین صاحب اور جملہ ارکان نہایت مستعدی سے کام انجام دے رہے ہیں کتب خانہ کا انتظام سعیدالدین صاحب کے ذمہ ہے ابتداء سے اب تک ادارہ جناب قاضی محبوب الدین صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کا ادارہ بہت ممنون و مشکور ہے۔ علم کا ذوق بڑھانے کے لئے ادارہ کے دارالمطالعہ سے لوگوں کو کتابیں دی جاتی ہیں روزآنہ عوام اور ارکان دارالمطالعہ میں آتے ہیں افسوس ہے کہ ادارہ کی مالی حالت اچھی نہ ہونے کی وجہ سے اخبار رہبر دکن ایک سال سے بند ہے۔

بلڈنگ فنڈ صدر ادارہ کی اپیل پر ادارہ ہذا نے تقسیم اسناد کو بھی اس حال ملتوی کردیا ہے اس فنڈ کی تکمیل کے لئے عالی جناب دوم تعلقدار صاحب میر مجلس ادارہ ہذا سے ملاقات کی گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ حسب استطاعت دفتر ہذا سے بلڈنگ فنڈ کے لئے رقم روانہ کی جائے گی۔

اردو امتحانات بابت ۱۳۵۲ف سال حال ادارے کے اردو امتحانات ۲۹ و ۳۰ جولائی ۱۹۴۳ء م ۲۱ امرداد کو منعقد

حسب ذیل مرکزوں میں منعقد ہوئے۔
الند۔ اندولہ۔ بانسواڑہ۔ بشیر آباد۔ بلدہ (اناث) بلدہ (ذکور) بلدہ (فوج) بلولی۔ بمبئی۔ پرلی۔ تاکلی۔ جگتیال۔ دوم کنڈہ۔ کوڈنگل۔ گدوال۔ منجلے کاؤں۔ مومن آباد (فوج) میسور۔ ناگر کرنول۔ نظام آباد۔

ادارہ کی طرف سے حسب ذیل اصحاب بحیثیت صدر نگرانکار تشریف لے گئے تھے جنھوں نے تاریخ اور وقت مقررہ پر امیدواروں کا امتحان لیا۔

مولوی کلیم اللہ حسینی صاحب مولوی فاضل (الند) مولوی محمد حسین صاحب اظہر (اندولہ) مولوی مظہر الدین صاحب (بانسواڑہ) مولوی احمد اللہ حسینی صاحب (بشیر آباد) مسٹر رامکرشن راؤ بیتسکی (بلولی) مولوی خیر حسن صاحب ایم اے (بمبئی) مولوی محمد امیر الدین صاحب (پرلی) مولوی رکن الدین صاحب عثمان (تاکلی) مولوی شیخ محمد اسمٰعیل صاحب (جگتیال) مولوی ظہیر الدین صاحب (دوم کنڈہ) مسٹر شیشیلا (کوڈنگل) مولوی معین الدین صاحب ایم ایس سی (گدوال) نواب باقر علی خاں صاحب (منجلے گاؤں) مولوی حمید الدین صاحب (نظام آباد) مولوی احمد محی الدین صاحب منشی فاضل (ناگر کرنول)۔

مرکز بلدہ ذکور و اناث حسب سابق سٹی کالج اور زنانہ ہائی اسکول نامپلی مقرر کئے گئے تھے۔ مرکز فوج نظام اور پولیس فتح میدان قرار پائے۔ مرکز بلدہ کے صدر نگران کار مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار جامعہ عثمانیہ مرکز بلدہ فوج کے صدر نگران کار پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی تھے۔ مرکز اناث کی نگرانی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر زور اور محترمہ مسز عبد الرحمن صاحب مدیر وقت نے فرمائی۔

مولوی اکبر الدین صاحب ایم اے اور مولوی خیر الدین صاحب وکیل نے مرکز بلدہ کی نگرانی میں صدر نگرانکار صاحب کا بہت مدد فرمائی۔ مرکز فوج کی نگرانی میں صدر صاحبہ سکینہ ایم ایس سی، مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی ایل ایل ایم، مولوی عبد القادر صاحب جامعہ (عثمانیہ) اور مولوی ابو ظفر محی الدین صاحب نے ادارہ کا ہاتھ بٹایا۔

مرکز اناث کی نگرانی میں محترمہ افسر النساء بیگم صاحبہ اور محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ نے بھی مدد دی۔

جملہ مراکز کی تفصیلی روئدادیں سلسلہ وار شائع کی جا رہی ہیں۔

مرکز نظام آباد ۸ ر جولائی ۱۹۴۵ء کو رات کے ساڑھے نو بجے نظام آباد پہونچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ ادارہ نظام آباد تشریف لائے تھے۔ مسافر بنگلہ میں قیام و طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ معتمد صاحب کو قیام و طعام کا خاص خیال تھا جسکی وجہ بیحد آرام رہا۔ ۲۱ ر شہریور ۱۳۵۴ف کو دس بجے سے امتحان شروع ہو گیا۔ مولوی انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام نے ازراہ عنایت مدرسہ کا بڑا ہال ذکور کے امتحان کے لئے اور ایک دو کمرہ اناث کے لئے دیدیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ فرنیچر اور سیاہی کی دواتیں بھی دلوا دیں تھیں جسکی وجہ سے معتمد صاحب کو بہت سہولت ہو گئی۔ نیز صاحبزادہ مولوی میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات نے اپنے دفتر سے اناث کے پردہ کے لئے روٹیاں وغیرہ فراہم کردی تھیں۔

ذکور کے امتحان میں معتمد صاحب کے علاوہ وینکٹ کشور راؤ صاحب صدر مدرس طارٹیڈی کلاں تعلقہ کامارٹیڈی، مولوی محمود عالم صاحب نائب معتمد شاخ ادارہ، مسٹر ڈی راجنا اور مولوی عبد الاحد صاحب مدد گار مدرسہ تحتانیہ نظام آباد اور مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے نگرانی فرما کر بہت مدد دی۔

طبقہ اناث میں جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ نسوان وسطانیہ نے بحیثیت صدر نگران کار مسلسل تین روز نگرانی فرما کر اپنی انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ صدر صاحبہ نے اپنی مدد کے لئے ایک اور نگرانکار محترمہ خورشید بانو صاحبہ کو بھی بلا لیا تھا۔ اس کے علاوہ خادمہ بھی طالبات کو پانی پلانے کے لئے موجود تھی۔

جناب کاشی ناتھ راؤ صاحب کپال کر وکیل ہائیکورٹ ادارہ کی معاونت میں انتہائی دلچسپی اور بہت ایثار سے کام لے رہے ہیں۔ یہ معلوم کرکے انتہائی مسرت ہوئی کہ اردو کا شوق طبقہ نسواں اہل ہنود میں آپ ہی کی توجہ خاص کا مرہون منت ہے۔ ملک کو ایسے خدمت گزاران قوم کی ضرورت ہے۔ بوجہ بخار و ناسازی مزاج امتحان گاہ تشریف نہ لاسکے اور معافی چاہی۔

سب سے بڑھ کر مولوی غلام احمد صاحب وکیل قابل ذکر ہیں۔ معلوم ہوا کہ صاحب موصوف ہی کی بدولت وہاں ادارہ قائم ہوا اور چل رہا ہے۔ بانی بھی وہی ہیں۔ اپنا زیادہ وقت امتحان گاہ میں دیکر انتہائی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

۲ شہریور ۱۳۵۵ف کو مولوی غلام احمد صاحب کے ہمراہ صاحبزادہ میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات و مولوی بشیر احمد صاحب مہتمم خزانہ امتحان گاہ تشریف لائے تھے۔ مہتمم صاحب تعلیمات نے تمام پرچوں کو بغور ملاحظہ کرکے معیار کے متعلق اظہار خوشنودی فرمایا۔

معتمد صاحب ادارہ نظام آباد کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ سالہ اسناد و تقسیم شدنی ہیں۔ اس کے لئے ایک جلسہ منعقد کرنے کی کوشش میں ہیں۔ موصوف نے انتہائی کوشش کی کہ ہماری موجودگی میں ہو جائے۔ لیکن اکثر عہدہ دار تعطیلات کی وجہ مستقر پر نہیں تھے۔ جناب مہتمم صاحب تعلیمات و خزانہ نے امید دلائی کہ قریب میں جلسۂ تقسیم اسناد منعقد کریں گے۔ معتمد صاحب موصوف و مہتمم صاحب تعلیمات کا یہ خیال ہے کہ سابقہ ارکان کی تبدیلی ضروری ہے۔ کام کرنے والوں اور دلچسپی رکھنے والوں کو شریک کرنا چاہیے۔

آخر میں معتمد صاحب شاخ ادارہ نظام آباد کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جن کی وجہ مجھ کو ہر طرح آرام ملا نیز موصوف پڑتے پانی میں مجھے اسٹیشن نظام آباد پر سوار کراکے واپس ہوئے۔

مجید الدین

مرکز پرلی

بتاریخ ۲۰ امرداد ۱۳۵۵ف بوقت ۶-۰۵م کو اسٹیشن پرلی حیدرآباد دکن سے روانہ ہوکر تقریباً ۱۰ بجے شب اسٹیشن پر مولوی شیخ محمد وزیر صاحب معتمد ادارہ ادبیات اردو مستقر پرلی مع ارکان موجود تھے۔ صاحب موصوف سے ملاقات کے بعد جناب نے دیگر ارکان کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد آبادی کو روانہ ہوئے مدرسہ تحتانیہ میں قیام کا انتظام تھا۔

مدرسہ تحتانیہ قصبہ پرلی میں ہی امتحان کا انتظام تھا۔ تاریخ مقررہ سے پہلے ہی نشستوں کا انتظام ہو چکا تھا ٹھیک ۱۰ بجے امتحان زبان دانی کا آغاز کیا گیا۔ امتحان گاہ میں معتمد ادارہ کے علاوہ مولوی نواز الدین صاحب، مولوی شیخ حسین صاحب، مسٹر بھوانی پرشاد صاحب و مسٹر ادھو راؤ صاحب موجود تھے۔

مدرسہ تحتانیہ نسواں میں طالبات کے امتحان کا انتظام تھا جس کی نگرانکار صدر معلمہ صاحبہ تھیں۔ وقت سے ۱۵ منٹ پیشتر پرچے بذریعہ مولوی شیخ محمد وزیر صاحب معتمد ادارہ صدر معلمہ صاحبہ کی خدمت میں روانہ کر دیئے گئے تھے۔ دوران امتحان میں مولوی غلام رسول صاحب اول مددگار وسطانیہ پرلی امتحان گاہ میں تشریف لائے اور تھوڑی دیر کے بعد واپس ہوئے نیز وقتاً فوقتاً تشریف لاکر تھوڑی دیر نگرانی کرتے رہے۔

زبان دانی کا زبانی امتحان لیا گیا اور حسب نظام اوقات اردو عالم کے پرچہ جات لئے گئے۔

ادارہ کے عام حالات :- دار المطالعہ مولوی قاضی نجیب الدین صاحب کے دیوان خانے میں ہے جس کو موصوف نے ادارہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔ مولوی فصیح الدین صاحب مدرس وسطانیہ، شرافت علی صاحب مدرس، مولوی عبد القادر صاحب ادارہ کے ارکین ہیں۔ دار المطالعہ میں کوئی اخبار نہیں آتا البتہ "سب رس" آیا کرتا ہے۔ معتمد صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ سعید الدین صاحب ایک نوجوان محنتی ادارہ کے خیرخواہ تھے مگر وہ فکر معاش میں باہر چلے گئے ہیں جن کی روانگی کے باعث ادارہ اب خاموش ہو گیا ہے۔

ادارہ کا کوئی مستقل سرمایہ نہیں۔ اراکان ادارہ موقع و محل سے نہایت عمدگی سے کاروبارِ ادارہ انجام دے رہے ہیں۔ ادارہ کی عمارت کے لئے چندہ کا آغاز کیا گیا ہے جس میں جناب محسن ابن شبیر صاحب مددم تعلقدار موسن آباد کا خاص حصہ ہے۔

قیام و طعام کا انتظام مولوی شیخ محمد نذیر صاحب معتمد ادارہ شاخ پربنی کے ہاں تھا۔ انتظام معقول رہا۔ ادارہ کی جانب سے شیخ محمد نذیر صاحب و دیگر اراکان کا شکریہ ادا کیا گیا۔

ناگلی ضلع اورنگ آباد

چہارشنبہ کے روز ۲۹ امرداد ۱۳۵۲ف ساڑھے چار بجے دن کی ٹرین سے اورنگ آباد کی طرف روانہ ہوا۔ پندرہ سولہ گھنٹوں کے طویل سفر کا خیال ہی طبیعت کو قبل از وقت تھکا دینے کے لئے کیا کم تھا۔ اس پر بہرحال کو سفر کی انتہائی غیر دلچسپ گفتگو مستزاد تھی۔ جگہ ملی بھی تو ایسے ڈبے میں جو مارواڑ کے تاجروں اور صرافوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہمنشیں نے گفتگو سیاست حاضرہ سے شروع کی تو خوش ہوا کہ سفر کی گھڑیاں لطف و آرام سے گزر جائیں گی اور تھکن کا احساس نہ ہونے پائے گا۔ لیکن چند لمحوں کے بعد گفتگو کا رخ بازار کے نرخ کی طرف پھر گیا اور گھنٹوں کے بعد بھی گفتگو بازار کے بھاؤ سے آگے نہ بڑھنے پائی۔ ان کو اصرار تھا کہ میں بھی کچھ کہوں۔ میں کہتا کیا جب سننا بھی میرے لئے بار تھا۔ بہرحال وہ رات آنکھوں میں کٹ گئی صبح نمودار ہوئی اور دھندلکا صاف ہوا تو اورنگ آباد کا اسٹیشن سامنے تھا۔

اسٹیشن سے باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ خلدآباد کو جانے والی بس ٹرین کے آنے سے ایک گھنٹہ قبل جا چکی ہے اب وہاں تک جانے کے لئے ٹانگے کے سوا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ رات کے سفر کی تھکن کے ساتھ پیش آنے والے سفر کا خیال ہمت شکن تھا، لیکن وقت پر ناگلی پہنچنا بھی ضروری تھا۔ بہ مجبوری تمام ٹانگے میں بیٹھا اور خلدآباد کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے سفر کی کلفت اور سرگرانی یک گونہ کم ہو گئی۔ خلدآباد میں مجھے لینے کے لئے شاخ ادارہ ادبیات ناگلی کے معتمد جناب رئیس خاں صاحب پہلے سے موجود تھے۔ وہ پہنچ کر گمان کہ ابھی ناگلی پہنچنے کی ٹھیرا تھا، سمجھا تھا کہ یہ دلچسپ سفر اب ختم ہوا لیکن وہاں معلوم ہوا کہ دلچسپ سفر تو اب شروع ہونے والا ہے یعنی یہ کہ خلدآباد سے ناگلی جانے کے لئے گھوڑے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ دو گھنٹوں کے بعد ہم ناگلی میں داخل ہوئے۔

خیال تھا کہ شاید ناگلی جاگیر وسعت و آبادی میں ہماری ریاست کے کسی تعلقہ کے مستقر سے کم نہ ہوگی لیکن دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی مردم شماری پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے اور صرف تیس مکانات مسلمانوں کے ہیں۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس مختصر سی آبادی میں ۳۴ امیدوار ادارہ کے مختلف امتحانات میں شریک تھے۔ اس کے علاوہ نو امیدواروں نے گزشتہ سال جامعہ نظامیہ کے امتحان منشی میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی تھی اور اس سال بھی اس امتحان کی تیاری میں بعض امیدوار مشغول ہیں۔ مجھے مولوی نذیر خاں صاحب نے بتایا کہ یہ ساری علمی سرگرمی وہاں کے صدر مدرس مولوی کریم خاں صاحب اور اورنگ آباد کے وکیل شاخ ادارہ ناگلی کے سرپرست مولوی شیخ لعل صاحب ایم اے، ایل ایل بی عثمانیہ کی پرخلوص کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس وقت میری حیرت اور بڑھ گئی جب میں نے سنا کہ ایک خانگی مدرسہ بھی "مدرسہ سلطانیہ اسلامیہ" کے نام سے قائم ہے۔ وکیل صاحب کے پرخلوص ایثار اور سادگی اور طالب علمی کے ابتدائی عہد سے لے کر اب تک جو جو مشقتیں برداشت کر کے انھوں نے مسلسل ترقی کی ہے اس کو سن کر بڑی حیرت ہوئی۔ علاوہ ازیں ناگلی میں ایک خانگی اقامت خانے کے مصارف بھی مستقلاً ان کی ذاتی آمدنی سے پورے ہوتے ہیں۔ پھر نادار طلبہ اور مفلوک الحال لوگوں کی مالی امداد الگ رہی۔ تین دن تک امتحانات ہوتے رہے۔ اس عرصے میں وہاں کے خطیب و کوتوالی مولوی محمد جعفر صاحب کا مہمان رہا جن کی مہمان نوازی اور خلوص گفتگو نے دل سے اجنبیت کا احساس مٹا دیا۔ ان کے علاوہ شیخ لعل صاحب، کریم خاں صاحب، منیر خاں صاحب، قاضی تاج الدین صاحب اور وہاں کے تحصیلدار صاحب کے مخلصانہ سلوک کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ ان حضرات سے مختلف مباحث کے علاوہ ادارہ ادبیات اردو کے متعلق بھی گفتگو رہی۔ مولوی کریم خاں صاحب نے ان تجاویز کا ذکر کیا جو انھوں نے ادارہ کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادارہ کے امتحانات کو مقبول عام ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ حکومت ان کو مسلمہ قرار دے۔ یہ ایک ایسی مفید تجویز ہے جس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خود ادارہ کے ارباب اقتدار کوشاں ہیں۔ ناگلی میں جن امیدواروں نے امتحانات میں شرکت کی ہے ان کی فہرست کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مختصر سی آبادی میں اتنے امیدواروں کا شریک ہونا بجائے خود لائق تعریف ہے۔ مجھے "اعدادی" جماعت کے امتحان کے موقع پر محسوس ہوا کہ لڑکوں سے زیادہ لڑکیاں تیار ہیں جس کے لئے صدر معلمہ صاحبہ مستحق مبارکباد ہیں۔ ان طالبات کے جوابات سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ امتحان اردو زبان دانی کے لئے بڑی آسانی سے تیار کی جا سکتی ہیں۔ [illegible] شہریور [illegible] کو ناگلی سے رخصت ہوا۔ لیکن وہاں کے رہنے والوں کے خلوص اور سادگی کی یاد اب تک حافظے میں محفوظ ہے۔ [illegible]

رکن الدین حسان

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
[illegible] ...	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۹۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
〃 دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۰	۰
مرقا	۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۰
آشوب	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۱۰	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادہ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
〃 〃 دوم (۵۰) 〃	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۴	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش ثانی (۴) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء میں ...	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم اے

سب رس

فی پرچہ آصفیہ ۳ ۱۵
فی پرچہ برطانیہ ۳۹۵
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
سالانہ چار روپے آٹھ آنے
طلبا کا سبسکرپشن ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ
۸/

جلد ۸ — بابت اگست و ستمبر ۱۹۴۵ء — شمارہ ۸-۹

فہرست مضامین

نمبر	مضمون	مصنف	صفحہ
۱	حضرت مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم / فضیلت جنگ مرحوم کے حالات زندگی	ارشادات شاہانہ / اکبر الدین صدیقی ایم اے	۳ / ۱۲
۲	غزل	استاد السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل	۱۶
۴	نئی نظم کی زبان	علی اختر	۱۷
۵	پک وک کی حقیقت	ترجمہ	۲۰
۶	یاد (نظم)	نہال صدیقی	۲۱
۷	ضیافت	سبحان اللہ	۲۲
۸	اگر میں مرد ہوتی	زینت ساجدہ بی اے	۲۵
۹	کھلاڑیوں کی نفسیات	سید محمد ہادی	۲۸
۱۰	کیف جاوید (غزل)	نواب زادہ جاوید قیصری ایم اے (کانپور)	۳۲
۱۱	تاریخ زبان اردو کی ترتیب	محمد یحییٰ تنہا	۳۳
۱۲	آب و آتش (نظم)	لطیف ساجد بی اے	۳۷
۱۳	زبان اردو کے چند تاریخی کتبے	ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی	۳۸
۱۴	صوبہ بنگال کا اردو سے تعلق	عبد الجلیل (کلکتہ)	۴۲
۱۵	اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نصب العین	ڈاکٹر ایم حفیظ سید	۴۶
۱۶	زندگی کی اہمیت	امجد علی	۴۹

نمبر	مضمون		مصنف	صفحہ
۱۷	ساتھی	(نظم)	سردار الہام	۵۸
۱۸	عہد خزاں سماں کے شاعر		ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور	۵۹
۱۹	ترقی پسند ادب	(لطیفہ)	" " " "	۶۳
۲۰	عرض حال		تمکین سرمدی	۶۵
۲۱	حیات		علی اختر	۶۶
۲۲	طائر بلند مقام		ابو ظفر عبد الواحد ایم اے	۶۷
۲۳	خوناب		سلیمان اریب	۶۸
۲۴	چاندنی		ڈاکٹر ابو الکلام عبد المعین عابد	۶۹
۲۵	گاؤں کی باتیں		تمکین سرمدی	۷۰
۲۶	طلوع آفتاب		پنڈت ونکٹی دھر ودیا النکار	۷۱
۲۷	نوائے شوق		لطیف ساجد بی اے	۷۲
۲۸	یہ زمانہ		شاہد صدیقی	۷۳
۲۹	ذرّوں کا ناچ		فضل الرحمٰن بی اے	۷۴
۳۰	تجدید		کاوش	۷۶
۳۱	تعارف		کنول پرشاد کنول	۷۷
۳۲	استالین		مخدوم محی الدین ایم اے	۷۸
۳۳	تاج محل		صاحبزادہ میکش	۸۳
۳۴	انقلاب		نظر حیدر آبادی	۸۷
۳۵	گزارش		یوسف ناظم ایم اے	۸۸
۳۶	اجنتا		سکندر علی وجد بی اے، سی ایس	۸۹
۳۷	نتیجہ اردو امتحانات		ادارہ	۹۱

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

حضرت مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم

حضرت مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم

حضرت علامہ محمد انوار اللہ خاں نور اللہ مرقدہ دکن کے ایک بہت بڑے عالم، فقیہ اور صوفی تھے۔ اپنے تبحر علمی اور شمائل خلق کے باعث وہ اس زمانہ میں فرد فرید تھے۔ زہد و تقویٰ کے ساتھ ساتھ درس تدریس اور تالیف و تصنیف کا سلسلہ عمر بھر جاری رکھا۔ ان کا دسترخوان ان کے شاگردوں اور معتقدوں سے کبھی خالی نہ رہا۔ دور دور سے تشنگان علم و معرفت ان سے فیض حاصل کرنے کیلئے آتے تھے اور حسب استعداد فیض حاصل کر کے واپس ہوتے تھے۔

ان کے تلامذہ اور فیض یافتوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچی ہے لیکن ان کی یہ خوش قسمتی باعث صد رشک تھی کہ خسرو دکن و برار اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع جیسے شاگرد ان کو نصیب ہوئے جو اپنے علم و فضل اور زہد و تقویٰ اور دولت ایمان کے لحاظ سے دنیا کے سیکڑوں اور ہزاروں تاجداروں میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے استاد کے فیوض و برکات کو جاری رکھنے میں ان کی وفات کے ایک عرصہ بعد مدرسہ نظامیہ کی اصلاح و نشاۃ ثانیہ کی طرف توجہ فرمائی۔ اس سلسلہ میں اخبار دکن میں جو فرامین مبارک شائع ہوئے ہیں ان کو ہم یہاں نقل کر کے حضرت فضیلت جنگ مرحوم کے حالات زندگی اور تصویر شائع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔ (ادارہ)

انتباہ برائے طلباء مدرسہ نظامیہ

ایک عرصہ سے دیکھا جا رہا ہے کہ خود غرض اشخاص پس پردہ کام کر کے یہاں کے نظم و نسق کو خراب کرنے کی کوششیں [...]یں حتیٰ کہ طلباء میں اسٹرائک کا جو رجحان پیدا ہو گیا ہے جس سے اس دینی مدرسہ کی رسوائی پھیلی ہوئی ہے۔ نظر بریں سب متعلقہ اشخاص کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اگر درست طریقہ پر کام نہ ہوگا تو اس وقت گورنمنٹ کو سخت [...]ینکی ضرورت ہوگی۔

ہاں یہ بات اور ہے کہ اگر جائز شکایات ہیں تو باضابطہ گورنمنٹ میں پیش ہوں تاکہ اس پر غور و غرض ہو سکے۔ [...]ت کی شرانگیزی کرنے والوں کے حق میں مفید نہیں بلکہ مضر ثابت ہوگی۔ اور جب انسداد سند کام ہوگا تو یقیناً بدنظمی پیدا [...]ی کا سدباب از حد ضروری ہوگا۔ اور اگر یہ وقت ہاتھ سے نکل جائے گا تو بجز پشیمانی اور کوئی مداوائے علاج نہ رہے گا۔ [...]ف۔ چونکہ یہ فضیلت جنگ مرحوم کا بنا کردہ مذہبی مدرسہ ہے لہذا جہاں تک ممکن ہو سکے بجز ضروری احکام کے جس کی دنیا [...]ت پر قائم نہیں ہے بلکہ سی کوئی انقلاب ہے اس کو انہیں قواعد و ضوابط یا اصول کے تحت چلایا جانے کا جو [...]ن حیات کام ہوتا تھا۔

اصل بات اسی بے گروہ سے ہے کہ ان اور اس کی گورنمنٹ غافل نہیں ہے بلکہ ہر طرح باخبر ہے اور ہر چیز کو بامعان [...] دیکھ رہا ہے اور آمادہ عمل ہے۔

مہر دکن ۹ شہریور [illegible]

معروضۂ طلبائے مدرسۂ نظامیہ

ان کا معروضہ جو نذری باغ میں داخل ہوا تھا (حالیہ معاملہ سے متعلق) اس کو کونسل میں بھجوادیا گیا ہے جہاں سے ایک کمیٹی کا انعقاد ہو کر دریافت و تحقیقات عمل میں آئے گی اور رپورٹ کمیٹی پیش ہونے پر گورنمنٹ انتظام معقول کرے گی۔

جب تک کہ مدرسہ مذکورہ کے تمام امور پر از سر تا کل نظر نہ ڈالی جائے کوئی بہتر صورت عمل پیدا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ یہی مسئلہ اس وقت زیر غور ہے۔ اور انشاء اللہ زمانۂ قریب میں اس کے بہتر نتائج ظہور پذیر ہوں گے اور ہمیشہ کے لئے ایک مکمل لائحۂ عمل تیار ہو جائے گا۔ جس کے مطابق اطمینان سے کام چلے گا کیونکہ یہ فضیلت جنگ مرحوم کا سرمایۂ حیات تھا جس کو باقی رکھنا از حد ضروری ہے۔

صبح دکن سہ شنبہ ۱۱ر شہریور ۱۳۵۳ف

تشکیل کمیٹی انتظامی مدرسۂ نظامیہ

جبکہ اس کے ارکین میں ضروری کمی و بیشی ہوگی تو اُسوقت گورنمنٹ مزید معین ارکین کو شامل کرے گی۔ یعنی کوتوال بلدہ۔ ناظم امور مذہبی۔ (کیونکہ یہ دینی مدرسہ ہے) اور معتمد کمیٹی علماء۔

اس کے سوا تقسیم اسناد سالانہ کے موقع پر صدر اعظم باب حکومت موجود رہکر یہ کام خود انجام دیں گے۔ اور گاہ گاہ عند الضرورت مدرسہ کا کام کس طریقہ پر چل رہا ہے دیکھنے کے لئے سواری بھی آئے گی۔
چونکہ یہ خاص مشرقی علوم کا مدرسہ ہے اور اس کا بانی اپنے وقت کا عالم باعمل شخص تھا یعنے فضیلت جنگ مرحوم لہذا اس کی بقا ہر حالت میں گورنمنٹ اور حکمران کے پیش نظر ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گی چاہے کتنے ہی دور انقلاب سے یہ نکلتا رہے۔

صبح دکن چہارشنبہ ۱۲ر شہریور ۱۳۵۳ف

عمارت جدید برائے مدرسۂ نظامیہ

موجودہ عمارت اس کے لئے موزوں نہیں ہے کیونکہ ہر طرف کھنڈر ہیں۔ اور طلبا جس جگہ بیٹھ کر درس لیتے ہیں یہ سابق میں گھوڑوں کے اصطبل تھے جس کو درست کر کے کام میں لایا گیا تھا۔ اس کے سوا بانی مدرسہ کے مزار پر گنبد نہیں ہے جو کہ عین صحن مدرسہ میں واقع ہے۔ لہذا اس کی بھی ضرورت ہے۔

ایسی حالت میں جبکہ گورنمنٹ اسی قسم کے یادگاری کاموں میں فیاضی سے کام لے رہی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس تاریخی مدرسہ کی درستگی کی طرف متوجہ نہ ہو۔ نظر براں دو لاکھ کے مصارف سے امور مذکورہ کی تکمیل ہوگی تاکہ اس دینی مدرسہ کی شان بڑھے اور دوسری طرف یہ خیر و برکت کا کام انجام پاکر باعث مسرت روح مطہر فضیلت جنگ مرحوم ہو۔ اَلسَّعْیُ مِنِّیْ وَالْاِتْمَامُ مِنَ اللّٰہِ۔

صبح دکن پنجشنبہ ۱۳ ار شہریور ۱۳۵۴ف

جدید تشکیل کمیٹی انتظامی مدرسۂ نظامیہ

آغاز از یکم آذر سالِ نو فصلی

جبکہ موجودہ کمیٹی انتظامی برخاست ہو جائے گی۔

(جملہ (۷) اسم)

(۱) ممبر آف کونسل　　بہ حیثیت پریزیڈنٹ کمیٹی　(انچارج آف محکمۂ امور مذہبی)

اراکین

(۲) کوتوال بلدہ۔　(دین یار جنگ)

(۳) ناظم امور مذہبی (جدید ناظم)　} یہ مسئلہ اسوقت زیر غور ہے اور اعلان اواخر آبان میں ہوگا کیونکہ ان کا تقرر امتحاناً ایک سال کے لئے ہوا تھا۔

(۴) معتمد کمیٹی علماء (محمد پاشاہ حسینی صاحب)

(۵) مفتی ہائیکورٹ (مولوی عبدالقدیر صاحب بدایونی)

(۶) حکیم مقصود جنگ (سابق ناظم طبابت یونانی)

(۷) محمد الیاس برنی صاحب (پروفیسر جامعۂ عثمانیہ)

نوٹ۔ معتمد کمیٹی مذکورہ کا انتخاب بروقت ہوگا جس کی حیثیت رکن کمیٹی کی نہ ہوگی۔ ہیکل دیگر۔ چونکہ موجودہ عمارت مدرسۂ نظامیہ اجلاس کمیٹی کے لئے موزوں نہیں ہے لہذا تا تکمیل عمارت ہر ماہ میں ایک دن کمیٹی کا اجلاس بشیر باغ میں ہوگا۔ اور جدید عمارت میں خاص طور پر ایک کمرہ اجلاس کمیٹی کے لئے تعمیر کیا جائے گا۔

صبح دکن شنبہ ۱۵ ار شہریور ۱۳۵۴ف

مادۂ تاریخ بنائے عمارت جدید برائے مدرسۂ نظامیہ

(بیت العلوم شرقیہ)

میان زائیران بنگر ہجوم است — پئے ہر کلیتے عثمان لزوم است
(برائے فاتحہ قرآنی مدرسہ) ۱۹۷ (کثرت) — (قواعد و ضوابط)
چہ تعمیرے بہ الطافِ الٰہی — بنگر بادل کہ انوارِ علوم است
۱۳۶۴ھ

ف۔ ان شاء اللہ سنگ بنیاد عمارت بہ یوم الحج (۹ ذیحجہ) سال حال نصب خواہد شد و قت عصر۔ و این کار ما خود انجام خواہیم داد۔ بعونہٖ و کرمہٖ۔

دیگر۔ مارا توقع ہست کہ از مرور زمانہ این مدرسۂ دینی روزے حیثیت کالج (جامعہ) اختیار خواہد کرد۔
بہ مصداق۔ باد صبا ز غنچۂ و گلہا کہ دور نیست

صبح دکن یکشنبہ ۱۶ شہریور ۱۳۵۴ف

شرکت صرفِ خاص بہ تعمیر عمارت جدید برائے مدرسۂ نظامیہ

(ملقب بہ بیت العلوم شرقیہ)

موجودہ بوسیدہ و کہنہ عمارت کی جتنی زمین ہے وہ ملک صرفِ خاص ہے (تخمیناً مالیتی پچاس ہزار) لہذا یہ اور اس کے سوا مزید زمین کی ضرورت ہو تو (بشرطیکہ وہ بھی صرف خاص کی ہو) اس کو بغیر معاوضہ صرف خاص دیدیگا تاکہ خیر و برکت کے کام میں وہ بھی اپنی حد تک حصہ لے۔

مژدۂ جانفزا

ف۔ حیدرآباد گورنمنٹ بخلوص دل دو لک و بست و پنج ہزار برائے عمارت جدید منظور کرد و مدرسۂ مذکورہ بہ زبان حال می گوید کہ۔

جزاک اللہ فی الدارین خیراً

کرر۔ زین یار جنگ صدر آف کونسل نقشہ جات تیار کرکے بعد منظوری سرکار کام شروع کردیں گے جو کہ اس فن کے ماہر ہیں۔ گر دو سال تک یعنی ماہ ربیع الاول آئندہ سے طلبائے مدرسۂ مذکورہ کرسی و مسجد کی عارضی جگہ منتقل کرنا ہوگا ہے کہ وہاں وقت تعمیر کسی صورت سے نہیں رہ سکتے۔ لہذا یہ مسئلہ اسوقت زیر غور ہے جس کا تصفیہ قریب میں ہوگا۔ کیونکہ جب تک موجودہ عمارت مدرسہ کو بالکلیہ مسمار کرکے از سر نو مستحکم بنیاد و اللہ برپا نہ رکھا جائے گا کام خاطر خواہ نہیں چل سکتا کہ بہ سرعت بے بغیر کسی مداخلت کے وقت پر تکمیل پانا ہے اور وہ دو سے سال

معماروں کے شور و ہنگامے میں (یعنے دورانِ تعمیر) اطمینان سے درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہ سکتا لہذا اس کے لئے پرسکون مقام کی سخت ضرورت ہے۔

نوٹ۔ جدید عمارت کا نصف حصہ مدرسے کے کام میں آئیگا اور بقیہ نصف حصہ برائے رہائش و قیام طلبار جو کہ وہاں مقیم ہیں انکے لئے مختص کردیا جائے گا (بہ شکل ہاسٹل)

بہرحال امید قوی ہے کہ جب یہ عمارت مکمل ہوگی تو بجائے خود یہ ایک چیز ہوگی جسکی شہرت دنیائے علوم مشرقیہ میں گونجتی رہے گی بعونہ و کرمہ اور ریاست حیدرآباد کی فیاضی کو دنیا کا مسلم طبقہ اچھی نظر سے دیکھے گا۔

صبح دکن پنجشنبہ ۲۰ ر شہریور ۱۳۵۴ف

قطعات برائے عمارت جدید مدرسہ نظامیہ

(ملقب بہ بیت العلوم مشرقیہ)

بہ پیشِ مصحفِ قدسی تو شو جبیں سائے (تسلیماً)　　　زہے ہر یچے بنگر تو نیز ملجائے (یعنے برائے طلبا)

چہ شانِ مکتبِ انوار گفت این عثمان　　　علومِ مشرقیہ را بخواں تو این جائے (جائے پناہ)

دیگر

دہد نوید کہ این مکتبِ معالی را (مکاتب گرامیہ) (بلند)　　　نگر بہ چشمِ دل ایں اسوۂ غزالی را (امام فقہ)

زمان و ساعتِ فرخندہ فالِ عثمان　　　دہد چہ گردشِ ایام و ہم لیالی را

(برائے نشاۃ الثانیہ مدرسہ)

نوٹ۔ جدید بنائے عمارت مدرسہ کا مادۂ تاریخ طبع ہوچکا ہے (اخبار صبح دکن مورخہ ۱۴ ر شعبان میں) لہذا وہ عمارت کے بیچ میں رہے گا اور ہر دو جانب قطعات مذکورہ سنگ مرمر کی تختیوں پر کندہ کراکے نصب کردئے جائیں گے جو بہ شکل یادگار رہیں گے

صبح دکن یکشنبہ ۲۳ ر شہریور ۱۳۵۵ف

تقرر مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی بہ مدرسۂ نظامیہ

(بر صدر مدرسی و نظامت)

یہ مسئلہ اسوقت زیر غور ہے جس کا تصفیہ آذر سیال تو فصلی میں ہوگا کیونکہ یہ اسوقت علیل ہیں اور مزید بران پیرانہ سالی ہے۔ مگر چونکہ ان کا علم و فضل درمیان علمائے احناف مسلمہ ہے لہذا اگر ممکن ہو سکے تو ان سے بہتر کوئی اور شخص اس کام کے لئے موزون نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کسی اور کا انتخاب کرنا ہوگا۔

بہر حال ایسے ہی اشخاص سے احیائے علوم دینی کی خدمت ہو سکتی ہے جن کا پایۂ علوم مذکورہ میں بلند ہو۔ امید ہے کہ جب وہ یہاں آجائیں گے (بعد دو ماہ) تو سب امور کا تصفیہ ہوگا یعنے وہ یہ خدمت انجام دے سکتے ہیں یا نہیں۔

رئیس اور اس کی گورنمنٹ ان سے بخوبی واقف ہے اس کے سوا ہندوستان میں بھی صاحب مذکور غیر معروف نہیں ہیں بلکہ مشہور ہیں۔

صبح دکن شنبہ ۲۹ ر شہریور ۱۳۵۴ ف

تقرر اراکین کمیٹی تحقیقاتی برائے بدعنوانیاں مدرسۂ نظامیہ

(مقرر کردہ رئیس اور اس کی گورنمنٹ)

---

(۱) کوتوال بلدہ دین یار جنگ (بہ حیثیت پریزیڈنٹ کمیٹی مذکور)
(۲) سید محمد پاشاہ حسینی صاحب (بہ حیثیت رکن کمیٹی مذکور)
(۳) محمد الیاس برنی صاحب (بہ حیثیت رکن کمیٹی مذکور)

مکرر۔ یہ کمیٹی دو ماہ کے عرصہ میں اپنی رپورٹ گورنمنٹ میں پیش کردے گی جس پر سے بعد غور و خوض تمام اہم مسائل مدرسۂ مذکورہ جدید کمیٹی انتظامی میں پیش ہو کر تصفیہ پائیں گے، جو کہ یکم آذر سال تو فصلی سے اپنا کام شروع کردے گی۔ اور موجودہ کمیٹی انتظامی برخاست ہو جائے گی۔

صبح دکن یکشنبہ ۳۰ ر شہریور ۱۳۵۴ ف

تخت نشینی میں آپکو خطاب "خان بہادر" اور ایک ہزاری منصب عطا ہوا۔

سنہ ۱۳۱۱ھ میں حجاز کا دوسرا سفر کیا۔ ۲۶ رمضان المبارک سنہ ۱۳۱۸ھ میں مولانا کی اہلیہ محترمہ نے حیدرآباد میں انتقال کیا۔ سنہ ۱۳۳۰ھ میں حجاز کا تیسرا سفر کیا اور اس سفر میں ہوتے ہوئے مدینہ منورہ پہنچے۔ اور یہاں تین سال تک اقامت اختیار کی۔ یہاں آپ کا تقریباً تمام وقت حرم محترم اور کتب خانہ میں گزرتا۔ آپ کی تصنیف "انوار احمدی" اسی زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ اس تین سال کے عرصہ میں مولانا نے کتب خانہ شیخ الاسلام اور کتب خانہ محمودیہ سے نادر نسخوں کے نقل کرانے میں ہزاروں روپیہ صرف کیا جن میں سے حسب ذیل مشہور ہیں۔

۱. کنز العمال۔ حدیث کی کتاب ۹ جلدوں میں۔
۲. جامع مسانید امام اعظمؒ۔
۳. جوہر نقی علی سنن بیہقی۔
۴. احادیث قدسیہ۔

سنہ ۱۳۳۰ھ میں آپ کی ہمشیرہ اور فرزند نے وہیں انتقال کیا۔ ہمراہیوں نے جلد چلنے پر مجبور کیا اس لئے آپ سنہ ۱۳۳۲ھ میں مراجعت فرمائے بلدہ ہوئے۔ آپ کی واپسی پر اعلیٰ حضرت غفران مکان نے آپ کو اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علیخان آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کی تعلیم کے لئے مقرر فرمایا اور یہ سلسلہ تخت نشینی سنہ ۱۳۲۹ھ تک جاری رہا۔

سنہ ۱۳۳۲ھ میں آپ پھر مقامات مقدسہ کی زیارت سے مشرف و فیضیاب ہونے کے لئے سامان جاب کمربستہ ہوئے۔ بغداد شریف نجف سے فیضیاب ہوتے ہوئے ہندوستان کے بھی بزرگان دین کی زیارت حاصل کی۔ سنہ ۱۳۳۲ھ میں حسب فرمان عطوفت نشان آپ ناظم امور مذہبی و صدر الصدور صوبہ جات دکن مقرر ہوئے۔ اور جب نواب مظفر جنگ بہادر معین المہام امور مذہبی نے سنہ ۱۳۳۴ھ میں رحلت کی تو جہاں پناہ نے اس عہدہ جلیلہ پر آپ ہی کو ترقی دی۔ سنہ ۱۳۳۵ھ میں پرنس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر پرنس آف برار اور والاشان نواب معظم جاہ بہادر کی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے اور سنہ ۱۳۳۶ھ تک اس خدمت کو انجام دیا۔ اور علالت کے سبب اس خدمت سے دست برداری حاصل کی۔ اسی سال آپ کو نواب فضیلت جنگ بہادر کا خطاب سرفراز ہوا۔ سنہ ۱۳۳۵ھ کے طاعون میں آپ اعلیٰ حضرت قدر قدرت کے ہمراہ ورنگل تشریف لے گئے تھے اور ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۵ھ کے جشن میلاد النبی منعقدہ مکہ مسجد میں شرکت کے لئے اجازت حاصل کرکے حیدرآباد تشریف لائے اور جشن میلاد النبی کے بعد پھر ورنگل واپس تشریف لیجا رہے تھے کہ آپ کی کمر میں درد شروع ہوگیا۔ ورنگل پہنچنے کے بعد حسب فرمان ایک مسجد کے معائنہ کے لئے تشریف لے گئے۔ حرکت سے درد میں اضافہ ہوتا گیا اس لئے اجازت لیکر حیدرآباد آگئے اور تین ماہ مختلف امراض میں علیل رہے۔ اوائل سنہ ۱۳۳۶ھ میں مرض سرطان میں مبتلا ہو گئے اور آخر پنجشنبہ کے دن جمادی الثانی سنہ ۱۳۳۶ھ کا ہلال افق مشرق پر نمودار ہوا اور یہ آفتاب علم و عمل غروب ہوگیا۔

بعد نماز جمعہ مکہ مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔ مولانا نے اپنی زندگی میں اپنا مسکن و وطن مدرسہ نظامیہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور وہیں دفن بھی کرنے کی وصیت کی تھی۔ لہٰذا حسب ارشاد تعمیل کی گئی۔

مولانا نے مدرسہ نظامیہ کو بیحد ترقی دی۔ پہلے معلم پھر صدر بن کر اس کو جس معیار پر لاکھڑا کیا اس کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا دیا جا سکتا ہے کہ بلاد اسلامیہ کے طلبہ کا ہندوستان بھر میں صرف یہی ایک ملجا و ماویٰ تھا۔ مولانا کا دوسرا عظیم الشان کارنامہ دائرۃ المعارف النظامیہ ہے۔ سنہ ۱۳۰۱ھ میں جب مولانا مدینہ طیبہ سے واپس ہوئے اور اپنے ساتھ علم کے وہ گنجینے جنھیں ہزاروں روپیہ کے صرفہ سے نقل کروایا تھا لے آئے تو انھیں زمانہ کی دست برد سے بچانے کا خیال پیدا ہوا لیکن اخراجات کی مجبوری نے عرصہ تک مولانا کو پریشان رکھا لیکن مولانا کے ارشاد پر ملا محمد عبد القیوم سابق کمشنر و اول تعلقدار نے دائرۃ المعارف قائم کر دیا تاکہ

مولانا کے ارادہ کی تکمیل باحسن الوجوہ انجام پا سکے اس کے قیام کے کچھ دنوں بعد سرکار سے پانچسو روپیہ ماہوار کی منظوری ہوئی اور کنز العمال دائرۃ المعارف کی سب سے پہلی شایع کردہ کتاب ہے جس کو مولانا نے مکہ معظمہ میں نقل کروایا تھا۔ ۱۳۰۸ھ حیدر آباد کی تاریخ میں یادگار رہے گا کہ مولانا کی تحریک اور ملا محمد عبد القیوم اور عماد الملک کی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کے ایک مشہور کتب خانہ "آصفیہ" کا قیام عمل میں آیا۔

مولانا نے اپنی صدارت امور مذہبی کے زمانہ میں اور اس سے پہلے جو اسلامی خدمات انجام دیں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مولانا نے اشاعت تعلیم دینی کی غرض سے کئی مدارس مختلف مقامات پر قائم کروائے اور انھیں سرکاری امداد دلوائی۔ ریاست ابد مدت سے باہر جن مدارس کو امداد ملی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ مدرسۂ معینیہ عثمانیہ۔ اجمیر شریف ایک ہزار روپیہ سالانہ۔ ۲۔ مدرسہ دیوبند چھ سو روپیہ ماہانہ۔ ۳۔ مدرسہ کوٹھا پور دو سو روپیہ ماہانہ۔ ۴۔ مدرسہ بدایوں ایک سو پچیس روپیہ ماہانہ۔ ۵۔ مدرسۂ سبحانیہ الہ آباد سو روپیہ ماہانہ۔ ۶۔ مدرسہ فتح پور دہلی پچاس روپیہ ماہانہ۔ ۷۔ مدرسہ میواڑا ودے پور ایک سو پچیس روپیہ ماہانہ۔

اس کے علاوہ عبد اللطیف خاں صاحب بھوپالی نے مختلف صنعتوں سے قرآن مجید کی کتابت کروائی تھی اور طبع کرانا چاہتے تھے۔ مولانا نے ان خوبیوں کو دیکھ کر پچاس روپیہ ماہوار تاحیات وظیفہ اور تین ہزار روپیہ کلدار طباعت کے لئے اخراجات دلائے۔

حکیم یعقوب خاں صاحب نے کلام مجید کا مرہٹی میں ترجمہ کیا اس کے صلہ میں پچاس روپیہ تاحیات اور پندرہ ہزار روپیہ طباعت کے لئے دلا دیئے۔

تفسیر روح الایمان کی طباعت کے لئے مولوی فتح الدین پنجابی کو دو ہزار روپے کلدار دلائے۔ مسجد آشٹیلیا کی تعمیر کے لئے چالیس ہزار اور بصرہ کی مسجد کے لئے بھی گرانقدر رقم دلوا دی۔ یہ سب کچھ اسلام کے لئے تھا لیکن مولانا نے اپنے عزیز و اقارب کے لئے کچھ نہ کیا۔ حیدر آباد کے لئے انھوں نے بہت کچھ کیا محکمۂ صدارت عالیہ کی مستقل و منظم شکل آپ ہی کی مرہون منت ہے۔ دیہات میں پڑھنے اور جاہل مسلمانوں کو ان کے فرایض یاد دلانے کے لئے واعظین مقرر کئے گئے۔ قاضیوں کو دورہ کرکے مسلمانوں کو "مسلمان" بنانے کے لئے احکام نافذ کئے جس سے خود قاضیوں کی اصلاح ہوئی اور دیہات کی حالت درست ہونے لگی۔ یہ طریقہ اب تک بھی جاری ہے۔ اہل خدمات شرعیہ اب تک وراثتاً چلے آتے تھے اور ان میں اپنی خدمتوں کو ادا کرنے کی قابلیت نہ ہوتی تھی مولانا نے اس طریقہ کو مسدود کرکے ان کے لئے امتحانات مقرر کروائے اور صرف انھیں کو اس خدمت کا اہل سمجھا گیا جو امتحان اہل خدمات شرعیہ کامیاب ہوں۔ مدرسہ نظامیہ میں غریب اہل خدمات شرعیہ کے لڑکوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا جہاں انھیں اب تک بھی کھانے رہنے اور پڑھنے کے لئے غذا کمرے اور کتابیں دی جاتی ہیں نہ صرف یہ بلکہ لباس بھی۔

طوائفین سر بازار رہ کر تہذیب و تمدن اخلاق و عادات پر بہت برا اثر ڈالتی تھیں آپ نے ان کو بازاروں سے برخواست کروایا۔ ناپ تول کے پیمانوں کی تصحیح عمل میں آئی۔ عرس وغیرہ میں مینا بازار منعقد ہوتے تھے انھیں بھی بند کرا دیا۔ غرض مولانا کی اصلاحات ان گنت ہیں اور ان کا ذکر کرنے کے لئے ایک علحدہ کتاب کی ضرورت ہے۔

مولانا بحیثیت ادیب

مولانا کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی عدیم الفرصتی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے لیکن اس پر بھی مولانا اپنے وقت کے سب سے بڑے مصنف ہیں۔ آپ نے جتنی کتابیں اس زمانہ میں لکھیں ان سے حیدر آباد کی ادبیات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ تمام کتابیں مذہبی ہیں لیکن ان میں بھی موضوع مختلف ہیں۔ حدیث، فقہ اور سیرت پر متعدد کتابیں تصنیف کیں اور ایک رسالہ "مقاصد الاسلام" جاری کیا جو بلا تعین وقت شایع ہوتا تھا۔

بعض مذاہب کے علم برداروں نے اسلام اور حنفی فقہ

پر اعتراضات کئے تھے جن کے جوابات مولانا نے ان ضخیم کتابوں کی صورت میں شائع کئے ہیں چنانچہ افادۃ الافہام مرزا غلام احمد قادیانی کے جواب میں لکھی گئی اور مرزا اس کا جواب نہ دے سکے۔

حقیقۃ الفقہ یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔ فرقہ اہل حدیث کے عقائد کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ ابتدا میں مولانا نے فقہ کی تاریخ بتلائی ہے اور اس کی تدوین میں فقہا نے جو زحمتیں برداشت کی ہیں ان کو گنایا ہے جس سے فقہ پر عاید ہونے والے الزامات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

الکلام المرفوع فیما یتعلق بالحدیث الموضوع اس میں جمع احادیث، واہلیت راوی، و حقیقت محدثین و فقہا، وضع و اعتبار وغیرہ سے بحث فرمائی ہے۔

خدا کی قدرت یہ ایک مختصر منظوم رسالہ ہے جس میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے استمداد کی جا سکتی ہے۔

رسالۂ خلق افعال اس میں حق تعالیٰ کا خالق افعال ہونا ثابت کیا گیا ہے۔ اور فرقہ معتزلہ اور قدریہ کے اعتراضات کے جوابات فلسفیانہ طرز میں دئے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ حسب ذیل کتابیں بھی لکھیں۔

۱۔ رسالہ انوار احمدی مسئلہ وحدۃ الوجود ۲۔ رسالہ انوار احمد (حج)۔ ۳۔ رسالہ چہل حدیث۔ ۴۔ رسالہ بشری الکرام (میلاد شریف کو محققانہ حیثیت سے ثابت کیا ہے)۔ ۵۔ کتاب التوحید (نفس توحید کے مسائل کو واضح کیا گیا ہے)۔ ۶۔ کتاب العقل (اس کتاب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انسانی عقل خواہ اس کا معیار کتنا ہی بلند ہو غلطی کی ضرور مرتکب ہوتی ہے۔) ۷۔ انوار احمدی (یہ قیام مدینہ منورہ کے زمانہ میں لکھی گئی ہے۔ مولانا کے پیر و مرشد حاجی امداد اللہ صاحب نے اس پر ایک تقریظ بھی لکھی ہے۔)

مولانا بحیثیت شاعر مولانا کہنہ مشق شاعر نہ تھے لیکن جذبات کے اظہار کا (جو تصوف میں ڈوبا ہوا ہو) بہترین ذریعہ اشعار ہیں اور اسی بنا پر وہ کبھی شعر کہتے تھے۔ آپ کا کلام ضمیم الانوار کے نام سے شائع ہو چکا ہے لیکن ان میں اشعار کی تعداد بہت کم ہے زیادہ اشعار جن میں غزلیں وغیرہ شامل ہیں فارسی میں ہیں مولانا نے عرفی کے قصیدہ حمد کی طرز میں خود بھی ایک حمد اسی بحر و وزن میں لکھی ہے جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

اے ہوایت طرح رنگ کن فکاں انداختہ
طرح عشق اندر ہیولائے جہاں انداختہ

در سرشت ہوشانِ سرمدی اندر ازل
رنگ نیرنگِ تجدد واز زماں انداختہ

اے کہ عشقت شد فروکش ہر کجا کاندر وجود
عقل را بیرون سر حد گماں انداختہ

بر درِ گنجینۂ اسرار و خلوت گاہ خویش
قفلِ وسواس از خیال این و آں انداختہ

اکبر الدین صدیقی

غزل

آج تک دل کی آرزو ہے وہی
پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی

ہو گئی مے بہار میں کچھ اور
ورنہ ساغر وہی سبو ہے وہی

دل کے داغوں پہ اوس کیا پڑتی
وہی گلشن ہے رنگ و بو ہے وہی

لاکھ گر جائیں اشک آنکھوں سے
پھر بھی موتی کی آبرو ہے وہی

کھینچکر تیغ آزما دیکھو
ان رگوں میں ابھی لہو ہے وہی

عمر گذری تلاش میں لیکن
گرمئ پائے جستجو ہے وہی

صبر آجائے اسکی کیا امید
میں وہی دل وہی ہے تو ہے وہی

مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو
بھول جاتا ہوں میں کہ تو ہے وہی

میکدے کا جلیلؔ رنگ نہ پوچھ
رقصِ جام و خم و سبو ہے وہی

فصاحت جنگ جلیلؔ

کم وبیشی در موجودہ اساتذہ مدرسۂ نظامیہ

مولوی شبیر احمد صاحب دیوبندی کے معاملہ کی یکسوئی ہوتے ہی (در ماہ آذر سال نو فصلی) جدید کمیٹی انتظامی اساتذہ کے مسئلہ پر غور کرے گی اور انکا معیار قابلیت اور ذاتی کردار کا جائزہ لے گی کہ یہ طلباء کو پڑھانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ اس کے سوا موجودہ نصاب تعلیم اور نظم و نسق پر بھی غور کرے گی کہ اس میں کہاں تک رد و بدل ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک از جز تا کل تمام امور پر نظر نہ ڈالی جائے کام اطمینان بخش طریقہ پر چل نہیں سکتا جس کی سخت ضرورت ہے۔

دیگر۔ یکم آذر سال نو فصلی شروع ہونے کے لیئے صرف دو ماہ باقی رہ گئے ہیں لہذا اس دوران میں موجودہ قدیم کمیٹی انتظامی مدرسہ مذکورہ کوئی جدید اقدام کسی معاملہ میں نہیں کرسکتی کہ ایک طرح سے یہ معطل ہوچکی ہے۔

صبح دکن شنبہ یکم مہر ۵۴ف

از خسروِ شیریں سخن اعلحضرت سلطان العلوم سلطان الشعراء خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

نظم بتقریب سنگِ بنیاد جدید عمارت مدرسۂ نظامیہ

(ملقب بہ بیت العلوم مشرقیہ)

(مطلع) قیمتِ جنسِ فزوں تر ہوئی بازاروں سے — دل بھی آباد ہوا دیکھ خریداروں سے

(بڑھی) (خوش)

آمدِ بادِ بہاری نے جمایا نقشہ — خلشِ گل بھی مٹی دیکھ لے تو خاروں سے

(یعنے وقت پر توجہ ہوئی) (یعنے بدعنوانیاں مرفع ہوئیں)

بلبلیں اوڑتی ہیں ہو ہو کہ چمن پر قربان — رنگ گل پھوٹ پڑا آج جو گلزاروں سے

(یعنے طلباء) (دہ تشبیہ) (مدرسہ) (یعنے نتیجہ تجاویز دیکھکر)

دیکھ لے آج ذرا شانِ علومِ دینی — صوتِ تبریک نمایاں ہے جو مزماروں سے

(آواز مبارکباد) (آلات موسیقی)

سنگ اور خشت نے بھی خوب دکھایا جوہر — صنعتِ قصر ہوئی دیکھ لے معماروں سے

(مدرسہ)

شام کہتی ہے یہی صبح صفا سے سُن لو
جگمگایا ہے فلک دیکھ لے تو تاروں سے
(در تشبیہ)

(مقطع) نہیں معلوم ہوا کیا ہے جبھی تو عثمان
(یعنی تنظیم جدید)
گونج اوٹھا مکتبِ انوار پرستاروں سے
(در تحسین و آفرین) (بہی خواہان)

رائے اوستاد جلیل۔ سبحان اللہ بے مثل نظم ہے جو ایک یادگار چیز ہے۔

نوٹ۔ بعد تکمیل جدید عمارت مدرسہ سنگ مرمر کی تختی پر کسی موزون جگہ یہ نصب کر دی جائے گی۔

صبح دکن چہار شنبہ ۱۲ مہر ۱۳۵۴ ف

شرکت خان بہادر علاء الدین المخاطب احمد نواز جنگ

بہ مدرسۂ نظامیہ

اونھوں نے اطلاع دی ہے کہ جب جدید عمارت تیار ہوجائے گی تو اپنے ذاتی مصارف سے (معلبہ ہزار) برقی روشنی و پنکھوں کا انتظام کرا دیں گے۔ اس کے لئے مدرسۂ مذکورہ ان کا ممنون و مشکور ہے کہ یہ بھی شرکت کار خیر و برکت سے محروم نہیں بلکہ فیض یاب رہے۔

صبح دکن پنجشنبہ ۱۳ مہر ۱۳۵۴ ف

مادرِ دکن لائبریری

(کتابخانہ)

جب جدید عمارت مدرسۂ نظامیہ ملقب بہ بیت العلوم مشرقیہ مکمل ہوجائے گی تو یہاں ایک مختصر سا ہال بنا دیا جائے گا جہاں وہ سب کتب (در زبان عربی یا فارسی یا اردو) جو کہ نذری باغ میں بیکار سمجھے جائیں گے (مع رسائل و میگزین وغیرہ) بغیر معاوضہ مدرسۂ مذکورہ کو دیدیے جائیں گے تاکہ اس سے طلباء مستفید ہوں۔ غالباً اس کی تعداد و ڈیڑھ یا دو سو جلد سے کم نہ ہوگی اور اسکی نگہداشت کے لئے کچھ عملہ منجانب محکمۂ صرفخاص مقرر کردیا جائے گا۔

دیگر۔ چونکہ صرفخاص نے بغیر معاوضہ زمین مدرسہ کی عمارت کے لئے دیدی ہے لہذا ان امور کے مدنظر ایک رکن کمیٹی صرفخاص کا اضافہ ہوگا اوس مقررہ جدید کمیٹی انتظامی میں جس کا تقرر ہوچکا ہے۔ یہ زاید رکن کمیٹی مذکورہ کون

ہوگا اس کا اعلان او اخر آبان میں کیا جائے گا۔ اور اس شخص کو صرف ان امور سے تعلق ہوگا جو صرف مجلس سے تعلق رکھتے ہوں ورنہ دوسرے امور سے اوسکو واسطہ نہ ہوگا۔

اس کے سوا چونکہ عمارت کی تعمیر بہ مشورۂ زین یار جنگ ممبر آف کونسل ہوگی لہذا اس عمارت کی آئندہ نگہداشت سے تعلق انکی موجودگی بھی بہ حیثیت زائد رکن کمیٹی مذکورہ ضروری ہے۔ لہذا وہ اس حد تک (مثل رکن کمیٹی صرف خاص) اس میں کام کریں گے۔

امید قوی ہے کہ انشاء اللہ دنیائے اسلام میں یہ دینی مدرسہ نہ صرف شہرت حاصل کرے گا بلکہ وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ بعونہ وکرمہ

صبح دکن پنجشنبہ ۱۰ ر مہر ۱۳۵۴ ف

فضیلت جنگ مرحوم کے حالاتِ زندگی

آپ ۴ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ میں بمقام ناندیڑ پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم مولانا کے والد بزرگوار مولانا محمد شجاع الدین قندھاری نے دی مولانا سید شاہ بدیع الدین رفاعی قندھاری کے یہاں قرآن شریف شروع کیا سات سال کی عمر میں آپ کو حفظ قرآن مجید کے لئے حافظ امجد علی صاحب نابینا کے تفویض کیا گیا آپ نے چار سال میں کلام مجید حفظ کیا۔ مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی مولانا عبدالحی فرنگی محلی مولوی فیاض الدین اورنگ آبادی سے فقہ کی تکمیل کی۔ شیخ عبداللہ یمنی جو اس زمانے میں موجود تھے آپ کو تفسیر و حدیث کے درس دیتے تھے آپ کے ذوق علم کی تشنگی دیکھ کر آپ کے استاد بھی انگشت بدندان تھے اور اپنے ذکی شاگرد کا اپنی تصنیفوں میں مختلف مقامات پر ذکر فرمایا ہے۔ آپ نے سلوک کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور تمام سلسلوں میں بیعت کی۔

ازدواج و ملازمت وغیرہ

۱۲۸۴ھ میں حاجی محمد امیر الدین محتسب بنولہ کی صاحبزادی آپ سے منسوب ہوئیں ۱۲۸۵ھ میں محکمہ مالگذاری میں خلاصہ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے لیکن اس ملازمت سے محض اس وجہ سے جلد سبکدوشی حاصل کرلی کہ اس میں سودی لین دین کی مثل کا خلاصہ لکھنا پڑتا تھا۔ مستعفی ہونے کے بعد آپ پھر درس و تدریس میں مشغول ہوگئے اس اثنا میں محلہ چنچل گوڑہ میں مولوی امیر الدین صاحب پونیری نے ایک مسجد اور مدرسہ بنایا تھا جو عام مسلمانوں اور خاصکر اہل خدمات شرعیہ کی اولاد کی تعلیم و تربیت میں سرگرم تھا ملازمت سے علحدہ ہونے کے بعد جب مولانا خانہ نشین ہوگئے تو بانیٔ مدرسہ امیر الدین صاحب نے آپ کو بھی اس میں درس و تدریس کی دعوت دی۔ آپ کے تعلق کے بعد اور خاص کر آپ کی ترقی کے زمانے میں مدرسہ کو بھی ترقی ہوئی اور آخرکار وہ آپ ہی سے متعلق ہوگیا ۱۲۹۲ھ میں مولانا اس کے اعزازی صدر مقرر ہوئے۔ آپ کی تعلیم کی شہرت نے اتنی ترقی پائی کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ بلاد اسلامیہ سے شائقین علم اپنی تشنگی علم بجھانے آتے اور فیض یاب ہوتے۔

۱۲۹۴ھ میں آپ نے حج کا ارادہ فرمایا مکہ معظمہ پہنچ کر شیخ الوقت فانی فی اللہ باقی باللہ حاجی امداد اللہ احمد سے تمام سلسلوں میں مکرر بیعت کی اور سلوک کے منازل کی تکمیل کی۔ آپ کے ذوق علم اور اعلیٰ قابلیت کی بنا پر آپ کے پیر و مرشد نے بلا طلب خلعت خلافت مرحمت فرمایا۔

مولانا بحیثیت استاد مغفرت مکان

۱۲۹۵ھ میں محمد زماں خاںؒ نے جو اعلیٰ حضرت غفراں مکاں کے استاد تھے درجہ شہادت پایا اور ان کے بجائے ان کے بھائی مولوی مسیح الزماں خاں تعلیم کے لئے مقرر ہوئے لیکن آپ کو دیگر امور سلطنت بھی انجام دینے پڑتے تھے اس لئے مولانا انوار اللہ کا اس خدمت پر انتخاب کیا اور نواب سر سالار جنگ اول سے رائے لے کر دربار سے منظوری بھی حاصل کرلی لیکن اس کی اطلاع مولانا کو اس وقت تک نہ ہوئی جب تک فرمان خبر قصد ورنہ لایا۔ فرمان دیکھ کر مولانا نے کہا :-

"قومی خدمت بادشاہوں کی خدمت سے کہیں
زیادہ بہتر ہے پس اس کو قبول نہیں کر سکتا۔"

لیکن مولانا مسیح الزماں نے آپ کو سمجھا دیا: "میں نے پہلے پہل تمام مراحل طے کر کے منظوری حاصل کی ہے اگر آپ انکار کریں گے تو مجھے خفیف ہونا پڑے گا۔" مولانا نے بعد میں اس کو منظور کرلیا۔ اس سلسلے میں آپ کو چار سو روپیہ ماہانہ خزانہ صرفخاص سے تاحیات ملتے رہے۔ ۱۳۰۱ھ میں ولیعہد جشن

نئی نظم کی زبان

ہماری زبان کی تعمیر و تکمیل ایسے حالات میں ہوئی کہ شروع ہی سے یہ مسئلہ اختلافات کی زد میں رہا ہے۔ پچھلے زمانہ کے نظم جنھیں اب تک کھل کر بہنے کا موقع نہ مل سکا تھا عہد حاضر کی آزاد ہواؤں میں پھر تازہ ہوئے اور نہ جانے زبان کے اجتماعی خد و خال پر ان کا آئندہ اثر کیا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ شاعری نام ہے زبان اور نفسیات کے اجتماع کا۔ زبان جتنی ستھری اور صاف ہوگی حیات انسانی کے حقائق اسی قدر دل آویز ہوتے چلے جائیں گے اور یہی کمال شاعری۔ غالباً اب اس پر کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں ہے کہ ہماری شاعری اپنی زندگی کے وسطی عہد تک تصورات کی بھول بھلیوں میں گم گردہ رہی کی ٹھوکریں کھاتی رہی ہے اس لئے اس میں کچھ شک نہیں کہ عہد حاضر کے شعراء کی یہ سعی جمیل قابل احترام ہے کہ انھوں نے شعر و ادب کا رخ حقائق حیات کی جانب پھیرا اور شاعری کو اسی آب و گل کی دنیا کے چلتے پھرتے مناظر سے آشنا کیا لیکن اسی کے ساتھ میرا خیال ہے کہ انھوں نے اسے ضد کہئے یا پرانی قید و بند کا رد عمل، بہت سی شعری لطافتوں کو کھو دیا۔

اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ زندگی کی نفسی کیفیات مختلف تجربات اور حقیقتوں کو بیان کرنے کا انداز یکساں نہیں ہوتا۔ آپ سائنس کو رومان اور رومان کو سائنس کا چولہ دیکر کامیاب ادیب یا شاعر نہیں بن سکتے اور نہ کسی خاص موضوع کے ایک نقطہ پر شعر و ادب کی تمام بسیط و لطیف فضاؤں کو جھکایا جا سکتا ہے لیکن ہمارے جدید شاعر ان امور کا خیال کئے بغیر بھوک اور افلاس کے زاویوں میں گم ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ کسی نے اگر دو قدم آگے بڑھنے کی جرأت کی تو جنسیات کی طفلانہ اور غیر اخلاقی کیفیات بہت ہی غیر سنجیدہ انداز میں بیان کرنے لگا۔ خوشا رعایت ذوق!

اردو میں نظم یوں تو شروع ہی سے چلی آ رہی ہے بلکہ شاید اس زبان کی شاعری نظم ہی سے شروع ہوئی ہے چنانچہ مثنوی ترجیع بند وغیرہ اسی کا ثبوت ہیں لیکن ایسی نظم جس میں حقائق اپنے صحیح خد و خال میں پیش کئے جائیں آزاد اور حالی کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ خصوصاً مولانا حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری لکھ کر ہندوستانی شعراء کی ذہنیت پر ایک ایسی ضرب لگائی کہ وہ اپنی شاعری کو خرافات کا انبار سمجھنے پر مجبور ہو گئے۔ مولانا حالی نے نہ صرف نظم کا پرچار کیا بلکہ خود بھی قدیم انداز شعر کو چھوڑ کر زندگی کے مختلف مسائل پر سیر حاصل نظمیں لکھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی نظموں کا انداز ہندوستانی ادب میں ہمہ گیری کی قوت حاصل نہ کر سکا۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ حالی نے زبان اور انداز بیان کا وہ اسلوب اختیار کیا جو نظم سے زیادہ نثر کے لئے موزوں تھا وہ اپنی ہر نظم میں معمولی جزئیات تک کو شعر کا لباس دینا چاہتے تھے اور چونکہ ان کے بعد ہی علامہ اقبال اس سطح پر آ چکے تھے اور انھوں نے نظم کا صحیح انداز مطالب و معانی کو شعری ترقی اور گداز کے ساتھ پیش کرنے کا سلیقہ ادبی دنیا میں نمایاں کرنا شروع کر دیا تھا اس لئے حالی کی شاعری کامیابی کی منزل تک نہ پہنچ سکی البتہ ان کی مسدس کو وہ حیات دوام حاصل رہی جو شاید اردو کی کسی اور نظم کو حاصل نہ ہو سکی اصل میں مسدس مولانا کے دل کی آواز تھا۔ ان کی قومی درد مندی نے اس میں خود بخود وہ ادبی بلندیاں شاعرانہ لطافتیں اور سوز و گداز کی وہ کیفیتیں پیدا کر دیں جو کوشش و کاوش سے کبھی حاصل نہیں ہوتیں۔ بہرحال اکثر ارباب نظر کی یہ رائے ہے کہ مولانا حالی کی نظموں سے بہتر ان کی وہ اصلاحی غزلیں ہیں جو انھوں نے اپنا نقطۂ نظر بدلنے کے بعد کہی تھیں، چنانچہ طبا طبائی نے خود مجھ سے زبانی یہی کہا تھا۔

اس توضیح سے میرا مقصد یہ ہے کہ انداز بیان کی

خصوصیت اگر نہ ہو تو بڑے سے بڑے شاعر کو وہ ادبی کامیابی حاصل نہیں ہوتی جو قوموں کی تقدیر پلٹ دیتی ہے۔

گزشتہ عہد کے دوسرے شاعر بھی ہیں آپ انھیں پڑھیے اور پھر اقبال کا مطالعہ کیجیے آپ کو ان قدیم شاعروں کی فنی کاوشیں اقبال کے شعر و ادب کے مقابلہ میں تنکوں کا کھیل نظر آئیں گی۔

اقبال نے تمام عمر زندگی کی ٹھوس حقیقتیں بیان کیں اور فطرت انسانی کے نازک سے نازک پہلو کو چھیڑا لیکن ان خشک موضوعات میں شاعرانہ لطافت بیان کے ایسے نشتر بھی چھپا دیے جو دلوں میں ڈوب کر رہتے ہیں اقبال نے مزدور پر بھی لکھا اور کسان پر بھی۔ بھوک کی تباہ کاریاں اور افلاس کی تلخیاں سب کچھ بیان کیں لیکن خطابت اور نثر کی بے کیفیتوں سے اس کا دامن ہمیشہ پاک رہا اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نہ صرف خود کامیاب ہوا بلکہ اس کی شاعری بھی زندۂ جاوید ہو کر رہی۔

میں اپنے نئے دوستوں سے پوچھتا ہوں کہ انھوں نے بیان کا جو اسلوب اختیار کیا ہے اور شاعری کے لئے جن غیر اخلاقی اور غیر آئینی موضوعات کی بنیاد ڈالی ہے وہ وہی ہیں جو دنیا کی تمام علمی زبانوں کے ادب کو کامیابی کی منزل تک پہنچاتے ہیں اور جن کا نقش زمانہ کے تغیرات کی رو نہیں مٹا سکتی؟ یا بغیر سمجھے بوجھے وہ اس راستہ پر بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

ادب میں انقلاب آج کی بات نہیں ہے بلکہ یہ اس وقت شروع ہو گیا تھا جب مرزا غالب نے عود ہندی اور میر امن نے چہار درویش لکھی تھی۔ عہد حاضر بھی اصل میں اسی ابتدائی نشاۃ ثانیہ کی آواز بازگشت ہے میں شروع سے کہتا آ رہا ہوں کہ ٹکسالی زبان کی بحثیں اور فن کی پرانی رسوم و قیود اب ختم ہونی چاہئیں۔ اس میں نئے حالات کے لحاظ سے نئے زاویے نکالنے اور نئے خطوط بنانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہو سکتا کہ جو ادبی بلندیاں اور زبان و بیان کی لطافتیں حاصل کی جا چکی ہیں انھیں کھو دیا جائے اور ایک ایسی زبان کی ترویج کی جائے جو عوام میں بولی ٹھولی کی حیثیت سے تو ہمیشہ موجود رہی ہے لیکن جس سے اہل علم اور خواص ہمیشہ دامن بچا کر چلے ہیں ایسی کوششیں وقتی ہنگامہ تو پیدا کر سکتی ہیں اور آنی وانی ادبی خوبیوں کا منہ تو چڑھا سکتی ہیں لیکن نہ ان کو بقائے دوام حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ان کے زرد چہرے خد و خال ادب کے عالمگیر حسن کی دل آویزی حاصل کر سکتے ہیں۔

میں اسے مانتا ہوں کہ ہندوستان کی موجودہ زندگی کچھ ایسے آثار چڑھاؤ سے گزر رہی ہے جس میں کسی چیز کو قیام نہیں ہے غالباً میرے نئے دوستوں کا خیال بھی یہی ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھتا ہوں ہمیں ادب کی نکھری ہوئی سطح کو ناہموار نہ کرنا چاہیے۔ ہمارا ادب دنیا کی تمام متمدن زبانوں کے دوش بدوش آ چکا ہے اس میں ہر موضوع کو ادا کرنے کی صلاحیت اور ہر حقیقت کو قبول کرنے کی لچک موجود ہے اس لئے بڑی ضرورت ہے کہ ہم ادب کی سیرت کو اپنی عریانی اور فحاشی سے چوک اور چکلہ کی چیز نہ بننے دیں بلکہ احتیاط اور اہتمام کے ساتھ قومی تعمیر و تعمیر میں اس سے مدد لیں۔

نئی نظم میں چند مخصوص الفاظ کا ایک محور قائم کر لیا گیا ہے جس کے ارد گرد نظم اور اس کا سارا پلاٹ گھومتا ہے اور وہ الفاظ کچھ اس قسم کے ہیں سڑی لمبی لاشیں۔ متعفن چانچے۔ کوڑھی جسم۔ بوڑھی لنگڑی انسانیت، دولت کے دھندے، سرمایہ داری کے بھوت، تاریکیاں۔ دھند۔ جنسیت۔ عرش۔ تارے وغیرہ لعل تو یہی صحیح نہیں ہے کہ نظم کو لفظوں کا پابند کیا جائے اور مشاہدات کو تصور کے ایک تنگ گھیرے میں بند کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ کون کہہ سکتا ہے کہ جو زبانوں پر جو الفاظ خشونت اور انتقام کے موقع پر بھی آتے ہوئے رکتے ہیں وہ شعر کے جیسے لطیف اور نازک رشتوں میں گوندھے جا سکتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ نئے شعراء اصل اور فن تو ایک طرف اپنی زبان کے پھیلاؤ اور بہاؤ سے بھی بہت کم واقف

ہیں۔ کارلائل نے کہا تھا کہ ایک ادیب اور عالم میں یہ فرق ہے کہ ادیب لفظوں کے اندر چلتی ہوئی روح کو پہچان لیتا ہے اور عالم لفظوں کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے۔ ہمارے نئے شعراء ایسے مشوروں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں جو انہیں اپنی زبان کے ترشے ہوئے اور ناتراشیدہ جواہر کی پہچان میں مدد دے سکتے ہیں۔

یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ادب کی دو صورتیں ہیں ایک تو محض ادب اور اس سے ہر شخص بقدر ذوق کام لے سکتا ہے اور دوسری سیرت ادب اور یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ سیرت ادب کو پہچاننے کا ملکہ بڑے وسیع تجربہ اور مطالعہ کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی جان لینا اور اس کے بعض جدید ادبی کارناموں کو دیکھکر اندھی تقلید سے کسی زبان کا ادب نہیں بنتا بلکہ اس کے لئے ایک آدمی کو اپنی زندگی کی بے شمار راتیں گن کر گزارنی پڑتی ہیں اور سیکڑوں دن غور و فکر کی نذر کرنے پڑتے ہیں تب کہیں زبان اور فن کے وہ حقایق سمجھ میں آتے ہیں جو صحیح معنوں میں ادبی تعمیر کا کام دے سکیں۔

غالب نے پچاس برس کی عمر تک جو کچھ کہا تھا اسے خود نظری کر دیا۔ گوئٹے کو فاوسٹ پر پچاس سال سے زیادہ محنت کرنی پڑی تھی۔ دنیا کی تمام مشہور ہستیاں اسی طرح بنی ہیں اور اسی طرح بنتی ہیں۔ بہر حال خیالات چاہے جس طرح کے نظم کئے جائیں لیکن یہ ضروری ہے کہ بیان میں مشرقی نرمی اور زبان میں شعری حلاوت باقی رہے۔ شاعر خشونت و انتقام کے جذبات کو ابھارنے کے لئے پیدا نہیں ہوا گو کبھی کبھی اسے اس حربہ سے کام لینا پڑتا ہے لیکن اس کا اصل مشن عالمگیر برادری کا ایک مستقل پیام ہے وہ ہر چیز پر آفاقی وسعتوں کے ساتھ نظر ڈالتا ہے ایسا شخص ہرگز شاعر نہیں ہے جسے اپنے جام میں تو شراب سرچشمۂ کیف و سرور نظر آئے لیکن اگر وہی شراب دولتمند پینے لگیں تو مزدوروں کا خون بن کر قابل نفرت قرار دیجائے اور پھر ایسی زبان میں اپنے نصب العین کا پرچار کیا جائے جسے سن کر شیطان بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔

میرا لہجہ کسی قدر تلخ محسوس ہوگا لیکن یقین جانئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اس درد و کرب کا نتیجہ ہے جو عہد حاضر میں بہت سے قیمتی جوہروں کی تباہی سے میرے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ میری عمر کا بیشتر حصہ اسی فن کی بری بھلی خدمت میں گزرا ہے اس لئے یہ قدرتی امر ہے کہ اتنے دن کی انتھک محنتوں سے تعمیر کی ہوئی عمارت کو یوں منہدم ہوتے ہوئے دیکھنا میرے لئے بہت دشوار ہے۔

علی اختر

(لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد دکن سے پڑھا گیا)

"پک وک" کی حقیقت

(ناولسٹ کو یہ نام کیسے ملا)

والٹر شوپک کے قلم سے

لندن سے باتھ جانے والی شاہراہ پر ایک چھوٹا سا دیہات واقع ہے جو تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اس کا نام "پک وک" ہے اور اس دیہات میں جانے والے راستہ پر ایک بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں اس کا نام لکھا ہے۔

ادبیات انگلستان کی تواریخ میں اکثر اس بات کا ذکر آیا ہے کہ چارلس ڈکنز کی عظیم ترین دریافتوں میں "پک وک" کا نام بھی شامل ہے۔ جو دنیا میں کم سے کم اتنا ہی مشہور ہے جتنا کہ "اسٹاف"۔ اس زمانے سے اب تک "پک وک" کے چھوٹے سے دیہات کے متعلق اور اس چیز کے بارے میں کہ ناول نگار نے اپنی کتاب "پک وک کلب کے مسودات" کے غیر فانی ہیرو کا نام کہاں سے حاصل کیا بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کی حقیقت کے بارے میں محققین تاریخ ادبیات مندرجۂ ذیل رومانی داستان بیان کرتے ہیں۔

۱۵۰۰ء کے قریب باتھ کے نزدیک "پک وک" نامی گاؤں میں ایک عورت کو ایک لاوارث بچہ ملا۔ اس عورت نے بچے کو پالا پوسا اور اس کا نام "الیزار پک وک" رکھا جو گویا "الیزار۔ جسے وک سے اٹھایا گیا" کا مخفف تھا۔ ایک عرصے بعد یہ بچہ ایک شخص "موزز پک وک" کا پردادا بن گیا جو اس زمانے میں جبکہ چارلس ڈکنز باتھ کے مقام پر اپنا ناول لکھ رہا تھا ایک سرائے "دی وائٹ ہارٹ" کا مالک تھا۔ پک وک کا نام اس گاڑی کے دروازوں پر لکھا تھا جو سرائے کے مالک نے مہمانوں کو لانے لے جانے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ اس طرح یہ نام مصنف کی نظر پڑا۔ جب ڈکنز نے اس نام کو دیکھا تو کہا جاتا ہے کہ اس نے بڑی حیرت سے کہا "کتنا عجیب نام ہے" اور اس نے فوراً اسے اپنی یادداشت کی کتاب میں تحریر کر لیا۔

افواہ ہے کہ باتھ میں فی زمانہ بھی تین "پک وک" موجود ہیں جو اسی شخص "موزز پک وک" کی اولاد سے ہیں جس کے نام پر اس مشہور کتاب کا نام پڑا۔ پچھلے دنوں جب میں باتھ میں تھا تو میں نے انھیں ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی مگر سب بے سود۔ ایک شخص سے جب میں نے دریافت کیا تو اس نے کہا "پک وک" کہلانا کوئی خوش قسمتی نہیں اس لئے کہ جیسا کہ آپ کو علم ہوگا "مسٹر پک وک ایک بوڑھا بے وقوف تھا" جب میں نے کہا کہ ایک شخص جو ایسے مشہور خاندان سے تعلق رکھتا ہو بڑا نام پیدا کر سکتا ہے تو کچھ اثر پذیر نہ ہوا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سر ہلایا اور بولا "اس نام میں آخر کیا خوبی ہے۔"

کچھ عرصے کے بعد جب میں لندن کی "ٹیلیفون ڈائریکٹری" کے صفحات الٹ پلٹ رہا تھا تو ــــ اور سچ پوچھئے تو اس ڈائریکٹری کے دونوں حصے جاسوسی کی کہانیوں سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتے ــــ مجھ پر عجیب و غریب انکشافات ہوئے لندن میں دو خاندان ہیں جن کا نام "پک وک" ہے۔ یہاں پر بہت سے "چارلس ڈکنز" بھی ہیں اور یہی نہیں بلکہ دنیا کا ہر نام اس ڈائریکٹری میں موجود تھا۔ ان میں ۱۲ "شیکسپیئر" تھے جن میں ایک "ولیم شیکسپیئر" بھی شامل تھا۔ ۳۰ "بائرن" تھے بہت سے "گینز برو" "آئنسٹائن" "بے شمار "میکالے" "نصف درجن" "کلائیو" اور ایک "موزرٹ" بھی تھا۔

سو سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب "پک وک سیریز" لندن میں مشہور ہوئے۔ یہ ناول شروع میں چھوٹی چھوٹی قسطوں میں اور بعد میں ایک مکمل کتاب کی

صورت میں شائع ہوا اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ روس میں جہاں حال ہی میں ڈکنز کا ایک مکمل ایڈیشن شائع ہوا ہے، ڈکنز لاکھوں انسانوں کا پسندیدہ مصنف ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈکنز دنیا کا محبوب ترین مصنف ہے۔

(ترجمہ)

یاد

کبھی مجھ کو غم نے یہاں تک رلایا　　کہ رو رو کے آنکھوں سے دریا بہایا
کبھی وہ مناتے تھے ہم روٹھتے تھے　　کبھی وہ جو روٹھے تو ہم نے منایا
کبھی دوسروں کے لطیفے سنا کر　　وہ خود بھی ہنسے اور مجھے بھی ہنسایا
کبھی مسکراتے چمن میں جو آئے　　تو گل کیا، چمن کا چمن مسکرایا
کبھی چاند کی سیمگوں چاندنی میں　　محبت بھرا اک ترانہ سنایا
کبھی ہو کے برہم دلِ مبتلا کو　　خدنگِ نظر کا نشانہ بنایا
نہ دل میرے بس میں نہ آنکھوں پہ قابو　　نظر بھی پرائی ہے دل بھی پرایا
محبت کی باتیں جوانی کا قصہ　　کسی نے سنا اور کسی نے سنایا
نہ ہستی کی لذت نہ لطفِ جوانی　　محبت کی دنیا میں کیا میں نے پایا
غرض عشق میں دل کی بازی لگا کر　　کبھی میں نے کھویا کبھی میں نے پایا

نہالؔ اب محبت کا ایسا زمانہ
نہ پھر آئے گا زندگی بھر نہ آیا

نہالؔ صدیقی

ضیافت

اس چھوٹے سے مقام پر ایسے بڑے افسر کی آمد نے ہل چل مچادی، ہر شخص دیدار کا مشتاق نظر آتا تھا۔ سب لوگ آمد کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ مقامی عہدہ داروں نے تیاری شروع کردی۔ عمارتوں کی داغ دوزی ہونے لگی، سڑکوں کی مرمت اور گلیوں کی صفائی شروع ہوگئی نالیوں اور بدرووں کی غلاظت نکالی گئی۔ سنا ہے سال میں ایک مرتبہ گھوڑ کی قسمت بھی پھرتی ہے۔ وہ سماں اس موقع پر دیکھنے میں آیا۔ بڑے افسر کا آنا اس مقام کی خوش قسمتی کا باعث ہوا۔

تعمیرات کے محکمہ نے سب سے زیادہ کام کیا ہے عمارتوں کی دیکھ ریکھ اور سڑکوں کی مرمت اسی محکمہ سے متعلق ہے مسافر بنگلہ بھی جہاں بڑے افسر فروکش ہوں گے اسی سررشتہ کی نگرانی میں ہے اس لئے محکمہ کے لوگ دن رات کام میں لگے ہوئے ہیں۔ مقامی افسر نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک زبردست ضیافت کا انتظام کیا ہے۔ بڑے افسر کو کھانا کھلا کر خوش کرنے کا موقع عمر بھر میں ایک آدھ دفعہ ملتا ہے اس لئے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور لگے ہاتھوں دوسروں کو بھی دعوت میں شریک کر لینا چاہیے کہ وہ بھی احسان مند رہیں۔ نمک کا خیال سب کو ہوتا ہے پھر اپنی ترقی کا معاملہ بھی تو ہے۔

مال والوں کے بغیر کوئی کام نہیں ہوسکتا۔ انڈے مرغی کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے اور اس چھوٹے مقام پر تو قیمت ادا کرنے کے بعد بھی نہیں ملتے۔ مال والے مدد کریں تو یہ چیزیں بلا قیمت دستیاب ہوجاتی ہیں۔ مزدوروں کی مزدوری بھی آج کل چوگنی ہے ہندوستان کا مزدور کام چور ہوتا ہے، اجرت پوری مانگتا ہے اور کام آدھا بھی کرنا نہیں چاہتا اس لئے اس ملک کے عقلمند آدمیوں نے یہاں بیگار کا طریقہ جاری کر رکھا ہے یعنی مزدوروں سے کام پورا لیا جائے مگر دام بالکل نہ دیے جائیں بیگار کے اجارہ دار مال والے ہیں۔ جب تک مال والے مدد نہ کریں بیگار نہیں ملتے۔ اس لئے ان کی امداد سے ہزاروں گنوار پکڑوا بلائے گئے ہیں جو ڈیرے خیمے نصب کر رہے ہیں۔ بنگلہ کے میدان میں جھاڑو دے رہے ہیں۔ یہ کام مفت نہ ہوتا تو بڑی زیرباری ہوجاتی۔

عدالت کے قاضی صاحب نے بڑے افسر کو مقدمہ کا تماشا دکھانے کے لئے خوب تیاری کی ہے۔ چپراسیوں کو لال وردی پہنا کر زور سے آواز لگانا بتایا ہے۔ وکیلوں کو اجلاس میں آتے ہی جھک کر کس طرح سلام کرنا چاہیے اس کی مشق اچھی طرح کرادی ہے۔ فوج داروں کے کھڑے ہونے، معززین کے بیٹھنے اور محررین کی نشست کے لئے الگ الگ جگہیں مقرر کردی گئی ہیں غرض کہ ہر بات قاعدہ قانون اور ضابطہ کے ساتھ ہورہی ہے۔ ایک مقدمہ کی روئداد سب کو حفظ کرادی گئی ہے۔ سوال کیا ہوگا۔ جواب کیا دیا جائے گا۔ ملزم کیا بولے گا۔ فوج دار کیا پوچھے گا۔ گواہ کیا بیان دے گا۔ قاضی صاحب کیا لکھیں گے سب کو حفظ یاد ہے۔ یقین ہے یہ تماشا دیکھ کر بڑے افسر خوش ہوجائیں گے اور سمرقند یا بخارا نہ بخشیں تو ایک گریڈ کی ترقی تو کہیں نہیں گئی۔ ملے گی اور ضرور ملے گی۔ ایسا موقع عمر میں ایک آدھ دفعہ ہی آتا ہے۔ ہمیشہ نہیں آتا!!!

مدرسہ والوں نے سوچا کہ سب لوگ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں ہم نے کچھ نہ کیا تو ہماری ناک کٹ جائے گی۔ اس لئے ہم بھی بچوں کو انعام تقسیم کرنے کا جلسہ کریں گے رعایا جاہل ہے۔ اور عہدہ دار مغرور اور خود پسند ہوتے ہیں۔ مدرسہ والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں۔ یہ موقع ہے کہ لوگ تعلیم اور تعلیمات والوں کی حقیقی عظمت کا اندازہ لگائیں۔ جب بڑے افسر آکر ہمارے جلسہ کی صدارت کریں گے اور ہم سب سے ہاتھ ملائیں گے تو ان لوگوں کو ہماری حقیقت معلوم ہوگی۔ مدرسہ کے بچے آئندہ

کی توم میں بڑے افسران کو اپنے ہاتھ سے انعام تقسیم فرمائیں گے جس سے ہماری عزت اپنی اور غیروں کی نگاہوں میں بڑھ جائے گی۔ اس لئے اس موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ ڈرامے کی تیاری شروع ہو گئی ہے۔ رات دن طالب علم ڈراما کر رہے ہیں۔ مدرسہ ناٹک گھر بن گیا ہے۔ اسکوٹ ڈرل ہو رہی ہے۔ بینڈ باجا بج رہا ہے۔ ایٹ ہوم کی تیاری ہو رہی ہے۔ کیک پسٹری مٹھائی آئسکریم سب چیزیں بلدہ سے آئیں گی۔ غرض کہ یہ موقع ایسا ہے جسے مدرسہ والے ہرگز چھوڑنا نہیں چاہتے۔ آدمی عزت کی خاطر جیتا ہے اور اس موقع پر بھی عزت میں اضافہ نہیں ہوا تو پھر زندگی کا لطف ہی کیا ہے۔

پولیس کے کوتوال صاحب کی وردی صاف ہو رہی ہے پیتل کے ٹکڑوں پر پالش کی جا رہی ہے۔ جوان اپنی ٹوپیوں پر رنگ روغن چڑھا رہے ہیں۔ کوئی داڑھی منڈوا رہا ہے کوئی مونچھ صاف کرا رہا ہے۔ کوتوالی کا سارا احاطہ صاف کر دیا گیا ہے۔ کیا مجال ایک تنکا بھی ادھر ادھر پڑا ہوا نظر آئے۔ جا بجا پہرے لگا دیے گئے ہیں۔ سورما جوان بانکے بنے کھڑے ہیں اور ہر پیدل چلنے والے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے ہیں ایسا نہ کریں تو رعب قائم رہنا دشوار ہو جائے۔ بڑے افسر کے آتے ہی سیٹی بجے گی اور جب تک قیام رہے گا سب راستے بند رہیں گے۔ گلی کوچوں میں چلنے پھرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ کوتوالی کے لوگوں کو رعایا کی آسائش کا بڑا خیال رہتا ہے۔ خلق خدا کی خدمت ان کے فرائض میں داخل ہے اسی واسطے یہ سب انتظام کئے گئے ہیں۔ کوتوال صاحب کا کہنا ہے کہ ہمارا وجود کس کام کا ہے اگر بڑے افسر کے انتظامات تشفی بخش نہ ہوئے تو ہمارے کام کرنے کا کون سا دن آئے گا۔

کلب کے ارکان نے غیر معمولی جلسہ عام کر کے سیدوال پوری کھچوری پکوڑی کا ایٹ ہوم کرنے کی تحریک منظور کی ہے ہر رکن کی دلی آرزو ہے کہ بڑے افسر کلب میں آ کر اس سے ہاتھ ملائیں۔ اس لئے اس ایٹ ہوم کی تحریک بلا کسی اختلاف کے منظور ہو گئی ہے جب بڑے افسر کلب میں رونق افروز ہوں گے تو ان کی دلچسپی کے لئے برج ٹورنامنٹ منعقد کیا جائے گا۔ یقین ہے جیتنے والے جوڑے کو موصوف کوئی بیش بہا انعام دیں گے ان انتظامات کے مکمل ہو جانے سے سب کو اطمینان ہو گیا ہے۔ مگر دو امور کے باعث پریشانی ہے اور ان کی وجہ سے معتمد صاحب اور انتظامی مجلس کے سب ارکان سرگرداں ہیں ایک تو یہ کہ کلب کے احاطہ میں گھاس بہت ہے جس میں اور کھٹملوں کا مندا دن رات جیتا رہتا ہے۔ گتہ دار گھاس صاف کرانے پر راضی نہیں ہوتا اگر گتہ منسوخ کیا جائے تو کلب کی آمدنی مسدود ہو جاتی ہے جس کے باعث کلب بند کر دینا پڑے گا۔ دوسری دشواری یہ ہے کہ کلب کی عمارت پر چھت نہیں ہے چاندنی کا لطف اٹھانے کی خاطر اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی مگر اب جو بڑے صاحب آ رہے ہیں تو کیا ہو گا۔ بڑے افسر کی تشریف آوری کے موقع پر اگر دال سیدوال پوری کچوری پکوڑی بارش ہونے کی وجہ سے بھیگ گئی تو سارا لطف جاتا رہے گا۔ اور سب مزہ کرکرا ہو جائے گا۔ برسات کے بجائے گرمی کا موسم ہوتا تو کھلی چھت کی قدر بڑے صاحب بھی کرتے۔ خیر ابھی ایک دن باقی ہے اور یقین ہے انتظامی مجلس کے ارکان ان دونوں دشواریوں کا مناسب حل سوچ لیں گے۔

مسافر بنگلہ کی آرائش پر ہزاروں روپے صرف ہوئے ہیں ترمیم کا موازنہ تو ختم ہو چکا تھا لیکن گتہ دار بہت سمجھ دار آدمی ہے۔ مسافر بنگلہ کو بڑے افسر کی رہائش کے قابل بنانے میں جن چیزوں کی ضرورت ہے سب فراہم کر لی گئی ہیں۔ پھاٹک پر ایک کمان تیار ہوئی ہے جس پر چاروں طرف خوش آمدید لکھا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آتے ہوئے یا جاتے ہوئے جس طرف سے چاہیں خوش آمدید نظر آ جائے۔

صحن میں چمن بندی کی گئی ہے۔ ہر طرف ہریالی نظر آتی ہے۔ موقع موقع سے کونڈے رکھے ہوئے ہیں۔ بنگلہ کے برآمدہ میں صوفے کوچ کرسیاں قرینے سے رکھی گئی ہیں تاکہ بیٹھنے والے کو کھڑے رہنے کی تکلیف برداشت نہ کرنی پڑے۔ تمام عمارت پر سفیدی ہو گئی ہے۔ کمروں کے اندر رنگ کر دیا گیا ہے۔ حمام اور بیت الخلاء کی جدید ضروریات خاص طور پر فراہم کی گئیں کہ بڑے افسر کی آسایش میں کسی بات کی کمی نہ رہے۔

آج سرکار آنے والے ہیں۔ جملہ گزیٹیڈ عہدہ دار استقبال کے لئے جمع ہیں۔ ضیافت کی میز آراستہ ہے۔ پورے پچاس آدمیوں کا انتظام ہے۔ سفید چادر کے اوپر سفید پلیٹ رکھی ہوئی ہیں کانٹے چمچے چھری ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔ پھولوں کے گلدستے میز کے بیچ میں جگہ جگہ رکھے ہوئے ہیں۔ آتے ہی بڑے افسر کھانا کھائیں گے۔ پکانے والا باورچی سکندرآباد سے آیا ہے کھلانے والے ملازمین اس کے ساتھ آئے ہیں۔ نگران کے علاوہ انتظام کرنے والے صدہا لوگ کھڑے ہیں۔ ضرورت کی کوئی چیز طلب کی جائے تو ہر شخص چلا اٹھتا ہے اور ذرا سی دیر میں وہ چیز فراہم ہو جاتی ہے۔ انتظام کی خوبی یہ ہے کہ انتظام کرنے والے زیادہ تعداد میں ہوں۔ ہندوستان میں لوگ بولتے بہت ہیں کام کم کرتے ہیں یہ بات اس ضیافت کے موقع پر بھی ظاہر ہوتی ہے۔ انتظام کرنے والوں کی چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کھانوں کی فہرست بڑی طویل ہے، دیسی پردیسی ولایتی انگریزی، مدراسی، ہندوستانی، ہندوانی، مسلمانی، مرہٹی تلنگانی غرض کہ قسم قسم کی چیزیں مہیا ہیں اور ماہر فن کا بیان ہے کہ اس انتظام پر ایسے لذیذ کھانے، نہ سننے میں آئے نہ دیکھنے میں۔ کھانے کا تو بیان ہی فضول ہے خشک میوہ تر میوہ پھل پھلاری بھی موجود ہے۔ مہمانوں کی تقسیم میں بڑی دشواری پیش آئی کس کے نام تقسیم ہوں۔ آخر قرار پایا کہ بڑے افسر کی جانب سے ہی تقسیم کئے جائیں یعنی مہمان بھی وہی اور میزبان بھی وہی، وقت ٹھیک نو بجے مقرر کیا گیا تھا۔ ہر عزت والا آدمی آٹھ بجے ہی آموجود ہو گیا تھا۔ کھانوں کی خوشبو سے ہر شخص کا دماغ معطر ہو گیا تھا۔ وقت گزرتے معلوم نہیں ہوتا۔ جب بارہ بج گئے تو ذرا خیال ہوا کہ معلوم نہیں بڑے افسر صاحب تشریف لائیں یا نہ لائیں۔ یہ خیال عزت والوں اور میزبانوں کے ذہن میں آیا ہی تھا کہ دور سے موٹر کا بھوپو سنائی دیا۔ پولس والوں کی سیٹیوں اور استقبال کرنے والوں کے شور نے یقین دلایا کہ بڑے افسر وارد ہو گئے۔

موٹر سے آپ کے مستقر خاص پر آمد ہوتے ہی سب گزیٹیڈ عہدہ دار کالے کپڑے پہنے کھڑے تھے سر دوہرا جھکا کر آداب بجا لائے۔ ارشاد ہوا کہ سرکار کو نکلنے میں دیر ہو گئی پھر راستہ میں شکار فرمایا اس وجہ سے بھی تاخیر ہوئی۔ صبح کو جلدی دوسرے مقام پر جانا ہے اس لئے اس دعوت میں یا کل کسی اور ضیافت میں شریک نہیں ہو سکتے۔

سبحان اللہ

اعلان

سب رس کے قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ وہ اپنے مضامین نظم و نثر بالالتزام بھیجتے رہیں۔ شکریہ کے ساتھ شائع کر دئیے جائیں گے۔ نئے مضمون نگار بھی اپنے مضامین بھیج سکتے ہیں۔

اگر میں مرد ہوتی ....!

کبھی میں نے سوچا ہی نہیں کہ اگر مرد ہوتی تو کیا کرتی۔ بات یہ ہے محرومیوں کی زنجیروں نے اتنا متوجہ رکھا کہ کبھی اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ یہ سوچتی بیٹھتی کہ اگر زیدہ ہوتی تو کیا کرتی اور پھر مرد ہوتی تو کیا کرتی۔ ہاں وقتی طور پر ضرور کبھی کبھی چاہا کہ اللہ اگر آئندہ جنم دینے کا کہیں خیال کرے تو مرد بنا کر دنیا میں بھیجے۔ (ویسے ہم تناسخ کی قائل نہیں) پھر یہ سوچ کر میں یہ دعا کبھی نہ مانگ سکی کہ خدا معلوم ہماری دعا کب قبول کرے۔ اور جب ہم آئندہ خدانخواستہ مرد بن کر پیدا ہوں تو کہیں الٹی گنگا نہ بہنے لگے (اگر عورت میدان عمل میں قدم بڑھا رہی ہے) اور ہم مرد پیدا ہوئے تو خواہ مخواہ ہماری بیوی کہیں پردہ میں نہ بٹھا دے اور ہمیں پھر عورت بننے کی تمنا نہ کرنی پڑے۔

اگر میں مرد ہوتی تو کیا کرتی؟ شاید کچھ نہیں۔ اب جتنی آرزوئیں دل میں پیدا ہوتی ہیں جب شاید نہ پیدا ہوتیں۔ جب یہ دل نہ ہوتا، یہ دماغ نہ ہوتا۔ اچھا ہی ہوا کہ خدا نے عورت بنا کر پیدا کیا۔ ورنہ اتنا نحیف و نزار جسم، ایسی کمزور اور سہارا ڈھونڈنے والی روح کو مرد کہتے مردوں کو شرم آتی۔ اب یہ ہوتا ہے کہ کمزور ہے، سدا کی روگی ہے، عورت ہے، یہی خیال ہوتا ہے۔ اسی لئے سوائے محبت کے میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ جب یہ بات نہ ہوتی اور اماں کی ڈانٹ اور ابا کے جوتے ہمارا انتظار کرتے اور میں شاید آدھی آدھی رات تک سینما میں بیٹھا ایکٹرسوں کی اداؤں پر نثار ہوتا۔ چاندنی رات حسین ساگر پر گزارتا، برسات کا لطف گنڈی پیٹھ میں اٹھاتا۔ پڑھنے لکھنے سے جی چراتا۔ ہوسٹل کے کمرے میں بظاہر سامنے کتاب کھلی ہوتی اور میں زیادہ تر لڑکیوں کی باتیں کرتا اور سوچتا۔ بظاہر عورتوں کو برا بھلا کہتا پھرتا اور بند کمرے میں دھڑکتے دل اور الجھتی سانسوں کو روک کے عصمت چغتائی کے افسانوں کا مطالعہ کرتا۔ شاپنگ کرتے وقت راہ چلتے میں نمائش کے دوران میں جہاں کہیں ایک آدھ دلکش چہرہ کا سی صورت دیکھ لیتا تو دل پکڑ کر رہ جاتا۔ خیالی محبوبہ سے گفتگو ہوتی رات کو تارے گنتا۔ جھوٹے سچے شعر کہا کرتا اور دن کو دوپہر تک پڑا سوتا رہتا۔ البم میں تصویریں لگاتا۔ دنیائے فلم کی تمام عورتیں ہوتیں۔ جاپانی قسم کی الٹی سیدھی، گلابی گلابی، ہنستی ناچتی تصویریں ہوتیں۔ ایسے ناول پڑھا کرتا جن میں فرسودہ قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں ہوتیں۔ لرزا دینے والی بھڑکا دینے والی داستانیں اور پھر میں ان کے چند جملے رٹ کر انتظار کرتا کہ کوئی لڑکی قسمت سے نظر آ جائے تو فوراً چپکا دوں۔ جب وہ جھینپ جائے تو یہ سمجھ کر اکڑتا رہوں "واہ کیا کمال کیا ہے۔" پھر خواہ مخواہ دوست احباب میں کہتا پھرتا "وہ مارا، دیکھو یوں بنایا کرتے ہیں۔" میں اپنی بہن سے ساری لڑکیوں کی باتیں پوچھتا ان کی ٹوہ لیتا اور من گھڑت ان کے افسانے بناتا مگر اپنی بہن سے ہمیشہ کہتا "خبردار! تم ہماری بہن ہو ہاں!" بھونڈی صورت رکھتے ہوئے مردانہ وجاہت کا اپنے آپ کو کامل نمونہ سمجھتا۔ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں اپنے کو ہر انداز سے دیکھا کرتا۔ روزانہ شیو کرتا۔ ڈھیلے پائینچوں کے مجلے کے پروں جیسے پاجامے پہنتا۔ سلیم شاہی کامدار جوتیاں، مخملی ترچھی ٹوپی، تو تیہ سلک کی رنگ لگا کر شیروانیاں۔ "ایوننگ ان پیرس" استعمال کرتا۔ سگریٹ پینے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا۔ آٹھ دن میں بڑی مشکل سے جمعہ کی نماز پڑھتا۔ اور بس بات بے بات اکڑتا پھرتا۔ "میں مرد ہوں" بہنوں کو ڈانٹنا جھڑکنا معمولی عمل ہوتا۔ خوب ستا ستا کر دیکھتا واللہ ——— !

مگر اچھا ہی ہوا کہ مرد نہ ہوئی ——— ورنہ خاصا بن کوڑی کا تماشا ہوتا کہ غلام ہوتا اور اپنے آپ کو آزاد خیال کرتا۔ غنڈا شہدا بنا پھرتا اور اپنے کو مرد سمجھتا۔ آوارہ گردی کرتا اور خودداری کا رونا روتا۔ ایک آدھ سستا پمفلٹ پڑھ کر اپنے آپ کو کمیونسٹ بتلاتا جس دن

امتحان دے کر ہال سے باہر نکلتا علم کو دل و دماغ سے محو کر دیتا۔ نوکری ملنے سے پہلے بیکاری میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا اور اپنے کو قوم کا خادم، وطن کا سپوت اور ملک کا جان نثار بتلاتا۔ نظام دہر کو الٹنے کی تدبیریں سوچا کرتا۔ کام کرنے کو غلامی اور بیکاری کو آزادی سمجھتا۔ ہندوستان کے بھوک کے مسئلہ سے الجھتا اور پھر بستر پر پڑے پڑے تحصیلدار یا سپولیین بننے کے خواب دیکھا کرتا اور پھر جو قسمت سے کچھ بن جاتا تو پچھلے دن یکسر بھول جاتا۔ غریبوں کا خون چوستا۔ رشوت کا بازار گرم کرتا اور پھر ایک بیوی کا خیال کرتا جو بڑے باپ کی بیٹی ہو، خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو، سوسائٹی میں میری شریک بن سکے اور ساتھ ہی ساتھ ایک جرمن ڈزائن مکان، خوبصورت سی موٹر اور چالیس ہزار نقد بھی لا سکے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو اپنے باپ کے اثر سے کام لے کر سفارشی رقعہ بھی دلا سکے۔

اگر بدقسمتی سے اچھی نوکری نہ ملی تو پھر منشی گری کرتا جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ تجارت، زراعت، اور صنعت و حرفت جیسے شریف پیشوں سے جی چراتا اور اپنی برائیوں کا سارا الزام تقدیر، سماج اور خدا کے سر تھوپتا۔ اچھا ہی ہوا کہ مرد نہ ہوئی ——!

لیکن جب میں سوچتی ہوں کہ اب کچھ دنوں میں نفیس کی شادی ہو جائے گی، وہ کہیں دور چلی جائے گی۔ اس کی تارہ جیسی چمکیلی آنکھیں، اس کے مسکراتے مسکراتے شاداب ہونٹ، وہ اس کی ہنسانے دل موہ لینے والی باتیں سب کسی اور کی ہو جائیں گی تو میں بے چین ہو جاتی ہوں۔ میں کچھ نہ کر سکوں گی اگر مرد ہوتی تو اس سے شادی کر لیتی۔ دو محبوب روحیں اور جانے بوجھے دل مل جاتے۔ کیسی ابدی مسرت ہوتی۔ ہماری دنیا فردوس کا منہ چڑاتی۔ ہم دونوں پر تے سہانے خواب ہوتے، زندگی ہوتی حسین اور رنگین۔ اس گندی اور بری دنیا سے ہم کہیں دور ہوتے۔ کسی حسین اور خاموش دیہات میں، ہم دونوں کو کسی تیسرے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہماری دنیا کشمیر کا حسن ہوتا، پونا کی برسات، ہمالیہ کی بلندی، تاج محل کا خواب۔ مجھے اس غلام ہندوستان سے کتنی نفرت ہے۔ انسان بن کر فطرت کی غلام ہوں، عورت بن کر انسانیت کی۔ اور پھر ہندوستانی ہونے سے اس غلامی کو سہ آتشہ بنا دیا۔ اگر مرد ہوتا میرے اختیار میں ہوتا، یوں کہو کہ اپنی پیدائش میرے اختیار میں ہوتی تو میں اس بڑی گندی دنیا میں پیدا ہی کیوں ہوتی۔ کسی ستارے میں بیٹھی بیٹھی سیر کرتی۔ اللہ میاں کی لائبریری میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتی۔ کبھی جی چاہا تو دنیا کی سیر بھی کر لیتی، ایک نگاہِ غلط انداز سے دور ہی سے نگاہ کر زمین کا گھماؤ پھراؤ، عورت مرد سب کو دیکھتی، دریا کی سیر ہو جاتی اور دامن بھی نہ بھیگتا۔ کیا اچھا ہوتا۔ اور اور میں یکایک سوچنے لگتی ہوں کہ اگر عورت نہ ہوتی تو نفیس کو کہاں دیکھتی۔ اس کی باتوں کی حلاوت، اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ اور اس کی محبت کی گھلاوٹ کو کیسے محسوس کرتی۔ میں کسی عورت کو دیکھ ہی نہ سکتی ہمیشہ بھوکی ہی رہتی۔ خواہ مخواہ اندھیری دنیا سے ایک ان جانی بوجھی عورت مل جاتی اور عمر بھر اس سے نباہ کرنی ہوتی۔ کیا معلوم وہ میرے معیار پر اترتی بھی کہ نہیں۔ پھر زندگی جہنم ہو جاتی، روتے جھینکتے گزرتی۔ اندھیرے میں چلایا ہوا تیر ہمیشہ تو نشانے پر نہیں بیٹھتا!

اچھا ہی ہوا کہ عورت بن کر پیدا ہوئی میں۔ نفیس کو دیکھا ہے میں نے۔ عورت بن کر عورت کو دیکھا ہے۔ نازک نازک احساسات ملے ہیں۔ رنگین تخیل ملا ہے۔ وہ سب کچھ ملا ہے جس کی شائد مرد تمنا کرتے ہیں۔ مرد کی بھدی دنیا میں یہ سب کہاں نصیب ہوتا۔ وہ باتیں کہاں جو ہم لڑکیاں سو جوڑے گھنٹوں کیا کرتی ہیں۔ وہ ہمارے متعلق سوچتے سوچتے کھوئے جاتے ہیں ہم اپنے آپ ہی میں گم۔ اللہ رے ہم! مرد ہو کر میں محروم رہتی نہ صرف عورت بننے سے بلکہ ایک بیٹی، ایک بہن اور ایک ماں بننے سے بھی۔ اچھا ہی ہوا کہ مرد نہ ہوئی۔

پھر بھی سوچتی بھلا کہ اگر میں مرد ہوتی۔

اگر میں مرد ہوتی تو بخدا ان بہت سی باتوں کا حل سوجھ جاتا جو آج کل محض عورت ہونے کی وجہ سے مجھے پریشان کرتی ہیں۔ وہ تمام الجھنیں سلجھ جائیں جن میں اب میری زندگی پھنسی ہوئی ہے۔ عورت نہ ہوتی تو یہ پریشانیاں کا ہیکو ہوتیں۔ یہ صنف کی غلامی بڑی بری چیز ہے۔ اس کی وجہ سے کتنی مجبوریاں کتنی مایوسیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ اگر مرد ہوتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ آزادی ہوتی۔ میرے افعال و اعمال پر میرا اختیار ہوتا۔ میرے کسی عمل سے خواہ وہ اچھا ہو کہ برا خاندان کی ناک نہ کٹتی۔ جو چاہے کرتا جو چاہے نہ کرتا۔

سچ۔ ان پرندوں کی زندگی مجھے کتنی پسند ہے۔ سیر سپاٹے، کھلی فضا اور وسیع دنیا۔ اگر مرد ہوتی تو سچ ماننا میں سیر و سیاحت کو نکل کھڑا ہوتا۔ اتر سے دکھن اور پورب سے پچھم بس گھوما ہی کرتا۔ گھومتی ہوئی زندگی جس کا کوئی محور نہ ہوتا۔ مجھے دکھانے سے زیادہ دیکھنے کی خواہش رہی۔ ان دونوں آنکھوں میں دنیا کو جذب کرنا چاہتی ہوں۔ یہ خواہش جب ہی شرمندۂ تکمیل ہوتی جب میں مرد ہوتی۔ جب مجھ سے کوئی نہ پوچھتا کہ تمہاری صورت کیسی ہے۔ تم یہ کیوں کرتی ہو اور وہ کیوں نہیں کرتیں کسی کو جرأت کبھی نہ ہوتی کہ دریافت کرے میں پکوان جانتی ہوں کہ نہیں۔ میں سلیقہ سے نباہ سکتی ہوں کہ نہیں۔ یہ گھر کے دھکا دینے والے دھندے نہ ہوتے سب میری دلجوئی کرتے۔ مرد جو ٹھیرا۔ میرا دماغ اب جو کچھ سوچتا ہے جب اس پر عمل کیا کرتی۔

مگر پھر بھی سوچتی ہوں ان مجبوریوں کو دیکھتی ہوں اور مایوس سی ہو کر ان تمناؤں کو اپنے دل کی تاریکی میں دفن کر دیتی ہوں۔ کہ کہیں وہ بے وقت سر نہ اٹھائیں۔ ناحق مجھے دیوانہ نہ بنا دیں۔ جانتی ہوں کہ وہ ہٹ نہ سکیں گی۔ جانتی ہوں کہ ان کے بغیر میری زندگی کا حاصل کچھ بھی نہیں۔ لیکن پھر بھی مجبور ہوں۔ عورت ہو کر غلام ہو کر مجبور و بے بس ہو کر۔

جب مرد اور عورت دونوں ہی خدا کی مخلوق ہیں۔ جب دونوں مل کر ہی اس دنیا کے خرابے کو بساتے ہیں تو پھر کیوں نہیں زندگی کے چشمہ سے دونوں ہی پیاس بجھا سکتے۔ ایک کے لئے دنیا لامحدود اور دوسرے کے لئے محدود کیوں ہے۔ ایک پابندیاں عائد کرتا ہے دوسرا اسے قبول کرنے پر پابند کیوں ہے؟ کوئی مجھے اس کا جواب دے! نہیں! اس سوال کا جواب کوئی نہ دے گا۔ کوئی نہ دے سکا۔ ازل سے عورت یہی سوال کرتی آئی ہے۔ اور شائد ابد تک کرتی رہے گی۔ کبھی ہنس کر کبھی رو کر۔ پر اس کے سوال کا جواب کبھی نہ ملا۔ کبھی نہ مل سکے گا۔ وہ تشنہ کام ہی رہنے کے لئے پیدا ہوئی ہے اور یونہی رہے گی۔ گنبد کی صدا کوئی جواب نہیں لاتی۔ ہماری بات ہمیں لوٹا دیتی ہے۔ یہ منہ چڑانا کتنا تکلیف دہ ہے۔ اپنا ہی تھپیڑا اور اپنا ہی گال ——— اکاش میں مرد ہوتی ——— مگر!

زینت ساجدہ

(نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہوا)

کھلاڑیوں کی نفسیات

ایک انگریزی مقولہ ہے کہ واٹرلو کی جنگ ایٹن وہیارو کی بازیگاہوں پر جیتی گئی تھی۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ایٹن وہیارو کے میدانوں پر زور و شور کی لڑائی ہوئی جس کا اثر واٹرلو کی جنگ پر پڑا تھا بلکہ مقصد یہ بتلانا ہے کہ ایٹن وہیارو کی بازیگاہوں پر کھیلوں کے ذریعے جو اسپرٹ اور جذبات انگلستان کے نوجوانوں میں پیدا کیے گئے تھے وہ واٹرلو کی جنگ میں نمودار ہوئے اور اسی اسپرٹ کی بدولت نپولین کے خلاف انگلستان کو کامیابی ہوئی۔ فوج کی زیادتی یا اعلیٰ قسم کے جنگی ہتھیار فتح کے لئے کافی نہیں ہوتے جب تک کہ جوش، ہمت، بہادری، قوم و ملک کے لئے ایثار کا جذبہ سپاہیوں میں نہ ہو۔ اور یہ جذبات کھیلوں کے ذریعے ہی زیادہ تر پیدا کیے جا سکتے ہیں نہ کہ جماعتوں میں درسی کتب کے ذریعے مثلاً ایک استاد جماعت میں تاریخ کی تعلیم دیتے وقت طلبہ سے کہتا ہے کہ ٹیپو ایک بہادر سپاہی تھا شکست کے موقعہ پر بھی ہراساں ہوئے بغیر ہمت کے ساتھ اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیے جاتا تھا۔ اس جملے کا اثر ان طلبہ پر جنھوں نے کبھی کسی مخالف کا مقابلہ ہی نہ کیا ہو کس طرح ہو سکتا ہے لیکن ایسے طلبہ جنھوں نے کھیلوں کے مقابلوں میں حصہ لیا ہو محسوس کریں گے کہ کھیل میں جب انھیں شکست ہونے آتی ہے تو ان کے دلوں میں کس قسم کے جذبات پیدا ہوا کرتے ہیں لہذا اگر وہ بھی ٹیپو کی طرح ہمت سے کام لیا کریں تو شکست کو فتح سے بدل سکتے ہیں۔ جس طرح درسی سبق کے لئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح کھیل کے لئے بھی ایک معلم لازمی ہے اور والدین بھی اپنی اولاد کے لئے کھیلوں کو سیرت سازی کا بہترین ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ بچے عموماً کھیلوں کے دوران میں اپنی اچھی اور بری صفات کا اظہار کیا کرتے ہیں اور خوش قسمت ہیں وہ بچے جن کے والدین ان کے کھیلوں میں حصہ لے کر یا اکیلا کھیلتا دیکھ کر ان کی بری صفات کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی اچھی صفات کی تعریف سے ان کا دل بڑھاتے ہیں۔

اگر بچوں کے کھیلوں پر نگرانی نہ کی جائے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے چھوڑ دیا جائے تو اس میں آوارگی کی صفت پیدا ہوگی اس کے برخلاف اگر انھیں ایسے کھیلوں کی جانب راغب کیا جائے جن کا اثر ان کی صحت اور اخلاق پر پڑتا ہو تو بہتر اور مفید نتائج برآمد ہوں گے اسی لئے مدارس میں معلم گیمس کا مقرر کیا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے اور گھر پر والدین کو اس کی ضرور نگرانی کرنی چاہیے کہ ان کے بچے جن کھیلوں کی طرف راغب ہیں وہ کردار سازی کے لئے مفید ہیں۔ ہندستانی مائیں بچوں کی نفسیات سے ناواقف ہوتی ہیں اس لئے اپنی لڑکیوں کے کھیلوں کی خاطر خواہ نگرانی نہیں کرتیں بلکہ انھیں ایسے کھیلوں کا شوق دلاتی ہیں جو نفسیات کے نقطۂ نظر سے ان کے لئے فائدہ مند نہیں ہوتے۔ مثلاً گڑیا کی شادی ہی کو لیجئے۔ اس کھیل میں مائیں خود شریک ہوا کرتی ہیں اور انھیں گمان تک نہیں گزرتا کہ آئندہ چل کر ان کی بچیوں پر اس کھیل کی وجہ کس قدر مضر اثرات مترتب ہوں گے۔ جو عادتیں بچپن میں پیدا ہوتی ہیں وہ بہت دیرپا ہوا کرتی ہیں اور بیشتر اوقات ان کا دور کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہذا گڑیا کی شادی میں جو قدیم اور بے معنی رسومات ادا کیے جاتے ہیں وہ لڑکیوں کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں اور جب تک کسی شادی میں رسومات نہ کیے جائیں وہ شادی ہی نہیں سمجھی جاتی۔ اس سے کون واقف نہیں کہ شادی کی رسومات غیر ضروری ہوا کرتی ہیں اور ان کی وجہ بیجا مصارف ہوتے ہیں اور ہمارے تمدن کو ان سے نقصان پہنچ رہا ہے چنانچہ ان کے ترک کیے جانے کے لئے ہر سوشل ریفارمر اپنی آواز بلند کر رہا ہے اگر لڑکیاں بچپن میں اس قسم کے کھیل کھیلیں تو بڑی ہونے کے

بعد اپنی اولاد کی شادی کے موقع پر بھی ان رسومات کو جائز سمجھینگی اور اس طرح ہمارے تمدن کی ترقی میں مانع ہوں گی۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ بچپن ہی سے مائیں اپنی اولاد کو ایسے کھیلوں کی طرف راغب کریں جو اخلاق کی درستگی اور صحت کے لئے مفید ہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قوم کی ترقی کا زیادہ تر انحصار اس قوم کی عورتوں پر ہوا کرتا ہے اور ان کی امداد و تعاون کی ہندوستان کو ضرورت ہے۔

دنیا میں وہی قومیں ترقی کرتی آئی ہیں جن افراد کی دماغی و جسمانی نشوونما مساوی طور پر ہوئی ہو اور جن میں دیانت داری۔ صداقت۔ انصاف پسندی۔ فرض شناسی۔ رواداری اور ایثار جیسی صفات موجود ہوں جن اشخاص نے یورپ کے ممالک کا سفر کیا ہے میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ یہ صفات انگریز قوم میں بہ مقابل دیگر یوروپی اقوام کے بدرجۂ اتم ملیں گی اور میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح اس قوم نے کھیلوں کو کردار سازی کا ذریعہ بنایا ہے کسی دوسری قوم نے نہیں بنایا۔ حال حال میں اس راز کو دوسری اقوام نے معلوم کیا ہے اور اس امر میں کوشاں ہیں کہ وہ بھی اس طریقے سے فائدہ اٹھائیں آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ انگریز جب کبھی کسی شخص کی انصاف پسندی۔ رواداری اور خوش خلقی وغیرہ کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو صرف یہ کہہ دیتے ہیں کہ He is a real sports man یعنی وہ حقیقت میں اسپورٹسمن ہے۔ خود اس محاورے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز قوم توقع کرتی ہے کہ جو شخص کھلاڑی ہوگا وہ بری اور کمینی حرکات سے اپنے کو باز رکھے گا اور اس میں وہ سب صفات موجود ہوں گی جو کھیلوں کے ذریعے پیدا کی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے اگر ہندوستان میں یہ کہا جائے کہ فلاں شخص اسپورٹسمن ہے تو فوراً یہ تصور کر لیا جاتا ہے کہ وہ کھیل اچھا کھیلتا ہے اس کے سوا اس میں اور کسی قسم کی قابلیت نہیں بلکہ دوسرے الفاظ میں ان کو ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ہم نے کھیلوں کو صرف تفریحی نقطۂ نظر سے رائج کیا ہے اور ان کی اصل اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح دوسری اقوام نے کھیلوں سے فائدہ اٹھانے کی کوشش شروع کی ہے ہمیں بھی اسی طرح توجہ کرنی چاہیے تاکہ ہماری قومی کمزوریاں دور ہو جائیں۔

ایک استاد کلاس روم میں جھوٹ کی برائیاں اور سچائی کی خوبیاں طلبہ کو سمجھاتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ طلبہ ان دونوں کا فرق اچھی طرح ذہن نشین بھی کر لیں لیکن جب تک انھیں عمل کے مواقع نہ ملیں وہ جھوٹ اور سچ کی اہمیت کو نہیں جان سکتے۔ کھیل کے دوران میں ان دونوں کا فرق اور ان کے نتائج ظاہر ہو جاتے ہیں اور طلبہ کو جھوٹ سے احتراز کرنے اور سچ کو اختیار کرنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ مثلاً کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے اور ایک اچھا کھلاڑی بازی کر رہا ہے وہ گیند کو اچھالتا ہے اور میدان دار لڑکا اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے گیند زمین کو چھو کر اس کے ہاتھ میں آتی ہے یہ واقعہ اس قدر تیزی سے پیش آتا ہے کہ امپائر اس کو دیکھ نہیں سکتا اور وہ بلہ باز کو میدان سے خارج کر دیتا ہے۔ میدان دار اگر صداقت پسند ہے اور اس کی تربیت صحیح طور پر ہوئی ہے تو امپائر کو بتلا دے گا کہ گیند زمین کو چھونے کے بعد اس نے پکڑی تھی اور جب امپائر اپنا فیصلہ بدل دے گا تو تماشا بین میدان دار کو تالیاں بجا کر خراج تحسین دیں گے۔ بلہ باز اس کا ممنون ہوگا امپائر کی نظروں میں اس کی وقعت بڑھے گی اس کا ضمیر مطمئن ہوگا اور اس کے وہ ساتھی جو صداقت پسند ہوں گے اس کی قدر کریں گے۔ برخلاف اس کے اگر میدان دار نے خاموشی اختیار کی اور بلہ باز کو

خارج کئے جاتے ہوئے دیکھ کر خوشی منائی تو اس کا ضمیر اس پر لعنت بھیجے گا۔ تماشا بینوں نے اگر گیند کو زمین سے ٹکراتے ہوئے دیکھ لیا ہو تو اس پر نفریں کریں گے۔ ساتھیوں نے دیکھ لیا ہو تو ان کی نظروں سے وہ گر جائے گا۔ یہ ایسا عملی سبق اس کو ملے گا کہ جس کو وہ عمر بھر نہ بھول سکے گا۔ سچ اور جھوٹ کے نتائج کو جانتے ہیں اس کو کبھی دشواری نہیں پیش آئیگی۔ روزآنہ زندگی میں اگر کوئی جھوٹ بولے تو اس قسم کا سبق نہیں مل سکتا اس لئے کہ بعض اوقات سزا کو ملتے مہینوں اور برسوں گزر جاتے ہیں اور سزا ملنے کے بعد بھی خاطی کو یاد نہیں رہتا کہ کس جھوٹ کی سزا ملی ہے لیکن کھیلوں میں چونکہ فوراً ہی سزا مل جایا کرتی ہے اسلئے اس بری عادت کو ترک کرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔

انسان کی زندگی کے ہر شعبے میں ٹیم اسپرٹ کی ضرورت ہے۔ مثلاً گھر میں جب تک ماں، باپ، بھائی، بہن سب مل کر نہ رہیں گھر کی زندگی بدمزہ ہوجاتی ہے۔ اسی طرح جب تک ایک عہدہ دار اپنے بالادست افسروں اور ماتحتین سے اتحاد عمل نہ کرے سرکاری کام عمدگی سے نہیں انجام پا سکتے۔ کوئی جماعت اور کوئی قوم اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کا ہر فرد اتحاد اور اتفاق کے ساتھ قومی ترقی کے لئے کوشاں نہ ہو۔ اس ٹیم اسپرٹ کو پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ کھیل ہوا کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ انگلستان نے اپنے تمام مصائب کو ہمیشہ آسانی اور استقلال سے دور کیا ہے۔ ہر کھلاڑی ٹیم اسپرٹ کی اہمیت سے واقف ہوا کرتا ہے کیونکہ اس کا فقدان ٹیم کو کامیابی سے محروم رکھتا ہے۔ ایک ٹیم میں اگر انفرادی حیثیت سے گیارہ اعلیٰ معیار کے کھلاڑی ہوں اور یہ تمام اپنے جوہر علیحدہ علیحدہ ظاہر کرنا چاہیں تو ایک ایسی ٹیم سے شکست کھا جائیں گے جس میں انفرادی حیثیت اعلیٰ معیار کے کھلاڑی گو نہ ہوں لیکن ان میں اتحاد و اتفاق ہو اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہوں۔ اسی لئے اگر کوئی اعلیٰ معیار کا کھلاڑی خود غرضی ظاہر کرتا ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں رکھتا ہے تو اس کو ٹیم سے باہر کر دیا جاتا ہے اور اس وقت تک ٹیم میں دوبارہ داخل نہیں کیا جاتا جب تک کہ اس نے اپنی عادات نہ بدل دی ہو اور مل جل کر کھیلنا نہ سیکھ لیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ سبق اس کو زندگی بھر یاد رہے گا اور وہ اس امر کی کوشش کرتا رہے گا۔ کہ زندگی کے ہر شعبہ میں دوسروں کے ساتھ اتحاد عمل اختیار کرے۔ آپ نے اکثر یہ بھی دیکھا ہوگا کہ کھلاڑیوں کے لئے ایسے بھی موقعے پیش آتے ہیں جبکہ انھیں ٹیم کی خاطر ذاتی شہرت اور ناموری کا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ کرکٹ ہی سے مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ اگر رن لینے میں غلطی ہوجائے تو ہر دو کھلاڑی ٹیم کی کامیابی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں کہ کس کو میدان سے خارج ہونا چاہیئے اور جو بھی اپنے کو ٹیم کے لئے کم مفید خیال کرتا ہے خارج ہوجاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے تمام افراد میں اس قسم کا جذبہ پیدا ہوجائے اور وہ زندگی کے ہر شعبے میں اس سے کام لیا کریں تو اپنے ملک کو ترقی کے اعلیٰ سے اعلیٰ زینے پر پہنچا سکتے ہیں۔ اکثر انگریز کھلاڑیوں نے اپنی ٹیم کے لئے حیرت انگیز کارنامے کر دکھائے ہیں جن میں سے ایک کو بتلانا بے محل نہ ہوگا اور جس سے ٹیم اسپرٹ کے صحیح معنی واضح ہوجائیں گے۔ انگلستان اور آسٹریلیا کے مابین آزمائشی مقابلے کے دوران میں ایک انگریز کھلاڑی کے جسم پر اس زور سے گیند لگی کہ اس کی دو یا تین پسلیاں ٹوٹ گئیں اور اس کو ہسپتال بھیج دیا گیا۔ یہ واقعہ انگلستان کی پہلی باری میں پیش آیا۔ میاچ کے آخر میں ایک وقت ایسا آن پہنچا کہ اگر زخمی کھلاڑی کھیل میں حصہ لے تو انگلستان کو کامیابی ممکن تھی ورنہ شکست۔ جب کھلاڑی نے ٹیلیفون کے ذریعہ یہ اطلاع پائی تو ڈاکٹر کی ممانعت کے باوجود پٹیاں باندھے ہوئے ہسپتال سے آیا بدقت تمام کپڑے پہنے دو ساتھیوں نے دونوں کندھوں میں ہاتھ دے کر اس کو میدان پر لا کر کھڑا کیا اس نے خود بہت کم رن

بنائے لیکن اس کے ساتھی نے جو دوسری جانب کھیل رہا تھا باقی ماندہ دوڑیں بنالیں اور انگلستان کو کامیابی ہوئی۔ اس کھلاڑی نے نہ صرف ٹیم اسپرٹ اور قومی جذبے کا اظہار کیا بلکہ آسٹریلین تماشا بینوں کے دلوں میں اپنی قوم کی وقعت بڑھادی۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کے افراد بازیگاہ میں اپنی قوم کی ناموری کے لئے جان پر کھیل جاتے ہیں وہ اپنی آزادی کے لئے جنگ کے میدان میں کیا کچھ مصیبتیں نہ جھیلتے ہوں گے اور کس طرح خوشی خوشی اپنی جان نہ دیتے ہوں گے۔ کھیلوں ہی کے ذریعہ ایسے جذبات کو ابھارا جاسکتا ہے اور ترقی دی جاسکتی ہے۔

خودغرضی ایک تباہ کن صفت ہے۔ خودغرض انسان قومی ایثار تو بڑی بات ہے اپنی عزیز ترین اولاد کے لئے بھی ایثار کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا جس قوم میں خودغرض افراد کی زیادتی ہوگی وہ ترقی نہیں کرسکتی۔ کھیل اس لعنتی صفت کو دور کرنے کا بہترین ذریعہ ہے کیونکہ جوں ہی کسی کھلاڑی میں خودغرضی نظر آتی ہے اس کو تنبیہ کی جاتی ہے اگر یہ کافی نہ ہو تو اس کو ٹیم سے نکال دیا جاتا ہے۔ اسی لئے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو اشخاص حقیقی معنوں میں اسپورٹسمن ہوتے ہیں ان میں خودغرضی کی صفت بہت کم نظر آتی ہے اور جو عادت انھیں ابتداء میں پڑتی ہے وہ ان کی زندگی تک باقی رہتی ہے۔

جن کھلاڑیوں کو اپنی طبیعت پر قابو نہیں ہوا کرتا انھیں تلخ تجربے اٹھانے پڑتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ مجبور ہوجاتے ہیں کہ اپنے غصے کو دور کریں اور طبیعت پر قابو پائیں۔ بعض اوقات عمداً اور اکثر اوقات سہواً ایک امپائر یا ریفری غلط فیصلہ دیتا ہے ایک غصیلا کھلاڑی اس سے برافروختہ ہوکر یا تو اپنا کھیل خراب کرلیتا ہے یا اس سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوجاتی ہے۔ اول الذکر صورت میں وہ میچ ہار کر سبق حاصل کرتا ہے چنانچہ میں نے ایک مرتبہ ایک ٹینس میچ میں اسی طرح سبق حاصل کیا تھا آخرالذکر صورت میں امپائر یا ریفری اس کو میدان سے باہر کردیتا ہے۔ جب کھلاڑی کو اپنی رسوائی کا خیال آتا ہے تو وہ کوشش کرتا ہے کہ طبیعت کو قابو میں رکھے اور اس طرح کھیل ہی کی بدولت اس کی ایک بری صفت دور ہوجاتی ہے۔

انسان کو زندگی میں بہت ساری ناانصافیوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے جن کا مقابلہ ایک اسپورٹسمن ہراساں ہوئے بغیر کرتا ہے کیونکہ وہ ان کا عادی ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ غصہ کھانے یا شوروغل مچانے سے مفید نتائج نہیں برآمد ہوں گے۔

کھلاڑی اگر کھیلوں کو کردارسازی۔ تندرستی اور تفریح طبع کا ذریعہ سمجھ کر کھیلیں تو مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں اور اگر ان کو انعامات حاصل کرنے کا ذریعہ یا ذریعۂ معاش بنایا جائے تو کھلاڑیوں کی نفسیات میں فرق پیدا ہوجاتا ہے۔ پیشہ ور کھلاڑی کی ہمیشہ یہ کوشش ہوا کرتی ہے کہ وہ کھیل میں کامیابی حاصل کرے تاکہ اس کی آمدنی میں اضافہ ہو ظاہر ہے کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جائز اور ناجائز ہر قسم کے طریقوں کو روا رکھے گا اور اس کا کردار گرا ہوا ہوگا۔ اس فرق کا احساس مجھے اس وقت بہت زیادہ ہوا جب کہ میں نے ٹلڈن جیسے دنیا کے مشہور ٹینس کے کھلاڑی کو حیدرآباد میں بہ حیثیت پیشہ ور کھلاڑی نازیبا حرکات کرتے دیکھا۔ اسی کھلاڑی سے میری ملاقات امریکہ میں ہوئی تھی جبکہ اس کا شمار شوقین کھلاڑیوں میں تھا اور اس میں ایسے اوصاف پائے گئے تھے کہ میں اس کے اخلاق اور کھیل کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ اس فرق کے دیکھنے کے بعد مجھ پر واضح ہوگیا کہ انگلستان میں پیشہ ور کھلاڑیوں کو کیوں وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ ان میں یہاں تک فرق کیا جاتا ہے کہ لارڈز کے میدان پر جب کھلاڑی کرکٹ کھیلنے بازیگاہ میں داخل ہوتے ہیں تو شوقین اور پیشہ ور کھلاڑی

وہ مختلف دروازوں سے آتے ہیں اگرچہ کہ وہ ایک ہی ٹیم کے کھلاڑی ہوتے ہیں۔

ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہماری قوم کے افراد کا کردار کیا اتنا بلند اور اعلیٰ ہے جتنا کہ ہونا چاہیے کیا ہم میں ایثار، دیانت داری، ٹیم اسپرٹ، صداقت اور رواداری موجود ہے اگر اس کا جواب ہمارا ضمیر اثبات میں دے تو موجودہ طریقۂ تعلیم کو جاری رکھا جائے اور صرف درسی کتب کے ذریعہ کردار سازی کی جائے اور اگر ضمیر کا جواب نفی میں ملے تو طریقۂ تعلیم کو بدلنا ہمارا فرض ہوجاتا ہے کھیلوں کو کردار سازی کا ذریعہ بنا کر آزمایا جائے۔ اس کے لئے رقم صرف کرنی ہوگی کیونکہ جب تک ہر مدرسہ کے لئے ایک اعلیٰ درجے کی بازیگاہ نہ ہو اور معلم گیمس قابل اور ٹرینڈ نہ ہوں اس تعلیم کے مفید نتائج نہیں نکل سکتے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہندوستان کے ماہران تعلیم اس مسئلہ کو بغور مطالعہ کریں۔

سید محمد ہادی

کیفِ جاوید

الجھ کر رہ گیا ہوں آپ اپنے جذبۂ دل سے
مری منزل تھی آگے چاند اور تاروں کی منزل سے

جو ممکن ہو تو آ اور چھین لے کاشانۂ دل سے
بھری محفل کی محفل لے چلا ہوں تیری محفل سے

سماجی بندشیں کیا چھین سکتی ہیں تمھیں مجھ سے
کہ دل سے دور رہ کر بھی بہت نزدیک ہو دل سے

تمھیں پا کر بھی میری حسرتیں کچھ کم نہیں ہوتیں
بکھر جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

مری تسکین میری نیند سب کچھ لے لیا تم نے
کسی صورت سے اپنی یاد بھی لے لو مرے دل سے

ہجوم یاس کا کیا پوچھنا بس مختصر یہ ہے
کہ تیری یاد بھی آتی ہے تو آتی ہے مشکل سے

بہت کچھ پہلے تھیں قصری مگر اب ایک حسرت ہے
کہ میری یاد بھی جاتی رہی اس شوخ کے دل سے

نواب زادہ جاوید قصری

تاریخ زبان اُردو کی ترتیب

(کل ہند اُردو کانگریس منعقدہ حیدرآباد دکن کا ایک مقالہ)

زبانِ اُردو کی تاریخ کی اہمیت

زبانِ اردو کی تاریخ کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ اردو ہماری قومی زبان ہے، اس کی تدوین و ترتیب اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ہماری قومی تاریخ کی تحریر و تکمیل۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ بعض اصحاب ہماری قومی زبان کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار ہیں، اس کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔ اس کی مکمل تاریخ سے اشاعتِ اُردو میں بھی اضافہ ہوگا اور پائیداری حاصل ہوگی۔ جب اس کی خوبیاں سب پر منکشف ہو جائیں گی تو ظاہر ہے کہ مخالفین بھی اردو زبان کی عمدگی کے قائل ہو جائیں گے اور یہ خوب نشو و نما پائے گی۔ اس سے وہ ضرورت بھی محسوس ہوگی جو اس کی پیدائش کا باعث ہوئی اور وہ ضرورت اٹل اور امٹ ہے کیونکہ ہندوستان کی دونوں قومیں ہندو اور مسلمان اس زبان کو بولنے کے لئے مجبور ہیں ورنہ آپس کا لین دین، میل ملاپ اور تعلقات سب ختم ہو جائیں گے، اگر دونوں قومیں اپنی اپنی نئی یا جدا زبانیں بولنے لگیں گی۔

ترتیب زبانِ اُردو کب سے شروع ہوتی ہے

جہاں تک میرا خیال ہے زبان اُردو کی ترتیب اسی وقت سے شروع ہو گئی تھی جب کہ اردو شعرا کے حالات میں تذکرے تحریر ہونے کی ابتدا ہوئی۔ اگرچہ پہلے فارسی زبان میں ایسے تذکرے لکھے گئے کیونکہ اس وقت فارسی کا زیادہ رواج تھا اور اردو کی طرف کم توجہ تھی چنانچہ تذکرۂ شعرائے ہند فتح علی حسین گردیزی نے ۱۱۶۵ھ میں تالیف فرمایا اور اس کے بعد دیگر صاحبان نے تذکرے لکھنے شروع کئے اور اب تک برابر لکھے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے اردو میں منشی کریم الدین نے طبقات الشعرا یا تذکرۂ شعرائے اردو ترتیب دیا اور اس کے بعد آبِ حیات اس عمدگی سے آزاد نے لکھی کہ اس کی خوبیٔ زبان کے آگے سب تذکرے ہیچ ہو گئے۔ لیکن آزاد نے بھی نثر نگاروں کے متعلق کوئی کتاب نہ لکھی اور تاریخ زبان اردو نامکمل ہی رہی۔ خاکسار کو نثر نگاروں کے متعلق کتاب لکھنے کا خیال ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوا اور آخر کار ۱۹۲۴ء میں سیر المصنفین کی پہلی جلد شائع کی اور زبان اردو کی تاریخ کو تکمیل تک پہنچانے کی ایک ابتدائی کوشش کی۔ یہ تالیف اپنے مضمون پر سب سے پہلی کتاب تھی۔ اس کے بعد اور صاحبان نے بھی اس طرف توجہ فرمائی اور برابر کچھ نہ کچھ اس صنف میں لکھا جا رہا ہے اور یہ ضرورت بیشتر از بیشتر محسوس ہو رہی ہے کہ اُردو زبان کی تاریخ مکمل کی جائے۔ چنانچہ آج کی صحبت میں یہ مقالہ جو صاحبانِ فہم کے سامنے پڑھا جا رہا ہے اس سعی و کوشش کا پتہ دیتا ہے جو ہم لوگ اس بارے میں کر رہے ہیں۔

تکمیل تاریخ زبانِ اُردو میں کیا کیا مشکلات ہیں

سیر المصنفین جلد اول کے دیباچہ میں ایک جگہ تحریر ہے "........اس مقصد کو پیشِ نظر رکھ کر اس کتاب میں اہل ملک کے سامنے اپنی زبان کی عہد بہ عہد کی ترقی و تبدیلی کا ایک خاکہ کھینچا گیا ہے۔ اگرچہ اس سے ضمناً تاریخ اردو کی تکمیل بھی مقصود ہے جو اب تک ناتمام ہے اور کسی اہل نے ہنوز اس طرف توجہ نہیں کی........" دوسری جگہ یہ عبارت تحریر ہے "تاہم امید ہے کہ اس کتاب کی اشاعت ہمارے ناظرین میں تحقیق و تفتیش کی تحریک پیدا ہو جائے گی اور وہ اس کمی کو دور کرنے کی سعی بلیغ فرمائیں گے اور ان کی توجہ سے کامل یقین ہے کہ ہم آئندہ نہ صرف موجودہ مصنفین کے حالاتِ زندگی بالتفصیل زیبِ قرطاس

دیکھیں گے بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ آئندہ اِن دونوں دوروں کے مصنفین کی تعداد میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔"
جیسی کہ توقع ظاہر کی گئی تھی خدا کا شکر ہے کہ یہ امید پوری ہوئی اور اس طرف ایک بڑی تعداد کا خیال منعطف ہوگیا اور ان کی تحریرات سے ہماری معلومات میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا لیکن یہ کوششیں بھی ہمارے دردِ دل کا مداوا نہیں ہیں اور اس بات کی ضرورت ہے کہ از سرِ نو ایک جماعت اس کام کے لئے مصروفِ کار ہو اور جس طرح بن پڑے اس کارِ اہم کو انجام تک پہنچائے۔

مجھے سیر المصنفین لکھتے وقت بے حد مشکلات پیش آئیں۔ کوئی نمونہ میرے روبرو نہیں تھا۔ مصنفین کے حالات امتدادِ زمانہ نے ہماری دسترس سے باہر کردئے تھے۔ مصنفین کے پس ماندگان ان کے حالاتِ زندگی فراہم کرنے میں دریغ کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اصحاب کو اپنے باپ کے سوانح قلمبند کرنے میں بھی تامل تھا۔ یہ ناگوار صورت ایسی رکاوٹ تھی کہ ایک قدم بھی اس طرف نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ اگلے مصنفین اپنے حالات اشارتاً و کنایتاً بھی نہیں لکھتے تھے۔ خود اُن کی کتابوں سے بھی اُن کے حالاتِ زندگی پر روشنی نہیں پڑتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں تاریخ زبانِ اُردو کی تکمیل نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ ہم لوگ اب اس طرف توجہ کریں اور اس اہم کام کو پورا کریں۔

ترتیب و تدوین کس طرح ہو سکتی ہے؟

اگرچہ تاریخ اُردو کی ترتیب و تدوین کے بہت سے طریقے عام اذہان میں ہوں گے لیکن یہاں اُن میں سے چند کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ کامل غور و فکر کے بعد کسی ایک طریقہ پر متفق ہو کر ہم لوگ کاربند ہو سکیں اور اپنی آرزو کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور اس کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں اُردو کے بولنے اور لکھنے پڑھنے والے موجود نہ ہوں۔ چونکہ کتب و رسائل کی اشاعت کے طور و طریق تھوڑے ہی عرصہ سے رائج ہوئے ہیں، اس لئے ہر خطے کے اگلے لکھنے والوں کی کتابیں گوشۂ گم نامی میں پڑی ہوئی ہیں۔ بہت سے جواہرات ہیں جو خاک میں چھپ گئے ہیں اور ہم کو یہ خبر بھی نہیں کہ ان کے ناپید ہونے سے ہماری زبان کو کس قدر نقصانِ عظیم پہنچا ہے۔ سب سے بہتر طریقہ جو اِن جواہرات کو مٹی سے باہر نکالنے اور صاف کرنے کا ہے وہ یہی ہے کہ ہمارے اہلِ قلم اپنے اپنے اثر و اقتدار سے کام لے کر اپنے اپنے حلقۂ اثر میں چار پانچ اشخاص کی انجمنیں قائم کریں اور ہر ضلع یا ہر شہر کے شعراء اور اُدباء کی تحریرات کا کھوج لگائیں اور ایک ایک مضمون اِن مصنفین و مولفین مترجمین وغیرہ کے حالاتِ زندگی اور اُن کی کتابوں کے نمونوں پر حوالۂ قلم کریں جو رسالہ اُردو (دہلی) میں اشاعت پذیر ہوں اور اس طرح ہندوستان کے تمام شعراء اور اُدباء کے حالاتِ زندگی، ان کے دواوین اور کتابوں کے نام اور اُن کے بہترین نمونے فراہم کئے جائیں۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ مقامی انجمنیں اپنے اپنے مضامین کی ایک چھوٹے رسالہ کی شکل میں خود اشاعت کریں اور اردو کانگریس کو ایک ایک نسخہ بھیج دیا کریں۔ سیتاپور (یو۔پی) کی مثال میرے سامنے موجود ہے۔ وہاں کے چند اصحاب نے ایک انجمن بنا کر مولوی اکرام علی صاحب اخوان الصفا کے حالات معلوم کر کے ایک چھوٹے رسالے میں ترتیب دیے اور وہ رسالہ میرے پاس براہِ کرم روانہ فرمایا۔ چنانچہ

سیر المصنفین جلد اول کی دوبارہ اشاعت کے وقت صاحب اخوان الصفا کے حالاتِ زندگی درج کئے جاسکیں گے اور اب تک ہم لوگوں کو جو ناواقفیت تھی وہ دور ہو جائے گی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح برخوردار حسن یحییٰ عندلیب نے ایک مضمون "اردو کے نشو و نما میں میرٹھ کا حصہ" تحریر کیا ہے اور رسالہ اردو جنوری ۱۹۴۵ء میں چھپوایا ہے۔ مقامی انجمنیں اپنے اپنے مضامین اسی طرح رسالہ اردو دہلی میں چھپواتی رہیں تاکہ اس قسم کے مضامین سب ایک جگہ جمع ہو جائیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اردو کانگریس تمام بڑے بڑے شہروں میں مقامی انجمنیں قائم کرے اور اس قسم کے مضامین لکھنے کی ترغیب دے اور تمام مضامین کو ایک کتابی شکل میں شائع کرے۔ اس کے بعد کسی ایسے مقام پر جو مناسبِ حال ہو، تین یا پانچ اشخاص کی جماعت بناکر جو اس کام کے اہل ہوں اور جن کو اس کام کے کرنے کی فرصت و مہلت بھی ہو تاریخ زبان اردو لکھنے پر مقرر کرے اور اُن کو معقول ماہوار وظیفہ دے۔ انشاء اللہ یہ کام اس طرح بوجہ احسن تکمیل کو پہنچ جائے گا اور زبانِ اردو کی تاریخ مکمل ہو جائے گی۔

حلِ مشکلات جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اُس سے یہ نتیجہ اخذ نہ کرنا چاہیئے کہ اِس ترکیب سے تمام مشکلات آسان ہو جائیں گی۔ سب سے پہلی دشواری تو یہی ہے کہ ہم سب لوگ اِس طریق کار پر متفق بھی ہوتے ہیں یا نہیں کیونکہ ہمارے تمام کاموں میں اختلافِ نظر........ اور اختلافِ عمل پایا جاتا ہے اور اصل مقصد کو اپنی ذاتی وجاہت پر قربان کردیتے ہیں۔ اگر یہ مشکل دور ہوگئی تو پھر یہ بھی دقت ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں انجمنیں منعقد ہوسکیں اور اگر ان کا انعقاد ظہور پذیر ہو جائے تو اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ وہ یہ کام بھی کریں اور ہماری منشاء کے مطابق ہم کو امداد پہنچائیں۔ اگر بالفرض وہ ایسا بھی کریں تو اُن تین یا پانچ آدمیوں کی جماعت کے لئے یہ مسئلہ دشوار ہوگا کہ تمام مواد کو نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد کیا کیا انتخاب اور کیا کیا نظر انداز کرے۔ اگرچہ تمام ادبا اور شعراء کے حالات فراہم اور اشاعت پذیر ہو جانے کے بعد یہ فیصلہ ہر اہلِ قلم کے لئے آسان ہوگا کہ تاریخ ادبیات اردو میں کس کو جگہ دی جائے اور کس کو نظری کیا جائے۔

بہر حال ہم کو کام کرنا ہے اور اس مشکل کو آسان بنانا ہے۔ ہم کو فراخدلی کے ساتھ ہر مشورہ پر غور کرنا چاہیئے اور اردو زبان کی بہتری مدنظر رکھ کر اپنے ذاتی خیالات کو بہ جبر منوانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ اپنا اپنا نقطۂ نظر ضرور پیش کیا جائے لیکن اس کے تسلیم کرانے میں ضرورت سے زیادہ جوش نہ ظاہر کیا جائے اور دوسروں کی نیک صلاح کو پس پشت نہ ڈال دیا جائے۔ جو کچھ اردو کانگریس طے کرے اس پر اسی طرح عمل درآمد کیا جائے گویا یہ سب کچھ ہمارے دماغ کا اختراع ہے اور اس کا اتباع اسی طرح کیا جائے گویا یہ ہماری ذاتی خواہش ہے اور ہم کو اسی طرح اس کام کو تکمیل تک پہنچانا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو خدا کی ذات سے امید ہے کہ یہ بڑا کام جلد مکمل ہو جائے اور تاریخ ادبیاتِ اردو اپنی آپ نظیر بن جائے۔

انجمنوں کا انعقاد دہلی اور لکھنؤ کو چھوڑ کر بہت سے ایسے مقامات اور بھی ہیں جہاں اردو کی خوب نشو و نما ہوئی ہے مثلاً بنگال میں کلکتہ اور مرشد آباد، بہار میں عظیم آباد پٹنہ اور اس کے گرد و نواح کا ہر بڑا شہر۔ دکن میں حیدر آباد اور اورنگ آباد نیز میسور اور بنگلور، گجرات میں سورت اور احمد آباد، صوبہ بمبئی

میں خود بمبئی اور پونہ، سندھ میں کراچی اور حیدرآباد، پنجاب میں لاہور اور ملتان۔ ریاستوں میں رامپور، بھوپال اور گوالیار وغیرہ اور ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کا ہر بڑا شہر۔ اِن سب شہروں میں فوراً کام شروع ہو جانا چاہیئے۔
اردو کانگریس کی طرف سے تین آدمیوں کا ایک وفد اِن تمام شہروں کا دورہ کرے اور انجمنوں کو منعقد کرنے کے بعد ضروری ہدایات دے کر وہاں سے واپس آئے اور اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرے اور تمام انجمنوں کے ممبران کے اسماءِ گرامی شائع کرے تاکہ اُن کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو اور اپنے کام کو بخوبی انجام دیں۔ ہر مقام سے جہاں جہاں انجمنیں قائم ہوں تین ماہ کے اندر یہ سب اذکار اشاعت پذیر ہو جانے چاہئیں۔

تین یا پانچ آدمیوں کی جماعت

وہ جماعت جو تین یا پانچ آدمیوں پر مشتمل ہوگی، ان کے انتخاب میں شہرت و نمود کا خیال نہ کیا جائے بلکہ ان کی اہلیت کو مدِ نظر رکھا جائے۔ اہلیت کے بعد ان کی مصروفیت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ یعنی اگر وہ کسی دوسرے کام میں پہلے سے مصروف ہیں اور وہ کام بھی ہماری زبان کی اشاعت میں ممد و معاون ہے تو اُن کو اس جماعت میں شریک نہ کیا جائے۔ یہ تین یا پانچ آدمی ایسے ہونے چاہئیں جن کی نظر وسیع ہو اور جن کو اس کام کے کرنے کا شوق ہو اور جن کے دل میں اس کی چیٹک لگی ہو تاکہ تاریخِ ادبیاتِ اُردو لکھنے کے وقت ان کا قلم جنبہ داری سے پاک و صاف ہے۔

تاریخ ادبیاتِ اُردو

ادبیاتِ اُردو کی تاریخ جب کہ یہ تمام مسالہ فراہم ہو جائے لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تین حصے کئے جائیں پہلے حصہ میں اردو کی پیدائش کا حال درج ہو اور دکن کے تمام قدیم لکھنے والوں کا ذکرِ خیر کیا جائے۔ دوسرے حصہ میں اردو کے عالمِ طفولیت کی تاریخ جو نظم میں ولی اور سراج سے اور نثر میں میر فضلی سے شروع ہوتی ہے بیان کی جائے۔ تیسرے حصہ میں بحرانِ انقلاب ۱۸۵۷ء سے عصرِ حاضر تک کے مصنفین و شعرا کے حالات قلمبند کئے جائیں۔ اس طرح یہ تاریخ بہت جلد مکمل اور سب کی نظر میں مستند ہو جائے گی۔
یہ بھی ممکن ہے کہ ان تینوں زمانوں کے کئی دور قائم کر دئے جائیں لیکن اس قسم کے امور ایسے ہیں کہ اس جماعت کے اصحاب کے لئے چھوڑ دئے جائیں اور وہ جو کچھ مناسب سمجھیں اندازِ تحریر کے ساتھ ساتھ اس کا بھی خیال رکھیں کہ کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔
میں یہاں تک لکھ چکا تھا کہ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ یہ جو کچھ تم نے لکھا ہے ناقابلِ عمل ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ آپ کی رائے کن وجوہ پر مبنی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جن اصحاب کو علمی کام کرنے کا موقع ملا ہے وہ یہ خوب جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں کوئی شخص اس سرگرمی کے ساتھ بلا معاوضہ کام نہیں کرتا جس قدر شوق دہی سے اسے معاوضہ لے کر کام کرنا پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بلا معاوضہ کام اکثر ادھورا رہ جاتا ہے۔ اگر اردو کانگریس کو واقعی کچھ کام کرنا ہے اور محض ایک نمود و نمائش کی جماعت نہیں بننا ہے تو اس کو چاہیئے کہ کافی سرمایہ بہم پہنچا کر تمہاری تجویز کے مطابق ہر بڑے شہر میں ایک اہلِ قلم کی خدمات حاصل کرے اور اس طرح ہر ضلع کے سب اگلے پچھلے شعرا اور ادبا کے حالاتِ زندگی فراہم کئے جائیں اور ان کی تحریرات کے نمونے پیش کئے جائیں۔ ورنہ بلا معاوضہ کام کرنے والے وعدہ تو ضرور کر لیں گے لیکن اس کو

پورا نہیں کر سکیں گے اور اندیشہ ہے کہ یہ مفید کام ادھورا رہ جائے اور بدنامی کے سوا کوئی نتیجہ نہ برآمد ہو۔
آخر میں میری دعا ہے کہ بانیانِ اردو کانگریس کے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو اور ہمارا جمود و سکون جدوجہد میں تبدیل ہو کر تاریخِ زبانِ اردو کی تکمیل کا باعث ہو۔ فقط والسعی منی والاتمام من اللہ۔

محمد یحییٰ تنہا

آب و آتش

یک بیک نالۂ شبگیر کی مانند اٹھا
ابر کا شور دلِ چرخ کو دہلاتا ہوا !!
ایک بپھرے ہوئے اُمڈے ہوئے طوفاں کی طرح
وقت کے ساحلِ خاموش سے ٹکراتا ہوا !!

مسندِ خاک پہ وہ دیکھو ہوئے جلوہ فروز
گوہرِ آب کی صورت میں ستاروں کے رسول
ہر طرف نورِ مسرت کا ہے فراں جاری
قلبِ گردوں ہے مگر خستہ و ناشاد و ملول

جانے کس بزم میں لے آئے ہیں دل کو میرے
یہ سلگتے ہوئے ارماں یہ برستی ہوئی رات
جس جگہ گیت نہیں رنگ نہیں حسن نہیں
گرمیٔ ساز سے بیزار، دلِ سازِ حیات

شعلۂ زیست ـــــ سسکتی ہوئی آہوں کا دھواں
جذبۂ شوق ـــــ اترتے ہوئے نشہ کا خمار
نہ تلاطم کی تمنّا، نہ تبسم کا شعور
صرف اک جنبشِ انفاس، سو وہ بھی بیمار

کس طرح دیکھوں یہ دم توڑتی نظروں کا گداز !
کس طرح آتشِ احساس بجھا لوں آخر
حسن اور حلقۂ تاریکیٔ غم میں مجبور !!!
آہ کس دل سے نگاہوں کو چرا لوں آخر

دل کہ مدت سے اسیرِ خمِ ابرو ہی رہا !
خنجر و تیغ کی جھنکار بھی سن سکتا ہے
لاؤ! اب ظلمتیں تا دیر نہیں رہ سکتیں
صبحِ فردا کو بھی اس گیت پہ سر دھننا ہے

لطیف ساجد

زبان اردو کے چند تاریخی کتبے

ہندوستان میں ابتدا سے آج تک جب ہم کتبات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو علاوہ ثقافتی اور تاریخی اہمیت کے لسانیاتی اعتبار سے بھی عجیب وغریب انکشافات پیش آتے ہیں محققین کی قلم سے جس قدر بھی آج تک سواد اس ضمن میں دیکھنے میں آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک کسی نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی کہ اردو زبان جو اس وقت ہندوستان کی مسلمہ زبان قرار دی گئی ہے اس میں بھی یہ اہم مواد اسی طرح موجود ہے جس طرح دوسری زبانوں میں۔

میری ناقص رائے ہے کہ اگر ہم کسی مقام کی صحیح تاریخ لسانیات کا مطالعہ کرنا چاہیں تو سب سے اول کتبات کی تلاش لازمی نظر آتی ہے جن سے حیرت انگیز خصوصیات زبان مشاہدہ میں آئیں گی کیونکہ ان سے ہمیں وہ ضروری امور میسر آئیں گے جو کسی دیگر ماخذ از قسم کلام شعرا اور تحریرات مورخین بہ مفقود ہیں اگر بالفرض ہمیں بعض امور حاصل بھی ہو جائیں تو ان کے متعلق یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ آیا وہ واقعی اسی خاص مقام کی پیداوار ہیں جہاں کے متعلق ان کا دعویٰ ہے اور اس کے برعکس یہ شکوک کتبات میں پیدا ہونے کا کم گمان ہے کیونکہ وہ تو وہیں اسی مقام پر ہی میسر آتے ہیں اور اسی مقام کے علمی حضرات کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں اسی وجہ سے ہم اگر چاہیں تو آج بھی ان کتبات کی موجودگی سے ہر مقام کی لسانیاتی خصوصیات کا تجزیہ کرسکتے ہیں اور ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ کتبات ارتقاء زبان کے ضمن میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج ان انکشافات کی بدولت بالخصوص ہندوستان کی قدیم زبانوں کے ضمن میں ہر مقام کی زبان کی لسانیاتی خصوصیات ہم تک نہایت مستند صورت میں پہونچی ہیں ورنہ اس کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں۔

چونکہ میرا روئے سخن اس وقت زبان اردو کے کتبات سے ہے اس لئے ممکن ہے مجھ پر کوئی صاحب اعتراض کریں کہ تاریخی اعتبار سے اٹھارہویں صدی عیسوی سے پیشتر ہندوستان میں کسی بولی کا نام "اردو" نہیں تھا اور دراصل اس کے معنی "فوج یا لشکر" کے ہیں جو مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان میں اسی معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے چونکہ فوج ہمیشہ مخلوط آدمیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اس لئے وہ فوجی لوگ ہمیشہ ایک مخلوط سی زبان بولتے تھے جس وجہ سے اس زبان کو خاص کر "زبان اردو" کے نام سے بجائے فوجی زبان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اور یہ اردو کا لفظ اسی "فوجی" کے معنوں میں اس قدر عام زبان زد ہو گیا تھا کہ جو چیز یا امر فوج سے متعلق ہوتا اس کے ساتھ لفظ اردو لگایا جاتا تھا چنانچہ دہلی میں "اردو کا مندر" کے نام سے آج بھی ایک عمارت موجود ہے جو شاہجہاں کے عہد کی یادگار تصور کی جاتی ہے چونکہ یہ مندر پادشاہی جینی فوجی لوگوں کا تھا اسی سبب سے اردو کا مندر کہلانے لگا[1] مگر جس طرح آج عرف عام میں اردو ایک عام ہندوستان کی بولی شمار کی جاتی ہے میرے خیال میں سب سے پیشتر مصحفی نے سنہ ۱۱ھ کے حدود میں لفظ اردو کو ہندوستان کی عام بولی کے نام سے استعمال کیا ہے۔

ہاں یہ بھی اقرار کرنا پڑتا ہے کہ جہاں کہیں مسلمان مصنفین نے ابتدا میں ایسی مخلوط زبان اپنے علمی کارناموں میں استعمال کی ہے وہاں اس کے لئے لفظ ہندی استعمال کیا ہے اور اسے انہوں نے فارسی رسم الخط میں ہی لکھا ہے اور وہ زبان جو دیوناگری حروف میں لکھی جاتی تھی اسے عام طور پر "برج بھاشا" کے نام سے

[1] واقعات دہلی مولفہ بشیرالدین احمد جلد ۲ صفحہ ۲۰۶

یاد کیا ہے۔ مجھے یہاں یہ بیان کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے کہ ابتدا سے لے کر متاخر زمانہ تک اچھے اچھے مسلمان بھی بھاشا کے شاعر ہوئے ہیں یا امیر خسرو ہندی کے اول مسلمان شاعر تھے یا ملا مخدوم شیخ تقی الدین جامع مسجد دہلی میں فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں نورک اور چندا بھاشا کے شعرا کے کلام کو اپنے مواعظ حسنہ میں لوگوں کی جلدی تفہیم کے لئے استعمال کیا کرتے تھے[۱] یا ملک محمد جائسی نے پدماوت اسی برج بھاشا میں لکھی مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانان ہندوستان ابتدا سے ہی اس مقامی زبان سے خوب واقف تھے جس کا ثبوت ہمیں علاوہ دیگر شواہد کے بعض کتبات سے بھی ملتا ہے کہ کس طرح مسلمانوں نے اس مقامی زبان کو جو عام سمجھی جاتی تھی اس کا استعمال کتبات میں بھی کیا ہے جس کے چند نمونے آج بھی بعض قدیم یادگاروں پر ملتے ہیں اور ان کو اسی عربی رسم الخط میں کندہ کیا ہے۔ اگر آج ہم ان کتبات کو اردو یا ہندی کتبے کہیں تو کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ ان کتبات کی لسانیاتی خصوصیات جیسا کہ ذیل کے کتبات سے واضح ہو جائے گا وہی ہیں جو آج روزمرہ کی زبان اردو میں پائی جاتی ہیں اگرچہ ان میں مقامی عنصر بھی کافی ہے۔

گجرات اسی ضمن میں پیش پیش نظر آتا ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت آل مظفر کے نام ۸۸۱ھ سے لے کر ۹۸۰ھ تک رہی اور اس کے بعد مغلوں کا دور دورہ ہو گیا اور احمد آباد ان سلاطین گجرات کا پایۂ تخت تھا۔ جہاں بے شمار اسلامی یادگاریں آج بھی ملتی ہیں۔ چنانچہ احمد آباد کے محلہ رائے کھڈ میں ایک درگاہ شاہ علی جیوگا مدھنی کے نام سے مشہور ہے جو ایک روضہ اور مسجد پر مشتمل ہے یہ ہمیں خوب علم ہے کہ شاہ علی جیو گامدھنی متوفی ۹۷۳ھ گوجری یا قدیم اردو کے بلند پایہ شاعر تھے اور ان کا صوفیانہ کلام مرتب صورت میں بنام "جواہر اسرار اللہ" ملتا ہے[۲] اور اس درگاہ کی مسجد کے اندرونی مغربی دیوار میں تین محرابیں ہیں اور تینوں محرابوں پر سر سری سلوں میں کتبات ہیں درمیانی سل پر آیات قرآنی کندہ ہیں اور دائیں محراب کی سل پر شجرہ طیبہ صلعم معہ تاریخ تعمیر مسجد ماہ شوال ۹۶۱ھ" ہے اور تیسری سل جو بائیں محراب پر ہے جو ہمیں یہاں بیان کرنا مقصود ہے کتبہ ذیل موجود ہے:-

"المعتصم باللہ الرحمٰن غیاث الدنیا والدین ابو المجاہد احمد شاہ ابن عم محمود شاہ بن لطیف شاہ اخ بہادر شاہ ہیں مظفر شاہ بن محمود شاہ ابن محمد شاہ بنی احمد شاہ بن محمد شاہ بن مظفر شاہ السلطان خلد اللہ ملکہٗ

خنا دینسن بچھا کر باندھے شاہ جی بال	بانی مسجد کے تیئیں ہیجن ملک جلال
تاریخ اسی بیت کی ہوئی سیدوں مشہور	مسجد جامع کے بیچ بٹھا دیا ہی نور[۳]

۹۶۰ (۹۶۱)

اس کتبہ سے اول تو یہ ہے کہ یہ مسجد غیاث الدین ابو المجاہد احمد شاہ تیرہویں سلطان گجرات کے عہد میں تعمیر ہوئی جو

---

[۱] اس کے لئے "ہندی شاعری" مولفہ ڈاکٹر اعظم کریوی ملاحظہ ہو۔

[۲] ملاحظہ ہو اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۱ء مضمون گوجری یا گجراتی سولھویں صدی میں" از پروفیسر شیرانی

[۳] مسلم مونومنٹس آف احمد آباد از عبداللہ چغتائی بلیٹن دکن کالج پونہ جلد ۳ صفحہ ۱۵۹ - ۱۵۸

محمود شاہ برادر بہادر شاہ کے چچا کا لڑکا تھا اور اس کے بعد دو[۲] اشعار ہیں جو اُردو زبان کے ہیں اول سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسجد کا بانی ملک جلال تھا جو شاہ علی جیو گامدھنی) کے مریدوں سے تھا چونکہ شاہ علی جیو کو ہمیشہ شاہ جی کر کے ہی تذکرہ نگاروں سے تحریر کیا ہے اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ یہاں شاہ علی جیو سے مراد ہے اور اغلب ہے کہ یہ اشعار بھی ان کی ذاتی طبع کا نتیجہ ہیں اور دوسرے شعر سے مسجد کی تاریخ تعمیر ہے اور مقامی اعتبار سے مسجد کی بجائے لفظ مسیت استعمال کیا ہے۔ ہاں ایک امر توضیح طلب یہ ہے کہ میرے حساب سے تاریخ سنہ ۹۶۰ھ نکلتی ہے اور چاہیئے سنہ ۹۶۱ھ جیسا کہ کندہ ہے اس لئے مجھے اقرار کرنا پڑے گا کہ ممکن ہے کہیں مجھ سے پڑھنے میں غلطی ہو گئی ہو اگر کتبے کا لسانیاتی اعتبار سے تجزیہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ بالخصوص الفاظ جو اس میں استعمال ہوئے ہیں ان کا آج بھی اسی طرح عام زبان اردو میں استعمال ہو رہا ہے غرض کہ یہ کتبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اور اس وقت کی اردو یا گوجری یا ہندی ہونے کی حیثیت سے کافی اہمیت رکھتا ہے۔

۲- کتبہ ذیل بھی جو ہر دو اُردو اور دیوناگری حروف میں ہے۔ ریاست برودہ کے ضلع ہمسانہ قریہ وڈنگر سے ہے جیسے گجراتی، ہندی اور اردو کتبہ سمجھ کر ذیل کی طرح پڑھا گیا ہے افسوس کہ یہ کافی مسخ ہو چکا ہے جس کی وجہ سے بعض حروف پڑھے نہیں گئے بالخصوص دیوناگری تو جو بین السطور ہے بالکل مسخ ہو چکا ہے۔

چیت ماس تتہ چور تماشی ۔ سولہ سی پر ایک نواسی
اسلام خاں صوبی وکاجی ۔ لطف الہ پہ جس وزیرا جی
سر کرشن شکل ۔ نول
سری سد ہنا تھ درس پاکی ۔ کبت کوی جگجیو نداس
شہر (؟) سنہ ۱۰۴۲ھ م ا

ملا عبد الحمید لاہوری نے اپنے بادشاہ نامہ میں درج کیا ہے کہ اسلام خاں حاکم دار الخلافہ اکبر آباد سنہ ۱۰۴۲ھ میں بہ عہد شاہجہاں ناظم گجرات مقرر ہوا اور قریب تین سال کے اندر اندر گجرات سے تبدیل ہو کر بخشی الممالک کے خطاب سے سرفراز ہو کر بنگال ارسال کیا گیا[۲]۔ اور اول شعر کے مصرع ثانی میں سنہ ۱۶۹۰ء بکرم ہے اور آخر میں ہجری تاریخ۔ کتبہ میں لفظ شہر (مہینہ) کے بعد کا لفظ صاف پڑھا نہیں جاتا اگر اسے رمضان پڑھ لیں جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے تو اس پر تاریخی اعتبار سے ایک اعتراض پایئے گا کیونکہ اسلام خاں اس سے پیشتر رجب کے مہینہ میں تبدیل ہو چکا تھا۔

خوش قسمتی سے کتبہ کو کوی (شاعر) جگجیونداس نے نظم کیا ہے جو اس زمانہ میں ایک مشہور و معروف ہندی زبان کا شاعر تھا[۳] اس کے کلام کے بے شمار مجموعے ملتے ہیں۔ لسانیاتی اعتبار سے اس کتبہ کے الفاظ میں بھاشا کا عنصر زیادہ غالب ہے تاہم آجکل کے اردو الفاظ بھی اس میں عیاں ہیں۔

---

[۱] مسلم انسکرپشن (Inscription) جلد ۳ برودہ ریاست سنہ ۱۹۴۴ء۔ صفحہ (۱۰/۱۱)
[۲] بادشاہ نامہ ج ۱ صفحہ (۱۹۹، ۱۶۹)
[۳] ہندی لٹریچر از کسی کلکتہ سنہ ۱۹۲۰ء (۶۸)

۳۔ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد میں نواب کمال خاں بہاری جالور (ریاست جودھپور) کا حاکم تھا اور سخاوت و فیاضی اور رفاہ عام کے کاموں میں ضرب المثل تھا آج تک جالور، سانچور اور بھین مال کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام نیک نامی کے ساتھ چڑھا ہوا ہے اس نے سانگی ندی سے جو قصبہ بھین مال سے چار پانچ کوس دکن کی جانب بہتی ہے ایک نہر کھدوا کر رانی سرتالاب میں جو قصبہ مذکور کے پاس بہت بڑا تالاب ہے ڈال دی تھی جس سے رعایا کو بہت آرام ہو گیا نواب کمال خاں کے اس کار خیر کی یاد و تعریف میں ذیل کا ہندی دوہا، اب تک زبان زد ہر خاص و عام ہے۔

سانگی گنگا سار کی بھل آنی بہن سال
کہ آوے کرتار سے کے لایو خاں کمال[1]

جس کا عرف عام میں مطلب ہے کہ ندی سانگی سے جو مثل گنگا کے ہے نہر بہن سال میں خوب لائی گئی ہے یا تو خدا سے آتی یا کمال خاں لایا۔

مجھے کسی مقامی شخص سے عرصہ ہوا معلوم ہوا تھا کہ یہی دوہا ابھی تک ایک کتبہ کی صورت میں جالور میں موجود ہے اگرچہ میں نے خود نہیں دیکھا۔

۴۔ اسی طرح روضۂ اقدس حضرت نظام الدین اولیا کے اندر ایک کتبۂ ذیل عزیز الدین عالمگیر ثانی کے عہد کا مورخہ ۱۱۶۹ھ کا ہے عالمگیر ثانی حضور نظام الدین اولیا سے بہت عقیدت رکھتا تھا اس نے چند اشعار آپ کی مدح میں کہے اور وہ ایک کتبۂ ذیل کی صورت میں اندرون گنبد ایک سنگ مرمر کی سل پر محفوظ ہیں[2]

یا عزیز

جو ہوئے خادم نظام الدین کا دیس اسے عزیب اس کے تئیں ہوتا ہے تاج خسروی جگ میں نصیب
خادمی کی تھی عزیز الدین نے با صدق و یقین تاج شاہی ہند کا مجھ کو دیا ہے عنقریب
مرض دل افگار میرے کا وہ صحت بخش ہے بے غذا و بے دعا و بے دوا و بے طبیب
بس پریشاں حال ہے اب خلق پر محبوب حق فضل کر تقصیر واروں پر تم ہو حق کے طبیب

باہتمام غلام ہوشیار علی خاں محلی ۱۱۶۹ھ

ان چند متذکرۂ بالا کتبات کے اندراج پر اکتفا کر کے یہ کہنا پڑے گا کہ ارتقاء زبان اردو کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے ہم نے آج تک اس ضمن میں توجہ نہیں کی اور ان کے مطالعہ سے ہمیں وہ امور خود بخود بآسانی حاصل ہو جائیں گے جو ہمیں مشکل سے بڑے بڑے مصنفین کی کتب سے جوائے تلاش کرنے پر بھی میسر نہیں آتے یعنی الفاظ کی بندش۔ ان میں مقامی عنصر جو ناگزیر ہے، اسی بنا پر ان کتبات کے علاوہ عربی و فارسی کے اکثر کتبات میں بعض مقامی الفاظ بھی مل جائیں گے جو بالکل وہاں عجیب و غریب نظر آتے ہیں۔ متذکرۂ بالا کتبہ جالور کے متعلق یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ وہ اس زبان میں ہے جو آج بھی وہاں مارواڑی یا راجپوتانی زبان کے نام سے بولی جاتی ہے ہاں عالمگیر ثانی کے کتبہ سے جو زبان ہمیں میسر آتی ہے وہ بالکل آج کل کی "زبان اردو" ہے جو دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے جس کو قریب دو سو سال ہو چکے ہیں اور اسی عہد میں یہ "زبان اردو" کے نام سے مشہور ہو چکی تھی اور یہی زبان مصحفی کا ہے۔

محمد عبد اللہ چغتائی

---

[1] آثار خیر از سعید احمد مارہروی۔ آگرہ ۱۳۲۳ھ صفحہ (۱۱۱)
[2] واقعات دہلی مولفہ بشیر الدین احمد ج ۲ ،، (۷۹۲)

صوبۂ بنگال کا اردو سے تعلق

ہندوستان میں آج اتحاد و اتفاق کی جتنی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے، ماضی کا زمانہ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ملک بھر کے دور اندیش مفکر سیاست داں اور مدبر اس مقدس مقصد کو تقویت پہونچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کی مساعی جمیلہ قابل صد ستائش و آفریں ہیں، چنانچہ صوبۂ بنگال بھی اس مبارک تحریک سے متاثر ہو رہا ہے۔

انسانوں کے باہمی تبادلۂ خیال کا ذریعہ زبان (بولی) ہی ہو سکتی ہے، اگر ایک وسیع علاقہ میں ایک ہی زبان بولی اور سمجھی جائے تو یقیناً اس کے باشندوں کو اتحاد اور اتفاق قائم کرنے میں کوئی دقت نہیں پیش آسکتی اس کے برعکس جتنی زبانیں زیادہ ہوں گی اتنے ہی اس خطے کے لوگ، یا لوگوں کے گروہ ایک دوسرے سے دوری پر ہوں گے۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے، یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص ایک ہی زبان سیکھ کر موقع پڑنے پر ملک کے کسی بھی حصہ میں اپنا مطلب سمجھا سکے، اس ملک کو حقیقی ترقی تک پہونچانا نصیب نہیں ہو سکتا۔

اس وسیع ملک یا چھوٹے براعظم میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں، لیکن کتنی زبانیں ہیں جو فی الوقت ملک کے ہر حصہ میں سمجھی جاتی ہیں؟ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ زبان اردو ہے۔ اردو سے ملک کا وسیع طبقہ مستفید ہوتا ہے، سب اس کی خوبیوں سے واقف ہیں۔ ہندوستان میں اردو کے حامیوں کی کمی نہیں۔ لیکن ایک طبقہ ایسا بھی موجود ہے جو اپنے ذاتی اغراض کی بناء پر اردو کا دشمن بنا ہوا ہے، تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ یہی طبقہ اردو کی کان سے چاندی کے انبار نکال رہا ہے، مگر تعجب اور کوتاہ اندیشی کا کیا علاج۔

صوبہ بنگال میں کروڑوں مسلمان آباد ہیں، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے، ہر ایک صوبہ کے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو بلکہ غیر مسلموں کو بھی بھائی سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بنگالی مسلمان بقیہ صوبوں کے مسلمانوں سے محبت کرنے میں بہت پیچھے ہیں، اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ان کی زبان وہ نہیں جو دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کی زبان ہے، پھر ان کو برادران وطن نے ڈرا رکھا ہے کہ اردو کے حامی بنگالی زبان کے دشمن ہیں، اردو جتنی اس صوبے میں بڑھے گی اتنی ہی بنگالی زبان مٹے گی۔

ہم اردو کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے کہنا چاہتے ہیں کہ بنگال میں اردو کی ترقی کے لئے، وسیع میدان موجود ہے، اس لئے بنگالی مسلمان بھائیوں کو صحیح واقعات سے روشناس کرانا ضروری ہے، ہم ان کو یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اردو کے حامی ان کی مادری زبان کے دشمن نہیں۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں، بلکہ یہ پورے ہندوستان کے ہر مذہب و ملت کی زبان ہے۔ مسلمانوں نے کبھی بھی بنگالی زبان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ ان کے زیر سایہ یہ زبان پروان چڑھی۔ یہاں اردو زبان نہ ہونے کے باعث جسم ہندوستان کا ایک عضو رئیسہ اتحاد اور اتفاق کے نقطۂ نظر سے کم و بیش معطل ہو رہا ہے، اب ہم اپنے ہندو بھائیوں بالخصوص مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ "ہندوستانی ہندی" وغیرہ کا فتنہ اٹھا کر ملک کے اتحاد و اتفاق کو پارہ پارہ نہ کریں۔ جب کہ اس صوبۂ بنگال کو فخر حاصل ہے کہ اردو کی خدمت منظم طور پہ بنگال سے شروع ہوئی، اور نثر کی سب سے پہلے قابل قدر کتابیں جو آج دکھلائی دیتی ہیں، وہ فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی رہین منت ہیں، کیا بنگال اپنی اس شاندار تاریخ کو بھول جائے گا۔ اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اسی

صوبۂ بنگال کے اضلاع. مرشد آباد، ڈھاکہ، ہوگلی، سلہٹ وغیرہ کی خاک سے ایسے ایسے نامور ہندو و مسلمان شعرائے اُردو پیدا ہوئے کہ اپنے اعلیٰ تخیلات سے اس کو رشک دہلی و لکھنؤ بنا رکھا تھا۔

بنگال میں مسلمانوں کا تاریخی دور مسلمان سپہ سالار بختیار خلجی کے نام سے شروع ہوتا ہے، وہ قرونِ وسطیٰ کے نامی سپہ سالاروں میں سے تھے، جس کی نظیریں موجودہ زمانہ بہت کم پیش کرسکتا ہے، تاریخی واقعہ ہے کہ جب وہ اٹھارہ سواروں کے ہمراہ "لکھنوتی" (جو بعد میں گور کے نام سے مشہور ہوا) کے قریب پہونچا تو بنگال کا راجہ سین خوف زدہ ہوگیا اور وہ سب کچھ چھوڑ کر ڈھاکہ کی طرف بکرم پور چلا گیا۔ کون باخبر شخص نہیں جانتا کہ پورے ہندوستان کی مسلم آبادی کا ایک تہائی حصہ بنگال میں ہے۔ تو معاً یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہاں بھی مسلم ثقافت اور ادب کے بے شمار مرکز ہوں گے۔ مگر نہیں! ۔ اگرچہ سرکار کمپنی بہادر کو دہلی سے حقوق دیوانی ملتے وقت ایک شرط یہ بھی طے پائی تھی کہ عدالتوں میں زبان فارسی اور فارسی رسم الخط استعمال ہوا کرے گا۔ لیکن فارسی کی بقاء تو درکنار اس صوبہ کے مسلمان اُردو زبان سے بھی بے گانہ ہوگئے اور اب بعض ایسے مسلمان بھی ہیں جو اُردو سے مغایرت برتتے ہیں۔ لیکن ایسے مسلمانوں کی بھی کچھ تعداد ہے، جو دل سے بنگالہ زبان کے مداح ہیں اور اس زبان اور رسم الخط کو اپنا سمجھتے اور اسے ترجیح دیتے ہیں۔ گو یہ اردو کی اہمیت کو بھی سمجھتے اور اس سے محبت کرتے ہیں، اور حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے ہی مسلمانوں کے کرم و عنایت نے بنگالی زبان کو اس کے موجودہ رتبے پر پہونچانے میں امداد دی ہے۔ ورنہ یہاں کے برہمنوں نے اس کا گلا کب کا گھونٹ دیا ہوتا۔

تاریخ ادبیات بنگالی کے صفحہ چار پر مسٹر ڈی۔سی۔سین نے لکھا ہے کہ " قوانین منو" کے مطابق ہر ایک ہندو پر لازم ہے کہ وہ اس ملک (بنگال) سے کوئی تعلق نہ رکھے ورنہ اس کا دھرم بھرشٹ ہو جائے گا" پنڈت آنند تیرتھ نے لکھا ہے کہ "بنگال راکھشسوں اور پشاچوں کا مسکن ہے" چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آج کل بھی شمالی اور مغربی ہندوستان کے ہندو بنگالی قوم کو اپنے سے نیچا سمجھتے ہیں، یعنے سماج میں ان کا مرتبہ کم ہے۔

سب سے پہلے بدھ مذہب کے پیروؤں نے سنسکرت کو چھوڑا اور ملکی زبان میں مذہب کی اشاعت شروع کی، بنگالی زبان کے محسن اعظم اصل میں ایسے ہی لوگ ہیں انہی نے سب سے پہلے وہ راستہ اختیار کیا جو بنگالی زبان کی موجودہ ترقی و ترفیع کی بنیاد ہے۔ لیکن جب برہمنوں نے بدھ مذہب کے ماننے والوں کا قتل عام شروع کیا۔ تو ہزاروں ہزار بودھی اپنا وطن چھوڑ کر سیلون، چین، برما اور جاپان وغیرہ کی طرف چلے جانے پر مجبور ہوگئے، اسی زمانہ کے لگ بھگ پنڈت کرشنا نے بنگالی زبان کی صرف لکھی اور اس زبان کا نام پشاچی پراکرت رکھا، لیکن سنسکرت کے حامیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کردیا اور پنڈت کرشنا نے اس زبان کو ادبی معیار پر پہونچانے کی جو کوشش کی تھی وہ ملیا میٹ ہوگئی، برہمن مت کے ٹھیکہ داروں نے بودھوں کی زبان رسوم اور روایات کو مٹانے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے ادب میں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔

بنگال جب مسلمان سلاطین کے زیر اقتدار آیا تو انھوں نے بنگالی زبان کے استعمال کی سعی کی، چنانچہ "دنیش چندر سین" باوجود تعصب کے مسلمانوں کی رواداری کی بابت یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ "بنگالی زبان کو ادبی معیار تک پہنچانے میں بہت سی چیزوں سے امداد ملی اور اسلامی فتوحات کو اس میں سب سے بلند درجہ

حاصل ہے، اگر ہندو راجگان آزاد رہتے تو بنگالی زبان کو مسلمانوں کی سرپرستی حاصل نہ ہو سکتی اور اس کا نتیجہ صریح یہ ہوتا کہ اس زبان کی ترقی رکی رہتی "۔ پٹھانوں نے تیرہویں صدی عیسوی کے ابتدائی دور میں بنگال پر قبضہ کیا تھا۔ وہ اگرچہ دور دراز ملک کے باشندے تھے جو کوہ سلیمان کے اس پار واقع ہے۔ لیکن انہوں نے بنگال کے میدانوں کو اپنا وطن بنا لیا اور اپنے پہاڑی وطن کو واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ پٹھانوں نے بنگالی زبان سیکھی اور پنڈتوں کی اکثریت کے مابین رہنے سہنے لگے، ہندو اگرچہ محکوم تھے، لیکن مندروں کے کلس بھی مسجدوں کے گنبدوں کی مانند آسمان سے باتیں کرتے تھے، جب نیو وارد اپنی صبح، شام کی نماز کے لئے جمع ہوتے تھے تو مندروں سے سنکھ اور گھنٹے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ہندوؤں کے شاندار جلوس و مذہبی رسوم اور پوجا پاٹ وغیرہ ایسے ہی جوش و خروش سے منائے جاتے تھے جیسا کہ مسلمانو کے تہوار عید، شب برات اور محرم وغیرہ

مسلمان حکمرانوں نے سنسکرت زبانوں کی رزمیہ کتابوں کی شہرت سنی وہ سیاسیات کے زبردست ماہر تھے وہ جانتے تھے کہ ہندوؤں کی معاشرتی زندگی پر ان کتابوں کا بہت گہرا اثر ہے، وہ ان کتابوں کو پڑھنا اور سمجھنا چاہتے تھے۔ وہ بھانپ گئے تھے کہ برہمنوں کی معرفت ان کتابوں پر عبور حاصل کرنے کے لئے ایک عمر نوح کی ضرورت ہے۔ چنانچہ انہوں نے چوٹی کے عالموں کو مقرر کیا تاکہ وہ ان کتابوں کا ترجمہ بنگالہ زبان میں کریں، جسے عوام بولتے اور سمجھتے ہیں۔

بنگالی زبان میں مہابھارت کا ترجمہ پہلی مرتبہ حاکم نصیر اشاہ (نصرت شاہ) کے حکم سے ۱۳۲۵ء میں ہوا دوسری مرتبہ ترجمہ پراگل خاں صوبہ دار چاٹ گام کی ہدایت پر یہ کام نندی پرمیشور نے سرانجام دیا۔ نصرت شاہ بنگالی زبان کا انتہائی حامی تھا کہ بنگالی شاعر ودیا پتی نے اس کا ایک قصیدہ بھی لکھا ہے، پھر حسین شاہ نے ۱۴۸۰ء میں مالادھر باسو اور اپنے ایک مصاحب کے ذریعہ "بھگوت گیتا" کا بنگالی میں ترجمہ کرایا اور اسے گن راج کا خطاب عطا کیا۔ اب تک مسلمان حکمرانوں کے دیے ہوئے خطابات کی نسبت سے متمول ہندو بنگالی، معظم دار، سرکار ملک وغیرہ کہلاتے ہیں۔ پراگل خاں شاہ حسین کا سپہ سالار بھی تھا، چھوٹے خاں (ولد پراگل خاں) نے بھی سنت پدری پر عمل کیا اور جب وہ چاٹگام کا صوبہ دار مقرر ہوا تو ایک بنگالی ادیب نندی سے مہابھارت کے ایک باب کا ترجمہ کرایا، سترھویں صدی عیسوی میں شاعر علاول (علاؤ الدین) نے ملک جائسی کی پدماوتی کا بہت دلکش سنسکرت آمیز بنگالی زبان میں ترجمہ کرایا یہ ماگن ٹھاکر نامی ایک مسلمان کی زیر سرپرستی ہوا تھا، جو کہ اراکان کے حاکم کا وزیر تھا۔ پھر بعد میں علاؤ الدین نے امیر سلیمان کے حکم سے ایک فارسی کتاب کو بھی بنگالی زبان کا جامہ پہنایا مسلمان حکام کی یہ قدر دانی برہمنوں اور پنڈتوں کو ہمیشہ اپنے خیالات بدلنے پر مائل کرتی رہی آخر کار وہ (برہمن) بھی بنگالی زبان کے حامی بن گئے اور تحریر و تقریر میں اس کو استعمال کرنے لگے۔ اور ہندو راجاؤں نے بھی مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس زبان کی سرپرستی شروع کر دی۔

یہ ہے مختصر سی تاریخ ان علمی مساعی کی جو مسلمان بادشاہوں اور امراء نے کی اور بنگالی بولی کو زبان بنایا، بہت سے ہم عصر جو فرقہ پرستی کی تنگ فضا میں رہتے ہیں وہ اپنی کوتاہ نظری سے ہندو دھرم اور سنسکرت زبان کو زندہ کرنے کے لئے فرقہ پرستی کی بھٹی میں ہوا دیتے رہتے ہیں، لیکن ان کو سمجھنا چاہیے کہ جاننے والے جانتے ہیں کہ

ان کا یہ ادچھا حربہ ہرگز کارگر نہیں ہو سکتا۔
اگر کوئی یہ کہے کہ اُردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے ترقی دی ہے، عام ہندوستانیوں کو اس سے کوئی تعلق نہیں تو وہ سخت غلطی پر ہیں۔ جس طرح اردو عام ہندوستانیوں کی زبان ہے، جو مسلمان سلاطین اور امراء کی سرپرستی میں پروان چڑھی ٹھیک اسی طرح بنگالی بولی بھی انہیں کی بدولت زبان کے درجہ تک جا پہونچی اور علوم و ادب کے بیش بہا خزانے برہمنوں کی ٹھیکا داری سے نکل کر عوام الناس کے تصرف میں آگئے۔ یہ کام مسلمانوں نے اس وقت سرانجام دیئے جب کہ برہمنوں نے ان کو بھی عام طور سے اپنے زعم باطل میں...... اچھوتوں جیسا سمجھنے لگے تھے،
دنیا میں مسلمانوں کی اس عدیم المثال رواداری اور عدم تعصب کی نظیر نہیں ملتی۔ اگرچہ نووارد مسلمان فتوحات کے نشہ میں سرشار تھے لیکن انھوں نے انصاف کا ترازو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور ہندوستان کے مذہب، زبان اور رسم ورواج کی بابت ہمیشہ رواداری کا ثبوت پیش کرتے رہے۔
آج جو کچھ ادبی جواہر ریزے موجود ہیں وہ خواہ ہندی میں ہوں یا گجراتی، بنگالی اور پنجابی زبان میں سب انہی مسلمان حکمرانوں کی انتھک جدوجہد کا نتیجہ ہیں۔ سمجھ دار ہندوستانی ہیرو خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں پسند نہیں کرتے کہ ہندوستانی زبان میں جو غیر ملکی الفاظ شامل ہو گئے ہیں وہ صرف تعصب اور ہٹ دھرمی کی نذر ہو جائیں یہ صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ اور محبت بھرے دلوں کی یادگاریں ہیں۔
محاورے اور کہاوتیں اس وقت بنتی ہیں جب کوئی زبان اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ اکثر تاریخی تلمیحات بہت سے مشاہدات اور روزمرہ کے تجربے خاص معنوں میں استعمال ہونے لگتے ہیں۔ لیکن کسی زبان کی کہاوتوں کو کسی دوسری زبان میں سو فی صدی درست لغوی ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔ اگر کھینچ تان کر ترجمہ کر بھی لیا جائے تو سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کہنے والا کیا بک رہا ہے۔ ہر زبان اپنے مخصوص محاورات رکھتی ہے اور صرف ضرب الامثال کی بناء پر ہم ایک زبان کو دوسری زبان سے تمیز کر سکتے ہیں۔ ذیل کی چند کہاوتوں سے اندازہ ہو سکے گا کہ بنگالی زبان اور اردو زبان ایک دوسرے سے کتنی قریب ہیں۔

(۱) تومی پھیرو ڈالے ڈالے آمی پھیری پاتے پاتے — تم ڈال ڈال تو ہم پات پات
(۲) اَدھک سنیاسی تے گاجن نشٹو۔ یعنی زیادہ فقیروں سے خانقاہ برباد ہوتی ہے (دو ملاّ میں مرغی حرام)
(۳) سات کھون مایھ۔ سات خون معاف (۴) کاکے نئے گیلو کان۔ کوّا لے گیا کان۔
(۵) آکاش دھول جھاڑے آپن چوک پوڑے۔ آسمان کا تھوکا منہ پر گرتا ہے (۶) گرج بور بلا۔ غرض بری بلا ہے۔

غیر متمدن قومیں مجبور ہوتی ہیں کہ خصوصیت سے اسماء اور صفات کی کمی کو دوسری زبانوں سے پورا کریں اس نظریہ میں غور کرنے پر آپ کو معلوم ہوگا کہ کھانے پینے، رشتے، ناتے، موسم اور وقت کے تقریباً ۸۰ فیصدی الفاظ روزمرہ کی بول چال میں ایسے رائج ہیں جو ذرا سے لہجہ کی تبدیلی سے اُردو کہلا سکتے ہیں۔
جس طرح ہندوستان کے بعض حصوں میں ہندی اور اردو کا اختلاف پیدا ہو رہا ہے۔ اس صوبہ میں بھی ہندو بنگالہ اور مسلمان بنگالہ کا تنازع موجود ہے۔ ایک میں سنسکرت کے الفاظ کی بھرمار ہے تو دوسرے میں تمدن اسلامی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ ایک طرف ٹیگور نے بنگالی زبان کو غیر مانوس الفاظ محاورات سے آزاد کیا اور عوام کی بول چال سے قریب کر دیا تو دوسری طرف قاضی نذر الاسلام نے بنگالہ زبان کو حافظ اور سعدی کی فارسی بحروں سے مالا مال کر دیا۔ جس کی وجہ سے زبان بنگلہ وسیع ہوتی جا رہی ہے۔

عبد الجلیل (کلکتہ)

اُردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نصب العین

(یہ مضمون کل ہند اُردو کانگریس کے اجلاس تاریخ ادب اُردو میں پڑھا گیا جو جولائی ۱۹۴۲ء میں حیدرآباد دکن میں منعقد ہوئی تھی)

قدیم یونانیوں نے ہر علم کو فلسفے کی شان دے رکھی تھی۔ ان کی اس بظاہر عجیب و غریب عادت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو انھوں نے خود علم فلسفہ کی اس طور پر تدوین کی کہ آج تک ہر خیال کی بنا اور ہر عقیدے کے آغاز کا سراغ یونان کے فلسفے تک ملا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ ہر علم و فن کے اصول میں ایک خاص فلسفہ کی تلاش کی جاتی ہے اور اس کے طرز عمل اور اسلوب کو ایک فلسفہ قرار دیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کا ہر فکر اور ہر عمل ایک "فلسفے" کے ماتحت برسر کار نظر آتا ہے۔ لیکن ان سب تفلسف کی جڑ میں ایک چیز کارفرما تھی اور ہے۔ انسان کی زبان۔ انسان حیوان ناطق ہے۔ وہ بولتا ہے، اور اپنی بولی کے ذریعہ اپنے افکار، خیالات اور عقائد کا اظہار کرتا ہے "وہ کیا بولتا ہے، کیوں بولتا ہے اور کیونکر بولتا ہے؟" ان سوالات کے جواب نے علم اللسان اور علم الصوت کو پیدا کیا، اور اس علم کی کہنہ رسی اور موشگافی نے وہ تمام نازک بحثیں پیدا کیں جو مختلف علوم کے نام سے موسوم ہیں۔

مختصر یہ کہ زبان کا وجود انسان کے تمام افکار و اعمال کے اظہار کا ضامن اور ذمہ دار ہے اور یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے علوم انسانی کے وسیع اور عریض گنگ و جمن پھوٹ کر نکلتے اور انسان کی ہستی کو سیراب کرتے ہیں، نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ انکار مقصود ہے کہ انسان کی زندگی کے لئے تمام علوم اپنی کمی و بیشی کے ساتھ مفید ہیں لیکن اس حقیقت کا اعتراف بھی ناگزیر ہے کہ زبان کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے، ذرا سے غور سے بھی یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ زبان کا مطالعہ انسان کی ہستی کی تمام کیفیت اور چگونگی کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔ انسان کے "کیا، کیوں اور کیونکر" بولنے کے سوال نے جو جوابات پیدا کئے، ان میں سے ایک تو علم اللسان ہے اور اس کے بعد نظم اور پھر نثر ہے۔ علم اللسان تو صرف چند اہل "دماغ" کا حصہ ہو کر رہ گیا ہے مگر نظم اور نثر کی نوازش عام ہو گئی اور ہمیشہ عام رہے گی۔ نظم اور نثر نے زندگی کی ہر حالت میں انسان کی مدد کی ہے یہ دونوں وحشت، بربریت، تمدن اور تہذیب، ہر حالت میں انسان کی ہمدم رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ لہٰذا جہاں فلسفہ انسان کے محض افکار کا بیان کرتا ہے، نظم و نثر اس کے افکار و اعمال کی روزانہ کیفیات اور ان کی ترقی اور تنزل کا نقشہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اس لئے ہر متمدن قوم اپنی زبان کی نظم و نثر کی کیفیات اور ان کی ترقی، ان کے نشو و نما اور ان کی ترمیم و تبدیل کا مطالعہ کرتی ہے۔ اور اسی مطالعے سے اقوام کے مافی الضمیر سے لیکر ان کی ذہنیات کی باریکیوں تک کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اس علم سے جو جو کام نکلتے ہیں اور اس سے جو جو فوائد حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس کی تفصیل کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔

نظم و نثر کی بدلتی ہوئی کیفیات کا معلوم کرنا اور معلوم کرتے رہنا انسان کی اس عادت کا ایک ظہور ہے کہ وہ اس کائنات میں اپنی ہستی کو ابدی ہستی بنانے کے لئے اپنے تمام اعمال و افعال کو یاد رکھتا ہے اور اس غرض سے ان کو کسی نہ کسی صورت میں "قلمبند" کرتا رہتا ہے۔ یہ "قلمبندی" چٹانوں اور پتھروں کی بھدی تصویروں سے لے کر ریڈیو گراف کے نازک اور خوبصورت نقوش تک کی شکل میں رونما ہوتی ہے۔ اسی قلمبندی، اسی تحریر کا نام تاریخ نویسی ہے۔ انسان اپنی اور سب باتوں کی یاد کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہتا ہے کہ وہ آج سے ہزاروں برس پہلے کیونکر بولتا تھا۔ وہ یہ دیکھ اور سمجھ کر خوش ہوتا ہے کہ اب فلاں وقت میں وہ اپنے مافی الضمیر کو یوں اور یوں ادا کرتا ہے اور پھر یہ بھی نتیجہ نکالنا چاہتا ہے کہ غالباً آئندہ زمانہ میں وہ ایسے ایسے اپنے خیالات کو ادا کیا کرے گا اور اس تمام یادگار پر وہ فخر کرتا ہے اور بلاشبہ اسے فخر کرنے کا حق بھی ہے! کیونکہ اس کی زبان اور اس کی تدریجی ترقی، عروج اور ترمیم و تبدیل کا یاد رکھنا اور اس یادگار کو جمائے رکھنا اس کی حیات کا ضامن ہے۔

نظم و نثر کے امتزاج سے ادب پیدا ہوتا ہے اور ان کی تاریخ اور احوال کے ضبط کا نام تاریخ ادب ہے۔ جس طرح ہر چیز کا ایک فلسفہ ہے اسی طرح ہر چیز کی ایک تاریخ بھی ہے۔ تاریخ ہر چیز کی ہستی اور اس کی گزشتہ تاریخی ترقی، پھر اس کی آئندہ بقا و حیات کے امکانات اور اس سے وابستہ امیدوں کا پتہ دیتی ہے۔ اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز بہ یک وقت اہم بھی ہے اور نازک بھی لہٰذا کسی زبان کے ادب کی تاریخ نویسی میں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بظاہر یہ امر عجیب معلوم ہوتا ہے مگر یہ ایک امر واقعی ہے کہ دنیا کی اکثر و بیشتر زبانوں کے قواعد صرف و نحو اور ان کی ترقی اور

نشوونما کی تاریخ غیراقوام نے قلمبند کی ہے۔ اُردو زبان بھی اس عمومی خصوصیت سے خالی نہیں رہی۔ چنانچہ اردو کی صرف ونحو اور اس کے ادب کی تاریخ بھی بڑی حد تک غیرہندی مصنفوں اور مولفوں کی رہینِ منت ہے ان غیرہندی مصنفوں کے بعد خود ہندوستانی اہلِ قلم کا زمانہ آتا ہے اور اسی سے ہمیں اس وقت سروکار ہے۔

اُردو کے ملکی یعنی ہندوستانی اہلِ قلم نے اردو ادب کی جو تاریخیں لکھی ہیں' ان میں معلوم ومشہور چیز اُردو شعرا کے تذکرے ہیں۔ مگر وہ صرف شعرا کے تذکرے ہیں اور صرف شعروسخن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو کے کلاسیکی دور کے تذکرہ نویسو کے بعد حال کے تذکرہ نویسوں کا زمانہ آتا ہے۔ ان میں پیش پیش محمد حسین آزاد ہیں جن کی کتاب "آبِ حیات" حال کے تذکروں کے لئے نمونہ بن گئی تھی۔ خمخانۂ جاوید' شعرالہند اور گلِ رعنا اس سلسلے میں قابلِ تعریف کتابیں ہیں۔

ان کے بعد رام بابو سکسینہ کی انگریزی تالیف (History of urdu Literature) اور عسکری کے قابلِ قدر ترجمہ مع تصحیح و اضافہ یعنی تاریخ ادب اُردو کا نمبر ہے اور انہی پر یہ فہرست قریب قریب ختم ہوجاتی ہے۔

یہ سب صحیح! مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب بزرگوں نے اردو ادب کو محض شعر ہی تک محدود کیوں تصور فرما لیا تھا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ان کتابوں کے فاضل مصنفوں کو صرف شعر ہی سے "دلچسپی" تھی' دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے اور بعض وقت دیا بھی جاتا ہے کہ اُردو ادب میں شعر کو اکثریت (اور لہٰذا فوقیت) حاصل۔ پہلے جواب کو تو ظاہر ہے کہ سوا تسلیم کرنے کے اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ مگر دوسرا جواب ہرگز پوری طرح صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اردو کے کلاسیکی دور میں بھی نثر کی کمی نہیں ہے۔ جیسا کہ اب حال کی تحقیقات اور تفتیش سے ثابت ہورہا ہے۔ بہت اچھا ہوا کہ "دکن میں اُردو" "پنجاب میں اردو" اور "بہار میں اردو" کی (خالص ہندوستانی ذہنیت کی) بحث نے ہمیں قدیم (یا کلاسیکی کہئے) اُردو نثر سے بھی آشنا کردیا۔ مگر تماشا یہ ہے کہ اس بحث کے مردانِ میدان نے بھی زیادہ شعر ہی سے سروکار رکھا اور وہ غالباً اس بنا پر کہ اہلِ اُردو کا عقیدہ تھا ـــ اور اب بھی اس کے حامیوں کی تعداد قابلِ لحاظ شمار تک موجود ہے ـــــ کہ "زبان اور محاورہ تو وہی ہے جو شعر میں بندھ سکے"۔ یہ عقیدہ ہی بذات خود ایک عجیب وغریب چیز ہے مگر اس بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔

پھر بھی غنیمت ہے کہ ارباب فورٹ ولیم' ارباب نثر اُردو' نئے ادبی رجحانات' اُردو کا پہلا ناول نگار وغیرہ قسم کی تالیفوں نے نثر کو بھی اس قابل سمجھا کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ اس سلسلہ میں رسالہ ہائے اُردو' الناظر' نگار' ہمایوں وغیرہ کے ان مضامین اور مقالات کا ذکر بھی ضروری ہے جو اُن کے "خاص نمبروں" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقالات میں بھی زیادہ تر شعروشاعری کا تذکرہ زیادہ رہا ہے۔ اور ہوتا ہے اور نثر ونثار نادرات ہی سے ہیں۔ جب کبھی اردو ادب کی قرار واقعی طور پر ایک تاریخ لکھی جائے گی تو اس وقت کا مصنف اور اہلِ رائے ان سب امور پر ضرور حیرت اور تاسف کے ساتھ گفتگو کرے گا! اور اس وقت بھی ہمیں اس حیرت اور تاسف کا اظہار کرتے ہوئے اربابِ ذوق ورائے کی کو اس اہم ضرورت کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اُردو ادب کی تاریخ' صحیح معنی میں ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے اور یہ کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ کام صحیح اسلوب پر کیا جائے۔

صورت حال یہ ہے کہ اب تک اس اہم موضوع پر جو کچھ بھی لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر شعروسخن کے دائرے میں محدود ہے یا یہ کہ ہر مصنف جو اس موضوع پر کچھ لکھتا ہے' وہ کتابوں اور ان کے مصنفوں کی فہرست پر اکتفا کرتا ہے اور اگر کبھی رائے زنی بھی کرتا ہے تو زیادہ تر وہ اس کے شخصی اور ذاتی رجحانات کا پرتو ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مصنف یا اس کی تصنیف اسی وقت لائق توجہ اور قابلِ قدر ہوتی ہے۔ کہ جب اسے اس کے مجموعی ماحول میں رکھ کر اس تخلیقی ادبیات کے اندازہ سے جانچا جائے' جس کا پیدا کرنا تاریخ انسانی کا ایک جزوی منصب ہے لہٰذا اُردو ادب کی تاریخ کی کتاب کو سب سے پہلے مجموعی طور پر اردو ادب سے سروکار ہونا چاہیئے اور اس کا مقصد صرف یہ نہ ہونا چاہیئے کہ وہ نامور مصنفوں کے کارناموں کو ایک صحیح اور ضابطے کے مطابق بیان کردے' بلکہ اس کا بھی

لحاظ رکھنا چاہیئے کہ اس میں اُردو بولنے والی قوم کے حالات اور رجحانات کا بھی قرار واقعی اظہار ہو جائے۔

ایک مورخ ادب کا کام یہ ہے کہ مختلف ادوار کی ادبی تحریکات کا پتہ لگائے اور تاریخ انسانی کی ساخت جو شخصی اور غیر شخصی افکار اور رجحانات کے باہمی تاثرات کارفرما رہتے ہیں ان کی توضیح اور نشان دہی کرے۔ ایسے مورخ کو محض ان امور اور واقعات سے سروکار نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ ان امور کی کیفیت اور اسباب سے بھی بحث کرنا چاہیئے، اور اس توضیح اور تشریح کے سلسلہ میں اہل زبان اور ادب کے حالات زندگی ان کے تمدن اور ثقافت اور اس کے مختلف ادوار کی قوتوں کا بھی جائزہ لینا چاہیئے۔ جب تک وہ ایسا نہ کرے گا اور ان سب امور کا مطالعہ نہ کرے گا وہ ان نتائج تک پہونچنے میں کامیاب نہ ہوگا، جن کو تاریخ ادب میں مصنفوں اور تصنیفوں کا ذوق، رجحان، قدر وغیرہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً اردو ادب کے مورخ کو اپنے مصنفین کے ذاتی رجحانات اور تاثرات کو بیان کر کے یہ واضح کرنا چاہیئے کہ اردو ادب اور ہندوستانی زندگی اور ملکی ماحول کے مابین وہ کیا تعلقات تھے اور کیا آویزشیں تھیں جن کے سبب سے اردو ادب کے مختلف اور متفرق ادوار میں وہ خاص خاص رنگ پیدا ہو گئے تھے جن کے حامل اور نمائندہ وہ سب مصنف تھے۔

یاد رہے کہ "ادب" یوں نہیں پیدا ہوا کرتا کہ گویا چند اشخاص ——— مرد و زن ـــ زماں اور مکاں کی حدود سے باہر ہو کر کسی 'خلا' میں بیٹھے ہوئے کچھ کہہ رہے ہیں۔ ادب الفاظ کے ذریعہ ان امور کو بیان کرتا ہے جو مصنف کے وقت میں زندگی کے لئے گہرے معنی اور اہمیت رکھتے تھے۔ ادب کے "مزاج" میں وہ تخلیقی قوت ہوتی ہے جو حیات انسانی کی ان تجربات کی طرف راہنمائی کرتی ہے جو اس ادب کی پیدایش کے وقت کے روزمرہ تجربات سے اور حالات سے ماوراء ہوتے ہیں۔ یوں تاریخ ادب کا ایک ضروری منصب یہ ہے کہ وہ اپنے مصنفوں کے بارے میں اس امر کی توضیح کرے کہ اس نے انسان کی تہذیب اور ثقافت میں اپنے خیال اور رائے کے اظہار سے کیا قابلِ قدر اضافہ کیا ہے اور اس کی اہمیت کیا ہے۔ جب ہم تمام مصنفوں اور ان کی تصنیفوں کی صحیح قدر وقیمت اور اہمیت سے واقف ہو جائیں گے تو ہمیں ایک طرف تو اس ادب کے کردگاروں کی شخصیتوں کا پتہ چل جائے گا اور دوسری طرف ان کے دَور کے اہل ملک کی ذہنیت اور روح ملی کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے گا۔

اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اگر اس طور پر اردو ادب کی تاریخ لکھی جائے تو اس کی ایک شخصی قیمت اور ایک قومی اور ملکی اہمیت ہوگی اور اس سے ہمیں اپنے اہلِ ملک کی ذہنی قابلیت اور کمالات کا اور ان تمام قوتوں کا حال معلوم ہوگا جو ان مصنفوں کے زمانوں میں برسرکار تھیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر معمولی ملکی تاریخ ایک قوم کی سوانح عمری ہے تو اس کے ادب کی تاریخ گویا اس کا خود نوشت تذکرۂ حیات ہے۔

اس قسم کی تاریخ ادب ہی صحیح معنوں میں تاریخ ادب ہوگی، اور اردو زبان و ادب کی ایسی تاریخ ہمارے ملک اور قوم کو بیرونِ ہند کی اقوام اور اہلِ ادب سے روشناس کر کے ان پر یہ واضح کرے گی کہ اردو کے اہل ادب کا دنیا کی تہذیب و ثقافت کی ساخت اور اس کے نشو و نما میں کیا اور کس قدر اہم حصہ ہے!!

ایم حفیظ سید

رنگ کی اہمیت

لونی مسرت اور رنگ کوری

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ایک نابینا کی دنیا ساری لونی مسرتوں سے بے نیاز اور بے حد تاریک ہوتی ہے۔ دوامی تاریکی اس کی پرمسرت زندگی کو اس قدر بے کیف بنا دیتی ہے کہ اس عالم سیاہ تاب میں اس غریب کا دم گھٹنے لگتا ہے اور اسی وجہ سے اس کی زندگی انتہائی قابل رحم بن جاتی ہے۔ اس کی مجبوری اور قنوطیت پسند طبیعت پر ہر شخص کو رحم آتا ہے۔ اشیاء کی گوناگونی، رنگوں کی بوقلمونی، نور و ظلمت کی کرشمہ سازیاں، لونی تضاد اور تنوع، ہم آہنگیوں کی مسرت آفریں کیفیتوں کا اس بے چارے کو تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ واقعی چشم بینا، قدرت کا ایک بیش بہا عطیہ ہے جس سے انسان کو حقیقی لطف زندگی حاصل ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ انسانوں کی ایک اور بھی قسم ہوتی ہے، جو چشم بینا تو رکھتے ہیں، لیکن لونی بصارت سے محروم ہوتے ہیں۔ انہیں رنگوندھے (رنگ اندھے) یا رنگ کور کہتے ہیں۔ یہ بے چارے نہ تو مختلف رنگوں میں تمیز کر سکتے ہیں اور نہ ان کی بوقلمونی سے خاطر خواہ حظ اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی لونی دنیا بہت تنگ ہوتی ہے۔ اور اسی نسبت سے ان کی خوشی اور لطف اندوزی کا دائرہ بھی بہت محدود ہوتا ہے۔ جزوی بصارت کی وجہ سے دنیا کا ایک بڑا حصہ انہیں لطف و مسرت سے خالی نظر آتا ہے۔ جب یہ قابل رحم ہستیاں فن مصوری کی طرف رجوع ہوتی ہیں، تو انھیں بڑی مایوسی کی صورت دیکھنی پڑتی ہے۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایسی لونی نزاکتوں کو جو تصویری حسن کا جزو لاینفک ہوتی ہیں یہ افراد نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ رنگ آمیزی کے ذریعہ انہیں پیدا کر سکتے ہیں۔

حقیقت میں قدرت کی یہ بڑی مہربانی ہے کہ اس نے انسان کو دنیا میں بھیجنے سے قبل اسے رنگ برنگ کے پھول پتوں، دھنک، شفق اور پرندوں سے آراستہ کیا، تاکہ اس رنگین ماحول میں انسان کی زندگی دلچسپی کے ساتھ بسر ہو سکے۔ ذرا خیال کیجئے کہ دنیا میں اگر رنگوں کا وجود نہ ہوتا تو اس کی کیا ہیئت بن جاتی؟ چنانچہ جو لوگ قطبین کے حالات دریافت کرنے کی مہم پر روانہ ہوئے تھے، ان کے سفرناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدائی مہم میں وہاں کے برف پوش اور بے رنگ عالم نے ان کی بصارتوں میں نقص پیدا کر دیا اور بہت جلد یہ لوگ اس مقام سے تنگ آ گئے۔ اس لئے بعد میں جو لوگ وہاں جانے لگے، اپنے ساتھ رنگین عینکیں رکھنے لگے، تاکہ ان کے استعمال سے بے رنگ عالم، رنگین نظر آئے۔ اس طرح انھوں نے اپنی بصارت کو خراب ہونے سے بچا لیا۔

جانوروں کی دنیا

ہر نئی بات انسان میں ایک نئے خیال کی تحریک کرتی ہے۔ حیوانی تحقیقات کے سلسلے میں منجملہ اور امور کے ان مہموں کے واقعات نے بھی، ماہر حیوانیات کی توجہ کو جانوروں پر تجربے کرنے کی طرف مائل کر دیا۔ انھوں نے بھی لونی نقطۂ نظر سے، تجربات کے ذریعہ عالم حیوانی کی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی اور معلوم کیا کہ:—

(۱) شہد کی مکھی — بالا بنفشی (ULTRA VIOLET) رنگ دیکھ سکتی ہے، بالا بنفشی انسان کے لئے محض تاریکی ہے۔

(۲) مرغ - سرخ، زرد، سبز اور شوخ نیلا رنگ دیکھ سکتا ہے، لیکن بنفشی رنگ نہیں دیکھ سکتا۔
(۳) کبوتر - سرخ اور زرد رنگ دیکھ سکتا ہے، نیلا اور سبز رنگ نہیں دیکھ سکتا۔
(۴) الو اور نیل گنٹھ ——— صرف نیلا ہی دیکھ سکتے ہیں۔
(۵) بندر اور لنگور ——— رنگ اندھے نہیں ہوتے۔
(۶) کتا، بلی، بیل، بھیڑیا، شیر، ببر - یہ سب رنگ اندھے ہوتے ہیں۔ انہیں سب چیزیں خاکستری ہی دکھائی دیتی ہیں۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ درندے رات کی تاریکی میں شکار تلاش کرتے ہیں۔ کوئی نقطۂ نظر سے ان کی دنیا بڑی غیر دلچسپ ہے۔

اسی طرح یہ بھی دریافت ہوا کہ جن جانوروں کے رنگ دھندلے، بھورے، بادامی، زرد، سیاہ یا سفید ہوتے ہیں، بالعموم وہ رنگ اندھے ہوتے ہیں اور رنگ بیں جانوروں، پرندوں اور مچھلیوں کے رنگ شوخ اور چمکدار ہوتے ہیں۔

عمر اور جنس کا تعلق رنگ سے

رنگ کے انتخاب اور پسندیدگی میں عمر اور جنس کا خاص تعلق نظر آتا ہے۔ چنانچہ بالعموم دیکھا جاتا ہے کہ بچے فطرتاً شوخ رنگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ زرد اور سرخ رنگ پر تو بری طرح مائل ہوتے ہیں۔ مرد کو اپنی ابتدائی عمر میں شوخ رنگوں کی طرف مائل رہتے ہیں، لیکن جوں جوں ان کی عمر بڑھتی جاتی ہے، رفتہ رفتہ وہ سنجیدہ اور ثقہ رنگ پسند کرنے لگتے ہیں۔ عورتوں کو چمکدار رنگ بہت مرغوب ہوتے ہیں۔ چونکہ عورتوں کو فطرتاً رنگ کے ساتھ ایک خاص لگاؤ ہوتا ہے، اس لئے ان کا کوئی ادراک مردوں کے مقابلے میں زیادہ واضح اور نمایاں رہتا ہے۔ مرد کی طبیعت سنجیدہ ہو کر تاریکی کی طرف مائل ہوتی ہے، لیکن نسوانی طبع روشنی کی طرف آتی ہے۔ مرد جن تاریک یا سیاہی مائل رنگوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے، نسوانیت اسی کو جاذب نظر شوخ و چمکدار رنگوں میں نمایاں کر دکھاتی ہے۔ باقاعدہ کوئی تربیت کے باوجود، جنسی مذاق کا یہ فرق، رنگ آمیزی و رنگ آرائی میں علانیہ نظر آتا ہے۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ عورتوں کو سرخ اور مردوں کو نیلا رنگ زیادہ مرغوب ہوتا ہے۔

رنگ اور علاج

رنگ محض باصرہ کو محظوظ کرنے کے واسطے ہی نہیں استعمال ہوتے، اور نہ قدرت نے انہیں اسی واحد مقصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ بلکہ تجربوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ رنگ سے اکثر امراض کا خاطر خواہ علاج بھی کیا جا سکتا ہے۔ کوئی معالجین نے اپنا نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان رنگوں کا مجموعہ ہے۔ ناس کے جسم میں زرد، سرخ، نیلا، سفید، خاکستری وغیرہ کئی رنگ پائے جاتے ہیں اور جس وقت ان رنگوں کے قدرتی توازن میں فرق پڑ جاتا ہے تو اس سے مختلف امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ خون اور گوشت کا رنگ سرخ ہوتا ہے۔ شرائن میں لالی اور وریدوں میں نیلا پن دکھائی دیتا ہے، دماغ اور اعصاب میں سفید اور خاکستری رنگ نظر آتا ہے۔ بول و براز کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ زخموں میں زرد رطوبت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالوں کے رنگ سرخ، بھورے، نقرئی اور سیاہ ہوتے ہیں۔ آنکھیں سیاہ،

بھوری اور نیلی ہوتی ہیں۔ زیر جلد لونی خلیے پائے جاتے ہیں، جن کا کام رنگ پیدا کرنا ہے۔ رنگ ہی کی مدد سے امراض کی تشخیص کی جاتی ہے۔ چنانچہ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ خون کی کمی، یرقان اور زرد بخار میں مریض بالکل زرد پڑجاتا ہے اور ہر چیز اسے زرد ہی دکھائی دیتی ہے۔ چہرے اور جسم کی سرخی سے خون کی زیادتی ظاہر ہوتی ہے، جسے صحت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ رخساروں پر سرخی کی جھلک صحت کی علامت ہے۔ کسی عضو پر سخت چوٹ آجائے تو اتنا حصہ کبودی رنگت اختیار کرلیتا ہے۔ بہرحال یہ سب رنگ جسم انسانی سے باہر تو ہوتے نہیں، اندر ہی پائے جاتے ہیں۔ ہم جس قدر غور سے مشاہدہ کرتے ہیں، ہمیں مختلف امراض میں بعض رنگوں کی کمی اور بعض کی زیادتی ضرور محسوس ہوتی ہے۔

انیسویں صدی کے وسط میں، پہلی مرتبہ امریکہ میں رنگوں سے علاج شروع کیا گیا، جس سے بڑے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ ڈاکٹر ایبٹ جو اس علاج کے موجد ہیں، کہتے ہیں کہ رنگوں سے نظام اعصاب ضرور متاثر ہوتا ہے۔ نیلا رنگ دماغی امراض کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ ارغوانی، بے خوابی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ زرد رنگ، بخار کے لئے مضر ہے۔ سرخ رنگ زبردست محرک ہے۔ مختلف امراض میں ان کے مناسب حال رنگ مریضوں کی طبیعت میں یقیناً آرام و سکون پیدا کرتے ہیں۔ جن رنگوں کے دیکھنے سے دل میں افسردگی یا غفلت کے آثار پیدا ہوں، بالعموم انہی رنگوں سے مریض کو آرام و سکون بھی نصیب ہوتا ہے اور جن رنگوں سے قلبی کیفیت میں تغیر پیدا ہوتا ہے، اسی لحاظ سے وہ مریض کے حق میں صحت بخش بھی ثابت ہوتے ہیں۔ خوشی و اشتیاق کا باعث جو رنگ ہوتے ہیں وہ اکثر محرک قلب بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرانس میں جب ڈاکٹر پونزا نے علاج شروع کیا، تو اسے معلوم ہوا کہ رنج و غم میں مبتلا مریضوں کو سرخ رنگ سے قوی فائدہ ہوا۔ پاگلوں کے علاج میں ارغوانی رنگ بہت کامیاب رہا اور عصبی امراض میں سبز رنگ کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔

رنگوں کے اثرات کی نسبت تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ نیلا رنگ سب رنگوں کا سردار ہے۔ اس سے دماغ اور نظام اعصاب سکون پاتا ہے۔ عورتوں کی نسبت مردوں پر رنگوں کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔ جانور بالعموم گلناری، زعفرانی اور گیاہی (سبز) رنگ سے متاثر ہوتے ہیں۔ سانپ زرد رنگ سے مسحور ہوجاتا ہے۔ ضدی اور روتے بچے ہلکے نیلے رنگ اور زردی مائل سبز رنگ سے سکون پاتے ہیں۔ تندرست آدمیوں پر پیازی رنگ بڑی تیزی سے اثر کرتا ہے۔

۵: رنگ کی سماجی اور مذہبی حیثیت

زمانۂ قدیم سے اقوام عالم میں مختلف اغراض و مقاصد کے لئے رنگ استعمال کیا جاتا رہا۔ مصری نعشوں کو حنوط کرتے تو اس میں رنگ ملاتے تھے۔ افریقی باشندے طوطمی (TOTEM) یعنی اپنے قبائلی یا نسلی رنگ کو جسم پر ملا کرتے۔ مذہبی رسوم کے موقع پر بھی رنگ ملتے یا سفیدے سے جسم پر زیبرا کی وضع کے پٹے کھینچتے تھے۔ ایشیا کے جزائر اور آسٹریلیا کی قدیم قوموں میں بھی، جسم پر رنگ ملنے کی کافی شہادتیں ملتی ہیں۔ قدیم وحشی اقوام جسم پر رنگ کی تہ چڑھا کر اس کو بہ منزلۂ لباس سمجھتی ہیں۔ بالعموم رنگ کو جسمانی زینت و آرائش خیال کیا جاتا تھا۔ جب جسم سے رنگ چھوٹ جاتا، انھیں بڑا افسوس ہوتا۔ بار بار رنگ لگانے سے تنگ آکر

انہوں نے رنگ کو جسم پر مستقل کرنے کی تدبیر سوچی' اور گودنے (TATOOING) کا فن ایجاد کر لیا۔ گودنا انسان کو اس قدر مرغوب ہے کہ تہذیب کی انتہائی منزل پر پہونچنے کے بعد بھی اب تک وہ اس قدیم رسم کا پابند ہے۔ نسوانی سنگھار بھی اسی زمانے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

ہندوستان میں آج بھی جسم پر رنگ ملنے کی رسم جاری ہے۔ چنانچہ عورتیں زرد رنگ (ہلدی) ہاتھ' پیر اور چہرے پر ملتی ہیں۔ ہاتھوں اور پیروں میں مہندی لگاتی ہیں۔ ہونٹوں پر مستی کی دھڑی جماتی' آنکھوں میں سرمہ اور کاجل لگاتی ہیں۔ ہونٹوں اور زبان کی سرخی کے لئے پان استعمال کیا جاتا ہے۔ پان کی تواضع اس ملک کی خاص اور قدیم رسم ہے۔ نسوانی مانگ میں آرائش اور گلال بھرا جاتا ہے' نیز حسن کو دوبالا کرنے کے لئے پیشانی پر سرخ قشقہ لگاتے ہیں۔ سرخ رنگ کو سہاگ کی علامت سمجھا جاتا ہے اور اسے ہر رنگ پر ترجیح دی جاتی ہے۔ شادی بیاہ کی رسوم میں زرد' نارنجی اور سرخ رنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سہاگن بے رنگ کپڑا نہیں پہن سکتی۔ سفید لباس یتیمی اور بیوگی کی علامت ہے۔ دلہن کا سامان جہیز رنگوایا جاتا ہے اور شادی کی انتہائی مسرت کا اظہار' رنگ کھیل کر کیا جاتا ہے۔

معبدوں میں مورتیوں کو سیندور اور تیل سے رنگتے ہیں۔ گرو' سنیاسی' بھبوت رمائے پھرتے ہیں۔ گیروا اور بوگنیا رنگ' باخدا لوگوں کا بانا تصور ہوتا ہے۔ کرشن اوتار کی تصویر کے لئے نیلا رنگ مختص کر دیا گیا ہے۔ گھروں کی رونق بڑھانے کے لئے در و دیوار کو گیرو سے رنگتے اور دروازے کے سامنے لال مٹی سے چھڑکا دے کر اس پر سفید چونے سے نقش و نگار کرتے ہیں۔

دسہرے کے سوانگ اور بھاگوتوں کے کھیلوں میں سیاہی' نیلا رنگ اور گیرو جسم پر ملتے ہیں۔ اسی طرح محرم کے سوانگ میں جسم پر شیر کا رنگ چڑھایا جاتا ہے۔ دکن میں "بدکما" کا تہوار مناتے ہوئے رنگ برنگ کے پھول پتلی تھالیوں میں رکھ کر' عورتیں ان کے اطراف گاتی ہوئی' گھومتی اور رقص کرتی ہیں۔ دیوالی میں مختلف رنگ کے چراغ جلاتے اور جانوروں کو رنگتے ہیں۔ اسی تہوار میں مٹی کے برتنوں کو بھی قسم قسم کے رنگوں سے رنگا جاتا ہے۔ ہولی کی تقریب میں مٹھائیوں میں تک رنگ کی آمیزش ہوتی ہے۔ لوگ دل کھول کر رنگ کھیلتے ہیں' جس میں بعض اوقات بڑی رنگینیں اور شاعرانہ جدت طرازیاں پیدا کی جاتی ہیں۔ میر صاحب ہولی کی نوتی مدہوشی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں ؎

پھر لیا لب ہے آب گیرا رنگ
اور اڑے ہے گلال کس کس ڈھنگ
قمقمے بھر گلال جو مارے
مہوشاں' لالہ رخ ہوئے سارے
خوان بھر بھر عبیر لاتے ہیں!
گل کی پتی ملا اڑاتے ہیں!!

نظیر اکبر آبادی کہتے ہیں ؎

ہر جاگہ تھال گلالوں کے' خوش رنگت کی گل کاری ہے
ہے ڈھیر عبیروں کے لاگے' سو عشرت کی تیاری ہے
ہیں راگ بہاریں دکھلاتے' اور رنگ بھری پچکاری ہے
منہ سرخی سے گلنار ہوئے' تن کیسر کی سی کیاری ہے
یہ رنگ دکھائے ہولی نے

پوشاکیں چھوا کی رنگوں کی اور ہر دم رنگ فشانی ہے
ہر وقت خوشی کا جھمکیں ہیں پچکاری کی رخشانی ہے

سیاہ رنگ رنج و غم کی علامت ہے۔ ماہ محرم میں سیاہ اور سبز رنگ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔
مغرب میں سرخ رنگ خطرہ اور جنگ، سبز رنگ امن چین، اور سفید صلح و آشتی کی علامت مقرر کی گئی ہے۔

۶ رنگ اور ہندوستانی ادب

ہندوستانی ادب میں کافی رنگینی و رنگ آرائی موجود ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس کی طرف کوئی نقطۂ نظر سے شاذ ہی توجہ کی گئی ہو۔ نثر نگاروں میں محمد حسین آزاد، شرر اور سرشار اپنی تصویروں میں رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ شعرا کا کہنا ہی کیا ہے۔ ان کی دلکش رنگ آرائی کی تو کوئی حد نہیں۔ نظم و نثر کی تفصیل بجائے خود ایک کتاب کی محتاج ہے۔ اس لئے فی الحال صرف شعرا کی رنگ نویسی سے چند چیدہ چیدہ مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ گو شعرا رنگ بندی میں کہیں کہیں ضرورت شعری کے مدنظر ایک آدھ رنگ ذرا "رسکتا ہوا" بھی استعمال کر جاتے ہیں۔ لیکن اس سے تصویری حسن میں کوئی عیب پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض صورتوں میں کچھ بڑھ جاتا ہے۔ بسا اوقات جس کو ہم ناموزوں رنگ خیال کرتے ہیں، وہ شاعر کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان ہمیشہ شوخ رنگوں پر مائل رہا ہے اور رہیگا بھی۔ ہندوستان کا جغرافیائی محل وقوع ہی ایسا ہے کہ یہاں رنگ اپنی تمام شوخی اور کمال رعنائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ سورج کی تابناکی اور فضائے محیط کی نورباری نے یہاں کی فضا کو ساری رطوبتوں اور کثافتوں سے پاک کر رکھا ہے اور ایسا شفاف ماحول پیدا کر دیا ہے کہ حد دو افق کے ساتھ احاطۂ نظر بھی میلوں تک وسیع ہو جاتا ہے۔ ایسی فضا میں اشیا کے طبعی رنگ اپنی پوری تابناکی کے ساتھ بہار دکھاتے ہیں۔ دور سے بھی رنگ دیکھنے میں تکلف نہیں ہوتا، اور نہ ان کی شناخت میں خطا ممکن ہے۔ باصرہ پر ہر طرح بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں نور کی یہ کیفیت ہو، وہاں رنگ کے ساتھ نور و ظلمت کا تضاد اور تقابل بھی اپنا جمال، کمال کے ساتھ دکھلاتا ہے۔ بخلاف اس کے قطبین کے متصل مرطوب و شبنم ریز علاقوں میں فضا، آبی ذرات اور دیگر کثافتوں سے ہمیشہ لبریز اور مکدر رہا کرتی ہے۔ اس فضائی تکدر سے نہ صرف اشیا کی قدرتی صورت مسخ ہو جاتی ہے، بلکہ ان کے رنگوں پر بھی کثافت کا اثر پڑکر رنگوں کی درخشندگی سلب ہو جاتی ہے۔ فضائی تکدر نے سرد ممالک کی اشیا کو وہی دھندلا روپ عطا کیا ہے جو ہندوستان کی زیر آب اشیا میں دکھائی دیتا ہے۔ ممالک کا یہ لونی فرق، ہمیشہ ہر رنگ کار کے پیش نظر رہنا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فن تصویر کی طرح اس کے ادب میں بھی رنگ اپنی ساری شوخیاں اور کمال رعنائی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ چنانچہ بے نظیر شاہ صاحب، فایق اللون ہم آہنگی میں "بسنتی رنگ کی بہار" اس طرح دکھاتے ہیں، جس میں انھوں نے طیفی رنگوں کے زرد سے لے کر سبز تک مختلف مدارج رنگ کو بڑی عمدگی سے باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

چلے ساقیا دور، کم ہوں حواس — کہ جوبن دکھائے بسنتی لباس
اٹھا جام زرین، پلا بے درنگ — کہ عاشق کے حصے میں ہے زرد رنگ

ڈھلے زعفرانی شرابِ نیاز — کہ مستی ہیں کھولوں میں رازِ نیاز
وہ مور آئے آموں پہ ہے کیا سماں — چمکتی ہیں پکھراج کی کلغیاں
دکھاتے ہیں دو چار پھول اب ببول — ہیں، پر دور تک پھولے سرسوں پھول
دیا کس نے یہ آبِ زر بے قیاس — کہ ہر کھیت کا ہے بسنتی لباس
یہ مستی دکھائی ہے ہر پھول نے — کہ آنکھوں میں سرسوں لگی پھولنے
وہ پھولا کسم، غیرتِ زعفراں — بنا رشکِ کشمیر، ہندوستاں
سنہری امربیل کی، نقرہ بول! — وہ پہنے ہے، اور کیل ہے، زرد پھول
وہ لیموں جو ہے کاغذی سبز تر — لٹکتے ہیں اب بن کے تعویذ زر
وہ گیندے کی شاخیں جو ہیں سرنگوں — ہیں لٹکائے کندن کے جھمکے تمام
اٹھائے ہوئے ہاتھ، سورج مکھی — دکھاتی ہے، سونے کی وہ آرسی
جو داؤدی کے زرد غنچے کھلے — کرن پھول ان کو کہاں سے ملے
لئے جام زریں، بصد آب و تاب — وہ کیا زرد زرد آج پھولا گلاب
وہ پھولوں پہ ہر سمت چھایا بسنت — وہ بلبل بھی گاتے ہیں، کیا کیا بسنت
درختوں سے وہ، اتر آتی ہے دھوپ — زمیں پر بھی سونا چڑھاتی ہے دھوپ
پڑا زرد کرنوں کا عکس آب میں — ہوا زرد پانی جو تالاب میں
بسنتی ہے یہ جامۂ ہر بشر — کہ ہلدی بھی شرماتی ہے دیکھ کر
ہے معشوق یا صاحبِ درد ہے — جسے دیکھئے زرد ہی زرد ہے
نہ کیوں اتنی زردی پہ ہو عقل دنگ — یہ چھایا ہے اڑ اڑ کے عاشق کا رنگ

شوق قدوائی "جنگل" کا خوب منظر کھینچتے ہیں۔ سرخ اور نیلے رنگ کے ساتھ سفید کا، اور تعدیلی (یعنی خاکستری) رنگوں کے ساتھ سرخ کا تقابل بڑی عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ سیاہ اور سبز پس منظر زرد گل کھلا کر زردی کو خوب اجاگر کیا ہے ؎

کیا بھاتی ہے، نظارے کو بہولوں کی بہار — پتیاں سر سبز، اور ان میں زرد پھولوں کی بہار
ابلقہ، کچھ پر سیاہ اس کے ہیں، اور کچھ پر سپید — لال، جن کے سرخ پر ہیں، اور خال النابر سپید
قمریوں کا رنگ خاکی، طوق کالے، پاؤں لال! — پھرتی ہیں ٹانگوں کو چکنائے، پویاں خوش جمال
جا بجا سبزہ زمیں پر، جا بجا خالی زمین! — دھوپ سے زرد اور سائے سے کہیں کالی زمیں
جا بجا خوش رنگ بوٹے، جا بجا بیلوں کے جال — پھول جن میں کاسنی، اودے، گلابی، زرد، لال

پوری نظم سے تنوع اور بوقلمونی ہویدا ہے۔ ہر شعر ایک نئی تصویر اور نئی ہم آہنگی کا حامل ہے۔ خصوصاً دوسرے اور تیسرے شعر کی تقابلی ہم آہنگی بڑی نفیس و دلکش ہے۔

حضرت انیس نے بھی آسمان کو کبھی نیلا اور کبھی سبزی مائل نیلگوں باندھا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح   گلزار شب، خزاں ہوا، آئی بہار صبح
تھا چرخ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا   کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

آمد وہ آفتاب کی "وہ صبح کا سماں   تھا جس کی ضو سے، وجد میں طاؤس آسماں

پہلے اشعار میں سرخ اور نیلے کا، اور دوسرے شعر میں سرخ اور سبز نیلے رنگ کا خوش آہنگ میل دیا ہے۔
میر صاحب بھی تضادی رنگ کی شوخی پر بڑے مائل نظر آتے ہیں ؎

شفق، سرخ رنگ لائی ہے   لالہ گوں ہے، سپہر زنگاری
بدلیاں چھا رہی ہیں، گردوں پر   زرد، اودی، سنہری، زنگاری

دیکھا آپ نے آسماں کیسے کیسے رنگ بدلتا ہے۔ اسی کیفیت کے مدنظر، ہندوستانی زمین و آسمان کے تنوع کو آتش نے کس جامعیت کے ساتھ ایک ہی شعر میں قلمبند کیا ہے ؎

زمینِ چمن، گل کھلاتی ہے کیا کیا   بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

اور انہی رنگوں میں مولانا حسرت کو ان کی تدریجی کیفیات بھی نظر آتی ہیں، جن سے محظوظ ہو کر کہتے ہیں ؎

گردوں پہ ہیں رنگ کیسے کیسے   پھیکے اور شوخ، بھاری، ہلکے

آسمان سے جب زمین پر اتر آتے ہیں، تو رنگین پس منظر میں تعدیلی (مائل بہ فاکستری) اور عدیم اللون (سیاہ، سفید) رنگوں کے ابھار سے لطف اٹھاتے ہیں ؎

چوپایوں کے صاف ستھرے گلے   رمنوں میں ادھر ادھر ہیں پھرتے
سبزے میں، سفید اور کالے   بھاتے ہیں نگاہ کو یہ کیسے

حسرت کی لونی تدریجی کے ساتھ تدریجی تقابل سے مرزا ہادی رسوا متاثر نظر آتے ہیں۔ گلاب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

سرخ کوئی، کوئی گلابی ہے   ہلکا ہلکا سا، کوئی آبی ہے
ہے کسی گل کا زرد، زرد لباس   شربتی جامہ ہے، کسی کے پاس

غور کیجئے، رنگ کے ہلکے ہلکے انعکاسات کو کس لطیف پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس کی ضد میں ایک دوسرے شاعر نے شدید تقابل کا اعتراف کرتے ہوئے "اڑنے والے پھولوں" کی تعریف یوں کی ہے ؎

کوئی سبز اور کوئی گلابی ہے   آتشی کوئی، کوئی آبی ہے
کوئی نیلا ہے، اور کوئی پیلا   جس کو دیکھو غضب کا رنگیلا

اس سے ہمیں بحث نہیں کہ پھول سبز بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ ممکن ہے شاعر نے دیکھا ہو، یا کلی مراد لی ہو۔ یا ضرورت شعری کے تحت وہ مجبور ہوا ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سرخ اور سبز، نیلا اور پیلا، دونوں میل انتہائی شدید ہوتے ہیں۔ شاعر غضب کا لفظ استعمال کرکے، خود ان کی شدت کا معترف ہے۔ اصولی حیثیت سے بھی رنگوں میں اس سے زیادہ شدت پیدا کرنا ممکن نہیں۔ لیکن سفیر اس شدت سے گھبرا جاتے ہیں،

اور سرد رنگوں کی طرف پلٹ کر کہتے ہیں ؎
کہیں پھول ہیں کنول کے کہیں نیلگوں ہے پانی
مرزا غالب بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے فرماتے ہیں ؎
سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی! بن گیا روئے آب پر کائی
سفیر اور غالب نے نہایت مسکن رنگ آمیزی سے کام لیا ہے۔ متاثلہ ہم آہنگی کی نہایت نرم اور سکون پرور مثال پیش کی ہے۔ تقابل کے متعلق غالب نے ایک نفیس مثال دی ہے، فرماتے ہیں ؎
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا
لطیف اور کثیف رنگوں کے تقابل سے تصویری حسن میں بہت اضافہ ہوجاتا ہے ان سرد اور پرسکون مناظر میں فقیر صاحب کی آنکھیں نور کی چمک (HIGH LIGHT) کو تلاش کرتی اور اس سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎
پانی میں کیسی دولت بہا دی قدرت نے سیروں چاندی گلا دی
بے نظیر، شوق اور سرور شاعرانہ نظر کے ساتھ مصورانہ نظر بھی رکھتے ہیں۔ انہیں دھوپ کی کرنوں میں زردی دکھائی دیتی ہے اور اس شئے میں بھی جس پر آفتاب پرتو فگن ہوتا ہے ؎
درختوں سے وہ اتر آتی ہے دھوپ زمیں پر بھی سونا چڑھاتی ہے دھوپ (بے نظیر)
سرور صاحب 'مرغابی' سے مخاطب ہوکر یوں کہتے ہیں ؎
ڈھل گیا دن، اور شبنم ہے زمیں پر قطرہ ریز گوشۂ مغرب میں گلگوں ہے شفق سے آسماں
پڑ رہی ہیں، دور تک، سورج کی کرنیں، زرد زرد جا رہی ہے تو اکیلی شام کو اڑتی ہوئی!
بے نظیر اور سرور، زوالِ آفتاب کے وقت ہی اس کی شعاعوں میں زردی کو محسوس کرتے ہیں، لیکن شوق قدوائی کی نظر بہت تیز ہے۔ انہیں ہر وقت دھوپ میں زردی نظر آتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎
جا بجا سبزہ زمیں پر، جا بجا خالی زمیں! دھوپ سے زرد، اور سائے سے کہیں کالی زمیں
لطف یہ کہ پڑتی دھوپ میں نور و ظلمت کا کتنا صحیح تضاد دکھلایا ہے۔ جتنی تیز دھوپ پڑے گی سائے بھی اتنے ہی زیادہ سیاہ روپ اختیار کریں گے۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ضیاء بار ملک کی ......
...... فضاء میں، عموماً یہی کیفیت دیکھنے میں آتی ہے۔
بھورے اور مٹیالے رنگ عام طور پر لطیفی رنگوں کے مقابلے میں دھیمے یا ماند ہوتے ہیں۔ لیکن اس کیفیت کے باوجود ہندوستانی بھورے رنگ مغربی سرد ممالک کے شوخ رنگوں کی ہمسری کے مدعی نظر آتے ہیں۔ شاعری نے ان رنگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ چنانچہ "بیا" کی تعریف کرتے ہوئے باسط صاحب یوں گویا ہوتے ہیں ؎
رہتا ہے بچپن میں بھورا رنگ کچھ سیاہی لئے ایک برس کے بعد ہوتی ہے، رنگ آمیزیاں
سر کے اوپر کلغی اور نیچے پیارا زرد رنگ کلک قدرت کی عیاں ہوجاتی ہے گل کاریاں
اس عنوان کے تحت جتنی شاعرانہ ہم آہنگیاں بیان کی گئی ہیں، وہ سب قدرت ہی سے ماخوذ ہیں۔

اس سے ہماری شاعری کی قدرت پرستی اور حقیقت نگاری عیاں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قدرت کے مقابلے میں انسانی رنگ آمیزی ہیچ ہے۔ لیکن ہر علم وفن کے اصول قدرت ہی سے تو ماخوذ ہوتے ہیں۔ اور قدرت ہی کی رہنمائی میں اصول بنتے ہیں، جس پر انسان عمل پیرا ہوکر فائدہ اٹھاتا ہے۔ مگر مشاہدہ شرط ہے اور نوعی مشاہدے کے لئے نظر رسا کی ضرورت ہے۔ ہمارے شعرا کی نظر انتخاب کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے قدرت کی طرف رجوع ہوکر بہ نظر غائر اس کا مطالعہ کیا ہے اور اس سے صحیح اصول استنباط کرنے کی کامیاب سعی کی۔ لونی دنیا الفاظ کے تنگ دائرے میں سمانے والی چیز نہیں، لیکن پھر بھی لونی کیفیات کی حدت وشدت کو جنچے تلے الفاظ میں ظاہر کرنے میں کمال کردیا ہے۔ انہی اشعار کو دیکھ لیجئے کہ باسط صاحب نے خاص نوعیت کی حرمائی ہوئی لونی اسکیم، قدرت سے اخذ کی ہے اور بڑی خوبی سے کتھئی رنگ پر زرد کو ابھار کیا ہے۔ "پیارا" کہہ کر اس کی خیرہ کن کیفیت کو ٹھرا دیا ہے۔ اپنے الفاظ میں لونی کیفیتوں کو کس عمدگی سے بیان کردیا ہے۔ ان الفاظ سے ایک مصور صحیح تر تصویر بنا سکتا ہے۔ علیٰ ہذا مصنوعی رنگ بندی کی بھی ذیل میں ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ اس کے بھی طرز بیان سے دیکھئے رنگ کا کس قدر صحیح تصور کیا جا سکتا ہے ؎

دوپٹہ ترا میلا ہوکر رنگ لایا ہے، شک ہے ملاگیری کا　　　اگری کا ہے گماں

اس شعر میں شاعر نے مٹیالے رنگوں کو بڑی نفاست سے باندھا ہے۔ میل خورے رنگوں کو میلا کرکے ان کی تبدیل ہیئت کا بڑی نفاست سے نقشہ کھینچا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ میل نے اصلی رنگ کو مشتبہ کردیا ہے، جس پر کئی رنگ کا دھوکا ہوتا ہے۔ نہ اگری اور نہ ملاگیری رنگ اس میلے کپڑے کے رنگ کو ظاہر کرسکتے ہیں "رنگ لایا ہے" کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ دونوں کے مخلوط ہونے سے جو کپڑا رنگا جائے گا، البتہ وہ اس کیفیت کو ظاہر کرسکے گا اور اسی وقت "گمان اور شک" رفع ہوسکیں گے۔ کیونکہ کپڑے میں دونوں رنگوں کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔

مصوری میں رنگ کی اہمیت

زمانۂ قدیم سے آج تک رنگ کی ہر قوم وملت میں خاص اہمیت رہی ہے۔ اب تو یہ ہماری زندگی کا جزو لاینفک بن چکا ہے۔ قدرتی چیزوں کے علاوہ تصاویر، پوسٹر، اشتہارات، کتابوں کے سرورق، بچوں کے لباس، گھر کی تزئین غرض ہر چیز میں رنگ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نقاشی اور ڈزائن سازی سے کہیں زیادہ رنگ میں دلفریبی اور کشش پائی جاتی ہے۔ مسٹر ڈاوسٹ کہتے ہیں۔

"ڈزائن تصویر کا جسم، ڈرائنگ اس کا دل اور رنگ اس کی جان ہوتا ہے۔"

مصوری کی عمارت، ڈزائن ہے، تو ڈرائنگ اس کی شاعری اور رنگ اس کی موسیقی ہے۔"

ہر رنگ اپنی ایک منفرد خصوصیت رکھتا ہے اور ساتھ ہی بے حد متنوع بھی ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے رنگ کو قابو میں رکھنا آسان نہیں۔ رنگ کی جاذبیت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔ محض پنسل یا قلمی نقش کشی کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہوتے ہیں۔

آرٹ کی دنیا میں رنگ سے زیادہ مفرح اور دلکش کوئی چیز نہیں اور نہ رنگ کاری سے زیادہ فرحت بخش کوئی کھیل ہے۔"

حقیقت بھی یہی ہے کہ رنگ دیکھنے سے ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ عمدہ رنگین تصویر، لمحاتِ فکر میں ہماری ایک غمگسار ساتھی ہے۔ اچھی تصویر گھر کی آرائش بڑھاتی اور اداسی کو گھر سے دور کردیتی ہے

امجد علی

ساتھی

افسردہ نوجوانی کا بجھتا ہوا دیا!
موہوم سی امنگ کی اک آخری کرن
یعنی مہیب ظلمتِ آلام کے پرے
آسودہ زندگی کا دلاویز بانکپن!!

مبہم سے اک خیال میں الجھا ہوا ہوں میں
اور دل میں رقص کرتی ہے بے نام آرزو
مایوسیٔ شباب کو تسکین کی تلاش
پژمردہ روحِ زیست ہے مصروفِ جستجو

پیوست کس نے کردیے اپنے رسیلے ہونٹ؟
ہر عضوِ جسم شدتِ لذت سے چور ہے
تم ساتھ ہو تو غم بھی ہے پیغامِ انبساط
مانا کہ اپنی منزلِ مقصود دور ہے

اب نوحۂ حیات کی حاجت نہیں رہی ——— دنیا اب اتنی قابلِ نفرت نہیں رہی

سردار الہام (عثمانیہ)

عہد غفراں مکاں کے شاعر

غفراں مکاں میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس دکن کے ایک نہایت ہی مقبول اور ہر دل عزیز حکمران تھے۔ ان کے جود و سخا اور علم و وضع داری کے قصے اب تک مملکت حیدر آباد کے عوام کے ورد زبان ہیں۔ ان کی وجاہت اور شجاعت و سخاوت نے انھیں دور دور تک ہر دل عزیز بنا دیا تھا اور ان کے دربار کی شان و شوکت شاہان مغلیہ کے پُر شکوہ درباروں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ انہیں کے عہد میں مملکت آصفیہ کی دفتری زبان فارسی کی بجائے اردو قرار پائی۔ وہ خود اردو کے ایک اچھے شاعر تھے اور ان کے کلام میں زبان کی شستگی، محاوروں کی برجستگی اور خیالات کی صفائی خاص طور پر نمایاں ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی اور ان کے عہد میں حیدر آباد سے جو رسائل اور گلدستے شایع ہوا کرتے تھے ان میں ان کا کلام قریب قریب التزام کے ساتھ شایع ہوتا تھا۔

عہد غفراں مکاں کے شعرا کو بلحاظ زمانہ تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ ان شعرا کا ہے جو حضرت غفراں مکاں کے عہد سے قبل ہی بہ حیثیت شاعر ملک میں روشناس ہو چکے تھے اور اپنے کلام کی خوبیوں کی بنا پر کافی شہرت بھی حاصل کر چکے تھے۔ ایسے شاعروں میں گردھاری پرشاد راجا محبوب نواز ونت باقیؔ، حکیم مظفر الدین خاں معراجؔ، بہاری لال رمزؔ، میر احمد علی عصرؔ، فیاض الدین خاں مشرف جنگ فیاضؔ، آغا محمد داؤد اصحؔ وغیرہ خاص کر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر و بیشتر استاد کل میر شمس الدین محمد فیضؔ کے تلازمہ یا فیض یافتہ تھے اور انھوں نے نواب افضل الدولہ آصف جاہ خامس کے عہد میں شعر و سخن اور علم و فضل کی جو فضا پیدا ہو گئی تھی اس میں نشو و نما پائی تھی۔ ان شاعروں میں سے بعضوں نے حضرت غفراں مکاں کے زمانے میں شعر و سخن کے معیار کو بلند رکھنے میں بڑا حصہ لیا۔

اس عہد کے شعرا کا دوسرا گروہ ان ارباب سخن پر مشتمل ہے جو یا تو اسی عہد میں پیدا ہوئے یا ان کے شعر و سخن کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ ایسے شعرا میں ڈاکٹر احمد حسین مائلؔ، صاحبزادہ میر وزیر علی خاں آصف یاور الملک وزیرؔ، احمد اللہ واصلؔ، شمس الدین امیر حمزہ، شمس العلما عزیز جنگ ولاؔ اشرف الحکما، لقمان الدولہ دلؔ وغیرہ بہت مشہور ہیں اور ان کے علاوہ اس گروہ میں بیسیوں دوسرے شاعر بھی شامل ہیں جن کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس صحبت میں محض مشاہیر کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔

عہد غفراں مکاں کے شعرا کے تیسرے گروہ میں سید جلال الدین توفیقؔ، مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ، ڈاکٹر مہدی حسین اکملؔ، محمد مہدی خاں مہدیؔ، عبد الغفور خاں نامیؔ، قادر حسین قادرؔ، عبد الصمد واصفیؔ، اعظم اللہ حسینی اطہرؔ، عزیز یار جنگ عزیزؔ اور رضی الدین حسن کیفیؔ وغیرہ نے بہت کافی شہرت حاصل کی۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کے شعر و سخن کا آغاز عہد غفراں مکاں ہی میں ہوا اور اسی فضا میں ان کی شاعری نے ایسی اچھی نشو و نما حاصل کی کہ وہ عہد غفراں مکاں کے بعد اساتذہ سخن میں شمار پانے لگے۔

شاعروں کے ان تین گروہوں کے علاوہ ایک اور گروہ ایسے شعرا کا بھی عہد غفراں مکاں میں حیدر آباد میں موجود تھا جو بیرون مملکت سے حضرت غفراں مکاں اور ان کے امرا و اعیان کی سرپرستی اور بذل و نوال کی شہرت سن کر اقصائے ہندوستان سے مملکت دکن میں جمع ہو چکا تھا۔ ان شعرا میں

بعض بہت اعلیٰ پایہ کے شاعر تھے اور اردو دنیا میں اپنی آپ نظیر سمجھے جاتے تھے۔ خاص طور پر کاظم حسین شیفتہ لکھنوی، سید محمد کاظم حبیب کنتوری، نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی، شمس الحق میکش تھانوی فصیح الملک مرزا داغ دہلوی، نادر علی برتر قنوجی، عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی، نجم الدین ثاقب بدایونی اس گروہ کے مشاہیر ہیں اور ان کے علاوہ بیسیوں اور اصحاب فکر و سخن بھی اس عہد میں حیدرآباد کو اپنا وطن بنا چکے تھے۔

شعرائے عہد غفراں مکاں کے پہلے گروہ میں راجہ گردھاری پرشاد باقی کا شمار دکن کے ان ہندو امراء میں کیا جاتا ہے جو اپنی علم دوستی اور رفاہ خلق کے کاموں کی بنا پر اس سرزمین میں بہت مشہور ہیں۔ وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور استاد کل شمس الدین محمد فیض کے خاص تربیت یافتوں میں شامل تھے۔ انھوں نے تیس سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر چھپ چکی ہیں۔ ان کا اردو دیوان "بقائے باقی" اعلیٰ تخیل اور صوفیانہ رجحان سے مملو ہے۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ اردو نثر بھی لکھی۔ چنانچہ ان کی ایک کتاب "پتی چرتر" مشہور ہے جو سوامی بھاسکرانند سرسوتی کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ ان کی علمی و ادبی زندگی اس قابل ہے کہ اس پر بجائے خود ایک ضخیم کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔

اس گروہ کے دوسرے شعراء میں حکیم مظفر الدین خاں مزاج اس لئے قابل ذکر ہیں کہ وہ حکیم مومن خاں کی طرح ایک طبیب ہونے کے باوجود شعر و سخن میں بہت مشہور ہوئے۔ انھوں نے اردو کلام کے چار دیوان مرتب کئے تھے۔

سدا نند جوگی بہاری لال رمز بھی باقی اور مزاج کی طرح حضرت فیض کے تربیت یافتہ تھے اور اپنے استاد کے اتنے زیادہ گرویدہ تھے کہ ان کی وفات بھی حضرت فیض کی مزار ہی پر ایسے وقت واقع ہوئی جب کہ وہ عرس حضرت فیض کے مشاعرے میں اپنی غزل سنا رہے تھے۔ ان کے کلام کے گیارہ مجموعے اس وقت موجود ہیں جن میں سے چھے اردو اور چار فارسی اور ایک ہندی میں ہے۔ ان کا کلام زیادہ تر تصوف پر مبنی ہے اور تکلفات و تصنعات سے عاری۔ وہ ایک فطرتی شاعر تھے اور اسی لئے بے ساختگی اور بے پروائی ان کے جملہ کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔

جو شاعر خود عہد حضرت غفراں مکاں کی پیداوار سمجھے جا سکتے ہیں ان میں ڈاکٹر احمد حسین مائل بہت سربرآوردہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ دراصل ایک طبیب تھے لیکن شعر و سخن میں بھی ایک اعلیٰ پائے کے استاد ثابت ہوئے۔ ان کے زمانے میں دکن میں کوئی ان کا ہم پلہ شاعر نہ تھا اور واقعہ یہ ہے کہ استاد الاساتذہ حضرت فیض کے بعد سے مائل جیسا قادر الکلام، پختہ مشق اور پرگو شاعر آج تک حیدرآباد کی سرزمین نے پیدا نہیں کیا۔ مائل میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو ایک حقیقی اور بلند مرتبہ شاعر میں ہونی چاہئیں۔ رفعت تخیل، فکر کامل، قادر الکلامی، شوخ طبعی اور جرائت رندانہ یہ سب خصوصیتیں ایک جگہ جمع ہو گئی تھیں۔ مائل نے قریب قریب ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ان کی غزلوں میں شوخی اور رندی و مستی اور کہیں کہیں تصوف کی بھی جھلک پائی جاتی ہے۔ ان کے قصیدے لفظی شان و شکوہ اور قادر الکلامی کے

اچھے نمونے ہیں۔ ان کے مرثیے ان کے قلم کی روانی اور قوت بیان کے دلچسپ ترجمان ہیں اور ان کی رباعیاں، نوحے، میلاد نامے اور منقبتیں روحانی لذتوں اور گوناگوں قلبی کیفیتوں سے مالامال ہیں۔ ان کے کلام کے تین مجموعے شایع ہو چکے ہیں اور ایک مجموعہ ان کے ایک شاگرد نے "زمزمۂ ہند و دکن" کے نام سے شایع کیا جس میں اردو کے اکثر مشاہیر شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ مائل کے کلام کو بطور مقابلہ پیش کیا گیا ہے۔

مائل کو شعر و سخن کے میدان میں مرزا داغ دہلوی جیسے بلند پایہ شاعر سے دکن میں مقابلہ کرنا پڑا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مرزا داغ نئے نئے حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور یہاں کے مشاعروں میں شرکت کرنی شروع کی تھی۔ ان کی آمد سے قبل ہر مشاعرہ مائل کے کلام کی داد و تحسین سے گونج اٹھتا تھا اور ان کے تلامذہ کی تعداد روز افزوں ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی مرزا داغ کا آوازہ بلند ہوا دکن کے بہت سے نوجوان شعراء اپنے قدیم اساتذہ کو چھوڑ کر داغ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے لگے تھے ایسے وقت میں مائل نے اپنی استادی برقرار رکھنے کی خاطر نہایت ہی سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں طبع آزمائی شروع کی اور سچ تو یہ ہے کہ شاہ نصیر اور ذوق کے بعد اردو زبان کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر پیدا ہوا ہو جو اس خصوص میں مائل کی ہمسری کر سکے۔

اس گروہ کے ایک اور شاعر صاحبزادہ آصف یار الملک وزیر ہیں۔ یہ حیدرآباد کے خاندان شاہی کی ان ممتاز ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنے علمی شغف کے باعث اس ملک میں کافی شہرت حاصل کی۔ حضرت فیض کے عرس کی تقریب میں ہر سال جو شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے ان کے صدر نشین وہی ہوتے تھے اور تلامذۂ فیض میں ان کو ایک خاص مرتبہ حاصل تھا۔ ان کا دیوان "چمنستان سخن" تقریباً جملہ اصناف سخن کے کلام پر مشتمل ہے اور خاص طور پر ان کے خمسے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ اس دور کے ایک دوسرے شاعر شمس الدین امیر حمزہ اپنے کلام سے زیادہ ڈراموں اور دکن کی تاریخی کتابوں کی وجہ سے خاص شہرت کے مالک ہیں۔ تاریخ قصبہ دکن، تاریخ گولاس اور روضۂ شہید وغیرہ ان کی مشہور تاریخی کتابیں ہیں، سحر سامری، غنچۂ دلربا اور ساحر صبا جیسے متعدد ڈرامے کلکتہ کی الفنسٹن تھیٹریکل کمپنی کی جانب سے اسٹیج پر پیش کئے جا چکے ہیں۔ چھپ بھی چکے ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "چمنستان حمزہ" کے نام سے کئی بار چھپ چکا ہے اور یہ صرف نعتیہ کلام پر مشتمل ہے جو میلاد کی مجلسوں میں بہت شوق و ذوق سے پڑھا جاتا ہے۔ حمزہ کا اصل کلیات جو صرف عاشقانہ کلام پر مبنی ہے ابھی تک شایع ہو کر منظر عام پر نہیں آیا لیکن "چمنستان حمزہ" ہی ان کے شاعرانہ کمال اور مرتبے کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔

شمس العلماء عزیز جنگ ولا بھی اس دور کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ انھوں نے نثر میں متعدد ضخیم کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں اور خاص کر فارسی زبان کی لغت ان کی ایک اہم یادگار ہے جو آصف اللغات کے نام سے اٹھارہ جلدوں میں شایع ہوئی ہے۔ ولا در اصل فارسی کے شاعر اور ادیب تھے لیکن ان کا اردو کلام بھی بہت ضخیم ہے اور یہ "کلیات نظم ولا" کے نام سے شایع ہو چکا ہے۔ جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ باوجود ایک بلند پایہ عالم و فاضل ہونے کے اردو شعر و سخن کی دنیا میں بھی اپنا ایک درجہ

رکھتے تھے ۔ ان کے کلام میں عاشقانہ سوز اور مشق و تراولت کے آثار خاص طور پر نمایاں ہیں ۔

اشرف الحکما ر لقمان الدولہ دل عہد غفران مکاں کے دوسرے طبیب شعرا مثلاً مزاج اور مائل کی طرح اردو کے خاص دلدادہ اور پختہ مشق شاعر تھے

وہ نواب مرزا داغ دہلوی کے ان حیدرآبادی تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے دکن میں خاص شہرت حاصل کی ان کے کلیات میں غزلوں کے سوا مثنویاں اور قصیدے بھی ان کی قادرالکلامی کے بہت اچھے نمونے ہیں ۔ انھوں نے "لوایح جامی" کا اردو میں منظوم ترجمہ بھی کیا تھا جو "تجلیات دل" کے عنوان سے ۱۳۳۱ء میں شایع ہوا ہے ۔

عہد حضرت غفران مکاں میں جن شعرا نے نشوونما حاصل کی اور اس عہد کے ختم ہو جانے کے بعد بھی عرصے تک شعر و سخن کی محفلوں میں اثر انداز رہے ان میں جلال الدین توفیق، کشن پرشاد شاد، مہدی حسین الم، عبدالغفور خاں نامی اور رضی الدین حسن کیفی خاص طور پر قابل ذکر ہیں لیکن یہ اور ان کے ساتھ وہ شعرا جو اب بھی بطور باقیات الصالحات موجود ہیں دراصل عہد حضرت آصف جاہ سابع کے شعرا سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے اس صحبت میں ان سے متعلق کچھ کہنا غیر ضروری ہے ۔

سید محی الدین قادری زور

بادۂ سخن :۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے ان کے کلام میں سادگی اور خداداد بے تکلفی ہے اس انتخاب کے ساتھ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کا معرکۃ الآرا مقدمہ بھی شریک ہے جس میں داغ اور مائل کے معرکوں کا بھی تذکرہ درج ہے صفحات (۱۲۷) قیمت ۱۲

متاع سخن :۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز حضرت داغ دہلوی کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں ادبی لطافت اور زبان کی پاکیزگی نمایاں ہوتی ہے۔ اس انتخاب کے ساتھ جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور کا مقدمہ بھی ہے جس میں ان کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے شاعری اور زبان کا مذاق رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔ تعداد صفحات (۱۲۶) مع تصویر شاعر قیمت ۱۲

مرقع سخن جلد اوّل :۔ یہ دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور اہل قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے ۔ یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اس کی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعرا کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرے کے ساتھ دیگر ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے شعرا کے نام دیئے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے ۔ شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرمانروایان دکن اور قدردانان ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔ پانسو صفحات پچپن تصاویر ۔ قیمت ےہ

مرقع سخن جلد دوم :۔ پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے اس کی ترتیب بھی اسی ڈھنگ پر ہے جیسی پہلے کی ہے ۔ ہر شاعر کے سوانح حیات اور نمونہ کلام کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے ۔ ان دونوں کتابوں سے حیدرآباد کی گزشتہ اور موجودہ شاعری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے ۔

تعداد صفحات (۴۳۱) تعداد تصاویر ۵۰ قیمت ےہ

ترقی پسند ادب

حیدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس اس سال حیدرآباد میں مدعو کی گئی ہے۔ اس کی مجلس استقبالیہ کے صدر عالی جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زورؔ نے ملک کے علم دوست حلقوں کو اس کانفرنس کے ساتھ تعاون عمل کرنے کے لئے حسب ذیل دعوت نامہ جاری فرمایا ہے :۔

ترقی پسند ادب کی تحریک ہمارے ملک کی سب سے مقبول، اہم اور منظم ادبی تحریک بنتی جارہی ہے اور آج ملک کی تقریباً تمام زبانوں میں اس کی انجمنیں قائم ہو چکی ہیں۔ ہمارے اکثر بڑے ادیب اور شاعر اس کے فروغ میں یا تو عملی حصہ لے رہے ہیں یا اس سے گہری ہمدردی رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر ٹیگور، منشی پریم چند، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری جیسے مشاہیر کے نام اس تحریک سے خاص طور پر وابستہ ہیں۔

ترقی پسند ادیب اور فن کار سماج کی زندہ حیات بخش اور صالح قوتوں کو ابھارنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں اپنے ماضی کی اعلیٰ ترین روایات کو اور اقبال اور ٹیگور کے لازوال کارناموں کو مشعل راہ بناکر ہر قسم کی رجعت پسندی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ پوری ذمہ داری سے محسوس کرتے ہیں کہ ادب اور فنون لطیفہ چند لوگوں کی تفریح، جنسی لذت اندوزی یا زندگی سے فرار کا ذریعہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسا حربہ ہیں جس کی مدد سے ملک میں بسنے والے تمام باشندوں کی آزادی، خوش حالی اور روشن مستقبل کی جانب رہبری کی جاسکتی ہے۔

اس عالمگیر جنگ کے دوران میں جب کہ ساری دنیا کی ترقی پسند اور رجعت پسند قوتیں برسرپیکار تھیں ترقی پسند ادیبوں نے سب سے پہلے پوری قوت کے ساتھ فاشزم کی انسانیت دشمن قوتوں کے خلاف آواز بلند کی۔ زمانۂ جنگ کے غیر معمولی حالات، سیاسی تعطل اور معاشی بحران کی وجہ سے ملک میں جو مایوسی، افسردگی اور بے بسی کی فضا پیدا ہوگئی تھی اور جس کی وجہ سے ہمارے ملک کے ادیب ابہام پرستی، فحش نگاری اور فرار پسندی کا شکار ہونے لگے تھے۔ اس کے دور کرنے میں ترقی پسندوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔

بنگال کے قحط کے زمانہ میں جب کہ ہماری ساری معاشی، سماجی اور تہذیبی زندگی درہم برہم ہوگئی تھی، ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں ہی نے اپنے افسانوں، نظموں اور تصویروں کے ذریعہ اپنے ثقافتی ورثہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ سخت مایوس کن اور تاریک دور میں حب الوطنی، ایثار اور اتحاد کا پیغام دیا اور روشن مستقبل کی طرف رہبری کی۔ اس نازک دور میں ترقی پسند ادیب اور فن کار عوام کے دکھ کے دور سے تماشائی نہیں رہے بلکہ ان میں سے اکثر ان کے ساتھ اس کشمکش میں شریک رہے۔ آج جب کہ فاشزم کو یورپ میں شکست ہو چکی ہے۔ ہر طرف ترقی پسند قوتیں آگے بڑھ رہی ہیں اور ہمارے ملک پر سے سیاہی کی چادریں ہٹ رہی ہیں۔ تمام ادیبوں پر خاص ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں۔

آج اس کی ضرورت ہے کہ ہم زمانۂ جنگ کے ادب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھیں کہ ہمیں اپنے مقصد میں کس قدر کامیابی ہوئی اور کیا کوتاہیاں ہمارے کام میں رہ گئیں اور اس کے بعد آئندہ کے لئے اپنی راہ متعین کریں۔ ساتھ ہی اردو، ہندی اور ہندوستانی کا مسئلہ اور اسی قسم کے اور دوسرے مسائل بھی ہماری توجہ کے خاص طور پر مستحق ہیں۔ اس لئے کہ یہ مسائل ہماری قومی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ان کا تفصیلی جائزہ لیں اور ایک سوچا ہوا راستہ ملک کے سامنے پیش کریں۔

ان ہی مقاصد کے تحت ۵، ۶ اکٹوبر ۱۹۴۵ء کو حیدر آباد میں ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کی ایک کل ہند کانفرنس منعقد کی جا رہی ہے جس کی صدارت پروفیسر فراق گورکھپوری، کرشن چندر، قاضی عبدالغفار اور عبدالرحمٰن چغتائی صاحبان فرما رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فنون لطیفہ کی ایک بہت بڑی نمائش اور ایک مشاعرہ کا بھی انتظام کیا جا رہا ہے اور کل ہند عوامی تھیٹر ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک ڈراما اور کلچرل پروگرام بھی پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی قوی امید ہے کہ حیدر آباد کے علم دوست حضرات اس کانفرنس کی سرگرمیوں میں نہایت جوش و خروش سے حصہ لیں گے اور اس کی کامیابی میں مجلس استقبالیہ کی ہر طرح امداد فرمائیں گے۔

سید محی الدین قادری زور
(صدر مجلس استقبالیہ)

تعلیم کا مسئلہ: — از ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ قیمت عہ

ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے پروفیسر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی صاحب کی ایک جدید کتاب "تعلیم کا مسئلہ" شائع ہوئی ہے جس میں حسب ذیل عنوانات پر مفید اور ضروری معلومات درج ہیں:۔

(۱) تعلیم و تربیت کا مقصد (۲) تعلیم کی مدت (۳) موجودہ نظام تعلیم کے نتائج و نقائص (۴) اعلیٰ تعلیم کا صحیح نصب العین (۵) علم کی وحدت (۶) انسانی وحدت کی تعلیم (۷) ایمان اور علم (۸) ابتدائی اور ثانوی تعلیم (۹) اعلیٰ تعلیم (۱۰) تعلیمی منزلیں اور نصاب (۱۱) جامعہ کے شعبہ جات (۱۲) طالب علم اور عملی سیاسیات —

ہندوستانی تمدن: — از پروفیسر ڈاکٹر الیشورا ٹوپا۔ ڈی فل ریڈر تاریخ تمدن ہند جامعہ عثمانیہ۔

یہ تقریباً پانچ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب ہے جس میں فاضل پروفیسر صاحب نے ہندوستان کے قدیم تمدن کو دس ابواب میں شرح و بسط اور تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر اردو تو کجا کسی اور زبان میں بھی ایسی عالمانہ کتاب اب تک نہیں لکھی گئی تھی۔ جو لوگ قدیم ہندوستان سے واقف ہونا چاہتے ہیں اس کو ضرور پڑھیں۔ صفحات (۴۴۰) قیمت ہے

ملنے کا پتہ
سب رس۔ کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

عرضِ حال

"میری پسندیدہ نظم" یہ موضوع کوئی نیا نہیں، چند سال قبل خانہ کتابستان الہ آباد نے اس نام کی ایک کتاب شائع کی تھی۔ اس میں ہر شاعر نے اپنی نظموں میں سے کسی ایک کو پسندیدہ قرار دے کر وجہ بیان کی ہے۔ اس سے نہ صرف پڑھنے والوں کی تفریحِ طبع ہی ہوتی ہے بلکہ نظم کی وجہِ تخلیق اور شاعر کے ذہنی پس منظر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ادارہ نشرگاہ حیدرآباد نے اس کی افادیت اور اہمیت کے پیشِ نظر پانچ ماہ پہلے اسی نوع کا ایک مشاعرہ پیش کیا تھا، جس میں حیدرآباد کے شاعروں نے شریک ہو کر اپنی اپنی پسند کی نظم سنائی تھی۔ یہ موضوع اگرچہ نیا نہیں، لیکن اس قسم کا اجتماع اپنے اندر کافی معنی رکھتا ہے۔ نشرگاہ حیدرآباد سے یوں تو ہمیشہ ہی معیاری مشاعرے پیش ہوتے رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ جدت سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے دو موضوعی مشاعرے (ساحلی مشاعرہ اور منظری مشاعرہ) پیش کئے گئے تھے جو بہت پسند کئے گئے۔ اس خصوص میں فضل الرحمن صاحب، محبوب علی طاہر صاحب اور میر حسن صاحب قابلِ ستائش ہیں۔

میں قارئین کی دلچسپی کے لئے "سب رس" میں اسی مشاعرہ کی منتخب نظمیں شائع کر رہا ہوں۔ اس کا مقصد حیدرآباد کی ادبی سرگرمیوں اور صحیح ذوقِ شعری کی ترجمانی کے علاوہ یہ بھی بتانا ہے کہ یہاں کا شاعر نئے اسلوبِ نگارش اور ترقی پسند رجحانات سے کس قدر قریب ہے اور ہندوستان کے عظیم تر مستقبل کی تعمیر میں کیا حق ادا کر رہا ہے ــــ میں یہاں یہ بھی لکھنے سے احتراز نہیں کرتا کہ اس زمانہ میں بھی ہمارا ملک صوبہ واری تعصب اور بغض و عناد کی لعنتوں سے پاک نہیں، صرف دعوے سنتے جائیے زبان و ادب کی خدمت کے ــــ! جس ملک میں چپہ چپہ پر اتنے اختلافات ہوں وہاں ترقیوں کے کیا امکانات ہو سکتے ہیں؟ ــــ

اس جذبۂ ناز یبا کا نشانہ خصوصاً حیدرآباد بنتا رہا ہے چنانچہ چند سالوں سے کچھ اچھے اور مشہور اداروں نے ہر سال گزشتہ سال کا بہترین شعری انتخاب کتابی صورت میں پیش کرنا شروع کیا ہے۔ لیکن کسی مجموعہ میں بھی حیدرآباد کے کسی شاعر کی نظم انتخاب نہیں ہوتی، حالانکہ حیدرآباد کا شاعر کسی منزل پر بھی دوسروں سے پیچھے نہیں، وہ بھی شعر کی عظمت اور آرٹ کو بلند کرنے میں دوسروں کے دوش بدوش نظر آتا ہے ــــ علی اختر، مخدوم محی الدین، اور علی منظور تو خیر کسی تعارف کے محتاج نہیں، لیکن ان کے علاوہ سکندر علی وجد، شاہد صدیقی، میکش، نظر، کاوش اور سلیمان اریب کا کلام حیدرآباد کے علاوہ باہر کے معیاری اور مشہور رسالوں میں اکثر شائع ہوتا رہتا ہے لیکن تعصب کی عینک نکال کر دیکھئے تو یہ سب آج ہندوستان کے شعراء کی فہرست سے کسی طرح بھی الگ نہیں کئے جا سکتے ــــ!

میں ان شاعروں کی خدمت میں معافی چاہتا ہوں، جن کی نظمیں اس انتخاب میں چند ناگزیر وجوہ کی بنا، پر شریک نہ ہو سکیں۔ لیکن وہ کسی وقت بھی ہماری صف سے الگ نہیں ہو سکتے۔ صمد رضوی، ساز، تمکین سرمست اور کاوش کی نظمیں نشر نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن کم از کم اس مجموعہ میں ان کی شرکت ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ میں نے ان حضرات کو خطوط بھی لکھے، لیکن افسوس کہ سوائے کاوش کے کسی شاعر نے بھی اپنی نظم نہیں بھیجی، تمکین، اور ساز نے تو کوئی جواب ہی نہیں دیا، اور علی منظور صاحب نے جو جواباً خط میرے نام تحریر کیا ہے اس کی نقل یہاں پیش کرتا ہوں۔

"عنایت نامہ موصول ہوا، شکریہ۔ افسوس ہے کہ میں آپ کے ارشاد کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ میری بہترین نظم کے نام سے ایک نیا مجموعہ کتابستان الہ آباد نے شائع کیا ہے جس میں میری نظم نظر آئے گی۔ آپ فرمائیں گے کہ دونوں صورتیں ایک ہیں عسکری صاحب کی بات کیوں مان لی اور ہماری کیوں ٹال دی؟ سنئے بھائی صاحب! وہ نظم بھی میں نے ارسال نہیں کی "ادبی دنیا" سے موصوف نے نقل کر لی ہے۔"

سب سے پہلے خیال تھا کہ ان نظموں کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع کروں لیکن یہ خیال عملی صورت اختیار نہ کر سکا، لیکن مقصد اب بھی فوت نہیں ہوتا، وہی نظمیں آپ کے سامنے موجود ہیں۔

میں محترمی ڈاکٹر زور صاحب کا بیحد ممنون ہوں کہ موصوف نے "سب رس" کے اس شمارہ کو مرتب کرنے کی اجازت عطا فرمائی۔ یہ بھی زبان و ادب کی خدمت گزاری کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ کام کرنے والوں کو ان کے منشا کے مطابق موقع دیا جائے۔

جناب خواجہ حمید الدین صاحب شاہد ایم اے مدیر سب رس کا اشتراک و تعاون اگر حاصل نہ ہوتا تو شاید یہ انتخاب شائع بھی نہ ہوتا۔ جس کے لئے میں ان کا بھی شکر گزار ہوں ــــ

(نوٹ) یہ تمام نظمیں نشرگاہ حیدرآباد کی اجازت سے شائع کی جا رہی ہیں۔

تحسین سروری

"یہ نظم مجھے پسند ہے اس لئے کہ میری کہی ہوئی ہے"

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

مجھے یہ دھمکیاں نہ دے حیات کوئی چیز ہے
وہ کوئی چیز ہو نہ ہو مگر مجھے عزیز ہے
سمجھ سکوں یہ راز میں ابھی تو یہ تمیز ہے
ڈرا نہ دام و دار سے فریبِ امتحاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

حجابِ دہر اٹھا گئی گرفتگی خیال کی
مآلِ غم سے مٹ گئی خلش غمِ مآل کی
یقیں نے توڑ دیں حدیں طلسمِ احتمال کی
حیات پھر حیات ہے مثالِ رفتگاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

تلاشِ رازِ دہر میں کہاں کہاں پھرا ہوں میں
نفس نفس بچھا ہوں میں چمن چمن کھلا ہوں میں
فریبِ انتہا میں تھا اب اپنی ابتدا ہوں میں
جو منزلیں گزر چکیں انہیں کا پھر نشاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

اجل سے بھیک مانگنا یہ کارِ زندگی نہیں
خزاں کے رحم پر ہو جو وہ پھول پھول ہی نہیں
تجلیات وہم ہیں جو حسن سرمدی نہیں
حدیثِ شوق کیا اگر لطافتِ بیاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ہوائے سرد سرد ہے نشاطِ جاں لئے ہوئے
سرور موج موج ہے جوانیاں لئے ہوئے
حجابِ گردِ کارواں ہے کارواں لئے ہوئے
یہاں فغاں کا ذکر کیا یہ دعوتِ فغاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

ازل سے گرم کار ہے وہ فطرتِ عظیم تر
دیارِ نور و نار میں سر بساطِ بحر و بر
اسی کے صبح و شام ہیں اسی کے لالہ و گہر
متاعِ سود مند کو یہ تہمتِ زیاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

چمن کے راز داں ہیں جو انھیں غمِ خزاں نہیں   چمن بھی سرمدی نہیں خزاں بھی جاوداں نہیں
گر وہ روحِ زندگی کہاں رواں دواں نہیں   دیارِ عقل و ہوش میں پیامِ مرگ ہاں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

فنا مآل وہم ہے نہ منزلیں نہ کارواں   حیات نقشِ مستقل حیات حسن جاوداں
کہیں سکوں کہیں خلش کہیں عیاں کہیں نہاں   یقیں کی بارگاہ میں یہ تحفۂ گماں نہ دے

اب اے تصورِ اجل مجھے یہ دھمکیاں نہ دے

علی اختر اختر

طائرِ بلند مقام!

[زندگی بظاہر رنگ روپ کے بل پر کھڑی ہے، لیکن دوا ما سرگرم سفر ہے۔ اس کے حرکی بانکپن کا شیدائی فلسفی بھی ہے اور آرٹسٹ بھی۔ دونوں اس کو "آنی" کہتے ہیں۔ اس کی آن کیا ہے؟ محض ایک چکوگی۔ کچھ اس قسم کی کیفیت اس نظم میں پیش کی گئی ہے۔ مخاطب میں ہوں۔ مخاطب کون ہے؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔]

وفا شعار ہوں، مسلکِ مرا جفا طلبی   یہ قرب و بُعد کے قضیے یہ فاصلے کیا ہیں!
پسند ہے تجھے دوری تو دور رکھ مجھ کو   کہ آگئے تیری خوشی کے مرے گلے کیا ہیں
ازل سے تابہ ابد ایک آن کا ہے سفر   نگاہِ مردمِ بینا میں، فاصلے کیا ہیں
تو اپنی آن پہ رہ طائرِ بلند مقام!   وزارت اور امارت کے گھونسلے کیا ہیں!
یہ سب کھلونے ہیں فانی، اک آن باقی ہے   مجاہدانہ گزر جا، یہ بلبلے کیا ہیں!

"اچھل کے بحرِ حوادث سے بیکراں ہو جا"
سبک ہے پلہ ابھی، اور کچھ گراں ہو جا!

ابو ظفر عبد الواحد

خوناب

"خوناب" مجھے اپنی تمام نظموں میں بہت زیادہ عزیز ہے اور شاید یہ میری بہترین نظم بھی ہو لیکن آپ اس کو میری رفیقۂ حیات کی بے وقت موت پر میری آنکھوں سے ٹپکے ہوئے ایک آنسو ہی کی حیثیت سے دیکھئے۔"

حسن اور عشق کے پرکیف خیالوں میں مگن — جھومتا گاتا ہوا میں بھی تھا سرگرمِ سفر
کوئی پیکر ہو کوئی زلف کوئی آنچل ہو — چند لمحوں کے لئے تھے مرے مسجودِ نظر
ایک بے نام سی خواہش سے جو دل تھا بیتاب — ایک انجانی سی تسکین کو تڑپتا تھا جگر

اک دوراہے پہ کچھ اس طرح ملیں تم مجھ سے — جیسے تم مجھ سے کبھی تھیں ہی نہیں بیگانہ
تم نے پھر اپنی محبت کا جلایا دیپک — اور مجھے بخش دیا سوزِ دلِ پروانہ
میرے ساقی تری بدمست نگاہوں کی قسم — میرے ہر گام پہ بنتا ہی رہا میخانہ

ایک منزل ہی پہ دم لے کے چلے تھے آگے — اور ابھی دور بہت دور تھا ہم کو جانا
تم ہی تھیں اور نہ تمہارا تھا وہاں نقشِ قدم — میں نے اک موڑ پہ جو تم کو پلٹ کر دیکھا
تم نے سوچا نہیں کیا مجھ پہ گزر جائے گی — اور مجھے چھوڑ دیا زار و ملول و تنہا

تم کو جب ساتھ نہ دینا تھا مرا آخر تک — توڑنا تھا نہ تمہیں میری جوانی پہ ستم
خیر اب ہو گی نہ دامن کو تمہارے زحمت — اب ہمیشہ ہی رہیں گی مری آنکھیں پُرنم

یاد کو اپنی بنا دو جو سہارا دل کا
حال پہ ایک مسافر کے بڑا ہو گا کرم

سلیمان اریب

"میں نے اپنی نظم "چاندنی" منتخب کی ہے جو یہ ہے۔ ایک درخشاں لمحۂ فکر میں جب کہ یہ نظم سپردِ قلم ہوئی ہے میں نے اس دریائے نور کو جو مجھ میں آپ میں اور ساری کائنات میں ہمہ گاہ جاری و ساری ہے اپنے سے قریب تر محسوس کیا ہے۔ فی الحال تو بس یہی ایک وجہ انتخاب کی میری سمجھ میں آرہی ہے باقی :-

"تو دانی حساب کم و بیش را"

گردوں پہ قصر ہے کہ کھلا کوئی کنول ہے — یا جلوہ گہہ چرخ پہ اک تاج محل ہے
ہاں اے نگہِ شوق یہ سجدہ کا محل ہے — تسبیح میں کھویا ہوا ہر دشت و جبل ہے
ٹھنڈی سی کوئی آگ سلگتی ہے ہوا میں
اللہ جمیل کا فسانہ ہے فضا میں

براق ہے منظر کا وہ رہ رہ کے دہکنا — وہ سبزۂ نوخیز کا مستی میں لہکنا
وہ بادۂ گل پی کے ہواؤں کا بہکنا — وہ جھومنا شاخوں کا وہ جنگل کا مہکنا
وادی کے دھندلکے میں وہ ندی کی روانی
تیزی سے گزر جاتی ہے جس طرح جوانی

میں شام کے پردے میں سحر دیکھ رہا ہوں — ظلمات کے سینے میں شرر دیکھ رہا ہوں
اک نور ہی پیدا ہے جدھر دیکھ رہا ہوں — وارفتہ نظر جانے کدھر دیکھ رہا ہوں
اک وجد کا عالم ہے عجب بے خبری ہے
پھولوں کے اجالے پہ گمانِ سحری ہے

سجدے سے مچلتے ہیں ستاروں کی جبیں میں — لرزش سی ہے پیدا پرِ جبریلِ امیں میں
خاموش سا طوفاں ہے بپا عرشِ بریں میں — چشمے سے ابلتے ہیں دلِ خاک نشیں میں
حاصل ہے مرے سوز کو اب سازِ الٰہی
ہے روح مری مائلِ پروازِ الٰہی

اب سیر میسر ہے مجھے دونوں جہاں کی — نظروں میں حقیقت ہے زمین اور زماں کی
پاتی ہے مری روح خبر سرِّ نہاں کی — وسعت ہے مرے دل میں ترے کون و مکاں کی
اے خالقِ کونین مرے دل میں سما جا
اے ربِّ سمٰوات مرے طور پہ آ جا

ابوالکلام بدرالدین بدر

گاؤں کی باتیں

"میں اپنی چند پسندیدہ نظموں میں اس کو اپنی بہترین نظم اسلئے قرار دیتا ہوں کہ اس میں میرا بچپن اور میرے گاؤں کی باتیں ہیں اور اس میں میرے ان تمام دیہاتی ساتھیوں کے نام آ گئے ہیں جن سے میں اب بھی ملنے کے لئے بیتاب رہتا ہوں اور جی چاہتا ہے کہ ہم سب پھر سے کسی آم یا املی کے گھنے پیڑ کے تلے جمع ہو اکریں۔ ہمارے اردگرد نہریں، تالاب لہلہاتے کھیت اور ہرے بھرے جنگل ہوں ——— میں جب کبھی اس نظم کو پڑھتا ہوں اپنے کو اسی ویران آبادی میں سانس لیتا ہوا پاتا ہوں ——— میرے سامنے سے تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور میں ایک لامتناہی اجالے میں آ جاتا ہوں ———

نیز اس میں شعری تکلفات بہت کم ہیں لیکن خلوصِ جذبات سادگی بیان اور کردار کے حقائق کم ازکم میرے لئے بلند آہنگ ہوسکتے ہیں۔

کیوں نارائن اچھے ہو کیا حال ہے گاؤں کے لوگوں کا
تنہائی سے اکتا کر جب گھر سے نکل جاتا ہوں میں
ہاں یہ تو بتاؤ ارجن ماتک کیسے ہیں ملتے ہی نہیں
کہتے ہیں سب یہ جو نیا پٹواری ہے کچھ اچھا ہے
خیر یہ باتیں چھوڑو کچھ اپنی بھی کہو کیا کرتے ہو
وہ بھی زمانہ کیا تھا جب دنیا کی ہمیں پروا نہ تھی
دن آیا کھل جاتے تھے رات آئی کمھلا جاتے تھے
املی کے پیڑوں کے تلے تھا گھر اپنا مسکن اپنا
مونگ چنے دو پہروں کو کھیتوں سے جو چرایا کرتے تھے
وہ جو گھنا سا بڑ ہے اس کے آگے ہی پیپل کے قریب
یاد ہے اک دن اس گوری یا دھا کو کتنا ستایا تھا
ہاں پھر شائد اس کے چھوٹے بھائی گنپت نے آ کر
شکلا ہم سے گھبراتی تھی لچھمن بھی تو ڈرتا تھا
کھیلتے تھے سب آنکھ مچولی ستیا دیکھا کرتی تھی
اس پگڈنڈی والے ویرانے سے ہم گھبراتے تھے
کتنے اچھے دن تھے وہ اور کتنی سہانی راتیں تھیں
میں پرسوں آیا لیکن دل مردہ ہے جی بیٹھا سا
کیا جانے کیا یاد مجھے آتا ہے مچل جاتا ہوں میں
اور سنا ہے گردھاری نے ٹھیکے لگا دی اپنی زمیں
اچھا ہوگا بوڑھا ہے دنیا کو سمجھا بوجھا ہے
اب بھی پڑھتے ہو یا کام اپنی کھیتی کا کرتے ہو
ساتھی تھے یا یہ جنگل تھا اور کسی سے چاہ نہ تھی
دن کے راجہ تھے ہم رات کی رانی سے گھبراتے تھے
ندی نالے اپنے سمجھے تالاب اپنا اور بن اپنا
جھاڑی میں یا باڑھوں میں چھپ چھپ کر کھایا کرتے تھے
پیلے دھان نظر آتے تھے کتنے دلکش کتنے عجیب
بے چاری پر گندہ پانی سب نے لے کے اچھالا تھا
ہم پر اینٹیں پتھر برسائے تھے طیش میں لہرا کر
اور وہ کملا کی باتوں پر اندر کتنا مرتا تھا
پاربتی کی بھاوج اپنی آنکھیں میچا کرتی تھی
لیکن شنکر اور چندر اہر بار ادھر ہی جاتے تھے
کتنی سادہ ملاقاتیں تھیں کیسی البیلی باتیں تھیں

تحسین سروری

طلوع آفتاب

فطرت کے نظاروں میں سورج کے نکلنے کا نظارہ میرے دل کو بہت اپیل کرتا ہے ــــ اس چھوٹی سی نظم میں اسی نظارے کی سادگی کے ساتھ تصویر اتارنے کی کوشش کی گئی ہے ــــ اسی لئے مجھے یہ نظم پسند ہے ــــ

دیکھو سورج نکل آ رہا ہے
بدل گیا ہے رنگ گگن کا رنگ بھوم بدل رہا ہے
اندھا ہو کر چلا اندھیرے
کہیں ڈھونڈنے اپنا ڈیرا
مدھر اوشا کی اجیالی بال کرن دل مچل رہا ہے
چٹکیں نو جیون کی کلیاں
ہل مل کھیل رہیں رنگ رلیاں
آشاؤں کے مکھ سے آنچل ہٹ کر سر پر سنبھل رہا ہے
دور ہوئی نیرو تا کالی
ناچے چنچلتا متوالی
کرنوں کی جگ مگ تاروں سے راگ سنہرا نکل رہا ہے
جاگ اٹھی سپنوں کی دنیا
چہک رہی پرانوں کی چڑیا
اٹھتی لہروں میں پرکاش کی دل لو دن کا اچھل رہا ہے

ونشی دھر ودیا النکار

"مجھے وہی نظم پسند آتی ہے جس میں شاعر اپنے انفرادی تاثر کو روح اجتماعیت سے علٰحدہ نہ رکھے۔ میں نے اپنی اس نظم میں اس بات کی کوشش کی ہے کہ اپنا انفرادی تاثر منفعل نہ ہو سکے۔ کیونکہ انفعالیت زندگی سے گریز اور فرار کا دوسرا نام ہے —— جو ادب کی دنیا میں ایک ناقابل معافی جرم ہے۔"

کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات
آہ یہ بزم کہ ہے محبسِ اوہام میں شاد
عقل سہمی ہوئی تدبیر کے سامان برباد
ہر طرف جہل کی تاریک گھٹاؤں کا خروش
سینۂ زیست پہ ہے رقص کناں دیوِ عناد
کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات
آہ یہ چشمِ امارت کے بھٹکتے ہوئے خواب
اف یہ لٹتا ہوا دوشیزۂ مسرت کا شباب
بے کسی ظلم و ستم جور و جفا تعزیریں
زندگی پردۂ درِ کشمکشِ روزِ حساب
کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات
شوق کو فرصتِ آرایشِ افکار تو دے
میری آزاد روی کو دلِ سرشار تو دے
اور کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں اے دردِ حیات
اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے
کیا کروں اے غمِ بے چارگیٔ دردِ حیات
نورِ احساس کا بہتا ہوا دھارا بن کر
ایک خورشید در آغوش شرارا بن کر
چھین ہی لوں گا امارت کی جبیں سے تنویر
شبِ افلاس کی قسمت کا ستارا بن کر
اک فقط جذبۂ بے باک کی تلوار تو دے
اور کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں اے دردِ حیات

لطیف ساجد

یہ زمانہ

"میں اس نظم کو محض اس لئے اچھا سمجھتا ہوں کہ اس میں موجودہ زمانہ کے بعض حقائق کی جانب شاعرانہ اشارے پائے جاتے ہیں لیکن میرا یہ جذبۂ پسندیدگی "وقتی" بھی ہو سکتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی ذہنی تغیر کی منزل سے گزرنے کے بعد میرے لئے یہ نظم پسندیدہ نہ رہے —— مختصر یہ کہ میں اپنی سب نظموں کو اچھا سمجھتا ہوں —— اور انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے۔"

آپ کیوں ہیں انقلاباتِ جہاں سے بدگماں
زیستِ منزل کے لئے بیتاب ہے اے مہرباں

کل تک اسکی عقلِ پرکار زمیں بھی پر تھا
آج انساں کی نظر ہے ماورائے کہکشاں

عقل محتاجِ سکوں ہے عشق جویائے خلش
بڑھ رہا ہے اپنی منزل کی طرف ہر کارواں

آج تقدیرِ چمن کو جانے کیا منظور ہے
اک طرف کچھ آشیاں ہیں اک طرف کچھ بجلیاں

اپنی بربادی کا اس کو خوف ہو سکتا نہیں
بجلیوں پر جس نے رکھی ہو بنائے آشیاں

کھولتی جاتی ہیں راہیں ذہنِ تازہ کیلئے
ایک فرسودہ نظامِ فکر کی بربادیاں

کہنگی کی لاش پر محوِ تبسم ہے شباب
اور بڑھاپا ہے پرانے مقبروں میں نوحہ خواں

اک طرف بھڑکے ہوئے شعلوں میں بھی خنکی سی ہے
ایک جانب اٹھ رہا ہے سطحِ دریا سے دھواں

ایک جانب موت کی آنکھوں میں ہے کچھ نیند سی
ایک جانب لے رہی ہے زندگی انگڑائیاں

ایک جانب چہرۂ افلاس پر رنگِ وقار
اک طرف روئے امارت پر ہزاروں جھریاں

ہے یہ موزوں وقت تعمیرِ نشیمن کے لئے
زلزلے ہی زلزلے ہیں آندھیاں ہی آندھیاں

یہ زمانہ کس قدر پُرسوز و راحت خیز ہے
زندگی کی دوڑ کتنی سست کتنی تیز ہے

شاہد صدیقی

ذرّوں کا ناچ

"میری پسند خاطر نظم ——— نشری مشاعرہ کیلئے ——"

اس مشاعرہ کے لئے مجھے یہ نظم پسند آئی ہے۔ اور جس طرح کسی پسند کے بارے میں کوئی معقول وجہ نہیں بتلائی جا سکتی اسی طرح اس انتخاب کے متعلق بھی میں کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔"

یہ پہاڑ یہ نہریں یہ کھیت یہ بن
یہ زمیں جو ہے جلوؤں میں رشکِ چمن
وہ ستارے جو پھول ہیں روشنی کے
وہ فلک جو ہے نور کا باغِ عدن
یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمیں
وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن
یہ ہوائیں جو باغوں میں مست ہیں سب
یہ درخت جو شیشہ بدست ہیں سب
یہ بہار یہ نکہت و رنگ کی مئے
یہ صراحئ لالہ یہ جامِ سمن
یہ سہانے نظارے یہ پیاری زمیں
وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن!

یہ شگوفے حسینوں کی جن میں ادا
یہ تبسّم کا رقص یہ موجِ صبا
یہ پرند یہ پیت کے مارے ہوئے
نہیں بجھتی پریم کی جن کے اگن
یہ سہانے نظّارے یہ پیاری زمیں
وہ فضائیں فلک کی وہ چرخ بریں
یہ ہے برق کے ذرّوں کا ناچ پیا
وہ ہے بجلی کی لہروں کا کھیل سجن
یہ بشر جو ہے خلق کا تختِ جگر
ہے جو ساری خدائی کا نورِ نظر
ہے یہ کون سے ذرّوں کا ناچ پیا
ہے یہ کون سی لہروں کا کھیل سجن
یہ تخیل و فکر یہ ذہنِ رسا
یہ تکلّم و نطق یہ ذوقِ نوا
ہے یہ کون سے ذرّوں کا ناچ پیا
ہے یہ کون سی لہروں کا کھیل سجن

فضل الرحمٰن

تجدید

مجھے تو وہی نظم پسند آتی ہے جس میں زندگی کی تلخیاں Healing Power کی حقیقت رکھتی ہیں یا چیخ بن جاتی ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میری اپنی پسندیدہ نظم ہے۔

چشم کو دیدۂ بیدار بنا کر چھوڑوں دل کو سرحلقۂ انوار بنا کر چھوڑوں
روح کو محرمِ اسرار بنا کر چھوڑوں دہر کو گلشنِ بے خار بنا کر چھوڑوں
درد کا اک نئے انداز سے درماں کر دوں

اس طرح تجھ پہ کروں اپنے غموں کا اظہار کہ ترے دل میں بھی ہو جائے محبت بیدار
حد سے گزری مری بیتابیٔ دل تیرے نثار آ کہ اچھے نظر آتے نہیں غم کے آثار
دیدۂ و دل کو تری راہ میں قرباں کر دوں

کتنی الٹی مری تدبیر ہوئی جاتی ہے زندگی موت کی تقدیر ہوئی جاتی ہے
اور ہی خواب کی تعبیر ہوئی جاتی ہے آج بھی یاس کی تعمیر ہوئی جاتی ہے
لاؤ شیرازۂ ہستی کو پریشاں کر دوں

میں رہوں صرفِ ستم گاریٔ ہجراں کب تک دلِ خوں گشتہ میں یہ کاوشِ پنہاں کب تک
میں بہاروں میں رہوں اشک بداماں کب تک چاک اس طرح کئے جاؤں گریباں کب تک
کس طرح تجھ سے محبت کو نمایاں کر دوں!

کاوش

تعارف

ہندی کے ایک گیت " پرچھے " سے متاثر ہو کر میں نے یہ گیت لکھا ہے یہ گیت کچھ تلخ حقیقتوں کا آئینہ دار ہے۔ عرصۂ حیات میں بے حس تصویر کی طرح کچھ لمحوں کے لئے ساتھ کھڑے ہو جانے والے رسمی ساتھیوں کے خلاف اس گیت کو ایک بیٹھی کر تلملا دینے والی چٹکی کے طور پر استعمال کرنے کی اپنی نظر میں میں نے ایک کامیاب کوشش کی ہے ـــــ اور یہی وجہ ہے کہ یہ نظم مجھے پسند ہے۔"

"مجھ سے میرا نام نہ پوچھو"

میں راہی ہوں ایک اکیلا
گھیرے رہتا راہ کو جس کی ہر دم طوفانوں کا ریلا
تم اپنے دھندلے دن دیکھو میری ڈھلتی شام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

تھک کر چور ہوا جاتا ہوں
جتنا چلتا ہوں منزل سے اتنا دور ہوا جاتا ہوں
اجڑے گھر میں بسنے والو میرا اجڑا گرام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

سانجھ سویرے رونے والو
جینے کے پیچھے مر مر کر اپنا جیون کھونے والو
اپنے الجھے دھندے دیکھو میرا الجھا کام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

آزادی کا دیوانہ ہوں
انگاروں سے کھیلنے والا اک البیلا پروانہ ہوں
تم سو بندھن میں جکڑے ہو آزادی کے دام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

دنیا کا رنگ دیکھ رہا ہوں
منڈلاتے طوفانوں بھونچالوں کا بھی ڈھنگ دیکھ رہا ہوں
کانپ اٹھو گے دنیا والو دنیا کا انجام نہ پوچھو
مجھ سے میرا نام نہ پوچھو

کنول پرشاد کنول

اِستالین

"یہ نظم اس تاریخی دور کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے جب کہ سرخ فوج دشمن کو کمزور کرتے ہوئے منظم طور پر پیچھے ہٹا رہی تھی۔ سوویت یونین کے دشمن تو دشمن دوست بھی یہ سمجھ رہے تھے کہ ماسکو اب گیا یا تب گیا۔ لیکن مجھے یقین کامل تھا۔ فاشزم نیست و نابود ہو کر رہے گا اور سرخ فوج اس معرکے سے منصور و مظفر نکلے گی۔ آج جب کہ سرخ فوج برلن کے در و دیوار پر کھڑی ہے۔ یورپ میں ہٹلر کے ساتھ ہی انسانی تاریخ کا تاریک ترین خونی باب ختم ہو رہا ہے — جمہور کی آزادی کی صبح طلوع ہو چکی ہے۔ مجھے یہ نظم قطع نظر اس کی لفظی شوکت اور خوش آہنگی کے اس لئے بھی پسند ہے کہ معنوی اعتبار سے مجھ میں اپنے ملک کی حفاظت اور اس کی آزادی کا ایمان تازہ ہوتا ہے۔"

صفِ اعدا کے مقابل ہے ہمارا رہبر — استالین
مادرِ روس کی آنکھوں کا درخشاں تارا
جس کی تابانی سے روشن ہے زمیں
وہ زمیں اور وہ وطن
جس کی آزادی کا ضامن ہے شہیدوں کا لہو
جس کی بنیادوں میں جمہور کا عرق
ان کی محنت کا اخوت کا محبت کا خمیر
وہ زمیں
اس کا جلال
اس کا حشم
کیا میں اس رزم کا خاموش تماشائی بنوں
کیا میں جنت کو جہنم کے حوالے کر دوں
کیا میں تلوار اٹھاؤں نہ وطن کی خاطر
میرے پیارے مرے فردوس بدن کی خاطر

ایسے ہنگامِ قیامت میں مرا نغمۂ شوق
کیا مرے ہم وطنوں کے دل میں
زندگی اور مسرت بن کر
نہ سما جائے گا —
قرۃ العین۔ مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں — استالین

وہ مرا ملکِ جواں
وہ مرا بادۂ احمر کا جواں سال سبو
مری نوخیز مسرت کا جہاں
وہ مرا سروِ رواں ملکِ جواں
ولدالجرم خطا کار درندوں نے جہاں
اپنے ناپاک ارادوں سے قدم رکھا ہے
ایک نوخیز کلی۔ ایک نو آغازِ بشر
وہ مرا ملکِ جواں
سچ کہاں ہے کہ " زمیں کے کیڑے
اپنی بے وقت اجل سے ڈر کر
تھر تھراتے ہوئے سہمے ہوئے گھبرائے ہوئے
نکل آئے ہیں بلوں سے باہر "

اپنے فولاد سے روزن کے دہن بند کردو
اور فاشست شغالوں سے کہو
نغمۂ اوّل و آخر ہے یہی
قرۃ العین مری جانِ عزیز
او مرے فرزندو
برق پا وہ مرا رہوار کہاں ہے لانا
تشنۂ خوں مری تلوار کہاں ہے لانا
مرے نغمے تو وہاں گونجیں گے
ہے مرا قافلہ سالار جہاں —— استالین

یہی محشر ہے دو عالم کا تصادم ہے یہی
ایک پرانا عالم
ایک نیا
ایک مرتی ہوئی بڑھیا کا لنگڑاتا ہوا پاؤں
ایک ڈھلتی ہوئی چھاؤں
دوسرا۔ ایک ابھرتے ہوئے سینے کا شباب
تیز اور تند شراب
پیٹ سے رینگنے والے یہ نجس اور ناپاک
سوسمار
دورِ وحشت کے درندے
موذی

وہن آز و ہلاکت کا شکنجہ لے کر
مرے شاہیں کے خلاف
نہیں جائیں گے کبھی رائیگاں میرے نغمے
اور مرے ہم وطنوں کے نغمے
مرے شاہیں تو منصور و مظفر ہی رہیں گے دائم
سو سماران خنزندہ درگور
مرا شاہین مرا استالین
مرے شاہین بچے جن کا ابھی نام نہیں
سرخرو اور سرافراز فضاؤں میں بلند
ہاں مرے ہم وطنو
جاؤ اور اپنے سمندوں کو مہمیز کرو
سرخ فوجوں میں ملو
جوئے پر جوش بنو برق کا سیلاب بنو اور بہو
اک دہکتے ہوئے پگھلے ہوئے دوہے کا سمندر بنکر
غضب آلود بھنور بن جاؤ
اور فاشست خنازیر کو
فی النار کرو
مرے بجاش کہاں ہے وہ مسلہ سرخ ترا
اس سے کہنا سر دشمن پہ گرے شل بن کر

بحر اخضر کے او ماہی گیرو غوطہ زنو
اپنا ذخیرہ لاؤ
اور قربانِ وطن کر ڈالو
معدنوں سے کہو اور کھیتیوں کو آواز تو دو
لائیں وہ اپنے سن و سال کا حاصل لائیں
اور قربانِ وطن کر ڈالیں
یہ ہیں رہوار یہ پشمینہ ہے یہ خرمن ہیں
مرے محبوب وطن
سب کے سب تیرے ہیں سب تیرے ہیں
اینتالین نے میداں میں بلایا ہے ہمیں
کسب اور جہد کا پیغام سنایا ہے ہمیں
خطۂ قدس سے دشمن کو نکالو باہر
قازقستان
اپنی طاقت کو سمیٹے ہوئے اٹھ
خیز با صد حشم و جاہ و جلال
بہ ہزاراں جبروت -
ایک جان ایک جسد
پھونک دے دشمنِ ناپاک کی خاکستر کو

مخدوم محی الدین

"میرے موجودہ دورِ شاعری میں یہ نظم مجھے بیشتر خاطر ہے۔ اس وجہ سے کہ میں نے تاج محل کو ایک نئے زاویے سے دیکھا ہے اور اس کے حسن اور اس کی تخلیق کو ایک کی "اجارہ داری" سے نکال کر دنیا کے سامنے ان کو پیش کیا ہے جن کے زخمی ہاتھوں نے تاج محل کے ذریعے ممتاز محل اور شاہ جہاں کی محبت کو حیاتِ جاوید عطا کی ہے ــــــ اس کے علاوہ اس کو پسند کرنے کی کچھ ایسی ناقابلِ اظہار وجوہ بھی ہیں جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، کہا نہیں جا سکتا۔"

یہ اندھیری رات یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں
جس طرح گھونگھٹ الٹ دے کوئی بدصورت دلہن
آنسوؤں کی طرح یہ بکھرے ہوئے تاروں کی دوڑ
بہہ رہی ہو جیسے ٹکڑے ہو کے سورج کی کرن

اس اندھیرے میں نمایاں ہے یہ کیا اجلی سی شئے
جیسے چھوٹے ماہتابی سی ادھورے خواب میں
رات کو ٹوٹی ہوئی کشتی پہ اک مدھم چراغ
جھلملائے جا رہا ہو جس طرح سیلاب میں

خشک ہونٹوں پر ہو پھیکی مسکراہٹ جس طرح
بے بسی میں جس طرح آ جائے ماتھے پر شکن
کوئی مجبورِ مشیت تھرتھراتے ہاتھ سے
بیوتا بیٹھا ہو جیسے اپنے بیٹے کا کفن

جاگ جاتا ہو جو آنسو بن کے سعیِ ضبط میں
یہ نگاہوں کا وہ خوابیدہ اشارہ تو نہیں
جو بھٹکتا ہو زمیں پر آسماں سے ٹوٹ کر
پستیوں میں یہ وہ اک گمراہ تارا تو نہیں

مرمریں پیکر میں اس خوابِ حسیں کو ڈھال کر
کتنی نیندوں کے پریشاں خواب ہیں سوئے ہوئے
جن کی بے خوابی نے ڈھالا ہے اسے وہ خواب گر
جیسے اب بھی پھر رہے ہیں بوجھ سا ڈھوئے ہوئے

کتنے چہروں کا پسینہ کتنے ہاتھوں کا لہو
حسن دینے کے لئے اس کو ٹپک کر بہہ گیا
کتنی غم پروردہ آنکھوں نے گرایا خونِ دل
جب کہیں شاہ جہاں کا ایک آنسو رہ گیا

ایک ملکہ کی محبت کو عطا کرنے دوام
کتنی صبحیں پتھروں میں حسن بن کر رہ گئیں
کتنی راتیں موت کے طعنوں سے تھراتی رہیں
جب کہیں اک زندگی کی چند سانسیں بچ گئیں

اس حسیں دھوکے سے ہوتی تو ہے تسکینِ نظر
لیکن اے اہلِ نظر یہ حسن ہے غم میں اسیر
پتھروں کے قلب میں ٹوٹے ہوئے دل کو بھی دیکھ
چھین لے حدِ نظر سے اب تعیّن کی لکیر

اب بھی ہے تحسین طلب جبرِ بلندی کا غرور
یہ ہے جذباتی سکوں کا ایک خودبیں اہتمام
حسن یہ کتبہ ہے جس کے بے نوا الفاظ میں
موت دہراتی ہے مردوں کی پرستش کا پیام

کتنی نامعلوم قبروں میں ہیں وہ گم نام لوگ
جن کے ہاتھوں کی تھکن کا نام ہے یہ یادگار
نذر دیتے ہیں اسے اپنی جوانی کتنے پھول
دامنِ گلچیں میں ہے بے آبرو جن کی بہار

بے در و دیوار کتنے گھر ہیں ارضِ تاج پر
رات کی تاریکیوں میں کتنے گھر ہیں بے چراغ
کتنے ایسے ہیں جنھیں ڈستے ہیں مہتاب و نجوم
کتنے ایسے ہیں جو خود ہیں اپنے ہی سینے کے داغ

ایک ملکہ وہ کہ جس کی آخری خواہش کا نام
جنبشِ ابرو کا یہ فرمان یعنی تاج ہے
لیکن اپنی پہلی خواہش بھی جو کہہ سکتی نہیں
ایسی کتنی رانیوں کا جھونپڑوں میں راج ہے

ایک محبت وہ کہ جس کو نوجوانی بخش کر
ایک نے پایا سکوں اور سیکڑوں نے اضطراب
ایک محبت وہ کہ جس میں عشرتِ غم بھی نہیں
آہ مفلس کی محبت آہ مفلس کا شباب

اپنی ہی تخلیق میں ہے دفن روحِ حسن کار
کتنی سانسوں کے تموج کا ہے مدفن یہ مقام
کیا یہ بے حس مقبرہ دیتا ہے وہ عزمِ حیات
اپنی دھڑکن میں جگاتا ہے جسے قلبِ عوام

اس کے سنگ در پہ ہیں ماضی کے بوسوں کے نشاں
اپنی آنکھوں میں لئے پھرتی ہے جمنا جس کے خواب
اب اسی جمنا کی موجیں نوجواں ہو جائیں گی
پیکر جمہور میں جاگے گی روحِ انقلاب

آخری تارہ وہ ٹوٹا آسماں کی گود سے
پھر میں وہ تاج کا ہر اک کنارا گھل گیا
وہ کرن پھوٹی وہ صبحِ نو نے لیں انگڑائیاں
وہ بلندی پر شفق کا لال پرچم کھل گیا

جھک کے وہ سورج کی کرنوں نے دیا اذنِ خرام
ظلمتوں کو چیر کر نکلیں وہ موجیں نور کی
وہ تنے مضبوط سینے وہ اٹھے مضبوط ہاتھ
تاج پر وہ مسکرائی آرزو مزدور کی

——— میر محمد علیخاں میکش

شعرائے عثمانیہ :- سلسلہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں چھبیس شعرائے جامعہ عثمانیہ کے کلام کا پاکیزہ انتخاب درج ہے۔ یہ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستۂ رنگ و بو ہے۔ تقریباً بیس سال سے یہ جواہر پارے بکھرے پڑے تھے جن کو مولوی سید معین الدین صاحب قریشی ایم اے اور مولوی عبدالقیوم خاں باقی ایم اے (ریسرچ اسکالر) نے نہایت سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔

جدید اردو شاعری کے رجحانات کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ایک کمیاب اور کارآمد تحفہ ہے رائل سائز (۲۳۱) صفحات باتصویر قیمت مجلد عالی - سب رس کتاب گھر سے طلب فرمائیے۔

۱۲/

انقلاب

"انقلاب" میری تازہ ترین نظم ہے اور اسی لئے اس میں میرا ذہنی شعور اور انداز بیان پوری طرح واضح ہے اور اسی لئے مجھے یہ نظم پسند ہے ـــــــ"

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

ظلمتِ غم دب گئی ہے عقل کی تنویر میں
زخم دل ہے اب گرفتِ حکمت و تدبیر میں
"عالمِ نو" تھا ابھی تک "پردۂ تقدیر" میں
آج ہر پردہ اٹھاتا آ رہا ہے انقلاب

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

فکرِ ہستی خواہشِ تعمیرِ دوراں جاگ اٹھی
جاگ اٹھی ہاں کوششِ تخریبِ زنداں جاگ اٹھی
اہرمن ہے سر بہ زانو روحِ انساں جاگ اٹھی
روحِ انساں کو جگاتا آ رہا ہے انقلاب

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

روحِ خیر و شر نئی کروٹ بدلنے ہی کو ہے
پائے آگاہیٔ دلِ ہستی مچلنے ہی کو ہے
اب جلوسِ عزمِ آزادی نکلنے ہی کو ہے
راہ میں آنکھیں بچھاتا آ رہا ہے انقلاب

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

دورِ مشرق کے کہستانوں میں نظروں نے ادھر
عہدِ نو کی منتظر ہے لیلیٔ فتح و ظفر
زندگی نکلی ہے اب سر سے کفن کو باندھ کر
موت سے آنکھیں ملاتا آ رہا ہے انقلاب

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

راہ میں حائل اگر مجبوریاں ہو جائیں گی
نوجوانوں کی نگاہیں بجلیاں برسائیں گی
اور تلواروں کی جھنکاریں وہ نغمے گائیں گی
جن کو صدیوں سے سناتا آ رہا ہے انقلاب

اک نیا پرچم اڑاتا آ رہا ہے انقلاب

نظر حیدرآبادی

گزارش

"یہ نظم مجھے پسند ہے اس لئے کہ اس میں سچائی کی جھلکیاں ہیں۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں کو میں نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بڑی حد تک میں اس کوشش میں کامیاب بھی ہوا ہوں۔"

اے خدا دیکھ نہ مٹ جائیں کہیں رسم و رواج
ورنہ ہو جائے گا دنیا کا تخیل تاراج

آہِ مفلس کو کبھی عرش سے ٹکرانے نہ دے
توڑ دے حسبِ روایات غریبوں کے زجاج

دامنِ زیست سے لپٹی ہی رہے فکرِ معاش
عرش پاتا رہے معصوم دعاؤں کا خراج

پا نہ جائیں کہیں ہم لوگ حقیقت کا سراغ
ترے بندوں کو نہ ہو فرصتِ تکمیلِ فراغ

سینۂ سنگ سے ٹپکا کرے فرہاد کا خوں
اور پرویز کے ہاتھوں میں ہوں عشرت کے ایاغ

اے خدا گرم نہ ہونے دے جوانوں کا لہو
رسمِ تہذیب سے آزاد نہ ہو ان کا دماغ

خلد کے واسطے کیا چیز رہے گی باقی
گر یہاں جلنے لگیں عیش و مسرت کے چراغ

جہدِ انساں کا ہر انجام ہو سعیٔ ناکام
فکرِ روزی میں..... پِس سکتا ہی رہے قلبِ عوام

جنگ جاری ہی رہے عقل و جنوں میں پیہم
مصلحت کوش رہے سارے زمانہ کا نظام

خون ہوتا رہے انساں کی تمناؤں کا
عقل دیتی رہے ہر وقت تسلی کا پیام

اے خدا دیکھ مچلتا ہے جوانوں کا شباب
ان کے ہاتھ سے نہ گر جائیں کہیں چنگ و رباب

یوسف ناظم

اجنتا

"آج کل مجھے یہ نظم پسند ہے۔"

جہاں خونِ جگر پیتے رہے اہلِ ہنر برسوں　　جہاں گھلتا رہا رنگوں میں آہوں کا اثر برسوں
جہاں کھنچتا رہا پتھر پہ عکسِ خیر و شر برسوں　　جہاں قائم رہے گی جنتِ قلب و جگر برسوں

جہاں نغمے جنم لیتے ہیں رنگینی برستی ہے
دکن کی گود میں آباد وہ خوابوں کی بستی ہے

شراب و شعر کی تاثیر ہے ٹھنڈی ہواؤں میں　　بہارِ زندگی غلطاں ہے سبزہ کی اداؤں میں
نوائے سرمدی آتی ہے جھرنوں کی صداؤں میں　　بیاں ممکن نہیں وہ لطف آتا ہے دعاؤں میں

یہاں صدیوں سے رائج پر سکوں شیریں مقالی ہے
یہاں کا ذرہ ذرہ مظہرِ شانِ جمالی ہے

در و دیوار پر ہیں نقش حسن و عشق کی گھاتیں　　پیام زندگی دیتی ہیں شرمیلی ملاقاتیں
جوانی برسات کے دن جان لیوا چاندنی راتیں　　فضا میں گونجتی رہتی ہیں ہردم دلنشیں باتیں

یہاں پیری پہ ہو جاتا ہے دھوکا نوجوانی کا
سبق دیتا ہے ہر چہرہ حیاتِ جاودانی کا

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی　　تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خامۂ مانی
مشکل ہے شباب و حسن میں تخئیلِ انسانی　　تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوقِ عریانی

گلستانِ اجنتا پر جنوں کا راج ہے گویا
یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا

بہانہ مل گیا دستِ جنوں کو حسن کاری کا اثاثہ لوٹ ڈالا شوق میں فصلِ بہاری کا
چٹانوں پر بنایا نقش دل کی بیقراری کا سکھایا گر اسے جذبات کی آئینہ داری کا
دلِ کہسار میں محفوظ اپنی داستاں رکھ دی
جگر داروں نے بنیادِ جہانِ جاوداں رکھ دی

ہنرمندوں نے تصویروں میں گویا جان بھر دی ہے ترازو دل میں ہو جاتی ہے وہ کافر نظر دی ہے
اداؤں سے عیاں ہے لذتِ دردِ جگر دی ہے کھلیں گے راز اس ڈر سے دہن پر مہر کر دی ہے
یہ تصویریں بظاہر گو یونہی خاموش رہتی ہیں
مگر اہلِ نظر پوچھیں تو دل کے راز کہتی ہیں

کرشمہ ہے یہ سب اہلِ جنوں کی سعیِ پیہم کا جنھیں احساس تک باقی نہ تھا کچھ شادی و غم کا
دلوں پر عکس کھنچ آیا تھا جن کے حسنِ عالم کا قلم کو نقش از بر ہو گیا تھا اسمِ اعظم کا
چٹانوں پر شباب و حسن کی موجیں رواں کر دیں
فسوں کاروں نے رنگوں میں مقید بجلیاں کر دیں

جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر خوشامد اہلِ دولت کی نہیں کی نام کی خاطر
نہ چھانی خاک در در کی کسی انعام کی خاطر جیئے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے
رہیں گے نقش ان کے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

سکندر علی وجد

نتیجہ اردو امتحانات بابتہ ۱۹۴۵ء

امتحان اردو دانی

حسب ذیل امیدوار علی الترتیب
سب سے زیادہ نشانات حاصل کئے۔
۹۰ء۔ محمد عطاء الرحمن اول
(مرکز گلبرگہ) ۸۸ء۔ احمد اللہ غوری دوم
(مرکز بلدہ ذکور) ۸۶ء۔ محمد سلیمان سوم
(مرکز مومن آباد ومیج)

مرکز النده (ذکور)
(کامیاب)

محمد موسیٰ
محمد لیاقت علی مجاہد
محمد عبدالرحمن
محمد عبدالعزیز

مرکز النده (اناث)
(کامیاب)

لعل بی
امیر النساء بیگم
اختر فاطمہ بیگم
زبیدہ بیگم
زینب النساء بیگم
رابعہ بیگم
یسین بی
ماہرو بیگم
حشمت بیگم

مرکز اندوله (ذکور)
(کامیاب)

ستدنا
بھیم داؤ

محمد حسین
محمد عبدالرحمن فاروقی
سید محبوب عالم
دتاتری راؤ

مرکز بانسواڑہ (ذکور)
(کامیاب)

محمد عبدالرشید
حکم سیمکیا
ناگمل کاکڈل گرمیا
گرمیا
محمد تسلیم الدین احمد
سید احمد علی
راملو
محمد خواجہ
گرمنا
محمد شریعت
محمد عبدالرحمن
محمد جمال الدین
محمد امین الدین
خواجہ اباتاج الدین
سید مخدوم حسینی بادشاہ

مرکز بانسواڑہ (اناث)
(کامیاب)

ماجرہ بیگم
اشرف بی
امتیازی بیگم
وحید النساء بیگم
عابدہ بیگم
رابعہ بیگم

رضیہ بیگم
صفورا بیگم

مرکز قیصر آباد (ذکور)
(کامیاب)

بابا محی الدین
سرنیواس

مرکز بلدہ (اناث)
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

ہدایت بیگم
امیر النساء بیگم

(کامیاب)

نوجہاں بیگم
حفیظ النساء بیگم
حنیف النساء بیگم
خدیجہ بیگم
رضیہ بیگم
صغرا بیگم
ثریا سلطانہ
رقیہ بیگم
امتہ العزیز عرف سید القضاۃ بیگم
نیر النساء بیگم
امتہ العزیز
آمنہ بیگم
تہذیب النساء
ہاشم النساء بیگم

چاندنی بیگم
رحیم النساء بیگم
کلثوم بیگم
فاطمہ خاتون

مرکز بلدہ (ذکور)
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

احمد اللہ غوری

(کامیاب)

مقبول احمد
محمد جعفر
محمد عبدالحمید
میر غلام مرتضیٰ احمد
محمد قاسم
محمد عبدالرحمن
محمد عبدالعزیز
محمد رسول
قاسم علی
سید محی الدین احمد
لچھمی نارائن
سید عثمان علی

مرکز بلدہ زوج
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

سید رشید احمد
رگھوپتی
سید عبدالغنی
محمد ابراہیم

فصیح الدین
سید برہان الدین قادری
پرو شتم
مرزا محمود بیگ
معز الدین
عبدالنور احمد خاں
سید احمد خاں
سید محمد
عوض علی خاں

اے ، پی ، رسیزر
محمد ظہور الدین
عبدالرشید
سخاوت علی خاں
محمد یوسف فانی
قاری عبدالحسین
حبیب محمد
سید حامد جیلانی
شیخ جعفر
الماس
سلیمان
محمد
موتی سنگھ
شیخ احمد

(کامیاب)
بہرام خاں
گلاب خاں
محبوب خاں
محمد پہلوان
شرف الدین
شیخ محبوب

شرف الدین
شیخ حمید
بابو خاں
کرشنا سوامی
محمد یوسف
محمد امیر الدین
محمد عبدالجبار
سرور خاں
عبدالحکیم خاں
سید جبار
شیخ محمد
محمد سلیمان
مبارک علی
سید عبدالغنی
محمد فقیر
محمد یوسف
عبدالسلام
یوسف علی
محمد عمر
فقیر محمد
محبوب علی
عبدالنبی
ولی محمد
رام داس
عبدالجبار
خلیل الرحمن
سید یٰسین احمد
غلام دستگیر خاں
محمد افضل
محمود خاں

شاہ نواز خاں
عبداللطیف خاں
محمد یعقوب
فیاض الدین
عبدالحبیب
شیخ عبدالقادر
عبدالنبی
ابوالحسن
وہاب الدین خاں
محمد عمر
حفیظ الدین
محمد اسحق خاں
محمد اسمٰعیل
عبدالرزاق
بھوجنگ سنگھ
عبدالعظیم
محمد نظیر الدین
سلطان محمود خاں
عبدالقدیر
امیرداد خاں
راجہ رام
یعقوب خاں
محمد نظام الدین نمبر (۲)
عبداللطیف
سید روشن
محمد جہانگیر
محمد شرف الدین
عباس حسین
سید امین الدین
سید خواجہ معین الدین

محمد خواجہ
سید عبداللہ
شیخ ابراہیم
محمد یعقوب
محمد اسمٰعیل خاں
محمد اسمٰعیل
عبداللہ وعلی بانقیب
سید عبدالعزیز رفاعی
سالم باجبیر
شیخ احمد باحمید
سید محمد رفاعی
شیخ رحیم باجابر
سید حسن جیلانی
عبداللہ حماوی
مبارک بن یعقوب
علی باسلیم
سعید باعقیل
سید عبدالقادر العیدروس
محمد ایمانی
ابراہیم
عثمان
یوسف
بلال
احمد
سلیمان
فتح
محبوب
احمد
عبدالرزاق
لازر جان

محفوظ
عبد الحبیب
حسن
علوی
اسمٰعیل
احمد حسین
وزیر علی
محمد بادشاہ
محمد اکبر خاں
غلام محبوب
اسمٰعیل خاں

مرکز بلولی (ذکور)

(کامیاب)
محمد رضی الدین
خیرات حسین
محمد عبد القیوم
محمد غفور الدین
محمد افقار الدین
محمد رحمت اللہ
محمد اکبر علی
محمد عبد القادر
محمد معین الدین

مرکز بلولی (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
حمیدہ اختر بانو

مرکز بمبئی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)

اشٹدبکھا
جہان محمد
(کامیاب)
احمد
پربھاکر
پرشوتم
پیر محمد
جعفر حسین
دوارکاداس
رام دیو پانڈے
سری کرشن
شوکت علی
صغیر حسین
عبد الحلیم
گوبند رام
محمد شوکت
محمد عثمان
محمد یوسف
وٹھل
ہربنس رائے

مرکز پرلی (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
سید جعفر
ولی خاں
(کامیاب)
شیخ حسین
مرزا غلام دستگیر
قاضی محمد عبد الوہاب صدیقی
روشیندر

الطاف حسین
تکارام
شیخ محمود
محمد حسام الدین
نارائن

مرکز پرلی (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
شریفہ بی
رحیمہ بیگم
ریحانہ بیگم صدیقی
(کامیاب)
بسم اللہ بی
الفت بی
میمونہ بی
خواجہ بی

مرکز ٹاکلی جاگیر (ذکور)

(کامیاب)
عبد الرحمٰن

مرکز ٹاکلی جاگیر (اناث)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
خیر النساء بیگم
خورشید بیگم
(کامیاب)
گمانی بیگم
صغری بیگم
التمن بیگم
جمیلہ بیگم

وحید النساء بیگم
محمودہ بیگم
مقبول بیگم
ہاجرہ بیگم
زیتون بیگم
زبیدہ بیگم
شہزادی دلہا بیگم
چاند بی
گلاب بی
رابعہ بیگم
محمودہ بیگم
زہرہ بیگم

مرکز جگتیال (ذکور)

(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
محمد وزیر
احمد علی
محمد عابد حسین
محمد اعظم
غلام دستگیر
محمد خدا بخش
محمد عظمت اللہ
محمد نظام الدین
مشرف حسین
مرزا رحیم بیگ
محمد احسن الدین اختر
خیرات علی
(کامیاب)
عبد الرزاق
شیخ فرید
محمد حنیف
محمد انور علی

محمد عباس
میراں محی الدین
شیخ امام
عبدالحفیظ خاں
ولی محمد
نذیر احمد
محمد علیم الدین
عبداللطیف خاں
سید احمد
عظیم الدین
محمد ظہور الدین
محمد غوث
عبدالغفار
احمد علی
محمد عزیز الدین
محمد ابراہیم
محمد سردار علی
محمد نصیر الدین
محمد عبدالقدوس
محمد حمید الحق
محمد خواجہ معین الدین خاں
محمد ابراہیم

مرکز جگتیال (اناث)
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
امۃ الغنی
رفیق النساء بیگم

مرکز دوم کنڈہ (ذکور)
(کامیاب)
بھوپال ریڈی

مرکز کوڑنگل (ذکور)
(کامیاب)
محمد عبدالغفور

مرکز کوڑنگل (اناث)
(کامیاب)
ساجدہ بیگم
رؤفہ بیگم
صفیہ بیگم
حلیمہ بیگم
فاطمہ بیگم

مرکز گدوال (ذکور)
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
مرزا احمد بیگ
محمد عطاء الرحمن
(کامیاب)
محمد بدر حسن
محبوب علی
مرزا احمد بیگ

مرکز گدوال (اناث)
(کامیاب)
مہر النساء
خورشید بیگم
حبیب النساء بیگم
فاطمہ بی بی
ممتاز خاتون
زاہدہ خاتون
خیر النساء بیگم

زبیدہ مریم

مرکز منچلے گاؤں (ذکور)
(کامیاب)
محمد اسحق الدین
شیخ محبوب
یوسف الدین

مرکز منچلے گاؤں (اناث)
(کامیاب)
مہر النساء بیگم

مرکز مومن آباد (فی)
(کامیاب بدرجۂ امتیاز)
میر محمد علی
شیخ محمد حسین
محمد سلیمان
(کامیاب)
عباس علی خاں
داؤد خاں
سید پادشاہ حسینی
عنایت خاں
عبداللہ بن سلیمان
ذوالفقار علی خاں
عثمان خان
سید رسول
شیخ عثمان
زاہد علی خاں
سید چاند
الماس بن حسن

مرکز ناگر کرنول (ذکور)
(کامیاب)
گنڈال بل سوامی
محمد ضمیر الدین
محمد ظہیر الدین
خواجہ کمال الدین

مرکز ناگر کرنول (اناث)
(کامیاب)
اسماء بیگم
یادالنساء بیگم
رحیم النساء بیگم
سعیدالنساء بیگم
خیر النساء بیگم
محبوب بی
احمد بی
حبیب النساء
بلقیس بانو

مرکز نظام آباد (ذکور)
(کامیاب)
بی وینکٹ رمنا
بی گنگا رام
لچھمن
مادنا
احمد علی خاں

مرکز نظام آباد (اناث)
کامیاب
حلیم النساء بیگم
امیر فاطمہ
خدیجہ بیگم
شہزادی بیگم
حنیفہ بی
لچھمن بائی
سکوتا بائی
شنکروتی بائی

نتیجہ امتحان اردو زباندانی

ناموں کی ترتیب بلحاظ نمبر مسلسل
۲۰۰ - عابد شریف (بلدہ فوج) اول
۱۸۸ - سید صادق (بلدہ) اول
۲۹۲ - جمال النساء بیگم (مالی کلیہ) اول
ناموں کی ترتیب بلحاظ سلسلہ نمبر

مرکز نلگنڈہ

۶ - امتیاز الدین سوم
۷ - محمد عبد الرزاق سوم
۹ - خورشید بیگم سوم
۱۰ - سیدہ حمیدہ بیگم دوم
۱۱ - عابدہ بیگم سوم
۱۸ - خورشید بیگم دوم

مرکز احمد نگر

۲۵ - محمد محبوب علی سوم
۲۷ - پتلی بیگم دوم
۲۸ - زیب النساء بیگم دوم
۲۹ - قمر النساء بیگم سوم
۳۱ - ذکریا خاتون سوم
۳۳ - صالحہ بیگم سوم
۳۴ - اختر النساء بیگم دوم
۶۴ - نور النساء بیگم سوم
۲۱ - محی الدین بی [illegible]

مرکز بشیر آباد

۳۹ - سید سعید الدین احمد سوم
۳۷ - محمد عظیم الدین سوم
۴۴ - رحیم النساء بیگم دوم
۴۵ - رحمت بانو سوم
۴۶ - اختر النساء بیگم دوم
۴۷ - لیاقت النساء بیگم سوم

۴۸ - شاہ جہاں بیگم دوم
۴۹ - ممتاز جہاں بیگم سوم
۵۰ - شان خاتون سوم
۵۲ - اختر جہاں بیگم سوم
۵۳ - نور جہاں بیگم سوم
۵۴ - اصغری بیگم سوم
۵۵ - امۃ اللہ بیگم دوم
۵۶ - بلقیس بیگم سوم
۵۷ - سکینہ بیگم سوم
۵۸ - چاند بیگم سوم
۵۹ - محمود النساء بیگم سوم
۶۰ - بشیر النساء بیگم سوم
۶۱ - لطیف النساء بیگم دوم
۶۲ - داور بیگم سوم
۶۳ - خیر النساء بیگم سوم
۶۴ - احمدی بیگم سوم

مرکز بلدہ (اناث)

۷۱ - خورشید بانو سوم
۷۲ - جمیل النساء بیگم سوم
۲۰ - بشیر النساء بیگم سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۷۵ - حفیظ الدین سوم
۷۹ - یٰسین خاں سوم
۸۰ - ملہار راؤ دوم
۸۳ - محمد جمال الدین دوم
۸۴ - نارائن راؤ پاپا راؤ دوم
۸۶ - میر اعظم علیخاں دوم
۸۷ - میر معظم علیخاں دوم
۸۸ - محمد سعد اللہ سوم
۸۹ - محمد عثمان علی سوم

۹۰ - میر محسن علی موسوی دوم
۹۱ - محمد خواجہ دوم
۹۳ - گوری شنکر سوم
۹۴ - حیدر علی دوم
۹۵ - غلام مصطفیٰ دوم

مرکز بلدہ (فوج)

۹۶ - ابوبکر بن علی اول
۹۷ - مرزا محمد بیگ دوم
۹۸ - محمد حمید الدین دوم
۹۹ - شیخ بڈھن اول
۱۰۱ - گرویا سوم
۱۰۴ - مرزا شناء اللہ بیگ دوم
۱۰۵ - شوکت علی دوم
۱۰۷ - سید عبد القیوم دوم
۱۰۸ - شیخ احمد دوم
۱۰۹ - محمد صدیق سوم
۱۱۰ - رنگا ریڈی دوم
۱۱۱ - سید صابر حسین دوم
۱۱۲ - سید خواجہ معین الدین دوم
۱۱۳ - محمد بشیر الدین دوم
۱۱۴ - محمد حنیف دوم
۱۱۵ - محمد احمد علی دوم
۱۱۶ - حبیب بیگ دوم
۱۱۹ - محمد جان دوم
۱۲۲ - نور محمد دوم
۱۲۶ - محمد حبیب دوم
۱۲۷ - مرزا اسمٰعیل بیگ دوم
۱۲۸ - محمد یوسف شریف دوم
۱۲۹ - مرزا ذوالفقار علی بیگ دوم
۱۳۰ - خواجہ احمد دوم

۱۳۱ - سید عبد الحسین شاہ قادری دوم
۱۳۲ - محمد حسین خاں سوم
۱۳۳ - محمد صدیق دوم
۱۳۴ - احمد منظور الدین اول
۱۳۵ - صالح بن سالم دوم
۱۳۶ - غلام رسول دوم
۱۳۷ - محمد عبد الحی سوم
۱۳۸ - محمد پاشاہ سوم
۱۴۰ - محمد قمر الدین دوم
۱۴۱ - اختر عمر اول
۱۴۲ - تراب علی خاں دوم
۱۴۴ - محمد موسیٰ خاں اول
۱۴۵ - تاتار خاں دوم
۱۴۶ - محمد حسام الدین دوم
۱۴۸ - یوسف الدین دوم
۱۴۹ - عبد الحمید خاں دوم
۱۵۰ - محمد جعفر دوم
۱۵۳ - محمد عنایت اللہ دوم
۱۵۴ - شیخ محبوب دوم
۱۵۶ - سید نظام الدین دوم
۱۵۷ - سید شوکت علی اول
۱۵۸ - سید صادق اول
۱۵۹ - حیات اللہ خاں دوم
۱۶۱ - سید مظہر حسین دوم
۱۶۳ - مصطفیٰ خاں دوم
۱۶۷ - میر ارشد علی دوم
۱۶۸ - محمد مہتاب علی اول
۱۷۱ - سید محمد عبد القیوم شاہ قادری دوم
۱۷۲ - معین الدین دوم
۱۷۳ - میاں خاں دوم

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
[illegible]	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر)	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے	۴۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عمادالملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۱۰	۰
مہ لقا	۰۰	۱	۰	۰
لی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۰	۸	۰
فیق اردو داں	۲۲۴	۰	۱۲	۰
شوق	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۱۰	۰
یاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصم	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر	۸۰	۰	۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲[illegible]	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
[illegible]	۲۴	۰	۴	۰
[illegible]	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سفر ۱۹۴۲ء مبئی	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصرالدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

آکٹوبر ۱۹۵۸ع

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۲۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸ر

سب رس

جلد ۸ | بابت ماہ اکتوبر ۱۹۴۵ء | شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

۱ ــــ عہدی افادی ــــ محمد احسان اللہ بی اے (عثمانیہ) ــــ ۲
۲ ــــ افکارات ــــ (غزل) ــــ عظیم حیدرآبادی (عثمانیہ) ــــ ۸
۳ ــــ انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا ــــ محمد عبدالجبار فاروقی ــــ ۹
۴ ــــ رادھا ــــ (افسانہ) ــــ محمد عزیز الرحمٰن (عثمانیہ) ــــ ۱۲
۵ ــــ ہماری کتابیں ــــ وحدی الحسینی (بھوپال) ــــ ۱۴
۶ ــــ وجہی کی سب رس ــــ زینت ساجدہ بی اے (عثمانیہ) ــــ ۱۷
۷ ــــ شاعر امرء القیس ــــ قدسیہ منشی فاضل ــــ ۲۰
۸ ــــ گاؤں کی شام ــــ (نظم) ــــ اشعر ملیح آبادی ــــ ۲۳
۹ ــــ فریاد ــــ (") ــــ جبریل ــــ (جبل پور) ــــ ۲۴
۱۰ ــــ اردو زبان کا تشکیلی دور ــــ پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی، صدر شعبۂ اردو، فارسی، عربی جامعہ میسور ــــ ۲۵
۱۱ ــــ چرواہے ــــ (نظم) ــــ احمد ندیم قاسمی بی اے ــــ ۳۰
۱۲ ــــ سپنا ــــ (افسانہ) ــــ جہاں بانو بیگم ایم اے ــــ ۳۱
۱۳ ــــ نوید امن ــــ (نظم) ــــ مظفر الدین ظفر بی اے (عثمانیہ) ــــ ۳۲
۱۴ ــــ ایثار ــــ (افسانہ) ــــ منیزہ کاؤس جی ــــ ۳۴
۱۵ ــــ نئی کتابیں ــــ نواب مرزا سیف علی خاں ــــ ۳۷
۱۶ ــــ تنقید و تبصرہ ــــ " ق " ــــ ۳۸

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے عہد آفریں برقی پریس میں چھپکر خیریت آباد سے شائع ہوا

مہدی افادی

مہدی حسن کا ذکر حلقۂ ادب میں اب بھی کبھی کبھی آتا ہے۔ عوام شاید ان کے نام سے ناواقف ہوں اور ان میں اب کوئی جاذبیت نہ محسوس کرتے ہوں مگر ادب کے طالب علم کے لیئے ان کی ذات اور ان کے مختصر مگر قیمتی رشحاتِ قلم کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ مہدی حسن بھلائے جانے کے لائق نہیں۔ ان کی ہستی دنیائے اردو ادب کے لئے باعثِ افتخار تھی۔ ان کے عہد کے تمام اہلِ قلم ان کی ذہانت طباعی اور خوش اسلوبی کے مداح تھے۔ شبلی کے سے نقاد نے ان کے ایک مضمون کو دیکھ کر کہا تھا "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے نصیب ہوتے"۔ اگر اس تعریفی جملے میں خلوص و مروت کا رنگ بے لاگ رائے پر غالب بھی ہو تو حقیقت سے یہ تعریف یکسر معرا نہیں۔

مہدی حسن کو مرے ہوئے صرف چوبیس سال ہوتے ہیں۔ کتنا کم عرصہ ہوا! لیکن ان کا نام کتنا کم سنائی دیتا ہے۔ جب تک مجھے ان کی مختصر حیات کے مطالعے کا موقع نہ ملا خود میں ان کو ساٹھ، ستر سال پہلے کا ادیب سمجھتا تھا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ مہدی حسن کی زندگی، غیر معمولی واقعات و حادثات اور جاذب نظر وقائع سے خالی ہے۔ شاید اکثر حضرات کو یہ خشک اور بالکل غیر دلچسپ معلوم ہو۔ مگر حقیقت یوں نہیں۔ ان کی ذات اور طبیعت کے بعض گوشے مطالعے کے لائق ہیں نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ دلچسپ ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا گہرا اثر ان کی طرز تحریر پر پڑا۔ یہ بات کسی معمولی ادیب میں نظر نہیں آتی!

صحیح تاریخ ولادت کا پتہ نہ چل سکا مگر اغلب ہے کہ ۱۸۶۸ء یا اس کی قریب کی تاریخ میں پیدا ہوئے۔ گورکھپور کے ایک شریف اور خوش حال خاندان کے فرد تھے۔ والد سے خودداری، دیانت داری اور شرافت نفسی جیسی عمدہ خصلتیں ورثہ میں ملیں۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ عربی و فارسی میں کامل استعداد بہم پہنچائی تھی مگر باقاعدہ انگریزی تعلیم سے محروم رہے۔ کچھ دن گھر پر انگریزی پڑھی اور کچھ دن علی گڑھ میں گزارے۔

بچپن سے اردو ادب کے شائق اور دلدادہ تھے۔ اچھی نظمیں یاد کرنے اور اعلیٰ ادبی کتابیں پڑھنے سے ازحد مسرت محسوس کرتے۔ "تہذیب الاخلاق" بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے اور کہتے "مجھے اسی تہذیب الاخلاق نے آدمی بنایا"۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے سے بھی خاصا شغف تھا جو کچھ لکھتے نپا تلا اور اعتبار سے لکھتے یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ایک دو مضامین ہی سے ارباب ذوق میں چمک گئے۔ بیس اکیس سال کی عمر میں سلسلۂ ملازمت میں منسلک ہوگئے۔ مختلف عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے آخرکار نائب تحصیل دار ہوئے۔ سرکاری ملازمت سے مہدی حسن چاہے معاشی اعتبار سے خوش حال کیوں نہ رہے ہوں لیکن ان کی ادبی زندگی اسی وجہ سے نامکمل رہی۔ سرکاری ملازمت کے قیود ایک طرف اور دور دراز مقامات کا سفر علمی مراکز سے دوری اور اطمینان و یکسوئی کا فقدان دوسری طرف ان کے ادبی نشو و نما میں ہمیشہ مانع رہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق تو کبھی کم نہ ہوا لیکن پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ کتب بینی روز کے معمول میں داخل تھی۔ کوئی نئی کتاب نہ ملے تو اپنی مختصر لائبریری سے کوئی پڑھی ہوئی کتاب ہی نکال کر ورق گردانی شروع کر دیتے۔

مہدی حسن کی سی باقاعدہ ضبط و نظم کی زندگی بہت کم لوگوں کو بسر کرتے دیکھا گیا ہے۔ ہر کام کا ان کے پاس وقت مقرر تھا۔ سونا، اٹھنا، پڑھنا، دوستوں کو خط لکھنا ہر چیز اپنے وقت پر ہوتی اور ان کے پروگرام میں بہت کم بے ربطی کی صورت پیدا ہوتی کتابیں پڑھنے اور مضامین لکھنے کے بعد خط لکھنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ خط کا جواب نہ دینا ان کے نزدیک اخلاقی جرم تھا۔ دوستوں اور احباب کو خط باقاعدہ لکھتے اور جواب بھی

بغیر تاخیر کے روانہ کرتے علمی مذاق رکھنے والوں سے بہت دلچسپی تھی۔ حلقۂ احباب میں تمام تر یا علم اور اہل ذوق حضرات تھے۔ شبلی اور ماجد ان کے عزیز ترین دوست ہیں۔ مہدی حسن کی طبیعت کی ایک دلچسپ خصوصیت ان کی نفاست پسندی تھی۔ نفاست پسندی کا عنصر چاہے گھر کی کسی چیز میں ہو لباس کی تراش خراش میں ہو کھانے پینے میں ہو، تحریر یا تقریر میں ہو، ان کو بہت مرغوب تھا۔ بے ربط تحریر اور ضبط و نظم سے آزاد زندگی دونوں سے وہ متنفر تھے۔

انتقال کے وقت عمر چالیس سے زیادہ اور پچاس سے کم تھی۔ اس عمر میں مرنے والا جواں مرگ کہلانے کا مستحق تو نہیں لیکن مہدی حسن کی ادبی زندگی ضرور مختصر تھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا بدقت تمام فرصت کے تنگ لمحوں میں لکھا۔ ان کی طبیعت کے جوہر کبھی ان کی مختصر تحریروں میں پوری طرح جلوہ گر نہ ہو سکے۔ مگر ان کے نکھرے ہوئے اسلوب اور بے مثال طرز انشاء کی جو جھلکیاں ان کے مختصر مضامین کے دامن میں ملتی ہیں اہل نظر کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دل انھیں دیکھ کر یک لخت افسردہ ہو جاتا ہے کہ اردو کا ایک نوخیز ادیب اپنے دور نشو و نما ہی میں ہم سے رخصت ہو گیا۔ عمر بھر وہ کسی مستقل ادبی تصنیف یا مسلسل و مربوط ادبی تحریر کے خیال کو کثرت کار کی وجہ سے ٹالتے رہے۔ مرنے سے کچھ دن پہلے ان کا ارادہ پختہ ہو گیا تھا کہ سرکاری ملازمت سے پیچھا چھوٹتے ہی وہ اپنے آپ کو علم و ادب کے لئے وقف کر دیں گے۔ مگر انھیں کیا معلوم تھا کہ انھیں جلدی اس عالم آب و گل سے انھیں کوچ کرنا ہے۔ ان کی فطری اپج اور طبعی ذہانت جو صرف انہی کا حصہ تھی اور اردو ادب کے لئے ایک نعمت بے بہا سے کم نہ تھی پھر کسی اور میں دیکھنے میں نہ آئی — ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

مہدی حسن کا تمام سرمایۂ عمر ایک مجموعۂ مضامین اور ان کے مکتوبات کا ایک مجموعہ ہے۔ جن کو ان کے انتقال کے بعد ان کی غمزدہ بیوی نے بڑی محنت سے مرتب کیا۔ مضامین کا مجموعہ "افاداتِ مہدی" کے نام سے غالباً سب سے پہلے ۱۹۲۳ء میں معارف پریس اعظم گڑھ سے چھپا تھا۔ اس کے بعد اسی مطبع سے دو تین بار اور چھپا۔ اس مجموعے میں عبدالماجد کا دیباچہ اور ایک مختصر مضمون بھی شامل ہے جو مہدی حسن کی وفات پر ہمدم (لکھنؤ) میں چھپا تھا۔ دیباچہ کے بعد مہدی حسن کی زندگی کا ایک مختصر خاکہ "ان کی یاد" کے عنوان سے مہدی بیگم نے لکھا ہے۔ ظاہر ہے اس مجموعہ میں جتنے مضامین شامل ہیں انھیں مہدی حسن نے اس خیال سے کبھی نہیں لکھا تھا کہ ان کو کتابی شکل میں جمع کرنا ہے۔ یہ مضامین مختلف ادبی تحریکات، ادبی بحثوں، نئی کتابوں پر تبصروں، کچھ مختصر تراجم اور کچھ ادب لطیف کے ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔ مضامین کا باضابطہ سلسلہ ۱۸۹۹ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۹ء میں ختم ہوتا ہے۔ صرف ایک مختصر مضمون "حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر" ۱۸۹۰ء کا لکھا ہوا ہے۔ یہ مضامین ملک کے مختلف رسالوں اور اخباروں مثلاً "البشیر، مخزن، نقاد، معارف، مشرق" وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔ مضامین کی کل تعداد تیس ہے جن میں بعض بہت مختصر اور بعض طویل ہیں۔

انیسویں صدی کا عشرۂ آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول ہندوستانی تمدن اور ادب دونوں کے لئے ایک عبوری دور تھا۔ انیسویں صدی کے آخر سے ہندوستان کی معاشرت اور ادب دونوں نے مغرب کا گہرا رنگ قبول کرنا شروع کیا تھا۔ سر سید احمد خاں کی تحریک بیداری مسلمانوں کی معاشی اور معاشرتی ترقی کے لئے ایسا ہی اہم بالشان واقعہ ہے جیسا حالی کی قدیم طرز شعر کی مخالفت اور نئے طرز کی بنیاد اردو شاعری کے لئے ایک

یادگار تغیر ہے۔ اسی زمانے میں نثر پر زیادہ توجہ کی گئی۔ اردو میں تنقید کو پہلی بار متعارف کیا گیا۔ فرسودہ موضوعات خافوق اور مافوق الفطری دیووں اور پریوں کے قصے الف سے اردو ادب نے بیزاری کا اظہار کیا۔ ٹھوس علمی و ادبی مضامین، کتابیں اور تاریخی ناول لکھے جانے لگے۔ نذیر احمد، شبلی، حالی، سرسید اور ان کے رفقائے کار کا اس دور کے ادب کی تعمیر میں بڑا حصہ رہا ہے۔ اردو ادب کا یہی تعمیری دور مہدی حسن کے مضامین کا زمانہ ہے۔ ان کو تاریخ، فلسفہ اور تنقید سے از حد دلچسپی تھی۔ ادب کے دلدادہ اور خصوصاً اردو ادب کے بڑے شائق تھے۔ ان کے مضامین اس بات کے شاہد ہیں کہ وہ اردو ادب میں ٹھوس علمی مواد فراہم کرنے کے لئے اپنی جانب سے ہر ممکنہ کوشش کرنے تیار تھے۔ خود بھی فرصت کے اوقات میں لکھتے تھے اور دوسرے اچھے لکھنے والوں کو لکھنے پر اکساتے تھے۔

مہدی حسن کے مضامین کو بآسانی تین شقوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) ایسے مضامین جو دراصل اپنے وقت کے رسالوں یا کتابوں پر تبصرے ہیں یا جن میں کسی وقتی ادبی تحریک پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے (۲) علامہ شبلی کی علمیت، ان کی تصانیف سے متعلق مضامین (۳) خالص علمی اور ادبی مضامین

مہدی حسن اپنے وقت کی ادبی تحریکات اور تصانیف سے بہت باخبر رہتے تھے۔ ملک کے مقتدر ادبی رسالے ان کے زیر نگاہ ہوتے اور ان کی ادبی بحثوں میں یہ بڑے شوق سے حصہ لیتے۔ "تمدن عرب" پر کسی نے سخت تنقید کی تھی اور اس کے مصنف پر چند الزامات عائد کئے تھے اس کے جواب میں ایک مضمون "تمدن عرب پر ایک علمی چٹھی" کے عنوان سے لکھا جس میں تفصیل سے کتاب کی خوبیاں گنائیں اور کتاب کے نفس مضمون اور ترجمے کے اسلوب دونوں پر وسعت نظر سے بے لاگ رائے دی۔ یہ مضمون تمدن عرب کا ایک مجمل تبصرہ کہلایا جاسکتا ہے۔ اسی قبیل کے دوسرے مضامین میں "ایک خط" "البیان" "ادارۂ ادبیہ" "نظام الملک طوسی" وغیرہ شامل ہیں۔

مولوی اسلم جے راجپوری نے "شعر العجم" پر چند اعتراضات کئے تھے اس کے جواب میں "شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر" کے عنوان سے ایک طویل مضمون لکھا جس میں نمبروار ہر اعتراض لکھ کر اس کا تشفی بخش جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

ان مضامین میں مہدی حسن نے اردو زبان اور ادب کی مقبولیت اور وسعت کے لئے جگہ جگہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت اردو صحافت کی ترقی پر بار بار زور دیا ہے۔ "البیان" اور "معارف" کی حمایت میں مضامین لکھے اور اردو داں پبلک سے بہ اصرار درخواست کی کہ یہ اور اس طرح کے علمی و ادبی رسالوں کی حمایت ان کے اہم فرائض میں داخل ہے۔

شبلی اور ان کی تصانیف سے مہدی حسن کو دلچسپی نہیں عشق تھا۔ منجملہ تیس مضامین کے کوئی دس کے قریب مضامین شبلی اور ان کی تصانیف پر لکھے گئے ہیں۔ علاوہ بریں دوسرے مضامین میں جہاں جہاں موقع آیا ان کے قلم نے شبلی کی مدح سرائی میں کبھی کوتاہی نہ کی۔ دراصل مہدی حسن کو تاریخ اور خصوصاً فلسفۂ تاریخ اور تاریخ اسلام سے از حد دلچسپی تھی۔ شبلی ہی وہ شخص تھے جنھوں نے اردو میں پہلی بار ان موضوعات پر تحقیق و تدقیق سے قلم اٹھایا اور بیش بہا کتابیں......... پیش کیں مہدی حسن کی شبلی پرستی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اردو میں خالص علمی لٹریچر دیکھنا چاہتے تھے۔ ملک کے پست مذاق طبقے سے تو کوئی امید نہ تھی البتہ جو اس کے اہل ہیں ان سے طالب تھے کہ وہ کچھ لکھیں۔ ہم عصر مصنفین میں سرسید، حالی اور شبلی ہی وہ حضرات تھے جو خلوص اور محنت سے اردو میں علمی مواد فراہم کر رہے تھے۔ شبلی کی شعر العجم" اور "موازنۂ انیس و دبیر" جیسی تنقیدی کتابیں اردو کے لئے بالکل نئی تھیں

اور مہدی حسن ایسی کتابوں کے بڑے شائق تھے۔ ان وجوہ کے علاوہ شبلی کو چاہنے کی ایک اور وجہ ان کے ذاتی خوشگوار تعلقات بھی تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہ کمال مروت پیش آتے اور ہمیشہ خلوص و محبت کا اظہار کرتے۔

"تمدن عرب اور پروفیسر شبلی"، "علامۂ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ"، "آدھ گھنٹہ علامہ شبلی کے ساتھ"، "شعر العجم پر ایک فلسفیانہ نظر"، "شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی" وغیرہ ان کے چند دلچسپ مضامین ہیں جن میں انھوں نے شبلی کی تحریر اور ان کی زندگی پر بہ حیثیت عالم، مورخ، محقق، سوانح نگار اور نقاد روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مہدی حسن کی شبلی سے والہانہ دلچسپی اور محبت کی وجہ سے شبلی اور ان کی تصانیف سے متعلق بے لاگ تنقید کی امید رکھنا درست نہیں۔ مگر پھر بھی جو کچھ انھوں نے لکھا ہے دلچسپ اور دلکش لکھا ہے کہیں کہیں دلائل و براہین سے تبصرے کا رنگ بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شبلی کی جو بھی کتاب چھپ جاتی یہ اس پر مضمون لکھتے۔ جہاں کسی نے شبلی پر اعتراض کیا یہ اس کا منہ توڑ جواب دینے تیار ہو جاتے۔ گو مہدی حسن نے اکثر جگہ "شبلی پرستی" کی دھن میں تقریظ و تنقید کے جادۂ اعتدال سے انحراف کیا لیکن اپنے ایک مضمون "حالی اور شبلی کی معاصرانہ چشمک" میں تعجب ہوتا ہے کہ انھوں نے انتہائی سلامت روی کا ثبوت دیا ہے ہی نہیں بلکہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ انتہائی فیاضی سے شبلی کی بعض فروگزاشتوں کا اعتراف بھی کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "یہ غور طلب ہے کہ غالب کی طرح شبلی کی افراط خودداری بھی معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں ہے۔ شبلی نے "الکلام" لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حالانکہ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے دور جدید میں مذہب کو معقولات عصریہ سے تطبیق دینے کی کوشش کی۔"

مہدی حسن کے مضامین کا اہم ترین حصہ ان کے علمی و ادبی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر ادبی موضوع یا معاشری اور تاریخی مباحث پر قلم اٹھایا ہے۔ "حکمائے یونان پر ایک سرسری نظر" مختصر مگر دلچسپ ہے۔ "بیسویں صدی کا آغاز اور دماغی صحت مجیر فانیوں سے" اور "ترکوں کی معاشرت" معلومات آفریں مضامین ہیں۔ مہدی حسن شبلی کی مکمل تقلید کرنا چاہتے تھے۔ گو خود کو کبھی تحقیقی مضامین لکھنے کا موقع نہ ملا لیکن رجحان ادھر ہی تھا۔ فلسفہ تاریخ اور تاریخ اسلام کے متعلق جو کچھ بھی جانتے تھے اکثر اس کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتے رہتے تھے۔ جرمن مستشرق وان کریمر کی "تاریخ اسلام" کا اردو میں ترجمہ شروع کیا تھا جس کے کچھ اجزا "مخزن" میں "افادات وان کریمر" کے نام سے شائع کئے تھے لیکن عدیم الفرصتی کی بناء پر اس کی تکمیل سے بھی قاصر رہے۔

مرحوم کو ادب اور تنقید سے غایت دلچسپی تھی۔ اردو میں تنقید عالیہ پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن انھیں اس کا بھی احساس تھا کہ اردو میں اعلیٰ پایہ کی تصانیف کی بہت کمی ہے۔ "ارتقائے ادب اردو" "اردو لٹریچر کا نقش واپسیں" "مشرق اور انشاء پردازی کا دور جدید" ان کے اعلیٰ ادبی مذاق اور شستہ خیالات کے گواہ ہیں۔ ادب پر ان کی نگاہ بڑی اونچی تھی۔ ملک میں سستے لٹریچر کے شائع ہونے کے بہت شاکی تھے۔ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں "ہمارے ہاں دو چار معزز مستثنیات کے سوا عموماً اہل قلم صحیح قوت فیصلہ نہیں رکھتے یعنی اپنی استعداد کا صحیح مصرف نہیں جانتے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی پیداوار دماغی بلحاظ اوصاف و مقدار عموماً دوم درجہ کی ہوتی ہے" ـــــ یہ مستقل مصنفین کی حالت ہے صحافت یعنی مضمون نگاری اس سے گئی گزری ہے۔ غیر ذمہ دار لٹریچر کی ایک مقدار کثیر ہے جو جرائد عصریہ کے ہاتھوں ملک میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

اور چونکہ لکھنے والے کسی موضوع پر تیار نہیں ہوتے یعنی قلم اٹھانے سے پہلے پڑھتے نہیں ہیں اس لئے ان کے خیالات و مقالات کا زیادہ تر حصہ سطحی ہوتا ہے [illegible] علوم کہ جس پرچے کو دیکھئے نذر بے قدری ہو رہا ہے۔"

"اردو لٹریچر کے عناصر خمسہ" والے مضمون [illegible] سید، آزاد، شبلی، حالی اور نذیر احمد کے کارناموں پر صحیح اصول تنقید سے روشنی ڈالنے کا ملک کے اہل قلم حضرات سے مطالبہ کیا ہے تاکہ اردو میں جو کچھ قیمتی لٹریچر ملتا ہے اس پر تنقید عالیہ کا حق ادا ہو جائے۔

مہدی حسن جب کسی بات کو کہنا چاہتے تو انتہائی بے باکی اور بغیر کسی جھجک کے کہتے، یہ ان کی طبیعت کا خاص پہلو تھا گو اس کی وجہ سے انھیں مخالفتیں بھی مول لینی پڑیں۔ نذیر احمد سے انھیں شکایت تھی کہ وہ اپنی استعداد کے مطابق کام نہیں کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ نذیر احمد کی وسیع علمیت اور قابلیت کا غلط استعمال ہے جو لکچروں کی شکل میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ نذیر احمد کو انھوں نے اپنے ایک مضمون "نذیر احمد اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے ذریعے بہ کمال اصرار ایک قاموس الاسلام لکھنے کی طرف متوجہ کیا تھا۔ انجمن ترقی اردو سے اس شکایت کی بنا پر کہ وہ کوئی ٹھوس علمی کام کو انجام نہیں دے رہی ہے اسے کھلے الفاظ میں اپنے فرض کی کوتاہی کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ "انجمن ترقی اردو سے چنداں امید نہیں، لایق سکریٹری ہر سال چند بے غایت رسائل کو فرض کفایہ سمجھتے ہیں لیکن اس قسم کی بے اصولی اور خودرو اشاعت سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی، نہیں جانتا کس وقت تک کوئی لائق ذکر کام کیا گیا۔" خود مولوی عبدالحق سے وہ اس بات کے شاکی تھے کہ وہ بجائے اپنی قابلیت کو کسی مستقل تصنیف کے لئے استعمال کرنے کے مقدمات لکھنے پر ٹال دیتے ہیں۔

مہدی حسن کے بالخصوص دو مضامین "اردو لٹریچر کا نفس واپسیں" اور "ارتقائے ادب اردو" آج بھی پڑھنے اور غور کرنے کے لائق ہیں، جن میں انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور وسعت کے مسئلہ پہ پروفیسر براؤن کی رائے کے ساتھ تفصیل سے بحث کی ہے۔ ان کا خیال ہمیشہ ادب کے تعمیری پہلو پر رہا اور وہ سب سے پہلے زبان کی بنیادوں کو مستحکم کرنا ضروری خیال کرتے تھے۔ جس کے لئے انھوں نے تجویز پیش کی تھی کہ اردو زبان کی ایک جامع لغت، ایک مجموعہ محاورات و اصطلاحات اور قاموس کے بغیر اردو کی وسعت و ترقی کے لئے کوشش کرنا بے سود ہے۔ مہدی حسن اپنے زمانے کے ادبی رجحانات سے گہرے متاثر تھے۔ "ادب لطیف" کی جو ہوا پہلے پہل اس زمانے میں چلی تھی یہ بھی اس میں مبتلا تھے۔ ادب لطیف کو دراصل مغربی ادبیات سے لیا گیا تھا اور ٹیگور کی گیتانجلی کی اشاعت سے اسے آگے چل کر اور تقویت پہنچی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اچھے لکھنے والے عنقا تھے اور ادب لطیف آج کل کے سستے افسانوں کی طرح ابتذال ادب کی صورت ہو کر رہ گیا تھا۔ مہدی حسن نے بھی "جنت غم" اور "فلسفۂ حسن و عشق" وغیرہ میں اس صنف پر طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کے اسلوب کی شگفتگی اور تحریر کی رنگینی کے سوا اس میں کوئی نئی اور دلچسپ بات نہیں ملتی بلکہ بعض جگہ تو ان کی رومان پسندی عریانیت کی سرحدوں سے ملتی نظر آتی ہے۔

"افادات مہدی" میں ادب کے طالب علم کو ایک حد تک یوں دلچسپی ہو سکتی ہے کہ ابتدائے بیسویں صدی کے ادبی رجحانات اور موضوعات کے چند مرقعے اس میں موجود ہیں جس سے اس زمانے کے اردو کی بعض دلچسپ تحریکات اور مباحث سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا ہے۔ مگر ایک عام قاری کو شائد ان مضامین میں موضوع اور خیالات

کے اعتبار سے کوئی نادر چیز نظر نہ آئے۔ بعض مضمون تشنہ ملیں گے بعض خیالات پرانے ہونے کی وجہ سے غیر دلچسپ معلوم ہوں گے۔ بعض ادبی بحثیں بے وقت کی راگنی معلوم ہوں گی اور بعض تاریخی اور تنقیدی مضامین وقت گزر جانے اور علم و ادب میں ترقی ہونے کی وجہ سے پھیکے نظر آئیں گے۔ لیکن جو چیز ان سب کی تلافی کرنے والی ہے وہ ہے مہدی حسن کا اسلوب بیان! ان کے اسلوب کو ابھی اور پختہ ہونا چاہیئے تھا۔ بعض مقامات پر نامانوس الفاظ اور ترکیبیں بھی مل جاتی ہیں کہیں جملوں کی بناوٹ عجیب سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن طرز ادا کی انفرادیت کہیں بھی کم ہونے نہیں پاتی۔ مہدی حسن بلاشبہ ایک انفرادی طرز کے انشا پرداز تھے۔ ان کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور نفاست پسندی ان کی تحریر میں جذب ہوگئی تھی۔ الفاظ بڑے سلیقے سے استعمال کرتے محاورے بڑے قرینے سے جڑتے چلے جاتے۔ عبارت کی خاص خصوصیت اس کا اتار چڑھاؤ ہے۔ کہیں لہجہ وقت کے لحاظ سے سنجیدہ کبھی گرم و تیز اور کبھی نرم ہوجاتا تھا۔ اسلم جے راجپوری اور احسن مارہروی پر تنقید کرتے وقت جو لہجہ ہے اس کی تندی "بعث عم" میں باقی نہیں رہتی۔ ان کی تنقیدوں میں اکثر طنز کا چبھتا ہوا پہلو مضمر ہوتا۔ یہ طنزیہ انداز ان کی خاص خصوصیت ہے۔ اسلم کے متعلق لکھتے ہوئے کہتے ہیں:- "میرا خیال ہے کہ ملک میں ایسے نفوس قدسی صدیوں میں پیدا ہوں گے جو منصفانہ تنقید اور تنقیص بے جا یعنی عیب گیری کی حد فاصل کا احساس کرسکیں اس لئے بے محل جنبش لب سے خاموشی اچھی۔ آپ خیر سے گونگے ہوں تو اعتراض کی بات نہیں۔ لیکن بولئے اور آدمی کی طرح نہ بولئے تو مجھے شکایت ہوگی۔ اس خلوص اور سچ کا کیا ٹھکانا ہے کہ شعر العجم کے جزئی عیوب بھی ریویو نگار کے خیال میں اتنے ہیں کہ اگر وہ ابھار کر دکھائے جائیں تو ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے"! طنز کا یہی پہلو مولوی عبدالحق کے متعلق لکھتے ہیں تو اور زیادہ ابھر جاتا ہے "مذاق صحیح ہو تو یہ کام یورپ کے سہارے کرنے کے ہیں۔ مجھے اتنا موقع نہیں۔ دوسروں کو "کلام غالب" پر دیباچہ لکھنے لکھانے سے فرصت نہیں ایک صاحب "نقاد" سے متقاضی ہیں کہ دیباچہ لکھواؤ۔ یہ دیباچہ کیا بلا ہے؟ آج تک میری سمجھ میں نہ آیا۔ اگر مقدمہ سے غرض ہے تو سیدھے عبدالحق کے پاس حیدرآباد جائیے۔ تنقید و تبصرہ منظور ہے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑتا ہے اس کا دور ختم ہوچکا"۔

شبلی ان کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "نذیر احمد اور آزاد کی روحوں نے ایک قالب اختیار کرلیا ہے"۔ یہ رائے بالکل درست لیکن نذیر احمد اور آزاد کا رنگ ایک جگہ جمع نہیں۔ مہدی حسن علمی و تاریخی مضامین لکھتے تو نذیر احمد کا اسلوب آزاد کے طرز پر حاوی ہوتا نظر آتا۔ ان کے ادب لطیف کے ٹکڑوں میں آزاد کا رنگ بالکل کھلا ہوا ملتا ہے۔ الفاظ کی در و بست اور محاوروں کا شوق بالکل وہی عبارت کی ترکیب، رنگینی، روانی، البیلا پن اور شگفتگی بالکل آزاد ہی کی سی تھی۔ مگر تکلفات کا وہ عالم نہ تھا۔ طرز بیان ہمیشہ ہلکا پھلکا رہتا۔

ایک جگہ عبارت کی روانی اور بے ساختگی دیکھئے "یہ حالت جس قدر مایوس کن ہے اس سے زیادہ لائق افسوس ہے۔ مگر ایک مشہور انشا پرداز کا خیال سن رکھئے کہ جس طرح ہر شعلہ محبت مصیبت کا گھر ہے، مشغلۂ سخن سب سے بڑھ کر ہے۔ حسن کلام کے پیچھے نہ دیکھے۔ سارے اہل قلم بری طرح جئے اور عمر بھر روٹیوں ہی کے محتاج رہے۔"

تو ریہ یان کی کتنی اچھی مثال ہے:- "بڑے بڑے سنجیدہ حضرات اپنے نامۂ اعمال کی طرح اخباروں کے کالم سیاہ کرتے رہتے جس سے کچھ دنوں کے لئے اخباری افق کی فضائے بسیط ایک دم سے تیرہ و تار ہوگئی۔ کیا یہ کوئی علمی واقعہ تھا؟

ہرگز نہیں۔ صرف حاسدین کی کم نظری تھی؛ دلوں کی جمی ہوئی سیاسی لغزش قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی"۔

اجمال اور اختصار ان کی تحریر کی خاص [illegible]یت ہے۔ لیکن اس اجمال نے کہیں بھی ان کے اسلوب کی اثر انگیزی کو دھیما نہیں کیا بلکہ اکثر جگہ اثر اجمال کے سہارے بڑھتا گیا ہے۔ ایک جگہ کس خوبی سے لکھتے ہیں: - "سر سید سے معقولات الگ کر لیجئے تو کچھ نہیں رہتے - نذیر احمد بغیر مذہب کے لقمہ نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجئے تو قریب قریب کورے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں -

لیکن آغائے اردو یعنی پروفیسر آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں" ذیل کا اقتباس مہدی مرحوم کی انشائے لطیف کا بے مثال نمونہ ہے - یہ خاص انہی کا رنگ تھا جو انہی کے ساتھ ختم ہوگیا: -

"مہرالنساء کا وہ واقعہ کس قدر دلچسپ ہے جب اس نے باغ کی ایک روش پر جہانگیر کے ہاتھ سے کبوتر لے کر چھوڑ دئے تھے - پروفیسر آزاد نے جس خوبصورتی سے اس کو دکھایا ہے انشاپردازی کو آج تک اس سے بہتر الفاظ نہ مل سکے - آپ وہ سماں دکھا دیجیے جب مہرالنساء جوان بیوہ کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے لگی ہے -

لیکن ہائے وہ حسن افسردہ جو اپنی قوتوں سے واقف ہو - خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی"

جی چاہتا ہے کہ ان کے لطیف انداز تحریر کی اور بھی مثالیں پیش کروں لیکن طوالت کا خوف دامن گیر ہے -

مہدی افادی اگر کسی وجہ سے یاد رکھے جانے کے قابل ہیں تو وہ ان کا طرز بیان ہے - اگر ان کی عمر وفا کرتی تو وہ اردو کے بے مثل انشاپرداز ہوتے - ان کی تحریر کے رکھ رکھاؤ، گھلاوٹ، سج دھج، بانکپن اور اثر انگیزی پر ان کا جان دار اظہارِ ادا مستزاد تھا - افسوس کہ اردو کا ایک نوخیز صاحب طرز جو یقیناً اس کے مستقبل کو سوارنے میں بڑا ممد و معاون ثابت ہوتا یوں بے وقت دنیا سے اٹھ گیا -

محمد احسان اللہ

افکارات

دل مرا خوگرِ حرماں ہے تمہیں کیا معلوم
ہر نفس شعلہ بداماں ہے تمہیں کیا معلوم

زندگی موت کا عنواں ہے تمہیں کیا معلوم
رنج و غم سلسلہ جنباں ہے تمہیں کیا معلوم

حسن اک عالمِ طوفاں ہے تمہیں کیا معلوم
عشق اک وادیٔ پیچاں ہے تمہیں کیا معلوم

سوزِ الفت کی تپش، دردِ جدائی کی خلش
دل کے داغوں سے نمایاں ہے تمہیں کیا معلوم

اشک آلود نگاہوں کا فسانہ توبہ!
حسرت و یاس کا عنواں ہے تمہیں کیا معلوم

میری مجبور نگاہوں میں محبت کی جھلک
غمِ کونین کا ساماں ہے تمہیں کیا معلوم

دردِ الفت کی قسم، آج تمنائے عظیم
موت سے دست و گریباں ہے تمہیں کیا معلوم

عظیم (حیدرآبادی)

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا

انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا، یوں بھی دلچسپ اس وجہ سے ہو جاتی ہے کہ دیگر زبانوں میں اور انگریزی زبان میں ڈرامے کی ابتدا حسن اتفاق کہئے یا کسی اور وجہ سے مذہبی روایات کی رہین منت ہے۔ اس لئے ربط مضمون کی خاطر بطور تمہید ان دیگر زبانوں میں ڈرامے کی ابتداء کے حالات کا مختصراً ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا۔ جس سے تکمیل مضمون کے ساتھ موضوع بحث کے دیگر پہلو پر بھی روشنی پڑ سکے۔

ہندوستان میں ڈرامے کی ابتدا، تقریباً اس وقت سے ہوتی ہے جب سے کہ شاعری کا رواج ہوا ہے۔ سنسکرت میں لفظ (ناٹک) ناٹ سے نکلا ہے جس کے معنی ناچ کے ہیں اور لفظ (روپک) بھی جس کے معنی بھیس بدلنے کے ہیں سنسکرت کے ناٹک کے معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک ادبی تحقیق کا تعلق ہے یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ ہندوستان میں (ناٹک) کی بنیاد مذہب کے ساتھ پڑی ہے۔ اس سے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ بہت سے دیوتاؤں نے ہم خیال ہو کر دیوتائے علم برہما کے پاس ایک عرضداشت گزرانی جس میں یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ ان کی دل بہلائی کے لئے کوئی موزوں سامان مہیا کیا جائے۔ برہما نے ان کی درخواست منظور کی اور ان کے لئے ناٹ وید ایجاد کی جس میں مکالمہ رگ وید سے حاصل کیا۔ نقالی یجروید سے، گانا سام وید سے اور ناچنا اتھروید سے۔ وشوا کرم کو فوراً حکم ملا کہ وہ ایک رنگ شالہ یا اسٹیج تیار کرے۔ یہ رنگ شالہ اندر بھون میں تعمیر کیا گیا اور تیوہار اندر دھوج کے موقع پر رنگ شالہ میں پہلا ناٹک جو کھیلا گیا وہ امرت منتھن تھا اس ضمن میں ایک اور روایت بھی ہے کہ سب سے پہلا رنگ شالہ جس نے بنوایا وہ راجا نہیش ہے۔ جس نے اداکاری گندھرب اور اپسراؤں کے سپرد کی۔ الغرض اس قسم کی قدیم روایتوں سے یہ تو ضرور پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں ڈرامے کا رواج بہت قدیم سے ہے اور ابتداً یہ چیز پوجا پاٹ کے موقع پر ناٹک کے نام سے پیش ہوتی تھی جس میں دیویوں، دیوتاؤں، رشیوں اور منیوں کی زندگی کے حالات پیش کئے جاتے تھے۔ اور بعد کو راجا، مہاراجا خود اس قسم کے ناٹکوں میں بہ حیثیت ہیرو کے حصہ لینے لگے تھے۔

مصر کی مشہور کتاب (Book of Dead) بھی غالباً سوائے مذہبی ڈرامے کے کچھ اور نہیں ہوسکتی جس میں (Dead) اہم اداکار اور دیگر اداکار دیوتا ہیں۔ مگر یہودیوں کے پاس ڈرامے کو کوئی فنی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔ تاہم ان کی عبادات کے طریقوں کی چھان بین سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ڈرامائی عناصر ان کی عبادات میں کسی نہ کسی صورت میں شامل تھے۔

یونانیوں کے پاس اداکاری کا رجحان دیگر اقوام کے مقابلہ میں زیادہ پایا جاتا تھا اور یونانیوں کے حسن کارانہ ذوق کا ذکر ہی کیا ہے جب کہ جدید ڈرامے کے المیہ (Tragedy) حصہ کی بنیاد قدیم (Greek Tragedy) پر رکھی گئی ہے۔ ان کے ہاں بھی عبادات کے طریق اور ڈرامائی مظاہروں میں بہت قریب کا تعلق ہے۔ یونانیوں کے مشہور دیوتا (Dionysius) کی پرستش کے موقع پر ساری رسومات کی ادائیگی میں یہ بات ملحوظ رکھی جاتی تھی کہ رسوم ڈرامائی شکل میں پیش کئے جائیں۔ ان کا بیدیا (معابد) چونکہ (Athens) میں واقع تھا اس لئے زائرین کا ایک ہجوم رہا کرتا تھا۔ ایسے موقع پر یونانی

ڈراموں کو منظوم پیرایہ میں پیش کیا جاتا تھا۔ ان ڈراموں میں قومی ویر اور بہادروں کے مشہور کارنامے اور ان کی زندگی کے حالات اس انداز میں پیش کئے جاتے تھے کہ ناظرین کے قلوب میں جذباتی جذبات پیدا ہو جائیں۔ لیکن بعد کو ان ڈراموں میں سیاسی اور قومی مسائل بھی شریک کئے جانے لگے۔ تاہم اس بات کا خیال ضرور رکھا جاتا تھا کہ ڈراما نویس ڈرامے کی تیاری میں اور اداکار اداکاری کے موقع پر عباداتی تقدس کو رخصت نہ ہونے دیتے۔ یونانی ڈرامے کا ذیلی مقصد اصلاح اخلاق، ذوق تعلیم اور سیاسی شعور کا پیدا کرنا بھی ہوا کرتا تھا۔ یا یوں کہئے کہ یونانی ڈراما مذہبی تعلیمات اور تلقین کا دوسرا نام تھا۔ بدیں وجہ یونانی ڈرامے کی ابتدا کو مقابلتہً شروع ہی سے اعلیٰ حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی اور یونانی ڈرامے کے متعلق جو کچھ پیش کیا گیا ہے عام حیثیت سے اس کا اطلاق راست اور بے کم و کاست جدید فن ڈراما پر ہوتا ہے، اس طرح انگریزی ڈرامے پر بھی

جب عیسائیت کا آفتاب یورپ پر طلوع ہوا اور گیلیلو (Galileo) کے اصول تعلیمات نے لوگوں کے ذہنوں میں مکمل انقلاب بپا کر دیا اور فاتح روم کمزور اور نحیف (Judee) کے قدموں پر سرنگوں تھا تو نئے خدا کی پرستش کرنے والوں نے پہلے پہل ڈرامائی اور رومانی میلانات کو نفرت سے دیکھنا شروع کیا۔ بہ الفاظ دیگر رومانی اسٹیج میں بجائے المیہ اور ڈرامائی رجحانات کے (Athletic) مناظرے اور مجادلے (Gladiatorriot) کے میلانات زیادہ کارفرما ہونے لگے۔ رومانی ڈراما باوجود یونانی ڈرامے کی پیداوار ہونے کے اپنے اندر وہ اخلاق اور تقدس نہیں رکھتا تھا اور یونانی ڈراما جو انتہائی مذہبی اور مقدس فرائض کی بنیادوں پر قائم تھا رومیوں کے ہاتھوں میں صرف کھیل اور تماشا بن کر رہ گیا رومی چونکہ یونانیوں کی طرح اعلیٰ مذاق اور حسن کارانہ جذبات سے لگاؤ نہ رکھتے تھے اس لئے وہ ڈرامائی فن کو بالکل پست اور مبتذل انداز میں پیش کر کے تفریح طبع کا سامان مہیا کر لینا کافی سمجھتے تھے۔ دور اول کے نصرانی جو آنے والی دنیا کے لئے ایک سرچشمۂ مسرت و شادمانی محفوظ کرنا چاہتے تھے رومی (Amphetheatre) کے بھیانک اور دل ہلا دینے والے مناظر دیکھ نہ سکے جن میں انسان خونخوار جانوروں کی بھینٹ چڑھا دئے جاتے تھے اور وہ چونکہ ایک سادہ اور تصنع سے معرا زندگی کے متلاشی تھے۔ اس قسم کے حالات کے خلاف ایک زبردست تنفر اور ردعمل اپنے اندر محسوس کرنے لگے اور بالآخر شاہ (Constantine) کے دور میں ان کے سدباب کے لئے امتناعی احکام جاری کئے گئے۔

بہر حال مسیحیت نے بہت جلد یہ محسوس کر لیا کہ عوام کے قلب و دماغ پر رومی کھیل تماشوں کا کس قدر گہرا اثر مترتب ہے اور اس کے خلاف مسیحیت کو کس قدر اہم اور مشکل جنگ کرنی ہے علاوہ ازیں عیسائیت نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ عبادات کے غیر دلچسپ طریق اور خشک پند و نصائح عوام پر بہ مشکل اثر انداز ہو سکتے ہیں جب کہ عوام کی آنکھیں رومی تفریحات اور تفرج گاہوں کے دلپذیر مناظر سے لطف اندوز رہ چکی ہوں۔ ایسی صورت میں اور ان حالات کے تحت مسیحیت کے لئے ناگزیر تھا کہ وہ اپنی تلقین و تعلیم کو ایسے جاذب پیرائے اور دلپذیر اسلوب میں عوام کے سامنے پیش کرے کہ وہ قدیم عقیدہ سے متنفر نہ سہی کم از کم بیزار ہو کر جدید عقیدے کو اپنے دل میں جگہ دیں۔

مسیحیت کو اپنے ابتدائی نقوش گہرے طور پر مرتسم کرنے کے لئے عبادات کے طریق میں ڈرامائی عنصر کو

شریک کرنا پڑا اس طرح سب سے پہلے (Communim) کو عوام کے سامنے پیش کیا گیا۔
جس میں مسیحی موت اور مصائب کے حالات کو نہایت ہی والہانہ اور درد انگیز انداز میں بتلایا گیا تھا۔ غیر مسیحی
دنیا میں یونانی ڈراما کی مرکزیت انسانی خدا (Dionysus) پر ختم ہوتی تھی اور دورِ مسیحیت میں
ڈراما کی مرکزیت خدائی انسان (Christ) پر موقوف تھی مگر (Dr. Hase) اپنی کتاب
(Miracle plays) میں یہ لکھا ہے کہ "دورِ مسیحیت کے تمدن میں عوام کے لئے وہ کشش و
جاذبیت نہ تھی جو غیر مسیحی زمانے میں یونانی تمدن نے پیش کی تھی۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں عیسائیت
کے رہبر مسیح کو اگرچہ یونانی خداؤں اور دیوتاؤں پر تفوق حاصل تھا لیکن مسیحی تمدن کو وہ کشش اور اثر
نصیب نہ ہوا جو یونانی تمدن کی میراث تھی۔ چوتھی صدی عیسوی میں متذکرہ حالات کے تحت "The passion
of Christ" المیہ پیش کیا گیا۔ ہم یہ یقین سے نہیں کہتے کہ ڈراما نویس کا مقصد آیا کوئی ادبی
معیار کا ارتقا مقصود تھا یا مسیح کی آمد کا پیام دینا تھا۔ بہرصورت اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس المیہ کا
بیشتر حصہ (Euripides) سے ماخوذ ہے۔ ازاں بعد سولھویں صدی عیسوی میں ڈرامے کی طربیہ
نگاری کی ابتدا یوں ہوئی ہے کہ (Hraswitha) نامی ایک مسیحی جوگن نے (Gander
Shein' Terence) کی اتباع میں چھ طربیہ ڈرامے پیش کئے جو صرف
مسیحی معبد کی چار دیواری تک محدود اور جو خاص طور سے مسیحی جوگن کی دل بہلائی کے لئے تصنیف کئے
گئے تھے اور آج کے جدید ترقی یافتہ فن ڈراما کی ابتدا ان متذکرہ قدیم المیہ و طربیہ ڈراموں سے ماخوذ ہے۔
علاوہ عباداتی طریق میں ڈرامائی عنصر کو شریک کرنے کے ایک اور کوشش جو کی گئی وہ یہ تھی کہ مذہبی تقاریب
مثلاً (Easter-good Friday) ڈرامائی شکل میں منائے جانے لگے اور بتدریج
ان ڈراموں میں علاوہ مقدس انجیل کے مسیحیت کے تاریخی اجزا کا بھی کافی حصہ شریک کیا گیا۔ جب اس ڈرامائی
ادب نے مسیحیت کو پوری طرح اپنے اندر سمانے کی صلاحیت پیدا کر لی اور جب عوام کو دلچسپی ہونے لگی تو
لاطینی زبان کو مقامی زبان سے بدلا گیا اور لاطینی زبان نے جب پوری طرح چولا بدلا تو ڈراما مذہبی بندھن
سے آزاد ہو کر منصۂ شہود پر آیا اور اس طرح وہ بالآخر ہر دل عزیز ہو گیا۔

اب ہم اس سرسری خاکہ کے بعد اس تحقیق کی طرف رجوع ہوں گے جو ہمیں انگریزی زبان کے
ڈرامے کے منبع اور سرچشمہ کی طرف رہبری کرتی ہے۔ دوسرے ممالک میں اور خاص طور سے فرانس میں جدید ڈرامے
کا سرچشمہ مذہبیات، ادبیات اور موسیقی وغیرہ ہیں مگر انگلستان میں اس کی ابتدا دوسرے ذرائع سے ہوئی یعنی
ابتدائی حالات میں اس میں مذہبی رجحان و میلان پایا جاتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ اس کا
سرچشمہ صرف مذہب ہی ہے کیونکہ اگر مذہب ایک طرف زبردست عنصر تھا جس نے قرونِ وسطیٰ کے مزاج کو موزوں
کیا تو دوسری طرف رزمیہ میلان بھی اس کے قومی کردار کا طرۂ امتیاز تھا۔ اس طرح دورِ وسطیٰ کے فرنگیوں میں ہمیں
مذہبی پیشوا بھی ملتا ہے اور میدانِ کارزار کا علم بردار بھی۔ اس طرح ابتدائی انگریزی ڈرامے کے محرک دونوں
ہوا کرتے تھے۔ اول الذکر کو اگر تلقین مقصود تھی تو آخر الذکر کو تفریح۔ اس طرح انگریزی ڈرامے کی پیدائش
اور پرورش کی ذمہ دار یہ دو جماعتیں تھیں جن میں سے ہر ایک کو اپنا مقصد ملحوظ تھا۔

محمد عبد الجبار فاروقی

رادھا

رمیش شفاخانہ میں ملازم تھا۔ اس کو اپنی بیوی سندرا سے بے حد محبت تھی۔ سندرا کا دل بھی محبت سے معمور تھا۔ رادھا باپ کی نورِ نظر، ماں کی لختِ جگر تھی۔ [illegible] کے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ رمیش کی مالی حالت خراب نہ تھی۔ اس کا دل بھی بہت غنی تھا۔ وہ اکثر رادھا کے لئے بازار سے قسم قسم کے کھلونے لایا کرتا اور رادھا اپنا بیشتر وقت گڑیا، گڈے کی شادی رچانے میں گزارتی تھی۔

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا، رادھا کا بچپن بھی دیکھتے دیکھتے گزر گیا۔ اب وہ شباب کے پُر فضا باغ میں قدم رکھ چکی تھی۔ ایک پھول تھا جو ویرانے میں کھلا تھا۔ اس کی معصومیت اور بچپن کے مجسمہ سے شباب کا رنگ جھلکنا شروع ہو گیا۔ اس کے والدین اس کی معصوم اور حسین صورت دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے تھے۔ انھیں اب رادھا کی شادی کی فکر ہوئی۔ وہ رادھا کو ایک بڑے گھرانے کی بہو بنانا چاہتے تھے، جہاں دولت اور چین کا مینہ برستا ہو لیکن وہ نسوانی جذبات سے بالکل نا آشنا تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ عورت کی مسرت دولت سے نہیں خریدی جا سکتی۔ انہیں تو صرف اپنے فریضہ سے سبکدوش ہونے کی لو لگی تھی۔

بیسیوں رشتے توڑنے کے بعد جو رشتہ انہیں پسند آیا، وہ سندر کا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ پچاس ہزار کی جائداد کا وارث تھا۔ اس کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اکیلا رہا کرتا تھا۔ شرافت اور سچائی کا مجسمہ تھا۔ قدرت ہمیشہ سچائی اور شرافت کے خلاف بغاوت کرتی ہے، غرض اس کے پاس دنیوی عیش کے سب سامان تھے۔ لیکن ایک چیز نہ تھی اور وہ تھی صحت۔ وہ دائم المریض تھا جس کے متعلق ڈاکٹروں کا فیصلہ تھا کہ وہ تھوڑے دنوں کے بعد زندہ نہ رہے گا۔ مگر خاندانی لال بجھکڑوں نے ڈاکٹروں کی رائے کو ہذیان سمجھا اور الٹا فتویٰ دے دیا کہ شادی تو ایسی اکسیر دوا ہے جس سے تمام مرض دور ہو جاتے ہیں۔ غرض رادھا کی شادی دھوم دھام کے ساتھ سندر سے ہو گئی اور والدین نے پچاس ہزار روپیوں پر اس کو فروخت کر دیا۔

رادھا کو اپنے شوہر کے مکان کا باوا آدم ہی نرالا نظر آیا۔ وہ میکے میں اپنا سارا وقت اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنسی خوشی میں گزارتی تھی لیکن یہاں صرف دو ہی ہستیاں موجود تھیں۔ ایک تو خود اس کی اپنی ذات اور دوسری اس کا مریض شوہر سندر۔ دولت اس کے قدم چومتی تھی لیکن رادھا کو دولت سے مطلق رغبت نہ تھی۔ وہ اپنے والدین کی تنگ خیالی پر دل ہی دل میں افسوس کرتی تھی۔ وہ سماج کو ایک بے پناہ سمندر سمجھ رہی تھی جس کی خوفناک موجوں میں ہر عورت کی انفرادی شخصیت اور ہر انقلابی ذہنیت کے لئے موت کا سامان ہے۔ وہ ایک دل برداشتہ خادمہ کی طرح شوہر کی خدمت کرتی تھی، والدین کی غلطی کا واحد علاج صبر سمجھتی تھی اور کبھی اس کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ صرف ایک چیز کی خواہاں تھی اور وہ تھی شوہر کی تندرستی۔

رادھا کے ہاتھوں کی مہندی بھی میلی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے پتی کی کشتیٔ حیات بیماریوں کے گرداب میں پھنس کر تھپیڑے کھانے لگی "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ تمام معالج اس بات پر متفق تھے کہ وہ بچ نہیں سکتا۔ تندرستوں کو مریض کی سانس بھی مہلک ثابت ہوتی مگر رادھا جو بلبل کی طرح اس پھول کے سامنے رکھ کر آہ و فغاں کیا کرتی تھی، وہ اس نزاعی سانس کو اپنی زندگی سمجھ رہی تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ محبت کو فنا نہیں۔

سندر نے کروٹ لی اور اپنی بے رونق آنکھیں کھولیں۔ رادھا سامنے کھڑی تھی۔ اس کا سانس پھولا

ہوا تھا پیشانی پر پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ سندر
کی حالت اب آخری وقت کا پیام سنا رہی تھی۔ کچھ دیر تک سندر حیرت کی نگاہ سے رادھا کو دیکھتا رہا اور پھر
کہنے لگا "رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوتا رادھا۔ انسان پانی کا ایک بلبلا ہے۔ اس کو ٹوٹتے دیر نہیں لگتی۔
اس حباب کو خواہ ہوا کا تیز جھونکا توڑدے یا وہ خود پانی میں مل جائے ایک ہی بات ہے۔ موت کی دوا دنیا
میں نہیں ہے مگر میں موت سے نہیں گھبراتا" یہ باتیں رادھا نے اپنے پتی کی زبانی سنیں اور زخمی ہرن کی طرح
تڑپ کر کہنے لگی "کوئی بیماری ایسی نہیں جس کا علاج دنیا میں موجود نہ ہو۔ جو طاقت آدمی کو بیمار ڈالتی ہے
وہ تندرست کرنا بھی جانتی ہے۔ ناگ والے کے پاس ناگ کے کاٹے کا تریاق بھی تو ہوتا ہے" سندر
کی قوت گویائی فرطِ غم اور حسرت و یاس کی وجہ سے سلب سی ہوگئی۔ نیم بے ہوشی کی حالت اس پر طاری ہوگئی۔
رادھا جو اس کے پلنگ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی دعا کرنے لگی "خداوند! میرے شوہر کو تندرست کردے اس
کی بجائے مجھے موت دے۔ وہ میرا چین ہے وہ میرا عیش ہے جب وہ زندہ نہ ہوگا تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گی"
سندر نے کروٹ لی اور تھوڑا سا پانی رادھا کے ہاتھ سے پیا۔

آسمانی دیوتاؤں نے رادھا کے درد بھرے نالوں کو سن لیا اور سندر کو موت کے طوفان سے نکال کر
زندگی کی خوش گوار وادی میں ڈال دیا۔ سندر اچھا ہوتا گیا اور اطمینان کی زندگی کے سانس لینے لگا لیکن
رادھا کے جسم کی نزاکت اس موذی مرض کے مقابلے کے قابل نہ تھی وہ اس سے متاثر ہوگئی۔ اس کے
چہرہ کی سرخی زردی سے بدل گئی۔ اس کا بھرا ہوا جسم' ابھرا ہوا سینہ' ہڈیوں میں تبدیل ہونے لگا اور رفتہ
رفتہ اس موذی مرض نے اس کے جسم کی روح کھینچ لی۔ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔ اس کا شوہر تندرست
ہو گیا تھا اس کی پچاس ہزار کی جائداد اس بدنصیب رادھا کو موت کے پنجے سے نہیں بچا سکی۔ آخر کار اس
مرض مہلک کی بدولت رادھا دنیا سے رخصت ہوگئی اور دنیا کو بتلا گئی کہ والدین کی ذرا سی غلطی اولاد کے
لئے موت کا پیام ہے۔ ؎

جان ہی دیدی جگرؔ نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

محمد عزیز الرحمٰن (عثمانیہ)

محبّت کی چھاؤں :- مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے کے چودہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے۔
اس کے جملہ افسانے عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور حسن و شباب کی
رعنائیوں سے معمور ہیں۔ ہر فسانہ میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدات کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں
کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کے لئے ایک شائستہ ذہنی
تفریح ہے۔ اس کا حسین و جمیل سرورق دیکھتے ہی اس کتاب کے بے باک اسلوب اور اس کے
افسانوں کی بے پناہ شوخی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ چھوٹی تقطیع (۱۳۲) صفحات قیمت مجلد ۱؎

ہماری کتابیں

موجودہ علمی وتحقیقی کساد بازاری، اور انتشار ذہنی وافلاس دماغی کے زمانہ میں جب ہم ہندوستان کی سال بہ سال فہرست تصانیف پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو نہ علم وتحقیق کی کساد بازاری پر ماتم کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور نہ انتشار ذہنی پر نالہ وشیون کرنے کا، اور نہ ہی افلاس دماغی پر آہ وبکا کرنے کا شائبہ باقی رہتا ہے۔

بلکہ ہندوستانی مصنفین کا ہجوم بے پایاں اور ہندوستانی تصانیف کی فراوانی دیکھ کر نہ صرف ہماری اشک شوئی ہو جاتی ہے بلکہ ملک کی زرخیز زمین کی طرح حقائق انگیز ومعارف خیز دماغوں کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ تحقیقات کا یہ انبار، کتابوں کا یہ انبوہ، جرائد ورسائل کی یہ کثرت، ماہناموں، روزناموں کی یہ بہتات، مقالات ومضامین کی یہ فراوانی، افسانوں کی یہ افزونی ملک کے روز افزوں، ترقی یافتہ حالات ونتائج کی آئینہ دار ہے۔ کیونکہ جس سرزمین کے باشندے تمام دنیا میں ⅕ کی حیثیت رکھتے ہوں، جو ملک دنیا کے مہذب ممالک کے مقابلے میں اپنے رقبہ کی وسعت، آبادی کی کثرت، معدنی و دولتی حیثیت سے نمایاں مقام پر فائز ہو، اس کے لئے اتنی علمی ترقی، تصنیفی وتالیفی اضافہ حیرت افزا نہیں۔ بلکہ علم وعمل کی کوتاہی، تصنیف وتالیف کی سست رفتاری یقیناً اس براعظم کی پسماندگی وسہل انگاری کی روشن دلیل ہوگی چالیس کروڑ نفوس کی اس بھیڑ میں دو چار ہزار کتابوں کی تصانیف کی تعداد ایسی کوئی غیر معمولی نہیں ہے کہ اس پر اظہار تعجب کیا جائے۔ کیونکہ کسی قوم کی تہذیب وتمدن کے ارتقا کا اندازہ کرنے کے لئے اس کا ترقی یافتہ گروہ ہی ہوا کرتا ہے اور درحقیقت یہی ممتاز گروہ قوم کی تمام طاقتوں کا مرکز، مجموعی کوششوں کا مرقع ہوتا ہے۔ یہ لوگ بقول لیبانی زمانہ کی طویل گردشوں کے نتیجے ہوتے ہیں۔

مصنف، شاعر، فلسفی، مفکر، سیاسی سب اسی میں داخل ہیں اس لئے مذکورہ بالا تصنیفات کی فہرست تعجب انگیز نہیں۔ تصویر کا یہ روشن رخ نہایت مسرت زا، حوصلہ افزا ہے۔ کاش! اس حقیقت کا صرف یہی درخشانی پہلو ہوتا۔ لیکن ہماری سخت کوتاہی ہوگی اگر ہم اسی حقیقت کے تاریک پہلو کا پردہ نہ اٹھائیں۔

ہماری مسرت کی کچھ انتہا نہ ہوتی اگر ان تصانیف کا اکثر وبیشتر حصہ خود ان کے ذاتی غور وفکر، ذاتی محنت وریاضت ذاتی جد وجہد کا مرہون منت ہوتا۔ لیکن ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ ان شائع شدہ تصانیف میں سے بہت زیادہ حصہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور روسی، تصنیفات سے ماخوذ یا خلاصہ ہوتا ہے اور ہمارے مصنفین انتہائی سرخوشی وسرمستی میں اس شراب مستعار کو اپنی تصنیفات کے ساغروں میں ڈال کر قدح خواران بزم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں اور وہ ہاتھوں ہاتھ لے کر گرمئ محفل کا سامان بنا دیتے ہیں

خدانخواستہ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی قوم کے پاکیزہ خیالوں، اجنبی زبانوں کے شاہکار حصول کا اپنی زبان میں منتقل کر دینا لسانی گناہ ہے نہیں نہیں! کسی زبان کے عروق مردہ میں نیا اور تر وتازہ خون داخل کرنا خود نئی زندگی پیدا کرنے کے مرادف ہے لیکن کسی زبان کو لذیذ وغیر لذیذ طعام سے اس قدر شکم پری کر دینا بھی باعث امتلا اور موجب بدہضمی ہے۔

سچ پوچھئے تو اس کا حقیقی سبب ہماری غلامانہ ذہنیت ہے جو ہم کو اختراعِ فکر، ابداعِ خیال کے

بجائے کورانہ تقلید کی دعوت دیتی ہے کیونکہ فاتح قوم کا تمدن، فاتح قوم کے معتقدات مفتوح اقوام کے رگ و ریشہ میں نہ صرف سرایت کرجاتے ہیں، بلکہ جزو بدن بن جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں قومی مزاج، قومی خصائص قومی شعائر رفتہ رفتہ آمادۂ فنا ہونے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب ہم کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتے ہیں، کوئی مقصد لے کر عازم سفر ہونا چاہتے ہیں تو نہ ہمارے سامنے سوچا سمجھا طریقۂ کار ہوتا ہے نہ سمجھا بوجھا ہوا راستہ، جس ڈگر پر دوسرے لوگوں کو چلتا ہوا دیکھتے ہیں ہم بھی چلنا شروع کردیتے ہیں۔ نہ افق منزل کا پتہ، نہ جادۂ مقصد کا سراغ۔ ہم چلتے رہتے ہیں۔ اپنے سفر کو جاری رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ دوسرے لوگ چل رہے ہیں دوسری قومیں سفر زندگی کی تگ و دو میں معروف ہیں لیکن نتیجہ میں نہ ہم منزل تک پہونچتے ہیں نہ مقصد کو پاسکتے ہیں۔ اس کی وجہ بجز نقالانہ جبلت اور غلامانہ فطرت کے اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پرانے آسمان کے نیچے کوئی چیز نئی نہیں ہے اور چراغ ہی سے چراغ ہمیشہ سے جلتا ہوا چلا آتا ہے لیکن قومی مزاج، قومی خصائص سے پہلو تہی اور چشم پوشی بھی ارتقائے انسانیت کے لئے ایک رکاوٹ ہے صرف ایک محدود و یخ بستہ ماحول پر قناعت کرلینا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

خود ہم جب بقول ایک انگریزی مصنف علم و تحقیق کے دریائے بیکراں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ قدیم علم و ادب کے کچھ علحدہ اور پوشیدہ سرچشمے ہیں۔ یہی وہ سرچشمے ہیں جہاں ہمارے موجودہ مصنفین پہنچ کر اپنے خیالات کے کم آب نالوں کو ان کے پانی سے اس قدر لبریز کردیتے ہیں کہ وہ کناروں سے ابل پڑتے ہیں۔ یہ وہ علمی و ادبی نایاب ذخیرے ہیں جن میں سے ہر شخص اپنے اپنے حسب منشا چن چن کر آپ کے سامنے ایک وسیع دسترخوان بچھا دیتا ہے۔

یورپ کی علمی تحقیقات، فنی و عملی مصنوعات کا راز کیا ہے؟ مجھے اس کے جواب دینے کی شاید ضرورت نہیں بلکہ ان یوروپین محققین کی طرف اشارہ کردینا ہی کافی ہے جو یورپ کے اسی دور نشاۃ ثانیہ کو اندلس کے عربوں کی تہذیب و تمدن کا مرہون احسان سمجھتے ہیں۔ علم و فن کا یہ وسیع خزانہ انھیں نایاب ذخیروں کی بدولت ہم تک پہونچا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ اہل یورپ نے اس علمی و تحقیقی متاع کو اپنے قومی و تہذیبی سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا ہے کہ خود ہمیں شناخت کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔

خداوند عالم نے اس اخذ و اقتباس کی عادت سے علوم و فنون کے لئے کیا بارآور نتائج پیدا کئے؟ کیا اس طریقہ کو کتابوں کے ناگزیر تنزل کے باوجود ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ تک علم و حکمت کے بیجوں کو قائم رکھنے کا ذریعہ قرار دیا ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت نے کمال حکمت و فیاضی کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک تک بیجوں کے پہونچانے کا انتظام بعض پرندوں کی شکم پروری کے ذریعہ سے کیا ہے۔ حالانکہ وہ طیور بہ ظاہر باغوں اور کھیتوں کے ناجائز لٹیرے معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل وہ فطرت کے حمال ہیں تاکہ اس کی رحمتوں کو پھیلا کر اس کو دیرپا بنائیں۔ اسی طرح متقدمین کے نازک خیالات اور ٹھوس معلومات کو یہ لٹیرے مصنف اپنی تصنیفات کے بازوؤں میں لے اڑتے ہیں اور وقت کے نہایت دور خطے میں ان کو گرا دیتے ہیں تاکہ وہ بڑھیں اور پھلیں، پھولیں۔ ان کی بہت سی کتابیں آواگون کے

پھیر میں آکر نئی شکلیں اختیار کرتی ہیں۔ ایک مستقل تاریخ "افسانہ" ایک داستان کہن "با کر ایک صورت اختیار کر لیتی ہے۔

اور ایک خشک و متین فلسفہ کا رسالہ دلچسپ و دلکش مضامین کے سلسلہ کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔

پس ہم کو متقدمین کے زوال اور ان کی یک قلم فراموشی پر افسوس نہیں کرنا چاہئیے۔

مگر اسی کے ساتھ ہم کو اپنے اسلاف ہی کی بتائی ہوئی تحقیقات پر قانع ہو کر نہیں بیٹھنا چاہئیے بلکہ قدرت نے ہم کو فکر و نظر کی بیش بہا دولت سے جس قدر فیض یاب کیا ہے اس سے کام نہ لینا کفران نعمت کے مرادف ہے اپنے قوائے عملیہ کی طرح قوائے عقلیہ کو بھی بروئے کار لانا ہی ہماری زندگی و سربلندی کا ضامن ہو سکتا ہے۔ ہمارے مصنفین کے لئے اس کی اشد ضرورت ہے اور اسی میں ہماری کامیابی کا راز مضمر ہے۔

وجدی الحسینی (بھوپال)

سرگزشت حاتم:۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی کلام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں قلمبند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار کے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے ان کی زندگی کے حالات پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور تصنع سے پاک تھی۔ تشنگان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے صفحات (۱۲۸) طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت عہ/

شاد اقبال:۔ اقبال اور شاد دونوں کی ہستیاں محتاج تعارف نہیں البتہ اس خبر سے اردو دنیا میں مسرت کی ایک لہر دوڑ جائے گی کہ علامہ اقبال مرحوم اور مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنۃ آنجہانی کے درمیان پچیس تیس سال تک جو مسلسل مراسلت ہوتی رہی ہے اس کو اہتمام سے مرتب کیا گیا اور یہ پوری مراسلت ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطالعہ سے اقبال کی زندگی اور کردار کے ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جن کے متعلق دوسرے ذرائع سے کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان گرانمایہ خطوط کو جناب ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے بسیط مقدمہ کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے شاد و اقبال کی نایاب تصاویر بھی شامل ہیں۔ صفحات (۱۷۶) قیمت عہ/

ملنے کا پتہ

سب رس کتاب گھر

خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

وجہی کی سب رس

دکن ہندوستان کا دل ہے۔ علم و ادب کی سرپرستی جیسی کچھ یہاں ہو رہی ہے اس سے کوئی ناواقف نہیں۔ خصوصاً اُردو کو اس بے ہنگم دَور میں پناہ دینے والے دکھنی ہی ہیں۔ وہ دن حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے جب یہ کہا جاتا تھا کہ دلّی اور دلّی کے بعد لکھنؤ ہی اُردو کا مرکز ہے۔ اب دلی اور لکھنو والوں سے زیادہ اس مرجھائے ہوئے پودے کو دل کے لہو سے سینچنے والے دکھنی ہی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ زبان شمال والوں کی تھی دکھنیوں کو ملی اور انھوں نے سر آنکھوں سے لگایا اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اہلِ زبان کے احسان مند بن گئے۔ بلکہ اُردو کو اس قدر زیادہ محبوب رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ نام نہاد "اہلِ زبان" کے منھ کھولنے سے بہت پہلے دکھنی یہ زبان بولتے چالتے تھے۔ اس میں شاعری کرتے اور کتابیں لکھتے تھے اور اس کو ایک ادبی زبان بنا چکے تھے۔ چنانچہ وَلی، قطب شاہ اور مُلّا وجہی اسی خاکِ دکن سے اٹھے۔

کچھ دنوں پہلے تک فیضی کو نثر نگاری میں پہلا استاد سمجھا جاتا تھا اور یہ "استادی" محض ناواقفیت کی بنا پر تھی۔ ہم اکثر یونہی اپنی انجانی نادانی سے کسی کو کچھ اور کسی کو کچھ سمجھ لیتے ہیں۔ اب تحقیقات نے علم کا میدان وسیع کر دیا ہے اور نئے نئے واقعات و حالات روشنی میں آتے جا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اکثر ہمیں اپنے پہلے فیصلہ کو باطل قرار دے کر ایک نئی رائے قائم کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ وجہی، فیضی سے پہلے بہت دنوں پہلے ہوا ہے۔

دکھنی زبان یعنی اردو کی ابتدائی صورت میں ہمیں سب سے پہلے شعر و سخن کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے پہلے ادبی اور درباری زبان فارسی ہوا کرتی تھی۔ شمالی ہند کے لوگ فارسی ہی میں تمام کاروبار کیا کرتے تھے۔ وہ اردو کو اس قابل نہ سمجھتے تھے کہ اس میں کچھ لکھیں پڑھیں۔ یوں ایک زمانہ تک انھوں نے اسے منھ نہ لگایا۔ لیکن دکھنیوں نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ یہ ادبی زبان بن جائے۔ وَلی اور قطب شاہ جیسے شاعروں نے جو اُردو کے سب سے قدیم شاعر ہیں اُردو یا دکھنی میں شاعری کی اور اس زبان کو اس قابل سمجھا کہ اس میں داستانِ دل سنائی جا سکتی ہے۔ وَلی کا کلام شمالی ہند میں بھی پہنچا اور جب لوگ اس سے واقف ہوئے تب ہی انھیں معلوم ہوا کہ جس زبان کو وہ عام زبان اور ادبی وسعتوں کے لئے ناکافی سمجھتے تھے وہ وَلی جیسے استاد کے لئے ذریعۂ اظہارِ جذبات بھی بن سکتی ہے۔

جس طرح اس زبان کو شعر و شاعری کے لئے سب سے پہلے دکھن والوں نے استعمال کیا، اسی طرح اس کو نثر نگاری سے مالا مال کرنے کا سہرا بھی دکھنیوں ہی کے سر ہے۔ اس کے ثبوت میں سب سے پہلی جو قابلِ ذکر اور معیاری کتاب ہمیں ملتی ہے وہ مُلّا وجہی کی تصنیف کردہ کتاب "سب رس" ہے۔

"سب رس" سے پہلے نثر میں ایک دو رسائل اور بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ لیکن وہ ایسے نہیں کہ ادب میں انھیں کوئی خاص اہمیت دی جا سکے۔ وہ خالص ادبی حیثیت والے نہیں نہ ادب کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ تو مذہبی تبلیغ کے لئے لکھے گئے تھے کسی مسئلہ وغیرہ پر بحث تھی اور بعض فلسفیانہ موضوع پر تھے۔ اس قسم کے رسائل کو جو بہت مختصر ہوتے ہیں ایک مستقل کتاب کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

مُلّا وجہی کی اس کتاب کو پڑھنے اور اس کی زبان پر تبصرہ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دکھنی نثر کا استاد فارسی زبان کا کافی بڑا شاعر تھا۔ اس کا ایک ضخیم کلیات ہمیں ملتا ہے۔ اس کا ایک اردو دیوان بھی تھا لیکن ہنوز اس کا پتہ نہ چل سکا۔ وجہی جب فارسی میں شاعری کرتا ہے تو یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ

اسے اس زبان پر کافی عبور حاصل ہے ۔ وہ [illegible] کا صحیح مصرف و تلفظ جانتا ہے ۔ وہ متبحر عالم ہے۔
یہی وجہی جب دکھنی زبان میں نثر لکھتا ہے تو الفاظ کا املا وہی لکھتا ہے جو عام طور پر بول چال میں استعمال
ہوتا ہے ۔ وہ " صحیح " کو " سہی " لکھتا ہے ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسے اس لفظ کی اصلیت معلوم
نہیں یا وہ برتنا جانتا نہیں بلکہ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک آزاد قوم کا فرد ہے ۔ اگر کسی دوسری زبان
کا لفظ استعمال کرنا چاہتا بھی ہے تو وہ اسے اپنا لیتا ہے ۔ اس کی صورت وہی رکھتا ہے جس طرح اس کی
زبان بنا ڈالے ۔ اس طرح وہ ایک دوسری زبان کا غلام ثابت ہونا نہیں چاہتا ۔

آج کل ہماری ذہنیت بہت بدل گئی ہے ۔ ہم الفاظ کو ان کی اصلی شکل و صورت میں برتنا چاہتے
ہیں اور حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ غیر زبانوں کے الفاظ ہم ویسے ہی استعمال کریں جس طرح وہ اپنی
اصلی زبان میں مستعمل ہیں ۔ یہ ہماری غلامانہ ذہنیت ہے ۔ ہم اپنی کوئی رائے نہیں رکھتے ہم صرف غیروں سے
مرعوب ہونا چاہتے ہیں ۔ ہم صرف احکام کی تعمیل سر جھکا کر کرنا جانتے ہیں اور یہی غلامی کا سایہ ہمارے سارے
ادب کو دھندلائے دیتا ہے ۔

ایک اور بات جو سب رس پڑھ کر محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ ایک آزاد دماغ کی تخلیق ہے ۔
جو اپنی ذاتی رائے رکھتا تھا ۔ جو اپنے طور پر سوچنا جانتا تھا اور اسے اس قدر آزادی حاصل تھی کہ وہ جو
سوچے اُسے لکھ سکے ۔ وہ اوروں کی نگاہوں سے مسائل کو پرکھتا نہ تھا بلکہ اس کا اپنا ایک زاویۂ نظر تھا ۔
اسے پڑھتے پڑھتے ہمیں تعجب ہونے لگتا ہے کہ جب ہماری ہی قوم کے ادیب آزاد تھے تو کیسے اور کیونکر سوچتے
تھے اب اگر اس انداز سے ہم سوچیں بھی تو ہمارا غلام قلم لکھنے سے قاصر ہے، عاجز ہے ۔ زندگی کے حقائق اب بھی وہی
ہیں جو اس زمانے میں تھے ۔ لیکن انداز نظر بے شک بدل گیا ہے ۔

وجہی کے بعد آج تک حیدرآباد دکن کی سرزمین نے اتنا بڑا ادبی انسان نہیں پیدا کیا ۔ اس میں کوئی
شک نہیں کہ قلی قطب شاہ ایک ضخیم دیوان کا مالک ہوا ہے ۔ لیکن وہ بھی نثر کے میدان میں ہارا جاتا ہے ان دونوں
میدانوں میں فرد اور کامل ہمیں جو ملتا ہے وہ یہی ملا وجہی ہے ۔ وہ نثر میں "سب رس" کے علاوہ
اور دو کتابوں کا مصنف ہے "قطب مشتری" اور "تاج الحقائق" ۔ اس کا شاہکار سب رس ہی ہے ۔

یہی اس کی سب کتابوں میں ممتاز، اُسے زندۂ جاوید بنانے والی ہے ۔ اس کا مضمون کافی طویل ہے ۔
خود وجہی کی عمر کی طرح طویل و دراز ۔ اس میں کئی ایک خوبیاں جمع ہوگئی ہیں ۔ اس کی لمبی عمر کے سارے
تجربات کا نچوڑ ہے ۔ اسے پڑھ کر حیرت یوں ہوتی ہے کہ وجہی باوجودیکہ پرانے زمانہ کا آدمی ہے مگر
اپنے اندازِ نظر اور طریقۂ فکر کے لحاظ سے وہ آج کل کے نوجوان ادیبوں جیسا ہے ۔ وہ "ادب برائے زندگی"
کا قائل ہے ۔ اس کے ہر ہر لفظ میں زندگی تڑپتی ہے اور پڑھنے والا اسے کوئی اجنبی نہیں سمجھتا بلکہ
اپنی ہی طرح اس آب و گل کی دنیا کا رہنے والا انسان خیال کرتا ہے ۔ وہ بھی گوشت پوست سے بنا ہے ۔
وہ دکھوں کو محسوس کرکے روتا ہے اور زندگی کی مسرتوں پر مسکرا دیتا ہے ۔ اس کی بات بات میں جان ہے،
ست اور تڑپ ہے ۔

وجہی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص طبقہ کو اپنا کر اپنا ادبی دائرہ تنگ نہیں کرتا ۔

وہ اپنے موضوع میں اپج کے ساتھ ساتھ وسعت بھی پیدا کرتا ہے اور زندگی کی نہ بدلنے والی حقیقتوں اور مسائل حیات پر وہ ہر ایک طبقہ کے زاویۂ نگاہ سے روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کو بہت زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ خود کو ایک انسان سمجھ کر اس نے انسانوں کو پرکھا تھا۔ اسی وجہ سے وہ ہر طبقہ کی بہترین ترجمانی کرتا ہے اور اپنے دور کا بہت موزوں نمائندہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کا ادب عوام اور عام لوگوں کا ادب ہے۔ یہ کتاب اس زمانہ کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویر ہے۔ اس دور کی سیاست، درباری زندگی اور عام طبقے کے خیالات، امراء کے حالات سبھی اس مرقع میں نظر آتے ہیں۔ وہ کسی خیالی دنیا کا خواب دیکھنے والا مصور نہیں بلکہ ایک حقیقی اور واقعی دنیا کا چابکدست عکاس ہے۔

اس کی کتابوں میں "سب رس" سب سے آخری تصنیف ہے۔ یہ اس کی لمبی عمر کے آخری دور میں لکھی گئی۔ اس وقت تک وہ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو گیا تھا۔ وہ تلخ و شیریں تجربات کا مزہ لے چکا تھا۔ جوانی کی نادانیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں اور بڑھاپے کے غور و فکر سے آشنا ہو گیا تھا۔ زندگی ڈھل چکی تھی۔ لیکن خیالات پختہ ہو گئے تھے۔ یہی فن کے شباب کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس نے تمام منازلِ حیات کبھی ہنسی خوشی سے اور کبھی رو دھو کر طے کئے تھے۔ وہ بہت دور چلا آیا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر عمر رفتہ کو دیکھا اور اسے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آ گئیں جو اس لمبے لمبے راستے پر اسے پیش آئی تھیں۔ اسی یاد کو، انہی تجربات کو اس نے ملفوظ کر دیا۔ جہاں دیدہ ہونے کی وجہ سے وہ جانتا تھا کہ کونسی بات کیسے کہی جا سکتی ہے۔ اس نے چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا۔ یعنی ابراہیم قطب شاہ کے عہدِ حکومت میں پیدا ہوا۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری کا ذوق تھا۔ اس کو ماحول بھی سازگار ملا۔ گولکنڈہ اس وقت علم و ادب کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وجہی کا خاص طرز بہت جلد مشہور ہو گیا اور اس کی اکثر شعراء سے چشمک تھی۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے درباری رنگ کو بھی اس کی آنکھیں دیکھتی رہیں۔ اس کے سامنے گولکنڈہ کی سیاسی بساط کئی مرتبہ جمی۔ گولکنڈہ کی ساری زندگی اس کے قلم سے "سب رس" میں ٹپک گئی ہے۔ یہ اس کے سارے تجربات کا نچوڑ ہے۔ نام بھی "سب رس" اس نے خوب ہی رکھا۔ زندگی کا ہر رخ اس میں روشن ہے۔

"قطب مشتری" میں اس نے بھاگ متی کا عشق، محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ نہایت فلسفیانہ رنگ میں لکھا ہے۔ اس دور کی جزئی تفصیلات بیان کی ہیں۔ علم و ادب، تہذیب و تمدن، خیالات و رجحانات، رسم و رواج بھی وجہی کے یہاں ملتے ہیں۔ خارجی و داخلی دونوں پہلو جھلکتے ہیں۔

وجہی محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں نقطۂ عروج پر پہنچ چکا تھا۔ محمد قطب شاہ کے دور میں یکایک رنگ بدلا گو لیے اور شاعروں کی کوئی قدر نہ رہی۔ ایرانی امراء نظر سے گر گئے ملک کے علماء و فضلاء کو دربار میں باریابی ہوئی۔ شعر و سخن کی بجائے ادب و فلسفہ کی سرپرستی ہونے لگی۔ غواصی جو وجہی سے کم عمر تھا منظر میں ابھرا اور وجہی پس منظر میں چلا گیا...... بہت دنوں بعد ایک اور دور وجہی کے دن پھرے۔ عبداللہ قطب شاہ عنفوان شباب میں جب بادشاہ ہوا تو پھر اس کے نانا قلی قطب شاہ کا زمانہ لوٹ آیا۔ وجہی پھر چمک اٹھا۔ مذہب امامیہ جاگ اٹھا۔ کیونکہ عبداللہ کی تربیت میں اس کی ماں حیات بخشی بیگم کا بڑا حصہ تھا۔ غرض وجہی کا یہ آخری زمانہ تھا۔ بادشاہ مہربان ہوا اور ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی۔ وجہی نے "سب رس" لکھی۔ اپنے قلم کی ساری قوتیں اس میں بھر دیں کیونکہ یہ اس کی حاصل زندگی تھی۔ اس کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے۔ اب تک نثر نگاروں کے لئے یہ مشعل راہ کا کام کرتی ہے۔ ۱۰۴۵ھ میں یہ کتاب لکھی گئی۔ اس کے بعد تاریخ ادب میں وجہی کا نام نظر نہیں آتا۔ گویا اس کا شاہکار ہی آخری ادبی کارنامہ تھا۔

زینت ساجدہ

شاعر امرء القیس

عرب کی شاعری زمانۂ جاہلیت میں اوج کمال پر تھی۔ عرب شاعر قومی تمدن و معاشرت کا معیار ہوتا تھا اور قومی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ شعراء کی آزادی طبع انہیں ہر اس شخص کی ہجو کرنے پر آمادہ کر دیتی تھی جو ان کے خلاف منشا عمل کرتا جس سے وہ شخص تمام قبیلے میں ہدف ملامت بن جاتا تھا اور ہر ایک اسے نہایت ذلیل و خوار تصور کرنے لگتا تھا اور کوئی شاعر اگر کسی کی تعریف کر دیتا تو اس شخص کی بے حد تعظیم و تکریم کی جاتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب شعراء میں باہم معرکہ آرائیاں اکثر وہاں کے بازاروں یا میلوں میں ہوا کرتی تھیں اور جس شاعر کا کلام مایۂ ناز تصور کیا جاتا اس کے کلام کو خانۂ کعبہ میں معلق کر دیا جاتا تھا تاکہ دوسرا مدعی اس سے بہتر کلام پیش نہ کر سکے۔ یوں تو اس زمانے میں متعدد مشہور شعراء گزرے ہیں لیکن امرء القیس کو اپنے تمام ہمعصر شعراء پر نمایاں فضیلت حاصل تھی چنانچہ بعض ارباب ذوق و فن نے اس کو جسد شاعری میں بمنزلہ سر کے قرار دیا ہے۔

امرء القیس اسلام سے چار سو سال قبل گزرا ہے۔ اس کا باپ قبیلہ کندی سے تھا۔ امرء القیس ایک نہایت آزاد منش اور حسن پرست انسان تھا یہی وجہ ہے کہ اس کی آزادی فطرت اور حسن پرستی ہر وقت اسے ایک پری وش کی جستجو پر ابھارتی رہتی تھی اس لئے وہ ملک الضلیل کے لقب سے مشہور رہے اور اس کی بے شمار محبوبائیں تھیں جن میں ام حویرث اور عنیزہ قابل ذکر ہیں۔ عنیزہ اس کی چچا زاد بہن بھی تھی جس کے فراق میں اس نے اپنا بے نظیر قصیدہ اہلِ ذوق کے سامنے پیش کیا اور خوب داد تحسین حاصل کیا۔

عرب کا اوجڈ بدو صحیفۂ فطرت پڑھ کر شاعر بنا۔ ضروری تھا کہ اس کا کلام سراپا فطری اور اثر میں ڈوبا ہوا ہو۔ چنانچہ وہ اپنے مخصوص انداز سے قصیدہ اس طرح شروع کرتا ہے وہ ایک رہ نورد ہے راستے میں وہ اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں کبھی وہ اپنی معشوقہ کے دیدار سے پہلی بار مشرف ہوا تھا اور اب وہاں ٹوٹے پھوٹے کھنڈر اس زمانۂ گزشتہ کی یاد دہرا رہے ہیں عہد رفتہ کی یاد شاعر کو بے قرار کر دیتی ہے اور وہ چند لمحے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے وہاں ٹھہر جاتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے ؎

قفا نبک من ذکریٰ حبیب و منزل بسقط اللوی بین الدخول فحومل

فتوضح والمقراط لم یعف رسمہا لما نسجتہا من جنوب و شمال

(ترجمۂ اشعار) ٹھہر جاؤ اے دوستو! اور مجھے اپنے حبیب اور اس کے مکان کی یاد تازہ کر لینے دو جو توضح، مقراط، دخول اور حومل کے درمیان تھا اور اب تک باد شمالی و جنوبی کی آمد و رفت نے اس کے دلکش نشانات کو ناپید ہونے نہیں دیا۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ شاعری اگرچہ کہ ایک غیر مادی شئے ہے لیکن مادیت کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور ہر قوم کا ادب اس کے تمدن و معاشرت، اخلاق و آداب اور خیالات کا آئینہ دار ہوتا ہے چنانچہ زمانۂ جاہلیت کی ایک غیر متمدن اور سادہ لوح قوم کے شاعر امرء القیس کے کلام میں بھی سادہ خیالات اور عام فہم تشبیہات و استعارات کا پایا جانا لازمی ہے۔ وہ جس مضمون کو چاہتا بغیر کسی ہیر پھیر اور تکلف کے اشاروں، کنایوں میں بیان کر دیتا تھا ؎

الا رب یوم کان منہن صالح ولا سیما یوم بدارۃ جلجل

(ترجمہ) دارۃ جلجل پر وہ اتنا مبارک دن تھا کہ کوئی دن اس کے برابر نہیں ہے۔ دارۃ جلجل ایک تالاب کا نام ہے اور اس شعر میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب کہ قبیلے کی چند عورتیں وہاں نہانے گئی تھیں شاعر کی شوخ نظریں

اس قسم کے نظاروں کی منتظر ہی رہا کرتی تھیں اس کی حسن پرست فطرت نے اسے اس وقت وہاں پہنچا دیا۔ اس کی شوخ طبیعت رنگ لائی اس نے چپکے سے سب عورتوں کے کپڑے چھپا دیئے۔ ان عورتوں میں اس کی معشوقہ عنیزہ بھی تھی جب سب عورتیں نہا کر کپڑے تلاش کرنے لگیں تو امرء القیس ان کو اور خصوصاً عنیزہ کو کپڑوں کی گٹھری دکھا دکھا کر فاتحانہ انداز سے ہنسنے لگا۔ اس واقعہ سے ہمیں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ اگرچہ امرء القیس ایک اخلاقی جرم کا مرتکب ہوا تھا لیکن اس نے اس کی پردہ پوشی کی بجائے بلا تامل تشہیر کر دی اور اپنی خوبیوں کے ساتھ کمزوریوں کو نظر انداز ہونے نہ دیا یقیناً یہ انسانیت کا ایک اعلیٰ کردار اور زندگی کا ایک اہم پہلو ہے جس کے بغیر سازِ زندگی بے سرا اور بے کیف رہ جاتا ہے۔

صحرائے عرب کی پرسکوت وسعت۔ لوؤں کی لپٹ۔ بادِ صرصر کے طوفان، تپتی ہوئی ریت کی موجیں تاروں بھری روپہلی راتوں میں قافلہ والوں کے پُر زور قہقہے اور جوش آور نغمے اور ریگستان میں جرس کی گونجتی ہوئی صدائیں، جا بجا کھجوروں کے جھنڈ خوبصورت اونٹ، گائیں اور دوسرے صحرائی جانور اگر خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں تو کیا شاعر نے ان کی تصویر کو الفاظ کا ایسا جامہ پہنایا ہے کہ تصور انھیں ہو بہو سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے ؎

فادبرن کالجزع المفصل بینہ بجید معم فی العشیرۃ مخول

اور یہ بات ہمیں شاعر کی زبانی ہی معلوم ہوئی کہ عرب کی گائے کا منہ اور سر سیاہ اور باقی جسم سفید ہوتا ہے۔ شاعر نے کوڑیوں سے ان کی مشابہت بتا کر گائے کے حسن میں چار چاند لگا دیئے اور ان کے منتشر جتھے کو اس مالا سے تشبیہ دے کر جس کے موتی سنہری تار میں الگ الگ پروئے ہوئے ہوں منظر کو اور زیادہ دلکش کر دیا ہے۔

امرء القیس کو یہ کمال حاصل تھا کہ جب وہ کسی واقعہ کو بیان کرتا یا کسی چیز کا نقشہ کھینچتا تھا تو اس کی جزئیات تک کو نہ بھولتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے کہ وہ نہایت صبا رفتار اور حملہ آور ہے اور اسے اتنی قدرت تھی کہ وہ سامنے دوڑتا دوڑتا اچانک مڑ کر پیچھے اس طرح دوڑنے لگتا ہے جیسے کسی پتھر کو سیلاب بلندی سے نیچے تیزی سے پھینک دے ؎

مکر مفر مقبل مدبر معاً ! کجلمود صخر حطہ السیل من عل

متعدد تشبیہات کو ایک ہی شعر میں فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کرنا کوئی آسان کام نہیں لیکن ایک جاہل بدو شاعر امرء القیس کے کلام پر نظر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ وہ کس خوبی سے اس کام کو انجام دیتا ہے ؎

لہ ایطلا ظبی و ساقا نعامتہ وارخاء سرحان و تقریب تتفل

گھوڑے کی دونوں رانیں ہرن کی رانوں کی طرح، پنڈلیاں شتر مرغ کی پنڈلیوں کی مانند بتا کر اس کی صبا رفتاری کو بھیڑیئے کی تیز روی اور خرامی رفتار کو لومڑی کے بچے کے پھدکنے سے تشبیہ دی ہے۔

شاعر کی جدت پسند طبیعت ہر چیز کو ایک نئے روپ میں پیش کرنے کے لئے بے قرار رہتی تھی۔ وہ اپنے ہمعصروں سے محبوبہ کی نازک انگلیوں کو معمولی مسواک سے تشبیہ دیتے ہوئے بارہا سن چکا تھا اس کی جدت پسندی رنگ لائی اور اس نے محبوبہ کی نرم و نازک سے انگلیوں کو وادی ظبی کے سفید اور لمبے لمبے

خوبصورت کپڑوں کے مشابہ بتا کر اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت پیش کیا ہے

وتعطو ابرخص غیر ششن کانہ　　اساریع ظبی او مساویک اسحل

زمانہ جاہلیت کے عرب شعراء کے کلام سے وہاں کے حالات پر اتنی روشنی پڑتی ہے کہ ان کا کلام بجائے خود عرب کی تاریخ بن گیا۔ عرب طبعاً نہایت مہماں نواز ہوتے ہیں اور امرء القیس اس بات کا یقین ہمیں اس طرح دلاتا ہے

عقربتہ اقوام جعلت عصامہا　　علی کاہل منی ذلول مرحل

اگرچہ کہ وہ شاہی خاندان کا ایک اعلیٰ فرد تھا لیکن فخریہ کہتا ہے کہ "میں نے بارہا پانی کی مشک گردن پر رکھ کر پھیری کی ہے اور قافلے والوں کی مہماں نوازی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا"۔

شجاعت اور دلیری عربوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوتی ہے اور اس کی مثالیں ہمیں امرء القیس کے کلام میں جا بجا ملتی ہیں

و واد کجوف العیر قفر قطعتہ !　　بہ الذیب یعوی کالخلیع المعیل

شاعر اپنی شجاعت کا اظہار یوں کرتا ہے کہ اس نے بے خوف و ہراس بھیانک اور ویران وادیاں طے کی ہیں ایسی وادیاں جو بھوکے گورخر کے شکم کے مانند گھاس وغیرہ سے بالکل خالی تھیں۔ یہ سادہ تشبیہات کی ایک نادر مثال ہے کیونکہ عرب ان ہی اشیاء کی تشبیہ دیا کرتے تھے جو ان کے مشاہدہ میں آتی تھیں تاکہ سامع مطلب آسانی سے سمجھ سکے اور شعر زیادہ موثر ثابت ہو یہ طریقہ ایک عرب شاعر کے لئے بے حد موزوں تھا کیونکہ وہ صحرائی اور شکاری خانہ بدوش قوم ایران یا ہند کے یاسمن و نرگس اور گل و بلبل کیا جانتی اور ایسی رنگین تشبیہات کہاں سے لاتی جب کہ اس نے خواب میں بھی ایسی چیزیں نہ دیکھی تھیں اور شاعری کے لئے ضروری ہے کہ اسباب بھی موجود ہوں۔ ایک دفعہ ابن الرومی سے لوگوں نے دریافت کیا کہ تم ابن المعتز سے اچھے شاعر ہو لیکن تشبیہات اس کی سی کیوں نہیں دیتے ہو　اور مثال کے طور پر ابن المعتز کا یہ شعر پیش کیا جو ماہ نو کی تعریف میں ہے

فانظر الیہ کزورق من فضۃ　　قد اثقلتہ حمولۃ من عنبر

ماہ نو کو ایک چاندی کی کشتی سے تشبیہ دی ہے جو عنبر سے لدی ہوئی ہے اور اس کے بوجھ سے ایک جانب جھک گئی ہے۔ آسمان کا رنگ نیلا ہوتا ہے اس لئے اسے عنبر سے تشبیہ دی ہے۔ ابن الرومی بے اختیار بول اٹھا "خدا کسی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ہے ابن الرومی امیر ہے گھر میں جو کچھ دیکھتا ہے اس کی تشبیہ پیش کرتا ہے"

امرء القیس نے اہلِ عرب کے عادات و خصائل پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس لق و دق صحرا میں پانی کی قلت کی وجہ سے اکثر بدو شکار کا کچا گوشت کھا کر اپنے گھوڑوں کی ایال سے ہاتھ پونچھ لیا کرتے تھے

ونمشی باعراف الجیاد اکفنا　　اذا نحن قمنا من شواء مضہب

آدم کی پیدائش سے لے کر آج تک ہر قوم میں حب الوطنی کا جذبہ نمایاں رہا ہے۔ چنانچہ سرزمین عرب اگرچہ کہ ایک چٹیل میدان اور لق و دق صحرا کے سوا کچھ نہیں نہ وہاں ایران کے پھولوں سے لدے ہوئے چمن ہیں نہ پنجاب کی صاف و شفاف پانی کی نہریں جن سے موسم گرما میں لطف اندوز ہو سکیں لیکن شاعر کا جذبہ

حب الوطن عربستان کے موسم بہار کا ایسا دلکش منظر پیش کرتا ہے کہ انسان اس سے مسحور ہو کر بجائے ایک لق ودق صحرا کے اپنے آپ کو وادیٔ غیط کی سرسبز و شاداب سرزمین میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں ابر بہار نے رنگ برنگ کے پھول کھلائے ہیں ۔

والقی بصحر الغیط بعاعہ ! نزول الیمانی ذی العیاب المحمل

مختصر یہ کہ امراء القیس کے کلام سے ہمیں ملک عرب کے حالات بہم پہنچتے ہیں کیونکہ اس نے بدوؤں کی نفسیاتی کیفیات جنگجو عربوں کے حالات ان کی فیاضی و مہمان نوازی اور بہادری ان کے خیالات اور صحرائی جانوروں، اونٹوں اور گھوڑوں کے حالات سب اس طرح ترتیب دیئے ہیں کہ پڑھنے والا پاس کی چیزوں اور ماحول سے بالکل بے خبر ہو کر عرب کی اس ریتیلی سرزمین کی سیر کرنے لگتا ہے ۔

قدسیہ

گاؤں کی شام

اپنی کرنوں کو سمیٹا مہرِ عالم تاب نے
اپنی منزل پر تھکے ہارے مسافر آ گئے
موجزن دریا کی آنکھوں میں خمار آنے لگا
دور لہراتے ہوئے پرچم کی لہریں تھم گئیں
چل دیے گھر کی طرف سب دھوپ کے مارے کسان
بیچ سے کھیتوں کے یوں مبہم جھلکتی ہے سڑک
دور افتادہ مکانوں سے دھواں اٹھنے لگا
حسن کی کچھ دیویاں پنگھٹ سے گھر جانے لگیں
گنگناتیں، جھومتیں، مڑتی ہوئیں، گاتی ہوئیں
لہلہاتے پھول پودے سب اچانک تھم گئے
گاؤں کی شورش سکوں کی وادیوں میں کھو گئی

فرشِ رنگیں خود بخود میدان سے اٹھنے لگے
راستوں کے چلنے والے چلتے چلتے تھم گئے
آبشاروں کی روانی پر سکوں چھانے لگا
جھاڑیوں کے سائے میں آوارہ نہریں تھم گئیں
ہند کی قسمت کے مالک یعنی بے چارے کسان
کفر کے بادل میں جیسے نورِ ایماں کی چمک
طائروں نے قصد اپنے آشیانوں کا کیا
ہر طرف تنہائی پا کر موج میں گانے لگیں
مستیوں کی رو میں گاگر اپنی چھلکاتی ہوئیں
شام کے اورنگ پر زریں ستارے جم گئے
سبزۂ بیگانہ کے مانند دنیا سو گئی

اے دلِ محزوں ہر اک شے چپ ہے اس دریا کے پاس
تو بھی سو جا گود میں لے کر ہجومِ درد و یاس

اشعر ملیح آبادی

فریاد

موسمِ خوشگوار آیا ہے
دردِ بےکر قرار آیا ہے

چھایا چھایا سا ابرِ مستی ہے — ہر طرف زندگی برستی ہے
یاد آتا ہے اک حسین کافر — روٹھا روٹھا سا ہے دلِ مضطر
گلستاں کا عجیب منظر ہے — جو دکھائے نصیب بہتر ہے

عہدِ رفتہ کی سرگزشت نہ پوچھ
میری تقدیر کی نوشت نہ پوچھ

مجھ کو آنکھیں ملی ہیں اشک نصیب — جیسے تارے ہوں دو قریب قریب
مسکراتی ہے جب عروسِ بہار — لوٹ لیتی ہے زندگی کا قرار
جب نگاہیں گلوں پہ پڑتی ہیں — دل کی آبادیاں اجڑتی ہیں
چاند تاروں کو دیکھتا ہوں میں — آبشاروں کو دیکھتا ہوں میں

ہائے وہ ربطِ شمع و پروانہ
لب پہ بلبل کے گل کا افسانہ

چرخ پر قوس جب نکلتی ہے — زندگی کروٹیں بدلتی ہے
ایسے ماحول میں کسی کی یاد — کون سنتا ہے عشق کی فریاد
سطحِ آبِ رواں پہ غولِ حباب — دل کے داغوں کا کامیاب جواب

کاش ہوتا وہ قلبِ مضطر میں
یہ کمی رہ گئی مقدر میں

جمیل

اردو زبان کا تشکیلی دور

اردو زبان کے ارتقا کی تاریخ میں، شاید ہی کوئی دور، اتنا اہم ہو جتنا کہ اس کا تشکیلی دور ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں، نہایت ہیجان کا زمانہ تھا جس میں سیاسی ابتری کے علاوہ، لسانی افراتفری بھی، اپنے منتہا کو پہنچ گئی تھی۔ ہندوستانی ماہرین لسانیات کے اقوال کے مطابق اس زمانے میں، ہندوستان کی ہند آریائی زبانیں ایک عبوری دور سے گزری تھیں، جو ان کا "اپ بھرنشہ" دور یعنی متوسط ہند آریائی دور کی پراکرتوں کے موجودہ بھاشاؤں کی طرف مائل ہونے کا دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں ہند آریائی زبانوں کا اتنا کافی ادب ہم کو نہیں ملتا، کہ ہم ان کے تدریجی ارتقاء کا عمدگی سے مطالعہ کر سکیں۔ اردو کے تعلق سے تو یہ مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کی تشکیل میں کسی ایک بولی کو دخل نہیں ہے، بلکہ اس زمانے کی ان تمام ہندوستانی بولیوں جیسے قدیم پنجابی پراکرت، برج بھاشا، بانگرو، راجستانی اور ہند ایرانی زبان، فارسی کا بھی حصہ ہے۔ ہند آریائی بولیوں میں، اختلافات کے ساتھ، مشابہتیں بھی اتنی ہیں کہ متعلم لسانیات کے لئے ہر قدم پر غلطی کا امکان ہے، اور جو رائے وہ قائم کرے گا، اس کی رو سے ایسے نظریے بن جانے کا احتمال ہے، جن کے نتائج دور رس ثابت ہو سکتے ہیں۔

اردو زبان کی ابتدا کے مسئلہ پر پچھلے چند سال سے اردو کے بعض سنجیدہ محققین، سرگرم تحقیق ہیں اور اس کا تھوڑا بہت ادب بھی پیدا ہو چکا ہے، جو رسالوں کے چند مضامین اور ایک دو کتابوں پر بھی مشتمل ہے۔ جس میں "دکن میں اردو" "اردوئے قدیم" "پنجاب میں اردو" اور "اردو شہ پارے" کے علاوہ "نقوش سلیمانی" اور "رسالہ اردو" کے وہ مضامین بھی شامل ہیں، جو اس موضوع پر، وقتاً فوقتاً شایع ہوئے ہیں۔ ان میں قدیم مخطوطات کی چھان بین کر کے اردو کے قدیم ترین ادب کو اکٹھا کرنے کی بیش بہا کوشش کی گئی ہے۔

اس سارے مواد کی، ہم کو یقیناً ضرورت ہے اور اب اس کے سامنے آجانے کے بعد، مواد کے مستند ہونے کی چھان بین اور مخطوطات کے متن کا لسانی مطالعہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، جس کے بعد ہی ہم یہ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو نے اپنی تشکیل میں کن کن بولیوں سے مدد لی اور کس جز کی حد تک، اور اس پر اپنا کیا اثر ڈالا۔ یہ کام ظاہر ہے کہ کسی ماہر لسانیات کا ہے اور یہ فن ہندوستان کے لئے ابھی نیا ہے۔ چنانچہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی اس کے عالم کم ہیں۔ ایسی تحقیق کے لئے، متعلقہ موجودہ زبانوں کے علاوہ، متوسط ہند آریائی زبانوں یعنی پراکرتوں اور قدیم ہند آریائی یعنی سنسکرت پر عبور حاصل کئے بغیر قدم اٹھانا دشوار ہے۔

حالیہ زمانے میں صرف تین کتابیں ایسی شایع ہوئی ہیں، جن میں اس مسئلہ تک صحیح فنی راستے سے پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتابیں "ہندوستانی لسانیات" "ہندوستانی صوتیات" اور "پنجاب میں اردو" ہیں۔ اول الذکر دو کتابیں، ٹھیٹ فنی ہیں اور آخر الذکر کتاب، گو تاریخی اور بیانی ہے، پھر بھی کسی حد تک فنی بحثوں پر بھی مشتمل ہے۔ ابھی ابھی ایک کتاب جامعہ کلکتہ کے مشہور پروفیسر لسانیات، ڈاکٹر سنوتی کمار چٹرجی کی "ہند آریائی زبانیں اور ہندی" کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا تعلق زیادہ تر ہندی زبان کے مسائل سے ہے، تاہم اردو کے بعض پہلوؤں پر بھی، اس سے روشنی پڑ سکتی ہے، کیونکہ بنیادی طور پر ہندی کی قواعد اردو سے زیادہ مختلف نہیں ہے لیکن

مصنف کو، فارسی اور عربی سے، اتنی نفرت ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں کی بنیادی شکل کے لئے عام پسند اصطلاح "ہندوستانی" سے بھی ناراض ہیں، کیونکہ انھیں اس میں فارسی کی بو آتی ہے، اس لئے وہ سنسکرت شکل یا "ہندوستھانی" کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔ فنی تحقیق میں، جب جذبات بھی شامل ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ہم صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتے۔ اردو کا تصور کم از کم، فارسی اجزا کے بغیر ناممکن ہے۔ فارسی جو ہند ایرانی کی بیٹی ہے، ہندوستان کی موجودہ ہند آریائی زبانوں کی سگی خالہ زاد بہن ہی تو ہوتی ہے۔

موجودہ ہند آریائی زبانیں جیسے پنجابی، سندھی، گجراتی، مرہٹی، اودھی، بنگالی اور اردو، ان پراکرتوں کی بیٹیاں ہیں، جو آج سے تقریباً بارہ سو سال پہلے، آریائی ہندوستان یعنی دراوڑی حصوں کو چھوڑ کر، سارے ملک میں رائج تھیں، پراکرتیں خود، قدیم ہند آریائی سے مشتق سمجھی جاتی ہیں، جس کی سب سے اہم یادگار سنسکرت ہے۔ پراکرتوں کا دور ۶۰۰ ق، م سے ۱۰۰۰ء تک معین کیا جاتا ہے۔ اسی زمانے سے پراکرتوں کے اجزا بکھرنے لگے، اور صوتی اور صرف نحوی تبدیلیاں ہوتے ہوتے، خاص خاص علاقوں میں ان کی خاص خاص صورتیں بننے لگیں۔ زبانیں، زندہ جسد کی طرح، ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ لیکن ان کی تبدیلی، ان کی تعمیر کی طرح سینکڑوں سال میں مل کر محسوس ہوتی ہیں۔ زبانوں کی تبدیلی کے عام اصول، کفایتِ توانائی، سہولت اور آسانی ادا ہوتے ہیں۔

اردو زبان کا نقطۂ آغاز، مسلمانوں کا ہندوستان میں آنا اور یہاں کی زبانوں سے ان کا تعلق ہے۔ مسلمانوں کا سب سے پہلا قافلہ یہاں آٹھویں صدی عیسوی کے اوائل میں پہنچا، گو ان کے اور خاص طور پر عربوں کے تعلقات، ہندوستان سے بہت قدیم ہیں۔ منظم طور پر، ساتویں صدی عیسوی کے اوائل سے، انھوں نے ہندوستان کی طرف رخ کرنا شروع کیا اس کے اسباب سے متعلق کچھ کہنا بحث کو طولانی بنانا ہے، لیکن مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں، کہ یہ اسباب، ان اسباب سے کچھ زیادہ اچھے نہیں تو برے بھی نہیں تھے، جنھوں نے، اس سے بہت پہلے، آریوں کو ہندوستان آنے پر مجبور کیا تھا۔ آریوں ہی کی طرح، یہ بھی مختلف اوقات اور مختلف گروہوں میں یہاں آئے۔ سب سے پہلا قافلہ ۶۳۶ء میں ملتان تک آکر رک گیا تھا، اس کے تین چوتھائی صدی بعد، محمدؐ بن قاسم کی ممتاز قیادت میں عراق اور ایران کے سرفروشوں کی ایک خاصی تعداد، سندھ میں آکر مقیم ہوگئی اور ایک اسلامی نو آبادی یہاں بن گئی۔ اسلامی تہذیب اور شائستگی، عقائد اور اثر کا سب سے پہلا گہوارہ یہی تھا اور یہیں سے، ہندوستانی زبانیں بولنے والوں کا میل ملاپ، عربی اور فارسی بولنے والوں کے ساتھ شروع ہوا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسی کے عربی نام پر، سارے ملک کا نام "ہند" اور یہاں کی زبانوں کے لئے، "ہندی" کا نام مخصوص ہو گیا، جو آج ملک کی عظمت کا نشان بن گیا ہے۔

اس وقت، ہندوستان کی، ہند آریائی زبانیں اپنے ارتقا کے دوسرے دور، یعنی پراکرتوں کی حالت میں تھیں، جس کا نقشہ یہ تھا کہ پنجاب، سندھ اور گجرات میں، جو زبانیں رائج تھیں، وہ ایک پراکرت سے تعلق رکھتی تھیں، جس کو بعض وقت بیرونی دائرے کی بولی سے بھی موسوم کیا گیا ہے مہاراشٹر علاقے میں اس پراکرت کا نام "مہاراشٹری" تھا، اس کی خصوصیت یہ تھی کہ، قدیم ہند آریائی کے حروف صحیح کے ساتھ اس کا سلوک کسی قدر بے دردانہ تھا، چنانچہ سنسکرت کے الفاظ، "پریا"، "راجا"، "کوکیلا"، کی شکل، اس میں "پیا"، "رایا" (جس سے بعد کا رائے مشتق ہے)

اور "گوئیلا" ہو جاتی ہے۔ مشرقی پنجاب اور صوبۂ متحدہ
میں، شورسینی کا دور دورہ تھا، جو سب سے اہم پراکرت
سمجھی جاتی ہے۔ علاقہ اودھ میں اَردو ماگدھی اور
بنگال اور آسام میں ماگدھی رائج تھی۔ راجستان کے
علاقے میں کوئی مِلی جلی پراکرت مروج تھی، جسے کچھ آونتی
اور کبھی ابھیری وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔
ماہرینِ لسانیات کا کہنا ہے کہ، اس وقت یہ
پراکرتیں، اور خاص طور پر شورسینی، پراکرت کے رتبہ
سے بھی نیچے گر کر، "آپ بھرنشہ" یعنی مسخ ہو رہی تھی۔
اس سے جو زبانیں بنیں وہ برج بھاکا، بانگرو، بندیلی
قنوجی اور ہندوستانی کہلاتی ہیں۔ راجستان کی پراکرت
سے، موجودہ مالوی، میواتی، مارواڑی اور گجراتی
بولیاں پیدا ہوئیں۔

ان تمام بولیوں کی تشکیل کا آغاز ۱۰۰۰ء کے
قریب ہوتا ہے اور یہ زمانہ محمود غزنوی کی فتح پنجاب سے
کم و بیش مطابقت رکھتا ہے، اس وقت تک مسلمانوں
کو ہندوستان میں بسے ہوئے تین صدی کا عرصہ گزر
چکا تھا۔ اردو کے اولین آثار، جو ہم کو دستیاب ہوئے
ہیں، وہ اس کے دو سو سال بعد کے ہیں۔ گویا اس
زبان کو تشکیل پاتے پاتے پانچ سو سال کا عرصہ لگ گیا۔
یہی زبانوں کی تشکیل اور ارتقا میں فطرتاً ہوتا ہے۔
اردو ہی کے دوش بدوش دوسری جدید ہند آریائی
زبانیں بھی تشکیلی دور سے گزر رہی تھیں، چنانچہ ان کے
اولین ادبی آثار بھی، بارھویں صدی سے لے کر پندرھویں
صدی عیسوی تک کے زمانہ پر حاوی ہیں اور سب سے
پہلے نمونے جو ہم کو ملتے ہیں، وہ اردو ہی کے ہیں۔

محمود غزنوی اور اس کے جانشین مسعود کے
زمانے میں، اردو کی پُر امن تشکیل کے لیئے موقع فراہم
ہو گئے تھے، چنانچہ اس زمانے تک اس کو یہ حیثیت
حاصل ہو چکی تھی کہ وہ ایک مستقل زبان سمجھی جانے لگی تھی
اور نہ صرف فارسی، بلکہ عربی کو بھی وہ متاثر کرنے لگی تھی۔
فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں اس کے الفاظ راہ
پانے لگے تھے، چنانچہ کافور (کپور) امبج (آنب) صندل
(چندن) قرنفل (کرن پھول) معرب ہندوستانی الفاظ
ہیں اور کوتوال، ردی، پانی، مور، توتا، رتی، ماشہ،
غرض بیسیوں اردو الفاظ، فارسی میں داخل ہو گئے تھے۔
کوتوال جو دراصل کوٹ + وال" یعنی قلعہ والا یا
قلعہ کا نگہبان ہے، فردوسی جیسے مستند فارسی شاعر کے
کلام میں بھی ملتا ہے۔

یہی زبان تھی جس کو ساتھ لے کر مسلمان، دہلی
پہنچے تھے۔ اس سرزمین کی بولیوں نے اردو زبان کے
ارتقاء کی دو اہم منزلوں پر اثر ڈالا۔ ایک تو اس موقع
پر، جب وہ ایک سیال بولی کی صورت میں پنجاب سے
ابھی ابھی آئی تھی دوسرے، اٹھارویں صدی کے
وسط میں، جب اس کی چار سو سال پہلے کی تشکیل دکن
سے یہاں پہنچی تھی۔

دہلی، دراصل چار بولیوں کا نقطۂ اتصال ہے۔
مشرقی پنجابی، برج بھاشا، اور راجستانی دونوں،
"اُو = o" یا "اَو = au" گروہ کی زبانیں کہلاتی
ہیں۔ یعنی ان کے اسما، صفات اور افعال کی آخری
علامت "اُو" یا "اَو" ہوتی ہے۔ جیسے "میرا بیٹا
آیا" کی صورت، ان زبانوں میں "میرو بیٹو آیو"
ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں بانگرو اور راجستانی
میں یہی صورت، میرا بیٹا یا پُت یا پُتر آیا" ہوتی ہے۔
ان لسانی صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے، ظاہر ہے کہ،
وہ پرانا مقبول نظریہ، جو اردو کا نشوونما برج بھاشا سے
کرتا تھا، معلق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب، بعض ماہرین
لسانیات جیسے پروفیسر چٹرجی اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور نے، لسانی شہادتوں سے اس کو پایۂ ثبوت کو پہنچا
دیا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے چند مروجہ الفاظ جیسے

"سچ" "کل" "رتی" پیش کئے جا سکتے ہیں، جن کی شکل پنجابی ہے۔ مغربی ہندی میں یہ شکلیں ساچ، کال، رائی وغیرہ ہوئیں۔

اردو کے نشو و نما کے سلسلے میں برج بھاشا کا جو نام لیا جاتا تھا، اس کا اصل ایک سبب تھا، اس نئی زبان کے نشو و نما پانے سے پہلے مغربی ہندی کی شاخوں میں یہی ایک بولی، گیتوں اور نظموں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ دہلی کے بعض مسلمان شعرا جیسے قطب تکاناں اور رس خان، وغیرہ نے بھی اس کو استعمال کیا تھا، اس لئے دہلی کے بعد کے دور میں، اس پر کچھ اثر برج بھاشا کا کا بھی مشاہدہ کیا گیا تو بعض مصنفین نے جن میں میرامن اور آزاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس کے ڈانڈے برج بھاشا سے ملا دئے۔

اردو کو تشکیل دینے میں پراکرت یا اپبھرنشہ سے عام مسلمانوں کی ناواقفیت نے جو آسان طریقے اختیار کئے وہ نہایت دلچسپ ہیں۔ زبانوں کو صرف نحو کے پیچیدہ اصولوں کے خلاف اپنی سہولت کے مطابق استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جس کی وجہ سے صیغے، حالتیں، تعداد اور جنس کی علامتیں سب غلط ملط ہوگئیں۔ اس کی ایک مثال موجودہ اردو کی حالت فاعلی ہے، جو دراصل اگلی زبانوں میں حالت واسطہ تھی۔ جس کی وجہ سے اردو جملوں کی ساخت، متعدی افعال کے ساتھ مجہول ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اردو کے جملے "میں نے روٹی کھائی" کا لفظی ترجمہ اگر ہم انگریزی میں کریں تو ...... (By me the bread was eaten) ہوگا۔ الفاظ کی پراکرت صورت کی تبدیلیوں کی مثالیں بے شمار ہیں۔ مثلاً "آگی" کو آگ "اردھا" کو ادھا یا آدھا "کنگلا" کو کنگال، "اکاویس" کو اکیس، "کب بھا" کو "کوبڑا" "اکھی" کو آنکھی اور پھر آنکھ وغیرہ کر لیتے تھے۔ پراکرت کے مرکب فعل کی تمام خصوصیات کو ظاہر کرنے کے لئے جس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر لئے جاتے تھے، وہ بھی بڑی دلچسپ چیز ہے۔ مثلاً "پالیتی" پالی پراکرت کا فعل ہے جس کے معنی "وہ پالتا ہے" کے ہیں۔ اس میں "پال" مصدر کو باقی رکھ کر، صیغے اور زمانے کے لئے "وہ" "تا" اور "ہے" کے ٹکڑے جما لئے گئے ہیں۔ یہ زبان کو آسان بنانے کا وہ عجیب و غریب عمل ہے جس کے سبب اردو، دنیا کی سب سے زیادہ تجزیاتی یعنی (Analytic) زبانوں میں شامل ہو گئی ہے۔ فارسی اور عربی کے جو الفاظ انہیں استعمال کرنے پڑتے تھے، ان سے فعل بنانے کا آسان ترین طریقہ بھی انہوں نے اختیار کر لیا تھا، اور وہ اس طرح کہ لفظ جو عموماً اسم ہوتا تھا اس کے بعد "کرنا" بڑھا لیتے تھے جیسے "صاف کرنا" "دق کرنا" "شرمندہ کرنا" "جنگ کرنا" وغیرہ اس کو کبھی کبھی اور بھی آسان کر کے ہندی اسماء پر بھی حاوی کر لیا گیا جیسے "کھوجنا" "لڑنا" "جھگڑنا" وغیرہ "تجویزنا" اور دوسرے اس قسم کے افعال کی بھی یہی صورت ہے۔ اسی کے نمونے پر جامعہ عثمانیہ نے "برقانا" وغیرہ کے طریقے کو علمی زبان میں رائج کیا ہے۔ اردو (اور ہندی کے بھی) اس طرز عمل پر ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ زبانوں کی تشکیل میں مثال یا مشابہت بڑا عمل کرتی ہے۔ ایسے تمام افعال بنانے کے لئے ان کے پاس، فارسی کے نمونے "صاف کردن" "تجویز کردن" "جنگ کردن" وغیرہ موجود تھے۔ یہ تسہیل و ترکیب ہندوستانی زبانوں کا بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جس کے سبب، اس کو دوسری زبانوں پر فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔

اردو اور ہندی کے موجودہ ارتقاء میں عربی، فارسی رسم خط کو بھی بڑا دخل ہے، چنانچہ

اس کی وجہ سے ایک طرف بعض ضروری آوازوں جیسے "ز" "ژ" "ف" کے ادا کرنے کے ذریعے مہیا کئے، دوسری طرف سنسکرت کے اصول کے مطابق ہر لفظ کے آخری حرف صحیح میں جو ایک مختصر "آ" یا "ہلا" کی آواز پوشیدہ رہتی ہے، وہ فارسی میں علامت نہ ہونے کی وجہ سے ترک کر دی گئی اور لفظ فارسی اصول کے مطابق، ساکن بن گیا جیسے "پدٗ" سے "پدْ" "جگٗ" سے "جگْ" "پھلٗ" سے "پھلْ" وغیرہ۔

سب سے آخری بات یہ ہے کہ، قدیم زمانے سے ہندوستان کے علمی اجارہ داروں نے سنسکرت کے سوا، کبھی کسی عوام کی زبان کو منہ نہیں لگایا، پالی کا نشوونما دراصل اسی علمی اور مذہبی اجارہ داری کے خلاف ایک تحریک تھی، جس کا، ہندوستان میں جو حشر ہوا، ہمارے سامنے ہے، اس کے علاوہ عوام کی زبانوں کی سرپرستی کے ثبوت بہت کم ملتے ہیں۔ اسی دباؤ کا اثر تھا کہ ہندوستان کے مصنفین، جب جدید زبانوں میں لکھنے بیٹھتے تو، مجبوراً، قدیم شکلوں اور طرز کی طرف مائل ہو جاتے تھے، اس عادت کو بیمس نے اس طرح ظاہر کیا ہے کہ "ہندوستانی مصنف جب لکھنے بیٹھتا ہے تو وہ غیر فطری بن جاتا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف تمام ماہرین لسانیات کو ہے"۔

لیکن مسلمان بادشاہوں نے، جب عوام کی زبانوں کی سرپرستی شروع کی تو چند سال کے اندر اندر ساری جدید زبانوں میں تصنیف و تالیف کے شوق کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ چنانچہ اودھی میں "پدماوت" اور "رامائن" بنگالی میں "رامائن" اور "ویدوں" کے ترجمے، راجستانی، گجراتی اور مرہٹی میں میرابائی، پدمانا اور اکنا تھ جیسے عظیم الشان شعرا اور مصنفین اٹھنے لگے۔ یہ ذہنی انقلاب سلطان محمود غزنوی کا کے زمانے سے شروع ہو چکا تھا، جس نے سنسکرت اور دوسری جدید زبانوں کی سرپرستی کی اور معتبر شعرا، جیسے مسعود سعد سلمان، امیر خسرو، عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ سب نے عوام کی زبانوں میں لکھنا شروع کیا۔ اس تحریک سے ہندو مذہبی رہنماؤں نے بھی فائدہ اٹھایا، اور عوام تک پہنچانے کے لئے مذہبی ادب کو جلد جلد، عوام ہی کی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس طرح، اردو، جدید ہند آریائی زبانوں کے نشوونما کا بھی براہِ راست باعث ہوئی۔

عبدالقادر سروری

چرواہے

وہ بانکے ترچھے چرواہے یوں پھرتے ہیں میدانوں میں
جیسے رنگیلی تیتریاں منڈلاتی ہیں بستانوں میں
کہساروں میں لہراتے ہیں درّاکے ہیں ویرانوں میں
موسم کے ارادے تولتے ہیں پروائی کی میزانوں میں
انگور کی لذّت پاتے ہیں مکئی کے جھلستے دانوں میں
دن بھر کی تھکی ہاری چڑیاں جب آتی ہیں کاشانوں میں
یہ اپنا جی بہلاتے ہیں ! پریوں کے حسیں افسانوں میں
صدیوں سے اجڈ کہلاتے ہیں فیشن کے غلام انسانوں میں
لیکن یہ اِن سے بڑھ کر ہیں مضبوط اپنے ایمانوں میں
رکھتے نہیں اپنی مورتیاں تہذیبوں کے بت خانوں میں
تاریخ مرتب کرتے ہیں کھیتوں میں اور کھلیانوں میں

جب تک یہ گڈریے جیتے ہیں
گیتی کے گریباں سیتے ہیں

احمد ندیم قاسمی

شکوۂ آبلہ ابھی سے میرؔ ہے پیارے ہنوز دلّی دور

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد ہی سے کالج کے خواب دیکھنے لگی تھی۔ ابھی نتیجہ بھی تو نہ نکلا تھا۔ جانے کیوں، کالج کے نام سے ایک خوشگوار کپکپی سی ہوتی تھی۔ جیسے ملیریا کا بخار چڑھ رہا ہو۔ جاڑا جاڑا سا ہوتا۔ لیکن ایک لطف سا محسوس ہوتا۔ ہر روز سوچتی تھی کہ آخر کونسا مضمون لینا میرے لیے بہتر ہوگا۔ سائنس —— اونھوں —— کیا کروں گی سائنس لے کر۔ کونسے تیر مارنے ہیں۔ کونسی ایجاد کرنی ہے۔ بم بنانے ہیں۔ مشین گن بنانی ہے۔ آخر ہے کونسی مصیبت —— گھریلو زندگی کی سائنس ہی ہم ہندوستانی لڑکیوں کو آجائے تو کافی ہے۔ ایک رد ٹی ٹھیک طور سے ڈالنی تو آتی نہیں اور چلے شان بگھارنے۔ سائنس میں بھی تو کئی شعبے تھے۔ ایک شعبہ تھا نباتیات۔ آپا نے نباتیات لی تھی۔ ان کو چھٹیوں میں دیکھتی تھی۔ پتہ پتہ بوٹا بوٹا کسی چیز کو ڈھونڈھتی پھرتی ہیں۔ میں باغ لگا لگا کر حیران۔ وہ نوچ نوچ کر مجھے آزردہ کرتی تھیں۔ پوچھتی تو جواب ملتا۔ ارے ہم کو اس پھول میں کچھ ریسرچ کرنی ہے۔ نہ جانے یہ ریسرچ کیا بلا ہوتی ہے۔ کون جانے یہ سب۔

لیکن میں نے بعض نباتیات لینے والے بی۔ ایس۔ سی کے گھر دیکھے تھے۔ اجاڑ سے پڑے تھے۔ نہ درخت نہ گملے! نہ بیل نہ بوٹے!! باغ تو بڑی چیز ہے!!! میں سوچتی تھی، یہ لوگ کیوں فیشی شیشی کو کوئی ایسا مضمون لے لیتے ہیں، جس میں سلیقہ سے اپنی کارگزاری بتا بھی نہیں سکتے —— میں نے باغ میں کچھ سبزی لگائی تھی۔ میرے پودوں میں چیونٹیاں لگ رہی تھیں۔ بڑا افسوس ہوتا تھا اپنی محنت اور شوق کی چیزیں یوں ویران ہوتیں دیکھ کر۔ نباتیات کے ایک پروفیسر سے پوچھا کہ بتائیے کیا علاج کروں ان کے دفیعہ کا؟ آخر آپ لوگوں نے کچھ تحقیق کی ہوگی! —— وہ بس ٹکوں سے ہوگئے۔ کچھ بھی تو نہ بتا سکے۔ کہدیا مجھے باغ داغ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور نہ کبھی ان خرافات کی تحقیق کی ہے۔ کتنی بدمذاقی ہے اس جواب میں —— ! افسوس!! بہت سی آرزوئیں خاک میں مل گئیں ——

حیوانیات سے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ اس شعبہ سے بھی ایک بدگمانی سی تھی۔ سنا مینڈک چیرنی ہوتی ہے۔ تمام وقت بدبو میں دن گزارنا ہوتا ہے۔ میں تو بڑی بد دماغ ہوں۔ بدبو کی ذرا برداشت نہیں۔ تانے شاہ کا دماغ ہے اس حیثیت سے۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی۔ یہ سب کیونکر سہہ لوں گی۔ ڈاکٹری کا بھی خیال تھا۔ مگر اس پیشہ سے بھی بدظنی تھی۔ ڈاکٹر جتنی صفائی کا پروپگنڈہ کرتے ہیں اتنے ہی غلاظت میں گھرے رہتے ہیں۔

پھر ایک لہر آئی کہ نہیں جی انٹر میں تاریخ لیں گے۔ یہ کیسی رہے گی۔ پھر سوچتی کہ یہ تو وہی لے سکتا ہے جس کا دماغ رٹو قسم کا ہوتا ہے۔ جس کا حافظہ زبردست ہے جس کو برسوں کی باتیں یاد رہتی ہیں۔ مجھے تو اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں رہتی۔ اپنی بے ہنگام زندگی کا کوئی اہم سے اہم واقعہ بھی بھول جاتی ہوں —— بس مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا۔

پھر آخر یوں کیا سر اپنا —— اب شعبۂ فنون کے دوسرے پہلو کو سوچتی کہ اردو، فارسی اچھی رہے گی۔ یا اردو کے ساتھ کوئی اچھا سا مضمون اور لے لوں گی۔ اپنی زبان ہے۔ اس پر ہی قدرت آجائے۔ مگر یہ اردو کے ساتھ ہندی بھی ضروری ہے۔ یہ ہندی کیا ہوتی ہے؟ ہاں ع کو گرد راہ ہے مگر آندھی کے ساتھ ہے۔

سیکھ لوں گی - کیا ہوا ایک نئی زبان تو آجائے گی - کیا سوچ ہے - ہندی میں ایک لوچ اور شیرینی ہے - بڑی پیاری سی زبان ہوتی ہے - غرض یہ جاگتے خواب دیکھتی ہوئی سو گئی - اب سپنوں میں دیکھئے کون آتا ہے - میں خواب ہی میں میٹرک کامیاب ہو گئی ہوں اور کالج کھلنے کی دھن ہے - ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ کالج کب کھلے گا - یہ اتنی لمبی لمبی چھٹیاں کیوں ہوتی ہیں ؟ غرض بڑی بے چینی سے منتظر تھی کہ کالج کھلے اور میں جلد اپنی منزلِ مقصود پر گامزن ہو جاؤں - مگر کہاں - وہ تو کھلتا ہی نہ تھا - انتظار میں بھی کتنی تلخ لذت ملتی ہے - یہ تو بس ہم ہی جانتے ہیں - جوں جوں وہ مبارک دن قریب ہونے لگا میری امیدیں سر اٹھانے لگیں - میں نے بہت سی اوڑھنیاں رنگ برنگ کی رنگ لیں کہ شاید پھر فرصت نہ ملے - اس رنگ کی چوڑیاں لیں - جو ان دوپٹوں کو "میچ" کر سکیں - امی سے کہہ کر نئے نئے سینڈلز خریدے - بھیا سے کہہ کر ایک اچھا سا فونٹن پن لیا - نوٹس جو لکھنے ہوتے ہیں - غرض کالج کھلا - اور ہم داخل کیمپ ہوئے -

بھانت بھانت کی لڑکیاں - کالج کا صحن ان رنگا رنگ بوقلمونیوں سے ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دھنک پھیل گئی ہے سارے صحن میں ـــــ پہلا دن کھیلتے - باتیں کرتے ہی گزر گیا - یہ سوچتے - وہ پوچھتے - یوں تیوں شام ہوئی - ہم گھر لوٹے - نئے مسائل کو بھیک کی جلدی ہوتی ہے - ہمیں بھی اپنی کلاس دیکھنے ، اپنے لکچرار سے ملنے کا ایک مجنونانہ اشتیاق تھا - ہم نے فارم بھرے اور داخل کر دیئے - ایک ہفتہ تک جبیں سائی کی - خدا خدا کر کے وہ دن آیا کہ ہم نو وارد مشتاقانِ علم کا انٹرویو ہوا - صحن کالج سے آفس تک ایک "کیو" بن گئی تھی - جگہ جگہ کی لڑکیاں ، قسم قسم کی صورتیں ، کبھی اتنے سب کو یکجا دیکھنے کا ـــــ اور پھر ایک ہی غرض کے لئے ، کاہے کو اتفاق ہوا تھا - کالج بند صق ایک بکھرے شیرازہ کو سمیٹ کر ایک کر دیتا ہے - کسی کی صورت پسند آئی کسی کے لباس کا سلیقہ ، کسی کے بال ، کسی کی آنکھیں ، اخلاق اور فطرت کا تو پتہ کیسے چلے ، پہلی نظر میں - دن مہینے اور سال لگ جاتے ہیں بعض وقت تو جب اخلاق کے جوہر کھلتے ہیں - بہت سے حسین دیکھے تھے - مگر مل کر رہنے کے بعد بڑا ہی تلخ تجربہ ہوا - حسن دھوکا ہے - غرض ان خیالات کے آتے ہی فلاسفی کا خیال آیا - بہتر ہوگا اگر فلسفہ لے لوں ـــــ یہ دنیا یوں ہی آنکھوں سے اتر گئی ہے - اب اور بھی اتر جائے تو کیا اچھا ہو ـــــ

انٹرویو کے بعد ـــ ہم اپنی اپنی کلاس میں بھجوائے گئے - لکچرار صاحبہ آئیں - ہم منچلوں نے دبی زبان میں گنگنایا ؎

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

انھوں نے نام پوچھے - اختیاری مضامین سے متعلق سوالات کئے - کالج کیسے پسند آیا ؟ کون سے اسکول کی ہو وغیرہ وغیرہ ـــ ہم کو لکچر سننے کی جتنی عجلت تھی ان کو دینے کی نہ تھی - دینے والے اپنی چیزیں کتنے تکلف منتن بلکہ چونچلوں سے دیتے ہیں - ارے فدا سمجھے ان سے ـــ

خیر - گھنٹہ ختم ہوا - دوسری لکچرار آئیں - انھوں نے بھی کچھ اسی سے ملتے جلتے سوال کئے خود کو روشناس کیا اور یہ کہہ کر کہ آج موسم کتنا اچھا ہے ، پڑھانے کا موڈ نہیں ہے - یہ سنتے ہی ہمارا پڑھنے کا موڈ بھی یہ جا اور وہ جا - سرد پڑ گیا -

ہم نے امتحان کے بعد بہت دن بے کاری میں گزارے تھے - پڑھنے اور نئے نئے لکچر سننے کے

افلاسی جیسے ہوگئے تھے۔ علم کی پیاس بھی کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن جب ہمارا ساقی ہی بخیل ہو تو ہم کیا پی سکتے ہیں۔ کسی نے کہا پہلے چند روز تک پڑھانے کو طبیعت نہیں چاہتی۔ کسی نے فتویٰ دیا، بیکار رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ اب ایکدم سے کام کرنے کو کس کا جی چاہے گا۔ چلئے یہ سلسلہ بھی چار چھے روز قائم رہا۔ اس کے بعد تو پڑھائی باقاعدہ ہونے لگی۔ یہ تعبیر ہے میرے سپنوں کی ـــــــ

آپ اپنی بنایئے ؟

ارے نہیں! یہ تو خواب تھا۔

نہیں بلکہ ـــ

کبھی غم تھا، کبھی احساسِ غم تھا اور کبھی دونوں
محبت میں گزاری اس طرح سے زندگی ہم نے

جہاں بانو بیگم

نویدِ امن

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
ہوائے سازگار ہے
فضائے کیف بار ہے
بہار لالہ کار ہے
نگاہ بادہ خوار ہے

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
روش روش، چمن چمن
کھلے ہوئے ہیں یاسمن
جوانیوں کی ہے پھبن
حیاتِ نو ہے نغمہ زن

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
نویدِ امن کی ملی
جہاں کو زندگی ملی
سکوں ملا خوشی ملی
گلوں کو تازگی ملی

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
گھٹائیں جھوم کر اٹھیں
اٹھا بھی جام ہم نشیں
پلا شرابِ آتشیں
سنا سُرودِ دل نشیں

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
نہیں ہیں غم کی بدلیاں
وہ جنگ کی تباہیاں
تباہ کن لڑائیاں
اداس ہولناکیاں

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے
جہاں کو اک قرار ہے
خوشی سے ہم کنار ہے
قدم قدم بہار ہے
کہ فضل کردگار ہے

بہار ہی بہار ہے، بہار ہی بہار ہے

مظفرالدین ظفر

ایثار

جس وقت کسی شخص کو چاروں طرف سے مصیبتیں آگھیرتی ہیں تو اکثر یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ وہ بے خود سا ہو جاتا ہے اور اس کے دل و دماغ کی ساری قوتیں جواب دیتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن ایسے میں عورت کا عالم بالکلیہ جداگانہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ناپیدا کنار سمندر میں اس کی کشتیٔ حیات ہچکولے کھاتی ہے اور آلام و مصائب کے قیامت خیز طوفان کی نذر ہونے لگتی ہے، آسمان کو چومنے والی سمندر کی موجیں اس کی زندگی کا شیرازہ بکھیر دینے کے لئے اس کی طرف بڑھتی ہیں، مگر اس کی پیشانی پر شکنیں تک نہیں آتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مرد ریت کے ذروں سے تیل نکال سکتا ہے، شراب کو پانی بنا سکتا ہے، مگر اس زندگی میں ایک عورت کے صبر و استقلال ضبط و تحمل کا مقابلہ نہیں کر سکتا، وہ مصیبتیں جو مرد کی کمر کو دہرا کر ڈالتی ہیں، عورت ان کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے۔ مگر افسوس! کہ دنیا عورت کو جسم بے روح تصور کرتی ہے حالانکہ تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ صنف نازک نے قوموں کی تقدیریں زیر و زبر کر دیں، حکومتوں کے تختے الٹ پلٹ کر ڈالے۔ دہر میں ایک ہل چل پیدا کر دی۔ ساتھ ہی مرد کو زندگی جاوید بخشی، اس کی ہمدرد و غمخوار بنی۔ اس کی مصیبتوں میں ہاتھ بٹایا، اور اس طرح اس کی مقدر کی تاریکیوں کو اپنی ان تھک محنت و کوشش سے چکا چوند کر ڈالا۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کا سکون قلب بنا کر اس جہان فانی میں تخلیق فرمایا ہے کہ وہ اس وقت جب کہ مرد کی ہمت جواب دے چکی ہو، اس کے حوصلوں پر پانی پھر چکا ہو، ناکامیوں، نامرادیوں کے گھٹا ٹوپ بادل اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہوں، تو وہ نور بن کر، اس کے قلب کا سرور بن کر اس میں روح تازہ کی تخلیق کرے، وہ ہمت اور وہ حوصلہ بخشے جس سے اس میں آگے بڑھنے کی طاقت پیدا ہو جائے، حیات مستعار کی ساری کلفتیں اطمینان قلب سے مبدل ہو جائیں، امن اور چین اس کا رفیق ہو، عورت جس کی شفیق ہو......... غرض یہ مشاہدات ایک ایسے درد بھرے واقعہ کو تازہ کرتے ہیں جو اپنے اندر ایک داستان چھپائے ہوئے ہے،

انگلستان میں لیتری نامی امیر گھرانے کا ایک شخص تھا پشتوں سے دولت گھر میں چلی آئی تھی، قسمت کا ایسا دھنی تھا کہ مٹی پر ہاتھ پھیرتا سونا ہو جاتا، طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ دولت نے اسے کبھی راہ انکساری و راستی سے نہ ہٹایا اور خوشامدی مصاحبوں کی چکنی چپڑی باتوں نے کبھی اس کا دماغ خراب نہ کیا، یہی وجہ تھی کہ اس نے ایک اوسط درجہ کے شریف گھرانے کی ایک حسین لڑکی میری نامی سے شادی کی، میری کے بھاگ جاگ گئے اور سوسائٹی میں اس کے حسن اور خوش مزاجی کے چرچے ہونے لگے۔ ایک طرف دولت بے اندازہ، طرف دیگر محبت بے پناہ۔ اس پر لطف یہ کہ طبیعتیں جدا جدا، مشرق و مغرب کا فرق۔ ایک طرف سنجیدگی و متانت کا دور دورہ تو ایک جانب ظرافت و زندہ دلی کا راج۔ مگر کیا مجال جو دونوں میں بال برابر بھی فرق آیا ہو، لیتری کی یہ آرزو کہ اس کے پاس جو کچھ مال و متاع ہے وہ بیوی کی نت نئی خواہشوں کی نذر ہو جائے اور میری کی یہ تمنا کہ اپنے شوہر کو مسرور و محظوظ رکھنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھے۔ پھر ایک دو روز نہیں، برسوں ان دونوں کی زندگی اسی طرح مہر و وفا اور ایک دوسرے کی رفاقت و محبت میں بسر ہوئی۔ دونوں کی رفتار سے کون بے خبر ہے؟ صبح شام اور شام صبح کچھ اس قدر تیزی سے آپس میں بدلے سدلے کا پتہ تک نہ چل سکا کہ کب صبح ہوئی اور کب شام، ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، زندگی کی منزلیں طے کرتے ہوئے

چلے جا رہے تھے اور یونہی چلتے رہتے اگر گردشِ روزگار ان کے درمیان حائل نہ ہوتی۔ فلک کینہ پرور اور تقدیرِ عبرت انگیز کو میاں بیوی کا چین، سُکھ ایک آنکھ نہ بھایا، ان پر ایک بلائے ناگہانی ٹوٹ پڑی، وقت نے پلٹا کھایا، پلٹا بھی ایسا کہ لیزلی کو دن ہی میں تارے نظر آنے لگا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ اس نے ایک کاروبار شروع کیا تھا اور نفع کی امید پر اپنی دولت کا ایک کثیر حصہ صرف کر ڈالا، رنگ میں بھنگ، پھول میں کانٹا، خوشی میں غم کی چاشنی - ان چیزوں کا کچھ ازل ہی سے ساتھ چلا آیا ہے اور پھر دولت کا حال تو چلتی پھرتی چھاؤں کا سا ہے..... چنانچہ یہی حشر لیزلی کا ہوا کہ ایک تو ناتجربہ کاری، دوسرے تقدیر کی ناسازگاری دیکھتے دیکھتے وہ شخص...... وہ شخص روپیہ جس کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا پیسہ پیسہ پر نظر رکھنے پر مجبور ہوگیا اور وہ سرمایہ جس سے صدہا امیدیں وابستہ تھیں منٹوں میں ہاتھ سے جاتا رہا، نقصان ہوا جس سے لیزلی کا صبر و شکیب جاتا رہا۔ چند روز تو اس نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ حال اپنی مشفق بیوی پر ظاہر نہ ہونے پائے۔ لیکن آخر کب تک..... اس کی خاموشی، اس کے چہرے کی بے چینی میری کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی؟ اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ہو نہ ہو لیزلی پر آفتِ ناگہانی کا آسمان ٹوٹ پڑا ہے، لیکن وہ چاہتی تھی کہ لیزلی خود ہی انکشافِ حال کرے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، گردشِ روزگار کا دھارا ضبط کے بندوں کو توڑ کر بہ نکلا اور وہ لیزلی جس نے اپنے احوال کے چھپانے کے ہزاروں جتن کئے تھے، اپنی بیوی کو ہمراز بنانے پر مجبور ہوا، حالات نے اسے مجبور کیا کہ کوئی اس کا غمخوار ہو، کوئی اس کا شفیق ہو، کوئی ہو جو اس کی مصیبتوں میں شریک ہو لیکن اسے علاوہ کر یہ خیال ستاتا تھا کہ کہیں اس کی ناداری...... اس سے اس کی چہیتی بیوی کو بیگانہ نہ کر ڈالے اور کہیں وہ ذات جو اس کے قلب کا سرور اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، اس سے کنارہ کشی نہ کر بیٹھے۔ بے چین ہو ہو جاتا جب اسے خیال آتا کہ کہیں اس کا اظہارِ حال میری کے لبوں کی دلفریب مسکراہٹ، اس کے دل خوش کن نغمات اور اس کی آنکھوں کی مستانہ جھلک کو اس سے چھین نہ لے...... مگر ایسے لمحات آ ہی پہنچے جب کہ اس کے دل پر اندھیاری گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، مستقبل کی مصیبتیں ایک ڈراؤنا اور بھیانک منظر پیش کر رہی تھیں اور لیزلی اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا اپنی ماضی کی زندگی میں گردش کر رہا تھا، اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی کہ اتنے میں اس کی بیوی رحمت بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی، لیزلی گویا ایک خواب سے چونک پڑا، بیوی کی طرف دیکھا جس کے معصوم چہرے اور دلکش نگاہوں سے محبت و وفا ٹپکی پڑتی تھی، دونوں خاموش تھے۔

لیزلی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا وہ اپنے نورانی وجود سے اس کے دل کے ظلمت کدوں کو سکون و اطمینان کے نور سے منور کر رہی ہے، تھوڑی دیر تک کمرہ میں خاموشی چھا گئی، لیزلی کو ایکبار چند لمحوں کے لئے پھر انھیں خیالات نے آگھیرا جو اس کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے تھے، اس نے نگاہیں نیچی کر لیں، اس کے چہرہ پر مردنی سی چھا گئی، وہ سوچنے لگا، بھلا کیسے یہ حسن و عیش کی دیوی مفلسی و ناداری کی ناقابلِ برداشت مصیبتیں جھیل سکے گی، کس طرح وہ عیش و آرام کی زندگی کو مصائب و آلام پر قربان کر سکے گی؟ لیزلی انھیں خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ میری کی آواز نے اس کی ایک ایک گتھی سلجھا دی، آنکھ اٹھائی تو بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے تھا جو اس سے اس کی پریشانیوں کی کنہ پوچھ رہا تھا، اس نے اس وقت اپنے آپ میں ایک نئی طاقت محسوس کی اور وقت کی موزونیت سے فائدہ اٹھا کر صاف صاف الفاظ میں اپنی غم آلود زندگی کے

انقلاب کا حال کہہ سنایا' میری نے بلا چون وچرا سب سنا'
لینزلی اب نتیجہ کا منتظر تھا...... وہ عورت جس نے
مدتوں تک زمانہ کی تلخیوں کا ایک گھونٹ نہ چکھا ہو'
جس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسرتوں اور خوشیوں کی
نذر ہوا ہو' گوش ہوش سے اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے شوہر
کی زبانی سنا اور مسکرانے لگی۔ لینزلی متحیر نگاہوں سے
میری کو دیکھنے لگا جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی' قلبی
محبت کو اس دولتِ فانی سے کیا نسبت ہے میں تمہاری
ہوں' تمہاری رہوں گی ...... یہ بول نہیں تھے
امرت پارے تھے' لینزلی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے
اپنی ساری کھوئی ہوئی دولت پالی' اسے گویا قارون
کا خزانہ ہاتھ آگیا۔ میری کے ان الفاظ نے اس میں
حیاتِ نو کی تخلیق کی اور غیر فانی محبت کا پیام دیا' بیم و
رجا کے پردے اس کی نگاہوں سے اتار پھینکے اور اس
مقام پر پہنچا دیا جہاں وہ بڑی سی بڑی مصیبت اور
بڑے سے بڑے رنج و غم کے مقابلہ کے لئے تیار تھا'
اس کے دل پر خوشی کا راج تھا اور وہ اپنی رفیق حیات
کے ہمراہ مفلسی و ناداری کی بھیانک وادیوں پر گلگشت
کرنے پر آمادہ تھا .... کیا یہ روح اس میں
عورت ہی کی پھونکی ہوئی نہ تھی؟

منیزہ بانو کاؤس جی

نئی کتابیں

۱۔ مقامِ اقبال، از اشفاق حسین ایم۔ اے (عثمانیہ) حجم ۲۳۰ صفحے قیمت للعہ پتہ ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن
۲۔ ضیغم (افسانے) از سعیدہ مظہر قیمت عہ پتہ انڈیا بک ہاؤس۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۳۔ نئی کروٹیں (افسانے) از قمر تسکین 〃 ہے 〃 〃 〃
۴۔ معاشقے (افسانے) از قمر انبالوی 〃 ہے 〃 〃 〃
۵۔ سازِ فطرت (〃) 〃 حسن عزیز احمد جاوید قیمت عاں 〃 〃 〃
۶۔ قسمت (〃) 〃 〃 〃 〃 〃 〃
۷۔ نئی فضائیں (〃) از قمر تسکین قیمت عاں 〃 〃 〃
۸۔ سرخ افسانے (روسی افسانے) حجم ۳۰۰ صفحے قیمت ہے پتہ۔ نیا کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دہلی
۹۔ سرراہے گاہے (ادبی مضامین) از ڈاکٹر سید منظور حسین زیدی حجم ۱۹۰ صفحے قیمت عاں پتہ قریشی بک ایجنسی کشمیری بازار لاہور
۱۰۔ آثارِ اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید حجم ۳۲۰ صفحے قیمت ہے پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن۔
۱۱۔ تلخ و شیریں (افسانے) مترجمہ صلاح الدین قریشی قیمت عاں پتہ مکتبہ جہاں نما۔ اردو بازار۔ دہلی
۱۲۔ ذکر و فکر (مجموعۂ کلام) از رعنا و صبا اکبرآبادی قیمت عہ 〃 منظور احمد۔ کڑہ کا جی حسن۔ آگرہ
۱۳۔ ہندوستان کا نظام زر۔ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی۔ حجم ۲۹۲ صفحے قیمت ہے پتہ ادارۂ معاشیات۔ فاطمہ منزل حمایت نگر حیدرآباد دکن
۱۴۔ ترقی پسند ادب۔ از عزیز احمد حجم ۲۵۶ صفحے قیمت ہے پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن۔
۱۵۔ تنقیدی حاشیے (تنقیدی مضامین) از مجنوں گورکھپوری حجم ۳۲۰ صفحے قیمت للعہ پتہ ادارۂ اشاعت اردو۔ حیدرآباد دکن
۱۶۔ بیداری (علی گڑھ میڈیکل کالج نمبر) مرتبہ ملک عابد حسین و ابوالخیر حجم ۱۳۶ صفحے قیمت ہے پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
۱۷۔ رگِ سنگ (مجموعۂ کلام) از علی جواد زیدی قیمت عاں پتہ دکن بک ڈپو۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد دکن
۱۸۔ پرواز (〃) از علی سردار جعفری 〃 عاں 〃 〃 〃
۱۹۔ اسلام کے سیاسی تصورات (مضامین) مرتبہ غلام دستگیر رشید حجم ۲۴۲ صفحے قیمت ہے پتہ نفیس اکیڈمی۔
۲۰۔ شب تاب (مجموعۂ کلام) از اسرار الحق مجاز قیمت عاں پتہ نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی
۲۱۔ اشارے (افسانے) از طاہر میر۔ قیمت عاں 〃 〃 〃 〃
۲۲۔ پرانے خدا (〃) از کرشن چندر 〃 عاں 〃 〃 〃 〃
۲۳۔ غبار (افسانے) از قیسی رامپوری 〃 عاں 〃 〃 〃 〃
۲۴۔ ننگا پاؤں (افسانے) از شیر محمد اختر 〃 عہ 〃 ادارۂ ادبیات نو ۵۸ ٹیمپل روڈ۔ لاہور
۲۵۔ انوکھی مصیبت (افسانے) از حیات اللہ انصاری قیمت عہ 〃 〃 〃 〃
۲۶۔ چاندی کے تار (〃) از مہندر ناتھ 〃 عاں 〃 〃 〃
۲۷۔ نئے پرانے (〃) از سہیل عظیم آبادی 〃 عاں 〃 〃 〃

مرزا سیف علی خاں

تنقید و تبصرہ

یوروپین اور انڈو یوروپین شعرائے اُردو و فارسی

از
رائے بہادر رام بابو سکسینہ
نول کشور پریس لکھنو

یہ ضخیم کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے لیکن اس کے ساتھ چار سو سے زیادہ صفحات کا ایک ضمیمہ بھی شامل ہے جس میں ان یوروپی اور انڈو یوروپین شعرائے اردو فارسی کے اردو کلام کے انتخابات درج ہیں جن کا ذکر اس بسوط تاریخ میں کیا گیا ہے۔ کتاب پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں بارہ ضمیمے الگ شامل ہیں۔ اس کا پیش لفظ رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے قلمبند فرمایا ہے جو اردو ادب کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں اور اردو شعر و سخن کے عہد حاضر میں سب سے بڑے سرپرست ہیں۔

رائے بہادر رام بابو سکسینہ اردو کے ایک خاص دلدادہ اور وسیع النظر ادیب ہیں ان کی تاریخ اُدب اردو ایک عرصہ قبل شایع ہو کر انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے ماہرین میں خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ان کی کئی اور کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں جن میں جدید اردو ادب پر تین جلدوں میں ان کی زیر ترتیب کتاب کا بڑے اشتیاق سے انتظار کیا جا رہا ہے۔

تاریخ ادب اردو کی اشاعت کے بعد سے رام بابو سکسینہ کی وسیع النظری اور ان کے مذاق سلیم کو بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ لیکن زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں علمی و ادبی تحقیق اور تلاش و جستجو کی بھی خاص صلاحیت موجود ہے اور وہ صبر و استقلال اور محنت و مشقت سے کبھی نہیں گھبراتے۔ چنانچہ اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں انھوں نے محنت و جستجو کا جو اعلیٰ ثبوت دیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔

یہ موضوع جس قدر وسیع ہے اس کا اندازہ اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر اردو کے بڑے سے بڑے ماہر تاریخ کو بھی نہیں مل سکتا اور بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ مصنف نے تلاش و تحقیق کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا اور اس طرح سے اردو ادب کے اس پہلو پر ایک ایسی مستند کتاب پیش کی جس پر شاید ہی کوئی اور اضافہ کیا جا سکے گا۔

اس کتاب کے پہلے پانچ باب دراصل ان اسباب کی وضاحت کرتے ہیں جن کی بنا پر مغربی ممالک کے نو واردوں نے ہندوستان کی تہذیب و معاشرت سے انس پیدا کیا اور ہندوستانیوں سے اتنے قریب ہو گئے کہ ان کی زبان میں شعر و شاعری بھی کرنے لگے۔ یہ پانچ باب بجائے خود ایک جداگانہ کتاب ہیں جن کو فرنگیوں اور ہندوستانیوں کے ابتدائی تعلقات اور میل جول کے عنوان سے اردو میں الگ شایع کیا جا سکتا ہے۔ غرض اس پس منظر کو پیش کرنے کے بعد چھٹے باب سے مصنف نے اصل تذکرہ شروع کیا ہے پہلے یوروپین شعرائے اُردو و فارسی کو لیا ہے اور ان کے بعد ارمنی، ہند برطانوی، ہند پرتگالی، ہند فرانسیسی، ہند جرمن، ہند اٹالوی شعراء میں سے ہر ایک طبقہ کے لئے ایک علاحدہ باب وقف کیا ہے۔ تیرھواں باب "مختلف ہند یوروپین شعرا" سے اور چودھواں باب "ہند یوروپین شاعرات اردو" سے بحث کرتا ہے۔ آخری یعنی پندرھویں باب میں پوری کتاب کا مختصر خلاصہ خدمات اردو ادب کے عنوان سے قلمبند کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان بڑی خوش قسمت ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے اردو کے مخالفین بھی اس امر کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ یہی زبان ہندوستان کی ایک مشترک قومی زبان رہی ہے جس نے نہ صرف اس ملک کے ہر حصے کے باشندوں میں مقبولیت حاصل کی بلکہ جو لوگ باہر سے ہندوستان آئے ان کا دل بھی موہ لیا۔ شاید ہندوستا

کی کوئی اور زبان ایسی ہو جس میں اس کثرت کے ساتھ بیرون ملک کے باشندوں نے شعر و شاعری کی ہو اور اپنے دیوان یا کلام یادگار چھوڑا ہو۔ میری نظر میں اردو زبان کی یہ خوش قسمتی بھی قابل رشک ہے کہ اس کے لئے رام بابو سکسینہ جیسا وسیع النظر عالم و فاضل اور محقق فراہم ہو سکا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ بہت جلد اس کا اردو ترجمہ شایع کیا جائے اور یقین ہے کہ جب وہ شایع ہو جائے گا تو اہل اردو اپنی زبان اور ادب کے اس محسن کی حقیقی خدمات سے واقف ہوں گے اور اس کا اعتراف کریں گے۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ زیر نظر کتاب کی اشاعت سے اردو کے وقار اور ہمہ گیری میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے اور اس کے مصنف نے نہ صرف اپنے اعلیٰ پایہ محقق ہونے کا ثبوت فراہم کیا بلکہ اردو ادب کی بھی ایک بنیادی خدمت انجام دی ہے۔

کتاب میں اردو شعرا کی متعدد تصویریں اور ان کے خاندانی شجروں کے کئی نقشے بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف کتاب کی دیدہ زیبی میں اضافہ ہوا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے ہر شاعر کے حالات اور واقعات جمع کرنے میں کیسی کیسی زحمتیں اٹھائیں۔

توقع ہے کہ رام بابو سکسینہ صاحب اسی طرح اردو کی خدمت کرتے رہیں گے اور جدید اردو ادب پر جو کتاب وہ مرتب کر رہے ہیں اس کی پہلی جلد جلد سے جلد شایع ہو کر منظر عام پر آسکے گی۔

اسرار حیات

از ڈاکٹر ایشور ٹوپا۔ ناشر حیدرآباد تلگو اکیڈیمی۔

اس چھوٹی سی کتاب میں مشہور آندھرا صوفی ویمنا کے تخیلات، حقایق زندگی سے متعلق پیش کئے گئے ہیں۔ ابتدا میں پروفیسر آر۔ سہا راؤ پروفیسر تلنگی جامعہ عثمانیہ و معتمد تلگو اکیڈیمی نے ویمنا کی زندگی اور اس کی شاعری پر ایک مختصر سا مقدمہ قلمبند کیا ہے۔ جس کے بعد ڈاکٹر ٹوپا کا دیباچہ ہے اور پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے جو بارہ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ ہر باب ایک مختلف عنوان کے لئے وقف ہے اور ویمنا کی شاعری سے اس خاص عنوان کے تحت خیالات ایک جا کر دیئے گئے ہیں۔ مثلاً پہلا باب انسانی تہذیب کے راستے کے عنوان کے لئے وقف ہے اور دوسرے میں انسانی برتری اور کمتری پر ویمنا کے خیالات جمع کئے گئے ہیں۔

حیدرآباد تلگو اکیڈیمی نے اب تک "تلگو ادب" اور "ایک مثالی حکمران" جیسی کتابیں شایع کی ہیں اور خاص کر قرآن مجید کا تلنگی ترجمہ تین جلدوں میں مرتب کرایا ہے۔ ابتدائی دس پاروں پر مشتمل پہلی جلد شایع بھی ہو چکی ہے۔ زیر نظر کتاب بھی اسی کے سلسلۂ مطبوعات کی چھٹی کڑی ہے اور توقع ہے کہ اس اکیڈیمی کی طرف سے ایسی ہی مفید کتابیں شایع ہوتی رہیں گی۔

زیر نظر کتاب اسرار حیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ تلنگانہ کے مشہور صوفی ویمنا نے زندگی کے حقائق کو سمجھنے کی بڑی اچھی کوشش کی تھی۔ وہ وجیانگر کے راجا کرشنا دیورائے سے قبل بمقام چینتاپلی پیدا ہوا تھا اور اپنی زندگی کا زیادہ تر زمانہ ضلع گنتور کے ایک قصبہ میں گزارا تھا۔ اس کے کلام میں ایک خاص سوز و گداز اور انسان دوستی نمایاں تھی۔ ڈاکٹر ٹوپا صاحب کی یہ کوشش قابل قدر ہے کہ انھوں نے اس کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کیا اور مختلف عنوانات کے تحت اس کے شہ پارے یکجا کر دیئے۔ ضرورت ہے کہ اسی طرح ہندوستان کی دوسری زبانوں کے صوفی شعراء کے ملفوظات اور خیالات بھی اردو میں پیش کئے جائیں۔

مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں

از عبداللطیف اعظمی۔ ناشر شبلی اکیڈیمی دہلی۔

حال ہی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی مبسوط کتاب "حیات شبلی" شایع

ہوچکی ہے اور زیر نظر کتاب شبلی پر کوئی جامع تصنیف نہیں ہے بلکہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے جو جامعۂ ملیہ کے امتحان بی اے کے سلسلے میں ۱۹۴۱ء میں لکھا گیا تھا یہ اگرچہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے لیکن اس کی ترتیب میں عبداللطیف اعظمی صاحب نے صحیح ذوق ادب سے کام لیا ہے اور اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ نثر کے لئے وقف ہے اور دوسرا شاعری کے لئے۔ ہر حصے میں پہلے پس منظر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے بعد شبلی کی اہمیت اور خصوصیات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چونکہ مولف کو شبلی سے خاص عقیدت ہے اس لئے انھوں نے شبلی کے معاصرین کے مقابلے میں شبلی کی فوقیت جتانے میں تھوڑے بہت مبالغے سے کام لیا ہے اس لئے اس کتاب کا صحیح نام درحقیقت محاسن شبلی رکھا جاتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شبلی اردو کے ایک بہت بڑے ادیب، مورخ اور نقاد تھے اور انھوں نے اس زبان میں علمی و ادبی مضامین کے لئے ایک ایسا اسلوب ہموار کر دیا تھا جس پر آنے والی نسلیں کامیابی کے ساتھ گامزن رہیں گی۔ تاریخی نظموں کے لئے بھی انھوں نے جو اسلوب اور شکل استعمال کی تھی وہ بھی آج تک اردو شعرا کے لئے نصب العین کا کام دے سکتی ہے۔ ان حقیقتوں کے پیش نظر اس کتاب کا مطالعہ اردو ادب اور خاص کر تنقید کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگا۔

یہ جنگ

مصنفۂ ٹامس مان۔ مترجمۂ محمد اعظم ایم اے۔ لکچرار شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ

ٹامس مان عہد حاضر کا ایک بہت ہی ممتاز جرمن ادیب ہے جس نے اپنی اعلیٰ تصنیفات کی بدولت ۱۹۲۹ء میں ادب کا نوبل انعام حاصل کیا تھا۔ وہ جرمن ناول نگاروں کا سرتاج مانا جاتا ہے لیکن اس نے موجودہ جنگ کے متعلق بھی دو کتابیں لکھیں جن میں ایک "عمومیت کی فتح" اور دوسری "یہ جنگ" کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ موخر الذکر کتاب ۱۹۴۰ء میں اس وقت لکھی گئی تھی جب کہ نازیوں کا اقبال معراج کمال پر پہنچ چکا تھا اور ان کے حملے ہر طرف زور و شور سے جاری تھے اور متحدین کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ ایک ایسے نازک وقت میں بھی ٹامس مان نازیوں کے انجام کے متعلق جو عقیدہ رکھتا تھا وہ اس کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے اور جرمنی کی تباہی کی نسبت جو پیشین گوئیاں اس نے عین اس کے عروج کے زمانے میں کی تھیں، وہ آخرکار صحیح ثابت ہوئیں اور ٹامس مان کی دوربیں نگاہ اور سیاسی بصیرت کا ثبوت فراہم ہوگیا۔ اس اہم کتاب کا یہ ترجمہ قابل قدر ہے اور مترجم نے جرمن انداز بیان کی پیچیدگیوں اور فلسفیانہ مباحث کی خشکیوں کے باوجود اس کتاب کو حتی الامکان سلیس اور دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔

نئے زاویے

جلد دوم۔ مرتبہ کرشن چندر۔ ناشر مکتبۂ اردو لاہور۔

یہ دیدہ زیب کتاب دراصل ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے بہترین مضامین نظم و نثر کا ایک عمدہ انتخاب ہے جس کو اردو کے ایک مشہور ادیب کرشن چندر نے خاص ذوق اور سلیقے سے مرتب کیا ہے۔ ابتدا میں خود انھوں نے معروضات کے عنوان سے ایک دیباچہ لکھا ہے جس میں جدید ادب کے رجحانات اور جدید ادیبوں اور شاعروں کی خصوصیات پر بڑی سلاست اور خوبی سے نظر ڈالی ہے۔ جدید یا ترقی پسند ادب کے علم برداروں کو اپنے علمی و ادبی تحریروں میں اسی قسم کا سنجیدہ انداز بیان اختیار کرنا چاہئے اور اپنے ادب کے ایسے ہی اچھے نمونے موقع بموقع انتخابات کی شکلوں میں شائع کرنے چاہئیں جیسے کہ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

اس واقعہ سے کوئی وسیع النظر دلدادۂ اردو انکار نہیں کر سکتا کہ اردو ادب اب ایک جدید راستے پر چل نکلا ہے۔ اور اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوگا کہ نئے راستے پر چلنے والے ادیبوں اور شاعروں میں کیسی کیسی شخصیتیں شامل ہیں۔ اور یہ کہ اس قسم کے ادب میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی کیا کیا صلاحیتیں موجود ہیں۔ جو لوگ مستقبل کے اردو ادب کی تابناکیوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

"ق"

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
من کی بیتا	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۹۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھائی	۱۶	۰	۲	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
" " دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۸۰	۰	۵	۰
مہ لقا	۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۹
آشوب	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۰۱	۰
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	۰
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	قیمت روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۹۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۲	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چھونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشش ثانی (۴) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ...	۲۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۴	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۴	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	۰	۴۰	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ایم ۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
فی پرچہ ۸؍

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم، اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم۔ ایس سی

جلد (۸) بابت ماہ نومبر ۱۹۴۵ء شمارہ (۱۱)

۱۔ نوادر ۔۔۔ حرماں خیرآبادی ۔۔۔ ۲
۲۔ اردو شاعری اور نئی تحریکیں ۔۔۔ پروفیسر عبد القادر سروری ایم اے۔ ایل ایل بی، صدر شعبہ اردو، فارسی، عربی مہاراجہ کالج (میسور) ۔۔۔ ۳
۳۔ غزل ۔۔۔ علی احمد بی اے۔ بی ٹی (عثمانیہ) ۔۔۔ ۶
۴۔ مدرسۂ محمود گاواں بیدر کی تباہی ۔۔۔ سید محمد بیدری ۔۔۔ ۷
۵۔ کنول رانی (فسانہ) ۔۔۔ زینت ساجدہ بی اے (عثمانیہ) ۔۔۔ ۹
۶۔ جدید اردو ادب میں عورت کا مقام ۔۔۔ سعیدہ مظہر بی اے (عثمانیہ) ۔۔۔ ۱۳
۷۔ خطبۂ استقبالیہ کل ہند ترقی پسند کانفرنس ۔۔۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ۔۔۔ ۱۹
۸۔ اردو حروف اور رسم الخط ۔۔۔ دامودر ذکی ٹھاکور ۔۔۔ ۲۲
۹۔ جو آگ لگائی تھی میں نے۔ (فسانہ) ۔۔۔ رفیعہ سلطانہ بی اے (عثمانیہ) ۔۔۔ ۲۷
۱۰۔ امریکہ کی صنعتی ترقی کی ابتدا ۔۔۔ آیت اللہ بیگ عارف ایم اے (عثمانیہ) ۔۔۔ ۲۹
۱۱۔ روسی ادب (ترجمہ) ۔۔۔ حسینی شاہد ۔۔۔ ۳۳
۱۲۔ حشر جذبات (غزلیں) ۔۔۔ ثاقب کانپوری ۔۔۔ ۳۹
۱۳۔ قطعات ۔۔۔ شاطر حکیمی کامٹی ۔۔۔ ۴۰
۱۴۔ سادھو کے بول (فسانہ) ۔۔۔ جہاں بانو بیگم ایم اے۔ لکچرار کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ ۔۔۔ ۴۱
۱۵۔ پرچھائیاں (فسانہ) ۔۔۔ نگہت ناز ۔۔۔ ۴۶

خواجہ حمید الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس میں طبع ہو کر خیریت آباد سے شائع ہوا

نوادر

انقلاب کی طرفہ دنیا میں ہر زیر و زبر کو دیکھ لیا
اللہ! وہی پھر مشقِ ستم، راحت کے اثر کو دیکھ لیا

اب خاک کے ناکس ذرّوں کو توفیقِ جہانبانی ہو عطا
اک طرح نہیں ہر پہلو سے خورشید و قمر کو دیکھ لیا

یہ کلیاں یہ غنچے بھی ہیں کچھ، اک سانس میں مرجھا جاتے ہیں
اب وہ کوئی فطرت کا نگیں تزئینِ گہر کو دیکھ لیا

دنیا کی فضا ہے اور ہی کچھ اور شمس و قمر کی ہے وہی گردش
اب کوئی نیا مقصودِ سفر، اس دورِ سفر کو دیکھ لیا

اب قصرِ جہاں میں وضع ہو کوئی جو ہو جدا، اخلاق نیا
کیا طرزِ وفا، کیا رنگِ بلا، ہر خیر کو شر کو دیکھ لیا

چمن میں ہر طرف شبابِ رنگ کی پکار ہے
لٹا دے تو بھی آشیاں، بہار پھر بہار ہے!

وہاں نفس کی موج نے چمن میں جان ڈال دی
تجھے ہنوز جنبشِ صبا کا انتظار ہے!

اس کے خیال کو نہ پوچھ، اس کا خیال ہی تو ہے
اشک بنا ٹپک گیا، درد بنا سما گیا!!

قصرِ مآل و فکر کے سارے ستون ہل گئے،
عشق نے ایک سانس لی، عقل کو ہوش آ گیا

حرماں خیرآبادی

اُردو شاعری اور نئی تحریکیں

اردو شاعری، عصرِ اصلاح کے بعد سے، اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ، احول کی تبدیلی کی وجہ سے، اس سرمنزل پر پہنچ گئی تھی، جہاں سے، نوجوان شعرا کو، اس کے ارتقا کی رفتار بھی سست نظر آنے لگی یوسف ظفر کے یہ مصرعے شاید اس ذہنیت کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

کیا مجھے اپنے خیالوں کے ادا کرنے کو
اسی رفتار سے چلنا ہے کہ جس سے اب تک
دھیرے دھیرے مرے ہم عصر چلے جاتے ہیں

ذہنیتوں کی یہ تبدیلی، کچھ تو گزشتہ جنگ عظیم کے بعد کے حالات کے ردّ عمل کا نتیجہ ہے، اور کچھ نئی عالمی تحریکوں کی صدائے بازگشت، جس نے شعرا کی نوجوان نسل کو انقلاب کی طرف مائل کر دیا۔ چنانچہ، جدید اُردو شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں یہ آخری دس بارہ سال، نئی نئی تحریکوں اور انقلابی تصورات کی افزایش کے سبب پچھلے ادوار کے مقابلے میں، ممتاز نظر آتے ہیں۔ یہ دور اردو شاعری میں نئے شعری تصورات اور ایسی فنی تحریکات کا آغاز کرتا ہے، جو بہ حیثیت مجموعی اس سے پہلے اردو شاعری سے نامانوس اور اجنبی تھیں نوعمر شعرا نے اپنی ساری توانائیوں اور جدت طرازانہ مساعی کے ذریعے، اردو شاعری کو ایک اچھوتے نہج پر ڈالنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جو بعض حیثیتوں سے عالمی ادبی تحریکات سے ہم آہنگ ہے۔ وسیع تر عملی پس منظر اور قریب ترین قومی روابط کا یہ لازمی نتیجہ تھا، لیکن، ہمارے اپنے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کی مناسبت سے، ان تحریکات میں سے، ایسے پہلو زیادہ موثر صورت میں جلوہ گر ہو رہے ہیں، جو ہماری زندگی سے زیادہ گہرا ربط رکھتے ہیں یا نوجوان شعرا کی ذہنیتوں پر زیادہ اثر ڈال سکتے ہیں۔

شاعری کی اصلاح کی جو تحریکیں، اس وقت برپا ہو رہی ہیں، وہ شعر کی صوری اور معنوی، ہر حیثیت پر اثر انداز ہیں اور بہت کچھ ترمیم اور تنسیخ کی پیشین گوئی کر رہی ہیں، اور اگر ان کی ترقی، نئی راہوں میں بے روک جاری رہے تو عروض، قافیہ، ردیف اور دوسرے سارے اگلے فنی لوازم میں، اردو شاعری ایک نیا ورق الٹنے کو تیار ہے، جس میں، وقتی جذبات کی رد گزر جانے کے بعد، وہ رفتہ رفتہ ایک انفرادی جگہ پیدا کرتی جائے گی اور نئی شاعری ہندوستان کی دوسری زبانوں کی شاعری سے بھی اتنی ہی ممیز ہوگی، جتنی وہ، قدیم، عربی ایرانی اثر کی شاعری سے مختلف ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقی ہندوستانی شاعری ہوگی، جس میں عالمی شعری دبستانوں کا اثر، اس کے مخصوص مزاج کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہوگا۔

نئی تحریکوں کا مقصد، سب سے پہلے، اردو شاعری کو، حیات کی من و عَن ترجمان، بلکہ کنیز بنانا ہے۔ ادب اور زندگی کا اصول، اس دور میں اتنا ہی چھانا جا رہا ہے، جتنا کہ عصرِ اصلاح کے فوراً بعد، نیچرل یا فطری شاعری کا اصول مقبولِ انام ہو چکا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ، عصرِ اصلاح کے بعد سے لے کر موجودہ دور تک، جدید شاعری کا ارتقا بتدریج ہوتا رہا، اور سوائے اس عصر کے درمیانی ادوار میں، کوئی تحریک اس شدومد کے ساتھ نہیں اٹھی، جیسی کہ موجودہ تحریک، "ادب برائے زندگی" ہے۔ اس نقطۂ خیال کو متشکل کرنے میں اس عصر اور ہر عصر کے سب سے بڑے شاعر، اقبال کے شعری اور فنی نظریوں کو بہت کچھ دخل ہے، جو شعر و فن میں

ظاہری دلآویزی کے علاوہ، باطنی افادیت کے بھی قائل تھے۔ چنانچہ "فنونِ لطیفہ" کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن — جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے، وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر، سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس، مثلِ شرر کیا!
شاعر کی نوا ہو، کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو، وہ بادِ سحر کیا!

شعر کو وہ حیاتِ ابدی کا پیغام سمجھتے تھے۔

نئی تحریکات کے بارے میں، موافق اور مخالف بہت کچھ کہا گیا ہے .... اور کہا جاتا رہے گا اور جس طرح عصرِ اصلاح کی تحریکوں کے بارے میں خیال آرائیاں ہوتی رہی تھیں، لیکن، بے چینی، اضطراب اور تجدد پسندی کی وہ لہریں، جو، نوجوان ذہنوں میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں، اپنا کام کرتی رہیں، اور اب بھی کر رہی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس ساری سعی کا مفہوم متعین ہوتا جائے گا، جو اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ زندگی کی بدلی ہوئی قدروں سے شعر اور ادب کو ہم آہنگ بنایا جائے۔ وقتی اور فنا پذیر جذبات، اپنی طبعی موت مرنے والے ہیں، لیکن فکر کی نئی دھارا، شکست و ریخت اور تعمیرِ جدید کے آثار چھوڑے بغیر نہیں جائے گی۔

ادب کو عام پسند اور عوام پسند بنانے کا رجحان بھی ان تحریکوں کا ایک پہلو ہے دوسرے الفاظ میں، ادب سے خواص پسندی، ذہنی امارت اور اجارہ داری کو مٹانا بھی، نئی تحریکات کے پیشِ نظر ہے، فی نفسہٖ یہ مسئلہ اختلاف سے بالکلیہ بری نہیں کہ ادب کو کس حد تک عوام پسند ہونا چاہئے ؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس تحریک کے اثر سے اردو شاعری میں، فرضی حسن و عشق کی داستانوں کی بجائے، زندگی کے مشاہدے اور مطالعے کے نئے نئے زاویۂ نظر پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ شاعری کو عوام پسند بنانے کا مقصد ابھی پورے طور پر اس طرح حاصل نہیں ہو سکا، کہ شاعری کی پچھلی روایات کا اثر، نئے نمونوں سے ابھی تمام تر زائل نہیں ہونے پایا ہے۔

موضوعات کے تنوع، اسالیب کی توسیع اور فنی تجدد پسندی کی تجربی کوششوں کے لحاظ سے، موجودہ دور کی شاعری ایک حقیقی عبوری دور سے گزر رہی ہے، اور اگر اپنے سارے خد و خال کے ساتھ کامیاب نہ بھی ہو، پھر بھی، چند بنیادی اصولوں میں ہماری شاعری، اگلے ادوار کی شاعری کے مقابلے میں بالکل مختلف ہوگی، جس کے اجزا ہیں، شعر کے قدیم تصور سے، مختلف ایک نیا فنی تصور ہوگا، جس کی عمارت، محض ردیف قافیے مخصوص اور معین اوزان، روزمرے اور محاورے کے سہاروں پر ٹکی ہوئی نہیں، بلکہ شاعر کے انفرادی احساس حسن کاری، اس کی روح کے ذاتی ترنم اور اس کی اپنی فکر کے عناصر پر کھڑی ہوگی۔

موجودہ شاعری، مسلمہ اور مخصوص اوزان سے بھی اتنا ہی چڑ چڑاتی ہے، جتنا وہ ردیف اور قافیے سے گھبراتی ہے۔ اوزان اور صُوَرِ شعریہ کا تنوع، جتنا اس دور میں مقبول ہو رہا ہے، اس سے پہلے اردو شاعری میں کبھی مقبول نہ ہو سکا تھا۔ اسمٰعیل میرٹھی، شرر، نظم طباطبائی اور ڈاکٹر بجنوری نے بے قافیہ نظم کو اردو میں کھپانے کی سعی کا جو انجام دیکھا تھا، اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت، شعرا کا احساسِ ترنم، ابھی ردیف اور قافیے کے سہاروں کو ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اِس دور میں بے قافیہ نظم نہ صرف مقبول ہو رہی ہے، بلکہ اس میں چند ایسی اصطلاحی خصوصیات بھی نشو و نما پا رہی ہیں، جو اس میں شک نہیں کہ پہلے پہل، مغربی شاعری سے درآمد کی گئیں، لیکن رفتہ رفتہ، وہ زبان کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی

جارہی ہیں۔ اس طرح ہماری شاعری، مشرق اور مغرب کے شعور شعریہ کے متوازی، ایک نیا اور اپنا انفرادی راستہ بناتی جارہی ہے، جو اپنی ترقی یافتہ صورت میں اردو شاعری کی فنی خصوصیت سمجھا جائے گا۔

موجودہ شاعری میں، بعض خاص خاص موضوعات کی حد تک توارد، بلکہ تقلید کا شائبہ ضرور پیدا ہوگیا ہے، جن میں، افلاس، بھوک، قید، امراض، مزدور، کسان، سرمایہ داری وغیرہ کا ذکر بطور مثال کیا جاسکتا ہے، اس میں کچھ تو سیاسی تحریکات کا اثر ہے، اور کچھ اس لئے کہ یہ ایک شعری "وضعداری" اور "مسلک" سا بن گیا ہے، جس کے پیرو، تقریباً تمام نوجوان شاعر اور دو ایک جہاں دیدہ سخن سنج بھی ہیں، جس طرح غزل گوئی کا قدیم شاعر، مضمون پر مضمون کہنے پر فخر کرتا تھا، اسی طرح آج کا شاعر بھی غالباً یہی سمجھتا ہے کہ جب تک وہ اس زمرے کے موضوعات پر قلم نہ اٹھائے، ترقی پسندی کی سند پا ہی نہیں سکتا۔

عشق و محبت کا جادو اب بھی بول رہا ہے اور شاید سر چڑھ کر بول رہا ہے، لیکن اس سلسلے میں جو بات بنیادی ہے وہ یہ ہے کہ، موجودہ شاعری میں رسمی حسن پرستی کا شائبہ بہت کم ہوگیا ہے، نوجوان شاعر، عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، رمزیت، اشاریت اور استعاروں کے قدیم تو بر تو پردوں کو چاک کرنے پر تلا ہوا ہے، ممکن ہے کہ نئے دبستاں کے شعرا کے مابین یہ چیز بعض وقت رسمی معلوم ہو، لیکن ہم کو جگہ جگہ ایسے نمونے بھی نظر آجاتے ہیں، جہاں شاعر کی فکر، پاک اور معصوم محبت اور کبھی کبھی حسن ماورا کے سرا پردۂ آستاں تک پہنچتی دکھائی دیتی ہے، اور کہیں کہیں رازِ درونِ پردہ کی جھلک بھی دکھائی پڑتی ہے۔ اصلی اور نقلی جذبات کی یہاں بھی گنجایش ہے، لیکن کام کی بات اس سلسلے میں دیکھنے کے قابل یہ ہے کہ موجودہ شاعر، عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں، کسی طرح کی ذہنی پیچیدگی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا۔ وہ دن کو دن اور رات کو رات کہنے پر مصر ہے۔ چنانچہ عاشقانہ اور رمزیہ شاعری میں، قدیم اور جدید دور کے شاعر بھی، معشوق کا اتا پتا بتانے سے گریز کرتے تھے، موجودہ شعرانے، وہ رسم توڑ دی ہے، اور بعض تو شاید اس رو میں دور تک بہے چلے جارہے ہیں

ان تحریکات میں، جو نوجوان شعرا کی مساعی کا محور بنے ہوئے ہیں، یہ تحریک شاید، سب سے زیادہ دور رس نتائج کا باعث ہوگی کہ انھوں نے اسالیب شعر کو وسعت دے کر، اس خیال کو عملی جامہ پہنایا ہے کہ اردو اور ہندی دو مختلف زبانیں نہیں، بلکہ ایک ہی زبان کے دو مختلف اسالیب ہیں۔ صلح و آشتی پسندی، جس کی شاعر سے توقع کی جاسکتی ہے، اس کا یہ ایک نہایت مستحسن اشارہ اور اقدام ہے۔

نئی تحریکات میں شعر کی نغمیت، سب سے زیادہ نمایاں چیز ہے۔ موجودہ شاعری کا یہ وہ پہلو ہے، جو سب سے زیادہ معرکۃ الآرا بنا ہوا ہے۔ نظم کی اصناف میں آزاد نظم، موجودہ عہد کی گویا خصوصیت بن گئی ہے، جو قدیم دبستاں والوں کو ایک طرح کی دخیل چیز معلوم ہوتی ہے۔

جدید دور کے آغاز میں اردو شاعری نے اصلاح کا جو قدم اٹھایا تھا، وہ بظاہر موضوعات کی توسیع تک محدود رہا، لیکن ضمنی طور پر ایک بنیادی فرق قدیم اور جدید دبستانوں میں یہ بھی نمایاں ہوا کہ قدیم دور کی زیادہ تر محاورے، روزمرے اور صنائع بدائع کی نگہداشت کی شاعری کے مقابلے میں، جدید دور کی شاعری مطالب اور معانی پر زیادہ متوجہ رہی۔ موجودہ دور میں مطالب اور موضوعات کی بھی چھان بین شروع ہوئی اور فنی اعتبار سے نئے نئے تجربے شروع ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گزشتہ نصف صدی کے

دوران میں اردو شاعری میں حالات اور ذہنیتوں کی مناسبت سے تبدیلی ہوتی رہی کیونکہ تبدیلی فطرت کا ایک اٹل قانون ہے، اور یہی قانون اس کائناتِ آب وگل اور حیاتِ مادی پر حکمران ہے۔ ادبیات میں تبدیلی کا معیار حسن اظہار کی ترقی اور معنویت ہے۔ ہر ایسی تبدیلی، جس سے ان کو نقصان پہنچے نامقبول ہوگی۔

موجودہ شعری تحریکوں کو نہ تو ہم محض قدیم طرز سے بغاوت کے جذبے پر محمول کرسکتے ہیں اور نہ محض جدت طرازی کی عنان گسیختہ خواہش پر، بلکہ یہ تحریکیں ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک وسیع پس منظر رکھتی ہیں۔ یہ سمجھ لینا بھی صحت پر مبنی نہیں کہ نئی شعری تحریکوں کو، اگلے دور سے کوئی واسطہ نہیں۔ نئی تبدیلیاں ہمارے یا چند طبقوں کی ذہنیتوں کی تبدیلی سے گہرا تعلق رکھتی ہیں اور ذہنی تبدیلی کی ذمہ داری ماحول پر ہے۔ ہمارا حال، اگر ہمارے ماضی کی پیداوار ہے، تو نئی تحریکیں بھی پچھلے دور کے عمل اور ردِ عمل کا لازمی نتیجہ ہیں۔

موجودہ شعری پیداوار پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہوجاتی ہے کہ نوجوان نسلوں کا رجحان، نئے نئے شعری تجربوں کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہوتا جارہا ہے۔ اظہار کے سانچے بدل رہے ہیں، اور جمالی معیاروں میں ایک تبدیلی رونما ہورہی ہے۔ مظاہر فطرت کی تلاش میں، جن گوشوں کو موجودہ شاعر اور خصوصاً نوجوان سخن پرداز ٹٹول رہے ہیں، ان کی اپنی فطرت کی رہبری کا نتیجہ ہے، اور جن راہوں پر وہ گامزن ہیں، پہلے سے بنی بنائی نہیں ہیں، بلکہ وہ خود انہیں کھولنا چاہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی ہر وحشت خرامی، ایک نیا شعری آئین بن جائے گی، لیکن یہ تصور، خود کچھ کم خوشگوار نہیں ہے کہ وہ ایک حقیقی پُرعظمت شاعری کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

عبدالقادر سروری

غزل

غم بہر صورت چھپایا جائے گا ضبط کرکے مسکرایا جائے گا

اٹھ رہی ہے کیوں مری جانب نظر کیا نگاہوں سے گرایا جائے گا

خشک لب کیا کہہ سکیں گے دردِ دل نم نگاہوں سے سنایا جائے گا

یہ مہکتی زلف کیوں کھولی گئی کس کی دنیا کو بسایا جائے گا

یوں نشیمن پر نظر ہے برق کی جیسے ہر تنکا جلایا جائے گا

تیرے دامن کی ہوا درکار ہے شمعِ فرقت کو بجھایا جائے گا

دل کو بہلائیں گے دردِ دل سے ہم درد کو درماں بنایا جائے گا

آئے کیوں طوفاں ڈبونے کے لئے خود سفینہ زد پہ لایا جائے گا

بڑھ رہے ہیں اے علی خود دستِ ناز
دامن اب کیونکر بچایا جائے گا

علی احمد

مدرسۂ محمود گاواں بیدر کی تباہی

جب دولت بہمنیہ تباہ ہوگئی اور شاہان بریدیہ کا تسلط قائم ہوا تو ہمسایہ سلطنتوں کی لشکر کشی کے اندیشہ سے دارالسلطنت بیدر کے گرد حصار کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ سنگ سیاہ کے میسر نہ آنے کے باعث علی برید شاہ فرمانروائے بیدر نے کل امرائے دولت اور مشائخین و معززین کو جمع کرکے دریافت کیا کہ آیا زندوں کی حفاظت ضروری ہے یا مردوں کی؟ سبھوں نے کہا کہ حفاظت تو زندوں کی کی جائے۔ علی برید مطلب کا جواب پاکر ایک فتوے پر سب کے دستخط لے لئے اور عام مقبرہ جس قدر عظیم الشان عمارتیں، شاہ عام کے ایوانات ...، گنبدیں اور قصر تھے سب کو توڑ کر فصیل، حصار و برج تعمیر کئے گئے۔ مدرسۂ محمود گاواں سے متعلق جو عمارتیں تھیں وہ بھی توڑ دی گئیں صرف مدرسہ اس دفعہ بچ گیا۔

عہد بریدیہ میں شاہان بیجاپور، احمد نگر و گولکنڈہ کی شورشوں سے مدرسہ کی موقوفہ جائداد میں دست درازی شروع ہوئی اور اکثر جاگیرات جو اس جنگ و جدل کے رقبے میں تھیں ان سے ہمسایہ سلطنتوں نے متمتع ہونے نہ دیا۔ رفتہ رفتہ سلطنت بریدیہ کا رقبہ اس قدر محدود ہوگیا کہ اس کے زیرنگیں صرف دو تین ضلع اور کوئی چار ہزار فوج رہ گئی۔ دارالسلطنت بیدر سے وہ اگلی شان و شوکت مفقود ہوگئی اور اطراف و اکناف سے اہل غرض کی آمد و رفت کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا۔ بیسیوں گھر ویران ہوگئے۔ اس طرح شہر کے ساتھ مدرسہ بھی ویران ہوگیا اور تقریباً سنہ ۱۰۲۰ھ تک اس کی افتادہ حالی کا یہی عالم رہا۔ فرمانروایان بیجاپور کا بیدر پر قبضہ ہونے کے بعد قلعداری کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں ملک مرجان مختار الملک والا جاہ (نائب سلطنت عادل شاہیہ) قلعدار نے رہی سہی جائداد کو بھی سلطان کی بیگم ملکہ پری بانو کے ذاتی اخراجات کی مد میں شریک کردیا۔ سنہ ۱۰۶۶ھ تک عادل شاہیہ کی قلعداری رہی۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر غازی نے سنہ ۱۰۶۶ھ میں بیدر فتح کیا، مدرسہ کی بے کسی اور بربادی سے سخت متاثر ہوکر اس کی درستی اور تعمیر کا انتظام فرمایا اور حکم دیا کہ پچھلی حالت پر لانے کی کوشش کی جائے۔ متعدد صوبہ داران عالی مقام اور حکام وقت مثلاً نواب افتخار خاں بہادر عالمگیری، مختار خاں رضوی سبزواری، نواب ابوالمظفر خاں اور نواب قلندر خاں نے اس کو اصلی حالت پر لانے کی ہر ممکنہ کوشش کی اور اس میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا۔ سنہ ۱۰۹۸ھ کے دورۂ دکن کے زمانہ میں شہنشاہ عالمگیر غازی نے بیجاپور کے نامور عالم اور مقدس بزرگ حضرت نائب رسول اللہ مولانا صبغۃ اللہ بدیع کے جانشین مولوی سید محمد حسین تہانوی کو منتخب فرماکر مدرسۂ محمودیہ کا امام المدرسین مقرر کیا۔ مدرسۂ محمود گاواں میں مولوی صاحب نے اشاعت علوم کی کوشش شروع کی، ان کے علم و فضل کی شہرت سن کر دور دور سے طالبان علوم و فنون آ آکر حلقۂ تلامذہ میں شریک ہونے لگے۔ اس زمانے کے تعلیمی کورس میں ادب کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ سلسلہ [illegible] سنہ ۱۱۰۷ھ تک جاری رہا۔ ۱۱ رمضان المبارک سنہ ۱۱۰۷ھ کو جلال الدین قلعدار کے زمانہ میں بجلی گرنے سے اس مدرسہ کے جنوب و مشرق کے حصوں کی عمارت منہدم ہوگئی۔ یہ بھی ایک حکمت الٰہی ہے کہ جلال الدین محمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں مدرسہ کی عمارت بنی تو دوسرے حاکم جلال الدین صوبہ دار کے زمانہ میں منہدم ہوئی۔ مدرسہ منہدم ہونے کے بعد عالمگیری درس و تدریس کا انتظام درہم ہوگیا۔ عہد مغلیہ کے خاتمہ پر ملک کی حالت بد سے بدتر ہوگئی تھی، سارے امرا اپنے اپنے علاقوں کے انتظامات کرنے اور آئے دن کی شورشوں کو مٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ دکن کا بہت سا حصہ [illegible] خاں بہادر

آصف جاہ اول بانیٔ خاندان آصفیہ کے قبضہ میں آچکا تھا۔ بیدر کے عالمگیری قلعدار واصل خاں کو قلعداری سے معزول کرکے اور جہانگیری جاگیر دے کر نواب آصف جاہ اول نے نواب میر کلان خاں بہادر کو بیدر کی قلعداری عطا کی ۱۱۵۲ھ تک بیدر پر شہنشاہ دہلی کی طرف سے قلعدار حکمران مقرر ہوتے رہے۔ اس کے بعد آصف جاہی قلعداری کی عملداری شروع ہوئی۔ اس زمانہ میں تعلیم وتعلم کا کوئی باقاعدہ انتظام نہیں تھا اس لئے نواب مختار الملک سر سالار جنگ بہادر کے زمانۂ وزارت تک مدرسہ کھنڈر بنا رہا اور جس قدر پتھر، چونا اور اینٹ کا انبار تھا اس کو عوام لے جا لے جاکر اپنے مکانوں کی تعمیر میں لگاتے رہے۔ تعلیم کی جانب جب نواب سر سالار جنگ بہادر کی توجہ جب مبذول ہوئی اور اضلاع میں مدرسین مقرر کئے گئے تو بیدر میں بھی اسی مدرسۂ محمود گاواں میں حافظ غلام مصطفےٰ خاں صاحب اول تعلقدار کے زمانہ سے نواب منصور یار جنگ بہادر کی تعلقداری تک (۱۳۰۵ف تک) فارسی درس ہوتا رہا۔ ۱۳۰۹ف میں مولوی اکرام الدین خاں صاحب اول تعلقدار کے زمانہ میں مدرسہ فوقانیہ کی جدید عمارت علی باغ کے عوض پر تیار ہوئی اور مدرسہ اس میں منتقل ہوگیا۔ مدرسۂ محمود گاواں کی عمارت پھر کس مپرسی کی حالت میں رہی ۱۳۰۹ف کے قحط میں مدرسہ دو تین سال تک لاوارث، یتیموں کا وارڈ بنا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ پھر چمگادڑوں کا گھر بن گیا اور ۱۳۲۰ف تک کم وبیش اسی حال پر رہا۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع فرمانروائے دکن خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے زرین کارناموں میں سے محکمہ آثار قدیمہ کا قیام بھی ایک زرین کارنامہ ہے کہ اس سے ازمنۂ ماضیہ کے آثار کی حفاظت، ان کی ترمیم اور داغ دوزی ہونے لگی۔ ۱۳۲۴ف سے اس مدرسہ کو محکمہ آثار قدیمہ نے اپنی زیر نگرانی لیا ۱۳۲۹ف میں ہزارہا روپے کے صرفہ سے ترمیم کرکے اندر کے حصہ کو پاک وصاف کیا گیا اور صحن میں جو اینٹ، چونہ پڑا ہوا تھا اس سے منہدمہ حصہ کا پایہ درست کرکے اسی پر چار چار فٹ اونچی دیوار بنائی گئی اور اوپر کی منزلوں کے دونوں حصوں میں دروازے لگاکر مقفل کردیا گیا ہے۔ ۱۳۴۴ف میں مدرسہ کو سنگ بستہ دیوار سے محصور کرلیا گیا۔ غرض محکمہ آثار قدیمہ کی توجہ سے اتنا ضرور ہوا کہ اب اس ویران مدرسہ میں کسی قدر رونق آچکی ہے۔

سید محمد (بیدری)

تاریخ گولکنڈہ:۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم وفضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم، نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز سوا تین سو سے زیادہ صفحات قیمت ۸؎

کنول رانی کے نام ـــــــ

معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے کہدیا "رانی تم واقعی اچھی ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئن ہو"۔ اسے سن کر جب رانی کے چہرہ پر گلال چھلکنے لگا تب خیال آیا کہ میں نے کیا کہہ دیا۔ کتنی بڑی بات۔ جانے کیوں میں نے یونہی کہہ دیا۔ زندگی کی بعض حماقتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیشہ ہمیشہ ہم انھیں سوچ سوچ کر پشیمان ہوا کرتے ہیں۔ رانی کو ایک زمانہ سے میں دیکھ رہا تھا۔ جوہی کی بیل سے زیادہ نازک اور بیلے کی پھولوں سے لدی ڈال کی طرح لچک دار رانی۔ یوں تو میں نے ہزاروں ہی لڑکیاں دور اور نزدیک سے دیکھی تھیں اور ان میں سے کئی ایک مجھے پسند بھی تھیں لیکن رانی کی بات ہی اور تھی۔ اس کے کندنی رنگ میں ایک عجیب اداسی گھلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں ایک مایوس چمک کہ دیکھنے والے کی نگاہیں اس پر پڑتیں تو جذب ہی ہو کر رہ جاتیں۔ اس کے چہرہ پر ہی ٹھٹک جاتیں اور وہاں سے انھیں لوٹنا مشکل ہو جاتا۔

اس کا حسن مثالی حسن تو نہیں کہ میں اس کی آنکھوں کو نرگس شہلا، اس کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیاں، اس کے گالوں کو چاند اور سورج اور اس کی باہوں کو کنول کے ڈنٹھل کہہ سکوں۔ نہیں اس میں ایسی کوئی بات نہیں۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی ایک سیدھی سادھی لڑکی ہے۔ کوئی غیر معمولی لڑکی نہیں۔ ہاں جسم میں لچک ہے اور آواز میں لوچ۔ بناوٹ نام کو نہیں۔ اور میں ـــــ میں ہی کیا اسے ہر دیکھنے والا دیکھتا اور شاید یہی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اس کی آنکھوں کی مایوس چمک میں زیادہ کشش ہے کہ اس کے چہرہ کی چمکیلی اداسی میں۔ کتنی عجیب سی بات ہے۔ لیکن اسے دیکھ دیکھ کر یہی خیال پیدا ہوتا ہے اور میں اب تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ تو میں نے صرف سوچا ہی تھا۔ کبھی کہنے کا ارادہ نہیں تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک دن میں اس سے ایک ایسی افسانوی بات کہہ دوں گا۔ مجھے اس کا ہرگز افسوس نہیں کہ میں نے اس کے حسن کو سراہا کیوں۔ لیکن اس دن میری بات سن کر اس کا خجل ہو جانا واقعی افسوس کے قابل تھا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ میں اس کے حسن سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں اور جو کچھ میں نے کہا وہ میرے دل کی آواز تھی ـــــ دل کی آواز کیا ہوتی ہے۔ یہی شاید محبت جسے کہتے ہیں۔ واللہ مجھے اس سے محبت نہیں۔ میں اس قسم کے اداس سراپا سے متاثر ہو کر اس کے بارے میں سوچتا ضرور رہوں لیکن اسے محبت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میری آنکھوں میں تو دو اور ہی آنکھیں بسی ہوئی ہیں۔ سوئی سوئی ٹھنڈی آنکھیں جن میں کوئی طویل اور میٹھا خواب گھلا ہوا ہے۔ جو شاید ہمیشہ سوئی سوئی ہی رہیں گی۔ کبھی نہ جاگیں گی۔ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دیکھنے والے کی طرف نہ دیکھیں گی ـــــ اور ان دو سوئی آنکھوں کے نیچے دو سرخ اور شاداب ہونٹ مسکراتے رہتے اور مجھے خیال ہوتا کہ ان میں جتنا شہد ہے وہ جنت میں بھی نہ ملے گا۔ رانی کی آنکھوں میں یہ بات تھی نہ ہونٹوں میں۔ اس کے ہونٹ تو خنک تھے بھیگے ہونے کے باوجود خشک سے لگتے۔ ان میں حلاوت اور نشہ میں نے کبھی محسوس نہیں کیا۔ پھر میں رانی سے کیسے محبت کر سکتا ہوں۔ کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ کاش اس نے ان کا غلط مطلب نہ سمجھا ہوتا۔

وہ محبت کے ناقابل تو نہیں لیکن میں اس کے لئے نہیں بنا۔ اس سے کوئی اور بھی تو محبت کرتا تھا۔ کمار۔ کمار میرا دوست تھا۔ اسی نے بار بار رانی کی باتیں کر کے، اس کے حسن کے گیت گا کے مجھے ادھر متوجہ کیا تھا۔ ایک دفعہ یوں ہی ہم دونوں میں بات ہونے لگی۔ ہم دونوں جب ملتے تو دنیا کا کوئی موضوع سخن باقی نہیں رہ جاتا۔ ایک دن یوں ہی حسن کی بات ہونے لگی۔ میرا خیال تھا کہ آج تک میں نے حسن کو ایک ہی آدمی میں مکمل نہیں دیکھا۔ کسی کی کوئی چیز اچھی ہوتی ہے کسی کی کوئی اور عام طور کی

گردن کی تراش بڑی نازک ہے۔ حسنی کے ہاتھ خوبصورت ہیں، نفیس کی آنکھیں پیاری ہیں، توشیل کماری کی کمر، نیلو کے بال اور نازلی کے پھڑکتے ہوئے ہونٹ۔ اس قسم کی تنقید کرنے سے ہمارا مقصد عیاشی نہ تھا۔ ہم دونوں بڑے شریف انسان تھے۔ ہم فلسفیوں کی سنجیدگی کے ساتھ ان کو پرکھتے تھے اور بعض اوقات آپس میں بحث بھی ہونے لگتی، مجھے جو ادا نازک معلوم ہوتی کمار اُسے بھدا سمجھتا۔ گھنٹوں سنجیدہ بحث ہوتی لیکن ذاتی دلچسپی کسی میں ہمیں محسوس نہ ہوئی۔ ہاں میں اُن ان دیکھی سوئی سوئی آنکھوں سے متاثر ضرور تھا جنھیں میں نے کبھی نہ دیکھا تھا لیکن پھر بھی ہمیشہ دیکھا کرتا تھا۔

جو ہمیشہ مجھے جانی پہچانی لگتی ہیں۔ کمار اس بات پر مجھے بنایا کرتا کہ میں جاگتے میں خواب دیکھا کرتا ہوں وہ خوابوں کا نہیں حقیقت کا قائل تھا اور اسی وجہ رانی کے متعلق خیال آرائی کرتا رہتا۔

ایک دن رانی ہمارے قریب سے گزری، اچھی سے اچھی ساری بھی وہ بڑی لاپروائی سے باندھتی، بال بنانے کا انداز بھی اسے نہ آتا اور یوں اپنے آپ کو بالکل اداس بنا لیتی۔ کمار کچھ دیر تک تو اس کا نگاہوں سے پیچھا کرتا رہا پھر بولا "یار سچ کہتا ہوں اگر میں اپنی مرضی کے موافق اس کو سنواروں تو ہندی افسانوں کی ہیروئین لگنے لگی۔ سارے کالج میں کوئی مقابلے کی نہ نکلے پھر ——" بات ہوئی بھی اور ختم ہو گئی۔

اس دن مولسری کے پیڑ کے نیچے میں کھڑا تبسّم کا انتظار کر رہا تھا۔ رانی بھی لجائے جسم چرائے وہیں آکر کھڑی ہو گئی۔ میں بلا ارادہ اسے غور سے دیکھتا رہا اور خواہ مخواہ بغیر اپنے الفاظ اور ان کے معنی پر غور کئے میرے منھ سے نکل گیا "رانی تم واقعی اچھی ہو۔ بالکل ہندی افسانوں کی ہیروئین۔" مجھے شاید یاد نہیں رہا کہ میں کمار سے نہیں رانی سے کہہ رہا ہوں اور یوں کہہ رہا ہوں جیسے اس سے دلی لگاؤ ہے۔ رانی کے چہرے پر سرخی ہمٹ آئی۔ گردن جھک گئی اور اس کے ہونٹ بھیگے ہونے کے باوجود سوکھے سوکھے معلوم ہوئے۔ تب مجھے پتہ چلا کہ میں نے بڑی بے جا بات کہہ دی۔ اب میں اسے مفہوم سمجھا بھی تو نہیں سکتا کہ بات اور بری نہ ہو جائے۔

اس کے بعد ایک دن ونود کے ہاں وہ دعوت میں ملی اور جوں ہی مجھ سے نگاہیں چار ہوئیں گلابی ہو گئی۔ مجھے بھی اپنی حماقت یاد آگئی۔ اس نے شاید شیل کماری اور نفیس سے اس کا ذکر کیا تھا۔ باقاعدہ لڑکیوں میں بحث ہوتی رہی اور اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلا کہ میں دل ہار بیٹھا ہوں۔ ونود کے ہاں موقعہ پاتے ہی ساری لڑکیوں نے گھیر لیا۔ نفیس نے پوچھا "بتائیے آپ نے یہ سب کیوں کہا تھا؟" میں اس کا جواب کیا دیتا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ میں نے کہا "بھئی یہ اچھی ضرور ہیں۔ لیکن وہ ہیروئین والا جملہ کسی اور کا تھا اور یوں ہی میرے منھ سے نکل گیا۔" لڑکیاں بھلا میری بات کیوں ماننے لگیں!

نیلو بولی "آپ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے "اور" کی آڑ کیوں لیتے ہیں" میں بے بس ہو گیا کہنا پڑا کہ "سنئے 'کسی' نے کہا تھا کہ انھیں اگر ان کی پسند کے موافق سنوارا جائے تو یہ ہندی افسانوں کی ہیروئین لگیں گی۔" شیل یوں ہنسنے لگی گویا اسے ہمدردی ہو مجھ سے۔ وہ سمجھی میں بات بنا رہا ہوں۔ میں کھسیانا ہو گیا۔

حسنی آنکھ مار کر بولی "اچھا اچھا کسی اور کی پسند بیان کرو، تاکہ ہم اسے اسی ڈھنگ سے سنوار کر ہیروئین بنا دیں۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں، آخر میں نے کہہ دیا "کہو تو ان سے پوچھ کر بتا دوں!" —— سب ہنسنے لگے گویا میں جان جان کر جھوٹ بول رہا ہوں۔ ان کی غلط فہمی دور کرنا تو میرے بس کی بات نہ تھی۔ آخر انھوں نے وعدہ لے کر ہی چھوڑا کہ میں دوسرے دن ضرور پوچھ کر بتا دوں گا۔

دوسرے روز کمار سے کچھ بحث ہونے لگی اور مجھے

یاد آگیا۔ میں نے اپنی مصیبت کا سارا حال کہہ سنایا کہ کس طرح رانی کو وہ چاہتا ہے اور الزام میرے سر ہے — سن کر وہ ہنسنے لگا پھر بولا —— "بات تو ٹھیک ہے۔ اسی طرح ایک بار تو میں اسے ہیروئن بنا دیکھ لوں گا — سن اس کے پاس ایک سرمئی رنگ کی سلک کی ساری ہے جس پر چوکور نقش بنے ہیں۔ وہ ایک دن ڈھنگ سے پہنے اونچی اونچی آستینوں کا چست پھنسا پھنسا بلاؤز پہنے، کانوں میں نئی وضع کے ٹاپس، بال اچھی طرح بنائے کہ پیشانی نمایاں ہو اور ان میں پھول سجائے، کلائیاں بھر بھر چوڑیاں پہنے، ماتھے کی بندیا کچھ نمایاں ہو۔ گلے میں وہ زنجیر ڈالے جو وہ پہلے بہن پہنا کرتی تھی۔ بس اور ہاں وہ ساری اس قدر لپیٹے نہ رہے آنچل کو لہرانے دے۔ بس ایک دن صرف ایک دن —" میں یہ سب کچھ سن کر ہنس پڑا۔ کمار کو کس قدر تفصیلات یاد تھیں۔ مجھے عورت تو یاد رہتی ہے اس کا لباس اور دوسری ذیلی باتیں یاد نہیں رہتیں۔ یہ باتیں سن کر میں نے سوچ لیا کہ لڑکیوں کو یونہی ٹال دوں گا بھلا یہ باتیں بھی ان سے کہنے کی ہیں —

مگر تو یہ کیجئے جو یہ حوا کی بیٹیاں مان جائیں کبھی — بات کہہ کر یہ کبھی نہیں بھولتیں — لائبریری کے برآمدہ میں لڑکیوں کی فوج کھڑی تھی۔ میں بری طرح گھر گیا۔ اکیلا تھا اس لئے گھبرا گیا۔ آخر مجبوراً رک رک کر مجھے بتانا پڑا کہ وہ "سرمئی رنگ کی دھاری دار ساری پہنے، بالوں میں پھول سجائے۔ چست اٹھی ہوئی آستینوں کا بلاؤز پہنے کہ مانو کندھوں پر دو کبوتر بیٹھے ہیں۔ کانوں میں ٹاپس، کلائیوں میں چوڑیاں آنچل لہراتا رہے۔" میں تو کسی ادبی جلسہ کی روداد ایک سانس میں سنا گیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سب کی سب بری طرح ہنس رہی ہیں۔ ان سب کے پیچھے میں نے رانی کو دیکھا۔ سمٹی سمٹائی لجائی ہوئی کھڑی تھی۔ گال زیادہ گلابی ہو گئے تھے۔ جھکی جھکی آنکھوں کی اداسی اور زیادہ چمک گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کونوں میں دبی دبی کوئی چیز ابھری اور رک گئی ——

مجھے میرے اپنے ہونٹ جلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میں پلٹ پڑا۔

شیلا نے مجھے روک لیا اور کہنے لگی "اچھا ہم رانی کو بنا سنوار کر ہیروئین بنا دیں گے۔ لیکن ہمیں کیا ملے گا۔ چاکولیٹ کھائے بہت دن ہو گئے۔ وعدہ کرو تو ہم سفارش کریں۔" "بھئی مجھے سفارش کی ضرورت نہیں اور نہ یہ میری خواہش ہے جو تمھیں چاکولیٹ کھلاؤں۔" تو اس نے کہا "اچھا تو کسی اور سے کہہ دیجئے کہ کھلا دیں۔" میں جھنجلا کر بول اٹھا "بھئی میں اب زیادہ سفارت کا فریضہ انجام نہیں دے سکتا مجھے چھوڑ بھی دو۔" ایک قہقہہ پڑا اور میں نے دیکھا کہ ان ہنسی سے سرخ سرخ لڑکیوں کی فوج کے پیچھے سے دو مسکراتی اداس آنکھیں ایک لمحہ کو اٹھیں پھر نیچے جھک گئیں۔ شاید انھوں نے کچھ کہا بھی تھا میں نے سمجھا نہیں یا اگر سمجھا تھا تو بھول جانا چاہتا ہوں۔

جب ہنسی ختم ہوئی تو ساری کا معاملہ پھر سے شروع ہوا۔ کونسی ساری؟ کیسی تھی وہ؟ واللہ مجھے خود اس ساری کا رنگ یاد تھا نہ وضع۔ میں کیا تفصیل بتاتا۔ میں نے کبھی بھی اس کی ساری سے محبت نہیں کی تھی۔ جب ہر لڑکی باری باری بول چکی تو آہستہ سے کسی کی آواز آئی۔ معلوم نہیں ہمیشہ اس میں اتنی موسیقیت رہتی ہے یا نہیں مگر اس وقت مجھے یوں لگا کہ دور بہت دور کسی ٹھنڈی جھیل کے کنارے پھولوں میں گھرا ہوا کوئی پپیہا چپکے سے "پی" بول اٹھا۔ رانی بولی "اس ساری پر ممی نے دوسرا رنگ چڑھا دیا — اور وہ زنجیر بھی ٹوٹ گئی ——" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے اسے واقعی افسوس ہو معصوم رانی۔ بھولی بھالی لڑکی ان شریر لڑکیوں کی بات کو حقیقت جان رہی تھی۔ کاش اے کاش اسے معلوم ہوتا کہ یہ میرے دل کی نہیں کمار کے دل کی آواز ہے۔ میں نے تو صرف ترجمانی کی تھی خیال اس کا زبان میری۔ اب میں کیسے سمجھاؤں؟

میں جانے مڑا ہی تھا کہ نیلو نے روک لیا "کہاں چلے ہیں جناب! لائیے ساری تحفہ دیکھیے اور دوسری چیز مہیا کرنے روپے نذر دیجئے۔ اب آپ یوں سستے نہ چھوٹیں گے۔"

"میں گھبرا کر بولا" بھئی میں کب انھیں بنا سنورا دیکھنا چاہتا ہوں جو ساری تحفہ دوں"———— وہ لڑکیاں سمجھ رہی تھیں کہ میں واقعی رانی کو چاہتا ہوں۔ وہ سب ہنسنے لگیں۔ حسنی بولی، "بڑے معصوم بنتے ہیں آپ۔ بہت موچکا کسی اور کی آڑ میں شکار چھپے رستم ہیں تب نکالئے روپے۔ چاکولیٹ کھائے بھی بہت دن ہو گئے۔"

میں نے دل ہی دل میں گڑگڑا کر دعا مانگی "اے خدا تو مجھے بچا لے۔ یہ کیسی حماقت ہوئی ہے مجھ سے۔ کیسی منحوس گھڑی تھی جب میں نے اسے ہیروئن بنایا تھا۔ اے اللہ میں کیا کروں"! میں نے ہمدردی کے لئے نفیس کو دیکھا۔ مگر وہ خود بھی ہنس رہی تھی مجھے بنا رہی تھی۔ جب میں بڑی مشکل سے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا تو میری عجیب حالت تھی۔ برسات کے اس ٹھنڈے بھیگے موسم میں، میں پسینہ میں ڈوب گیا۔ بال پریشان، ہونٹ خشک اور جب میں نے مولسری کے جھنڈ میں پناہ لی تو میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ایسا کہ یوں کبھی نہ دھڑکا تھا۔ دور مجھے کمار آتا ہوا دکھائی دیا۔

میرے سینے میں دل خون ہو گیا اور بوند بوند آنتوں میں ٹپکنے لگا۔ اندر ہی اندر میں خوف کھا رہا تھا۔ کس سے؟ مانی سے! کمار سے یا پھر اپنے آپ سے! میں سمجھ نہ سکا۔

اور اب بھی جب رانی کہیں ادھر ادھر مل جاتی ہے اور ایک لمحہ کو ہم دونوں کی نگاہیں چار ہوتی ہیں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ آسمان کی بلندی پر کئی ستارے آپس میں ٹکرا گئے اور ان کی چنگاریاں میرے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ رانی کا سر جھک جاتا ہے۔ چال میں زیادہ لچک پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے اداس چہرہ پر مایوس شفق پھولنے لگتی ہے۔ وہ آخر کیا خیال کرنے لگی ہے۔ اور میرے ذہن میں دو سوئی سوئی آنکھیں ابھرتی ہیں۔ شاداب ہونٹ مسکرا اٹھتے ہیں اور میں چونک کر آپ ہی آپ کہتا ہوں "میں نے یہ کیا کیا ———— رانی سے مجھے محبت تو نہیں" ———— معلوم نہیں کیوں میں نے رانی سے یوں ہی کہہ دیا تھا کہ تم ..... "

زینت ساجدہ

رات کا بھولا اور دیگر افسانے :- پروفیسر عبد القادر صاحب سروری ایم اے۔ ایل ایل بی صدر شعبۂ اردو، فارسی و عربی مہاراجہ کالج میسور کے گیارہ بلند پایہ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ہے جو نہایت اہتمام کے ساتھ بہت ہی دیدہ زیب شائع ہوا ہے۔ پروفیسر سروری صاحب نے اس سے قبل فن افسانہ پر مستند کتابیں مثلاً دنیائے افسانہ اور کردار افسانہ وغیرہ شائع کی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے قابلِ مطالعہ ہیں۔ اس کتاب کا ٹائٹیل ملک کے بلند پایہ حسن کار مسٹر عبد القیوم نے بنایا ہے۔ طباعت و کتابت پاکیزہ اور دیدہ زیب ہے۔ صفحات ۱۶۸ قیمت عہ

مَن کی دنیا - حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی ایم اے کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔ ہر فسانہ رعنائی خیال اور رنگینیٔ بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستار ان افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہوں گے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد عہ

جدید اُردو ادب میں عورت کا مقام

مرد ہمیشہ انتہا پسند ہوتا ہے۔ عورت کے بارے میں اس کی انتہا پسندی بعض اوقات حدِ اعتدال سے گزر جاتی ہے۔ کبھی اس کے قلم سے عورت کی اتنی تعریف و توصیف نکلتی ہے کہ وہ اسے "دیوی" اور "حور" جیسے پاکیزہ ناموں سے یاد کرتا ہے اور کبھی "طوائف" "کسبی" اور "پیشہ ور" جیسے نام دیتا ہے عورت نے زندگی کی تصویر میں اپنے وجود سے رنگ بھرا ہے اور مرد اسی تصویر کو دیکھ کر جیتا ہے۔ اسی عورت کے لئے وہ سب کچھ کرتا ہے، کر رہا ہے اور کرے گا۔ جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا وہ "ایک عورت" کے لئے ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا۔ عورت نے مرد کے افسانۂ حیات کو مکمل کیا اور یہ افسانہ زبانوں سے نکلا، صفحۂ قرطاس پر رقم ہوا اور ہوتا رہے گا۔ ادب، آرٹ اور فن اسی عورت کے اطراف گھومتے رہے ہیں اور گھومتے رہیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ کسی خاص قسم کے عمل کا ہوگا تو دوسرا ردِ عمل کا اور یہ عمل و ردِ عمل کا سلسلہ جب تک دنیا باقی ہے، اس میں مرد و عورت کی زندگیوں کا مد و جزر باقی ہے باقی رہے گا۔

ادب زندگی کی تصویر ہوتا ہے۔ زندگی داخلی اور خارجی اثرات کے دباؤ سے اولتی بدلتی رہتی ہے اسی لئے ادب ان تمام ذہنی، احساساتی اور نظریاتی تغیرات کی عکاسی کرتا ہے جو زندگی کو نئے نئے سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں اور جن کا تعلق براہِ راست شعوری بہاؤ سے ہوتا ہے۔ ادب خواہ برائے ادب ہو کہ برائے زندگی دونوں صورتوں میں زندگی سے متعلق ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے میں خیالات مسائلِ حیات کے نہیں بلکہ فنی لطافتوں کے گرد گھومتے ہیں اور دوسرے میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے صرف حیات اور اس کی ساری اچھائیوں اور برائیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی قدر کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس کا اصل مطمحِ نظر ایک عملی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے جس کی انتہائی شکل نیٹشے برنارڈ شاہ کے "کامل انسان" یا (Superman) کی بسائی ہوئی دنیا کا تصور ہوتا ہے۔ دنیا کا ادب تو دنیا جیسا وسیع و بسیط ہے میں صرف اردو ادب اور اردو ادب میں بھی جدید اردو ادب میں عورت کے مقام پر ایک طائرانہ نظر ڈالوں گی کیونکہ وقت کے پر ہوتے ہے اور میں پندرہ منٹ جیسے قلیل عرصے میں اس سے زیادہ کی جراءت نہیں کر سکتی۔

آج کل کے اردو ادب کے ناموں میں سب سے زیادہ نمایاں "ترقی پسند" ہے۔ یہ "ترقی پسند ادب" اگر بہ نظرِ غور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ محض ایک ڈھونگ ایک صریحی غلط پروپگنڈا اور صرف جنسیاتی مظاہروں کی نمائش گاہ نہیں ہے۔ اس پر تنقید کرنے سے پہلے ہمیں اپنے اردگرد کی زندگی پر بھی نظر رکھنی چاہئے اور ادیب زبان، قلم سے وہی بولتا ہے، جو اس کی آپ بیتی ہوتی ہے یا جس کا وہ مشاہدہ کرتا ہے۔ صرف اس جنگ کے زمانے ہی سے نہیں بلکہ گزشتہ جنگ کے زمانے ہی سے ہندوستانیوں میں اتنی بیداری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اپنے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور ادبی ماحول کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے لگے ہیں اور اگر سمجھنے نہ بھی لگے ہوں تو کم از کم شدت سے محسوس ضرور کرنے لگے ہیں۔ غالبؔ کا ایک شعر ہے ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے!

اور آج کل غالبؔ کا یہ احساس اس قدر شدید ہوگیا ہے کہ عام طور پر ادیب و شاعر یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ جیسے خدا کچھ کر ہی نہیں رہا ہے، وہ دیکھتا سب کچھ ہے پر کرتا کچھ نہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان آزادی، امن و سکون اور سب سے بڑھ کر اطمینانِ قلب کے لئے جیسے ترس رہا ہے۔ سرمایہ دار سب کچھ رکھ کر نادار ہیں اور نادار کے تو پوچھنے ہی کیا۔

لیکن اب نادار کو اپنی ناداری کا احساس ہوگیا ہے اور سرمایہ کی اس غیر اصولی تقسیم کے خلاف وہ احتجاج کر رہا ہے اس کی ایک اچھے پیمانے پر زندگی بسر کرنے کی خواہش اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ "ہر ذریعہ" کو اختیار کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ایسی خواہش ہی کیوں پیدا ہوئی تو آپ اس محرک کو کیا کہیں گے "جو نفس امارہ" کے نام سے موسوم ہے۔ ریشم و دیبا کتنے ہی اتنے نفیس و لطیف ہیں کہ ان پر ہاتھ پھیرنے کی خواہش ہر دیکھنے والے کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات اب افسانہ بن گئی کہ "نفس" یا "دل" کو قابو میں رکھنا ضروری تھا۔ اسے بس میں رکھنے والے جانے کس مٹی کے بنے ہوتے تھے۔ قناعت پسندی کے تصور سے جمود پیدا ہوتا ہے اور آدمی میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی حس خاموش ہو جاتی ہے۔ اس "مشینی دور" میں انسان کو کسی آسمانی امداد سے زیادہ اپنی قوت بازو پر بھروسہ ہے زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے میں صرف عقل کی روشنی مشعل راہ منزل نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس کیا جارہا ہے کہ مذہب و اخلاق کے اصول انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان کے ان کو اب بھی توڑا جا سکتا ہے۔ ان میں ردو بدل ہو سکتا ہے اور انہیں ایک بلند ارتقائی شکل بخشی جا سکتی ہے، جنت و دوزخ، نرگ اور سورگ کا تصور اب دلوں سے محو ہو رہا ہے، زندگی کی خوشیاں جنت اور اس کی مصیبتیں جہنم ہیں۔

عورت کی فطرت بے حد لچکیلی ہوتی ہے جس طرح پانی جس برتن میں ڈالا جائے اسی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اسی طرح عورت جس ماحول، جس رنگ اور جن حالات میں رہتی ہے خود کو اسی کے موافق ڈھال لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذاہب عالم کی اساس اور اخلاق انسانیت کی بنیاد سچ پوچھئے تو عورت ہی کی ذات پر ٹکی ہوئی ہے۔ اس کے ذہنی اور دماغی توازن پر حیات انسانی کا دارومدار ہوتا ہے۔ جہاں یہ توازن بگڑا حیات انسانی بے بادبان کشتی کی طرح کائنات کے بحر ذخار میں ڈوبنے لگتی ہے کیونکہ کائنات کی جان مرد اسی کی گود کا پالا ہوتا ہے اسی کی گود میں افلاطون اور سقراط جیسے نادر روزگار بچے اور اسی کی آغوش میں نیرو جیسا ظالم پرورش پایا، یہ دونوں قسم کی اولادیں اس کے مدوجزر حیات کی مظہر ہیں۔

وہ زمانہ گیا جب عورت پردوں میں رہا کرتی تھی، وہ لاچار تھی، معذور تھی یا اس میں کوئی قوت ارادی نہ تھی اس میں کوئی بیداری نہ تھی۔ اب وہ مردوں کے دوش بدوش زندگی کے میدان میں اتر آئی ہے۔ اگر کسی کو اس کی یہ آزادی ایک آنکھ نہیں بھاتی تو اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا یہ آنکھ کا اپنا قصور ہے۔ وہ آنکھ اس کے ہم دوش کی آنکھ نہیں آج سے پچاس برس پہلے کی پیدا شدہ آنکھ ہے اور اس آنکھ کی اسے کوئی پروا نہیں۔ اس کی آنکھ تو دور کہیں افق پر لگی ہوئی ہے۔

آج سے پچیس سال پہلے کے اردو ادب میں اس "جمہوریت پسندی" کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں جو آج بہت زیادہ پھیل گئے ہیں۔ پہلے عورت نذیر احمد، رسوا، سرشار، شرر وغیرہم کے پاس گھر گرہستی، عقیل و فہیم، ایک خاص نوابی آن اور شاہانہ حیثیت کی مالک تھی تو اس ربع اول کے آخر آخر میں وہ پریم چند کے متوسط اور ادنیٰ طبقوں کی قدرے خوش حال اور رو دھو کر زندگی بسر کرنے والی اور بعض اوقات فاقے کر کے گزارا کرنے والی عورت تھی۔ لیکن پریم چند والے طبقے میں بعض ایسے ادیب بھی ملتے ہیں جو محض فن برائے فن کے قائل ہیں۔ امتیاز علی تاج کے ہاں عورت کا مقام ملاحظہ فرمائیے، انارکلی جیسی عزیزہ گم ہوگئی اور شہزادہ سلیم نے اس کے ماتم کی بجائے اپنی "شکست آرزو" کا ماتم کیا!

دور حاضر کی ابتداء بہت ہی سست سی ہے۔

اعظم کریوی، علی عباس حسینی، احمد ندیم قاسمی، سدرشن
اوپندر ناتھ اشک اور شبیر حسن، عصری رجحانات سے
متاثر ضرور ہیں لیکن ان کے افسانوں میں وہ حرکت
اور وہ عمل نہیں جو اب چند سالوں سے، میرا خیال ہے
۱۹۳۵ء کے بعد سے، پیدا ہو گیا ہے اور اس شدت سے
پیدا ہوا ہے جیسے کوئی رکا ہوا طوفان یکایک پھٹ پڑا ہو۔
ترقی پسندی اندھی حقیقت نگاری ہرگز نہیں ہوتی جس
میں مشابہت اور نقل ہوتا ہے، "ادب محض ہمعنان
حیات ہوتا ہے بلکہ وہ ناقد اور معترضیات بھی ہوتا ہے۔
صالح ادب تو حال کی تصویر اور مستقبل کے لئے "اشاریہ"
ہوتا ہے۔ نری حقیقت نگاری "فطریت" ——
(Naturalism) کی بے اثر تحریک میں
گم ہو جاتی ہے۔

جدید اردو ادب میں ۱۹۳۸ء بہت اہم ہے۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت تک جو مطالعہ ادیب
کرتے اور جن مسائل پر غور و خوض کرتے رہتے وہ اب یکایک
ان کے علم سے نکل پڑ رہا ہے اور کرشن چندر، راجندر سنگھ
بیدی، اوپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی،
احمد ندیم قاسمی، مہندر ناتھ، فیاض محمود، دیوندر ستیارتھی،
اختر انصاری، اختر اورینوی، حسن عسکری اور
ممتاز مفتی اس بساط کے اہم مہرے ہیں۔ انھوں نے
نہ صرف اپنے ملک کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ادبی
زندگی کا مطالعہ کیا ہے بلکہ یورپ اور امریکہ وغیرہ دیگر
ممالک کے ان سارے مسائل کی بھی واقفیت بہم پہنچائی ہے۔
ان ادیبوں میں اکثر نے جیمس جوئس، ڈی ایچ لارنس
اور فرائیڈ جیسے موجودہ زمانے کے سب سے بڑے ماہرین
نفسیات و جنسیات کا مطالعہ کیا ہے اور بعضوں نے تو
اپنی ادبی زندگی کی باگیں اسی راہ پر موڑ دی ہیں۔ یہ لوگ
جنسیات اور اس کی مختلف کیفیات کے متعلق لکھتے
ہیں اور ان کا ادعا ہے کہ جنسی مسائل ہر دور
میں پائے جاتے ہیں البتہ انھیں سائنٹفک اصولوں
سے اب تک حل نہیں کیا گیا تھا۔ اس جنسی تعلیم کی
روشنی میں انھیں وہ اخلاقی قدریں جو انسان کو
جکڑے ہوئے ہیں بری معلوم ہونے لگی ہیں اور وہ انھیں
توڑ پھینکنے میں مصروف ہیں۔ مرد اور عورت ایک دوسرے
کے لئے بنے ہیں ان کا فطری میلان لازمی ہے بعض
معاشی اور معاشرتی پابندیوں نے ان دونوں کے
اس بندھن کو توڑا ہے اور آج عورت کی سماج کے
خلاف بغاوت انھی پابندیوں کو توڑنے کی کوشش
ہے۔ احمد عباس کے افسانہ "بارہ کھمبے" کو پڑھئے
اور اس بغاوت کی معراج ملاحظہ فرمایئے۔ جنسیات
اور اس کے پیچیدہ مسائل کو سب سے پہلے عظیم بیگ چغتائی
نے اپنے خاص رنگ میں پیش کیا۔ متوسط طبقے......
کی لڑکیوں کی ذہنی کیفیات ان کی الھڑ پن کی شوخیاں،
بے باکیاں، انھوں نے اس رنگ سے بیان کیں کہ قاری
کا ذہن اس تصویر میں فلم کا لطف لینے لگا۔ ان کے بعد
عصمت چغتائی نے عورت کو اس زمانے کی عورت کی حیثیت
سے اس کے خاص رنگ میں پیش کیا۔ عصمت کے نسوانی
کردار زندہ، چلتے پھرتے، مصیبتوں میں روتے بعض وقت
اس عالم میں بھی مسکراتے، خوشیوں میں ہنستے، خطروں
اور حادثوں کے وقت دماغوں کو استعمال کرتے ہیں۔
اخلاق و کردار کا اعلیٰ سے اعلیٰ اور بدتر سے بدتر نمونہ
اس نے پیش کیا۔ اس کے ہاں حجاب کی پریوں کی کہانیاں
نہیں۔ فرانسیسی دیویوں کی بجائے "بجری" ہے اور
عالیشان، خوبصورت پائیں باغوں کی بجائے بڑا کی
سڑی، گندی کوٹھڑی ہے۔ وادی زبیدہ، روحی اور
نسرین کی بجائے للّی، زہرہ، طلعت، رفیعہ اور
ریحانہ وغیرہ ہیں جو ہم سے ملتے ہیں، لڑتے ہیں، جھگڑتے
ہیں۔ ان کی شرارتوں پر جی کھولتا ہے اور پھر ان کو پیار
بھی کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا"، "لوز چاچو باجی" ہندوستان کے

پچاس فی صد گھرانوں میں ملتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں اگر عورت چلمن سے جھانک لیتی تھی تو وہ اب عصمت کی کالج کی شوخ لڑکی اور حسن عسکری کی "حرامجادی" بن گئی ہے۔ رسوا کی تہذیب یافتہ امراؤ جان ادا اس صنعتی دور میں منٹو کی "ہتک" بن کر "کالی شلوار" پہن چکی ہے، عصمت نے "لحاف" اٹھایا ہے اور اس میں سے جو "بو" آنے لگی ہے وہ اس گندگی کا تصور ہے جو خوبصورت ریشمی لحافوں کے پیچھے دبی ہوئی ہے۔ منٹو نے "قحبہ خانوں" کا مشاہدہ کیا ہے بقول کرشن چندر "منٹو نے زندگی کے زہراب کو بہت قریب سے دیکھا ہے، چھوا ہے، چکھا ہے" اور اب وہ تیز نشتر بن کر سماج کے فاسد مادہ کو خارج کر دینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مریض چیختا ہے چلاتا ہے، بین کرتا ہے۔ منٹو کو اس کی پروا نہیں وہ اس قدر بے رحم ہے "کہ کلوروفارم دینا بھی پسند نہیں کرتا" اور عورت کو یہ مقام در اصل مرد ہی نے عطا کیا ہے، محض اپنے جرم کو چھپانے کے لئے اس سے گریزاں ہے اس کے منہ پر انکار کر جاتا ہے کہ وہ اس سے محض آشنا بھی نہیں۔ منٹو کے ہاں مس فریا، مسز ڈی سلوا سے لے کر گھا ٹن لڑکی تک کئی کرسچین لڑکیاں ملتی ہیں جو آج کل خصوصاً اس جنگ کے زمانے کی "زیادہ سو لجر اگاؤ" مہم کی خصوصی پیداوار ہیں۔ کرشن چندر نے کشمیری عورت کی زندگی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ کشمیر صرف جنت نظیر ہی نہیں صرف چشم و نظر کی راحت ہی نہیں اگر اسے چشم بینا سے دیکھیں تو رنگ و بو کی وہ تصویر ہے جس کو اندر ہی اندر کیڑا کھا چکا ہے۔ اور اس خطۂ ارم کی یہ ایک حقیقت ہے کہ اس چشمہ سے لے کر اس چشمہ تک اور اس لاری سے لیکر اس لاری تک کئی ایک "بشیدائیں" پھرتی ہیں اور نہ معلوم کب تک ماحول انہیں اس طرح پھرنے پر مجبور کرے گا۔ کرشن چندر نے زندگی پر وسیع نظریں ڈالی ہیں اور "سورج کے چابک دست ماہی گیر" کی طرح زندگی کی اہم موضوعات کو اپنے فن اور تخیل کے جال میں سمیٹ

لیا ہے۔ چنانچہ چندرا، دنتی، سرائے کی لڑکی وغیرہ اس کے ایسے کردار ہیں جو بیک وقت رومانی، خوددار اور افلاس زدہ ہندوستانی عورت کی زندگی کے علحدہ علحدہ ترجمان ہیں۔ اس طرح اس کی فن کاری نے سماج کے جنتی اور جہنمی دونوں رخوں کی تصویریں کھینچی ہیں۔ بیدی گو کرشن چندر تک نہ پہنچے لیکن عورت کی اس کے ہاں مکمل تصویر ہے۔ اس کی عورت کی نمایاں خصوصیت اس کی اس حد تک ذہانت ہے جہاں خشک مزاجی پیدا ہو جاتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی "صبوحی" پنجاب کی "آتشیں گر شباب" کا لرزاں، رقصاں اور خنداں نمونہ ہے۔ اس کے ہاں عورت وہ بدمست شگفتہ والی ہے جس کے کانوں کو پتلی پتلی بالیاں چومتی رہتی ہیں، جس کی زلفوں میں گھٹاؤں کا سا رنگ اور آنکھوں میں ستاروں کی سی چمک ہے۔ جن کے چلنے میں ہواؤں کا سا انداز ہے جس کا سینہ چھلکتا ہوا میکدہ ہے اور جس کے ہونٹ پیمانوں کے لب! دیویندر ستیارتھی خود خانہ بدوش ہے اس کے سارے کرداروں اور ان کی زندگیوں پر "خانہ بدوشیت" سی چھائی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی کشادگی، وسعت اور لاابالی پن بھی وابستہ ہے ——
علی عباس حسینی نے ایسا "توفیق تنہائی" ڈھونڈ رہے جس نے اپنے آپ کو قدامت کے شکنجوں سے چھڑا کر بدعت کی شاہ راہوں پر ڈال دیا ہے۔

بقول عبادت بریلوی ان ادیبوں کے علاوہ "دوسرے لکھنے والوں کا ایک جنگل نظر آتا ہے" جس کی زیادہ تر نمائندگی نوجوان طبقہ کر رہا ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ریاض روحی، ممتاز شیریں، ابراہیم جلیس، عزیز احمد، شکیل اختر، قرۃ العین حیدر، شمس آغا وغیرہ کے نام سب سے نمایاں ہیں اس طبقے میں عورتیں بہت نہ ہی کچھ زیادہ ہی نظر آتی ہیں اور یہ آج کل کی تعلیم دیگر ممالک کے ادبیات، سیاسیات اور تمدن سے واقفیت کا نتیجہ ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں نے

ادب میں حصہ لیا اور نمایاں حصہ لے رہی ہیں، بقول
مسعود زاہدی صاحب "کہیں کہیں تو جنسی عریانی میں
یہ عورتیں مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ جاتی ہیں" اور اس طرح
جدید اردو ادب میں عورت اسکول مسٹریس، بھکارن،
مہترانی، سڑک پر کنکر توڑنے والی، مزدورنی، کاچھن،
بازاری عورت، کالج کی لڑکی، مغرب زدہ فیشن ایبل
عورت، دیہاتی الھڑ سادہ لوح لڑکی، بے وقوف،
ادھیڑ، سن رسیدہ عورت (جس کو اپنی جاتی جوانی کو
سنبھالنے کا بڑا خیال ہوتا ہے) غرض مختلف حیثیتوں
سے نظر آتی ہے۔ وہ پچھلے دور کی "دیویاں" اور "حوریں"
اب نہیں ملتیں۔ اب تو کبھی گندی نالی کی سڑاند آتی ہے
کبھی گھٹیا قسم کے عطر اور سینٹ کی بو، جن سے طبیعت
الجھنے لگتی ہے اور کبھی کبھی خالص فرانسیسی سینٹ کا
ایک ایسا بھپکا بھی آجاتا ہے جس سے طبیعت کو فرحت سی
ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں گرانی سی بھی ضرور ہوتی ہے۔

جب سے غزل کی بجائے نظم کا رواج زیادہ ہوا
نظموں میں محبوب کا تصور خصوصی طور پر عورت کی ہستی پر
چھا گیا۔ اب مرد محبوب نہیں، وہ محبوب خاص پیش نظر
ہے جس کی

بولتی آنکھوں کا اس گلرنگ عارض کا جمال

ایک "مسکراتا سا تصور" اور ایک "گنگناتا سا خیال"
بنا ہوا ہے۔ لیکن زندگی اس دور سے گزر رہی ہے جس میں
"آگے چلیں گے دم لے کر" کی فرصت نہیں اور یہ عدیم الفرصتی
"محبت کی فرصت" ہی نہیں دیتی۔ محبت کی "نعمت عظمیٰ"
عورت کی "لذت جاں بخش" اور اس کی آغوش کے
"مسرت آگیں" ہونے میں کلام نہیں لیکن شاعر مجبور ہے
اور اسے ع

انگنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم

توڑنے ہیں جو ع

ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے

ہیں۔ اس لئے وہ اپنے محبوب سے کہتا ہے ع

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

کیونکہ ؎ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

لیکن اتنا سوچنے کے باوجود شاعر انسان ہے اس کا
دل گوشت پوست کا ایک ٹکڑا —— وہ نہ "صرف روح"
یعنی (Mere Soul) اور نہ ہی "صرف مضغۂ
گوشت" (Just Flesh) محبوب کے عارض
سیمیں پر اشکوں کے قطرے دیکھ کر وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔
اسے ان آنسوؤں کی وجہ معلوم ہے، اس لئے وہ اسے
اطمینان دلانا چاہتا ہے کہ تمہیں رونے کی ضرورت نہیں
میں تم سے اب بھی محبت کرتا ہوں ؎

مجھ کو اک لمحہ کبھی چین بھی آیا تجھ بن
عشق ہی ایک حقیقت تو نہیں ہے لیکن
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور انجم کو اپنے گرد و پیش کی دنیا کا جائزہ لے کر افلاس،
سرمایہ و محنت کی جنگ، حکومت اور غلامی کے خلاف
بغاوت کرنے کا مشورہ دیتا ہے ؎

تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارہ بن جا
تو بھی اب عرش بغاوت کا ستارہ بن جا
زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم!

اور جب وہ "زندگی" کے مصائب کو ختم کرنے کی مہم پر روانہ
ہونے لگا تو اس کا دل ایک بار پھر لرزا ع

اف! یہ بھیگی ہوئی پلکیں یہ لرزتے ہوئے ہونٹ!

اور ان سے پریشان ہو کر دم چیخ اٹھا ؎

دیکھ! اب اور پریشاں تو نہ کر — زندگی ہے تو پلٹ آؤں گا
میں تری یاد کو دل میں لے کر — ہر مصیبت سے گزر جاؤں گا
دیکھو اب ہاں بھی جا دیکھ نہ روک
مجھ کو مت روک، مجھے جانے دے!

زندگی کی یہ پریشانیاں، لاچاریاں اور مجبوریاں ہیں لیکن

بقول شخصے "جب تک سانس تب تک آس" اسے امید ہے کہ اس کے دن ایک نہ ایک دن ضرور پھریں گے۔ یہ عصری رجحان ہے۔ باوجود ہر قسم کی مایوسی کے امید کا دامن چھوڑا نہیں جاتا، اسی کے سہارے سب جی رہے ہیں، ایک اعلیٰ اقدار کی حامل زندگی سب کو نظر آ رہی ہے، شاعر کہتا ہے ؎

چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
چند روز اور ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم

کیونکہ یہ ناجائز پابندیاں اس قدر سخت ہو چکی ہیں کہ ؎

جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے گفتار پہ تعزیریں ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے رہتے ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں

"حق کی فتح" کا اتنا یقین ہے کہ وہ عزم ہے

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

اس طرح الطاف مشہدی و ندیم قاسمی سے لے کر فیض و مجاز، یوسف ظفر و اختر الایمان سے لے کر میراجی و مخدوم، علی سردار جعفری و جاں نثار اختر سے لے کر روش صدیقی و سلام مچھلی شہری اور مخمور جالندھری سے لے کر میکش تک سبھوں نے عورت کو محبوبہ، بیوی، پجارن، بھکارن، طوائف، کالج کی تعلیم یافتہ، سوسائٹی گرل اور مزدورنی کے روپ میں پیش کیا ہے، یہاں تک کہ فیض نے اسے سیاست کے بکھیڑوں میں گھسیٹا کیونکہ اب ہر طرف بغاوت کی آگ پھیلی ہوئی ہے اقوال میں، اعمال میں، نظریوں میں، اصولوں میں اور یہاں تک ہی اسے یہ مشورہ دیا ہے کہ ؎

تو اس دامن کو اب پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

سعیدہ مظہر

خطبۂ استقبالیہ کل ہند ترقی پسند کانفرنس

(عالی جناب ڈاکٹر زور صاحب نے کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے اجلاس
حیدرآباد دکن منعقدہ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۴۵ء میں جو خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا وہ
وہ درج ذیل ہے)

معزز خواتین و حضرات!

میں بڑی مسرت کے ساتھ آج آپ کے اس اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اِس قسم کے میل جول اور تبادلۂ خیال سے اردو زبان اور ادب کو دیرپا فوائد حاصل ہوں گے اور ہماری آپس کی بہت سی غلط فہمیوں اور خامیوں کا ازالہ ہو سکے گا۔ ہماری زبان کی ایک بہت بڑی خوبی آج ہماری سب سے نمایاں خرابی بن گئی ہے۔ ہم سب اِس حقیقت حال پر فخر کرتے ہیں کہ ہماری اردو زبان ہندوستان جیسے وسیع ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی ہے اور اس ملک کے ہر خطے میں۔ خواہ وہاں کی مقامی زبان کوئی ہو۔ اردو ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے مختلف مذہبوں اور نسلوں کے لاکھوں انسان ایک دوسرے کے رنج و راحت کو سمجھتے اور اپنی سماجی ضروریات کی سربراہی کر سکتے ہیں۔ لیکن مختلف اقطاع ملک کے اہل اردو کے باہمی اختلافات اور تعصبانہ انتشار کے باعث ہماری زبان کا یہ ہنر ہمارے لئے عیب بنتا جا رہا ہے۔ ہمارے بڑے سے بڑے ادیب اور شاعر وسیع نظری اور رواداری سے محروم ہیں اور ہماری اکثر و بیشتر انجمنیں اور جماعتیں پست خیالی اور کوتاہ بینی کا شکار بنتی جا رہی ہیں۔ ایک جماعت دوسری جماعت کے قیام اور ایک فرد دوسرے فرد کے وجود کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی لئے اہل اردو کی نظر میں ہر نئی تحریک کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ اور ہر شخص دوسرے کو شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے۔

سال گزشتہ جب کل ہند اردو کانگریس کا ایک اجلاس ترقی پسند تحریک کے لئے وقف کیا گیا تو میرے ایک خاص دوست جو اس تحریک کے روح رواں ہیں اور آج کے اس اجتماع میں دوسری بار میں ان کا دلی مسرت سے استقبال کر رہا ہوں، بہت حیران ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ

"ہماری نظر میں حیدرآباد تو آخری مقام تھا جہاں یہ تحریک اثر انداز ہو سکتی تھی۔ لیکن اردو کانگریس کے اس اقدام سے ہم کو اپنی رائے بدلنی پڑی"

اُس وقت تک میرے ان فاضل دوست کو ترقی پسند حیدرآباد کے دیرینہ رجحانات سے شاید واقفیت نہ تھی اور یہ حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل تھی کہ یہ سرزمین صدیوں سے اس خصوص میں ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اردو زبان تو خاص طور پر اس ملک کے ترقی پسندانہ رجحانات ہی کا ایک نمایاں ثبوت ہے۔ آج سے چار پانچ سو سال قبل جب کہ فارسی زبان تمام ہندوستان کی سرکاری اور علمی و ادبی زبان سمجھی جاتی تھی حیدرآباد ہی نے جرأت کی اور ملک کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک پردیسی زبان کے طوق غلامی سے آزاد کرایا اور یہاں کے عوام بازاروں اور گھروں میں جس زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے اس کو علم و ادب کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ چنانچہ آپ سب بخوبی واقف ہیں کہ اردو کا ابتدائی ادب جس میں نثر و نظم کی سیکڑوں کتابیں شامل ہیں دکن ہی میں

لکھا گیا اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں تقریباً دوسو سال بعد ترقی پسندی کی یہ تحریک سرسبز ہوسکی ۔ اور وہ بھی محض دکن ہی کے ایک شاعر ولی کے سفر و قیام دہلی اور اس کے دیوان کی تشہیر کے بعد ہی خاطر خواہ ترقی کرسکی ۔ اسی واقعہ کی طرف میر تقی میر جیسے وضع دار شاعر نے جس کو شاید آپ قدامت پسند بھی کہیں ایک ترقی پسندانہ انداز میں اشارہ کیا تھا کہ ؎

قائل نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے　　معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اردو ادب اپنے ابتدائی دوسو سالوں میں زیادہ تر برج بھاشا سے متاثر رہا اور پہلے پہل دکن ہی کے ایک شاعر ولی نے اپنے سفر گجرات و دہلی کے بعد محسوس کیا کہ اس کی ترقی اور مقبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس میں فارسی اور عربی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں اس لئے وہ اور اس کے اورنگ آبادی دوستوں اور معتقدوں نے وہ ترقی پسندانہ رجحان اختیار کئے جن کو آگے چل کر مرزا مظہر جان جاناں اور شاہ ظہور الدین حاتم نے شاہ جہاں آباد میں رائج کیا اور اردو زبان کی وہ شکل قائم کردی جو آج تک معیاری اردو کہلاتی ہے ۔

اردو زبان کی حد تک حیدرآباد کے ترقی پسندانہ رجحانات کی تاریخ یہیں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اب تک جاری ہے ۔ چنانچہ جامعہ عثمانیہ کا قیام تو اس سلسلہ کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جو اردو کی تاریخ میں حیدرآباد کی ترقی پسندانہ خدمات کو زندگی جاوید بخشنے کا باعث ثابت ہوگی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں بھی ایسے اصحاب موجود ہیں جو اس تحریک کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اردو ادب میں گندگی پھیل رہی ہے اور اس ادب کو پڑھ کر ہمارے نوجوان گمراہ ہوتے جارہے ہیں ان کا یہ سمجھنا ایک حد تک غلط بھی نہیں ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس خوش آیند تحریک سے فائدہ اٹھاکر بہت سے خام کاروں اور آوارہ مزاج ادیبوں اور شاعروں نے اپنے پست جذبات اور زیادہ تر شہوانی الجھنوں کی نمود و نمائش شروع کردی ہے ۔ اس لئے اس امر کی سخت ضرورت ہے جیسا کہ میں نے یوم حالی میں بھی کہا تھا کہ " انجمن ترقی پسند مصنفین " جلد سے جلد اپنے تحت ایک ایسی احتسابی مجلس قائم کرے جو موقع بموقع ان نام نہاد ترقی پسندوں کے افکار نظم و نثر کا جائزہ لیتی رہے اور ان کی نسبت اپنی صریحی رائے کا اظہار دیانت اور جرأت کے ساتھ کرتی جائے ۔ اگر اس قسم کا کوئی اقدام جلد نہ کیا جائے گا تو ہر ناقص شاعر اور نااہل ادیب ترقی پسندی کے روپ میں اپنی کم علمی، ادبی بے بضاعتی اور اخلاقی نقائص کو چھپاتا رہے گا اور نہ صرف ترقی پسند تحریک کو نقصان پہنچے گا بلکہ حال اور مستقبل کے اردو ادب پر خامیوں اور گندگیوں کا ایک ایسا زنگ چڑھ جائے گا جس کی ذمہ داری اس تحریک کے مخلص بانیوں کے سر رہے گی اور جس کے دور کرنے میں مستقبل کے ادیبوں اور شاعروں کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑیں گی ۔

ایک ایسی ہی مجلس کی طرف سے صحیح قسم کے ترقی پسند ادب کے کئی مجموعے بھی شائع ہونے چاہئیں جو کرشن چندر کے جدید مجموعے " نئے زاویے " کے انداز میں مرتب کئے جائیں تو جواں سال شاعروں اور نومشق ادیبوں کی صحیح رہبری ہوگی اور وہ گمراہ ہوکر شہوانی جذبات کی ترجمانی اور عریانی کو ترقی پسندی کا لوازمہ سمجھنے سے باز رہ سکیں گے ۔

ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس وجہ سے بھی نقصان پہنچ رہا ہے اور شاید آئندہ بھی پہنچے کہ اس تحریک کے

...ں علم بردار ترقی پسندی اور اشتراکیت کو لازم و ملزوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ التزام اتنا ضروری نہیں
...تا کہ ترقی پسندی اور انسانیت میں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی زبوں حالی سے متاثر ہونا اور انسانی حقوق کی
...لیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا ایک ایسی وسیع الخیالی ہے جس کے مقابلہ میں کسی خاص سیاسی عقیدے
...بلیغ کرنا ایک طرح کی تنگ نظری کا ثبوت دینا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ترقی پسند ادیب اور شاعر اشتراکیت
...علم برداری کی بجائے اگر انسانیت کی علم برداری کا دعویٰ کریں تو محض ایک اصطلاح کی تبدیلی سے ان کے
...ت سے عیب ہنر نظر آنے لگیں گے اور ان کے بہت سے مخالف ان کے ہم نوا بن جائیں گے۔

ایک اور بات جس کی طرف ہماری اس کانفرنس کو خاص طور پر توجہ کرنی چاہئے اور جس کی وجہ سے بہت سی
...ط فہمیوں کا ازالہ ہوسکے گا، یہ ہے کہ ترقی پسند ادب کو افراط و تفریط سے بچایا جائے۔ اعتدال ہر
...بیابی کا لازمی ذریعہ ہے اور یہ خوبی اس وقت تک پیدا نہ ہوگی جب تک کہ ہم اپنی ہر کاوش پر سنجیدگی
...ٹھنڈے دل سے غور نہ کریں۔ بڑا اندیشہ ہے کہ کہیں ترقی پسندی اور جوش و جذبات کی ہنگامہ آرائی
...رادف نہ بن جائیں۔ لیکن یقین ہے کہ یہ اندیشہ دیرپا ثابت نہ ہوگا کیونکہ جیسے جیسے ترقی پسند ادیب اور
...اعر پختہ مشق اور سلیم الطبع ہوتے جائیں گے، ہمارا ادب بھی نکھرتا جائے گا۔ سلامتیٔ طبع اور خوش ذوقی بغیر اعتدال
...ممکن نہیں۔ اس لئے جب تک ترقی پسند تحریک کا ہر دلدادہ افراط و تفریط سے بچنے کی کوشش نہ کرے گا، وہ
...س تحریک کے لئے مضرت رساں ثابت ہوتا رہے گا اور اس کے ذاتی اعمال و اقوال دوسروں کو اس مفید
...حریک سے بدظن کرانے کا باعث بنتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ حیدرآباد میں ترقی پسند مشاہیر کا یہ اجتماع اردو دنیا کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور
...رنے میں کامیاب ثابت ہوگا اور ترقی پسند ادب کی تاریخ میں یہ کانفرنس ایک نئے اور شاندار دور کی بنیاد
...کھے گی اور اس توقع کے ساتھ میں آج آپ سب دوستوں کا دلی خلوص کے ساتھ استقبال کرتا ہوں اور
...یدرآباد کی انجمن ترقی پسند مصنفین اور اس کے سرگرم کارکنوں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان کے مساعی
...خوش گوار نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور یوم حالی کے بعد اس شاندار اجتماع کے انتظامات میں انھوں نے
...س سرگرمی اور جانکاہی سے حصہ لیا وہ اس کی متقاضی ہے کہ اگر آپ کو اجلاس حیدرآباد میں کسی قسم کی زحمت
...ناگواری محسوس ہو تو یقیناً درگزر فرمادیں گے۔

سید محی الدین قادری زور

سرگزشت حاتم ۔ دہلی کے پہلے اردو شاعر اور استاد الشعرا، شاہ ظہور الدین حاتم کے حالات زندگی اور اردو فارسی
...لام پر تبصرہ جس کو ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت ہی تحقیق و تلاش کے بعد عالمانہ انداز میں
...بند فرمایا ہے۔ اس چھوٹی سی کتاب کے ذریعے سے اردو کے ایک بڑے شاعر اور استاد الاساتذہ کی شخصیت اور کردار
...ے ایسے پہلو روشنی میں آجاتے ہیں جو ہر زمانے میں معیاری سمجھے جائیں گے۔ ان کی زندگی کے حالات پر نظر ڈالی
...ے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا حال اور قال ایک ہی تھا۔ ان کی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی تکلف اور
...صنع سے پاک تھی۔ تشنہ گان ادب اور محققین کے لئے یہ نادر تحفہ ہے۔ صفحات ۱۲۸۔ طباعت و کتابت دیدہ زیب۔ قیمت

اُردو حروف اور رسم الخط

۱۔ اردو میں حسب ذیل حروف تہجی ہیں جن میں سے اکثر حروف عربی سے لئے گئے ہیں۔

ا ب پ ت ٹ ث ج چ ح خ د ڈ ذ ر ڑ ز ژ س ش ص ض ط ظ ع غ ف ق ک گ ل م ن و ہ ی ے۔

بعض وہ آوازیں جو عام طور پر ہندی میں مستعمل ہیں مثلاً بھ پھ تھ ٹھ جھ چھ دھ ڈھ رھ ڑھ کھ گھ لھ وغیرہ ان سے بننے والے لفظ اکثر اردو میں بولے اور لکھے جاتے ہیں۔ ان کی آوازوں کے لئے اردو میں نئے حروف نہیں بنائے گئے بلکہ متعلقہ حروف میں ہائے دوچشمی (مخلوط) شامل کرکے ایک ہی آواز فرض کرلیا گیا ہے۔ ہندی حروف کو چھوڑ کر باقی حرفوں کے نام ہیں۔ حروف کے ناموں کے آغاز کی آواز "اس حرف کی آواز" قرار دی گئی ہے جس سے ہم یہ تعبیر کرسکتے ہیں کہ سالم اکیلے حرف کا نام پکارا جاتا ہے اور حرف کی وہ صورت جو تحریر میں اتصال کی غرض سے فرض کرلی گئی ہے وہ ملفظ کہلاتا ہے۔

۲۔ اِس کا رسم الخط متصل ہے اس لئے الفاظ میں حروف اپنی سالم شکل میں نہیں لکھے جاتے۔ اس میں خاص قاعدہ نظر آتا ہے۔ مستثنیات بھی موجود ہیں اور ان میں بھی ایک اصول کارفرما ملتا ہے۔

اکثر حرفوں کے دو حصے مانے گئے ہیں۔ جزو اول اور جزو دوم مثلاً ج = (۱) جـ + (۲) ے اور س = ۳ + ں اور ک = کـ + ـ وغیرہ پہلی علامت جزو اول اور دوسری جزو دوم ہے۔

۳۔ حروف تہجی میں سے ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و یہ نو حروف منفصل ہیں۔ اس لئے کہ یہ حروف جہاں کہیں واقع ہوتے ہیں، آگے کے حرف سے ملائے نہیں جاتے، خواہ وہ ایک ہی لفظ کے درمیان ہی کیوں نہ واقع ہوں۔ مثلاً تقابل، جذبات، دروازہ، بارش، مغرب، مشرق وغیرہ میں۔ اور باقی حروف ہیں۔ ان منفصل حروف کے شامل رہنے کے باوجود اس خط کو منصل خط کہتے ہیں۔

۴۔ کل حرفوں میں سے یہ چار حروف " الف، ط، ظ، و " ایسے حروف ہیں جو کسی صورت اور کسی حال اپنی شکل نہیں بدلتے اور باقی سب حروف تحریر میں اپنی شکل کچھ نہ کچھ بدلتے ہیں اور جس طرح اوپر بیان کیا گیا ہے حرف جزو اول رہ جاتا ہے۔

۵۔ اختتام لفظ پر جو حرف واقع ہوتا ہے وہ سالم آتا ہے اور اس کے علاوہ ہر جگہ جزو اول۔ بجز منفصل اور منتقل (دفعہ ۴ کے حروف) حروف کے چونکہ ان میں جزو بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

۶۔ ب، پ، ت، ٹ، ث، ن، ی، ے ان کا جزو اول تین شکلوں میں ہوتا ہے مثلاً ۱۔ ﻟ، ۲۔ ﯨ، ۳۔ ں، جو لفظوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان حرفوں کی اس وقت پہلی شکل بنتی ہے جب کہ یہ لفظ کے پہلے حروف ہوں اور ان کے بعد س ش ص ض، ط ظ ع غ ف ق میں واؤ سے کوئی حرف واقع ہوتا ہے۔ مثلاً بسم اللہ، پشتہ، بصرہ، بضاعت، بطخ، نظر، تعرض، بغاوت، تفصیل، تقابل، توبہ وغیرہ میں۔

الف۔ جب کوئی لفظ یائے مجہول پر ختم ہوتا ہے اور اس کے پہلے ب، پ، ت الخ میں سے کوئی حرف واقع ہو اور اس سے پیشتر کوئی منفصل حرف واقع ہو تو ان حرفوں کی یہی " ﻟ " شکل آئے گی۔ مثلاً کھٹنے، کماتے، ڈرتے، ٹماٹے، کھوٹے وغیرہ میں۔ مگر " ی " اس قاعدے سے الگ ہے۔

ب۔ دوسری شکل کا محل یہ ہے کہ ب پ ث الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا [illegible] کے بعد

ج چ ح خ م ہ میں سے کوئی حرف ہو مثلاً: بجلی، بچھوا، بچھو، تحفظ، تخیل، ثمر، تم، تماشا، بہت، پہلا وغیرہ

ج: تیسری شکل یہ ہے کہ ان حروف یعنی ب، پ، ت الخ میں سے کوئی حرف لفظ کا سر حرف ہو اور اس کے بعد الف، ب، پ، ت ٹ ث، د ڈ ذ ر ڑ ز ژ ک گ ل ن ی ے میں سے کوئی حرف واقع ہو۔ جیسے :- بت تدبیر، تیر، ٹکرانے، بگھی، بلہاری، بندوق، تیتر وغیرہ اور ب پ ت الخ جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو اس وقت بھی ان کی یہی (ہ) تیسری صورت رہتی ہے۔

۷۔ اگر لفظ کے درمیان منفصل حرف واقع ہو جائے تو لفظ کے بقیہ حصے کا آغاز بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح لفظ کا کیا جاتا ہے۔ جیسے "بشور شور" میں واؤ منفصل ہے اس لئے اس کے بعد "ے" کی شکل پہلی رہے گی جیسے آغاز لفظ کے وقت ہوتی ہے۔ کیونکہ "ے" کے بعد "ش" واقع ہوا ہے۔ "آبجوش" کے لفظ میں پہلا حرف منفصل ہے۔ اس لئے ۔ دوسرے حرف "ب" کی شکل دوسری شکل ہے۔ اور "کابک" میں "ب" کی شکل تیسری ہے۔

۸۔ ان کے سوا باقی جتنے حروف ہیں لفظ کی ابتدا یا لفظ کے درمیان میں جہاں بھی واقع ہوں ان کا جزو اول ہی نظر آئے گا۔

۹۔ منفصل حروف میں سے "د ڈ ذ ر ڑ ز ژ" ایسے حروف ہیں کہ جن کے ماقبل کے حرف متصل ان سے آملیں تو ان کی شکلیں د ڈ ذ کے بجائے ر ڑ ز اور ر ڑ ز ژ کے بجائے ر ڑ ز ژ ہو جاتی ہیں۔

۱۰۔ ع غ کا جزو اول کبھی "ع" ہوتا ہے اور کبھی "ـعـ" کی علامت۔ ان حروف میں پہلی شکل کا محل یہ ہے کہ یہ حروف لفظ کی ابتدا میں واقع ہوں یا منفصل حروف کے بعد واقع ہوں جیسے عادت، عرفان اور مراعات وغیرہ میں یا غضب، غرور اور چراغاں، مرغابی وغیرہ میں اور دوسری شکل اس وقت لکھی جاتی ہے جب اس کا ماقبل کوئی متصل حرف اس سے آملتا ہے۔ معبود، بدیع، شمع اور مغرور، تیغ، ارمغان وغیرہ میں۔

۱۱۔ "ہ" کی مختلف شکلیں نظر آتی ہیں ایک وہ شکل جو ب پ ت ٹ ث ف ق ع غ ص ض ط ظ س ش ک گ ل م کے بعد واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے جیسے :- بہار، پہاڑ، تہمد، ٹہلنا، سہنا، شہر، وغیرہ میں۔ دوسری وہ جو لفظ کا پہلا حرف ہ ہو اور اسی کے بعد کوئی متصل حرف واقع ہو جیسے ہشت، ہم وغیرہ میں اور حرف واؤ کے ماقبل واقع ہو تو اس کی شکل یہ بنتی ہے۔ جیسے ہوش، ہوا وغیرہ میں اور اس کی وہ شکل جب کہ یہ کسی منفصل حرف یا ل ک گ سے پہلے واقع ہو جیسے :- ہد ہد، ہرن، ہاتھ، ہل، گاہک وغیرہ میں (واؤ مستثنیٰ) وہ شکل جب یہ منفصل حرف کے بعد واقع ہو جیسے :- پردہ، دروازہ، قہوہ وغیرہ میں۔ ایک وہ شکل جب کہ یہ لفظ کا آخری حرف ہو اور ماقبل اس کا کوئی متصل حرف اس سے ملا ہو جیسے نوشتہ یا نقشہ وغیرہ میں اور ایک وہ شکل جس کو ہائے دو چشمی (مخلوط) کہتے ہیں جیسے :- جھرنا، گھر، آدھا، بوڑھا وغیرہ میں۔

۱۲۔ جہاں تک ہمیں علم ہے کسی اور زبان کے رسم خط میں اتنے قاعدے، اتنے ضابطے نظر نہیں آتے۔ [illegible] رسم خط میں پیچیدہ ہوں۔ اسی وجہ سے دوسری زبانیں جاننے والے نسبتاً اردو خط کو مشکل تصور کرتے ہیں۔ اگر [illegible] اصلاح [illegible] تو اس وقت مفید ہو سکے گی جب اصولوں میں زیادتی کرنے کے [illegible] اور اس کی بنیادی خصوصیت اتصال میں فرق نہ آنے پائے۔ اکثر

مصلحین نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ اس موضوع پر رسالے ہیں۔ مقالے ہیں، مضامین ہیں اور سب کا خیال ہے کہ موجودہ رسم الخط میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ مگر سب کا مطمح نظر غالباً ایک نہیں ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کی جتنی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں ان کا نظر غائر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس خصوص میں جن مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہ کسی نہ کسی صورت میں بدستور موجود ہیں اور کچھ قاعدوں کے اضافے کے ساتھ مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کی اصلاح رسم الخط کی کمیٹی نے اس طرف قدم اٹھایا ہے مگر وہی بات پھر پیدا ہوتی گئی ہے جو پہلے بھی موجود تھی۔ یہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو کوشش ناگپور کانفرنس میں سرخرو ہوئی۔ لیکن حال ہی میں حیدرآباد دکن میں آل انڈیا اردو کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ اس میں کمیٹی کی طرف سے کوئی تحریک اس بارے میں پیش نہیں ہوئی۔

۱۴۔ سب سے پہلے ہم ان تجاویز پر غور کریں گے جو ناگپور کانفرنس میں (شاید ا "چالیس ابرین" رسم الخط کے اجلاس میں پاس ہوئیں۔ جس کا تذکرہ اخبار "ہماری زبان" میں اور رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۴۲ء جلد نمبر ۱۱ میں "اصلاح رسم الخط" کے عنوان کے تحت مضمون کی شکل میں موجود ہے۔

دفعہ ۱۔ میں تحریر ہے کہ "لفظ مرکب کے دو لفظوں کے درمیان واضح فصل چھوڑا جائے"۔ مرکبات کے ہر دو لفظوں میں واضح فصل چھوڑا جائے تو ضروری ہوا کہ ہر دو مفرد لفظوں کے درمیان واضح تر فصل ہو۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس امر کا پتہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لکھا ہوا لفظ مرکب کا جزو ہے یا جداگانہ ایک جداگانہ مفرد لفظ۔ "گل کاری" لکھا جائے تو گل کو اس کے ماقبل سے متعلق یا کاری کو اس کے مابعد سے متعلق سمجھنے میں کیا امر مانع رہے گا؟ اس لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جیلے کے ہر لفظ میں اتنا فاصلہ رکھا جائے جس سے ظاہر ہو سکے کہ مرکب کے اجزا کون کونسے ہیں اور مفرد کون کونسے؟ اس سے تحریر کی سہولت معدوم، کاغذ کے خرچ کا لحاظ مفقود؟ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ مرکبات کے اجزا کے درمیان یا اوپر یا نیچے کوئی مختصر سی علامت وضع کی جاتی۔ یہ ہر طرح کی سہولت کا باعث ہوتا۔

اس سلسلے میں جناب ہاشمی صاحب کی "ضروری تاکید" میں صاحب موصوف نے بیان فرمایا ہے کہ "ہمارے یہاں لفظ کے ختم ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے"۔ ہم اس بات کو ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ ہماری تحریر پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جب لفظ کا وہ حصہ جہاں سالم حرف کا وجود ہو اور اس کے بعد فصل واقع ہو تو اختتام لفظ ہے۔ یہ صورت منفصل حرف کے واقع ہونے سے بھی پیدا ہوتی ہے مگر وہ تلفظ کے احاطے میں مقید ہے۔ لہٰذا فصل کہلایا نہیں جا سکتا۔

دفعہ ۲۔ ہمزہ کسی منفصل حرف کے بعد آئے تو جداگانہ لکھا جائے اور کوئی شوشہ نہ بنایا جائے مثلاً آ ء ی، نا ء ی بجائے آئی اور نائی کے۔

اگر کوئی لفظ جس کے تمام حروف متصل واقع ہوں اور ان کے درمیان ہمزہ ہو تو کیا عمل کیا جائے؟ مثلاً "کئی، نئی" وغیرہ میں۔ اگر یہ بدستور رہیں تو ہمزہ کے لکھنے کے دو قاعدے ہوتے ہیں۔ بصورت دیگر ک ء ی اور ن ء ی لکھنا ضروری ہوگا۔ جیسا کہ دفعہ ۲ کا منشا ہے۔

دفعہ ۳۔ میں تحریر ہے کہ "دھ، ڑھ وغیرہ میں ہائے مخلوط کو اصل حرف سے ملا کر لکھا جائے یعنی دھ، ڑھ اور اصل کی شکل انھیں بھی حرف منفصل قرار دیا جائے اور دوچشمی ھ کو لفظ کے دوسرے ٹکڑوں سے ملانے کے بجائے حسب ذیل طریق پر لکھا جائے مثلاً دھن کے بجائے دُھ ن، دھرتی کے بجائے دھ رتی اور پڑھنا کے بجائے پڑھ نا" یہاں ایک خرابی تو یہ پیدا ہوتی ہے کہ د، ر وغیرہ جو منفصل ہیں ایک جگہ منفصل اور ہائے مخلوط کے ساتھ متصل، اور ھ مخلوط جو ایک جگہ متصل ہے، کہیں دوسری جگہ منفصل۔ اس طرح پھر دو قاعدے بن گئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نئی تجویز کے موافق حرف ھ مخلوط اپنے اصلی حرف کے ساتھ مل جاتا ہے تو مخلوط حرف کو منفصل ہونا چاہئے۔ تو "پھر، گھر، گھوڑا، گھبرانا، پن گھٹ وغیرہ پر بھی اس قاعدے کو منطبق ہو جانا چاہئے۔ اور انھیں" پھ ر، گھ ر، گھ وڑا، گھ برانا، پن گھ ٹ وغیرہ لکھا جانا چاہئے جس کی وضاحت دفعہ میں نہیں کی گئی ہے، اس طرح ہائے مخلوط کے لئے بھی دو قاعدے ہو گئے ہیں۔

دفعہ ۴۔ میں بھی، جو حروف ایک جگہ متصل نظر آتے ہیں وہی دوسری جگہ منفصل ہیں۔

دفعہ ۵۔ یہ تجویز جن مشکلات کی خاطر وجود میں لائی گئی ہے اس کا حل حروف شمسی اور قمری کے سمجھنے میں موجود ہے۔ لہٰذا تحریر میں بے ضرورت ایک علامت کا اضافہ کسی اعتبار سے بھی کیوں نہ ہو درد سری کے سوا کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

دفعہ ۸۔ تحریر ہے کہ "صرف ابتدائی تعلیم کی حد تک علامات مصدر وغیرہ کو اصلی مادے سے دور لکھا جائے۔ لکھ نا، پڑھ نا وغیرہ۔ اسی دفعہ کی ضمن ب میں ہے کہ ابتدائی کتابوں میں ہر لفظ کے ایک ایک رکن کو جدا کرکے لکھا جائے مثلاً مصیبت کے بجائے مصی بت، قرینہ کے بجائے قری نہ وغیرہ"

اس تجویز سے ہمیں قطعی اختلاف ہے۔ ابتدائی نقوش جو دماغ میں گھر کر جاتے ہیں وہ بعد کو مٹ نہیں سکتے۔ پھر اس پر دوسرا نقش؟ مسودے مشکوک ہونے کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ ماہران فن تعلیم نے ابتدائی تعلیم کے وقت احتیاط برتنے پر اصرار کیا ہے، کیونکہ بعد کو اس کی صحت محال ہو جاتی ہے۔

دفعہ ۹۔ "ی کو الف اور واؤ کی طرح منفصل قرار دیا جائے۔ یہ اہم تجویز ہے" مگر کیوں؟ کونسی رکاوٹ پیدا ہوئی؟ کس قاعدے سے؟ کوئی قاعدہ پرانا ہے کہ کسی نئے قاعدے کے تحت؟

ہمارے حروف عربی سے لئے گئے ہیں اور جس وقت انھیں اردو کے لئے لیا گیا بجنسہ لیا گیا چنانچہ حرف "ی" کے لئے ہی کیوں ایسا فرض کیا جائے؟ اس کی معروف و مجہول اور ماقبل مفتوح صورتوں میں کوئی علامت کیوں نہ لگائی جائے؟ کیوں بلا وجہ خلاف قاعدہ اس کو منفصل قرار دیا جائے؟

دفعہ ۱۰۔ یہ اہم قرارداد ہے "اس پر از سر نو رائے کے لئے اخبار "ہماری زبان" میں اس کو شائع کیا جائے، کیونکہ اس قسم کی اصلاح ضرور ہوتی جاتی ہے۔ تجویز یہ ہے" عربی کے ہم آواز حروف جن کی تین اور چار شکلیں آتی ہیں ان کو اردو تحریر میں گھٹا کر صرف دو شکلوں پر اکتفا کرنا جائز قرار دیا جائے۔ یعنی ث، س، جن میں سے ص کو ذ، ز، ض، ظ میں سے ض، ز کو حذف کر دیا جائے یا جو لوگ ان کے بجائے س اور ذ اور ظ سے کام لیں ان پر حرف گیری نہ کی جائے۔ ایسے حروف کی باقی قسمیں یعنی ا، ع، ت، ط، ح، ہ، بدستور رہیں گی"۔ (ع، ا، ق کے متعلق کچھ ارشاد نہیں ہوا۔ کیوں؟) "اس دفعہ پر ناظرین اخبار اور اہل رائے حضرات کی رائے کی

درخواست کی گئی ہے"

ان تمام جدید تجاویز کا نہ سہی اس دفعہ ۱۰ کا تذکرہ آل انڈیا اردو کانگریس منعقدۂ حیدرآباد دکن میں آیا تھا۔ لیکن انجمن ترقی اردو یا اس کی رسم الخط والی کمیٹی یا مجوز صاحب کی طرف سے نہیں۔ افسوس کہ تحریک مسترد ہوگئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اہل الرائے نے اس تجویز کو پسند نہ فرمایا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس تجویز کی ضرورت اصلاحِ رسم الخط کے ساتھ ساتھ کیوں درپیش ہوئی ہے۔

"ہم آواز حروف" کے عنوان سے علحدہ مضمون کی شکل میں دفعہ ۱۰ کی ترویج سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ناگپور کانفرنس کی منظورہ تجاویز پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام تجاویز جا بجا تشنہ ہیں۔ اس لئے مزید پیچیدگیاں پیدا کرتی ہیں۔ ہر تجویز کے ساتھ کم از کم اور دو دو قاعدوں کا اضافہ ہوتا گیا ہے۔

اگر ٹائپ کی سہولت کے لئے یہ خط کارآمد نہیں ہوسکتا تو کسی نئے حروف کی ایجاد کی جاسکتی ہے۔ دستی تحریر کے لئے بھی اور طباعت کے لئے بھی۔ یا ٹائپ میں دیوناگری خط استعمال کیا جائے اور دستی تحریر کے لئے موجودہ اردو خط یا پھر اسی خط کو کھلم کھلا منفصل قرار دیا جائے جس سے یہ مشکلات یک قلم رفع ہوں۔ اور پوری تحریر بغیر اتصال کے رائج کی جائے۔

دامودر ذکی ٹھاکور

اطلاع

جن خریدار اصحاب کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہے وہ براہِ کرم اپنا چندہ دفتر سب رس پر روانہ فرمادیں یا "سب رس" تقسیم کرنے والے سے باضابطہ مطبوعہ رسید لے کر چندہ عنایت فرمائیں۔ ورنہ دفتر پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔

اضلاع کے خریدار اصحاب اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماکر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ یا دفتر ہذا کو رسالہ وی پی کرنے کا آرڈر روانہ کریں۔ اگر رسالہ وی پی کے ذریعہ آئے تو براہِ کرم اندرون مدت اسے چھڑا لیا جائے ورنہ وی پی ہونے کی صورت میں دفتر کو اخراجات ڈبیہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔

رسالہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی ۲۵ تاریخ تک روانہ فرمائیں ورنہ تعمیل ارشاد نہ ہوسکے گی۔ مہتمم

جو آگ لگائی تھی میں نے ...... "ایک لڑکی" کے نام

وہ لپٹی لپٹائی ایک گٹھڑی سی بنی بیٹھی تھی۔ جبکہ میں کمرے میں داخل ہوا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ چونک پڑی جیسے ستار کے تاروں کو کوئی یک دم چھیڑ دے۔ میں اس کی اس معصومانہ حرکت پر دل ہی دل میں مسکراتا اس کی طرف بڑھا۔ وہ سکڑ گئی۔ میں قریب بڑھتا رہا اور وہ مجھ سے دور ہٹتی رہی۔ 'قرب و بعد' کا یہ کھیل بھی بعض اوقات کتنا دلچسپ ہو جاتا ہے۔ وہ کیوں ہٹ رہی تھی۔ میں سوچنے لگا۔ میں کوئی درندہ تو ہوں نہیں جو اسے کھا جاؤں گا۔ یہ ہندوستانی لڑکیاں بھی کس قماش کی ہوتی ہیں۔ وہ 'ہرنوں' کی طرح مردوں کے سائے سے کیوں بدکتی ہیں —— شاید ان کی بھی فطرت میں 'رمیدگی' ہے۔ یہ 'رمیدگی' 'حسن و مسرت' سے کیوں وابستہ کر دی گئی۔ آخر نہ حسن کو 'دوام' ہے نہ 'مسرت' کو قیام —— یہ دونوں بھی 'ہرنوں' کی طرح 'رم' کر جاتے ہیں —— لیکن وہ مجھ سے کیوں گریزاں ہے —— مجھ سے اجنبی بھی تو نہیں وہ' میری 'عم زاد' ساتھ کی کھیلی ساتھ کی پلی —— پھر یہ 'تکلف' اور اجنبیت کیوں۔ "سنئے تو میں کوئی غیر نہیں" میں نے کہا' اور دھیرے سے گھونگھٹ الٹ دیا —— جھکی جھکی آنکھیں میری طرف اٹھیں —— سانولا سلونا رنگ —— پتلے پتلے ہونٹ —— چہرے پر غضب کی معصومیت۔ آنکھوں میں ڈر اور حیرت نے کچھ عجیب سی سہمی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی —— شاعر 'پہلی نظر' کی قسم قسم سے تاویل کرتے ہیں کوئی 'بجلی کی چمک' کہتا ہے تو کوئی 'تیر نیم کش' لیکن مجھے یہ دونوں تشبیہیں غیر حقیقی معلوم ہوتی ہیں —— مجھے تو ایسے معلوم ہوا نسیم سحر کا ہلکا سا جھونکا مجھ پر جھرجھری کی کیفیت طاری کرتا ہوا گزر گیا۔ "آخر آپ مجھ سے ڈرتی کیوں ہیں —— کچھ باتیں کیجئے —— اب تو ہمیں زندگی کی ناؤ مل کر کھینا پڑے گی —— یہ ڈر —— اس اجنبیت سے کیسے کام بنے گا" میں شاعرانہ انداز میں کہنے لگا —— مجھے معلوم ہو سکا عورتیں پُر تکلف گفتگو سے بہت مرعوب ہوتی ہیں۔ وہ خاموش ہی رہی میں نے سلسلۂ بیان جاری رکھا۔ "عورت مرد کی رفیق ہوتی ہے۔ قدرت نے اسے مرد کی دل بہلائی کے لئے پیدا کیا' دیکھئے نا آدم جنت جیسی جگہ سے بھی بیزار ہو گئے —— آخر خداوند تعالیٰ کو ایک عورت پیدا کرنا پڑی" —— میں باتیں کرتے کرتے تھک سا گیا۔ انسان بالخصوص مرد اپنے مشغلوں سے کس قدر جلد تھک جاتا ہے —— شاید قدرت نے انسان کے خمیر میں سیمابی تڑپ رکھی ہے —— شعلہ کی سی بے قراری —— وہ میری باتیں سن کر کبھی کبھی مسکرا دیتی۔ اس طرح ہماری شب عروسی بسر ہوئی —— رفتہ رفتہ اس کا حجاب دور ہوتا گیا لیکن تکلف نہ گیا —— عورت کا ظرف کتنا وسیع ہے —— وہ کتنی بردبار ہوتی ہے —— یہ مجھے نزہت سے مل کر معلوم ہوا —— اگر صبح سورج نکلنے اور دن ڈوبنے کا نام زندگی ہے تو ہماری زندگی گزرتی گئی —— وہ میری غیر موجودگی میں بلبل کی طرح چہکتی لیکن میرے سامنے سدھ بدھ کھو دیتی —— اسے شعر و ادب کا کتنا اچھا ذوق تھا —— میں اچھے اچھے افسانوں کی کتابیں لا کر دیتا اور اس کی رائے کا بے چینی سے منتظر رہتا لیکن وہ میرے سامنے کچھ نہ بولتی —— رکے ہوئے پانی میں تعفن پیدا ہو جاتا ہے —— اسی طرح ہماری زندگی بھی خشک ہو گئی —— اس 'جمود' سے میں عاجز آ چکا تھا —— میں زندگی میں حرکت و حیات کا قائل تھا وہ ایک برف کا تودہ بن گئی —— میں نے 'نیاز' چھوڑ کر ناز کرنا شروع کیا —— وہ اس خاموشی میرے سب کا جواب تھی —— بے اعتنائی اس امید پر کی تھی کہ 'قابل اعتنا' سمجھا جاؤں گا —— لیکن عورت کی فطرت کا کون اندازہ لگا سکا ہے .... اور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو کون پا سکا ہے؟ مجھے یک گونہ بے خودی کی تلاش تھی —— وہ مجھے نہ ملی —— میں نے اپنے دوستوں سے اپنی زندگی کی بے کیفی کا شکوہ کیا —— جمیل کہنے لگا ——

"گھر میں کیف تلاش کرتے ہو؟ !! ——— بیوی کے پاس مسرت ڈھونڈھتے ہو! گھر کی پالتو مرغی کا کوئی شکار نہیں کرتا دوست !! آسمان کی وسعتوں میں تیر چلاؤ۔ لطف آجائے گا۔" اختر کہنے لگا۔
"زندگی، زندگی ہمیں مسرت نہیں دے سکتی۔ وہ بخیل سرمایہ دار کی طرح مسرت کی متاع کو جمع کرتی جاتی ہے۔ تم میں ہمت ہے عزم ہے ولولہ ہے تو اس پر دھاوا کردو۔ زندگی سے بہ جبر مسرت لے لو پھر دنیا تمہاری ہے"
حمید نے کہا "کیف" پانا چاہتے ہو تو خود کو کھونا پڑے گا۔ کسی مقصد کے حصول میں غرق ہوجاؤ ——— اور دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوجاؤ ———" لیکن میں نے اپنے ہم نشینوں کی رائے نہ سنی۔ سنا تھا "دوری محبت کو بھڑکا دیتی ہے، فراق کی آگ میں جل کر محبت کا سونا کسوٹی پہ پورا اترتا ہے۔ اصلی "محبت" "فراق" کی آگ میں جل کر اور نکھر جاتی ہے۔ جھوٹی محبت جھوٹے سونے کی طرح ماند پڑجاتی ہے۔" اور ایک اداس شام میں نے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔ "میں جا رہا ہوں نزہت زندگی صرف حسین خواب ہی نہیں ——— زمانے میں "محبت" کے سوا اور بھی غم ہیں"۔ پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملائے جیسے فلک پر ستارے میرے لبوں پر ایک فاتحانہ "تبسم" کھیلنے لگا محبت کی بازی میں میں نے اسے مات دے دی تھی۔ "جائیے! کیوں جاتے ہیں آپ" اس کے منہ سے نکلا۔

میں چل دیا تاکہ محبت کا شعلہ فراق کے تھپیڑوں سے پورا فروزاں ہوجائے۔ اور اب ——— اب میں اس سے بہت دور ہوں۔ لیکن وہ، وہ میرے کتنے قریب ہے۔ اتنے ہی جیسے ستار میں نغمہ، چاند میں ضیا، پھول میں نکہت اور تصویر میں رنگت۔ میں نے سنا ہے، اس کی وہ پہلی کی حالت نہیں رہی۔ آنکھوں میں پھیلا پھیلا کاجل، ساری کی بے سلیقگی، گویا زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ کوئی ہمیں دیکھنے والا نہیں۔
اب وہ مشہور افسانہ نگار ہے۔ میں جب اس کا تازہ افسانہ پڑھتا ہوں، ایک روحانی سرور مجھ پر طاری ہوجاتا ہے۔ وہ افسانوں میں اپنی زندگی سمو دیتی ہے۔ اس کے افسانے مرد کی "سفاکی" کی داستان سے معمور ہوتے ہیں۔ آہ اسے سینہ چیر کر میں بتا سکتا کہ میرے دل میں اس کی کتنی محبت ہے۔ ہر تازہ افسانہ مجھے دعوت دیتا ہے کہ اس کے قدموں پر اپنا سر جھکا دوں۔ کبھی مسرت کے نشے میں سرشار محبت کی کامرانی پر مسکرا پڑتا ہوں۔ کبھی اپنے کیئے کی پشیمانی پر رو پڑتا ہوں۔ کچھ آنسو اور کچھ ہنسی، اسی سے تو یہ دنیا بنی ہے۔
لیکن اب، اب میری زندگی کی صبح طلوع ہو رہی۔ محبت اپنا کام کرچکی اور انعام بھی پاچکی۔ آرٹ کی بلند عمارت خون جگر سے تعمیر ہوئی ہے اس کا فن ترقی کرچکا۔ مجھے اس کے فن سے حسد ہو رہا ہے۔ اس کا "فن" میرا رقیب ہے۔ لیکن نہیں میرے سوا کوئی دوسرا اس کی زندگی میں داخل نہیں ہوسکتا ——— میں جاؤں گا ——— اس کے پاس ضرور جاؤں گا ———

رفیعہ سلطانہ

حیدرآباد ۔ اس کتاب میں عوام اور بچوں کے لئے شہر اور ریاست حیدرآباد کے ضروری حالات سادہ اور سلیس زبان میں درج کیئے گئے ہیں۔ اس کے کئی ابواب ہیں جن میں آب و ہوا، پہاڑ و دریا، پیداوار، تاریخ، طرز معاشرت، صنعتیں، زبانیں، طرز حکومت، آثار قدیمہ اور ذرائع حمل و نقل کو خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کی مرتبہ رفیعہ سلطانہ صاحبہ بی اے جامعہ عثمانیہ ہیں جن کو انشاپردازی کا خاص ذوق ہے۔
قیمت ۱۰/

امریکہ کی صنعتی ترقی کی ابتدا

ممالک متحدہ امریکہ میں بھی انیسویں صدی حکومتی تغیر کا ایک دور تھی۔ ۱۷۸۳ء کی صلح کے بعد تجارتی اور صنعتی معاہدات کرنے کے لئے ایک مرکزی ادارہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور ملک کی معاشی ترقی کی ضروریات اس امر کی متقاضی تھیں کہ ایک سمجھ دار اور طاقتور مرکز کی جانب سے متحدہ طور پر معاشی ترقی کے میدان میں قدم بڑھایا جائے۔ ریاستوں کی باہمی رقابت اور رنجش کی موجودگی میں یہ کام مشکل نظر آتا تھا۔ الگزینڈر ہیملٹن کی کوششوں سے معاشی مسائل کے طے کرنے کے اختیارات مرکز کے تفویض کردئے گئے۔ خانہ جنگی سے قبل امریکہ کی معاشی تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) ۱۷۸۳ء تا ۱۸۱۶ء۔ اس دور میں ریاستوں کے معاشی اتحاد، محاصل اور پبلک زمینات کے بندوبست کے مسائل زیر غور رہے۔

(۲) ۱۸۱۶ء تا ۱۸۳۳ء۔ اس دور میں بھی محاصل کا سوال تھا۔ جنوبی ریاستیں زرعی علاقہ پر مشتمل تھیں اور آزاد تجارت کی مدد سے شمال کی ریاستوں کی مصنوعات خریدنا چاہتی تھیں مگر شمالی ریاستیں محاصل بندی کا طریقہ اختیار کررہی تھیں۔ جنوبی ریاستیں ان محاصل کی ادائیگی کا یہ مطلب لیتی تھیں کہ اپنا نقصان کرکے شمال کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔

(۳) ۱۸۳۳ء تا ۱۸۶۵ء اس زمانے میں صنعت نے آبادی کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف منتقل ہونا شروع کردیا تھا۔ صنعتی ترقی کس نہج پر ہو اور غلاموں سے نئی آبادیوں میں کس حد تک کام لیا جائے۔ یہ مسائل اس دور میں درپیش تھے۔ خانہ جنگی کے بعد کا اہم مسئلہ یہ تھا کہ کیونکر یورپ کی سستی مصنوعات کا مقابلہ کیا جائے۔ یورپ میں شرح اجرت کم تھی جس کی وجہ سے مصارف پیدائش کم ہوتے تھے امریکہ کو یہ شکایت تھی کہ یورپ کی سستی محنت سے تیار کردہ اشیا کی امریکہ کی مہنگی محنت والی اشیا سے مسابقت ہو رہی ہے۔

ابتدائی دور میں امریکہ کی صنعت کی دو اہم خصوصیات ہیں۔ اول تو یہ کہ امریکہ نوآبادی علاقہ تھا اور اس میں مزدوروں کی کمی ایک قدرتی امر تھی۔ دوسرے یہ کہ زراعت ملک کا اہم پیشہ تھی۔ محنت کی کمی کی وجہ سے کارخانہ جات کی ترقی مشکل تھی اور زراعت کے معاشی زندگی پر محیط ہونے کے باعث ملک کی صنعت بھی زیادہ تر چمڑے کی دباغت، آلات زراعت کی تیاری، آٹا پیسنے کے کارخانوں اور گوشت کی پیکنگ تک محدود رہی۔

امریکہ میں صنعتی انقلاب کا آغاز نیو انگلینڈ میں ہوا کیونکہ یہاں آبادکاری بھی پہلے ہوئی تھی۔ اصل کی رسد موجود تھی اور پانی کی قوت محرکہ بھی آسانی سے دستیاب ہوسکتی تھی۔ نیو انگلینڈ کی آبادی نے اعلیٰ قسم کی ذہانت کے کاموں مثلاً پارچہ بافی کی مشینوں کی تیاری، گھڑی سازی، اسلحہ سازی، کٹلری، مشین کے پرزے، پینسل اور ٹین کے برتنوں کی تیاری میں مہارت حاصل کی۔ انگلستان کی طرح امریکہ میں بھی اصل کی فراہمی اور بازاروں کی دریافت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت ترقی کرتی گئی۔ انگلستان سے آزاد ہونے کے بعد امریکی نوآبادیات عارضی طور پر اس مرکز سے الگ ہوگئی تھیں جس سے کہ وہ مصنوعات حاصل کیا کرتی تھیں۔ مگر رفتہ رفتہ امریکہ میں بھی صنعتی ترقی ہوتی گئی۔ لوہے اور اون کی صنعتوں کو انعامات اور رقمی امداد دے کر جاری کیا گیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۱۵ء تک کے دوران میں امریکی کارخانے برابر ترقی کررہے تھے۔ مگر ۱۸۱۵ء میں صلح کے بعد انگلستان کا مال امریکہ میں تیزی سے برآمد ہونے لگا۔ امریکہ کی تمام منڈیاں انگلستان کے مال سے بھر گئیں۔ مگر انجام کار امریکہ کو اس گلوتراش مقابلے سے نجات مل گئی جس کے اسباب

حسب ذیل ہیں :-

(۱) ۱۸۱۶ء اور ۱۸۱۸ء کے تحفظی محاصل
(۲) اندرون ملک ایندھن اور خام پیدا وار کی فراوانی
(۳) محنت کی بچت کرنے والی مشینوں کی ایجاد
(۴) سرمایہ داروں کی شغلِ صنعتی کے لئے آمادگی
(۵) عالمگیر خوش حالی کی تجدید
(۶) ملکی بازار کی مسلسل توسیع

امریکہ میں انگلستان کی ایجادات نے صنعتی انقلاب کی بنیاد رکھی تھی مگر بہت جلد ان میں امریکی حالات کے مطابق اصلاح اور ترمیم کرلی گئی -

سب سے پہلے سوتی اور اونی دھاگہ بننے کے کارخانے تیار ہوئے - آگے چل کر اس دھاگے سے کپڑا تیار کرنے کے کارخانے قائم کئے گئے - ۱۸۱۴ء کے بعد جگہ جگہ کپڑا بننے کے کارخانوں کا قیام عمل میں آنے لگا - ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک کے عرصے میں کپڑے کے پچاس کارخانے (Massachusetts) میں کھل گئے تھے - یہ ترقی مسلسل جاری رہی - یہاں تک کہ ۱۸۰۵-۰۶ء میں امریکہ سے سوتی صنعت کی برآمد کی مقدار دوگنی ہوگئی اور چین، مشرقی امریکہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک کو سوتی کپڑے کی مسلسل برآمد ہونے لگی -

ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی نے ملک کی مصنوعات کے لئے نئے نئے بازار پیدا کئے - سڑکوں کی تعمیر کی بدولت داخلی تجارت آسان ہوگئی - حالانکہ اس کے قبل خارجی تجارت زیادہ آسان تصور کی جاتی تھی - اوائل انیسویں صدی سے ۱۸۱۲ء تک اور بالخصوص ۱۸۱۲-۱۴ء میں انگلستان سے جنگ کے زمانے میں غیر ملکی درآمد گھٹ گئی تھی جس کی وجہ سے اندرون ملک مصنوعات کی قیمتیں بڑھ گئیں اور لوگوں نے اپنا اصل صنعتوں میں لگانا شروع کردیا تھا - مگر جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے ۱۸۱۵ء میں انگلستان کی مصنوعات کی درآمد بہت زیادہ ہوگئی، اس سے شدید نقصان سوت، اون اور لوہے کی صنعتوں کو ہوا - سوت کی غیر ملکی طلب اتنی بڑھ گئی تھی کہ امریکی صناع اسے مناسب قیمت پر حاصل نہ کرسکتے تھے - اون کی صنعت کا یہ حال تھا کہ نیو انگلینڈ میں کارخانوں کی نصف مشنری بے کار پڑی ہوئی تھی - مگر اس مسابقت کے دوران میں بھی بہ حیثیت مجموعی امریکی صنعتیں ترقی کررہی تھیں - اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی کی رفتار بہت سست ہوگئی تھی - چنانچہ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے ۱۸۱۶ء اور ۱۸۲۴ء میں محاصل عاید کئے گئے اور ۱۸۳۳ء سے پھر بڑی تیزی سے صنعتی ترقی ہونے لگی - ۱۸۳۳ء سے ۱۸۶۱ء تک کے عرصے میں سوائے ۱۸۸۶ء اور ۱۸۵۶ء کی دقتوں کے مسلسل صنعت و حرفت ترقی کرتی رہی - باوجود خام پیداوار کی کمی کے اون کی صنعت نے بھی کافی ترقی کی - ۱۸۴۸ء میں بنائی کے لئے "Power loom" کی ایجاد سے قالین سازی نے خوب فروغ حاصل کیا - ہوزری میں مشینوں سے کام لیا جانے لگا - جہاز سازی نے خوب ترقی کی اور اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس زمانے میں امریکہ کا Tonnage دنیا بھر کا ایک تہائی تھا -

صنعتی انقلاب کے بعد دھاتوں کو صاف کرنے کے بہتر طریقے ایجاد ہوئے۔ ریلوں اور ذرائع حمل و نقل کی ترقی کی بدولت کوئلے اور لوہے کے ذخیروں کو ایک دوسرے سے ملا دیا گیا۔ لوہے کو صاف کرنے کے طریقے میں اصلاح ہوئی ۱۸۴۰ء میں لوہا صاف کرنے کے لئے چارکول کی جگہ بغیر دھوئیں کا کوئلہ (Anthracite) استعمال ہونے لگا۔ ۱۸۴۲ء میں انگریزی لوہے کی درآمد پر محصول عائد کیا گیا جس سے لوہے کی صنعت کو بڑی ترقی ہوئی۔ خانہ داری کی ضروریات اور سب سے بڑھ کر لوہے اور فولاد کی ریلوے کی پٹڑیوں کے استعمال کی بدولت آہنی مصنوعات کی طلب بہت بڑھ گئی۔ ۱۸۶۰ء تک شمال کے سب بڑے بڑے شہروں میں لوہے کے کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ خانہ جنگی کے ختم ہو جانے کے بعد (Tennessee) الباما اور جارجیا کی ریاستوں کے لوہے کے ذخیروں سے پوری طرح فائدہ اٹھایا گیا۔

امریکہ کی صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۱۱-۱۸۹۰ء کے درمیان فی سال اوسطاً ۷۷ اشیا پیٹنٹ کرائی جاتی تھیں مگر ۱۸۶۰-۱۸۵۰ء میں یہ اوسط ۲۸۰۰ سالانہ ہو گئی۔

(Automatic Machinery) خود بخود چلنے والی مشینوں کی ایجاد سے دھات کی بنی ہوئی اشیاء کی پیدایش بڑھ گئی کیونکہ اس کی مدد سے ایک ہی شکل اور ایک ہی سائز کی ہزاروں اشیاء تیار کی جاتی تھیں معیار........ (Standardisation) سے اور بھی سہولت ہوئی (Eli Whitney) نے مشین کے مختلف اجزا کی باہم منتقلی (Interchangeability) کے اصول سے امریکہ کو روشناس کرایا اور بہت جلد یہ اصول امریکی صنعت کا اہم جزو بن گیا۔ جوں جوں مغرب کی طرف آبادی بڑھی جہاں جہاں گیہوں کی کاشت کے لائق رقبے نظر آئے وہاں آٹا پیسنے کے کارخانے بھی کھل گئے اور جہاں پانی کی قوت محرکہ دستیاب نہ ہو سکی وہاں ان کو بھاپ سے چلایا گیا۔ آگے چل کر بجلی کا استعمال عام ہو گیا۔ وادی اوہیو (Ohio) کے بس جانے کے بعد گوشت بند ڈبوں میں بھیجنے کی صنعت نے بڑی ترقی کی بعد میں اس صنعت نے اپنے مراکز مغرب کی طرف Omaha اور Kanasas کو منتقل کر دئے۔ آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ عمارتی لکڑی کی طلب فرنیچر وغیرہ کے لئے بڑھ گئی۔ ترقی یافتہ مشینوں کی بدولت لکڑی سستی ہو گئی۔ جوتا سازی کی صنعت کی ترقی دیر میں ہوئی۔ گر قدیم ڈگر پر صنعت وسیع ہوتی گئی۔ ۱۸۶۰ء میں اس کے لئے نئی مشینیں ایجاد ہو گئیں۔ انیسویں صدی کے آخر میں امریکہ میں ٹرسٹ قائم ہونے لگے جس سے مسابقتی (Competitive) صنعت کو خطرہ لاحق ہوا۔ ٹرسٹوں سے صارفین اور مزدوروں کو نقصان ہو سکتا ہے۔ وہ حکومت اور سیاست کو بھی اپنی دولت سے متاثر کر سکتے ہیں مگر ان سے فائدے بھی ہیں۔ وہ مصارف پیدائش کو گھٹا دیتے ہیں، غیر ملکی بازار حاصل کر لیتے ہیں اور کاروبار کو زیادہ احتیاط اور دور اندیشی سے چلاتے ہیں۔ بہر حال ۱۹۰۵ء کے بعد ٹرسٹوں پر حکومت نے اپنی نگرانی قائم کر لی۔

آیت اللہ بیگ عارف

سب رس کے قلمی معاونین سے :-

مضامین، افسانے اور نظمیں بھیجتے وقت ایک ادبی رسالے کے معیار کا ضرور خیال رکھیں یہ ضروری نہیں کہ ہر لکھی ہوئی چیز شائع بھی ہو۔ ادارہ

قمر

(مخدوم محی الدین کے نام)

قدم قدم پہ لرزتا سا جا رہا ہے قمر — شرابیوں کو سنبھلنا سکھا رہا ہے قمر

یہ بزمِ شاہِ شبستاں یہ ماتمی سالباس — فرازِ چرخ سے آنسو بہا رہا ہے قمر

روش روش سے ہے مفہومِ زندگی پیدا — چمن کو شعرِ مکمل بنا رہا ہے قمر

کلی کلی ہے شرابی چمن چمن میکش — مئے جمال کے ساغر لنڈھا رہا ہے قمر

عجب تکلمِ خاموش ہے فضاؤں میں — کہ سن رہے ہیں ستارے سنا رہا ہے قمر

سنبھل سنبھل کے قدم اٹھ رہے ہیں کرنوں کے — یہ کس کی بزم میں تشریف لا رہا ہے قمر

بہارِ ساتویں جنت کا اک حسیں پرتو — بہار بن کے زمانے پہ چھا رہا ہے قمر

یہ کس کا تیرِ نظر اتنا خوبصورت ہے — یہ کس کے داغ کو دل میں چھپا رہا ہے قمر

ہر ایک شاخ رباعی ہر ایک پھول غزل — بساطِ شعر پہ مہرے جما رہا ہے قمر

ہنسی خوشی کا زمانہ بھی آئے گا ساقی

ابھی تو خون کے آنسو رلا رہا ہے قمر

ساقی صدیقی (جبل پور)

روسی ادب

(انقلاب تک)

[روسی ادیب اور حسن کار اپنے مخصوص زاویۂ فکر اور واقعاتی نظر کی وجہ سے دنیائے ادب میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ یہاں بارہ کلاسیکل حسن کاروں کی زندگی اور تصانیف کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے جو "Soviet union News" کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ یہ ان ادیبوں کا ذکر ہے جن پر قبل انقلاب ادبی دور ختم ہوتا ہے۔ "تالستائے کے بعد فلسفۂ معاشرت' دستہ ئفیکی کے بعد نفسیات اور روحانیات' چیخوف کے بعد تعلیم یافتہ طبقے کی عام زندگی کو ناول نگاری کا موضوع بنانا استادوں کے کلام میں اصلاح دینا تھا جو کہ انتہائی گستاخی اور بے ادبی ہوتی اور اس کا نتیجہ جگ ہنسائی کے سوا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ گورکی نے عوام کی زندگی ان کے جذبات اور احساسات کی تصویریں کھینچ کر روسی ناول کو قومی زندگی کا مکمل آئینہ بنا دیا۔ اس کے بعد یا تو زندگی بدلتی جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہوا' یا ناول لکھنا چھوڑ دیا جاتا' کوئی تیسری صورت نہ تھی۔" تو یہ ان ادیبوں کا ذکر ہے جنھوں نے ایک دور کو ختم کر دیا اور دوسرے درخشاں تر زمانے کی پیش رس کی تمنا میں ترانے گائے۔ یہاں تک کہ افق روس پر نئے سورج کی پہلی کرن پھوٹی اور سرخ سویرے سے انسانیت' ادب اور تہذیب کا دامن مالا مال ہو گیا۔]

لومونوسوف (۱۷۱۱-۶۵) آرخنگل کے قریب ایک دیہات میں پیدا ہوا۔ باپ نے اپنے پیشے میں شریک کر لیا جو مچھیرا تھا۔ (ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ خوش حال کسان تھا۔ مترجم) لیکن لومونوسوف کو تحصیل علم کا ذوق تھا' اس لئے سترہ سال کی عمر میں پا پیادہ ماسکو سدھارا اور کسی مدرسہ میں داخل ہو گیا بڑا ہی ذہین طالب علم تھا اس لیئے بعد کو سینٹ پیٹرز برگ بھیجا گیا' جہاں بیرون جات میں تکمیل علم کے لیئے دوسرے نوجوانوں کے ساتھ اس کا بھی انتخاب ہو گیا۔ تعلیمِ فلزیات کی تحصیل کے ساتھ ساتھ شعر بھی کہنے لگا۔ وطن کو مراجعت کی تو دار العلوم سینٹ پیٹرز برگ میں شعبہ کیمیا کی پروفیسری مل گئی اور کچھ ہی دنوں میں رکٹر بنا دیا گیا۔ ۱۷۶۴ء میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدہ پر فائز ہوا۔

اس کی "خطابت" "روسی زبان کی قواعد" اور مضامین بہت مشہور ہیں۔ سوویٹ یونین لومونوسوف کو "روسی زبان کی قواعد کا بانی اور عصری روسی ادبی زبان کا خالق" تصور کرتی ہے" اور "روسی عوام کے فرزند اعظم" کی حیثیت سے تعظیم دیتی ہے۔

کریلوف (۱۷۶۸-۱۸۴۴) روس کا قومی حکایت گر ہے۔ ماسکو میں ایک فوجی افسر کے گھر پیدا ہوا۔ نو سال کی عمر میں دفتری چھوکرے کی حیثیت سے کام کرنے لگا لیکن بعد میں سنیٹ پیٹرز برگ (لینن گراد) کے کسی دفتر میں ایک اسامی مل گئی۔ ۱۸۰۵ء میں لافونتین کی حکایتوں کا ترجمہ کیا۔ ۱۸۰۸ء میں سترہ حکایتیں شایع کروائیں جن میں بہتیری اچھی تھیں۔ ۱۸۰۹ء میں اس کی "حکایات" کا پہلا اڈیشن شایع ہوا جس میں خاص طور پر تعلیم یافتہ طبقے کی اس اندھی تقلید پر طنزیات ہیں جو فرانس کی ریس میں کی جاتی تھی۔ روسی، حکایت ڈولیل کے بڑے شیدائی ہوتے ہیں' اس لئے کریلوف بہت زیادہ محبوب اور ہر دل عزیز رہا۔ اس کی بیشتر حکایتیں کسانوں کی روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہیں اور سیدھے سادے قصوں میں کاہلی' حرص و آز اور روزمرہ زندگی کی لاپروائیوں پر طنز و تضحیک کی گئی ہے۔

لرمنتوف (۱۸۱۴-۴۱) شاعر اور ناول نگار تھا۔ اکثر "شاعر قفقاز" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ماسکو کے ایک اسکاچ نسل کے گھرانے میں پیدائش ہوئی۔ ماسکو کے جمنازیم سے دار العلوم میں داخل ہوا لیکن کسی عدول حکمی کے سلسلے میں تعلیم منقطع ہو گئی۔ اس نے کیڈٹوں کی درسگاہ میں شرکت حاصل کی اور کوئی عہدہ مل گیا۔ پشکن کی وفات پر زار کو مخاطب کر کے ایک ولولہ انگیز نظم "شاعر کی موت پر" لکھی جس کی بنا پر گرفتاری عمل میں آئی۔ کورٹ مارشل ہوا اور فوج سے علیحدہ کر کے قفقاز بھیج دیا گیا۔ یہ جلا وطنی صرف ایک سال جاری رہی۔ وطن لوٹا تو اپنی مشہور تصنیف "ہمارے زمانے کا ایک جوان مرد" لکھی (جس میں خود اپنی شخصیت کو پیش کیا ہے۔ شاعرانہ بانکپن اور آوارگی کا نقطۂ کمال میں عمل مل گیا تھا، اور اس نے اپنی اس دہری شخصیت کو ہمارے زمانے کا ایک جوان مرد ہیرو "پچورن" میں نکھار دیا ہے۔ وہ ہر لڑکی پر ڈورے ڈالتا ہے اور جب وہ گھائل ہو جاتی ہے تو نظریں پھیر لیتا ہے اس لئے کہ گھائل کرنا ہی اس کی فطرت ہے۔) مترجم

۱۸۴۱ء میں پیاٹگارسک کے قریب ڈوئیل لڑنے میں مارا گیا۔ اس کی مشہور نظمیں یہ ہیں۔

"اسماعیل بے" "ہاجی ابرک" "توامو زاور والگرک" وغیرہ۔ "زار ایوان ویسلی وچ اور بہادر سوداگر کالاشن کوف کا گیت" اس حیثیت سے مابہ الامتیاز ہے کہ قدیم روسی بے لڈ (Ballad) کے انداز میں کامیاب کوشش ہے۔

سوویت یونین کے اعداد شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ لرمنتوف کی تصانیف ان دنوں ہزاروں کی تعداد میں سالانہ شایع ہوتی ہیں اور اس کا شمار سوویت یونین کے محبوب شعرا میں ہے۔

پشکن (۱۷۹۹-۱۸۳۷) کو بحیثیت شاعر روسی ادب میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ بائرس کے ایک قدیم خاندان میں بہ مقام ماسکو پیدا ہوا۔ بچپن میں سینٹ پیٹرزبرگ کے قریب ایک مکتب میں شریک کر دیا گیا۔ ۱۸۱۷ء میں مکتب چھوٹا تو محکمۂ وزارت خارجہ سے وابستہ ہو گیا اور اسی سال "رسلان لیودمیلا" لکھنی شروع کی۔ ایسے میں وہ خوش باشوں کی محفل میں کچھ ایسا گھل مل گیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ شاعر کی بجائے ایک فیشن زدہ ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اسی زمانے میں "آزادی کا گیت" گودنر کی نظروں میں پڑا جس کے رد عمل کے طور پر جنوبی روس میں شہر بدر کر دیا گیا۔ اسی جلا وطنی کے دوران میں وہ بائرن کی تصانیف سے متعارف ہوا جو کچھ عرصے کے لیئے اس کی طبع شاعرانہ کی تحریک کا باعث ہوئی۔ یہ امر نہایت ہی تعجب انگیز ہے کہ زندگی نے اس سے کچھ زیادہ دن نباہ نہ کی اور حالات بھی بیحد ناساز گار رہے (مضمون نگار کا مطلب شاید اس احتساب سے ہے جو نہ صرف حکومت نے عائد کر رکھا تھا بلکہ خود زار نے اسے اپنے دربار میں جگہ دے کر پابند کر دیا تھا۔ ساتھ ہی یہ نشاط انگیز صحبت تخلیقی کام کے لیئے سنگ راہ ثابت ہوئی۔ مترجم) لیکن اس مختصر اور ناساز گار دور میں روسیوں کا قومی شاعر بن گیا۔ وہ وسیع القلب، آزاد خیال اور غیر معمولی طور پر مہذب و شائستہ تھا۔ ایک طرف تو وہ انتہائی روسی تھا اور دوسری طرف یکا یورپین۔

اس نے اپنا تاریخی ڈراما "بورس گودونوف" شیکسپیر کے زیر اثر لکھا، بعض ابتدائی نظموں میں بائرن کا رنگ جھلکتا ہے اور وہ نثری تصانیف میں سر والٹر اسکاٹ کا اثر نمایاں ہے۔ ان ادیبوں کے اثرات دیرپا نہ تھے بلکہ اس کی تخلیقی جبیں کے سنوارنے اور نکھارنے کے لیئے سنگ بنیاد تھے۔ پشکن کی پہلی نثری تصنیف "پیتر اعظم کا حبشی" ہے جس کے بعد "کپتان کی بیٹی" "پگاشیف کی بغاوت کی تاریخ" "ڈبرافسکی" "گوریوخو نوکی تاریخ" وغیرہ لکھی گئیں۔ پشکن کی نثر کے کتنے ہی دور رس اثرات کیوں نہ ہوں لیکن اس کا منظوم ناول (جیسا کہ وہ خود کہتا ہے)

"ایوجین ونجن" زیادہ اہم ہے۔

گوگول (۱۸۰۹-۵۲) بمقام سارو شنکی یوکرائنی تارق خاندان میں پیدا ہوا اور بچپن کا زمانہ یوکراین کی کھلی فضا میں بسر کیا۔ ۱۸۲۰ میں مستقبل کی کامرانیوں کی تلاش میں سینٹ پیترز برگ روانہ ہوا لیکن قدم قدم پر اہانت نے خیر مقدم کیا۔ دکنی جوش و شگفتگی اور ادا کارانہ مہارت کے ساتھ تخلیقی کام شروع کیا اور نتیجتاً "دکانکا کے قریب ایک کھیت کی شام" پیش کیا اس کتاب کا اس لئے بھی سرگرم خیر مقدم کیا گیا کہ متداول عقائد و رسومات اپنی پوری آب و تاب دکھلا رہے تھے جو اس زمانے کا فیشن تھا۔ سب سے زیادہ قابل توجہ چیز گوگول کی زبان ہے جو قافیہ، ترنم اور صنائع لفظی و معنوی سے پرکار ہوگئی ہے۔ گوگول کی نثر کا کامل نمونہ "وحشیانہ انتقام" ہے۔ کلاسک واقعاتی اسلوب پشکن کی نثر میں اپنی تکمیل کو پہونچ چکا تھا، گوگول نے نثر کی سیمابی طبیعت کو بلند کیا اور مرصع و مترنم نثر کو اس کے نقطۂ کمال پر پہونچا دیا۔ اس کا دوسرا مجموعہ "میرگورود" نثر میں ایک طرح کی قازق "الید" ہے۔

گوگول کی تخلیق میں اگلے وقتوں کے زمیندار "اوان دوچ اور اوان نکو رودوچ کی لڑائی"، "ایک خاتون کی سرگزشت" "نفسکی پراسپکٹ" (یہ ایک سڑک کا نام ہے۔ مترجم) "لبادہ"، "تصویر"، اور "انسپکٹر جنرل" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ گوگول کی تصانیف کا یہ دھندلا سا خاکہ اس وقت تک کا ہے کہ اس نگارشہ کار "مردہ روحیں" پیش نہ ہوا تھا۔ یہ تخلیق یورپی ادب کی حسن کارانہ کامران کاوشوں میں عظیم ترا ہمیت رکھتی ہے۔ مردہ روحوں میں روسی معاشرے اور صوبائی زندگی کی ناقابل فراموش تصویروں کا ایک لامتناہی سلسلہ ملے گا۔

دستہ ئفسکی (۱۸۲۱-۸۱) ماسکو میں پیدا ہوا ماسکو اور سینٹ پیترز برگ کے حربی انجینیری کے مدرسے میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۴۲ء میں فوجی کمیشن حاصل کیا۔ لیکن تین سال بعد اس سلسلے کو منقطع کر کے اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ اس کی پہلی تصنیف "غربا" ہے۔ اس کتاب کی اشاعت ان اہم واقعات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جو نئے ادبی دور کی غمازی کر رہے تھے۔ نوجوان ناول نگاروں میں دستہ ئفسکی سب سے زیادہ ہونہار معلوم ہوتا تھا۔ نیم انقلابی سیاسی انجمن (پیتراشوف سکی کا حلقہ جس میں اشتراکیت کا پرچار ہوتا تھا اور مارکسی تعلیمات پر بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ اس حلقے کے زیادہ تر ارکان اشتراکی تھے۔ ایک دفعہ ارکان انجمن کو یکایک گرفتار کر لیا گیا۔ نہ جرم بتلایا گیا نہ صفائی طلب کی گئی، خود ارکان کو بھی اپنے جرم سے کوئی آگاہی نہ تھی۔ مترجم) کے رکن کی حیثیت سے اس کی گرفتاری عمل میں آئی اور سزائے موت تجویز کی گئی۔ دستہ ئفسکی اور اس کے رفیقوں کو قتل گاہ پہونچایا گیا، قتل کے تمام مراسم طے پا چکے تھے کہ عین گردن زدنی کے وقت معافی کے احکام سنائے گئے۔ (زار کے حکم سے سزائے موت جلاوطنی میں بدل دی گئی۔ مترجم) ان ساعتوں نے دستہ ئفسکی پر گہرا رنگ چھوڑا، چنانچہ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی تصانیف میں ذکر کیا ہے۔ چار سال تک سائبریا میں قید رہا اور اس کے بعد مزید چار سال سمی پلد ئسنک میں سپاہی کی حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ رہائی کے بعد ہی دو تصانیف شائع ہوئیں "مردوں کا گھر" اور "بے کس و مظلوم"۔ "جرم و سزا" "فاطر العقل"، "بھوت پریت" "برادران کرمازوف"، "سدا سہاگی"، "خام کار نوجوان" اور "مصنف کا روزنامچہ" وغیرہ بعد میں شائع ہوئے۔ موخر الذکر تصانیف اگرچہ مختصر ہیں لیکن دستہ ئفسکی کو سمجھنے میں اہم ہیں۔ ان نگارشوں میں اس کی وہ تمام صلاحیتیں نمایاں ہیں جو

اسے بلا قید زماں سب سے بڑے ناول نگار کا مقام بخشتی ہیں اور غیر معمولی استثنائی شخصیت کی بلند ترین عظمت کی شاہد ہیں۔

نکراسوف (۱۸۲۱-۷۷) یاڈولیا میں ایک زمیندار کے سلب سے پیدا ہوا اس نے اپنے باپ کے منشاء کے خلاف سینٹ پیٹرز برگ میں تحصیل علم شروع کی جس نے بیٹے کو اپنے معاشی وسائل آپ تلاش کرنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اس دنیا سے چل بسا۔ انیس سال کی عمر میں نکراسوف کی نظموں کا پہلا مختصر مجموعہ "خواب و صدا" شایع ہوا۔ وہ عوامی شاعر تھا اس لئے اس نے غریب دکھیارے عوام کی چنتا اور دکھ درد کو اپنی نظموں میں پیش کیا ہے جس کی بناء پر وہ مصلحین کے لئے ایک نمونہ بن گیا۔ نکراسوف کی نظموں کے مشہور مجموعوں میں "سرخ کہرا" اور "روس میں چین و آرام سے کون رہ سکتا ہے" شامل ہیں۔

ترگنیف۔ (۱۸۱۸-۸۳) صوبہ کے ایک معزز گھرانے میں بمقام اورل پیدا ہوا۔ تعلیم گھر پر، جامعات ماسکو، سینٹ پیٹرز برگ اور بالآخر برلن میں ہوئی۔ جہاں تعلیم یافتہ روسی نوجوانوں سے میل جول کی وجہ سے وہ بھی مغربی خیالات کا پیرو بن گیا۔ کچھ دنوں سرکاری ملازمت کی لیکن بعد میں ملازمت ترک کرکے اپنے آپ کو ادب کے لئے وقف کر دیا۔ پہلی کامیاب ترین کوشش "کھلاڑی کے خاکے" سے عبارت ہے۔ جس میں کسان اپنے آقاؤں سے زیادہ جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے شہ پاروں میں "سکون" "آسیا" "نگاہ اولین" جیسے فسانے اور "ردود استراف کی خلوت گاہ" "بھتیجا" اور "باپ اور بیٹے" جیسے ناول شامل ہیں۔ جن میں پلاٹ اور عصری معاشری مسایل تار و پود کی طرح پیوستہ ہیں۔ ترگنیف کی تمام تصانیف پر چوٹی کے نقادوں نے تبصرے اور تنقیدیں کیں۔ اس کی حساس طبیعت تنقیدی نیش زنی کی تاب نہ لا سکی اور اس نے وطن کو خیرباد کہہ کے پردیس میں سکونت اختیار کی۔ بعد کی تصانیف اسی تنقید کی صدائے بازگشت ہیں۔ اپنے دو ناولوں یعنی "دھواں" اور "اچھوتی زمین" میں اس نے انہیں حقائق کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس سے اس کی طبیعت کی شدت اور حساسیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غیر معمولی حساسیت، بے مثال قوت مشاہدہ، خاص طور پر انسانی کردار کا۔ طریق اثر پسندی، ماہرانہ بے رنگ، صلاحیت توازن اور زبان کا ترنم، روانی اور فصاحت ترگنیف کی چند ایک نمایاں خصوصیات ہیں۔ ترگنیف ہی وہ سب سے پہلا روسی ادیب ہے جسے فرنگیوں نے پڑھا اور بے حد پسند کیا۔

تالستائے (۱۸۲۸-۱۹۱۰) اپنے والدین کے دیہی مستقر یاسنایا پولیانا میں پیدا ہوا جو طولا کے صوبہ میں واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم فرانسیسی (و جرمن۔ مترجم) اتالیق کی نگرانی میں ہوئی۔ (لیکن یہ سلسلہ ماں باپ کے انتقال پر ختم ہوگیا بعد میں کچھ دنوں صرف فرانسیسی اتالیق کی نگرانی رہی۔ مترجم) اور بعد میں دارالعلوم قازان میں شریک کر دیا گیا۔ قازان معاشری مرکز تھا، اس لئے تالستائے کا زیادہ تر وقت سوسائیٹی میں بسر ہوتا تھا۔ اس کے بعد کا زمانہ ماسکو میں بسر ہوا لیکن ۱۸۴۷ میں قفقاز چلا گیا اور توپ خانہ کی جمعیت میں بھرتی ہوگیا۔ (جہاں اس کا بھائی نکولائی کپتان تھا۔ تالستائے کے قفقاز جانے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ نکولائی نے قفقاز کے موسم، باشندوں اور فطری حسن کی تعریف سے اس کے دل میں۔ اس دیس کو دیکھنے کی امنگ پیدا کر دی تھی جس کی شاعر قفقاز لرمنتوف اور پشکن نے اپنی تصانیف میں بے حد ستائش کی تھی۔ خود تالستائے نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ایسی رومانی اور زندگی بخش فضا میں کیا۔ "بچپن، لڑکپن اور جوانی" "جنگل کی کٹائی" "قازق"،

"جنگ کے خاکے"، "سبستاپول دسمبر میں" اور "سبستاپول مئی میں" اسی تفقاز کے آغوش میں لکھی گئیں۔ مترجم) اور ترکوں سے مقابلہ اور سبستاپول کے محاصرہ میں بہادرانہ حصہ لیا۔ قلعہ کی تسخیر کے بعد اسے سینٹ پیٹرز برگ بھیج دیا گیا۔

تالستائے کی مشہور تصانیف میں "جنگ و امن" "آننا کرینین" "اعترافات" بچپن' لڑکپن' اور جوانی" "قازق" "بازفاست" "کرائسٹر سوناٹا" "باطل کی قوت" "روشن خیالی کا پھل" اور "زندہ لاشیں" شامل ہیں۔ ۱۸۷۶ء کے لگ بھگ تالستائے نے اپنی غیر اثر پذیر اور خوش حال زندگی سے الجھن سی محسوس کرنی شروع کی۔ سر پر کھڑی ہوئی موت کا ناقابل تسخیر خیال آسیب کی طرح دل پر مسلط ہوگیا' اس لئے وہ اپنی زندگی کے مذہبی جواز کی تلاش میں سرگرداں ہوگیا اور یہ قوت اس پر پوری شدت کے ساتھ محیط ہوگئی۔ اس کا شر سے عدم مقاومت کا نظریہ (اک زمانہ گزرنے اور اس کے رجعت پسند ہو جانے کے باوجود بھی گاندھی جی اسی نظریے کے پرچار میں مصروف ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ گاندھی جی اپنے "استاد" سے زیادہ باعمل ہیں مترجم) اس کے عقیدے کی بنیاد بن گیا جو بہت جلد ہی "تالستائیت" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ تالستائے نے اپنی اس معکوسیت کی بھدی روئداد "میرے اعترافات" میں بیان کی ہے۔ اس کی مذہبی تعلیمات پر بہت زیادہ بحث وتمحیص اور تنقید ہوئی لیکن لزت رن نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ "تالستائے کی اہمیت بہ حیثیت مفکر مختلف فیہ ہوسکتی ہے لیکن حسن کار تالستائے کا شمار بہرحال عظیم ترین شخصیتوں میں ہے"

تالستائے کی طبیعت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ ساری زندگی ذہنی کشمکش میں مبتلا رہا۔ یوں بھی اس کے عزائم اور خواہشات ہمیشہ اس کی دست رس سے آگے ہوتے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ اور عبرت انگیز وہ کشمکش تھی جو خاندانی روایات اور اپنے عقاید کے مابین پیدا ہو چلی تھی۔ اس کے عقاید اسے مجبور کر رہے تھے کہ روایات' قدامت اور نمول کے ٹھاٹھ ختم کردے لیکن خاندان بالخصوص بیوی اور اولاد پر نہ تو اس کی تعلیمات کا کوئی اثر پڑا اور نہ وہ اپنی قدیمی وضع بدلنے کو تیار تھے بلکہ الٹے ان کی یہی کوشش رہتی کہ وہ بھی ان کا شریک رہے۔ اسی کشمکش سے تنگ آکر اس نے بیوی کو ایک خط لکھا اور گھر چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ اسی سفر میں موت نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس نے کسی تیسرے درجے کے تاریک اسٹیشن میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مترجم)

چیخوف (۱۸۶۰-۱۹۰۴) ڈراما نگار اور افسانہ نویس تھا۔ تگن روگ میں پیدا ہوا جو بحر آزوف کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کا باپ ایک کاروباری آدمی تھا اور دادا زرعی غلام (جس نے روپیہ جمع کرکے آزادی "خرید" لی تھی اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مترجم) چیخوف نے اسی زمانے سے لکھنا شروع کیا جب کہ وہ جامعہ اسکو میں طب کا طالب علم تھا۔ ابتدا کی کہانیاں زیادہ تر مزاحیہ اور طنزیہ ہوتی تھیں اور ایسے ہی پرچوں میں شایع ہوتی تھیں "گل کار کہانیاں" اسی مزاح و ظرافت کا شکار رہیں۔ لیکن بہت جلد اس میں ایک نمایاں تبدیلی رونما ہوئی جو سب سے پہلے اس کے ڈرامے "اوانوف" اور افسانوں کے مجموعے "اداس انسان" میں ظاہر ہوئی۔ یہ دونوں کتابیں زندگی کے اس گم نام موڑ کے نشان راہ کی وارفتگی پر غمازی کرتی ہیں جو عنفوان شباب کا سرمایہ ہے۔

چیخوف کے شہ پاروں میں "ماموں وانیا" "تین بہنیں" "گلستان فاش وانہ" "میری زندگی" "سنگیت کنھیا" "کہنائے" "استیپ" "مسرت"

"ابستر کی شام" "ڈویل" "وارڈ نمبر ۶" وغیرہ شامل ہیں۔ اس کا شمار ڈراما نگار کے علاوہ دنیا کے چوٹی کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

چینخوف کا اثر روسی ادب پر دیرپا نہ رہا۔ اس کی موت کے فوراً بعد ہی نئی ادبی تحریک کو عروج ہوا اور چینخوف کی ادبی روایات کے جاری رہنے کے تمام تر امکانات ختم ہوگئے۔ آج کے روس میں چینخوف اپنے ہم رتبہ ادیبوں میں سب سے زیادہ بیگانہ ہے۔ لیکن دوسری طرف روس کے باہر پچھلے چند برسوں میں اس کے اثرات بڑھتے جا رہے ہیں (چینخوف کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی کے دوران ہی میں اس کے افسانوں کا اکیس زبانوں میں ترجمہ ہوا تھا۔ اس کی ہردل عزیزی کا یہ عالم تھا کہ جب اس کا انتقال برلن کی صحت گاہ باڈن وائلر میں ہوا تو چھ سال بعد اس کی یاد میں ایک مجسمہ نصب کیا گیا۔ اس کا جنازہ اس اہتمام اور تزک و احتشام سے اٹھایا گیا کہ دنیا کے دوسرے ادیبوں میں دستہ ئفسکی کے علاوہ کسی اور کی مثال آج تک نہیں ملتی۔ مترجم)

گورکی (۱۸۶۸-۱۹۳۶) اس کا نام الکسی ماکسی مووچ پشکوف تھا۔ نشنی نوف گورود (شہر استراخان) میں پیدا ہوا، جو اب اسی کے نام سے معنون ہے۔ اس کا باپ فرنیچر ساز تھا (ایک تذکرے میں لکھا ہے کہ کسی جہاز راں کمپنی کا نمائندہ تھا۔ مترجم) پانچ سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اس لئے ماں کے ساتھ نانا کے گھر رہنے لگا نو سال کی عمر میں (جب کہ اس کی ماں نے دوسرا عقد کر لیا اور بہت جلد دق کا شکار ہوگئی۔ مترجم) خود اپنا پیٹ آپ پالنے پر مجبور ہوا اور پندرہ سال تک مختلف پیشے اختیار کرتے ہوئے مشرقی و جنوبی روس کی خاک چھانی۔ اسی دوران میں اپنی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا اور دندیدوں کی طرح کتابوں پر ٹوٹ پڑا۔ ساتھ ہی انشاء پردازی بھی شروع کر دی۔ صوبائی جرنلسٹ بنتے دیر نہ لگی اور ۱۸۹۵ء اس کی کہانی "چلکاش" سینٹ پیٹرزبرگ کے کسی چوٹی کے ریویو میں قبول کر لی گئی۔ تین سال بعد کہانیوں کا مجموعہ شائع ہوا اور اس طرح بہت جلد دنیائے شہرت پر آفتاب بن کر چمک اٹھا۔ لینن کے دوست کی حیثیت سے انقلابی تحریکوں میں سرگرمی کے ساتھ عملی حصہ لیا۔ وہ سب سے پہلا چوٹی کا اشتراکی ادیب ہے جس کی تصانیف اور سرگرمیاں مزدور جماعت کے نام معنون ہیں۔ ۱۹۰۰ء میں گورکی کو اس کی انقلابی ذہنیت اور سرگرمیوں کی بناء پر شہر بدر کر کے نوف گورود بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں شاہی اکادمی کا رکن منتخب کیا گیا لیکن اس کی مصروفیات اور عقاید کی بناء پر یہ انتخاب مسترد کر دیا گیا۔ چینخوف ان دنوں زندہ تھا، وہ ایک ادیب کی توہین برداشت نہ کر سکا اور احتجاجاً خود بھی شاہی اکادمی کی رکنیت سے مستعفی ہوگیا۔ تین سال بعد پھر گورکی کو قید کر دیا گیا۔ لیکن اس سزا کے خلاف سارا فرنگ اٹھ کھڑا ہوا، مجبوراً زار شاہی کو اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا۔ گورکی کا کمال فن یہ ہے کہ اگرچہ وہ غیر تعلیم یافتہ تھا اور کٹر انقلابی لیکن اپنے آرٹ کی انفرادیت اور حسن کارانہ شخصیت کو برقرار رکھا اور اپنے آرٹ و شخصیت کو انقلاب کی ہنگامہ خیزی میں گم نہ ہونے دیا۔ اس کے باوجود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بناء پر عوامی ادب کا رہبر بن گیا۔ مترجم)

اس کے تخلیقی شہ کاروں میں ....
"میرا ہم سفر" "چھبیس مرد اور ایک لڑکی" "ماں" "دنیا میں"، "میری تعلیم گاہیں" "بچپن" "فوما گوردے یف" اور "وہ تینوں" وغیرہ شامل ہیں۔

مرژکووسکی (۱۸۶۵-؟) سینٹ پیٹرزبرگ میں پیدا ہوا۔ ناول نگار اور ناقد تھا عدالت کے کسی عہدہ دار کا لڑکا تھا۔ شاعر کی حیثیت سے ناکام رہا تو فلسفیانہ تنقید، تاریخی ناول، ڈرامے

اور پمفلٹ لکھنے شروع کئے۔ اگرچہ اپنی تصانیف میں بڑے سلیقے اور ہوشیاری سے کام لیا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ وہ نظریہ پرست تھا۔ اس لئے اسے زندگی کی جیتی جاگتی تصویروں سے زیادہ قدامت کی داستانیں سکون نصیب ہوتا ہے۔ انقلاب کے بعد پیرس چلا گیا اور وہیں انشا پردازی جاری رکھی۔

"خداؤں کی موت" "لیوے نارڈو وادنس" "پیٹر اور الکسس" "تالستائے اور دستہ لفسکی" وغیرہ اس کی مشہور تصانیف ہیں۔

حسینی شاہد

حشرِ جذبات

ہوگیا مخصوص سوز بندگی میرے لئے
سجدہ گاہِ عشق ہے تیری گلی میرے لئے

ہوشیاری میں تو بڑھ جاتی ہیں دل کی کاہشیں
ہے پیامِ زندگی اب بے خودی میرے لئے

ایک لطفِ خاص تھا جب مضطرب تھی زندگی
اب قیامت ہے غمِ آسودگی میرے لئے

ہو چکی تکمیل ثاقب کیا جنونِ عشق کی ؟
اب نہیں ہے فرض شاید بندگی میرے لئے

۲

آج پھر محفل میں اس کی اجتماعِ جلوہ ہے
دیکھئے پھر اوج پر نازِ متاعِ جلوہ ہے

غور کرتا ہے عبث تو زندگی کے راز پر
زندگی کیا چیز ہے بس اک شعاعِ جلوہ ہے

ایک ہی جلوے سے پیدا ہے یہ ساری کائنات
دہر کی نیرنگ سازی اختراعِ جلوہ ہے

آہ وہ پہلی سی رونق صحنِ گلشن میں نہیں
آج یہ معلوم ہوتا ہے وداعِ جلوہ ہے

آج ثاقب اس کی محفل میں ہے مخمورِ حیات
کس قدر پُر کیف یارب اجتماعِ جلوہ ہے

ثاقب (کانپوری)

قطعات

بے کیفی

درد میں اب کسک نہیں ہوتی
زندگی کے ہیں اور ہی آثار
یوں مرے دل میں ہے تمہاری یاد
جیسے دم توڑتا ہوا بیمار

تنہائی

کاش ایسے میں تم بھی آجاتے
چاندنی رات مسکراتی ہے
رو بھی لیتا ہوں یاد کر کے تمہیں
زندگی پر ہنسی بھی آتی ہے

یہ کیا کرتے ہو؟

ذکر بھولے ہوئے افسانوں کا
چھیڑ دیتے ہو برا کرتے ہو
تم جو برسات کی راتوں میں مجھے
یاد آتے ہو یہ کیا کرتے ہو

صدائے غم

کاش ایسے میں کوئی مجھ کو سہارا دیتا
سوجھتا ہی نہیں کچھ اور بجز راہِ فرار
یوں مرے درد بھرے دل سے صدا اٹھتی ہے
جیسے سنسان بیاباں میں پپیہے کی پکار

سرابِ خیال

دلِ خانہ خراب کے ہاتھوں
مبتلائے عذاب رہتے ہیں
ایک موہوم آرزو کے سوا
زندگی اور کس کو کہتے ہیں

سکوت نما حرکت

تم نے کیا کر دیا خدا جانے
اور ہی ہے خیال لوگوں کا
یوں پریشان حال رہتا ہوں
جیسے بیمار چند ہفتوں کا

تصور و تسلّط

رہزنی کر رہی ہے شامِ فراق
منزلِ زندگی ہے بے مشعل
یوں تخیل پہ چھا رہا ہے کوئی
جیسے برسات کے گھنے بادل

احساس

یہ بھی جینے میں کوئی جینا ہے
پیار ہی ہے نہ پیار کی باتیں
یوں جوانی کے دن گزرتے ہیں
جیسے جاڑوں کی چاندنی راتیں

شاطر حکیمی (کامٹی)

سادھو کے بول

مختصر یہ ہے داستانِ حیات
پھول ڈھونڈے ہیں خار پائے ہیں

لڑکپن کھیل کھیل میں ایسے کچھ گزرا کہ کبھی سوچا بھی نہیں کہ کب صبح ہوتی تھی اور کیونکر دیکھتے دیکھتے شام ہوجاتی تھی۔ البتہ شام کی آمد کا بہت انتظار رہتا تھا کیونکہ کھیل کی اجازت لے دے کر اسی وقت تو ملتی تھی۔ لڑائی، جھگڑا، دھول دھپا، ٹھوکر لگی، گرے، خون بہہ رہا ہے گھٹنے پھٹ گئے، بھاگے جا رہے ہیں۔ آتشبازی چھوڑی۔ دامن جل گیا، خوب ڈانٹ سنی، گالیاں کوسنے، دھمکیاں، لیکن پھر جیسے کے ویسے، نہ احساس، نہ رنج نہ تکلیف نہ ملال لڑکپن کی فہرست میں یہ سب گورکھ دھندے کہاں۔ دیکھتے دیکھتے صبح زندگی کی شام ہونے لگی۔ بھرپور شام، بڑے ہونے لگے آفت آگئی۔ دھیرے دھیرے عقل آنے لگی غضب ہوگیا۔ یہ نہ کرو، وہ کرو، یہاں مت جاؤ، وہاں مت بیٹھو، باہر مت نکلو، پابندیاں، اصول، نصیحتیں، غرض صبح سے شام تک کی نصیحتیں، جی بیزار ہوگیا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ سب کیوں کریں جس کے کرنے کو کہا جاتا ہے اور وہ کیوں نہ کریں جس کے کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سمجھ آئی بھی کیوں۔ کون بلایا تھا اسے۔ ہم ایسے ہی بھلے تھے ع

مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

رفتہ رفتہ اسکول سے کالج کے دن آئے۔ ۱۴ سال میں میٹرک کامیاب کیا۔ سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ نظر لگنی تھی۔ صدقے اترے۔ ٹوٹکے ہوئے غرض الا بلا سب ہی کچھ ہوا۔ دو سال انٹر کے بھی خیریت سے گزرے۔ شاندار کامیابی، مبارکبادیاں، دعوتیں، گلپوشی، کالج کو چھٹیاں ہوگئیں اور ہم بی اے کے سپنوں میں کھو گئے۔ دن گنتی تھی۔ کب کالج کھلے گا۔ گریجویٹ ہونے میں دو ہی سال تو رہ گئے ہیں۔ پھر کیا ہے اور پھر اس کے بعد؟ آگے دیکھا جائے گا۔ ادھر یہ تو میرے من کے سپنے تھے۔ ادھر گھر کے جس گوشے میں دیکھوں کھسر پھسر شروع ہوگئی تھی۔ تیکھی نظریں، سرگوشیاں، سر جوڑ کر چپ چپ سی باتیں، مجھے دیکھتے ہی سب کے سب خاموش، جیسے کوئی سنسر کے محکمے سے میرا تعلق ہے۔ ممانی جان اور پھپھی جان تو میری تعلیم کی دشمن بن گئی تھیں۔ جانے ان کا کیا جاتا تھا۔ "بس بہت پڑھ لیا ہے اس نے۔ اب شادی کر دو اس کی۔" جیسے میں ان کا کھا رہی تھی۔ ان پر دوبھر تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کیا منصوبے ہیں۔ کونسے ارادے ہیں۔ کس قسم کی اسکیم بن رہی ہے۔ تنظیم مابعد شادی کے سلسلہ میں ان کی کیا کیا تخیل آرائیاں ہیں ؎

درون خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہگذر کو کیا خبر ہے!

گھر کی فضا سے جی اکتانے لگا تھا۔ اس جاسوسی ماحول سے ہَول سی ہونے لگی تھی۔ وہ کالج ہی بھلا تھا۔ ہم سنوں کی صحبت، ہم نواؤں کا ہجوم۔ ہم صفیروں کا جمگھٹ۔۔ ایک جمعہ آتا تھا۔ وہ کم بخت بھی پہاڑ ہو جاتا تھا۔ نہ کسی کی بات اچھی لگتی تھی، نہ کسی سے بات کرنے ہی طبیعت چاہتی تھی ؎

دل کشش کشِ زیست سے ہے مرگ در آغوش
جینے پہ بھی اصرار ہے معلوم نہیں کیوں

جمعہ تھا۔ نصاب کی کتابوں کو دیکھی تو الجھن سی ہونے لگی۔ افسانوں کی ایک کتاب لے لی اور مہندی کی باڑھ کے قریب ہری ہری دوب پر جہاں نیم کے پیڑ کے ہلکے ہلکے سائے تھے، لیٹ گئی۔ ایک افسانہ شروع کیا۔ ہمہ تن گم ہوگئی۔ قصہ کی ہیروئن کے حالات کچھ کچھ مجھے اپنی زندگی کا پلاٹ محسوس ہونے لگے۔ کچھ سوچ سی لگ گئی۔ مستقبل کی سوچ کہ واقعی کہیں ایسا نہ ہوجائے۔ خیالات بھٹکنے لگے۔ دماغ کی نامعلوم وادیوں میں۔ کہ نجمہ دوڑی دوڑی آئی۔ کیا ہے؟ کیوں ہانپ رہی ہے بدتمیز؟ کچھ چل تو نہیں گیا دماغ؟

"کچھ نہیں باجی۔ امی تم کو کب سے ڈھونڈ رہی ہیں۔ اور تمہیں آج چھٹی کے دن بھی پڑھنا سوجھا ہے۔ یہ دیکھو میں اپنی گڑیا کے گھروندے بنا رہی تھی۔ چلو امی تمہیں بلاتی ہیں۔

ان کے پاس کچھ مہمان بی بیاں آئی ہیں۔ وہ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں"
"کیا کریں گی مجھے دیکھ کر۔ کچھ لعل تو نہیں لگے ہیں۔ عجائب گھر کی کوئی مخلوق تو ہوں نہیں"
یہ سب مجھے نہیں معلوم چلو بس۔
ہماری امی بڑی ہردل عزیز ہیں۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب ابا کہا کرتے تھے کہ "اگر مجھے اس کا علم پہلے سے ہوتا کہ تمہاری ماں کی گرویدگی کا یہ عالم ہے۔ تمہاری سہیلیوں کی اتنی زبردست پلٹن ہے تو شاید میں تم سے شادی نہ کرتا"۔ لیکن میں اتنی ہی آدم بیزار تھی——
کتنی مختلف تھیں ہم دونوں! خیر، نجمہ تو میری ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرا کر چلدی - اب کیا دیکھتی ہوں بوڑھی عشرت اپنا بھاری بھرکم تو ند اور بوٹا سا وزنی قد لئے تھل تھل چلی آرہی ہے - وہیں سے الاپ رہی ہے :-
"اے بی بی کہاں چلی جاتی ہو - نوج، ایک دن تمہ کا آتا ہے - اس دن بھی پڑھنا، پڑھنا، پڑھنا۔ جانے کس موئے نے یہ پڑھنا دڑھنا لکالا ہے - خدا ہی تو سمجھے اس سے۔ یہ لو، یہاں بیٹھی ہیں گٹ پٹ ہو رہی ہے - دیکھو آنکھیں ستیاناسی ہو جائیں گی - دماغ دشمنوں کا بیکار ہو جائے گا"۔ قطع کلام کرتے ہوئے :- "کیا ہے بوا؟ کیوں بڑبڑا رہی ہے؟ میرا کیوں پیچھا کیا ہے آج تم لوگوں نے؟ کہیں جینے بھی نہیں دیتے چین سے کم بخت——"
"اے کچھ نہیں بی بی تمہاری امی کی ایک سہیلی لکھنؤ سے آئی ہیں - بہت دنوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں——"
"ہٹاؤ بوا اس دیکھنے دکھانے کے قصہ کو۔ بھاگو یہاں سے - میرا سر نہ کھاؤ - نہیں آتے ہم۔ کیا کرلوگی ہمارا، وہ لکھنؤ کی ہوں یا بھوپال کی - ہم پر ان کا رعب نہیں جم سکتا سمجھیں؟ جاؤ سنا دو امی کو"۔ میں نے اس طرح اس پر اپنا رعب جما دیا۔ جانتی تھی کہ وہ کچھ بھی نہ کہے گی امی سے - وہ اپنا سا منہ لے کر جا رہی تھی - کچھ چپ چپ بڑبڑاتی بھی رہی۔ جو میں برابر سن نہ سکی - شاید میری بدتمیزی کی داد دے رہی تھی - میری ناقص تعلیم کی پھبتی اڑا رہی تھی۔ سچ بھی تو ہے - کہیں ڈگری لینے سے اخلاق آجاتے ہیں؟ انسان میں مکمل انسانیت آجاتی ہے؟ ڈگری تو محض ایک اشتہار ہے - شہرت کا ٹھیکہ جیسے - اب مجھے فلسفہ اور منطق کو چھوڑ کر زندگی کی نفسیات کو سوچنا تھا۔ اس جھگڑے کے سر سے ٹلنے کے بعد میں نے اطمینان کی ایک سانس لی اور قصہ پڑھنے لگی - قصہ کی ہیروئن۔ کتنی ملتی جلتی تھیں اس کی اکثر باتیں مجھ سے - ایسے لگتا تھا جیسے میری ہی اپنی زندگی کا نقشہ ہے - لکھنے والے نے لکھنے سے پہلے میری زندگی کو کونہ کونہ سے جھانک کر دیکھا ہے - کتاب میں بڑی دیر سے پڑھتی ہوں - بعض فقروں پر پہروں سوچ سی لگ جاتی ہے - غرض یوں تیوں ختم کرنے کی ٹھانی تھی کہ تیسرا جوہری بم پھٹا - دیکھتی کیا ہوں امی سر پر سوار ہیں - ان کی شخصیت مجھے بہت متاثر کردیتی ہے۔ ان کی خوبصورت آنکھیں، ان کا رعب اور ان کی گہرائی - میں انھیں دیکھ کر اپنا سب کچھ بھول گئی۔ اف! میں ان سے بہت ڈرنے لگی تھی - یونہیں چپ چپ حالانکہ وہ مجھے بہت چاہتی تھیں - سب بچوں سے زیادہ ——
"فریدہ! یہاں کیا کررہی ہے بچی - ساری دنیا سے نرالی طبیعت ہے - جی نہیں گھبراتا تنہائی سے؟ آخر ہمارے پاس بھی کبھی بیٹھا کرو - اتنی پڑھائی سے الجھن نہیں ہوتی تجھے؟ پگلی کہیں کی——"
کتنا رس اور کتنا پریم تھا ان فقروں میں - ماں کی محبت وہ بدنصیب کیا جانے جس نے کبھی ماں کا

پیار ہی نہ دیکھا ہو۔ جن بچوں کی مائیں لڑکپن میں ہی مر جاتی ہیں ان کے دل بڑے پتھر ہو جاتے ہیں۔ ماؤں کے رُوپ میں بھگوان بستے ہیں۔ میں امّی کا کچھ بھی تو جواب نہ دے سکی۔ لیکن اس غیر معمولی آؤ بھگت، اتنی خلاف عادت خاطر داری کا پس منظر میری نگاہِ دور رس کے لئے تشویشناک ضرور تھا۔ ہزار شکوک ہونے لگے۔ لیکن پھر ان توہمات کو میں ان کی محبت پر ہی محمول کرتی رہی۔ چپکے چپکے یہ گنگناتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ ہوگئی ع

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

یہ امائیں بھی کیسی کیسی ترکیبیں ہم کو دامِ فریب میں پھنسانے کی سوچتی ہیں۔ ان کے فتراک کے یہ معصوم نخچیر ——— دیکھئے ان کا کیا حشر ہو۔ ہمارا کھلانا پلانا جیسے انہیں کھلتا ہے۔ نجمی بھیا کی فکر ہی نہیں ہوتی کسی کو۔ اتنے سیانے ہوگئے ہیں۔ جب کبھی ان کی شادی کا ذکر چھیڑا، اماں نے منہ چڑا دیا۔ "ارے اس کا کیا ہے۔ کوئی عمر گئی ہے"۔ لو بھیّا تو مجھ سے کافی بڑے ہیں۔ ان کی تو ابھی عمر نہیں گئی۔ اور میں آنکھوں کا ٹھیکرا بن گئی۔ کہیں پڑھا تھا۔ یاد نہیں۔ کہاں۔ امّی کی باتوں سے اس فقرہ کا مفہوم اب سمجھ میں آنے لگا تھا۔ "شادی ———! جوان کو ابھی نہیں۔ بوڑھے کو کبھی نہیں" ———

خیر۔ تو مجھے اس بہانے سے بلایا تھا۔ سچ مچ مجھے دیکھنے آئی تھیں ان کی سہیلی۔ خوب گھور گھور کر دیکھا۔ جیسے جوہری کسی انمول کنکر کو دیکھے۔ یا شاہ کسی درِ شہوار کو پرکھے۔ قریب بٹھالیا۔ بلائیں لیں۔ ان کے ساتھ بھی ایک بوا تھیں۔ وہ بھی سرکتے سرکتے بہت قریب آگئیں۔ کئی نگاہیں وقت واحد میں مجھ پر فلڈ لائٹ کی طرح چاروں طرف سے پڑ رہی تھیں۔ میں سن سی ہوگئی تھی جیسے جان ہی نہ تھی سارے بدن میں۔ اتنی تنقیدی نگاہیں میرا جائزہ لیں اور میں کچھ محسوس نہ کروں۔ ع پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جیسے میرا طبّی معائنہ ہو رہا تھا۔ گھوڑا جب لیتے ہیں تو اس کی بال بھنوری دیکھی جاتی ہے۔ ایک انسان کو انسان ایسے دیکھتا ہے جیسے اس میں خود کسی قسم کا عیب نہیں اور انسان کی نگاہیں ہی تو انسان میں عیب ڈھونڈھ سکتی ہیں۔ غالب کہتا ہے ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

خیر۔ تو آپس کی سرگوشیوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس معائنہ تنقیدی میں ہم کامیاب ہوگئے ہیں۔ ہمارے دیکھنے والے نے اطمینان کی سانس لی اور بڑی محبت سے ہمارے سرِ اقدس پر دستِ شفقت رکھا۔ گاہک کو جنس پسند آگئی تھی اور ادھر میرا جو حال ہو سو ہو۔ من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اب کیا ہوگا یہ سوچ لگ گئی تھی۔ کاش اس امتحان میں ناکامی ہوتی تو پھر دنیا میں کیا کچھ نہ کر لیتی ع

سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

صیاد آیا، جلاد آیا، بیداد آیا قسم کے کئی قافیے ذہن کی فضا میں گونجنے لگے۔ قصہ کی ہیروئین کا پلاٹ کتنا سچا واقعہ تھا، کتنی ملتی جلتی تصویریں تھیں، کیسی ہو بہو عکاسی تھی میری اپنی زندگی کی۔ جیسے واقف تھا میری زندگی سے اس قصہ کا مصنف۔ !

گاہک نے اپنی اس جنس ناقص کی نظرِ ثانی کا دن مقرر کیا گویا دن گننے جاتے تھے اس دن کے لئے۔ اپنے گھر سدھاریں اور مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے ہزاروں کے زنغے سے کسی نے مجھے کھینچ لیا ہے۔ تنہائی کتنی اچھی ہوتی ہے۔ لیکن کہاں۔ یہ تو صرف ایک احساس ہی ہے۔ وہ تو چند دن۔ لیکن اب میں کیا کروں گی۔ ذرا سوچئے۔ یہ بھی زندگی ہے

اوراق کتنے منتشر کر دئے تھے انھوں نے گڑ بوٹ ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی - یہ کروں گی، وہ کروں گی - اپنی بہنوں کی خدمت اور نہ جانے کیا کیا، سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے - میرے نظام العمل کی ترتیب درہم برہم ہوگئی - ابھی دنیا بھی کیا دیکھی تھی - یہ خیال و خواب کی بستی - یہ میکہ کا سہانا پن، یہ بے فکری، یہ الّلے تلّلے - سب کے سب صرف یاد اور تخیل ہی ہو کر رہ جائیں گے

باکسے وقتی وصالے داشتم
سالہا بگذشت و آں از دل نرفت

اب ذرا ادھر کی سنئے - وہ بھی تو بڑے مزے کی کہانی ہے - امّی کی سہیلی کے صاحبزادے جو ہمارے ہونے والے کچھ ہوتے ہیں - ان سے پنڈ چھڑانا اب انھیں مشکل تھا - سوالات کی انھوں نے بھرمار کر دی - کیسی ہے، کیا ہے - سچی سچی باتیں ہوں سب - جھوٹ موٹ بناوٹی تعریف نہیں -

بیچئے گئیں وہ ہماری تعریف کے پل باندھنے - کہ ایسی ہے ویسی ہے - چاند سا ہے، اس میں میل نہیں - قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے - اپنی فرصت کے لمحے میں سوچ بچار سے ڈھلی ہوئی مورتی کوئی خامی کوئی کسر، ایک شہ کار ہے اس کے فن کا - کتنا سبک نقشہ، کیسے خوبصورت بال - آنکھوں کو خمکدہ سے کیوں نہ تشبیہ دوں - ایک شاعر کا تصور - ایک مصور کا کمال! بوا کریمن جو ساتھ تھیں انھوں نے ان کی شاعرانہ عکاسی میں اپنے دو بول شریک کر دے :-

بی بی آپ نے غور نہیں کیا بال میں ذرا الجھنیں سی ہیں - سیدھے سیدھے بال نہیں ہیں دلہن کے، اف! کتنی زبردست تنقید، کتنا گہرا تبصرہ، کیسی نکتہ رس نظریں! سلمیٰ بہن یہ ہماری نند ہونے والی تھیں - بوا کی اس ... الہانہ دخل در معقولات سے تھنجھلا گئیں "بس یہی یا اور بھی کچھ برائی ہے نہ؟ بوا کیسی ہی ... عیب جوئیں . تاثیر سے نظر بد سے تر ہو جائے گی" عامد - ایک اکھڑ قسم

خیر بھئی تو رفتہ رفتہ زندگی کا وہ دن آ ہی گیا کہ پر باندھنے صیاد آیا - کنوار پتے کے سہانے سلونے دن سپنے ہو گئے - در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہم میکہ سے رخصت ہوئے - جس گھر کو ہم اب تک اپنا سمجھتے تھے وہ حقیقت میں اپنا نہ تھا - اپنے تو غیر تھے، اپنے تو پرائے تھے جو پھر اپنے ہی ہو گئے -

سسرال میں ہماری بڑی قدر و منزلت تھی - بڑے چاؤ ارمان تھے، حامد مجھے بے انتہا چاہتے، میری ہر خواہش ایک حکم کا اثر رکھتی - میرے اشاروں پر دنیا ناچ رہی تھی - سب مجھے اس طرح گھیرے رہتے جیسے شمع کو پروانے - اتنی گرویدگی، اتنا دیوانہ پن، اس ہر دل عزیزی کا اب ردِّ عمل شروع ہوا - مجھ میں غیر ارادی تبدیلی سی مجھے خود محسوس ہوتی، نشۂ حسن نے مدہوش کر دیا - پیش نظر تھا آئینہ دائم نقاب میں، میرا سر پھر گیا، غرور نے دھاوا بول دیا - میں بھی خود کو کوئی چیز سمجھنے لگی تھی - غرض حسن اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا، اتنی محبت و گرویدگی سے بجائے اس کے کہ سمجھ میں انکساری پیدا ہوتی الٹا اثر ہونے لگا - بے حس پتھر جیسے - ان سب کی محبت اکتا دیتی - وارفتگی بیزار کر دیتی - طبیعت میں چڑچڑاپن، بدمزاجی، غرض میں کیا تھی اور کیا ہو کر رہ گئی تھی - واقعی صرف شکل و شمائل پر ریجھ کر جو گرفتار ہوتے ہیں وہ کتنی غلطی کرتے ہیں - غلط بیں نگاہوں کا یہ رنگین دھوکا اب خود فریب دینے لگا تھا - حامد کی اور میری محبت کو نظر بد سے بچانے کے لئے میرے میکے والوں نے جنتر منتر کا ایک ڈھونگ مچایا تھا - شاید یہ نفرت اور تبدیلی ان ہی تعویذوں کا اثر تھا - ان سب نے ایک دن ہم دونوں کو مخاطب کیا اور کہنے لگیں "تم دونوں حسن صورت میں یکتا ہو - نظر لگتی ہے اس جوڑے کو، یہ تعویذ ہے، اس کو علٰحدہ علٰحدہ دونوں پہن لو - اپنے سے کبھی جدا نہ کرنا، اس کی

تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اس نے کبھی ان توہمات پر اعتنا نہ کیا تھا۔ لیکن جانے کیا اثر تھا اس چاپلوسی و مکاری میں اب آٹھوں پہر تعویذ حامد کے سینہ پر سوار ہے۔ میری تعویذ بھی میرے گلے کا ہار ہے۔ دھیرے دھیرے ان ہی تعویذوں نے رنگ لایا تھا کہ سسرال اور سسرال والوں سے جی متنفر ہونے لگا۔ جہاں سے ایک شریف گھرانے کی لڑکی کو مر کر ہی نکلنا چاہئے، وہاں سے کھسنے پر میتے جی نفس آمادہ تھا۔ عورت کا ایک ہی تو حربہ ہے نا؟ رونا۔ میں نے بات بات پر رونا شروع کر دیا۔ یہ دانستہ نہیں۔ بلکہ میرا جی چاہتا کہ میں خوب ساروؤں حامد جو مجھے ذرا بھی متفکر دیکھتا تو پریشان ہو جاتا تھا، اب پہروں مجھے روتا بسورتا دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں نے حامد کو باور کر دیا کہ اب میں اس گھر میں نہ رہوں گی۔ ایسا نہ ہوگا زہر کھالونگی جہالت اور کیا۔ حامد مجبور ہو گیا۔ ماں، بہنوں، بھائیوں سب کو روتا بلکتا چھوڑیں اور حامد علٰحدہ ہو گئے۔ اب حامد کو میں ایک کٹ پتلی کی طرح جس طرح چاہتی نچاتی۔ جہاں من مانے جاتی۔ جو چاہے کرتی۔ حامد ایسے ہی چپ تھا جیسے کچھ دیکھتا ہی نہ تھا۔ کچھ سنتا ہی نہ تھا۔ بیکاری میں دل اب کیسے لگے؟ مجھے شاپنگ کا شوق چرایا۔ دکان دکان کی خاک چھاننی شروع کی۔ کئی بڑی بڑی دکانوں میں اپنی شان جتانے، اپنا رعب جمانے "اکاؤنٹ" کھولے۔ دنیا کی چیزیں آئے دن خریدتی۔ ضرورت کی بھی، بے ضروری بھی۔ انجانی سے دیکھتی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ لیکن وہ تو چپ تھا۔ ان تعویذوں نے اس کو چپ کر دیا تھا اور مجھے خود سر بنا دیا تھا۔ حامد قرضدار بن گیا تھا۔ کہیں دعوت میں جاتی، کسی کا زیور پسند آتا فوراً پوچھ لیتی کہاں بنوایا ہے اور جھٹ حامد سے کہتی۔ ایسے ضد کرتی جیسے ایک بچہ کسی کھلونے کے لئے مچل جاتا ہے۔ فرمائش کی تکمیل ہو جاتی۔ زیور بن کر آ جاتا۔ حامد مقروض ہو جاتا لیکن میری خواہش رد نہ ہوتی۔

اف! یہ تعویذ، یہ گنڈے، یہ جنتر منتر کتنوں کے گھر تباہ کئے ہوں گے۔ کون پوچھے اور بتائے بھی کون۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے میں اپنے طرز عمل کو سوچ رہی تھی کہ آخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ انجام —— ایک خوفناک دیو کی شکل میں اپنا بھیانک روپ دکھاتا۔ اور میں اس کی طرف سے بالکل انجان ہو جاتی۔ اتفاق کی بات۔ ایک سادھو اس طرف سے گزرا، گیروی لباس میں، منکوں کی تسبیح لئے، وہ کچھ بول رہا تھا — الفاظ کا مفہوم کچھ یہ تھا:—

"پھول جب کانٹوں سے نکل جاتا ہے۔ غیر محفوظ ہو جاتا ہے، چپ کا انجام ایک طوفان میں بھی بدل سکتا ہے۔ سمندر تلاطم سے پہلے ساکت ہی رہتا ہے۔"
کتنے موثر بول تھے۔ سنسنی سی ہونے لگی۔ دل پر ایک ہول ہول سی طاری ہو گئی۔ اوسان خطا ہونے لگے میں اپنے انجام کو سوچنے لگی۔ آخر یہ کیوں گزرا ادھر سے؟ میں نے یہ سوچا اور پھر گردن جھٹک لی۔ خیالات کی الجھنوں کو بھی جھٹک دیا۔

لیکن —— لیکن آخر کیا حشر ہوگا میرا؟

اللہ جانے! ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

جہاں بانو

پرچھائیاں

یوکلپٹس کا درخت پُراسرار طور پر جھوم رہا تھا —
ہلکی ہلکی چاندنی اور خوبصورت تاریکی میں سرو کے درخت کانپ رہے تھے۔ سارا باغ "ملکۂ شب" کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ رات بہت حسین اور رومان انگیز تھی مگر میں ان سب سے بے پرواہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ میری نظروں میں بہت سے بلند و بالا قد، حسین انداز اور مسکراتے چہرے گھوم رہے تھے۔
رؤفی اور اس کی دلربا مسکراہٹ — احمد۔ شرارت سے لبریز آنکھیں، ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔ کالج کی فضا میں سب سے زیادہ اسی کے قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ شفو سراپا رحم۔ اس کے انداز کچھ ایسے تھے کہ بعض اوقات مجھے اس پر رحم آنے لگتا۔ کیسے جیتا ہے یہ اتنا سنجیدہ رہ کر۔ اور اس وقت جب کہ سب لڑکے میری کسی چیز کی تعریف کرنے لگتے تو ان حضرت کی سنجیدگی اور بڑھنے لگتی۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی۔ شیام گھنگر والے پریشان بال معصوم چہرہ، یونس اور اس کی خوبصورت باتیں — فرخ جدید شاعری کا بہترین نقال۔

اوہ! — ان لوگوں نے مختلف اوقات میں میرے قدموں پر اپنے سر جھکائے تھے — کپکپاتے ہونٹوں سے اظہار کیا تھا۔ اپنی محبت کا یقین دلایا تھا اور وفا کے عہد و پیمان باندھے تھے۔ مگر شفو۔ اس نے اب تک مجھ سے بات بھی نہیں کی تھی۔ جب کبھی میں اس کے پاس سے گزرتی اس کی آنکھیں چمک اٹھتیں، مگر میرے ساتھ کسی اور کو دیکھ کر اس کی نظریں گہری ہو جاتیں، ان میں عجیب قسم کی وحشت چھا جاتی، اس کا سر اس کے ہاتھوں پر جھک جاتا اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگتا۔
ایک شام میں لائبریری میں بیٹھی پڑھ رہی تھی کہ شفو نہ جانے کہاں سے آگیا — اس کے چہرے پر وہی سنجیدگی طاری تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، مسکراتے ہونٹوں سے اس نے کہا "عذرا" اور جب میں اٹھ کر جانے لگی تو اس کے چہرے پر غم کی ایک لہر چھا گئی۔ اس نے آہستہ سے پھر ایک بار کہا "عذرا" اور چپ ہو گیا — بہت دیر تک میں انتظار کرتی رہی مگر وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ آخر میں غصے سے واپس چلی گئی۔ کتنا عجیب ہے یہ — ہر وقت نہ جانے کیا سوچا کرتا ہے۔ مجھے اس کے انداز ذرا بھی پسند نہیں۔ میں چاہتی کہ کالج کے لڑکے جب میری کسی چیز کی تعریف کریں تو اس میں شفو بھی شامل ہو مگر وہ ایسے موقعوں پر نہ جانے کہاں رہتا تھا۔ اور اس کی یہی بات مجھے پسند نہ تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اس کی خاموشی میرا مذاق اڑا رہی ہے اور میری نفرت میں اضافہ ہو جاتا۔
سب سے زیادہ تعجب مجھے اس بات پر تھا کہ احمد جس کے قہقہے کالج میں سب سے زیادہ گونجا کرتے تھے، جو شرارت میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھا وہی شفو کا گہرا دوست تھا — شفو جو کسی پارٹی میں حصہ نہ لیا کرتا تھا احمد کے کہنے سے کبھی کبھی ان مجلسوں میں نظر آجایا کرتا مگر چہرے پر وہی سنجیدگی اور آنکھوں میں عجیب طرح کی بے بسی — اس کی آنکھیں سب سے زیادہ خوبصورت تھیں — جن میں نرم سرخ ڈوروں نے ان کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ سے نہ جانے کیا کہا کرتیں مگر مجھے ان کی باتیں سمجھنے کی فرصت ہی کہاں تھی — ہاں کبھی کبھی جب میں تنہا ہوتی اس وقت سوچا کرتی کہ کاش سنجیدگی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں شرارت ہوتی۔
بہار کے دن تھے۔ ہلکی ہلکی گھٹائیں اٹھ رہی تھیں، احمد نے تجویز پیش کی کہ بجائے کلاس میں پروفیسروں کی بکواس سننے کے کیوں نہ کہیں پکنک کے لئے چلے جائیں۔ احمد کی رائے سب کو پسند آئی کیونکہ موسم ہی اتنا دلفریب تھا۔ چنانچہ رؤفی کی موٹر میں سب روانہ ہوئے۔ آج احمد نے زبردستی شفو کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ فرخ سے کسی نے

گانے کی فرمائش کی اور اس نے طلعت محمود کا گانا شروع کیا۔ اس کی آواز سب سے زیادہ پیاری تھی اور وہ جب اس شعر پر پہنچا ؎

وہ صباحتیں، وہ ملاحتیں، وہ نزاکتیں وہ لطافتیں
وہ نظر میں جب سے سمائی ہیں مجھے آنکھ اٹھانا بھی بار ہے

اس کی اس جرأت پر بے اختیار قہقہے بلند ہوئے اور میں شرما کر رہ گئی — یہ فرخ ہمیشہ یونہی کیا کرتا تھا — میری نظریں اس وقت بے اختیار شفو کی طرف اٹھ گئیں۔ سب ہنس رہے تھے مگر شفو کھڑکی میں سر لگائے دور نہ جانے کس چیز کو دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں سے گہرے رنج کا پتہ چلتا تھا۔ بال اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی بھویں کمانوں کی طرح کھنچی ہوئی تھیں۔ اس وقت اچانک میرے دل نے کہا "کتنا خوبصورت ہے یہ — کاش! زندہ دل بھی ہوتا —" اور اس کے ساتھ ہی اس کی سنجیدگی نے مجھے پژمردہ کر دیا۔

چشمے کے کنارے پہنچ کر شفو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا — سرخ پھولوں کی گھنی چھاؤں کے نیچے چشمہ بہہ رہا تھا۔ میں نے ان پھولوں کا ایک گچھا توڑتے ہوئے کہا "کتنا پیارا رنگ ہے ان پھولوں کا —" اور احمد نے شرارت سے فوراً کہا "بالکل تمہارے ہونٹوں کی طرح — اف! کتنا شریر ہے یہ۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اور ہم سب چشمے کے کنارے کھڑے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہے تھے۔ حد نظر تک آنکھوں کے سامنے چشمے کا پانی سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ رؤفی کیمرہ لئے اس خوبصورت منظر کی تصویر لے رہا تھا۔ ہم نے آخری نظر آسمان کے زریں کناروں پر ڈالی اور لوٹ آئے۔

زندگی حسین خوابوں کے سہارے گزرتی رہی۔ بی اے کے پہلے سال کا نتیجہ نکلا — ہم سب دوست پاس ہو گئے تھے اور شفو فیل۔ جس وقت نتیجہ سنایا گیا اور اسے معلوم ہوا کہ وہ فیل ہو گیا تو اس وقت بھی وہ ہمیشہ کی طرح بے حس بیٹھا رہا۔ ہاں اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی — اس دن کے بعد شفو کالج میں نظر نہیں آیا — احمد سے معلوم ہوا کہ وہ فوج میں شریک ہو کر کہیں دور چلا گیا ہے۔

دن اب بے کیف گزر رہے تھے کیونکہ پہلی سی باتیں نہ رہی تھیں۔ احمد جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتی تھی کسی امیر لڑکی سے منسوب ہو گیا تھا اور اس کا دل دولت کے انبار میں کہیں دب گیا تھا۔ فرخ کی شاعری کا مرکز اب ایک شرمیلی لڑکی لیلیٰ تھی — شیام نے اوشا کو اپنے دل کی رانی بنا لیا تھا۔ غرض کہ کالج کی فضا بالکل بدل گئی تھی۔ اف یہ مرد۔ ان کے لئے زندگی ایک حسین کھیل ہے اور لڑکیاں کھلونے۔ جب تک جی چاہا کھیلتے رہے اور پھر توڑ پھوڑ دیا۔ اس سے پہلے کبھی زندگی مجھے اتنی اداس نظر نہ آئی تھی گو کہ اب بھی رؤفی کی دلربا مسکراہٹ میرے سامنے اور حسین ہو جاتی اور یونس کی باہیں جھوم کر آگے بڑھنا چاہتیں مگر میں ان کی طرف بہت کم متوجہ ہوتی۔ میری آنکھیں کھل چکی تھیں۔ آخر میں نے کالج جانا چھوڑ دیا۔

ایک دن میں اداس بیٹھی تھی کہ احمد نہ جانے کیسے آ گیا اور آتے ہی اس نے مجھ سے کہا کہ شفو نے جاتے وقت اسے ایک لفافہ دیا تھا کہ مجھ تک پہنچا دے اور التجا کی تھی کہ بھول نہ جائے مگر اس کے باوجود احمد مجھے لفافہ دینا بھول گیا تھا۔ جسے آج لے کر وہ آیا تھا۔ وہ بہت دیر تک بیٹھا کالج کی باتیں کرتا رہا پھر وہ چلا گیا اور میں نے خط کھولا۔ اندر سے ایک رنگین کاغذ نکلا جس پر یہ عبارت لکھی تھی :—

"جب بہار کے دنوں میں دور۔ کہیں جھاڑیوں میں چھپی ہوئی بلبل نغمہ زن ہو اور پھولوں کی خوش بو ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہو، فطرت بے حد رنگین اور جاذبِ نظر ہو جائے، اس وقت جب کوئی "خوش نصیب" تمہارے حسن کی تعریف کرے اور تم شرما جاؤ تب سوچنا کہ کبھی تمہاری انہیں آنکھوں کے سحر نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ سیاہ بالوں کی پریشان لٹیں جو تمہارے شانوں پر بکھری رہتی تھیں میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھیں۔ تمہارے دمکتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ کتنی دلفریب معلوم ہوتی تھی۔ اسی حسین مسکراہٹ نے میرا دل موہ لیا تھا۔ میرے نزدیک تمہارا حسن بہار کی رنگینیوں سے کہیں زیادہ رنگین تھا۔ میں تمہارا پرستار تھا۔ تمہارا نام لے کر جیتا تھا اور کتنے خوش گوار تھے وہ لمحے جو میں نے تمہیں دیکھ کر گزارے تھے۔ پھر یاد کرنا کہ تمہاری محبت میرے لئے کتنی حسین تھی جس سے میری دنیا جگمگا اٹھی۔ پھر تمہارے تغافل نے میری محبت کو ٹھکرا دیا۔ میری آرزوئیں میرے سینے میں دفن ہو گئیں۔ اور اپنی آنکھوں میں ہزاروں مایوسیاں لئے میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو گیا——"

اور میری آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ اور نگاہیں دھندلی ہو گئیں۔ اس دھندلکے میں پچھلے گزرے ہوئے دنوں کی باتیں اجاگر ہونے لگیں۔

چشمے کے سوئے ہوئے پانی کے کنارے—— پھولوں کی جھاڑی کے نیچے مخملیں گھاس پر شفو سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں پھولوں کے گچھے توڑتے ہوئے وہاں جا پہنچی مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں کنول کی طرح کھل گئیں۔ مدھم آواز میں اس نے کہا "عذرا۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے" یہ کہہ کر اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جس میں التجا تھی۔ میں سبزے پر بیٹھ گئی اس کا سر جھک گیا اور وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے اکتا کر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مجھے کھڑے ہوئے دیکھ کر اس نے گہری سانس لی اور کہا "میں سمجھتا تھا کہ میری آنکھیں تمہیں وہ سب کہہ دیں گی جو میں زبان سے ادا نہیں کر سکتا مگر تم نے کبھی توجہ نہیں کی۔ تم——" وہ چپ ہو گیا۔

"میرے پاس آپ کی آنکھیں پڑھنے کا وقت نہیں"

یہ کہہ کر میں وہاں سے چلی آئی حالانکہ اس کی نگاہیں مجھے ٹھیرنے کی التجا کر رہی تھیں۔

میرے اس جواب کے بعد ہی سے شفو کی سنجیدگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ پہلے احمد کے اصرار پر کبھی کبھی ہمارے ساتھ تفریحوں میں شریک ہو جایا کرتا تھا مگر اب جیسے اسے ان چیزوں سے واسطہ ہی نہ رہا ہو—— کلاس میں بھی وہ سب سے پیچھے بیٹھے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتا۔ شاید وہ لیکچر بھی نہ سنتا ہو۔ کبھی مجھے اس کا خیال آ جاتا مگر میں پھر بہت جلد کالج کی رنگین فضا میں کھو جاتی۔ مگر آج اس کی اس تحریر نے مجھ پر سب کچھ ظاہر کر دیا تھا جس سچی محبت کی میں متلاشی تھی وہ اس کے خط سے نمایاں تھی۔ جس کے لئے میرے دل میں ذرا بھی جگہ نہ تھی اسی کے لئے اب میرا دل بھٹکا مارا تھا تھا۔ کاش وہ ایک بار آ جائے۔ صرف ایک بار—— مگر وہ مجھ سے دور—— بہت دور—— نہ جانے کہاں ہے۔

نگہت ناز۔

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
[illegible] کی بیتا ...	۸۰	•	۸	•
سرگزشت غالب	۶۴	•	۸	•
نظام الملک	۴۰	•	۴	•
تاریخ گولکنڈہ	۳۲۰	۳	۸	•
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	•	•
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	•
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	•
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	•
سرسالارجنگ	۴۸	•	۶	•
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	•
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	•
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	•
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	•	•
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	•
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	•
دادا بھائی	۱۶	•	۲	•
اردو نامہ	۲۰۰	۲	•	•
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	•	•
عمادالملک	۴۰	•	۶	•
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	•	۵	•
" " دوسری کتاب ...	۵۶	•	۵	•
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	•	•
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	•
فن تقریر	۹۲	•	۸	•
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	•	•
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	•
پودوں کی کہانی	۸۰	•	۱۰	•
مہ لقا	۱۰۰	۱	•	•
پانی کی کہانی	۴۸	•	۶	•
رسایل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	•
سلک گوہریں	۴۰	•	۴	•
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	-	۸	•
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	•
آشوب	۵۶		۸	•
حیدرآباد	۸۸	•	•۱	•
شاد اقبال	۱۷۶	۲	۸	•
آریائی زبانیں	۱۰۴	۱	•	•
نظام علی خاں	۳۲	•	۴	•
تذکرہ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	•	•
عرب اور عربستان	۵۶	•	۱۰	•

نام کتاب	صفحات	قیمت روپیہ	آنہ	پائی
سچ کا جادو	۴۸	•	۴	•
طبیعیاتی کائنات	۶۸	•	۸	•
متاع سخن	۱۲۴	•	۱۲	•
کیف سخن	۱۲۲	•	۱۲	•
بادہ سخن	۱۲۷	•	۱۲	•
سراج سخن	۱۵۲	•	۱۲	•
ایمان سخن	۱۲۰	•	۱۲	•
فیض سخن	۱۴۴	•	۱۲	•
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	•	•
" دوم (۵۰) "	۴۳۲	۵	•	•
نقد سخن	۱۷۵	۱	•	•
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	•
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	•	•
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	•	•
فن کی دنیا	۱۴۵	۱	•	•
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	•
محرم نامہ	۱۱۲	۲	•	•
نذر دکن	۱۵۴	۲	۴	•
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	•
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	•
دفتری معلومات	۵۶	•	۶	•
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	•	۶	•
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	•
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	•
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	•	۱۲	•
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	•
بلقان	۳۲	•	۳	•
خطابیات	۱۱۳	•	۱۲	•
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	•	•
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	•	۱۲	•
انوار	۱۶۸	۱	۸	•
کشمش نالی (۴) تصاویر ...	۸۰	•	۱۰	•
کارساں دتاسی	۱۲۲	۱	۴	•
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	•	•
سکندر جاہ	۲۴	•	۴	•
بلاغت	۵۶	•	۱۰	•
ادارہ سفر ۱۹۳۲ع میں ...	۲۰۰	•	۸	•
ناصرالدولہ	۳۴	•	۴	•
افضل الدولہ	۳۲	•	۴	•
نواب میر محبوب علی خاں	۳۴	•	۴	•

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن

دسمبر ۵۴ء

(ماہ نامہ)

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہ نامہ

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ
مجلس ادارت
خواجہ حمید الدین ایم اے
سکینہ بیگم
مہندر راج سکسینہ ایم ایس سی

[ت]صفیہ ۱۵۳
[ب]رطانیہ ایم ۳۹۵۰
[ن]مبر ۲۲۰۹
[سالانہ] چار روپیہ آٹھ آنے
[غیر ملکو]ں سے ایک روپیہ آٹھ آنے
[ف]ی پرچہ
۸/

سب رس

[ج]لد ۸ بابت ماہ ڈسمبر ۱۹۴۵ء شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

عنوان	مصنف	صفحہ
[غ]زل	سکندر علی وجدؔ بی اے۔ ایچ سی ایس	۲
[خ]طبۂ تقسیم اسناد (جامعہ اسلامیہ علی گڑھ)	آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر صدر المہام تعمیرات و نائب صدر ادارۂ ادبیات اردو	۳
[ا]کیلی عورت — (افسانہ)	محمد محبوب حسین جگرؔ بی اے (عثمانیہ)	۷
[ک]ارڈینل نیومن	ترجمہ	۹
[ش]اہد کے نام — (نظم)	مجیبؔ خیرآبادی (الہ آباد)	۱۳
[...]شہ بازی	تلاوت ید اللہی	۱۴
[ح]ضرت سید انوار اللہ شاہ بادشاہ قادریؒ نلنگوی	سید محمد بیا ر[...]	۲۱
[ز]ندگی	محمد یوسف زئی بی اے (عثمانیہ)	۲۷
[غ]زل	جناب مظفر نگری	۳۱
[...]کت کا نقاش — (نظم)	اختر آذری	۳۲
[...]پک بمک	اختر محمود (اکلپ اناتھ)	۳۳
غزل	شہاب بہار (لاہور)	۳۷
[...]ستی	سی ایم ریڈی (عثمانیہ)	۳۸
[...]گل بوٹے	باغبان	۴۲
[...]عر خوشی — (افسانہ)	وحید یوسف زئی	۴۶
[م]شورہ — (نظم)	سلیمان اریب	۴۹
[...]دو گھنٹے — (افسانہ)	سید محی الدین احمد بی اے (عثمانیہ)	۵۰
خواہش — (نظم)	جبرئیل (جبل پور)	۵۴
نئی کتابیں	نواب مرزا سیف علی خاں	۵۵
[ا]ردو شاعری کی خدمت	پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے	۵۶
[ا]دارہ کی خبریں	ادارہ	۵۷ تا ۶۴

[...]سید [...] الدین ایم اے کے اہتمام سے صحیفہ مشین پریس اعظم پورہ میں چھپ کر خیریت آباد سے شائع ہوا

غزل

طلسمِ فکر و فریبِ نظر ہے کیا کہئے
شباب موسمِ دیوانہ گر ہے کیا کہیے

مچل رہا ہے کوئی بات نا تمام ہمیں دل
تری نگاہ کے زیرِ اثر ہے کیا کہیے

ہر التماس پہ کہتے ہیں جانتے ہیں ہم
جب اپنے حال کی ان کو خبر ہے کیا کہیے

حریمِ دل کی مرے راہ پوچھنے والے
مرا خیال تری رہگزر ہے کیا کہیے

رموزِ عشق بتلائے گئے اشاروں میں
حیات فرصتِ رقصِ شرر ہے کیا کہیے

کھلے نہ راہ میں اسرارِ زندگانی کے
ازل سے تا بہ ابد ہم سفر ہے کیا کہیے

کمالِ شوقِ اسیری جنوں نہیں ہمدم
یہ رازِ تربیتِ بال و پر ہے کیا کہیے

زمانہ درپئے آزار اور میں چپ ہوں
ہنوز حوصلۂ درگزر ہے کیا کہیے

یقینِ دورِ مسرت مجھے بھی ہے لیکن
ابھی تو گردشِ شام و سحر ہے کیا کہیے

چمن میں نرگسِ بیدار کو سکوں نہ ملا
وطن مخالفِ اہلِ نظر ہے کیا کہیے

میں فصلِ گل میں دکھاتا نہ دل کے داغ کبھی
وفورِ جوششِ جنوں پردہ در ہے کیا کہیے

سکندر علی وجد

خطبۂ تقسیم اسناد

(جامعہ اسلامیہ علی گڑھ)

(مسلم یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد و انعامات میں آنریبل نواب زین یار جنگ بہادر نے جو خطبہ ارشاد فرمایا اس کے ضروری اجزا کا خلاصہ درج ذیل ہے)

نواب صاحب ممدوح نے مسلم یونیورسٹی سے اپنے قدیم اور خاندانی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"مجھے اس خیال سے اس دعوت کے قبول کرنے کی ہمت ہوئی کہ میرے بعض ارکین خاندان کے جو گہرے تعلقات یونیورسٹی سے رہے ہیں ان کی بنا پر ایک حیثیت سے میرا بھی تعلق یونیورسٹی سے ہے۔ میرے ایک چچا نواب عماد الملک بہادر سید حسین بلگرامی سرسید کی تحریک کے بہت بڑے حامی تھے اور میرے دوسرے چچا ڈاکٹر سید علی بلگرامی علی گڑھ کالج کے ان کارکنوں میں سے ایک تھے جنہوں نے اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں اس وقت جب کہ علی گڑھ کالج یونیورسٹی کی صورت میں منتقل ہو رہا تھا اس کا دستور مرتب کیا تھا اس طرح آپ کو معلوم ہوگا کہ کیوں اس ادارہ کی ترقی اور فلاح سے میں ایک حقیقی اور پائیدار دلچسپی رکھتا ہوں۔

مسلم یونیورسٹی کیا تھی

آدھی صدی سے زیادہ زمانہ گزرا جب سے مسلم تہذیب اور افکار کے ارتقاء سے مسلم یونیورسٹی کا تعلق رہا ہے۔ شاید یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ اس زمانہ میں مسلم ہندوستان کی تاریخ فی الاصل مسلم یونیورسٹی کی تاریخ ہے۔ بہت سے بڑے لیڈر جن کی کوششوں پر مسلمانوں کی تہذیب اور افکار کی ترقی منحصر رہی جیسے کہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مسٹر سرراس مسعود، ان سب کا کسی نہ کسی زمانہ میں مسلم یونیورسٹی سے تعلق رہا تھا۔ اس فہرست میں مجھے جسٹس سید محمود، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کے نام بھی شامل کرنے چاہئیں جنہوں نے اپنے نہ مٹنے والے نشانات مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں چھوڑے ہیں۔ وہ سب ایسے اسباب عمل تھے جو قوت عمل رکھتے تھے اور ان کے اندر ایک قسم کی ایسی خوش مزاجی اور یار باشی بھی تھی جو علی گڑھ کی خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی مسٹر وائس چانسلر! آپ کے طلبۂ ریلوے اسٹیشنوں پر ٹکٹ کلکٹروں کی نگرانی سے بچ نکلتے ہیں

بانی کا مقصد

اس عظیم المرتبت بانی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ہمارے نوجوانوں کے کردار کو بلند کیا جائے ان کے خیال میں کردار کی مناسب تربیت اس عمیق علم سے جو بڑی محنت کے ساتھ سبق کے کمروں اور اور کتاب خانوں میں حاصل ہوتا ہے زیادہ ضروری تھی میری رائے میں کردار کی تربیت کے لیے ضبط و نظم ایک ضروری چیز ہے۔

ضبط و نظم

ہماری یونیورسٹیوں میں ضبط و نظم پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے اس لئے کہ آج جو طالب علم ہے وہی کل اس ملک کا شہری بننے والا ہے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جیسا ہم نے برطانوی قوم کو جلتی ہوئی آگ سے فتحمند نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ جن لوگوں نے لندن کی بمباری اور بموں کی ہلاکت آفرینی کو دیکھا ہے وہ عام لوگوں کے اس ضبط و نظم کی بے حد تعریف کرتے ہیں جو (اس موقع پر) ظاہر ہوا۔ .... یاد رکھئے کہ جنگ کا شور و غوغا ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور جذبات کا سیلاب جاری ہے اور مزاجوں کی گرمی باقی ہے ایسی حالت میں ضبط نفس کی ضرورت اور بھی زیادہ ہوگئی ہے .... جنگ کے زخموں کے اندمال میں بہت وقت صرف ہوگا اور ہمیں اپنی پوری قوت کی ضرورت ہوگی تاکہ ہم اس آنے والے زمانہ سے گزر سکیں جس میں فلاح اور امن یقینی ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم اس بات کو بھی سمجھ لیں کہ دیانت اور

پہاڑوں کی حد بندی محو ہو چکی ہے اور بڑے بڑے فاصلوں کو ہوائی جہازوں نے کم کر دیا ہے۔ اس حالت میں کوئی قوم اپنے ہمسایہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی اور نہ اپنے علاقہ میں سب سے جدا رہ سکتی ہے۔ زمین سکڑ گئی ہے اور اس کی سطح پر کوئی مقام راکٹ اور ایٹم بم سے محفوظ نہیں رہا ہے۔ انسانیت کا مستقبل اب قوموں کی باہمی رفاقت، میل جول اور مفاہمت پر منحصر ہوگا ... ...

ڈگری کے علاوہ بھی کچھ اور

نوجوان طلبہ کو مخاطب فرماتے ہوئے نواب صاحب نے انہیں یاد دلایا کہ "جب تم ایک ایسی یونیورسٹی سے جیسی کہ یہ یونیورسٹی ہے رخصت ہوتے ہو تو تم اپنے ساتھ ایک ڈگری کے علاوہ بھی بہت کچھ لے جاتے ہو۔ اقامتی یونیورسٹی کے بڑے فوائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں ہم آہنگی اور رفاقت کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے کہ دوسروں کی رائے کو سننا گوارا کرو۔ اس لئے کہ رواداری ہی جمہوریت کی روح ہے۔ جب تم اس بات کو تسلیم کر لو کہ کسی ایک مسئلہ کے متعلق دو رائیں بھی ہو سکتی ہیں تو گویا تم نے جمہوریت کی بنیادی حقیقت کو تسلیم کر لیا ... ہمیں معلوم ہے کہ اندھا تشدد آمیز تعصب ... انسانوں کی روح کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا ہے۔ اسلامی مبلغین کے ترغیبی طریقوں کا ذکر کرتے ہوئے سر تھامس ارنلڈ نے لکھا تھا کہ:-

"اسلام کے مبلغ کی روح کلیتہً نہ تو ہم ظالم کی بے رحمیوں تعصب اور غضبناکی میں پا سکتے ہیں اور نہ قصص، کہانیوں کی شخصیتوں کے کارناموں میں۔ جہاں مسلمان جنگ آزما ایک ہاتھ میں تلوار اور ایک میں قرآن لئے ہوئے بتایا جاتا ہے۔ بلکہ یہ روح ہم کو اس خاموش اور سنجیدہ اور محنتی واعظ اور تاجر میں ملتی ہے جو اپنے مذہب کو کرہ ارضی کے ہر گوشہ میں لے کر گیا"... ...

رواداری

میں نے رواداری کا ذکر کسی قدر طویل کیا ہے اس لئے کہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جمہوری طرز زندگی کا رواداری سنگ بنیاد ہے اس لئے بھی کہ آج جب کہ فصاحت و بلاغت کی جگہ عمومی نعروں اور چلتی ہوئی باتوں نے ـــ نے لی ہے اور فنکارانہ ترغیب کے طریقوں کا بدل بن گئی ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم جن کو اسلام سے جمہوری اصول، ورثہ میں ملے ہیں، اس بات کا تہیہ کریں کہ ہر شخص کی بات انصاف اور رواداری کے ساتھ سنی جائے گی۔

. . . .

اہل قلم، شعرا، اور دماغی خصوصیات رکھنے والے نوجوانوں سے میں کہوں گا کہ زمانہ ماضی کا نوحہ اور گزری ہوئی باتوں کا ماتم ہماری قوم کی موجودہ تاریخ کا رخ نہیں بدل سکتا۔ برٹرانڈ رسل کے الفاظ میں - جن کی جوانی کی توانائی، بڑھاپے کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔ میں کہوں گا کہ:-

"سکھنے کی کوشش کرنا چھوڑ دو اور اس کے بجائے نہ سکھنے کی کوشش کرو۔ دنیا کی وسعت میں نکل کر رہو۔ سمندری ڈاکو بن جاؤ۔ بورنیو کے بادشاہ بن جاؤ۔ سوویٹ روس کے مزدور بن جاؤ جو چاہے بن جاؤ مگر اپنا وجود ایسا بناؤ جس میں تمہاری قدرتی ضرورتوں کے پورا کرنے میں تمہاری تمام قوتیں مصروف رہیں"

ان لوگوں کے لئے یہ ایک اچھا علاج جو دنیا کی ویران حالت ... سے آزردہ ہوتے ہیں اور جن کے دل انسانیت کی معیبت سے بیزار ہو گئے ہیں لیکن جو اپنے گھروں میں پڑے رہتے ہیں اور مایوسی کے خیالات میں مبتلا رہتے ہیں اور زندگی کو اپنے گھر کے دروازوں سے باہر نکال دیتے ہیں۔

خواتین

مسٹر وائس چانسلر۔ مجھے یہ معلوم کرکے بڑی خوشی ہوئی کہ خواتین بھی آپ کی یونیورسٹی میں شامل ہیں اور ان کو بھی مردوں کے ساتھ ساتھ ڈگری حاصل کرنے کی اجازت ہے۔ اس صورت میں تو آپ کیمبرج یونیورسٹی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں کیمبرج کے دارالعلوم نے صنف نازک .... کو اپنے سے خارج رکھا ہے۔ یہ تو ہم سب کو معلوم ہے کہ عورت اور مرد کا

مرد کا تفوق قصہ بہت قدیم ہے حضرت آدم کے جنت سے نکالے جانے کے بعد سے اس وقت تک مرد یہی کوشش کرتا رہا ہے کہ اصل تنقیح سے بچ کر نکل جائے اور اسی لئے وہ اپنے شریک زندگی کو اس کے فرائض تو یاد دلاتا ہے مگر اپنی آسانی کے لئے خود اپنے فرائض بھول جاتا ہے لیکن مرد کے اس تفوق کا زمانہ اب گزر چکا۔ اب یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مردوں کی دنیا میں عورتیں بھی کام کرنے کے قابل ہیں کسی مہذب سماج میں اب ان کے حقوق نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

۵۸۵ء مسیحی میں اسقفوں کی مجلس...... میں یہ سوال زیر بحث آیا تھا۔ اس مجلس میں ایک اسقف نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ عورتوں کو انسان نہیں سمجھا جا سکتا۔ مگر بحث و مباحثہ کے بعد دوسرے اسقفوں نے اس بحث کا فیصلہ مدعی کے خلاف کیا اور اس دن سے عورت عقلمندی کی منزلیں یکے بعد دیگرے طے کر رہی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب مرد کی وحشت اور عامیانہ بدتہذیبی عورت ہی کے اثر سے کم ہو سکے گی۔ ..

.... اب تمام دنیا میں ایک انقلاب ہے اور میں تو اس انقلاب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

....

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ ایسے ملکوں میں جیسے کہ ہمارا ہے جہاں کثیر آبادیاں، بہت زیادہ جہالت، زندگی کا یہ پست معیار اور سماجی خرابیاں موجود ہیں عورتوں کا کام گھروں کے اندر ہے۔ جس وقت معاشی دست نگری کا خوف باقی نہ رہے اور مردوں کے ساتھ مساوی حیثیت قائم ہو جائے تو ہندوستان کی عورت اپنے گھر کے انتظام کو درست کر کے ایسی نسلیں پیدا کر سکتی ہے جو شہری ذمہ داریوں کا وزن اٹھا سکیں۔ یہ کام میرے خیال میں زیادہ بڑا اور زیادہ محنت کا کام ہے بہ نسبت اس کے کہ سرکاری دفتروں میں مناسب عہدے

ل جائیں یا ہوائی جہاز میں پرواز کی جائے یا ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر چڑھا جائے۔

علی گڑھ کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ اس کو ہز اگزالٹیڈ ہائی نس حضور نظام حیدرآباد و برار جیسی بلند مقام شخصیت کا چانسلر نصیب ہوا۔ اعلیٰ حضرت کی علم نوازی اور تعلیم کے مقصد کی ترقی کے لئے اعلیٰ حضرت کی آرزو مندی نے ان کے لئے سلطان العلوم کے حق بجانب خطاب کو بہت موزوں بنا دیا ہے۔

....

میں اس موقع پر یونیورسٹی کے ایسے دوسرے مشاہیر کی شخصیتوں کا ذکر کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا۔ جیسے کہ ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی ہیں جنہوں نے مسلمانوں کی تہذیب اور افکار کی نمایاں خدمات انجام دی ہیں ...... آخر میں اس سال کے گریجویٹس کو مخاطب کرتے ہوئے نواب صاحب ممدوح نے فرمایا کہ

علم ایک غم ہے علم در اصل ایک غم ہے۔ اگر وہ تہذیب کے مجتمع خزانوں کی بربادی میں مدد کرے۔ مجھے امید ہے کہ اپنی طالب علمی کے قیمتی سالوں میں جو علم تم نے حاصل کیا ہے وہ تمہیں اس قابل بنائے گا کہ تم وحشیانہ جہل کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ بغیر خوف اور بغیر تعصب کے کر سکو ....

خدائے تعالیٰ صداقت اور حق کے راستے پر تمہاری رہنمائی کرے اور گزرے ہوئے زمانہ کے ساتھ تم ایک عظیم الشان ملک کے قابل سپوت اور اقوام عالم میں اپنی صحیح جگہ حاصل کرنے کے قابل ثابت ہو۔ میں اپنے خطبہ کو اس دعا کے ساتھ ختم کروں گا جو ہمارے محبوب شاعر اور فلسفی سر محمد اقبال نے مانگی تھی ؎

خود کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

(ماخوذ از پیام)

اکیلی عورت

نیلا تم پوچھتی ہو کہ میں تمہارے خطوط کے جواب میں ایسی پراسرار خاموشی کیوں اختیار کئے ہوئے ہوں کہ تمہیں اپنی نئی ازدواجی زندگی کا ایک لفظ بھی سنانا نہیں چاہتی، تم یہ کیسے سمجھ بیٹھی ہو کہ میں شیام کے ساتھ رنگ رلیوں میں ایسی محو ہوں کہ نہ صرف تم بلکہ کالج کی تمام ساتھی سہیلیاں بھی فراموش ہو گئیں۔ تم تو رہگذار کی رفیق نہیں نیلا بلکہ میری روح اور میری زندگی ہو۔ تمہارا ہی تو سہارا لیکر میں نے کالج کی زندگی کے تمام منازل طے کئے ہیں۔ میرے حواس ابھی جواب نہیں دیئے ہیں کہ میں نیلا کو بھول جاؤں اور اسے پہچان بھی نہ سکوں۔ میری طویل اور پراسرار خاموشی ایک دردناک حقیقت ہے۔ انہی خاموش دنوں میں میری زندگی کا جنازہ نکل چکا ہے۔ نصیب کی کمی ساری خوشیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا کی گود میں سو چکیں۔ نیلا بہن! اب میں ایک ٹوٹا ہوا رباب ہوں جس سے کوئی نغمہ نہیں نکل سکتا۔ تم مجھ سے کالج کی چہلیں بیان کرتی ہو اور مجھ سے چاہتی ہو کہ شیام کا حال سناؤں۔ اگر تم میری بدنصیبیوں اور محرومیوں کی دردناک داستان سننے کی سکت رکھتی ہو تو میرے پتی، شیام کی داستان بھی سن لو۔ اور میری زندہ موت کا ماتم کرتی رہو۔ یہ نہ سمجھو نیلا کہ شیام کا مزاج، نصیب دشمنان ہو گیا ہے۔ بلکہ میری تقدیر تقدیر دشمنان بن چکی ہے۔ یہ جان کر درد و غم میں ڈوب نہ جاؤ کہ شادی کے تین چار مہینے بعد ہی میری تقدیر کیوں پھوٹی۔

شیام کچھ عجیب سا جوان ہے۔ بہکا بہکا، اپنے خیالوں میں گرفتار، نگاہوں میں معمے، حرکتوں میں چھپی داستانیں، گفتگو میں خاموشی، خاموشی میں پہیلیاں۔ اس کو بوجھنے چلی تو اپنا پتہ بھی بھول گئی۔ اس رات جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تو ایک اچنبھے میں پڑ گئی کہ پرماتما نے مجھے کس وحشی کے پلے باندھا ہے۔ لیکن نیلا میری زندگی اس کی زندگی سے وابستہ ہے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ اس کی اس اداس طبیعت میں قرار پیدا کروں لیکن معلوم ہوا یعنی ہمارے بیاہ کے دوسرے ہی مہینے گوشہ کے آشرم میں چلا گیا۔ اس نے دنیا چھوڑ دی۔ سب کو تیاگ دیا غریب اور آتما کے پھندوں میں گرفتار ہو کر چلا گیا۔ بھائی بہن ماں باپ اور میں، بلکہ تمام رشتوں ناطوں کو محروم و مایوس بنا کر آشرم میں جا بیٹھا۔ آشرم میں جیسے اس کی آتما کو چین نصیب ہونے والی ہے۔ نیلا وہ آشرم چلا گیا ہے اور اب کون جانے کہ وہ کبھی لوٹے گا بھی یا نہیں۔ میں اس کے بغیر یہاں رہ کر کیا کرتی تھی۔ عورت کا آشرم، اس کی دنیا اس کی کائنات بھی تو اس کا پتی ہے میں بھی انہی قدموں پر چل نکلی۔ میرے آشرم پہونچنے سے وہ بگڑ بیٹھا۔ قہر و غصہ کا دیوتا بنا ہوا مجھ پر برس پڑا۔ میری ساری کوششوں کے باوجود وہ رام نہ ہو سکا۔ آشرم والوں کو بھی میرا قیام گراں گزر رہا تھا۔ گرو دیو نے سادھو چیلوں نے کہا کہ آشرم میں ایک سندری آئی ہے جو بی۔ اے پاس ہے اور اسکول میں لڑکیوں کو پڑھاتی بھی ہے۔ شاید شیام کی بیوی ہے۔ لیکن اس کا قیام آشرم پر کلنک کا ایک ٹیکہ بن جائے گا۔ مہاراج نے مالا جپتے ہوئے آنکھیں بند کئے شیام سے کہا کہ وہ مجھے آشرم سے چلے جانے کو کہہ دے۔ اس کو بھی آشرم میں جگہ نہ مل سکے گی۔ شیام بے پناہ بنا ہوا میرے تار و پود بکھیرنے چلا آیا۔ میں سوائے اس کے اور کیا کر سکتی تھی کہ آشرم سے گھر واپس چلی آؤں۔

نیلا میں درد و غم کی اسی دنیا میں سانس لیتی ہوئی ماتم کناں تھی کہ ایک اور پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ شیام کی ماں نے کہا کہ وہ میری وجہ سے آشرم چلا گیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک میم بیاہ لائے جو نہ گھر کی لاج ہو سکتی ہے اور نہ ایک بیوی بن سکتی ہے۔ اسکول اور کالج کی پڑھی لڑکی کی آنکھوں کا پانی مر جاتا ہے۔ شرم و حیا انہیں مس بھی نہیں کرتی اور پھر اس پر طرفہ یہ کہ اب بھی یہ لڑکیوں کو پڑھاتی ہے جنگلی کی لڑکیاں جو آج اپنا فیصلہ آپ خود کر رہی ہیں، ہے معلوم نہیں

زمانے کو دیکھ کر ہی شیام ڈرا ہے۔ اسی بیم سے خوفزدہ ہو کر وہ بھاگ کھڑا ہوا ہے۔ نیلا میں نے تعلیم پا کر رہنے سہنے کے آداب کو تہذیب عطا کی ہے لیکن ان آداب کو کبھی فراموش نہیں کیا ہے جو ایک بیوی کا زیور ہیں۔ شیام کی دماغی اور خیالی الجھنوں کو رفع کرنے کی میں نے پوری کوشش کی ہے۔ لیکن اس پر گرو دیو، گوسائیں جی اور آشرم کے بھوت سوار تھے۔ ان بھوتوں کا مقابلہ ایک مجبور عورت کیا کر سکتی ہے جس کی مخالفت میں گھر کی بڑھی بوڑھیاں بھی ایک پلٹن بن کر نکلی ہوں۔ شیام چلے جانے کے بعد ماں کے طعنے کوسنے اور مجھ ہی پر سارا الزام مجھے دیوانہ بنا رہے تھے۔ لیکن نیلا پھر بھی میں خاموش رہی۔ ماں کو خوش کرنے کی خاطر میں نے اسکول کی ملازمت بھی چھوڑ دی۔ لیکن ان کی نظروں میں میں ایک خار ہی رہی۔ مجھ اسکول کی استانی سے انھیں شکایت ہی رہی کہ میرے رکھ رکھاؤ ہی کو دیکھ کر وہ ڈرا ہے۔

نیلا اس دیس میں استانی اور نرس کبھی تقدس و عفت کا احترام حاصل نہیں کر سکتے استانی اور نرس، سماج کی تمام عورتوں نے انھیں اپنے مقام سے بے دخل کر دیا ہے چونکہ یہ مخلوق مردوں سے آنکھیں ملاتی ہے اور ہر ایک کے درد و غم میں بے حجابانہ شریک ہوتی ہے۔ استانی اور نرس کو دیکھ کر دیویاں اپنا دامن بچا لیتی ہیں۔ استریاں سائے سے بھاگ کھڑی ہوتی ہیں اور کھسر پھسر شروع ہو جاتی ہے کہ یہ پڑھی لکھی عورتیں جو بھی قیامت ڈھائیں وہ کم ہے۔ طعن و طنز کے انہی نشتروں سے زخمی، درد و کرب کے مارے آہیں بھرتی رہی لیکن یہ زخم اور بڑھتے گئے، گہرے ہوتے گئے۔ کسی نے یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں نے شیام کو آشرم کیسے بھیجا۔ کیا میں اپنے پتی کو چھوڑ کر اپنی سہاگ کی بربادی گوارا کر سکتی ہوں؟ ہمارے ملک کا دھرم یہی ہے کہ اپنی بربادیوں اور ناکامیوں کا ذمہ دار انھیں بنایا جائے جو یہ سب سن سکتے ہیں اس کے جواب میں کچھ کہہ نہیں سکتے

نیلا، میں اسی درد و غم کے اتھاہ سمندر میں ہچکولے کھا رہی تھی، نہ کوئی لنگر اور نہ کہیں بادبان کہ اس کے سہارے آگے بڑھ سکوں۔ ان دنوں تمہارے اور دوسری سہیلیوں کے خطوط آتے رہے جنھیں پڑھ کر مجھ میں ایک بھونچال آ جاتا تھا۔ روز، لکھتی تھی ساری رات میں نارمن کے ساتھ سمندر کی سیر کرتی رہی۔ نجمہ شفیق نے کشمیر سے خط بھیجا تھا کہ وہ جھیل ڈل کی رنگینیوں میں غرق ہیں۔ پاروتی اپنے شوہر کی شرارتوں کا ذکر کرتی تھی۔ ارمیلا کہتی ہے کہ اس کا شوہر دھوئیں کے مرغولے یوں چھوڑتا ہے کہ وہ اس کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں جس پر وہ کہتا ہے چاند ہالے میں گرفتار ہے۔ نیلا یہ سب پڑھ کر میرا قرار بے قراریوں کا روپ دھار کے مجھ سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ مجھ میں ایسی حرکت بیدار ہوتی ہے کہ میں دو جہاں پر چھا جانا چاہتی ہوں۔ چاند، ستارے، بادلوں کے جزیرے، غرض کائنات کے سارے حسن سے کھیلنا چاہتی ہوں۔ نیلا، میرے ٹوٹے ہوئے رباب سے بھی نغمہ تڑپ اٹھتا ہے۔ لیکن نیلا۔ میں وہ چنگاری ہو گئی ہوں جو راکھ میں بجھی جا رہی ہے۔

ماں کے نشتروں سے زخمی اور نڈھال ہو کر میں پھر آشرم پہونچی کہ شیام کو واپس لا سکوں۔ لیکن وہ اب کبھی نہیں لوٹ سکتا۔ اس کی جٹائیں اور سینے تک لہراتی ہوئی داڑھی اس بات کا ثبوت ہو چکی ہے کہ وہ آشرم ہی میں اپنی سمادھ بنا لے گا۔ مجبور ہو کر میں نے شیام سے کہہ بھی دیا کہ مجھے شرعاً چھوڑ دو اور دوسری نئی زندگی کی اجازت دو۔ میں نے کونسا قصور کیا ہے کہ تمہارے لئے میں بھی زندگی کو طعن و طنز کی آگ میں جھلسنے دوں۔ لیکن خدا کا بندہ صاف انکار کر گیا۔ وہ مجھے تو صرف تڑپانا اور جلانا چاہتا ہے۔ اب میرے لئے کیا رہا کہ زندگی کے حسین تصور کو اپنے میں آنے دوں۔

نیلا، تم ہی کہو کہ شیام کے آشرم چلے جانے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری ہے؟ وہ ناری کی اندھیر ... [illegible]

اپنے ساتھ میری دنیا کو کیوں خراب کرتا ہے۔ وہ مجھے کیوں فنا کر رہا ہے۔ اس دیس کی یہی ریت ہے۔ لڑکیاں قربانی کے جانور ہیں جو مردوں کی خوشی کے لئے بھینٹ چڑھتی ہیں۔ اسلم پاگل تھا جب اس پر دورے پڑتے تھے وہ نیک اور بد کا کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا لیکن پھول سی نازک اور گلاب کی پنکھڑی شاہدہ اس کے ساتھ بیاہی گئی جانتی ہو تم پھر کیا ہوا۔ اسلم پاگل خانہ گیا اور شاہدہ مدن پلی کے سینی ٹوریم میں شریک کی گئی۔ مہندرا قلب کا مریض تھا۔ لیکن ڈاکٹروں نے اسے رائے دی تھی کہ اگر وہ بیاہا جائے تو اس کا مرض جاتا رہے گا۔ کملا اس کی بیوی بن کر آئی مگر کچھ ہی دنوں بعد قلب کے مریض نے کملا کو مفارقت کا دائمی مرض عطا کر دیا۔ اور میں شیام کے آشرم کے جنون پر بھینٹ چڑھ رہی ہوں۔ اس دنیا میں بیویاں اپنے شوہروں کی باندیاں ہی بن کر نہیں رہتی ہیں بلکہ بھینٹ چڑھنے کے لئے بھی پیدا کی جاتی ہیں۔ عورت کی تقدیر ہی میں لکھا ہے کہ وہ اپنی بربادیوں پر اُف نہ کرے۔ ان ناانصافیوں کے خلاف اگر کوئی جہاد کرنے کا ارادہ کرے تو وہ مسمار کر دیا جائے گا۔ یا ستی کی رسم دوبارہ شروع کر دی جائے گی کہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بنسری۔

شیام کے باپ کہہ رہے تھے کہ اس نئے زمانے نے دھرم کو بھی بگاڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بڑے اچھے دن تھے جب کہ شوہر کے مرنے پر اس کی بیوی بھی چتا میں جل کر پہنچے اپنے شوہر کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ اب یہ طریقہ اٹھ گیا ہے زمانہ میں کیسی کیسی برائیاں پھیل رہی ہیں۔ بیوہ لڑکیاں مردوں سے مشغول کرتی ہیں۔ تم نے اس گفتگو کا مطلب نہیں سمجھا، نیلا وہ ستی پر اس لئے غور کر رہے تھے کہ بیوہ عورتوں کے لئے طریقہ مفید تھا لیکن ان عورتوں کے لئے یہ طریقہ مفید ہو سکتا ہے جن کے شوہر زندہ ہوں لیکن آشرم میں پناہ گزیں ہوں۔ وہ یا تو مجھے جلا دینا چاہتے ہیں یا قید کر دینا چاہتے ہیں تاکہ ان پر کلنک کا کوئی ٹیکہ نہ لگنے پائے۔ مجبوریوں اور لاچاریوں کے اس پشتارے کو لیکر میں نہ جانے کدھر چلی جا رہی ہوں۔ کالج میں شکسپیر کا انٹونی اور قلوپطرہ اور رومیو و جولیٹ جب پڑھتی تھی تو مجھے زندگی پیاری لگتی تھی۔ جب کالج چھوڑ کر زندگی میں چلی آئی تو کالج کے وہ دن ہی بھلے معلوم ہوتے ہیں جس میں دور کے ڈھول ہی سہانے تھے۔ اس دنیا میں شیام بھی بستا ہے جس کو آشرم کی پروا ہے جو زندگی کی حقیقت کو پہچاننا چاہتا ہے روح اور جسم کے تعلقات سے پردے ہٹا رہا ہے لیکن ایک عورت کا دل نہیں پڑھ سکتا۔ اس کی نگاہوں کو پہچان نہیں سکتا۔ اس کی دھڑکنوں کو سن نہیں سکتا۔ ایک عورت کی بربادی پر وہ اپنے عرفان کا محل تعمیر کر رہا ہے۔

نیلا شیام کی ماں صبح سے مجھ پر طعن و طنز کر رہی ہے کہ میرے قدموں کی برکت سے اس کا چاند سا بیٹا ہاتھوں سے جاتا رہا۔ اگر مجھ سے ممکن ہوتا تو میں شیام کی جٹائیں پکڑ کر آشرم سے کھینچ لاتی اور محبت کی ماری ماں سے کہتی کہ اپنے لاڈلے سے پوچھو وہ آشرم کیوں گیا؟ اپنی ماں کے محبت بھرے دل کو کیوں دکھ پہنچایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اگر مناسب سمجھو تو پوچھو کہ ایک جوان لڑکی کی زندگی بھی کیوں تباہ کر گیا؟

نیلا میں یہی سوچتی رہتی ہوں کہ کیا ہمارے ملک میں کوئی ایسا شخص بھی پیدا ہوگا جو آشرم جانے والوں سے نوجوان لڑکیوں کو بچا کر انھیں زندگی عطا کر سکے۔ میں بھی یہ طاقت رکھتی ہوں کہ آشرم جانے والوں کو آشرم جانے دوں لیکن ان کے ساتھ ایک دوسری زندگی بھی تباہ ہونے سے بچا لوں۔ لیکن نیلا میں اکیلی ہوں' کام بہت دشوار ہے اور راستہ میں بڑی مشکلات ہیں۔ اگر کوئی ساتھی مل جائے تو میں ناانصافیوں سے لڑنے چل نکلوں۔ لیکن ابھی میں اکیلی ہوں۔ تنہا۔ اکیلی ـــــ وقت اور ساتھی دونوں کا انتظار کر رہی ہوں۔

محمد محبوب حسین جگر

دیکھ رہی ہے۔

یہ بات بالکل قدرتی اور تقریباً لازمی ہے کہ ہم لوگ یعنی اس فرقہ کے موجودہ آدمی جن کی تربیت ایسے اشخاص نے کی ہے جو انھیں ان کی زندگی میں دیکھ چکے ہیں ـــ اپنے قائدوں اور فادر جان ہنری نیومن کو احترام کے ساتھ یاد رکھیں۔ یہ مکان مقدس روایات کا حامل ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں ڈین ہیرٹ اسے صرف ہولی فادر سینٹ فلپ نیری اپاسل آف روم سے دوسرے درجہ پر سمجھتا ہے۔

یہ صورت حال اعتراضات سے بالاتر ہے۔ ہم ان سے ذاتی اور نجی عقیدت رکھتے ہیں کیونکہ ہم پر ان کے بہت سے احسانات ہیں اور ہم ان کے ساتھ بہت سے رابطے رکھتے ہیں۔ ایک بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی لیاقت اور ذہانت کی وجہ سے رومن کیتھولک مذہب کو وہ کونسے فائدے حاصل ہوئے جن کی وجہ سے وہ دنیا کے احترام کے مستحق ہیں۔ وہ ۹ اکتوبر ۱۸۴۵ء کو کلیسائی نظام میں داخل ہوئے جس کی رسم اس سال صد سالہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ اسے کیوں ایک اہم واقعہ سمجھا جائے؟

نیومن نہایت ممتاز تھے مگر وہ کلیسا میں کوئی سرکاری حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک برطانیہ کے ایک قصبے میں ایک چھوٹی مذہبی جماعت کے رہنما رہے۔ لیکن حالات کے تقاضے سے یا اپنی ذاتی ترجیح کی وجہ سے برطانیہ کے کلیسائی معاملات کے ہنگاموں سے الگ رہے۔

وہ ان معاملات سے اس قدر الگ تھلگ رہتے تھے کہ ۱۸۶۳ء میں ایک خط میں انھوں نے لکھا کہ میں لوگوں سے عجیب و غریب طریقہ سے منقطع ہو گیا ہوں۔ اس وجہ سے میں نہیں جانتا کہ کیا کام ہو رہا ہے، کیا ہونا چاہیے اور اسے کون کر رہا ہے۔ جب انھیں ویٹیکن کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انھوں نے اسے بھی رد کر دیا اور کہا کہ میں اپنی قابلیتوں اور کامیابیوں کے لحاظ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی بڑے مذہبی مقصد کو ترقی دے سکوں۔ چنانچہ ہنری بریمنڈ نے جو فرانسیسی تھے اور نیومن سے عقیدت رکھتے تھے کہا کہ "وہ بہت بڑے راہب تھے اور انھوں نے اپنی مرضی سے فقیری اختیار کی تھی۔"

نیومن کو جو اثر حاصل تھا وہ ان کے مرتبہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کی وجہ سے تھا اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا اثر پڑا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے صاحب طرز انشا پرداز تھے اور ان کی تحریریں انگریزی نثر میں ایک خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ان کی قدر و قیمت کا گھٹا کر اندازہ لگاتے تھے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کے کثیر موضوعات پر کتابیں لکھنے پر اعتراض نہ کریں چنانچہ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں کہا تھا۔ "مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں نے نہایت کثیر موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں کیونکہ اس طرح سطحیت پیدا ہو جاتی ہے۔"

بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتابوں کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی اور انھیں اپنی مرضی سے منتخب نہیں کیا، بلکہ اپنے فرائض اور حالات کے تقاضے کے مطابق کتابیں لکھیں۔ اس وجہ سے وہ وقتی کتابیں ہیں (جیسی کہ انگریزی کی اکثر کتابیں ہوتی ہیں) یا آزمائشی۔ وہ اپنے انکسار کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ انھیں آزمائشی ہی ہونا چاہیے۔ ان کی دو کتابیں نہایت زبردست ہیں مگر انھیں بھی مضامین کہا گیا ہے۔

جو لوگ خاص موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں ان پر انھیں رشک آتا تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے موضوع کے متعلق قابل اطمینان طریقہ سے ساری باتیں پورے طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ شاید یہ درست ہو۔ مگر ہم ان کی ۴۰ کتابوں کو الگ کر کے ان کی جگہ اپنے پاس چند ایسی علمی کتابیں نہیں رکھ سکتے جو اب تقریباً لازمی طور پر پرانی ہو گئی ہیں۔

لیکن پوپ لیو سیزدہم نے کارڈینل نینا کے ذریعہ جو خط بھیجا تھا اس میں انھوں نے نیومن کو کارڈینل کا اعلیٰ منصب عطا کرنے کی خواہش کا اعلان کیا تھا اور اس کی یہ وجہ بتائی تھی کہ نیومن ذہین عالم، پارسا اور جوشیلے ہیں اور "ہولی سی" کے وفادار ہیں۔

نیومن نے ۱۲ مئی ۱۸۷۹ء میں بگلیٹو میں جو تقریر کی اس میں انھوں نے اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد یہ بتایا کہ "مذہب میں آزادی کے جذبہ کی مخالفت کی جائے" یعنی ایسے معاملات میں خیال آرائی کی مخالفت کی جائے جن میں انسانی دماغ غور کر کے کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے خیال میں ان معاملات میں ابتدائی اصول شامل ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مقدس اور اہم وحی کے حقایق ہیں اور وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام رسول پر نازل ہوتا ہے۔

لڑکپن میں نیومن کے ذہن میں جو اصول بیٹھ گئے تھے ان کے نقوش کبھی مدہم یا زائل نہیں ہوئے۔ آکسفورڈ میں انھیں لبرل پارٹی کے مقابلہ میں کام کرنا پڑا۔ ٹریکٹیرین تحریک کے تحت وحی کے حقایق کا اعلان ان لوگوں کے مقابلہ میں کیا گیا جو ان کے متعلق شبہ رکھتے تھے یا ان کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ لبرل پارٹی ہی نے انھیں آکسفورڈ سے نکال دیا۔

تھوڑے عرصہ کے بعد لبرل تحریک الحاد کا ایک بڑا فتنہ بن گئی۔ ہر جگہ اس کی ایک ہی حیثیت تھی۔ مگر ایک ملک کی بہ نسبت دوسرے ملک میں اس کے مظاہرے کی شدت میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ نیومن ابتدا ہی سے اس تحریک کو "اصولی مذہب" کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے۔ اور وہ اس تحریک کی مخالفت اور اصول کی حمایت کے سلسلہ میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھے۔

انھوں نے انگلستان کے کیتھولک آدمیوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا اور ترغیب دی کہ وہ فکر و نظر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلیں۔ انھوں نے ۱۸۵۱ء میں ایک لکچر میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ عام لوگ اپنے مذہب سے واقف ہو جائیں جو اپنی حیثیت کو سمجھیں جو یہ سمجھیں کہ ان کے پاس کیا چیز ہے اور کیا نہیں ہے۔ جو اپنے مذہب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتے ہوں کہ اس کی وضاحت کر سکیں، اور جنھیں تاریخ کا اتنا علم ہو کہ اپنے مذہب کا دفاع کر سکیں میں چاہتا ہوں کہ عام آدمی اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔ آپ اپنے علم کو وسعت دیں۔ استدلال کی قوت بڑھائیں۔ چیزوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کریں۔ یہ سمجھیں کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ عقیدہ اور عقلیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ کیتھولک مذہب کی بنیاد اور اصول کیا ہیں۔ اگر آپ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کریں تو آپ کی مذہبیت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوگی۔ بشرطیکہ آپ کو اس بات پر اعتقاد ہو کہ آسمان پر خدا موجود ہے اور آپ کی روحوں سے حساب لیا جانے گا اور انھیں نجات حاصل کرنی ہوگی"

مگر انگلستان ان کے نصب العین پر پورا نہیں اترا۔ انھوں نے ۱۸۶۳ء میں ایک یادداشت میں شکایت کی کہ "انگلستان کے کیتھولک آدمی اپنے نابینا ہونے کی وجہ سے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ وہ نابینا ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خیال ہے کہ کیتھولکوں کی حالت اور مرتبہ کو ترقی دینے کے لیے کیتھولکوں کی حیثیت کی استدلالی بنیاد اور فلسفہ اور موجودہ زمانہ کی خصوصیت کے باہمی تعلق کا احتیاط سے جائزہ لینا ان میں وہ معقول خیالات پیدا کرنا اور ان کے دماغوں کو روشن کرنا مختصر یہ کہ انھیں تعلیم دینا فضول مشغلہ ہے بلکہ توہین ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ٹھوس دلائل کی کمی ہے۔ اب شروع سے آخر تک میرا کام یہ ہے کہ تعلیم ان وسیع معنوں میں دی جائے"

چونکہ انھوں نے برابر اس قسم کے خیالات ظاہر کیے اس لیے بعض حلقوں میں ان پر طرح طرح کے

اعتراضات کئے گئے زیادہ تعلیم یافتہ کیتھولک کی کم عزت کی جاتی تھی اسی وجہ سے انھوں نے ۱۸۶۳ء میں لکھا "میں محسوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ حلقوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ قسیس پادریوں اور غریبوں پر مشتمل ہے اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مردوں اور عورتوں کو ایک حد تک [illegible] جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ [illegible] ہیں اور وہ کیتھولک جماعت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے اس لئے اگر ممکن ہو تو انھیں تباہ کر دیا جائے۔ اس طرح بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔" اس نظریہ کے خلاف ان کی یہ رائے تھی کہ تعلیم یافتہ لوگوں سے انہی کے مفاد کی خاطر رجوع کیا جانا چاہئے [illegible] ان کا احترام کیا جائے۔ نیز ان سے مصالحت کی جائے کیونکہ دوسرے طبقوں پر ان کا اثر ہے۔ ہم لوگ جنہیں نیا دور دیکھنے کا موقعہ ملا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیومن اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تعلیمی ترقی کے حامی تھے۔

ان رہنماؤں کا موجودہ کیتھولک مذہب پر بہت اثر پڑا ہے اس وجہ سے وہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں۔ انھیں اپنی بڑھی ہوئی روحانیت کی وجہ سے ان باتوں کا احساس ہوا تھا۔ ایک غیر کیتھولک شخص نے جو ان کو جانتا تھا ان کے متعلق لکھا ہے "وہ خدائی روشنی سے زیادہ قریب تھے اور یہ قربت بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوتی ہے نیز انہیں اس روشنی سے فیض حاصل تھا"

اس سلسلہ میں فادر اگنیشس رائڈر کی تصدیق خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ وہ ان کے ماتحت بچپن سے کام کرتے تھے اور ۴۰ سال تک کام کرتے رہے تھے۔ انھوں نے بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے لیکن زیادہ موثر اور واضح پیرائے میں "نیومن کی باتوں سے ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خدائے بزرگ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی باتیں لازمی طور پر موثر ہوتی تھیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے خلاف بچوں کو نرمی سے سمجھاتے تھے اور ان کے رفیقانہ انداز سے بچوں پر ان کی بات کا جلد گہرا اثر ہوتا تھا۔"

ہنری بریمونڈ نیومن کی عمدہ گفتگو خاص طنز اور عمدہ نثر نگاری سے اتنے متاثر نہیں جتنے وہ ان کی کتابوں کے کرداروں سے متاثر ہیں اور انہی کے ذریعہ بریمونڈ نیومن کو حقیقی طور پر سمجھا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ نیومن کی خداداد قابلیتوں اور ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس بات کا ان کے اہل وطن پر زیادہ اثر ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت خدا کو حاضر و ناظر محسوس کرتے تھے۔ اس وجہ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں پر مسلک کے امتیاز کے بغیر ایسا گہرا اثر پڑا جیسا انگلستان میں کسی دوسرے پادری کا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"شاہد کے ___ نام"

آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

بادۂ تلخ سے لبریز ہے یہ جامِ حیات
کتنی صدیوں سے جواں ہیں غمِ آلامِ حیات
کتنی افسردہ و غمگین سی ہے شامِ حیات
زندگی آج بھی اک بارِ گراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

نغمۂ شوق کوئی جھوم کے گائے بھی تو کیا؟!
سر بہ سر غم کی حکایت ہے سنائے بھی تو کیا
پردۂ جبرِ مشیت کو اٹھائے بھی تو کیا!
کیوں مری سمت یہ حیرت نگراں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

کتنے سینوں میں ہے گھٹتی ہوئی آہوں کا دھواں!
یہ تبسم کا مزار! آہ یہ قلبِ انساں!
چلتی پھرتی ہوئی لاشوں کا یہ مدفن یہ جہاں!
مری نظروں پہ غمِ دہر عیاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

غنچۂ گل کا خزاں بار تبسم بھی اداس
زہرہ و اختر و پروین کا ترنم بھی اداس
مہ جبینانِ سمن بر کا تکلم بھی اداس
زندگی دردِ مسلسل ہے فغاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

ہر مصیبت میں جو خنداں تھا۔ وہ دل ٹوٹ گیا!
جو ہر اک درد کا درماں تھا۔ وہ دل ٹوٹ گیا!
جو حریفِ غمِ دوراں تھا۔ وہ دل ٹوٹ گیا!
مضمحل اب وہ دلِ گرم و جواں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

اور بھی غم ہیں زمانے میں، محبت کے سوا
اور افسانے بھی ہیں تیری حقیقت کے سوا
فرض کچھ اور بھی ہیں عشرت و راحت کے سوا
زندگی صرف محبت ہی کہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

جا، یہ عزمِ بغاوت کو جگانے کے لئے!
مادرِ ہند کو آزاد کرانے کے لئے!
تجھ سے، جاتا ہوں بہت دور نہ آنے کے لئے!
منتظر کشمکشِ دورِ جہاں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

رخصت! اے دوست کہ منزل نے پکارا ہے مجھے!
رخصت! اے دوست جدائی بھی گوارا ہے مجھے!!
رخصت! اے دوست کہ طوفاں کا سہارا ہے مجھے!!

عزمِ محکم پہ مرے اب بھی گماں ہے اے دوست!!
آہ افسانۂ بے چارگیٔ شوق نہ پوچھ!

مجیب خیرآبادی

سٹّہ بازی

(۱) حیدر .... سٹہ باز نوجوان
(۲) تراب .... حیدر کا باپ (امیر آدمی)
(۳) تنویر .... حیدر کی بیوی
(۴) اعظم، اسلم، رستم ..... حیدر کے اوباش احباب

بجلی طوفان۔ بادلوں کی گرج۔
(بارش اور نرم ساز کے ساتھ تیز تیز چلنے کی آواز۔
گھڑی نو گھنٹے مارتی ہے۔ قدم؟ دروازے پر
کھٹکا۔ کھلنے کی آواز)

حیدر۔ تنویر!
تنویر۔ جی! اندر آجائیے بارش تیز ہے۔ (اندر آنے کی
اور دروازہ بند ہونے کی آواز)
حیدر۔ (چلتے ہوئے) ابا نے پوچھا تو نہیں؟
تنویر۔ جی نہیں!
حیدر۔ ابھی تک جاگ رہی تھیں؟
تنویر۔ جی! نہیں تو!۔
حیدر۔ جھوٹی! تمہاری آنکھیں بتلا رہی ہیں۔ کتنی بار کہا
میرا انتظار نہ کیا کرو۔ راتوں کو دیر گئے آنے
کا عادی ہوں۔
تنویر۔ کھانا نہیں کھائیے گا؟
حیدر۔ ہوٹل میں کب کا کھا چکا!
تنویر۔ گھر سے زیادہ آپ کو باہر کی چیزیں بہت پسند
آتی ہیں؟
حیدر۔ تم نے کھانا نہیں کھایا؟
تنویر۔ آپ کو اس سے کیا!
حیدر۔ خفا معلوم ہوتی ہو؟
تنویر۔ میں شروع ہی سے بدنصیب ہوں۔

حیدر۔ اور —— کیا کہتی ہو؟!
تنویر۔ میں آپ کے لایق نہیں تھی۔
حیدر۔ تنویر! کیا ہو گیا تمھیں؟
تنویر۔ جب ہی تو آپ راتوں کو باہر باہر رہتے ہیں۔
حیدر۔ مجھے غلط نہ سمجھو تنویر!
تنویر۔ تنویر! خود سراپا غلط ہے۔ کاش! مجھ میں وہ
سب کچھ ہوتا جو کسی اور میں ہے۔
حیدر۔ تنویر!! مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں آنا پیچ نہیں ہوں۔
تنویر۔ (گلوگیر آواز میں) پھر کہاں رہتے ہیں آپ؟ برسات
کی بھیگی راتیں۔ چاندنی دلفریب چاندنی کیوں بے معنیٰ
ہو گی؟ کیوں اداس ہو گی؟
حیدر۔ بس کرو تنویر! تم کافی بدگمان ہو چکی ہو میں سب کچھ
بتا دوں گا۔ لیکن وعدہ کرو ابا جان سے کچھ نہ کہو گی؟
تنویر۔ منع کرنے کے بعد میری کیا مجال ہو سکتی ہے۔
حیدر۔ تم دیکھو گی بس عنقریب دولت مند آدمی بن جاؤں گا
سو سنار کی چل رہی ہے ایک لوہار کی چلنی ہے بس اسی کا
انتظار ہے۔
تنویر۔ میں کچھ بھی نہیں سمجھی۔
حیدر۔ میں نے کہا —— دولت بہت جلد ہمارے گھر کی لونڈی
ہو جائے گی۔
تنویر۔ لیکن دولت تو دن کے وقت کمائی جاتی ہے؟
حیدر۔ یہ کھیل ہی ایسا ہے جو رات کی تاریکی میں ہوتا ہے۔
تنویر۔ او خدا!! مجھے تو آپ سے ایسی امید نہ تھی۔ خدا کے لئے
ایسا غضب نہ ڈھائیے۔ اپنا نہیں تو ابا جان کی
عزت کا خیال کیجئے۔ ان کو دنیا میں منہ دکھانے
کے لایق رکھئے۔
حیدر۔ بے وقوف پاگلوں کی طرح کیا بک رہی ہو؟ میں چوری
تھوڑی کر رہا ہوں۔
تنویر۔ خدا نہ کرے۔ لیکن شریف لوگ دن کے وقت دولت
کمانے کی فکر کرتے ہیں نہ کہ رات کے اندھیرے میں۔

حیدر۔ لیکن سٹہ تو........

تنویر۔ (بات کاٹ کر) سٹہ!!!۔۔۔ سٹہ کھیلتے ہیں آپ؟

حیدر۔ ہاں اور سٹہ بازوں کی قسمت کا فیصلہ رات کی تاریکی میں ہوتا ہے۔

تنویر۔ جو دولت اندھیرے میں آتی ہے وہ اندھیرے میں رہتی ہے اور اندھیرے ہی میں جاتی ہے۔ حیدر! خدا کے واسطے اسے چھوڑ دو۔ بُری لت ہے۔ بیکار عادت ہے۔ تباہ کن مشغلہ ہے۔ اس وبا نے ہزاروں گھر بے چراغ کر دیئے۔ غریبوں کو کنگال اور امیروں کو افلاس کے گندے کیچڑ میں ٹھونس کر رکھ دیا۔

دروازے کو زور زور سے مارنے کی آواز۔۔۔

تراب۔ (باہر سے) دولہن بیٹی دروازہ کھولو!

تنویر۔ اوخدا! آباجان!!! (سرگوشی کے انداز میں)

حیدر۔ جاگ رہے تھے؟!

تنویر۔ شاید۔

تراب۔ دروازہ کھولو بیٹی! دولہن بیٹی!

تنویر۔ جی! آئی اباجان۔

حیدر۔ تنویر! میں سو جاتا ہوں

تنویر۔ (ہچکچاتے ہوئے) اچھا۔ اچھا! (دروازہ کھلنے کی آواز۔۔۔ بھاری بھاری قدم اندر داخل ہو جاتے ہیں)

تراب۔ حیدر! کب آیا؟

تنویر۔ جی وہ۔۔۔ جی وہ تو جب ہی......

تراب۔ یعنی کب؟!

تنویر۔ یعنی یعنی۔ کوئی نو بجے کے قریب۔

تراب۔ کیا کہنا؟ دولہن بیٹی! کیا تمھارا خیال ہے کہ آدمی بوڑھا ہو جائے تو اس کو دھوکہ دینا یا غلط باور کروانا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک معصوم بچے کو۔

تنویر۔ نہیں۔ نہیں آباجان!! لیکن؟؟

تراب۔ بنانے کی کوشش نہ کرو۔ وہ نالائق تمھاری نظروں میں سراپا محبت ہے اس لیے تم اس کا ہر عیب چھپانا چاہتی ہو۔ چونکہ میں اس کا باپ ہوں اس کو سراپا محبت دیکھنے کے علاوہ اس کے اپنے روپ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ حیدر!!

حیدر۔ (گھبرا کر) جی آباجان!

تراب۔ کہاں رہتے ہو برخوردار راتوں کو؟

تنویر۔ آباجان آج تو میں نے بھیجا تھا انہیں۔

تراب۔ اچھا کل رات یہ کیوں غائب تھے؟

تنویر۔ کل رات۔۔۔ کل رات تو۔

تراب۔ ہاں ہاں کہہ دو سینما گئے تھے۔ پرسوں ناٹک میں شریک تھے ترسوں ڈانس پارٹی میں مدعو کئے گئے تھے۔ حیدر! آج میں صاف طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ کیا تم دولہن بیٹی سے ناراض ہو؟

حیدر۔ بالکل نہیں۔

تراب۔ کیا دولہن بیٹی تم سے ناراض ہے۔

حیدر۔ یہ بھی نہیں۔

تراب۔ پھر تم اوباش کی طرح راتوں کو کیوں بھٹکتے پھرتے ہو۔ کون چیز ہے جو تمھاری نیند حرام کر دیتی ہے۔ راتوں کو گھر میں ٹکنے نہیں دیتی۔

حیدر۔ کچھ بھی تو نہیں اباجان۔

تراب۔ برخوردار ٹال مٹول سے کام نہیں چلے گا۔ بتاؤ وہ چار ہزار روپیوں کا کیا کیا جو تم کو پرسوں بنک میں جمع کرانے دیئے تھے۔

حیدر۔ چار ہزار روپے۔ اباجان وہ۔ وہ تو۔

تنویر۔ وہ تو میرے پاس محفوظ ہیں۔

تراب۔ جھوٹ مت بول لڑکی۔ میں اس مردود کو خوب جانتا ہوں۔ اس کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ سٹہ کھیلنے لگے ہیں برخوردار۔ ایک دن ہمارا خاندان خراب کریں گے۔ ایک دن ہماری کُل برباد کر کے رہیں گے۔ پھر کیوں نہ وقت سے پہلے ان کو کان پکڑ کر باہر

تنویر۔ تمھارا زیور دیدو۔ جو بھی ہو دیدو۔ میں آخری بازی لگانا چاہتا ہوں بالکل آخری —

تنویر۔ بس اسی دیوانی امید نے ہم کو بربادی تک پہنچا دیا۔ آنکھیں کھولو حیدر! اب بھی وقت ہے باپ کا سایہ سر پر قائم ہے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حیدر۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنا زیور دیدو۔

تنویر۔ باقی ہی کیا رہ گیا ہے!

حیدر۔ جو کچھ بھی ہو حوالے کر دو۔

تنویر۔ تمھیں بربادی کا احساس کیوں نہیں ہوتا ہوگا حیدر!

حیدر۔ اس کا بھی وقت ہوتا ہے طوفانوں میں گھر کر تنکے کے سہارے کنارے کی امید کرنا پاگل پن ہے آخری بالکل آخری بازی لگانا چاہتا ہوں۔

تنویر۔ وعدہ کرتے ہو۔؟

حیدر۔ قسم کھاتا ہوں یہ بازی بالکل آخری ہوگی کب تک ستارکی چلتی رہے گی۔ تو ہار کو برسنا ہوگا گھمن نگانی ہوگی۔ لاؤ تنویر! دیدو تمھارا زیور۔

تنویر۔ یہ انگوٹھی ہماری شادی کی ایک ہی یادگار رہ گئی تھی۔

حیدر۔ ڈرو نہیں یہی انگوٹھی ہماری زندگی کے انقلاب کی یادگار رہیگی۔

تنویر۔ یہ لیجئے۔

حیدر۔ تم کتنی نیک ہو۔ واقعی تمھاری مصیبت کا باعث میں ہوں صرف میں!

تنویر۔ آپ میرے لئے سب کچھ ہیں۔

حیدر۔ اچھا خدا حافظ (چلنے کی آواز)

تنویر۔ خدا حافظ جلد آئیے گا — ارے ہاں سنیے!!

حیدر۔ (ٹھیر کر) کہو؟

تنویر۔ وہ آپ کے تین دوست؟

حیدر۔ کون؟ اسلم، اعظم، رستم۔

تنویر۔ جی! بڑے خود غرض اور بیہودے معلوم ہوتے ہیں بہتر ہے آپ ان کے مشورے اور صحبت سے پرہیز کیا کریں۔

حیدر۔ بس اتنی سی بات — اچھا میری سرکار آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ دروازہ بند کر لو — خدا حافظ

(نرم ساز کے ساتھ چلنے کی آواز اور دروازہ بند کرنے کی آوازیں۔ دروازے پر پھر کھٹکا — ڈراوٹ۔)

تنویر۔ پھر آگئے آپ (چلتے ہوئے) شاید ٹوپی بھول گئے۔

(دروازہ کھلتا ہے ایک بڑی آواز سے کم ہونیوالا ساز)

تنویر۔ کون؟؟؟

(اسلم داخل ہوتے ہوئے) اسلم اہا ہا ہا ہا۔
(اعظم داخل ہوتے ہوئے) اعظم ہو ہو ہو ہو۔
(رستم داخل ہوتے ہوئے) رستم ہی ہی ہی ہی۔

تنویر۔ وہ گھر میں نہیں ہیں۔!

اسلم۔ ہم جانتے ہیں۔

تنویر۔ پھر کیوں آئے آپ لوگ؟

رستم۔ آپ سے ملنے۔

تنویر۔ میں ان کی غیر موجودگی میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی مہربانی فرماکر آپ لوگ چلے جائیے۔

اعظم۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جانے کے لئے نہیں آئے۔

تنویر۔ فوراً چلے جائیے۔

اسلم۔ محترمہ ہم اپنا فطری حق طلب کرنے آئے ہیں۔

تنویر۔ ایک غیر عورت سے اپنا حق طلب کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔

رستم۔ دنیا کے ایک بہت بڑے فلسفی کا قول ہے کہ زر، زمین، زن کسی کی ملک نہیں ہوتی۔

اعظم۔ اور اس اصول کی رو سے تم صرف حیدر کی یا حیدر صرف

نکال دو۔ تاکہ وہ دنیا کی ٹھوکریں کھا کھا کر خود اپنا راستہ
ڈھونڈنے کے قابل ہو جائیں۔

حیدر۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو بندہ ہر طرح تیار ہے۔

تنویر۔ چپ رہیے! بڑھل کے منہ نہیں لگتے۔ ابا جان
انہیں معاف کر دیجئے۔ یہ نادانی کرتے ہیں۔

تراب۔ ڈرتی کیوں ہو بیٹی۔ حیدر نے کوئی بدتمیزی نہیں
کی اچھی باتیں کہہ رہا ہے۔ کتنی ہمت آگئی اس میں۔
کتنے بلند ہو گئے اس کے حوصلے۔ وہ انسان ہی کیا
جس کو اپنے مستقبل کا خیال نہ ہو۔ آخر اپنے پیروں
کھڑا ہونا بھی تو ہے۔ میرا تو چل چلاؤ ہے آج نہ
کل نہیں۔ حیدر کچھ روپیہ تم کو امداد دوں گا۔ اسی سے
اپنی زندگی سنوارو۔ اپنے آپ کو کام کے اہل ثابت کرو
یہ تمہارا امتحان ہوگا اگر کامیاب ہو جاؤ تو میری
ساری کائنات تمہاری ہے۔ ہاں جب تک
تمہاری حالت درست نہ ہو جائے دولہن بیٹی
یہیں رہیں گی۔

تنویر۔ لیکن ابا جان!

تراب۔ اپنے فرض کا خیال ہے۔ اچھا تم بھی جاؤ۔ تم اپنا
فرض ادا کرتی رہو۔ میں اپنا فرض ادا کرتا رہوں گا۔
——— خدا حافظ۔ (تیز تیز قدموں سے چلے جانے کی آواز
ایک ساز)

تنویر۔ کیا کہہ دیا تم نے؟ کیا کر دئے الگ جا کر؟ او خدا!
اب کیا ہوگا؟؟

حیدر۔ وہی ہوگا جو ابا جان نے کہہ دیا!

(ایک ساز جس سے گھبراہٹ اور غم [illegible])

داستان گو۔ حیدر باپ کے گھر سے نکل کر مستقل [illegible]
اپنی زندگی بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن [illegible]
جو انسانیت کے لئے مرض دق سے [illegible]
ہے۔ حیدر کی شرافت [illegible] دولت [illegible] اندر
اندر کھائی گئی۔ وہ گمراہی کے [illegible] ڈوبتا گیا

بدکاروں کی صحبت نے اسے مستقبل سے بالکل بے نیاز کر دیا
روز بروز اس کی عزت ذلت کے ہاتھوں شکست کھتی گئی۔
تراب الگ تھلگ بیٹھا بیٹے کی بربادی کا تماشا دیکھتا اور
خون کے گھونٹ پی کر چپ سادھ لیتا۔ عزت روپیہ
تنویر کا زیور سٹہ کی نذر کرنے کے بعد۔ آج پہلی
مرتبہ حیدر کے گھر اناج نہیں تھا سنئے وہ بھوکا پیاسا
شام گھر لوٹ کر دروازہ پیٹ رہا ہے۔ ناعاقبت
اندیش (دروازہ پر کھٹکا کھلنے اور بند کرنے کی آواز
نرم سا نغمہ اوٹ ———)

حیدر۔ تنویر کھانا کھا لیا تم نے؟

تنویر۔ آپ تو ہوٹلوں میں کھا چکے ہوں گے۔

حیدر۔ لیکن گھر کے پکوان میں بھی میرا حصہ ہونا چاہیئے۔
تنویر! تم بھی مصیبت کے وقت ذلیل سمجھ رہی ہو۔

تنویر۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟ جب اناج ہی نہ ہو تو کھانا
کہاں سے پکے چولھا کیسے جلے؟

حیدر۔ یعنی آج ہم کو فاقہ کرنا ہوگا۔ او خدا کتنا گر گیا میں کیا کرنا
تھا۔ کیا کرنا چاہیے۔ کیا کرنا ہوگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔
کچھ نہیں آتا۔ کچھ نہیں آتا۔

تنویر۔ ابا جان نے ہم کو علٰحدہ اس لئے کیا تھا کہ آپ کو اپنی
ذمہ داریوں کا احساس ہو سنبھل کر اپنی رہبری
آپ کرنا سیکھ جائیں۔

حیدر۔ [illegible] ابا جان کو صورت دکھانے کے لائق نہیں
ہوں۔ تم جا سکتی ہو۔

تنویر۔ اب جا کر ابا جان کی نظروں میں ذلیل ہونا نہیں چاہتی
[illegible] آتی۔

حیدر۔ [illegible] سناتی ایک لوہار کی" آخر
[illegible] سنار کی چلتی رہے گی۔ لوہار کو بھی گھن لگانی
[illegible] ایک گھن بالکل ایک۔
[illegible] سارا افلاس دور ہو جائے۔
[illegible] بار پھر ابا جان کو منہ دکھلانے کے لائق ہو جائیں گے۔

تنویر۔ تمھارا زیور دیدو۔ جو کچھ ہو دیدو۔ میں آخری بازی لگانا چاہتا ہوں بالکل آخری —

تنویر۔ بس اسی دیوانی امید نے ہم کو بربادی تک پہنچا دیا۔ آنکھیں کھولو حیدر! اب بھی وقت ہے باپ کا سایہ سر پر قائم ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔

حیدر۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اپنا زیور دیدو۔

تنویر۔ باقی ہی کیا رہ گیا ہے!

حیدر۔ جو کچھ بھی ہو میرے حوالے کر دو۔

تنویر۔ تمھیں بربادی کا احساس کیوں نہیں ہوتا ہوگا حیدر!

حیدر۔ اس کا بھی وقت ہوتا ہے طوفانوں میں گھر کر تنکے کے سہارے کنارے کی امید کرنا پاگل پن ہے آخری بالکل آخری بازی لگانا چاہتا ہوں۔

تنویر۔ وعدہ کرتے ہو۔ ؟

حیدر۔ قسم کھاتا ہوں یہ بازی بالکل آخری ہوگی کب تک سنار کی چلتی رہے گی۔ لوہار کو برسنا ہوگا گھن لگانی ہوگی۔ لاؤ تنویر! دیدو تمھارا زیور۔

تنویر۔ یہ انگوٹھی ہماری شادی کی ایک ہی یادگار رہ گئی تھی۔

حیدر۔ ڈرو نہیں یہی انگوٹھی ہماری زندگی کے انقلاب کی یادگار ہوگی۔

تنویر۔ یہ لیجئے۔

حیدر۔ تم کتنی نیک ہو واقعی تمھاری مصیبت کا باعث میں ہوں صرف میں!

تنویر۔ آپ میرے لئے سب کچھ ہیں۔

حیدر۔ اچھا خدا حافظ (چلنے کی آواز)

تنویر۔ خدا حافظ جلد آئیے گا — ارے ہاں سنیے!!

حیدر۔ (ٹھیر کر) کہو؟

تنویر۔ وہ آپ کے تین دوست؟

حیدر۔ کون؟ اسلم، اعظم، رستم۔

تنویر۔ جی! بڑے خود غرض اور بیہودے معلوم ہوتے ہیں۔ بہتر ہے آپ ان کے مشورے اور صحبت سے پرہیز کیا کریں۔

حیدر۔ بس اتنی سی بات — اچھا میری سرکار آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ دروازہ بند کر لو — خدا حافظ

(نرم ساز کے ساتھ چلنے کی آواز اور دروازہ بند کرنے کی آوازیں۔ دروازے پر پھر کھٹکا — ڈاوٹ۔

تنویر۔ پھر آگئے آپ (چلتے ہوئے) شاید ٹوپی بھول گئے۔

(دروازہ کھلتا ہے ایک بڑی آواز سے کم ہونے والا ساز)

تنویر۔ کون ؟؟؟

(اسلم داخل ہوتے ہوئے) اسلم ہا ہا ہا ہا۔

(اعظم داخل ہوتے ہوئے) اعظم ہو ہو ہو ہو۔

(رستم داخل ہوتے ہوئے) رستم ہی ہی ہی ہی۔

تنویر۔ وہ گھر میں نہیں ہیں!

اسلم۔ ہم جانتے ہیں۔

تنویر۔ پھر کیوں آئے آپ لوگ ؟

رستم۔ آپ سے ملنے۔

تنویر۔ میں ان کی غیر موجودگی میں کسی سے ملنا نہیں چاہتی مہربانی فرما کر آپ لوگ چلے جائیے۔

اعظم۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم جانے کے لئے نہیں آئے۔

تنویر۔ فوراً چلے جائیے۔

اسلم۔ محترمہ ہم اپنا فطری حق طلب کرنے آئے ہیں۔

تنویر۔ ایک غیر عورت سے اپنا حق طلب کرتے ہوئے شرم نہ آئی۔

رستم۔ دنیا کے ایک بہت بڑے فلسفی کا قول ہے کہ زر، زمین، زن کسی کی ملک نہیں ہوتی۔

اعظم۔ اور اس اصول کی رو سے تم صرف حیدر کی یا حیدر صرف

تمھارا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

تنویر۔ خاموش!! ذلیل کہیں کے شرم نہ آئی۔ کل تک جس کو بہن کہہ کر منہ سوکھاتے تھے آج اس کے ساتھ ایسا سلوک۔

اسلم۔ دیکھئے ہمارے فلسفی نے صرف ماں کے لئے منع فرمایا ہے ورنہ ہر عورت ہر مرد کی ملکیت ہے۔

تنویر۔ افسوس! تمھارے فلسفی نے بچاری ماں پر کیوں ظلم ڈھایا اس کو بھی ہر قید سے آزاد کر دیا ہوتا۔

رستم۔ جانے کس موڈ میں لکھ گئے ورنہ فطرت کی رو سے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ خیر ہم آپ کی تحریک کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں گے۔

تنویر۔ پھر تو جانور بھی آپ کی شرم و حیا پر آنسو بہانے لگیں گے۔ خدا آپ کو نیک ہدایت دے۔

اسلم۔ خدا — خدا ہمارے فلسفی کے پاس کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ہماری پیدائش ڈارون کے نظریے کی رو سے ہوئی ہم خود بخود بندر سے انسان بنے۔ ایسی صورت میں خدا کیا حقیقت رکھتا ہے۔

تنویر۔ جب ہی تو آپ کا بندر پن فطرت انسان کو حیوانیت کی طرف لیجا رہا ہے۔ پاجی بدمعاش چلے جاؤ یہاں سے۔

تینوں۔ (ایک آواز) کیا کہا ؟؟؟

تنویر۔ نکل جاؤ یہاں سے!

اعظم۔ اچھا — اسلم لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے

رستم۔ جانتی ہو! جب بھونرہ پھول پر آتا ہے تو پھول اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ہم آغوش ہونے پر مجبور ہے۔

اسلم۔ حسین دلربا۔ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر اچھی نہیں ہم تمھیں ہر قیمت پر حاصل کرنے آئے ہیں دیکھتے ہیں کون سودا بچاتا ہے۔

(بھاری بھاری قدموں کی بڑھنے کی آواز خوفناک ساز)

(پریشان ہوکر) نہیں۔ ٹھیرو! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں خود بدل جانا چاہتی ہوں۔ بدل جاؤں گی۔ ہاں ضرور بدل جاؤں گی۔ مجھے اس زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔

اسلم۔ اب آئیں رستہ پر۔

تنویر۔ ہاں دیکھو گے میرا رستہ مجھے بہت بلندی پر لیجائے گا۔ میرا مقام بہت بلند ہو جائے گا۔

اعظم۔ ہاں بلند۔ بہت بلند۔ آسمان سے بھی زیادہ بلند ہو جاؤ۔

رستم۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہر چیز نیا روپ دھار رہی ہے۔

تنویر۔ ہر چیز نیا روپ دھار رہی ہے۔ انسانیت بھی کروٹ لے رہی ہے۔ میرا خیال تھا کہ کچھ دن اور اس ذلت کی زندگی میں گزارنے ہوں گے۔ لیکن نہیں میرا وقت آگیا۔ میں سب چھوڑ دوں گی۔ ہاں سب چھوڑ دوں گی

اسلم۔ ایک دم چھوڑ دو تاکہ دنیا تمھاری ترقی دیکھ کر دنگ رہ جائے۔

تنویر۔ میں کوشش کروں گی۔ دنیا کو میری جرأت دیکھ کر حیرت ہو مجھے اچھے نام سے یاد کرے۔ باوفا عورت کے نام سے یاد کرے!

اعظم۔ انسان کچھ کھو کر ہی پاتا ہے۔

تنویر۔ میں بھی اپنا سب کچھ کھو کر وہ سب کچھ پالوں گی جو عورت کے لئے لازم ہے جو ایک مسلم عورت کے شایان شان ہے۔

رستم۔ تم بھول گئیں ہم مسلم نہیں ہیں۔

تنویر۔ کوئی ہوں۔ ہماری فطرت مسلم ہے ہر عضو مسلم ہے ساری کائنات مسلم ہے۔

اسلم۔ ہوگی! فی الوقت ان باتوں کا وقت نہیں آؤ ہماری زندگی کو رونق بخشو۔ دل لبھاؤ ہمارا آؤ عنبر بن کر آؤ اور ہماری ہستی پر چھا جاؤ۔

تنویر۔ بغیر شراب کیا مزہ آئے گا؟

اعظم۔ شراب کاش ہوتی!
تنویر۔ حیدر پہنچتے ہیں!
اعظم۔ پھر تو ضرور ہو گی۔ جلدی لاؤ جاؤ۔
اسلم۔ تم خود شراب ہو اور تمھارے ہاتھ کی شراب۔
آہا ہا ہا۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔
رستم۔ شراب ناب کو دو آتشہ بنا کے پلا
پلانے والے نظر سے نظر ملا کے پلا
تینوں۔ جاؤ لاؤ شراب۔ آہا ہا ہا۔ ہو ہو ہو ہو۔ ہی ہی ہی ہی
(نرم ساز جس سے غم کا اظہار ہو دھیرے دھیرے چلنے کی آواز۔)
اسلم۔ دیکھا کیا کام آیا فلسفی کا قول۔
رستم۔ خدا کی قسم غضب کا دماغ پایا ہے۔
اعظم۔ ارے چپ رہو وہ آ رہی ہے
(غمگین ساز پیروں کی چاپ۔۔۔۔ قدم اوٹ۔
اسلم۔ "ساغر و جام نہیں ہاتھ میں تیرے ساقی"
اعظم۔ شراب نہیں پلاؤ گی ہم کو؟
تنویر۔ شراب! میں نے سب کی سب پی لی۔ یہ دیکھو خالی شیشی (فرش پر شیشی کے گرنے کی آواز۔)
اعظم۔ یہ کیا؟ یوڈین پی لیا تم نے؟؟!
اسلم۔ کمبخت! یہ تو زہر تھا!
تنویر۔ نہیں! امرت تھا زندگی سے زیادہ مزے دار بہت زیادہ مزے دار۔ جس کو پی کر کمزور طاقتور کو زیر کر سکتا ہے مظلوم ظالم کے منہ پر زور سے طمانچہ مار سکتا ہے۔
رستم۔ بھاگ چلو ظالم نے غضب ہی کر دیا۔
تنویر۔ بھاگ رہے ہو اپنے مشترکہ سرمایہ چھوڑ بھاگ رہے ہو۔ عورت مشترکہ سرمایہ ہے نا قوم کی دولت سمجھتا؟ آؤ۔۔۔۔ آؤ بھونرے بن کر آؤ میں اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ تمھارے حضور حاضر ہوں آؤ۔۔۔۔

اعظم۔ بھاگ نکلو! رستم دیر ٹھیک نہیں۔ اسلم چراغ بجھا دو (خوفناک ساز مگر نرم پھونکنے کی آواز اعظم کے ساتھ دوڑنے اور تنویر کے طنز و نفرت آمیز قہقہے کی آواز دروازہ اندر سے کھلا اور بند ہو گیا)
تنویر (قہقہہ لگاتے ہوئے) بھاگ گئے بزدل سٹہ باز بھاگ گئے نفس کے غلاموں نے ہوس کی بازی لگائی تھی مجھ سے ہار گئے۔ بڑے بڑے سٹہ باز روز کی طرح آج بھی ہار گئے۔ میری جیت ہو گئی! میں جیت گئی۔ دنیا ہار گئی میں جیت گئی۔ میں جیت گئی۔
(ساز۔ دروازے سے باہر کوئی "بیٹی" "بیٹی" چلا رہا ہے اور دروازہ بری طرح پیٹ رہا ہے)
تنویر۔ (خود بخود) بزدل سٹہ باز! ایک ایک شیشی اپنے اہل و عیال کو لیجا کر پلا دیتا کہ سٹہ بازی کی وبا، ان کو بھی افلاس کے گندے کیچڑ میں دب کر مرنے سے بچائے۔ روز روز ننگا بھوکا سونے نہ پائیں۔
(دروازہ بڑی آواز سے کھل جاتا ہے۔ ایک بڑی آواز سے کم ہونے والا ساز)
تراب۔ (داخل ہو کر) بیٹی۔ دولہن بیٹی۔ میں تباہ ہو گیا برباد ہو گیا۔
تنویر۔ ہیں! کون؟ کون ہو تم؟؟
تراب۔ میں بدنصیب حیدر کا باپ ہوں۔
تنویر۔ ابا جان آداب بجا لاتی ہوں۔ آداب بجا لاتی ہوں۔ اندھیرا ہو گیا ہے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دیا سلائی لا دوں۔۔۔۔ دیا سلائی لا دوں۔۔۔
تراب۔ بیٹی! حیدر نے سٹہ بازی کے ایجنٹ کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور خود فوجی موٹر کے نیچے دب کر جان دیدی (تنویر اپنی دھن میں برابر "دیا سلائی لا دوں" کہے جا رہی ہے۔)
تنویر۔ چراغ جلائیے ابا جان۔۔۔۔ یہ رہی دیا سلائی۔ بیٹی۔
سنا نہیں تو نے بیٹی میرے حیدر نے موٹر کے نیچے آکر

جان دیدی۔ (لڑکھڑا کر گرنے کی آواز) بیٹی!

تنویر۔ چراغ جلایئے اباجان۔ اندھیرا ہوگیا۔ کچھ دکھائی نہیں۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ (آواز تبدریج کم ہوجاتی ہے)

تراب۔ بیٹی ــــ دولہن بیٹی (دیا سلائی جلانے کی آواز) تنویر بیٹی کیا ہوگیا تجھے۔ او خدا تیرا چہرہ کیوں سیاہ پڑ گیا۔ یہ کیسا کف۔ زہر پی لیا تو نے؟؟ بیٹی ــــ بیٹی۔ اب میں کس کے سہارے جیوں گا؟ کون ہے میرا؟

تنویر۔ (رکتے ہوئے) اباجان۔

تراب۔ حیدر نے موٹر کے نیچے آکر خودکشی کرلی۔ تو نے زہر پی لیا۔

تنویر۔ حیدر نے خودکشی کرلی؟ وہ بھی چلے گئے۔ اب مجھے تنہائی کا ڈر نہیں موت کو خوشی سے قبول کروں گی۔

تراب۔ (روتے ہوئے) بیٹی میں تباہ ہوگیا۔ میری دنیا تاریک ہوگئی۔ سٹہ بازی نے بوڑھاپے کا سہارا چھین لیا۔ میں کہیں کا نہ رہا۔ میرا بچہ۔ میرا خون۔ میری تمنا۔ میری زندگی (رونے کی آواز سن کر) آپ روتے ہیں؟ باپ ہوکر روتے ہیں؟ حیدر ہمیشہ ہارتے رہے کبھی افسوس تک نہ کیا۔ ہمیشہ سوستار کی ایک لوہار کی فکر کرتے رہے۔ مجھے دیکھئے سٹہ بازوں نے ہوس کی بازی لگائی تھی مجھ سے میں نے زندگی دیکر ایک آبرو کو بچایا۔ میں زندگی دیکر بھی نہیں روتی کیونکہ میں جیت گئی دنیا ہار گئی۔ لیکن لیکن آپ ہار کر رونے لگے۔ ایک ہی بازی میں سب کھو دیا۔

تراب۔ بازی۔ میں نے کب بازی لگائی تھی۔ کب کھیلا تھا سٹہ میں نے؟ بیٹی!

تنویر۔ بھول گئے۔ آپ نے بہت بڑی بازی لگائی تھی۔ جس اولاد کا ذمہ دار باپ رہبری چھوڑ دے اس کی خدا بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ حیدر کو گمراہ چھوڑ کر آپ نے راہِ راست کی امید کی تھی کیا یہ اچھائی اور برائی کے سٹہ میں اولاد کی بازی نہیں تھی۔ اولاد کی بازی! بہت بڑی بازی لگائی تھی آپ نے سب کچھ لگا دیا تھا۔ سب ہار بیٹھے۔ کچھ نہ رہا سب کھو گیا۔ کچھ نہ رہا۔ کچھ نہ رہا۔

(آواز تبدریج کم ہوجاتی ہے)

تراب۔ بیٹی۔ بیٹی۔ خاموش ہوگئی؟ چلی گئی؟ سچ مچ کچھ بھی تو نہ رہا۔ سب تباہ ہوگیا۔ سارا برباد ہوگیا۔ میں سٹہ باز ہوں!۔ میں نے حیدر کی بازی لگائی تھی؟ نہیں نہیں جگر کا خون دے دے کر اس کی زندگی سنواری تھی۔ چاند سی دولہن بیاہ لایا تھا۔ پھر ایسا کیوں میں نے اس کی بازی کیوں لگا دی؟ نہیں نہیں باہر کے ماحول کا باپ ذمہ دار نہیں۔ کوئی اور طاقت ہے کوئی اور اقتدار ہے لیکن میری بربادی مظلوم باپ کی مظلوم آہیں۔ امراد تمنائیں بے جبر اقتدار کا خاتمہ کر دیں گی۔ آسمان ٹوٹے گا۔ بجلیاں گریں گی۔ زلزلے آئیں گے دیکھو ہوشیار ہوجاؤ! مجبوریاں انقلاب کی چنگاری کو سرخ بنا رہی ہیں۔ ایک دن سب بھسم ہوجائے گا۔ بھسم ہوجائے گا بھسم ہوجائے گا۔ آ ہاہاہاہا کچھ بھی نہ رہا۔ سب مٹ چکا آ ہاہا اب مٹ گیا۔ آ ہاہاہاہا (ایک غمگین ساز ـــــ فیڈ آوٹ!

تلاوت یداللہی

حضرت سید انوار اللہ شاہ بادشاہ قادری رحمۃ اللہ علیہ ننگوی

خطۂ دکن ہمیشہ سے مردم خیز رہا ہے اور اس سرزمین نے ہر شعبۂ زندگی میں ایسے فرزند پیدا کئے ہیں جن پر مادرِ گیتی کو بجا طور ناز ہو سکتا ہے۔ بالخصوص جب اسلام کے آفتاب جہانتاب نے اس سرزمین کو اپنی ضیا پاشیوں سے بقعۂ نورانی بنایا تو اس کی خاک سے ایسے ایسے افراد اٹھے جن پر اسلام بجا طور پر نازاں ہے۔ ان ہی بزرگانِ دین میں وہ بزرگ بھی ہیں جن کا نام زیبِ عنوان ہے۔

حضرت سید انوار اللہ شاہ بادشاہ قادری اپنے زمانہ کے بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے آپ کی ذات گرامی سے صدہا بندگانِ خدا نے راہ ہدایت پائی اور سیکڑوں گم کردہ راہ رستے پر لگ گئے۔ حضرت کا متاخرین صوفیا میں بڑا رتبہ ہے۔ آپ کے مریدین اور معتقدین اقطاعِ دکن میں پھیلے ہوئے ہیں۔ سلف صالحین نے اولیائے کرام کے حالات میں جو تذکرے لکھے ہیں ان میں زیادہ تر اظہار کرامات اور ذاتی عقیدت اور مداح گستری سے کام لیا ہے مگر زمانہ بدل چکا ہے، ذکر کرامات سے زیادہ موثر اور بہتر طریقہ اب انسان کے اخلاق، خصائص اور سادہ معاشرت کا تذکرہ ہے اور جن کی تقلید ابنائے جنس اور اخلاف کو کرنی چاہیئے۔

آپ کا وطن ننگہ ہے جو ضلع بیدر کا ایک مستقر تعلقہ ہے جہاں بزرگانِ دین و اہل یقین بڑی تعداد میں آرام فرما ہیں۔ شاہ صاحب کا سلسلۂ نسب بیسویں پشت میں۔ غوث صمدانی محبوب سبحانی معشوق ربانی مقبول دو جہانی حضرت میراں محی الدین سید عبد القادر جیلانی رض سے ملتا ہے۔ آپ کے جد حضرت سید السادات سید شاہ حیدر ولی اللہ قادری بغداد سے عہد بہمنیہ میں وارد ننگہ ہوئے آپ کے پوتے حضرت سید السادات سید حضرت قادری عہد عادل شاہیہ میں پون لاکھ کے جاگیردار اور سکندر عادل شاہ کے اتالیق تھے۔ علی عادل شاہ ثالث کے زمانہ میں ننگہ آپ کی جاگیر تھی تفصیلی حالات روضۃ الاولیا، بیجاپور میں درج ہیں۔

آپ کے اجداد میں سے حضرت سید السادات سید عبد الرزاق تاج الدین مفتی عراق تھے۔ اور حضرت سید السادات ابو صالح نصر قادری خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں قاضی القضاۃ ہوئے ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام سید شاہ محی الدین بادشاہ عرف سید مظہر اللہ صاحب قادری ہے آپ علوم ظاہری میں فارغ التحصیل تھے ہمیشہ تدریس ظاہری و باطنی میں مصروف رہتے تھے۔ تصوف کی مشہور کتابوں پر پورا عبور تھا۔

۹ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ کو انتقال فرمایا۔ مزار اورنگ آباد میں ہے۔ انوار اللہ بادشاہ قادری ۱۱۸۴ھ میں پیدا ہوئے علوم ظاہری کی تحصیل اپنے والد ماجد سے فرمائی ۱۲۱۲ھ میں انھیں خرقۂ خلافت عطا ہوا۔ ہمیشہ طالبانِ حق کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہتے تھے حضرت نے جو مقامات عالیہ سلوک میں طے فرمائے ان کی حقیقت اور شان ان کے کلام سے ظاہر ہے جس سے وہی بزرگ آگاہ ہو سکتے ہیں جو فہم و بصیرت کا نور رکھتے ہوں ۱۲۷۹ھ میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔ مزار شریف ننگہ میں شاہ راہ عام پر زیر آسمان ایک چبوترہ پر واقع ہے۔ ننھیالی سلسلہ اس طرح ہے۔ سید انوار اللہ شاہ قادری بن رحمت بی زوجہ سید محی الدین قادری بنت بی صاحبہ بی بی بنت فاطمہ صاحبہ بی بی بنت سارہ صاحبہ بی بی۔ زوجہ محمد آمنت بنت سید السادات خلاصۂ اولاد محبوب سبحانی ہمشیرہ قدسیہ صاحبزادی قطب الاقطاب سید نور الدین نور الحق عرف پیر بادشاہ صاحب قادری قدس سرہٗ العزیز ننگوی۔

شاہ صاحب کے معتقدین میں نواب سیف جنگ، امجد الملک بہادر، اور ان کے بیٹے نواب رکن الدین بھی تھے۔ شعر و سخن سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ آپ کی منقبتیں درباب گلی دانڈو، چرخہ، ڈول، کفن چدر وغیرہ مشہور ہیں۔

عرفان انوری

درباب گلّی دانڈو

(۱) چل کھیل دل دانڈو گلی سنگ کی گھڑی کھڑ کھوڑ لے   یعنی لے ہمت ثابتی صدق و صفا کی جوڑ لے
تو پیٹر کرنے نفس سے ایک بیت اول ہوڑ لے   ... سب دینار کے گلی سب پھوڑ لے
شاخ و فرعہا اصلہا ثابت کا دانڈو توڑ لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کے دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۲) زیر درخت منتہا چھورے بلا چو گھاٹ کے   نفس امبارا کی جینتے چن کے گڑی تو باٹ دے
چھتیس سب پاکھنڈ کے سب چھوڑ دے درس نجے   یک اسم اعظم پیٹ میں جھنگی توکل کی تو لے
نصرٌ من اللہ پڑ کے تو یاری کے تئیں جب چھیڑ لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۳) امر و نہی دو راستے درمیان تو داؤ بچھا   دل کی اگل کو کر جتن تو عشق کے ہوڑ یکہ مچا
وہاں نفس امبارا کبھی بن کر اگل کا مور چا   پھینکے اگر گلی تو تو دانڈو سے کر دو پار جا
خوف و رجا کے بیچ میں پیڑا کے اس کو چھوڑ لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۴) اثبات کر لے معتصم باللہ تو حبل المتین   طناب حبلٌ من مسد جرأت لے ہمراہ اور یقین
لا نفس امبارا کو واں اس کے مع سب ہمنشین   دانڈو سے بند کر بند کر پیش نظر نظار گیں
پھر پڑ کے استغفار کو لعنت کے برسا کوڑ لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۵) ہے نفس کے ہمراہ کئی اچلے اُچکے چور نٹ   لیجا دیں نا کیں کر دغا دل کی اگل دانڈو واپٹ
کھلی نہ کہہ زنہار تو اِنّ انا احمد کی پٹ   تو نیں میں جا چڑ چا نہ کر اس بات کا پردہ اولٹ
کر دل کنتیں اپنے جتن جاوے نہ اس کو چور لے
گلی اوڑا بد کھور کی دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۶) تو حی یا قیوم پڑ دانڈو اگل میں کر کھڑا   نفس امبارا ہے بہت مکار اور جادو گرا
وہ کرکے سو شیوہ سامری دانڈو کنتیں دیگا اوڑا   کئے مکر تو نے داؤ کر وہ داؤ کو لے گا پھرا
پھینکے گا لیمو اور کئی جادو مکر کے ڈور لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے   کرار بڑے اور کھڑ بڑے اور ماگلے اور مھور لے

(۷) ہوشیار ہو تو مکر سے کیں داؤ نہ تجھ پر چڑے　　ہات میں دے یاد سن تو ہفت ہیکل کے کڑے
کیں کھیل میں ایسا نہ ہو ٹونا نہ کیں ٹامن کرے　　گلی اگل سے آ پڑے دانڈو زمیں پر گر پڑے
بن کر اگل کا حوت کیں دانڈو کو کہا ویں گور لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے اور ماگلے اور مھور لے

(۸) گلی اگل پر دھر کے جب دیوے گا تو جس دم گھما　　رکھ شست سے دانڈو جمع لاحول کے ٹھوکے لگا
جو نفس ہے تیرا بھڑو کر اس کو تو قابو سے آر　　پھ کر اگل کے پاس تو گلی کو مت آنے دے آر
آکر کئی قابو سے پھر پھیکے وہ گلی بدلہ اور لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کے اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۹) پھیکے گا گلی پھیر کر کئی داؤ کر دھوکا دکھ　　کر کر خا غفلت میں بہا دانڈو نظر کتیں جھکا
پڑ آ ہتنا یا ربنا و انصرنا آعوذ بک　　جب یاد کی ہاتوں دہیں سر میں دغا کے دوا تکا
کر ہوش کو در گوش تو غفلت کے در کو مٹر لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۱۰) کر شرم کو سر سے لپٹ گلی سمٹ وہ تجے حیا　　آوے گا لینے کو اگل لے کر طمع حرص و ہوا
بغض و حسد، کینہ، کبر، غصہ، غضب جور و جفا　　جب تو بھی اپنے سنگ لے ساتے رضا علم و وفا
پھرا پھرا ان سب کا تو سنگ صبر کے رکھو ڑلے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۱۱) تجھ پر تکبر وہ اگر بھیجے غروری کتیں　　تو عاجزی اور علم کی حلقہ میں ہلکا دے وہیں
لے غیر خطروں کے اگر آوے حمایت سے تیں　　جب بڑ کے تو ارفع بلا واللہ خیر الحافظین
رد کر دے ان سب کے تئیں تو ٹیر جا یک ٹھور لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۱۲) کر کر ارادہ آوے گر لینے اگل بخل و جہل　　تو لے شجاعت اور سخا دھکے دلا وہاں تے ہمل
موذی یہیں ان کی نگت ان پانچ کو کر تو قتل　　دے پاؤں میں پستی کے تو مستی کو ہستی کے کھوڑ ل
آعوذ باللہ ورد کر پھر نفس کو کر زیر لے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۱۳) یہ نفس کئی کئی داؤ سے کر جا لگا قابو بلا　　ہوشیار ہو گلی نہ کیں ڈالے اگل کے بیچ لا
پھیکے اگر گلی سمٹ مٹی میں لے ماٹی میں ملا　　تو جب نظر گلی پر دھر دانڈو پکڑ کر اڑ بلا
اور لول جھٹ آگے رہیں تو ذر لڑے اور پھولے
گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے　　کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ماگلے اور مھور لے

(۱۴) میدان اگل کا گھیر کر دانڈو کتیں تو خوب رول　　شست بند کر تو ٹیں دے گلی کو تو ماٹی سے ٹٹول
جس جا پہ گلی جا پڑے دانڈو دے گنتی کر کے بول　　جھلے جمع سب جوڑ کر بہے بھڑو کے کان کھول

گنتی لگا گی سے تو دانڈو اگل کی توڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے اور ما گلے اور مھور لے

(۱۵) گن ایک کا بابا گپھ پکڑ منحرف کو تحقیق کر — یعنی سمجھ تحقیق تو ہے فنتا کے پیڑ و جڑ
پھر دو کی پھتی کر ضحی اللہ محمد یک دگر — مرشد سے ل گن تین تو مستی ید اللہ کی پکڑ
پھر چار ل گھوڑے پہ چڑ سب مفسدوں کو گھیر لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھوڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۶) گن پانچہ میں پنجہ من خدا اور گن خدا میں پنجتن — اس پانچہ میں پنج گنج گن گن شش جہت چودہ سخن
اس راز کو مت فاش کر برقعہ حیا کا اوڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۷) سب شش جہت کو دید میں دانڈو سے گن کراکٹھے — اس کے سوا جو ہو عدد دل کی اگل میں جھانک لے
پھر سب خدائی سات میں گن ایک جھلا ٹانک لے — اس ایک میں پھر دیکھ تو دونو جہاں لولاک لے
چودہ طبق ارض و سماں وہاں بھاگے اور تھور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۸) سب بھاگے اور تھور لے چھوٹے بڑے سب ایکجا — تو جب خبر اس کھیل کی پہونچا دے ہر اہل جا بجا
اس وقت سارے مولوی شیخوں کے تئیں بلوا بھجا — تب جیت کا فرنفس دے فتح کا طبلہ بجا
پھر خلق سب ہو گی جمع آواز سن گھن گھور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۱۹) آوازیہ جب فتح کا ملکوں کے اوپر جائے گا — گوکل سے بندربن سے لے کو پال گردھر آئے گا
مرلی بجاتا ناچتا سنگ گاؤ گور و ڈھور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۲۰) پھر سب کتیں رکھ شاہدی نفس عدو سے آج لے — سب کا بھی اس سے ..... ہر وقت اپنے کاج لے
ٹوپی اوڑا اس نفس کے سر پر ادب کا تاج لے — اقرار کر کر چھوڑ دے مت سب میں اس کی لاج لے
..... اطاعت کا لگا کر ..... تو گل کھوڑ لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

(۲۱) مرحبا اس شخص پر جو نفس پر سر بر ہوا — کر نفس کو زیر و زبر کیا نامور اکور ہوا
جس کھیل سے ہے عشق کا دل نیں شیر کے نر ہوا — وہ کھیل سارے کھیل کے دفتر کا سر دفتر ہوا
جس کھیل کا جن و ملک گئے آسمان پر شور لے

گلی اوڑا بد کھوڑ کی دل کی اگل کو ہیر لے — کرار بڑے اور کھڑ بڑے تو ما گلے اور مھور لے

منقبت چینڈول

(۱) ہے دنیا بناوٹ کی بازیگری — کنڈوا کی مولی ہوخاں کی بلی
عجب کھیل مانڈی ہے وہ ہیٹ جلی — دکھا اپنے مکروں کی سب کو تجلی
بتائی ہے سب کتیں شیخ چلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۲) یہ دنیاں ہی پر مکروں کھیل والی — بہوت سوں کو گاڑی بہوت سے نکالی
حریفوں کی باندھی ہے چوروں کی ٹالی — کسے دیوے چوما کسے دیوے گالی
دگڑا اس کا ہے خوب جعفر جٹلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۳) یہ ...... سے اطراف آنگن — کہ بے انتہا ہے گا جس کا پٹنگن
پڑے ہینگے عاشق ہوکے اس کے آنگن — کئی اس کو لے پیٹ کرتی ہیں بلن
سبھی سنت سادہو برا من معلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۴) ارے دل . ست کھیل مانڈو — طمع کی تو بانے میں جز اس کے آنڈو
تو اپنے ساتھی جو ہی پانچ پانڈو — اٹھالے تو صبر و قناعت کا دانڈو
طمع کی اگل میں تو دھر مار گلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۵) ارے دل یہ سن بات رکھ یاد پھر تو — بکو کھیل بل ال کے جز نا رسے تو
یہ دنیا کی نہار لالچ نہ لے تو — اگرچہ وہ آوے تو آنے نہ دے تو
اگر اسپو آوے تو توڑ اس کی نلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۶) ہے دنیا بہوت ٹھگ ہے عیار ناری — اپنی نے بلوتوں کی پگڑیاں اوتاری
ارے دل یہ دنیا سے مت رکھ تو یاری — ہزارو خلق میں ایسے تھے اوتاری
نہ ڈالی کسے تیل تا لو پہ پلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۷) بڑی ہے یہ پنچال ... کھلاڑی — اپنے داومیں لا بہوت سے پچھاڑی
عمل جہاں میں میری جلد کر جھاڑی — چپراوے تو ٹھوکر چکر تھپاڑی
کھلا کر نیاں چھاپ پھیک پو پہلی
تو جا کھیل اے دل کنیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا اتن کی ہیلی

(۸) سمل جا تجھے کئیں پھراوے نہ آئے دل — تجھے کئیں یہ دنیا بھولاوے نہ اے دل
کہیں دل ترے سے مگاوے نہ آئے دل — دوا برما کے تجھ کو کھلاوے نہ اے دل
وہ میوہ متر تجھ کو فنتر کی ڈالی
توجا کھیل اے دل کنہیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی پہلی

(۹) ہے جو سر بھی جیہ چہار کنج پنج انور — دھرے اس کے بازی پو کئی گنج انور
تو اوپچ نہ کر اس کی دم سانپ انور — یہ دنیاں کی ہے سخت شطرنج انور
لے اپنے زیارت کی موتی ہو گلی
توجا کھیل اے دل کنہیا کی گلی — سمٹ دم کا چینڈول اوڑا تن کی پہلی

شادی کی مبارکبادی

یارب مری مرادیں سب یہ حصول ہوئے — شادی ہو یہ مبارک عرض قبول ہوئے
نصریں انگار کنگنا باندھوں میں اس بنے کو — گوہر راہ میں جس کے زہرا نزول ہوئے
خورشید زیاف ہر ایک زرتار ہر لڑی میں — ماہ بھر بنے کے سہرے کے پھول ہوئے
ایام شادمانی نت رہ بنا بنی پر — ہرگز کبھی نہ ان کی خاطر ملول ہوئے
بنڑے کی مشکلاتیں مشکل کشا کو سونپا — بنڑی کے سر پہ دائم دست بتول ہوئے
کر عمر کی درازی اسطوران کی یارب — دن خوش ہزار سالہ اشب عیش طول ہوئے
شاہد وکیل جن کے ہوئے امام ضامن — انور مشاہدی میں شاید رسول ہوئے

سید محمد بیدی

زندگی

(منشی پریم چند کا لکھا ہوا)

ہندو فلسفہ میں قنوطیت کی جھلکیاں ہیں۔ بدھ مذہب میں بجز یاس کے کچھ نہیں، اور عیسائی مذہب کا بھی یہی حال ہے۔ انسان ابتدا ہی سے سکھ کی کھوج میں رہا ہے اور اس کا حصول اس کی زندگی کا خاص مقصد رہا ہے۔ دکھ سے وہ اتنا گھبراتا ہے کہ اس زندگی ہی میں نہیں بلکہ آنے والی زندگی کے لیے بھی ایسا اہتمام کرنا چاہتا ہے کہ وہاں بھی وہ سکھ چین کا تصور کر سکے۔ جنت اور سورگ، نجات اور نروان سب اسی آرزو کی پیداوار ہیں۔ سکھ کے حاصل کرنے کے لئے ہم نے زندگی کو ڈھلتی پھرتی چھاؤں اور دنیا کو فانی کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب زندگی کو ثبات ہی نہیں اور دنیا فانی ہے تو پھر کیوں نہ اس سے منہ موڑ کر بیٹھیں؟ مگر ہم نے اب تک اس پر غور ہی نہیں کیا کہ ہم کیوں مغموم ہوتے ہیں؟ وہ کونسی ذہنیت ہے جو ہمیں غم کی جانب لیجاتی ہے؟ آج ہم اس سوال پر غور کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس اندھیارے میں کہیں اجالا بھی نظر آ سکتا ہے یا نہیں۔

دکھ کے دو بڑے اسباب ہیں۔ ایک تو وہ سخت قدیم قوانین ہیں جن میں ہم نے اپنے کو اور سماج کو جکڑ رکھا ہے، دوسرے وہ شخصی الجھنیں ہیں جو ہمارے دل کو الجھائے رکھتی ہیں، اور اس میں باہر کی ہوا اور روشنی کو جانے نہیں دیتیں۔ ان قدیم بندشوں سے تو ہم اس وقت بحث کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کی اصلاح ہمارے بس کی بات نہیں، کیونکہ ان کا دارومدار تو اس پورے نظام پر ہے۔ البتہ شخصی الجھنیں ہمارے بس کی بات ہیں اور ہم اپنا خیال یہیں تک محدود رکھیں گے۔

اکثر ایسے لوگ بہت کبیدہ خاطر دکھائی دیتے ہیں جو بے اعتدالی کے باعث اپنی صحت کھو بیٹھتے ہیں، یا جن کے پاس مال و دولت کی کمی ہے۔ لیکن درحقیقت دیکھا جائے تو مسرت کے لئے نہ دولت کی ضرورت ہے نہ صحت کی۔ کئی متمول دکھی ہیں اور کئی بیمار خوش ہیں۔ سکھی جیون کے لئے دل کا صحت مند ہونا نہایت ضروری ہے مگر اس کے لئے بیمار نہ ہونے والا جسم بھی لازمی ہے۔ سب ہی تو رشی نہیں ہوتے بلا قصور اور صحت مند جسم اور دل میں علت و معلول کی نسبت ہوتی ہے۔ اگر ایک معمولی انسان عقل سے کام لے اور صحت مند زندگی کی طرف سے آنکھیں نہ بند کر لے تو وہ اپنے جسم کو امراض سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ جسم ایک مشین ہے۔ اسے جس طرح کوئلہ پانی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم اس مشین سے کام نہ لیں تو بہت تھوڑے دنوں میں اس کے پرزوں میں زنگ لگ جائے گا۔ مزدوروں کے لئے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ ان لوگوں کے لئے جو گدی یا کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہیں کسی نہ کسی ورزش کی سخت ضرورت ہے۔ کرکٹ اور ٹینس کے لئے ہمارے پاس اسباب مہیا نہ ہوں تو کیا ہم اپنے گھر میں سو پچاس ڈنڈ بیٹھک بھی نہیں لگا سکتے؟ اگر ہم اپنی صحت کے لئے ایک گھنٹہ بھی نہیں دے سکتے تو اس کا یہ صاف مطلب ہے کہ ہم سکھ کو ٹھوکروں سے مار کر اپنے ہی دروازے سے بھگاتے ہیں۔

کھانے کا سوال بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔ کونسی چیز کس طرح اور کتنی کھائی جائے؟ اس بارے میں بیوقوفوں سے زیادہ عقلمند غلطیاں کرتے ہیں۔ اکثر ایسے ملیں گے جو اس خصوص میں بالکل کورے ہیں۔ زندگی کا سب سے بڑا کام ہے کھانا، اسی پر تو دنیا کا سارا چکر چلتا ہے اور اسی کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ بچوں کا پہلا سبق پیسے اور بڑوں کا کھانے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کتنی مضحکہ خیز ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں کہ ہماری صحیح نشو و نما اور ترقی کا راز کھانے میں ہی ہے۔

رنج کا بڑا سبب ہے اپنے آپ میں غرق رہنا۔ ہمیشہ اپنے ہی بارے میں سوچتے رہنا۔ ہم یوں کرتے تو یوں ہوتے۔ وکالت پاس کر کے مٹی خراب کی۔ اس سے کہیں اچھا ہوتا کہ نوکری کر لی ہوتی۔ اگر نوکر ہیں تو یہ افسوس ہے کہ وکالت کیوں نہ کر لی۔

لڑکے نہیں ہیں تو یہ فکر مارے ڈالتی ہے کہ لڑکے کب ہوں گے۔ لڑکے ہیں تو۔ رو رہے ہیں کہ یہ کیوں ہیں، یہ بچے نہ ہوتے تو کتنے آرام سے زندگی کٹتی۔ کئی ایسے ہیں جو اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں۔ کوئی ماں باپ کو کوستا ہے جنھوں نے ان کے گلے میں زبردستی جوا ڈال دیا۔ کوئی ماموں یا پھوپا کو جنھوں نے یہ رشتہ جوڑا تھا۔ اب ان کی صورت بھی انہیں پسند نہیں۔ بیوی سے آئے دن ٹھنی رہتی ہے۔ وہ سلیقہ نہیں رکھتی۔ میلی ہے، پھوہڑ ہے، مردہ ہے، نحوسی ہے جب دیکھو منہ لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ یہ نہیں کہ شوہر صاحب دن بھر کے بعد گھر میں آئیں تو لپک کر ان کے گلے سے لپٹ جائے۔ اس گروہ میں زیادہ تر ادیب اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے۔ یہ دوسروں کی بیویوں کو دیکھ کر اپنی قسمت کو رو دیتے ہیں۔ وہ کیسی سلیقہ مند ہے۔ کتنی ہنس مکھ کتنا خیال رکھنے والی۔ دن رات بیچارے اسی خیال میں جلا کرتے ہیں۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ ساری دنیا ان کی تعریف کرتی رہے۔ خود جب موقع پاتے ہیں اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں وہ خود کسی کی تعریف نہیں کرتے۔ کسی سے محبت نہیں رکھتے، لیکن آرزو ہے کہ دنیا ان کے آگے سر تسلیم خم کرکے کھڑی رہے، ان کے گن گائے۔ وہ اس فکر میں گھلے جاتے ہیں کہ دنیا ان کی قدر نہیں کرتی۔ اس کے باعث ان کے کردار میں حسد آ جاتا ہے اور ایسے لوگ تو گھر گھر ملیں گے جو ننانوے کے پھیر میں پڑ کر زندگی کو مستقل عذاب بنا لیتے ہیں۔ فکر ـــــ فکر۔ اس میں ان کی زندگی ہے۔ ایسے آدمی صرف انھیں سے خوش ہوتے ہیں جو ان کی فکر اور ان کے مقاصد میں ممد ہوں۔ اور کسی سے انھیں سروکار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس بیوی سے گفتگو کرنے کو وقت نہیں۔ بچوں کو پیار کرنے کی انھیں بالکل فرصت نہیں۔ گھر میں کسی سے ایک پائی کا نقصان ہو جائے تو گھر سر پر اٹھا دیتے ہیں۔ بیوی نے اگر ایک آنے کے بجائے سات پیسے کی ترکاری منگوالی تو خاوند کو رات بھر جھینکنے کا مسالہ مل گیا۔ تم گھر لٹا دو گی۔ تمھیں کیا خبر پیسے کیسے آتے ہیں؟ آج مر جاؤں تو بھیک مانگتی پھرو۔ ایسی دل جلانے والی باتیں کرکے آپ روتے ہیں اور دوسروں کو رلاتے ہیں۔ لڑکے سے کوئی چمنی ٹوٹ پھوٹ گئی تو کچھ نہ پوچھو۔ بیچارے معصوم و بے قصور بچے کی شامت آ گئی۔ مارتے مارتے اس کی کھال ادھیڑ ڈالی ـــــ مانا لڑکے نے نقصان کیا۔ تم غریب ہو اور تمھارے لئے دو چار آنے کا نقصان بھی بہت ہے۔ لیکن لڑکے کو مار پیٹ کر تم نے کیا پایا؟ چمنی تو جڑ نہیں گئی؟ ہاں محبت کا بندھن ضرور ڈھیلا ہو گیا۔

یہ سب اپنے آپ میں ڈوبے رہنے والوں کا حال ہے۔ اس کی دوا صرف یہی ہے کہ اپنے بارے میں اتنی فکر نہ کریں، دوسروں میں دلچسپی لینا سیکھیں۔ چڑیاں پالنا، پھول پودے لگانا۔ گانا بجانا۔ گپ شپ کرنا۔ کسی تحریک میں حصہ لینا۔ غرض دل کو اپنی جانب سے ہٹا کر باہر کی طرف لیجانا ایسی طبیعت والوں کے لئے سکھ کا باعث ہو سکتا ہے۔

اداس طبیعت والے بھی اکثر مغموم رہتے ہیں، دنیا میں ان کے لئے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ مرض زیادہ تر اونچے درجوں کے عالموں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے دنیا کے فلسفہ کو جانا بوجھا ہے اور اب زندگی میں انھیں ایسی کوئی شئے نہیں ملتی جس کے لئے وہ زندہ رہیں۔ دنیا تحت الثریٰ کی طرف جا رہی ہے، لوگوں سے محبت اٹھ گئی، ہمدردی کا کہیں نام نہیں۔ ادب کی کشتی ڈوب گئی جس سے محبت کرو وہ بے وفائی کرتا ہے۔ دنیا میں کس پر اعتماد کیا جائے؟ یہ چیز تو اب دنیا سے اٹھ گئی۔ اب لکشمن کے بھائی اور ہنومان جیسے خدمت گزار کہاں؟ یہ اداسی انہیں لوگوں میں ہوتی ہے جو گھر کے اچھے ہیں۔ جنھیں زندگی کے لئے کوئی کام کرنا نہیں ہوتا۔ مزے سے کھاتے اور سوتے ہیں۔ وہ دنیا میں صرف رونے کے لئے آئے ہیں۔ ان کی ذات سے کسی پر احسان کی توقع نہیں۔ ہر ایک چیز میں عیب نکالنا، ہر ایک چیز سے مطمئن نہ ہونا، بس یہی ان کا کام ہے۔ ایسے لوگوں کا علاج یہی ہے کہ فوراً کسی کام میں لگ جائیں اور کچھ نہ ہو سکے تو تاش ہی کھیلنا شروع کر دیں، کوئی بھی کام اس رونے سے

اچھا ہے۔

دنیا کب تحت الثریٰ کی طرف نہیں جارہی تھی؟ جب کوروؤں نے درو پدی کو بھری محفل میں عریاں کرنا چاہا اور پانڈو بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھتے رہے، کیا دنیا اس وقت زوال کی طرف نہیں جارہی تھی؟ کس زمانہ میں بھائی نے بھائی کا گلا نہیں کاٹا؟ دوستوں نے کب اعتماد کا گلا نہیں گھونٹا؟ عیاشی کب نہیں ہوئی؟ شراب کے دور کب نہیں چلے؟ لڑائیاں کب نہیں ہوئیں؟ دنیا آج بھی وہی ہے جہاں دس ہزار برس پہلے تھی، نہ تحت الثریٰ کی طرف گئی اور نہ اسے زوال ہوا۔ اور اسی طرح آخر تک رہے گی۔ اضطراب زندگی کا راز ہے۔ خاموش دل میں ہمیشہ اضطراب کی موجیں اٹھتی رہتی ہیں۔ دنیا میں جو کچھ ترقی ہو رہی ہے یا ہوئی ہے اس میں اسی مطمئن نہ ہونے کے احساس کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن اس اضطراب کو حرکیاتی (Dynamic) قسم کا ہونا چاہیے جو نت نئی راہیں پیدا کرے اور نئے مقاصد معلوم کرتا رہے جو ادب اور آرٹ کی تخلیق کرتا رہے۔

دنیا اگر فانی ہے تو آپ کو اس کی کیوں فکر؟ یقین مانیے آپ کی زندگی میں سکون ہوگا۔ اور اگر سکون ہو جائے تو آپ کے فکر کرنے کی چنداں ضرورت؟ جو سب کی حالت ہوگی وہی آپ کی بھی ہوگی گھر سے باہر نکل کر دیکھیے میدان میں کتنی دلکش ہریالی ہے درختوں پر پرند کیسی خوش الحانی کے ساتھ گا رہے ہیں۔ ندی میں چاند کیسا تھرک رہا ہے۔ کیا ان مناظر سے آپ کو ذرا بھی خوشی نہیں ہوتی؟ کسی جھونپڑی میں جاکر دیکھیے ماں فاقے کر رہی ہے مگر کتنی محبت سے بچے کو اپنی سوکھی چھاتی سے چمٹائے ہوئے ہے۔ بیوی اپنے بیمار شوہر کے سرہانے بیٹھی موتی برسا رہی ہے اور خدا سے یہ التجا کر رہی ہے کہ شوہر کے بجائے وہ خود بیمار ہو جائے ــــ یقین کیجیے آپ خدمت، ایثار اور یقین کے ایسے ایسے مناظر دیکھیں گے کہ آپ کی آنکھیں کھلی رہ جائیں گی۔ ہو سکے تو ان کی کچھ مدد کیجیے۔ محبت کرنا سیکھیے اس دکھ کا، ان انسانی مصیبتوں کا علاج بھی ہے۔ آج کل دکھ کی ایک نئی ٹکسال کھل گئی ہے اور وہ ہے زندگی کی جنگ۔ جدل حیات جدھر دیکھیے۔ یہی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس جنگ میں کسی سے ہمدردی کی، رحم کی امید نہیں کر سکتے۔ سب ہی اپنے اپنے ناخن اور دانت نکالے شکار کی تاک میں بیٹھے ہیں۔ ان کی بھوک بحرالکاہل سے بھی زیادہ گہری ہے۔ کسی طرح سیر نہیں ہوتی۔ کاش یہ دن چوبیس گھنٹوں کے بجائے اڑتالیس گھنٹوں کا ہو جاتا۔ ادھر سورج نکلا اور ادھر مشین چلی۔ پھر یہ دو بجے رات سے پہلے نہیں بند ہو سکتی۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں: ناشتہ کھڑے کھڑے کیجیے۔ کھانا دوڑتے دوڑتے کھائیے۔ دوسروں سے ملنے کے لئے وقت نہیں۔ فالتو باتیں سننے کی فرصت نہیں۔ مطلب کی بات کہیئے صاحب فوراً۔ وقت کا ایک ایک منٹ اشرفی ہے۔ موتی ہے۔ اسے فضول نہیں کھو سکتے۔ اس جنگ کی ذہنیت مغرب سے آئی ہے اور بڑے زور سے ہندوستان میں پھیل رہی ہے۔ بڑے بڑے شہروں پر تو اس کا قبضہ ہو چکا اب چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی اس کی عملداری ہوتی جارہی ہے۔ مندی تیزی، بازار کے چڑھاؤ اتار، حصول کا گھٹنا بڑھنا یہی زندگی ہے۔ یہ نیند میں بھی تیزی مندی کا خواب دیکھتے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کی کسے فرصت؟ سینما دیکھ لیں گے۔ ناول کون پڑھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے دل بہلا لیتے ہیں؟ لیکن یہ خبط بھی ہے کہ ہم کسی میدان میں بھی پیچھے کسی سے نہ رہیں۔ ادب، آرٹ، سیاست ہر موضوع پر نئی سے نئی باتیں بھی ہم سے نہ چھپنے پائیں۔ ہمہ دانی اور ہمہ خوانی کی نمائش کے لئے تو نئی سے نئی کتابیں میز پر ہونی ہی چاہئیں۔ کسی طرح ان کا خلاصہ مل جائے تو کیا کہنا۔ دس منٹ میں کتاب کا لب لباب معلوم ہو جائے۔ تبصرہ پڑھ کر بھی تو کام چل سکتا ہے۔ اسی لئے لوگ تبصرے بڑے شوق سے پڑھنے لگے ہیں۔ اب ہم ان کتابوں پر اپنی رائے دینے کا حق رکھتے ہیں۔ مہذب محفل میں ہمیں کوئی بیوقوف نہیں کہہ سکتا۔ اس بھاگا دوڑی کی زندگی میں مسرت کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ زندگی میں سکون و اطمینان یقیناً زندگی کے چھ جزوں میں بڑا ہیں، اس تیز گھوڑے کو اپنی رانوں کے نیچے رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ

وہ پہلیں جابہ ہر جا ہے لئے دوڑتا پھرے، زندگی کو جنگ سمجھنا، یہ سمجھنا کہ یہ صرف پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے اور ہم صرف اپنے ہی مقابل کو پچھاڑنے کے لئے دنیا میں آئے ہیں، ایک طرح کا فریب ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری آرزو تو طاقتور ہو جاتی ہے لیکن سکون تباہ ہو جاتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ہم سکون و اطمینان کی قیمت سمجھیں۔ زندگی کی خوشی کھو کر جو اطمینان ملے وہ ایسا ہی ہے جیسے اندھی آنکھوں کے سامنے کوئی تماشا۔ سکون کی غایت ہے مسرت۔ اگر کامیابی سے دکھ بڑھے، اضطراب بڑھے تو وہ حقیقی مسرت نہیں۔

مستقبل کی فکر دکھ کا سبب ہی نہیں بلکہ علت غائی ہے۔ کل کہیں چل بسیں تو کیا ہوگا گھر کا کچھ انتظام نہ کر سکے۔ مکان نہ بنوا سکے۔ پوتے کا بیاہ بھی نہ ہو سکا۔ ادھر ہم نے آنکھیں بند کیں اور ادھر ساری گرہستی تین تیرہ ہوئی۔ لڑکا آزاد ہے پیسے کی قدر نہیں کرتا۔ نہ زمانہ کا رخ دیکھتا ہے، اسی فکر سے اکثر رات کو نیند نہیں آتی جس کی وجہ سے صحت پر برا اثر پڑتا ہے ایسی ذہنیت نئی نئی فکروں کے پیدا کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ دو چار دن کھانسی ہوئی تو فوراً تپ دق کا شک ہو گیا دو چار روز ہلکا سا بخار آ گیا تو ٹائیفائڈ کا شبہ ہونے لگا۔ اگر جوانی میں آنکھیں بہک گئی تھیں تو اب گناہ کا احساس دل کو دبائے جا رہا ہے، یہی فکر دامن گیر ہے کہ اس گناہ کا بدلہ کیا آفت لائے؟ لڑکا بیمار ہو گیا اور منت مرادیں ہونے لگیں۔ بس اسی کی سزا ہے۔ کسی بڑے مقدمہ میں ہارے اور وہی خیال سر پر سوار کہ یہ سب اسی کا پھل ہے۔ اتنا بوجھ رکھ کر زندگی کیسے بیتے گی۔ دوزخ کا ہیبت ناک تصور کھانا پینا حرام کر دیتا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ آدمی ٹھنڈے دل سے ہر ایک موضوع پر غور کرے یہاں تک کہ اس پر اس کے سارے پہلو روشن ہو جائیں، تم کیوں سمجھتے ہو کہ تمہارے لڑکے تم سے زیادہ نالائق ہوں گے؟ اسی طرح تمہارے باپ نے بھی تو تمہیں نالائق سمجھا تھا۔ مگر تم تو لائق ہو گئے اور آج گرہستی کی دیکھ بھال مزے سے کر رہے ہو، تمہارے بعد تمہارا لڑکا بھی اسی طرح گھر سنبھال لے گا۔ ممکن ہے وہ تم سے زیادہ عقلمند نکلے

اور گناہ کو تو ایک ڈھکوسلا بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے حساب سے تو کوئی شرابی نہیں، ہم نے پی لی تو گناہ کے مرتکب ہوئے۔ کیوں گناہ کیا؟ کروڑوں آدمی روز پیتے ہیں علانیہ پیتے ہیں۔ وہ اسے گناہ نہیں سمجھتے۔ بلکہ ان کی نگاہ میں جو شراب نہ پیئے وہی پاپی ہے۔ ہمارے کل میں گوشت کھانا پاپ ہے۔ ہم نے کھا لیا تو کوئی پاپ نہیں کیا۔ ساری دنیا کھاتی ہے پھر ہمارے لئے گوشت کھانا کیوں پاپ ہے؟

گناہ وہی ہے جس میں اپنا یا دوسروں کا نقصان ہوتا ہے اگر شراب پینے سے تمہارے سر میں درد ہونے لگتا ہے یا تم بہک کر گالیاں بکنے لگتے ہو تو بے شک شراب تمہارے لئے گناہ ہے۔ اگر تم شراب کے لئے اپنے بچوں کو کھانے پینے کی تکلیف دیتے ہو تو وہ بے شک گناہ ہے۔ اور اسے فوراً چھوڑ دو۔ اسی طرح اگر گوشت کھانے سے تمہارے پیٹ میں درد ہونے لگے تو وہ تمہارے لئے جائز نہیں۔ گوشت ہی کیوں، دودھ پینے سے تمہارا ہاضمہ بگڑ جائے تو دودھ بھی تمہارے لئے جائز نہیں۔ مذہبیت و لامذہبیت کے جھگڑوں میں پڑ کر خدا کے متعلق بحثیں کر کے کیوں خود کو دکھی کرتے ہو؟ یا نا ممکن ہے اس قسم کی غلامی! اگر تمہارا اکثر قسم کے لوگوں میں کچھ رسوخ بڑھ جائے۔ لیکن یہ ہے بیوقوفی تم خود سوچو کہ حقیقت میں برا کام کونسا ہے۔ اپنے کاروبار میں اوچھا پن، نوکروں سے خراب برتاؤ، بچوں پر ظلم اور سختیاں اپنے ساتھیوں سے رشک بغض و حسد، دوسروں پر اتہام، بری نیت، دغا، فریب یہ سب حقیقت میں برے جذبے اور برے کام ہیں جن کی قانون میں بھی سزا نہیں۔ لیکن جن کے باعث انسانی سماج تباہ ہو رہا ہے۔ دل میں گناہ کے تصور کا بیٹھ جانا ہماری خودی کو مٹا دیتا ہے۔ اور جب خودی کو ٹھیس پہنچے تو سمجھو بہت کچھ چلا گیا۔ پاپی سدا بغض و حسد سے جلا کرتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں کے عیب دیکھا کرتا ہے۔ سدا مذہب کا ڈھونگ رچا کرتا ہے۔ جب تک وہ دوسروں کے گناہ کا پردہ نہ کھول دے اور اپنے

مذہب پرست ہونے کی دھاک نہ بٹھائے اس کو تسلی نہیں ہوتی۔

ہمارے ایک دوست ایسے ہیں جنہیں ہمیشہ یہ فکر ستایا کرتی ہے کہ لوگ ان سے جلتے ہیں، ان کے مضمونوں کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ ان کی کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں، کچھ لوگوں نے ضرور ایک جتھا بنا کر ان کی بے عزتی کی ٹھانی ہے۔ ایسے آدمی دوسروں سے اس طرح خائف رہتے ہیں گویا وہ خفیہ پولس ہوں۔ پس جس نے ان کی تعریف نہ کی اسے اپنا دشمن سمجھ لیا، اس کا سبب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے کو اس سے کہیں بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔ جتنے وہ ہیں، دنیا کو کیا غرض پڑی ہے کہ ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے۔ ہم اپنی تحریروں کو انمول سمجھیں لیکن دوسرے تو اسے انمول اسی وقت سمجھیں گے جبکہ در حقیقت وہ انمول ہو گی۔ یہ ذہنیت جب بہت بڑھ جاتی ہے تب آدمی اپنے لڑکوں کو بھی اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال کرتا ہے کہ اس کے لڑکے اس کا زیادہ خیال رکھیں، یہ خلاف فطرت ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے کو خواہ وہ اس کا لڑکا ہی کیوں نہ ہو اس کی فطری راہ سے ہٹا کر اپنی راہ پر لگائے۔

(مترجمہ) امجد یوسف زئی

غزل

راز الفت عیاں نہ ہو جائے
بے زبانی زباں نہ ہو جائے

ہے تغافل سے راز عشق نہاں
وہ کہیں مہرباں نہ ہو جائے

عشق کرتے تو ہو مگر اے دل
زندگی بے اماں نہ ہو جائے

ضبط ہے خوب پر نگاہ شوق
تو سراپا زباں نہ ہو جائے

اپنی بیباک نظر کو دیکھو
پھر کوئی نیم جاں نہ ہو جائے

تری فرقت ملی ہے قسمت سے
یہ بھی آرام جاں نہ ہو جائے

یوں نہ گردن جھکا کے شرماؤ
درد کا امتحاں نہ ہو جائے

ان کو لکھو تو دیا ہے پر بیتاب
یہ بھی غم جاوداں نہ ہو جائے

بیتاب مظفر نگری

وقت کا نقاش

ہو نہ جائے زندگی مایوس لمحوں کا شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
مشتعل جذبات میں جوشِ قیامت خیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزو ہیں پاش پاش
زندگی تو ہیں، ذوقِ زندگی ہے دل خراش
کچھ نہیں ہے عظمتوں کے قافلے کا اعتبار
انتشارِ مرگ ہے گل کو تبسم کا خمار
چاند کی کرنیں بھی ہیں تاریکیوں سے ہمکنار
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

نور کے تڑکے چمن کیا جلوہ در آغوش تھا
ڈالیاں گلزار کی گویا سراپا نور تھیں
مستیاں تھیں، نکہتیں تھیں، زندگی تھی جوش تھا
کیف میں ڈوبی ہوئی تھیں قہقہوں میں چور تھیں
اک طرف یہ رنگِ محفل پھول تھے نکھرے ہوئے
دوسری جانب، ادھر پر کیف ہنگاموں سے دور
زندگی کا منظر غمناک وحشت کوش تھا
عشق پیچاں کے قریب ان زرد رو آموں سے دور
ایک ننھی سی کلی تھیں جس کی آشائیں جوال
موت کے آغوش میں کچھ پتیوں کے درمیاں
اور اس مرقد پہ آنسو جابجا بکھرے ہوئے

زندگی کے میکدے پر ابر پاروں کا خرام
چھوڑ پی لینے دے پی لینے دے جرعاتِ شباب
مستیوں کے آبشاروں پر بہاروں کا خرام
جھیل کی موجیں درخشندہ ستاروں کا خرام
یہ حسیں لمحات آنے کے نہیں پھر بار بار

میرے ہونٹوں پر ترے بوسوں کی ہلکی سی پھوار
ہاں، سمو سکتی ہے تشنہ کام آنکھوں میں خمار
بخش سکتی ہے دلوں کو خندۂ فرخندہ بہار
روح کو بالیدگی اور زندگی کو برگ و بار
مضطرب سینے میں اک جذبات کا طوفان ہے
دل میں ارماں اور ارمانوں میں اک ہیجان ہے
سر ترے سینے پہ ہو مدہوش سا کھویا رہوں
اس طرح سوؤں ہمیشہ کے لئے سو یا رہوں

چھوڑ پی لینے دے پی لینے دے جرعاتِ شباب
یہ شبابِ چند روزہ اور کیف آور شراب
ہاں میسر ہو نہیں سکتے ہمیں پھر بار بار
ایک دن ہو جائیں گے مایوس لمحوں کے شکار
مضمحل افکار ہیں ماحول یاس انگیز ہے
حادثاتِ زندگی سے آرزو میں پاش پاش
زندگی کا خواب اک خوابِ فسوں انگیز ہے
وقت کا نقاش ہے ہنگامہ گر افسوں تراش

افسر آذری

برسات کا دل فریب موسم، رات بھر برس کر بارش تھم چکی تھی۔ آسمان پر چھایا ہوا ابر غائب ہو چکا تھا اور خوش گوار دھوپ دھندلے بازاروں کو روشن کر رہی تھی۔ ایسے میں ناہید باجی نے پھولوں کو گل دان میں رکھتے ہوئے پوچھا — "اب کا اتوار کہاں گزارا جائے"؟

ننھی بھیا جھٹ بول اٹھے "قطب!"

ہم نے منہ چڑا دیا۔ "قطب، بڑے آئے قطب کے، وہ دھرا ہی کیا ہے وہاں۔ — ایک ادھوری مسجد۔ چند ٹوٹی پھوٹی قبریں۔ ایک اجڑا سا باغ —"

ابا جی ہنستے ہوئے بولے "سچ تو کہتی ہے ننھی۔ گزشتہ اتوار قطب ہی میں تو گزرا۔ کوئی نئی جگہ بتاؤ —"

ناہید باجی نے ہمیں اشارے سے رات والی بات یاد دلائی۔ میں جلدی سے بول اٹھی۔ "اچھے ابا جی اوکھلا چلئے اب کے —" بھیا نے منہ بنایا۔ امی واہیات کہہ کر خاموش ہو گئیں اور ابا جی کچھ سوچنے سے لگے۔ کچھ دیر بعد بولے۔ "اچھا اس دفعہ اوکھلا سہی۔ یہ کوئی خاص جگہ نہیں —"

"واہ اس دن سنا نہیں نازو کتنی تعریف کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی دلّی میں رہ کر جس نے اوکھلا کی سیر نہ کی اس نے سیر کا لطف اٹھایا ہی نہیں۔" ہم نے ابا جی کی گھڑی کی زنجیر سے کھیلتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو اتوار کب ہے؟" ابا جی نے پوچھا۔

"پرسوں —" سعید باجی نے پہلی دفعہ ہماری باتوں میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ یہ سعید باجی ہماری بس کچھ یوں ہی سی ہیں۔ فلسفہ سے بڑی دلچسپی ہے انھیں۔ لیکن پڑھتی نہیں۔ بس یوں ہی بغیر پڑھے لکھے چاہتی ہیں کہ ایک دم سے فلسفی بن جائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے ان کی۔ بغیر جانے بوجھے کوئی ڈاکٹر بن جائے، کوئی فلسفی بن جائے اور مانے کیا کیا کچھ بن جائے۔ گزشتہ اتوار جب ہم قطب گئے تھے تو اس وقت ابا جی اور امی تو جانے کیا کیا کہہ کر ہنس رہے تھے اور ہم تینوں بھیا، بہن اور ناہید باجی قطب کی سیڑھیاں ہر بار اپنی بے پناہ باتوں میں بھول کر پھر سے ٹھیک گننے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے تو ہماری سعید باجی، ابا اور امی سے کچھ دور ایک ننھی سی جھاڑی کے نیچے بیٹھی ہیں تو کچھ اونگھتی سی لگیں۔ جانے کیا کیا سوچ رہی تھیں۔ جب میں نے قریب آ کر انھیں گدگدایا تو وہ یوں چونک سی گئیں جیسے ان کے سنہرے سپنے کے تار ٹوٹ گئے ہوں —!

ہاں تو میں کہاں بہک گئی — کہہ رہی تھی اوکھلا کی بات اور پہنچ گئی قطب۔ تو ہفتہ کے دن میں نے اور ناہید باجی نے کل ساتھ لے جانے والے سامان اور مختلف کھانوں کی فہرست تیار کی۔ کچھ سامان خود درست کیا اور باقی شرفو نے کر لیا۔ کھانوں کی فہرست باورچی کو دے دی اور چپکے سے کہہ دیا میٹھی چیزیں زیادہ تیار کرے اور پھر رضیہ اور فرحت کو نوکر بھیج کر بلا لیا اور پھر باتوں میں دن گزر گیا جیسے کبھی آیا ہی نہ ہو — رات بھر اوکھلا کے خواب دیکھتے رہے۔

صبح ابھی چڑیوں کی چوں چوں بند نہ ہوئی تھی کہ ہارن کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ کھڑکی میں سے جھانکا کچھ نظر نہ آیا۔ ہر چیز دھند کے پردوں میں لپٹی ہوئی تھی — جلدی سے بستر بچھونا پر سے اتری۔ ابا جی اٹھ چکے تھے — موٹر گیٹ کے اندر آ گئی تھی میں قریب گئی — اوہ — ابا جی کے دوست اور

ان کی بیوی - اور ارے یہ ہماری شمسی — "ٹھیک موقع پر آئی بھئی - چل اوپر - یہاں تو ٹھنڈی ہوا سے جان نکل رہی ہے"۔ اور ہم دھول دھول اوپر بھاگے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شمسی نے بتایا کل اباجی نے ٹیلی فون پہ کہا کہ ہم سب صبح سات بجے تک اوکھلا جا رہے ہیں شام تک واپس آجائیں گے، تم لوگ ضرور آنا۔ رضیہ اور ناہید باجی تو جاگ اٹھی نہیں مگر نیند کی ماتی فرحت سو رہی تھی - شرارت جو سوجھی تو ایک گلاس بھر ٹھنڈا پانی اس کی گردن اور منہ پر الٹ دیا۔ معصوم گھبرا کر اٹھ ہی تو بیٹھی - وہ کانپ رہی تھی - جانے اس ٹھنڈے پانی کے اثر سے یا پھر خواب میں کسی بھیانک دیو کو گلا گھونٹتے دیکھ پایا ہو - پانچ منٹ بعد ہوش میں آئی تو لگی غصہ کرنے —— سیکڑوں صلواتیں سنا ڈالیں —— بدلہ لینے کی دھمکی دی —— - اور پھر کھو گئے سب باتوں میں —- کبھی نہ ختم ہونے والی باتیں —- بے سر و پا باتیں ——

"اے لڑکیو - بس ختم بھی کرو اپنی باتیں —— کب سے انتظار ہو رہا ہے چائے پر تمہارا —— ادئی! تو نے ابھی تک کنگھی تک نہیں کی —" امی نے میرے بکھرے بالوں کی لٹ کھینچتے ہوئے کہا۔

"ابھی پانچ منٹ امی اور ہم آئے ——" کہہ کر بھاگی، میں غسل خانہ میں —— بس ذرا یوں ہی سا منہ دھو — کپڑے بدل کرے میں آئی - فرحت، رضیہ، ناہید اور شمسی سب ہی تو چلنے تیار کھڑے تھے - ایک دوسرے کے رنگ برنگے لباس پر قہقہے لگاتے ہوئے نیچے آئے۔ اباجی کے دوست کو چچا کہہ کر سلام کیا اور ان کے قریب ہی جا بیٹھ گئی - یہ ہماری شمسی کے بھی تو چچا ہیں نا۔ باجی نے جلدی جلدی سب کو چائے بنا کر دی اور کوئی قریب آدھ گھنٹہ لگا چائے پینے میں - اسی دوران میں شوفر نے اطلاع دی کہ موٹریں تیار ہیں اور سب سامان موٹروں میں رکھ دیا گیا ہے - ہم نے سوچا اپنی والی موٹر میں بیٹھیں - بھیا جو ڈرائیو کریں گے - بڑا مزا رہے گا - جلدی سے میں اور رضیہ بھاگے اوپر — کیمرہ اور گراموفون بھول آئے تھے۔ "پک نک بغیر گراموفون اور کیمرے کے کچھ پھیکی پھیکی سی لگتی ہے"۔ یہ رضیہ کہتی ہے ہم نہیں - بوجھل سا گراموفون اور کیمرہ سنبھالے جب ہم نیچے آئے تو موٹروں میں سب بیٹھ گئے تھے - سامنے والی سیٹ پر بھیا کے پاس شمسی اور ننھی سی فرحت بیٹھی تھی - فرحت کو گدگدایا — شمسی کے چٹکی لی — "ہٹ یہاں سے نہیں تو کہہ دوں گی سب سے رات والی بات —" وہ کچھ کسمسائی اترنے کے لئے - بھیا نے شمسی کا بازو پکڑ لیا۔ "نہ جانا شمسی یہاں سے - یہ یہاں بیٹھ کر بیہودہ کو چھیڑ چھیڑ کر بیکار سوالوں سے میرا دماغ چاٹ جائے گی"۔ بڑی مشکل سے بھیا راضی ہوئے اپنے ساتھ بٹھانے - شمسی اور فرحت پیچھے چلی گئیں —— راستہ قہقہوں اور دلچسپ باتوں میں گزرا — سرسراتی ہوئی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے دل کو گدگدا رہے تھے - آسمان پر اجلے اجلے بادل منڈلا رہے تھے اور جب ہم بند کے قریب پہنچے تو بادل نیچے کی طرف پھیل رہے تھے - ہوا میں جان بخش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوش بو - شکر ہے سعید باجی اس دفعہ بجائے امی کے ساتھ بیٹھ کر ہم پر رعب جمانے کے ہمارے مسکراتے قہقہوں میں شریک تھیں۔

دہلی کے تفریحی مقامات میں اوکھلا ایک پرفضا تفریح گاہ ہے - یہاں ایک چھوٹا سا بند اور ایک ننھا سا آبشار ہے جس سے اطراف میں ایک دل فریبی پیدا ہوگئی ہے اور جس وقت دریائے جمن کا چمکتا ہوا پانی لاکھوں پیچ و تاب کھاتا ہوا اس چھوٹے سے بند سے ٹکراتا ہے اور پھر اس ننھے سے آبشار سے چادر بن کر شور کرتا نیچے گرتا ہے تو بے حد

دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ ایک جگہ آبشار بہت زور شور سے گرتا ہے اور جس وقت یہ ہزاروں ننھے ننھے تاروں سے چمکتی ہوئی پانی کی چادر نیچے گرتی تو پانی میں ایک تلاطم ایک ہیجان برپا کر دیتی — ان گنت بلبلے بنتے اور پھر بگڑ جاتے اور اس بننے اور بگڑنے نے نظارے کو افسانوی اور دل فریب بنا دیا ہے۔

موٹر سے اتر کر ہم لوگ ریشم کی طرح نرم اور ملائم گھاس پر لیٹ گئے۔ ابا جی اور چچا سگار پیتے ہوئے ایک دوسرے سے باتیں کرنے لگے۔ امی اور ان کی بہنیں بھی کچھ باتیں کرنے لگیں جو ہماری سمجھ میں خاک نہ آئیں — یہی خاندان کی باتیں — کسی کی شادی کی — کسی کے مرنے اور کسی کی پیدائش کی۔ اور خدا جانے وہ لوگ کیا کیا کہتے رہے ایک دوسرے سے۔ بھیا بندوق میں کارتوس بھر رہے تھے اور شرفو مچھلیاں پکڑنے ڈور کو درست کر رہا تھا اور ہم ان سب کے درمیان بیٹھیں کچھ احمق سی لگ رہی تھیں — کسی نے رائے دی کہ گراموفون لے کر یہاں سے نو دو گیارہ ہو جانا جانا چاہئے اور اس طرف دور پرے جو بڑا سا درخت ہے اس کے موٹے سے تنے کی اوٹ میں بیٹھ کر گراموفون بجایا جائے۔ میں نے اور رضیہ نے اس کی تائید کی اور گراموفون اٹھا کر چلے۔ ابا جی نے جاتے جو دیکھا پوچھا — کہاں چلیں — ؟"

"کہیں نہیں — بس ذرا یہاں تک .. اس درخت تک — ذرا وہ —" بات پوری کہنے نہ پائی کہ چچا جو شاید کچھ لکچر دے رہے تھے اس ڈر سے کہ وہ اپنی تقریر بھول نہ جائیں جلدی سے بولے — "اچھا تو جاؤ۔" کچھ دور تیز تیز قدموں سے چلے پھر کسی کو دھکا دیا۔ کسی کو گدگدایا اور کسی کے کان میں زور سے سیٹی سی بجا دی — یوں ہنستے کھیلتے اس تناور درخت تلے پہنچے۔ کہ اگر اس کے تنے کی اوٹ میں ہم میں سے چار چھپ جائیں تو اس پار والے بالکل نہ دیکھ پائیں۔ اور پھر دھپ دھپ کر کے گھاس پر یوں جم کر بیٹھ گئے جیسے اب وہاں سے اٹھنے کے ارادے ہی نہیں — کچھ دیر گراموفون بجایا۔ پھر رضیہ نے، شمسی نے اور ناہید باجی نے فلمی گیت سنائے اور پھر بس یوں ہی ایک دوسرے کو گدگداتے رہے اور ہنستے رہے اور جب جلدی جلدی ان سب باتوں سے جی بھر گیا تو (Opinions) کھیلتے رہے اور پھر جب یہ کھیل بھی ناہید باجی کے کوئین (Queen) بن جانے پر ختم ہو گیا تو آنکھ مچولی شروع ہوئی۔ آنکھ مچولی میں بڑا لطف آیا۔ کھیل بہت دلچسپ رہا۔ سعید باجی ہر بار چور بن جاتیں۔ کچھ ان کے چور بننے پر رحم سا آ رہا تھا اور کچھ کھیل کو دستے نڈھال سے ہو رہے تھے اور کچھ بھوک بھی لگ رہی تھی، اس لئے کھیل ختم کیا اور واپس آئے۔

شرفو اور بھیا نے چار پانچ مچھلیاں پکڑی تھیں۔ بھیا کے بے حد اصرار پر سعید باجی اور شمسی نے مچھلیوں کو تلا اور پھر سب نے وہیں ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ شرفو اپنی بانسری بجاتا رہا اور ہم کھاتے رہے۔ اسے بھوک نہ تھی۔ کم بخت نے کھا لیا ہوگا ڈٹ کر صبح — اور پھر کھانے کے بعد دیکھتے دیکھتے آسمان پر کالے کالے بادل پھیلتے ہی گئے۔ ہلکا سا جھکڑ بھی چلنے لگا — بارش کے آثار تھے۔ جلدی جلدی سب سامان موٹروں میں ڈالا — بس تھوڑی سی دیر ہلکی سی بارش ہو کر آسمان صاف ہو گیا اور ہم ایک درخت تھ

کھڑے قدرت کے مذاق کی اس آن کا ملاحظہ کرتے رہے۔

قریب کوئی چار بجے چائے پی اور وہ مٹھائیاں وسالمہ تھیں۔ خوب کھائیں اور پھر یوں ہی باتیں کرتے کرتے شام ہوگئی۔ بھیا نے کہا آؤ چلو شکار کریں۔ فرحت اور سعید باجی وہیں رہیں اور ہم چاروں اور بھیا اور شرفو چلے شکار کرنے۔ پیاری پیاری مرغابیاں پنکھ پر پھیلائے نہر میں تیر رہی تھیں۔ بھیا نے ان کا نشانہ لگایا تو شمسی نے سہم کر ان کا ہاتھ پکڑ لیا ——
"نہیں بھیا ان تیرتی ہوئی خوبصورت مرغابیوں کو تو نہ مارو۔ ——" بھیا نے ہنس کر اڑتے ہوئے جل کوے کا نشانہ لگایا۔ اٹھائیں کی آواز اور دور پرے بیچارا جل کوا مرا پڑا تھا۔ شمسی بندوق کی آواز سے کانپ اٹھی، اس نے بھیا سے بندوق چھین لی ——
اب کسی کو نہ مارنا۔ وعدہ لے کر دیدی۔ ہائے رے! کتنے کمزور دل کی لڑکی ہے یہ شمسی اور پھر شرفو سے بھیا نے اپنا سوئمنگ ڈریس لیا اور چلے درخت کی آڑ میں پہننے۔ شمسی اور ناہید ریت پر کچھ نیم دراز باتوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔ میں اور رضیہ ہم دونوں نہر میں پاؤں لٹکائے پانی میں ننھی ننھی کنکریاں پھینک رہے تھے۔ لہریں ہمارے پاؤں سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں۔ ایک لہر آکر لوٹتی تو دوسری دور سے سربلند کرتی اور وہ بھی یوں ہی آکر لوٹ جاتی۔ شلوار گیلی گیلی سی ہوگئی تھی مگر ہم لہروں کی دلچسپیوں میں گم سوچ رہے تھے "اگر ہم جل پریاں ہوتیں تو ——" غڑاپ کی آواز کے ساتھ ہی ہم دونوں پلٹیں۔ "کوئی گرا ——" رضیہ نے تقریباً پریشان ہوکر کہا۔ —— میری چیخ نکل گئی "بھیا" اور دوسرے لمحہ متلاطم پانی کی سطح پر بھیا کا مسکراتا چہرہ نظر آیا اور ہم دونوں ہنس پڑیں اپنی بھول پر —— رضیہ بھاگی کیمرہ لینے۔ بھیا کی نہاتے ہوئے تصویر لی۔ نہر کا پانی شیشہ کی طرح چمک رہا تھا۔ آسمان پر گھٹائیں سی چھائی ہوئی تھیں اور ایک طرف دور نہر کے اس پار افق پر دھنک نکلی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کوئی مسکراتی دوشیزہ رنگ برنگ کی چندری اوڑھے کھڑی ہو۔ پانی سے بھیگی ہوائیں طبیعتوں کو گدگدا رہی تھیں۔ نہر کی پُرشور لہریں ابھر ابھر کر پیاری پیاری راگنیاں سنا رہی تھیں۔ ناہید باجی گا رہی تھیں ——
"گھر کر آئی بدریا گھر آؤ" شام کا وقت، نہر کی مضطرب لہریں ہوا کے سرور انگیز جھونکے ——
ناہید باجی کی سحر انگیز آواز، فضا ایک روح افزا شعریت میں ڈوب گئی۔ ہستی کا ذرہ ذرہ مدہوش سا ہونے لگا۔ اس وقت کی یاد مدتوں ہمارے دل میں رہے گی اور پھر جب آسمان پر گھٹائیں کچھ کالی اور کچھ اودی سی ہونے لگیں تو ناہید باجی اور شمسی نے ایک گیت "چھائی ہے کالی گھٹا جیا مورا لہرائے ہے" گا کر فضا میں ایک سحر آلود کیفیت پیدا کردی اور پھر ایک دوسرے کو گدگدا کر، ہنس ہنس کر وہیں ریت پہ لوٹ لوٹ گئے۔ نہر کا چمکتا ہوا پانی اور اس چمکتے پانی کی مچلتی لہروں کے سینے پر غروب آفتاب کی ارغوانی کرنوں کا عکس، پانی سے بھیگی ہوا کے سرور انگیز جھونکے، دور تک کھلے میدان اور لہلہاتی کھیتیاں اور ذرا دور پر شور مچاتا ہوا وہ ننھا سا آبشار ہماری ملاقات ہی مسرتوں میں برابر کے شریک تھے۔ فضا کی لامحدود وسعتوں میں تاریکیاں پھیل رہی تھیں۔ باجی اور سب ہماری طرف آرہے تھے اور جب گھر واپس چلنے کو کہا —— "گھر، اتنی جلدی" ایسے دلفریب اور حسین نظارے کو چھوڑ کر کس کا جی جانے کو چاہے گا۔ لیکن رات آگئی تھی۔ آسمان پہ کہیں کہیں کوئی ستارہ نظر آرہا تھا۔ پھیکا پھیکا زرد زرد

چاند نہر کے اس کنارے چھائی ہوئی سیاہ گھٹاؤں کے پیچھے سے ابھر رہا تھا۔ خوشیوں میں وقت کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ایک تھکے ہوئے انداز میں ہم سب موٹروں میں بیٹھ گئے۔ دروازے کا سہارا لئے کھوئی ہوئی حالت میں، نہر کے چمکتے ہوئے متلاطم پانی، ننھے سے شور مچاتے آبشار اور کالی کالی اودی اودی گھٹاؤں اور فضا کی سحر آلودگی کا لطف لیتی رہی۔ رضیہ نے گدگدایا اور میں چونک سی پڑی۔ "تو تو یوں کھو گئی جیسے۔ جیسے۔" اور ہم دونوں ہنس پڑے وہ مثال نہ دے سکی۔

اختر محمود

غزل

ان کی باتوں میں دلِ امیدوار آ ہی گیا
جھوٹے وعدوں پر بھی مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

پھر مری اجڑی سی دنیا میں پلٹ آئی بہار
پھر خیالِ یار جنت درکنار آ ہی گیا

رفتہ رفتہ حد سے افزوں بے قراری ہو گئی
آتے آتے قلبِ مضطر کو قرار آ ہی گیا

آخرش سامانِ شکستِ توبہ کے ہو ہی گئے
آسماں پر جھوم کر ابرِ بہار آ ہی گیا

جب شبِ وعدہ ذرا سی بھی کوئی آہٹ ہوئی
میں نے یہ سمجھا وہ جانِ انتظار آ ہی گیا

دل میں برپا ہو گیا طوفانِ رقت اے بہار
لب پہ میرے نالۂ بے اختیار آ ہی گیا

شوراج بہار

ستی

اتنی جلدی اپنی دنیا اجڑتی دیکھ کر لیلا دم بخود رہ گئی۔ اس کا پتی دیو اتنی جلدی دنیا سے آنکھیں پھیرے گا اور اس کے سپنوں کی دنیا پتی کی چتا کے ساتھ یوں جل کر راکھ ہو جائے گی، اسے تو اس کا گمان بھی نہ تھا۔ آہ! وہ اندوہناک لمحہ ——! جب اس کی غم آگیں اور اشک آلود آنکھیں اس کی چوڑیوں سے بھری خوبصورت کلائی کو آخری بار نظر بھر کر دیکھ رہی تھیں ——! پھر اس نے سب چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ ٹوٹی ہوئی نیلی پیلی چوڑیوں کا ڈھیر اس کے سامنے تھا —— اس کی ٹوٹی امنگوں کا انبار عظیم ——————

اب اس کے کان اس کی چوڑیوں کی نشاط آور کھنک کبھی نہ سنیں گے، اس کی آنکھیں اس کا عکس جمال کبھی نہ دیکھیں گی، اور اس کے ماتھے پر وہ من موہن تلک کبھی نہ چمکے گا —— وہ کتنی مجبور تھی بیوگی کا سوانگ بھرنے پر ——! جیسے اسے دنیا میں ڈھنڈورا ہی تو پیٹنا تھا کہ بھئی میں بیوہ ہو گئی ہوں، مجھے نہ چھوؤ، میں نیچ ہوں، سہاگنو! مجھ سے دور رہو، دلہنو! مجھ سے خوف کھاؤ، میں ابھاگن ہوں، رانڈ ہوں رانڈ۔ تمہیں یقین نہیں آتا تو لو دیکھ لو میرے بُچّے[1] ہاتھ، میری بے نور آنکھیں، میرے بے ترتیب بال، میری زندہ درگور جوانی ....!!

لیلا کی عمر سولہ سال کی تھی جب اس کی ماں نے اسے پرائی کر دی تھی۔ بے چاری نے بڑی دوڑ دھوپ کر کے بیٹی کا بیاہ رچایا تھا، مگر بیٹی کے دکھ سکھ دیکھنے کے لئے وہ زندہ نہ رہی اور شادی کے ایک سال بعد ہی کرموں جلی لیلا کا سہاگ لٹ گیا کتنے مختصر تھے اس کی خوشی کے لمحے ——! صبح کے کیف آور سماں کی طرح مختصر اور مجمل ——

اب دنیا میں لیلا کی صرف ایک بڑی بہن کملا اور اس کے شوہر شیو رام تھے، جب انہوں نے یہ غم ناک خبر سنی تو بہت افسوس کیا اور دوسرے دن ہی لیلا کے گھر جا پہنچے۔

کملا نے جب اپنی بیوہ بہن کو کمرے کے کونے میں دبکی بیٹھے پایا تو وہ بے اختیار اس کی طرف لپکی اور اس سے لپٹ کر خوب روئی، خوب واویلا مچایا، جیسے اسی کا گھر اجڑ گیا تھا جیسے اسی کی مٹی پلید ہو گئی تھی۔ لیلا سوچتی کیا میری بہن کو مجھ سے اتنی محبت ہے، کیا میرے برباد ہونے کا اسے اتنا دکھ ہے ——؟ اس سے بھی نہ رہا گیا، یہ بھی روئی مگر اس کا دل شدت غم سے جیسے پھٹ گیا تھا اور آنکھوں میں آنسو جیسے خشک ہو گئے تھے۔ وہ صرف سسکیاں بھرتی رہ گئی، ایک موت تو اتنی خوفناک چیز نہیں، موت تو سب کو آتی ہے، مگر ایک نوجوان ہندو شوہر کی موت —— ! اف!! ایک جوان بیوہ کا پتی کی یاد کو چھاتی سے چمٹائے جیون بِتانا کتنا کٹھن ہے ——!

شیو رام جو اب تک دور کھڑے آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کر رہے تھے لیلا کے قریب آ کر نہایت شفقت و محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے "نہ رو لیلا! دنیا میں کس کے دن ایک سے رہے ہیں؟ کبھی سکھ کبھی دکھ، بھگوان کی یہی مرضی تھی !!"

"بھگوان" لیلا سوچنے لگتی کیا بھگوان کو ہم دکھیاروں کو رلانے میں اتنا مزا آتا ہے؟ وہ کتنا چاہتی تھی کہ اس سے کوئی والہانہ محبت کرتا

[1] چوڑیوں سے خالی ہاتھ

اور عین شادی کے دن وہ مرگئی ہوتی' زندگی بھر رلاتی اسے' خوب انتقام لیتی خوب ..... اور اسے اپنے شوہر پر غصہ آنے لگا' بھلا اتنی جلدی مرنا تھا تو شادی ہی کیوں کی تھی مجھ سے .....

شیورام "سرپرستانہ" وقار سے لیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے' لیلا! تم چنتا نہ کرو۔ آخر ہم کس دن کے لئے ہیں۔ ہمارا گھر تمہارا ہی گھر ہے او ہمارے بچے ." کملا نے بھی اکڑے ہوئے گلے سے کہنا شروع کیا "ہاں ہاں سب کچھ تمہارا ہی تو ہے۔ تم کوئی غیر ہو" اور قدرے توقف کے بعد ایک آہ بھر کر کہنے لگی" اچھا ہی ہوا اماں پہلے ہی چل بسیں' ورنہ اس صدمہ کی تاب نہ لاتیں گھل گھل کر مرجاتیں"

لیلا کو آسرا مل گیا۔ ایک سال بیت گیا۔ اب کملا بالکل بے فکر تھی۔ اب اس کے جسم پر موٹاپے کے آثار نمایاں تھے۔ وہ مزے سے کھا کر ایک جگہ پڑی رہتی اور دن بھر بہن کو حکم دیتی رہتی کبھی کہتی لیلا میری اچھی بہن ذرا وہ تو کر ذرا یہ تو لا" ایک کنبے میں ایک جوان بیوہ کا رہنا کتنا ضروری ہے۔! اس کے گوشت سے بھرے قوی اعضاء پر سماج کی نگاہیں کس حسرت سے پڑتی ہیں —!! شائد انھیں اسی لئے زندہ سلامت رکھا جاتا ہے تاکہ وہ سماج کے بے دام غلام بن کر رہ جائیں تاکہ ان کی انفرادیت ملیا میٹ ہوکر ان کی زندگی اور ان کا سنسار کسی اور کے سنسار کا جزو بن کر رہ جائے۔ لیلا سوچتی کتنے اچھے دن .... تھے وہ جب بیوی پتی کے جلتی چتا میں زندہ جھونک دی جاتی تھی۔! یہ گھل گھل کر مرنے سے تو وہ کہیں اچھا تھا —

لیلا حد درجہ جذباتی عورت تھی۔ وہ سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ وہ بیوہ ہے اور سماج اس سے گھن کھاتا ہے۔ اسی لئے وہ اب بھی بال بناتی' مانگ چوٹی سنوارتی' باہیں ننگی رکھتی اور چہرے پر غازہ ملتی تھی۔ کملا اس کے یہ رنگ دیکھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

گھر کا سارا کام کاج اب لیلا ہی کے سپرد تھا۔ رسوی بنانا' بچوں کو نہلانا' کھلانا' پلانا سب کام یہی کرتی تھی۔ کام کی دھن میں اسے کچھ احساس نہ ہوتا تھا' ایک مشین کی طرح کام میں الجھی رہتی —— مگر جب رات ہوتی اور سارا عالم نیند کی میٹھی آغوش میں سانسیں لینے لگتا تو اسے اپنی ہولناک تنہائی کا احساس ہوتا۔ اس کے دل میں آتشیں جذبات کروٹیں لینے لگتے اور اس کے خیالات بہک بہک جاتے۔ وہ سوچتی پتی برتا استری۔! کتنا مکروہ لفظ ہے ——! عفت و پاکدامنی —! استری کی متاع عزیز —! کتنا فریب ہے !! اور اس کا جی چاہتا اس دکھاوے کی عزت و عصمت کا لباس تار تار کردوں اور بر سر عام لوگوں سے چیخ چیخ کر کہوں "اے سنگدل انسان! دیکھ میں ہوں عورت' تمہاری خوشیوں کا مرکز' تمہاری زندگیوں کا سرمایۂ بے بہا' لوٹ لو اس سرمایہ کو —— میں ہوں عورت — حسین ..... جوان دیکھتے نہیں میرے سینے سے جوانی کس بے باکی سے جھانک رہی ہے —! کیا تم مجھ سے دور بھاگتے ہو' ٹھکراتے ہو اس سرمایہ کو' ہنستے ہو مجھ پر —— ہُنہ" اور اس کے اعضا میں خوفناک تشنج پیدا ہوتا۔ وہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی' وہ چاہتی میں ایک زلزلہ بنوں' ایک خوفناک زلزلہ اور سارے نظام کائنات کو درہم و برہم کردوں' مہا کالی بن کر

سارے عالم پر چھا جاؤں، ساری انسانیت کو کچل کے رکھ دوں، ہر طرف تاراجی پھیلا دوں — تباہی ـــــ تاراجی ـــــ خون ـــــ خوب پی لوں خون، خوب روح کی پیاس بجھاؤں ـــــ" اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں بستر پر اوندھے منہ گر پڑتی —

اور جب صبح ہوتی تو اس کے جذبات کا سمندر پرسکون ہو جاتا اور متلاطم لہریں تھم جائیں جیسے تھک کر چور ہو گئی ہوں اور وہ روز کے کام دھندوں میں کھو سی جاتی، پھر اُسے نہ منگل کی سُدھ رہتی نہ بدھ کی، ایک دن شیورام نے اسے بے طرح چھیڑا - وہ ایک دھلا ہوا فراک الگنی پر سکھا رہی تھی، پاس ہی شیورام چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے - ان کا دو سالہ بچہ ان کے زانوں پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا - شیورام بچے کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہنے لگے " لیلا! تم کتنی سگھڑ ہو، دیکھتے دیکھتے گھر کا نقشہ بدل ڈالا تم نے، تمہاری بہن سے کچھ ہونا نہ تھا اور اگر تم نہ آتیں ......" لیلا کا گلنار چہرا ایک دم تمتما اٹھا، اس کے تن بدن میں ابال سا آنے لگا، اس کے دل سے گرم اور کھولتے ہوئے خون کے فوارے سے چھوٹنے لگے اور اس کی نسیں تن کر بے حس سی ہو گئیں، اسے شیورام پر بے حد غصہ آرہا تھا۔ وہ سوچتی کیا انھوں نے مجھے اسی لئے گھر پر بٹھا رکھا ہے؟ کیا اس کام کے لئے میں ہی رہ گئی تھی؟ جیسے میرا کوئی دوسرا مصرف ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں، بزدل ـــــ! نامرد ـــــ!" آج بہن کے تیور بھی بگڑے ہوئے تھے۔ لیلا کام کاج سے فارغ ہو کر سنگار کرنے بیٹھ گئی تھی - بملا کمرے میں آکر اسے ایک ٹک دیکھتی رہی - جب وہ سنگار ختم کر چکی تو بملا نے کہا " لیلا تمہارے یہ لچھن ٹھیک نہیں - تم ودھوا ہو - تمہیں یہ بناؤ سنگار کی کیا ضرورت ہے اور یہ منہ پر منوں پوڈر کیوں تھوپ لیا تم نے ـــــ؟ دنیا کیا کہتی ہے تمہیں کچھ پتہ بھی ہے ـــــ؟

لیلا کے جی آئی کہ بال نوچ لوں، کپڑے پھاڑ ڈالوں اور چہرے پر کولتار مل لوں..... مجھے کیا حق ہے میں ودھوا...... آج کام میں کسی طرح اس کا جی نہ لگا - دن بھر دل میں بے کلی سی رہی، پھر رات کی، بھیانک تنہائی کے خیال کرکے ابھی سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

مگر آج اس کا مضمحل اور تھکا ہوا جسم بہت جلد نیند کی سکون آمیز زنجیروں میں جکڑ گیا ـــــ رات میں اس نے عجیب عجیب خواب دیکھے - اس نے دیکھا ہندوستانی بیوہ استریوں کا ایک جلوس چلا آرہا ہے - زرد زرد مرجھائے ہوئے چہروں والی بیوائیں جن میں جوان بھی تھیں اور ادھیڑ بھی - بیوائیں جن کے بہادر اور کڑیل نوجوان شوہر جنگ میں آخری وقت تک لڑتے لڑتے دم توڑ دئے تھے اور جن کی بہادری کے صلے میں انھیں "وکٹوریا کراس" عطا کیا گیا تھا! سب کی سب ایک جہنمی بھٹی، ایک نمرودی الاؤ کے گرد آ کھڑی ہوئی تھیں - الاؤ سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے اور ایک قوی جثہ اہرمنی شکل کا دیو باری باری سے انھیں پکڑ کر دہکتی آگ میں جھونک رہا تھا - ان کے نالہ و شیون اور دیو کے خوفناک قہقہوں سے فضا گونج رہی تھی ... لیلا چیخ مار کر اٹھ بیٹھی - وہ کانپ رہی تھی اور اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا - اس نے محسوس کیا جیسے ان الاگنوں میں

تو بھی تو شامل تھی۔

تین چار دن سے شیو رام کے گھر میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ پونا سے ان کا چھوٹا بھائی ہری رام آیا ہوا تھا۔ پچیس چھبیس سال کا سن تھا' بشرہ زرد اور مرجھایا ہوا' کوئی عاشقِ تشنہ کام معلوم ہوتا تھا۔

لیلا دن بھر ہری رام کی دلجوئی میں لگی رہتی تھی۔ اس کام میں اسے ایک قسم کا سکھ ملتا تھا اور لذت سی محسوس ہوتی تھی۔ ان دنوں وہ ہشاش بشاش بھی نظر آنے لگی تھی' چہرے پر نہ وہ افسردگی کی زردیاں تھیں اور من پر نہ وہ غموں کی کالی بدلیاں۔ اب راتوں میں جھلملاتے تارے اسے ان جانے سے اشارے کرتے اور چندرما مسکراتا ہوا اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے گھورتا —— جب وہ نیند کی گود میں سر رکھے بے خود پڑ جاتی تو رات کے سناٹے میں چپکے چپکے اس کے من کے چور دروازوں سے کوئی انجانی ان دیکھی موہوم سی ہستی دبے پاؤں داخل ہوتی اور اس کے من پر چھا جاتی۔ پھر وہ سپنوں کی دنیا میں کھو جاتی' سندر اور سہانے سپنے —— اسے خود تعجب تھا کہ وہ یوں یکسر بدلتی جا رہی ہے اور اس کی روح کی گہرائیوں میں ایک رومانیت سی کیوں اترتی جا رہی ہے۔ مگر لیلا ہری رام کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر من میں بہت کڑھتا تھا۔ بظاہر خندہ پیشانی سے ملتا اور اس کے ہر سوال کا سیدھے منہ جواب دیتا مگر اس کے دل میں لیلا کے خلاف شدید تنفر کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ دنیا کی اس دھتکاری

اور روندی ہوئی مخلوق کو کیا حق تھا کہ سولہ سنگار کرے اور مسکرا مسکرا کر اس کی طرف یوں دیکھے جیسے صرف اس کی بیوی ہی دیکھ سکتی تھی —!

ہری رام کو آئے آج پانچواں دن تھا —

آج لیلا معمول سے زیادہ مسرور نظر آتی تھی۔ دن بھر وہ ہنستی بولتی رہی۔ رات میں کھانے کے بعد شیو رام اور ہری رام دونوں میں بہت دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جب رات بہت ہو چکی تو شیو رام اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہری رام بالکونی میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ رہے۔ مگر لیلا کی کسی طرح آنکھ نہ لگتی تھی جب بہت دیر تک بستر پر پہلو بدلتے بدلتے آنکھ نہ لگی تو وہ ہولے ہولے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر کھسک آئی۔ فضا میں چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہر سو خاموشی سو رہی تھی۔ آبادی سے قدرے دور جہاں گاؤں کے ڈھوروں کا ریوڑ سوتا تھا' کوئی گوالا دھیمے دھیمے سروں میں بانسری بجا رہا تھا' بانسری کی مدھر مدھر لڑکھڑاتی تانیں لیلا کے کانوں میں جیسے رس گھول رہی تھیں — اس کی روح وجد میں آ کر ناچنے لگی' اس کا من جھولنے لگا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کو کوئی اپنی مضبوط باہوں میں بھینچ لے ..... اس کی ہستی کسی کی ہستی میں سما جائے۔ اس کی روح کسی کی روح میں اتر جائے۔ وہ پلٹ کر ہری رام کی چارپائی کی طرف بڑھی مگر قریب پہنچ کر اس کے پاؤں خود بخود رک گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے وہ ٹھٹھکی۔ مگر اس کے دل میں ہیجان بپا تھا اور جذبات میں ہلچل سی مچی ہوئی تھی — قریب پہنچ کر وہ اپنے بائیں ہاتھ کی لرزتی ہوئی انگلیاں ہری رام کے خشک بالوں میں الجھا کر کانپتی ہوئی

مدھم آواز میں بولی "سو رہے ہیں آپ؟" ہری رام ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور مندی مندی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ لیلا اب ان کی چارپائی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی اور کہہ رہی تھی "دیکھئے موسم کتنا خوش گوار ہے...... ہر طرف چاندنی.. اور......" اس کی آواز گلے میں اٹک گئی ——

ہری رام کی کرخت آواز اس کے کانوں میں آئی "ذلیل عورت! تیرے یہ لچھن —!! ناشدنی تجھے لاج نہیں آتی — آخ...... تھو...... مہا پاپنی...... !!"

لیلا کے دل پر جیسے ہزاروں بجلیاں گر پڑیں۔ اس کی جوانی جیسے کسی سنگلاخ چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ وہ دم سادھے تھوڑی دیر کے لئے مبہوت و مضطرب کھڑی رہی اور پلٹ کر بے تحاشا دوڑتی ہوئی آئی اور کمرے کے اندر گھس کر بستر پر اوندھے منہ گر پڑی۔

اب وہ سچ مچ بیوہ معلوم ہونے لگی تھی۔ اب نہ بناؤ تھا نہ سنگار۔ اس کا دل اب چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اس کی زندگی میں کئی ایسے موقعے آئے جب اس کا دماغ بہک جاتا اور دل بے قابو ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے پیروں کو کبھی لغزش نہیں ہوئی اور اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ وقت گزرتا رہا۔ بسنت رت آتی رہی اور ان گنت چڑیاں ہری بھری گھنیری شاخوں پر جھوم جھوم کر راگیں الاپتی رہیں، ساون کی کالی کالی گھٹائیں آسمان کے لامحدود پھیلاؤ میں گاڑھے دھوئیں کے مرغولوں کی طرح رینگتی رہیں —— مگر لیلا کے من میں وہ ترنگیں کبھی نہ اٹھیں اور وہ وجد آفریں نغمے کبھی نہ پھوٹے........

اب راتوں میں کبھی کبھی اس پر غشی طاری ہوتی تھی اور دن میں کام کرتے بہت جلد تھک جاتی تھی۔ اس کی روح ایک ابدی سکون کے لئے بہت تڑپتی تلملاتی، مگر اس کی منزل جیسے بہت دور تھی اور وہ تھکی ہاری...... نڈھال ...... مضمحل...... افسردہ.......

وقت کا بوڑھا دیوتا بیٹھا اونگھتا رہا.... اونگھتا رہا...... ہر چیز آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر اپنے انجام کی طرف بڑھتی اور مٹتی گئی فطرت کی پُر اسرار وسعتوں میں گم ہوتی گئی —— مدتیں بیت گئیں...... دن گزرتے گئے۔ اب شام ہونے والی تھی، اس کی زندگی کا اداس سایہ ڈھلنے والا تھا۔ ناکام و نامراد وہ صفحۂ ہستی سے گم ہونے والی تھی...

سی۔ ایم۔ ریڈی (عثمانیہ)

حال ہی میں ہم ایک "برخوردار" بیمار کو میسور لے گئے تھے، یہ بیمار کوئی آٹھ مہینے سے ہلکے بخار میں مبتلا تھا، علاج کے سارے پاپڑ بیل ڈالے مگر بخار نہ جانا تھا نہ گیا! "قطب از جا نمی جنبد" کا مضمون تھا!! اکیس دن "ٹائیفائیڈ" میں مبتلا رہنے کے بعد تین ہفتوں تک ٹمپریچر نارمل بلکہ سب نارمل رہا مگر پھر ۹۹ اور ۱۰۰ کے درمیان رہنے لگا۔ "ٹائیفائیڈ" کے دوران میں جو ڈاکٹر صاحب علاج کرتے تھے کوئی دو درجن انجکشن بخار جانے کے دئے مگر کچھ نہ ہوا! ایک اور مشہور ڈاکٹر ان کے شریک ہوئے بعد "غور کامل" ایک درجن اور انجکشن دینے کی رائے ہوئی، اس کے بعد بھی بخار کا وہی حال تھا!!

تنگ آمد بہ جنگ آمد! ہم نے ڈاکٹروں کو خیرباد کہہ کر طبیبوں سے مشورہ کیا، ایک مشہور طبیب نے "جگر کی خرابی" تشخیص کی۔ گولیاں، جوارش، معجون، سفوف، عرق وغیرہ وغیرہ سب کچھ دئے مگر ہنوز روز اول!! ایک مہینہ اس طرح گزرا۔ ایک حاذق مشہور ڈاکٹر باقی رہ گئے تھے ایک دن انھیں بھی تکلیف دی گئی۔ ان کے ساتھ قدیم معالج بھی بلائے گئے۔ دونوں نے کوئی ایک گھنٹہ تک امتحان کرکے مشورہ دیا کہ بجلی کا علاج کرانا چاہئے کیونکہ ہنسلی کے غدود بڑھ گئے ہیں۔ دس مرتبہ بجلی دینے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائیں گے، یہی سبب بخار رہنے کا ہے۔ یہ پکی تشخیص تھی: اب ہفتہ میں تین مرتبہ بجلی کے علاوہ کے لئے موجودہ پیٹرول کی سخت راشننگ کے مریض کو موٹر میں ہسپتال لے جانا پڑتا تھا۔ یہ بنفشی شعاعوں کا علاج تھا، روشنی بڑی خوبصورت ہوتی تھی۔ ایک بڑے لیمپ کے نیچے بیمار بیٹھا رہتا تھا، دس مرتبہ کے عوض ہسپتال کے "بجلی ڈاکٹر" کے مشورہ سے ہم نے بیس مرتبہ مریض کو لیمپ کے نیچے بٹھایا مگر چراغ تلے اندھیرا ہی رہا! اب کیا کیا جائے؟

ہمارے ایک دوست "صادق" نے مشورہ دیا کہ ایک ڈاکٹر پرانے بخاروں کے ماہر حال ہی میں کہیں سے آئے ہیں، ان سے مشورہ کرنا چاہئے۔ ایک دن ہم ان سے ملے، کوئی ایک گھنٹہ تک ڈاکٹر صاحب نے بیمار کو بٹھاکر، لٹاکر، الٹاکر، پلٹاکر، ٹھونک کر، بجاکر دیکھا۔ رائے ہوئی کہ ریڑھ کی ہڈی کی مختلف زاویوں سے تصویریں لینی چاہئیں۔ حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ تصویریں دیکھ کر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کچھ صاف نہیں آئی ہیں، دوبارہ لینی چاہئیں۔ بجلی کا علاج کراتے کراتے اور تصویریں لیتے لیتے اب ہم بیزار ہو گئے تھے۔ اس لئے سوچا کہ کیوں نہ بیمار کو میسور کے "سینا ٹوریم" میں لے جاکر تشخیص کرائیں۔ اللہ کا نام لے کر ہم مریض کو لئے نکل پڑے۔ ریل کی نشستیں کوئی پندرہ دن پہلے محفوظ کرائی تھیں لیکن خدا جنگ کا بھلا کرے ٹرین میں مسافروں کا وہ ہجوم تھا کہ پناہ بخدا! ہمارے ڈبہ میں کوئی سولہ مسافروں کی "مسڈ پارٹی" تھی۔ برتھ کے علاوہ ٹرنکوں پر، بستروں پر، ٹیفن باسکٹوں پر مسافر ہی مسافر تھے، ہم بھی ایک ٹرنک پر بیٹھ گئے بیمار کو بڑی مشکل سے برتھ پر جگہ ملی۔ ڈورنا چلم تک ڈبہ میں میلہ لگ رہا تھا۔ جب یہاں سے ٹرین چلی صرف آٹھ مسافر رہ گئے تھے۔

ٹرین کی رفتار اب کچھ بڑھ گئی تھی، ہمارے سامنے کی برتھ پر ایک بھاری بھرکم خاتون کچھ بیٹھی اور کچھ لیٹی کتاب پڑھ رہی تھیں، محترمہ نے پانی کچھ زیادہ پی لیا تھا، ٹرین کی رفتار بڑھتے ہی کچھ عجیب قسم کی

آوازیں ان کے پیٹ میں سے آنے لگیں! محترمہ شرما کر اٹھ بیٹھیں۔ پھر بھی "تال بم" کم نہ ہوئی!! ایک مرتبہ کنکھیوں سے ہماری طرف دیکھ کر مسکرائیں، ہم نے بھی ہمدردانہ نظروں سے ان کی مسکراہٹ کا جواب دیا۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونا شروع ہوئی اور جوں جوں کمی ہوتی گئی محترمہ کے چہرے پر بحالی آنے لگی۔ یہاں تک کہ ٹرین ایک جنگل کے بیچوں بیچ کھڑی ہوگئی! مسافروں نے سمجھا شاید سگنل نہیں گرا!! ہم نے ڈبے سے گردن نکال کر جو دیکھا تو کہیں سگنل کا پتہ نہیں تھا! ایک آدمی انجن سے اترا اور جنگل میں پھرنے لگا!! ہم نے ٹرین ٹھہرنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "ڈرائیور صاحب کی ٹوپی ہوا سے اڑ گئی ہے تلاش کر رہا ہوں"! اتنے میں گارڈ صاحب تشریف لائے اور انجن کی طرف جانے لگے، ہم نے ان سے ٹرین روکنے کا سبب پوچھا تو ارشاد ہوا "یہی معلوم کرنے تو جا رہا ہوں"! ہم بھی ان کے ساتھ ہو گئے، انجن ہمارے ڈبے سے قریب ہی تھا، گارڈ صاحب انجن پر چڑھ گئے اور لگے ڈرائیور کو ڈانٹنے!! اس نے کہا ٹوپی بالکل نئی تھی، پندرہ روپے میں خریدی تھی، اس کے بغیر وہ انجن چلانے تیار نہیں ہے، تلاش کرنے کی اجازت دی جائے! اس وقت وہ آدمی جو جنگل میں ٹوپی ڈھونڈ رہا تھا واپس آیا کہ ٹوپی کہیں نہیں ملی، گارڈ نے ڈرائیور سے پوچھا اب کیا کروگے؟ اس نے کہا ٹرین کو واپس لے جائیں گے، کہیں نہ کہیں ٹوپی مل جائے گی! اس وقت ہمیں جناب شوکت تھانوی کی "سودیشی ریل" یاد آگئی!!

ٹرین واپس چلی، کوئی تین چار فرلانگ پیچھے جانے کے بعد ایک درخت پر ٹوپی انکی ہوئی نظر آئی!... ٹوپی کا نظر آنا تھا کہ سارے مسافروں نے ٹوپی! ٹوپی!! چلانا شروع کیا۔ گویا سبھوں نے عید کا چاند دیکھ لیا! ڈرائیور نے ٹھیک ٹوپی کے درخت کے سامنے انجن ٹھہرایا، ٹوپی اتاری گئی اور ڈرائیور نے پہن لی، تب کہیں ٹرین چلی!! ڈرائیور نے آنے والے اسٹیشن پر بر وقت پہنچنے کے لئے ٹرین کی رفتار اس قدر تیز کر دی کہ ہماری ہم سفر خاتون کا بیٹھنا بھی دشوار ہوگیا۔ سب مسافروں کے ساتھ وہ بھی اچھلنے لگیں۔ سب کے سب اچھل رہے تھے اور ہنس رہے تھے مگر محترمہ مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھیں۔

رات کے کوئی دس بجے ہوں گے کہ ایک ایسے اسٹیشن پر پہنچے جہاں "صاحب لوگ" بڑا کھانا کھاتے ہیں، ان کی خاطر ٹرین یہاں کوئی پون گھنٹہ ٹھہری، ہم نے اور ہماری ہم سفر خاتون نے اپنے اپنے توشہ دان کھولے اور کھانا شروع کیا، محترمہ نے اپنے توشے میں سے سالن ملے ہوئے چاول ہماری طرف بڑھائے اور کہا "ہمارے گھر کی یہ خاص چیز ہے تھوڑا سا چکھ کر دیکھئے"! واقعی یہ چاول بڑے مزیدار تھے!! چٹنی، اچار، بگھارے بیگن، ماہی قلیہ اور دو چار قسم کے سالن کا مزہ آ رہا تھا۔ ہم نے تعریف کی تو محترمہ نے اصرار کے ساتھ ہمیں اس قدر کھلایا کہ پیٹ میں مطلق گنجایش نہیں رہی، ہم دونوں کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے بقیہ صاعنہ کر رہے تھے کہ ایک تربوز فروش چار چھے تربوز ٹوکرے میں لئے نازل ہوا۔ ہماری دوست نے ایک تربوز خریدنا چاہا۔ تربوز ہاتھ میں لئے

قیمت چکا رہی تھیں کہ وہ پھسل پڑا اور پلیٹ فارم پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا !! اب تو مجبوراً خریدنا ہی پڑا اور ہمیں رات کے بارہ بجے اس کو زہر مار کرنا پڑا۔ ہزار ہم نے انکار کیا کہ اس وقت تربوز کھانے سے نزلہ ہو جائے گا' حلق میں خرابی پیدا ہو گی' مگر محترمہ نے ایک نہ سنی اور فرمایا کہ صبح تک خراب ہو جائے گا' بارہ آنے کا خون ہو گا' مجبوراً کچھ کم آدھا تربوز ہمیں کھانا پڑا باقی محترمہ نے نوش فرمایا' یہاں سے کچھ جاگتے کچھ سوتے صبح کے چھے بجے بنگلور پہنچے۔ یہاں ٹرین کوئی دو گھنٹے ٹھہری۔ میسور جانے کے لئے ٹرین بدلنی پڑی۔ ہماری دوست نے ہمیں "خدا حافظ" کہا کیونکہ وہ بنگلور میں اپنی والدہ کے ہاں گرمیاں گزارنے آئی تھیں۔ بنگلور ان کا وطن تھا مگر اردو ایسی صاف بولتی تھیں کہ گویا ان کی مادری زبان ہے ! وہ ہمارے ہاں کے ایک بڑے عہدے دار کی رفیق حیات ہیں۔ خدا انھیں اچھا رکھے کہ ان کی وجہ سے ہمارا سفر پر لطف رہا۔

میسور کے اسٹیشن پر اترتے ہی دو چار ہوٹل والوں نے ہمیں گھیر لیا کہ ان کے ہوٹل کو چلیں! ہم نے "وننی کپلی" کے "آنند بھون" کی تعریف سنی تھی' سیدھا وہاں پہنچے !! ہوٹل کے کمرے نہایت نفیس اور آرام دہ تھے جگہ بھی بڑی پر فضا تھی مگر یہاں ایک دو دن بھی چین سے رہنے نہ پائے تھے کہ منیجر نے کمرے خالی کرنے کے لئے کہا۔ وجہ پوچھی تو بتایا کہ ہمارے ساتھ "دق" کا بیمار ہے ہم نے کہا بیمار کو "دق" ہونا کس نے بتایا؟ اس نے جواب دیا خود بیمار نے ! جس طرح ناٹک میں مار مار کر جبراً حکیم بنایا جاتا تھا اسی طرح ہمارے برخوردار بیمار نے خود کو "دق" کا بیمار بنا لیا !! ہزار اس کو سمجھایا کہ بھئی دق وق کچھ بھی نہیں ہے صرف ہلکا بخار کبھی رہتا ہے کبھی نہیں رہتا۔ تبدیل آب و ہوا کی غرض سے آئے ہیں مگر اس نے ہرگز یقین نہیں کیا۔ مجبوراً ہوٹل چھوڑنا پڑا !

بڑی تلاش و جستجو کے بعد مارکٹ کے قریب ایک ہوٹل میں اچھا کمرہ مل گیا' مگر یہ مقام ویسا پر فضا نہیں تھا۔ ہم نے بیمار کو سخت تاکید کر دی کہ اپنا حال زار کسی کو نہ سنائے' نہ ہوٹل کے منیجر سے دوستی کرے ورنہ یہاں سے بھی کوچ کرنا ہو گا اور یہی رفتار رہی تو ایک دن ہم "خانہ بدوش" ہو جائیں گے۔ اس تقریب میں دو دن بیکار گئے۔ چوتھے دن بیمار کو لے کر ہم سینا ٹوریم پہنچے۔ ڈاکٹر نے بیمار کو بٹھا کر خوب ٹھونک بجا کر امتحان کیا' بجلی سے تصویر بھی لی۔ بجلی کے مشین کے سامنے کھڑا کر کے جسم کے اندر کا حصہ بھی دیکھا۔ خون کا امتحان بھی ہوا اور ان سب امتحانوں کی فیس صرف چالیس روپے ہوئی۔ اپنے وطن کے ہسپتال میں ایسے ہی امتحانوں کے اخراجات جب ہمیں یاد آئے تو یہاں نہیں بلکہ اپنے ہی وطن میں ہم نے "غریب الوطنی" محسوس کی ! صرف بجلی سے تصویریں لینے کی فیس ہم نے اڑتالیس روپے دی تھی۔ اس کے باوجود تصویریں بھی صاف نہیں آئی تھیں۔ غرض کہ یہ سارے امتحان ہونے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ بیمار کو کوئی مرض نہیں ہے ! نہ علاج کی ضرورت ہے نہ دوا کی !! کوئی چار ہفتے میسور میں رہنے کے بعد بیمار بالکل چنگا ہو گیا ! جان بچی لاکھوں پائے۔ خیر سے اب وہ گھر کو آئے !!

باغبان

خرگوش

"سرزمین اٹلی کو مشہور ادیب گریزیا دے لیدا کو جنم دینے کا فخر حاصل ہے۔ اس ادیبہ نے ۱۹۲۶ء میں نوبل انعام حاصل کیا اور دنیا کے مشہور ادیبوں کی صف میں جگہ پائی۔ وہ مشہور اطالوی ڈراما نگار لوئی جی پیرنڈلو اور مشہور شاعر گابرئیل دانون زیو کی ہم عصر تھیں"۔ مولانا کاروستی سے کم درجہ کی مالک نہیں" (وحید یوسف زئی)

ایک چوڑی ندی کے بیچ ایک چھوٹا سا ٹاپو ابھرا ہوا تھا اور اس ٹاپو کے بیچ ایک ننھی سی جھیل تھی، جھیل کیا ایک ہرا بھرا چاندی کے رنگ کا تالاب تھا، چاروں طرف سے جنگلی ببول کی جھاڑیوں اور چنار کے درختوں سے گھرا ہوا، لمبی، مخملی اور بیگنی رنگ کے سورج مکھیوں سے جڑا ہوا، گھاس سے گھرا ہوا۔ بت جھڑ کے دنوں میں آسمان کے بدلتے ہوئے رنگ اور جھائیاں، اڑ رہ کر گزر جانے والے رنگ برنگ کے بادل، زوال کے وقت دمکتا چاند اور جگمگاتے تارے، جھیل کے گہرے آئینے میں جھانکتے ہوئے چناروں کے کانپتے ہوئے پتے، اس جگہ اس جھیل کے قریب ایک عجیب سماں پیدا کر رہے تھے۔

ایک شام کو، شکاری نے، جس نے اپنی ناؤ ویرانے ٹاپو کے ریتیلے ساحل سے باندھ دی تھی اور اچھوتی ریت پر پیر کے قدموں کے نشانوں کا راستہ بناتا ہوا گیا تھا، اس بڑے دمکتے ہوئے چاند کو چناروں کے بیچ سے نکلتے ہوئے دیکھا اور پھر اس سے بھی زیادہ حسین روپ میں اس چاند کو اس نے اس چھوٹی سی جھیل کے پانی میں دیکھا۔ وہ ایک پل کے لئے رکا اس کی آنکھیں اس چمکدار پانی کی تصویر پر گڑی ہوئی تھیں، معلوم ہوتا تھا آسمان خود ہی زمین کے دل سے نکل آنے کے لئے بے چین ہے، ایک نئی دنیا بسانے کے لئے۔

ایک بوڑھی مادہ خرگوش نے جو کنارے پر ببول کی جھاڑیوں میں رہتی تھی، اس کالے آدمی کو، اپنے خوفناک دشمن کو دیکھا اور وہ بھاگی ــ ہلکی ــ لمبی ــ اور ــ خاموش اس کے کان سخت اور یوں کھڑے ہوئے تھے جیسے اس کی حفاظت کے لئے دو تیز چھریاں ہوں۔

آدمی اپنے خوابوں کی دنیا میں گمن رہا، خرگوش نے اپنے سپنے کھو دئے لیکن چمڑی بچالی۔ جب وہ جنگل کے بیچ پہنچ گئی تو ایک گھنی جھاڑی کے اندر دبک کر جتھ رہی اور بڑی دیر تک انتظار کرتی رہی ــ کان لگائے اور اپنی ذرا سی کانپتی ہوئی ناک سے ہوا کو سونگھتے ہوئے۔ اس کا دل اسی زور سے دھڑک رہا تھا کہ مہینوں سے اتنے زور سے نہ دھڑکا تھا سچ مچ، جھیل کی حال ہی کی باڑھ کے بعد سے، جب ٹاپو کے سارے خرگوش، جالوں میں پکڑے جا کر یا مارے جا کر، یا کل کل کرتی بہتی ندی میں بہہ کر غائب ہو چکے تھے تو بوڑھی مادہ خرگوش سوچتی تھی کہ اس جگہ کی وہی اکیلی مالکہ ہے اور اپنی زندگی کو ویسی ہی شان اور خوشیوں کے دنوں میں بتانے کے سپنے اس نے دیکھے تھے۔ وہ بوڑھی تھی اور تھی بھی زندگی سے مایوس ــ بغیر کسی ساتھی کے اکیلی، تنہا۔ اس کے بچوں نے اسے چھوڑ دیا تھا اور نر خرگوشوں کو اب اس کی چاہ نہ تھی ــ ٹاپو کے ایک سنسان کونے میں وہ بہت آسانی سے، نہایت اطمینان سے بلا کسی خوف خطرے کے رہ سکتی ہے۔

بسنت کے دنوں میں جب باڑھ آئی تھی وہ ان پیڑوں کے تنوں میں رہی تھی جو اس چھوٹی سی جھیل کے اوپر اونچے کناروں تک بہہ کر آ گئے تھے۔ ٹاپو کے اس دلدلی اور ریتیلے حصہ کو پار کرنے کی کسی کو ضرورت کیوں ہونے چلی تھی اور بعد میں جب ریت خشک ہو گئی اور جھیل کے کنارے پر گھاس اگ آئی تب بھی شکاری ہی ٹاپو پر گئے اور نہ ماہی گیر ہی۔

مکمل امن ــ اور ــ خاموشی ..... صرف بلبلیں ہی، چنار کے لمبے درختوں میں بہتے پانی کا استقبال کرتی ہوئی، پتوں کی کھڑکھڑ تال کے ٹھیک پر گا رہی تھیں۔ پتوں نے چاند کی حسین کرنوں میں نہاتے ہوئے کہا :-

"الوداع پانی! کھڑے رہنے سے دوڑنا اچھا ہے"

اور پانی نے، سمندر کی طرف دوڑتے ہوئے کہا ــــ

"الوداع ہمیشہ کے لئے! سدا دوڑتے ہی رہنے سے کھڑا رہنا اچھا ہے"

اور بوڑھی مادہ خرگوش نے سنا۔ وہ اپنے آپ میں خوش تھی، اس نے اپنے کو پیڑوں سے زیادہ مضبوط اور پانی سے زیادہ خوش نصیب سمجھا کیونکہ اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنی مرضی کے موافق دوڑ اور کھڑی رہ سکتی ہے۔

جیتے جیتے بلبلیں خاموش ہو گئیں اور چنار کی پتیاں

گرنا شروع ہوگئیں، اس بوڑھی مادہ خرگوش نے زندگی میں اور کبھی بھی ایسے امن کا خواب نہ دیکھا تھا، مگر - اب - بیکایک یہ بھیانک کالا بت جھڑ پھر سے آگیا اور بھلا وہ آ کیوں گیا؟

وہ جھاڑیوں کے اندر دبکی پڑی رہی اور اس کی آنکھیں صرف اپنی لال پلکوں کے اندر سے اس دوری پر چاند سے چمکنے والی ریت کا پھیلاؤ دیکھ سکتی تھیں جو جھاڑیوں سے زیادہ گہرا نہ تھا، ایک طرح کا کھلا میدان، جہاں وہ بھی اپنی جوانی کے سکھی دنوں میں اچھلتی کودتی تھی اور اپنی ہی پرچھائیں کا پیچھا کیا تھا یا ان راتوں کو، جب چاند خوب تیز چمکتا ہوتا، اپنے محبوب کا انتظار کیا تھا -

ریت پر ایک پرچھائیں جھولتی تھی اور پھر دوسری، بوڑھی مادہ خرگوش نے سوچا کہ وہ یقیناً ایک خواب ہی دیکھ رہی ہے، لیکن پرچھائیاں پھر لوٹ آئیں، رکیں اور پھر اپنا طلسمی کھیل جاری کر دیا - اس بارے میں کوئی بھول اس کی نہ تھی - وہ دو خرگوش تھے اور تب اس بوڑھی نے جان لیا کہ کیوں اس کا کالا دشمن، شکاری، رات کو ایک بار پھر ٹاپو پر آیا ہوا تھا - شکاری نے مار ڈالا تھا -

ایک بچہ اپنے بھائی کے سر اور کان کو چاٹ رہا تھا - جب اس کی نظر بوڑھی مادہ خرگوش پر پڑی اس نے اسے غور سے دیکھا - اپنی ناک باہر کو نکالی اور پھر اپنی جراٴت پر خوف زدہ ہو کر دہشت کھا کر، اسے پھر اندر سکیڑ لیا -

بوڑھی خرگوش اپنی راہ گئی لیکن کچھ دیر بعد پھر واپس آئی اور اس نے دونوں غریب خرگوش کے بچوں کو ساتھ کھیلتے اور ایک دوسرے کو چاٹتے دیکھا -

وہ ایک اداس ٹھنڈا دن تھا، لگ بھگ شام کے بارش ہونے لگی اور بوڑھی مادہ خرگوش پھر اپنی پرانی جھیل کے اونچے کناروں پر، پیڑ کے تنے والے گھونسلے کو لوٹ گئی - بارش ہوتی رہی اور ہوتی رہی لیکن بوڑھی مادہ خرگوش کو اور کوئی زیادہ اداسی محسوس نہیں ہوئی - اس کے نزدیک بارش کا مطلب اچھے موسم کا خاتمہ ہوتا تھا - جلد ہی ریت پھر دھنسنے کے قابل ہو جائے گی اور پھر کوئی شکاری گیلے، سپاٹ جنگل کو پار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا -

اور ان بے چارے خرگوش کے بچوں کا کیا ہوگا؟ ان کے اس چھوٹے سے کھوکھلے میں ان پر کیا بیتے گی؟ کیا اس بوڑھی مادہ کو خود اپنے ننھے بچوں کا، ان کے گھونسلے کی گرمی، اپنی بڑھتی ہوئی امنگوں کا یکایک خیال آگیا؟ یہ کہنا مشکل ہے - لیکن سویرے کے وقت اس نے اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑی اور ان خرگوش کے بچوں کو پھر دیکھنے گئی - وہ بے چاری، ننھی سی جانیں سو رہی تھیں ایک پر دوسری، لیکن نیند میں بھی وہ ضرور ہی اپنی ماں کا انتظار کرتے رہے ہوں گے کیونکہ جب وہ بوڑھی مادہ ان تک آئی، انھوں نے اپنی ناک بڑھائی اور اپنے ذرا ذرا سے کان ہلائے اور بوڑھی مادہ نے انھیں اپنی بڑی چمکیلی آنکھوں سے دیکھا اور اس نے بھی اپنی ناک بڑھا دی گویا وہ گھونسلوں کی بو سونگھ رہی ہے -

بارش پھر سے ہونے لگی آٹھ دن اور آٹھ رات، کہر اور مینہ کا ایک تھوڑا سا پردا ٹاپو کو گھیرے اور ڈھنکے رہا، جھیل، کالی چمکتی ہوئی سیاہی سے بھری نظر آنے لگی اور پانی چڑھتا رہا اور چڑھتا رہا یہاں تک کہ آخر کار اس نے بوڑھی مادہ کے جسم کو چھو لیا - اس نے لوٹ کر، ان خرگوشوں کے بچوں کو پھر دیکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے قدموں کے پاس کی ریت بہت جگہوں پر اندر دھنسنے کو تھی اور پانی سے بالکل دلدلی ہو رہی تھی اس چھوٹی سی ترائی تک پہنچنا اس کے لئے بالکل ناممکن تھا - پانی برستا رہا اور برستا رہا اور دوری پر اس علاقے سے گزرتی، سب کو تہس نہس

کرتی، اپنی قوت پر نازاں سستاتی ہوئی، کوئی چیز آرہی تھی، بالکل ویسے ہی جیسے کسی چڑھائی کرنے والے کی فوج ہو۔

بوڑھی مادہ خرگوش اس آواز کو، اس چیز کو اچھی طرح جانتی تھی، وہ فتح اور کامیابی کے ساتھ دوڑنے والی ندی کی آواز تھی۔ اسے اپنی جگہ چھوڑنے کی ہمت نہ ہوئی اور ساتھ ہی بھوک اسے ستا رہی تھی اور اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ سوکھی پتیوں کو چھوڑ کر اور کچھ نہ تھا۔ ایک دن اسے فاقے سے بھی رہنا پڑا کیونکہ پانی بالکل تنوں تک پہنچ گیا تھا اور اس وقت ذرا بھی ہلنا جلنا خطرناک تھا۔

بھورا اور یک رنگ کالا پانی چڑھا اور زیادہ چڑھا، زمین اور آسمان اور دیوانی ہوا سب ٹھنڈے ہوگئے تھے اور گندے پانی کا ایک ڈھیر سا ہو گیا تھا۔ لیکن آٹھویں دن کی شام کو پانی رکا اور اچانک بادل پھٹ گئے۔ کہر کو چیر کر، یہاں، وہاں، ہرا پیلا سا آسمان نکل آیا اور بادلوں کی اوٹ سے، دھندلکے کی گہرائیوں میں سے چاند کا چہرہ دکھنے لگا۔

پانی نیچے ہٹا، گویا اپنی فتح پر نازاں اپنی موجوں میں پتیوں، شاخوں، ریت اور مردہ جانوروں کو بٹور کر واپس پھر رہا ہو۔

دوسرے دن سورج نے اس ویران جگہ پر اپنی روشنی پھینکی اور غریب، بھیگی اور بھوک سے ادھ موئی مادہ خرگوش نے اپنی چھپنے کی جگہ چھوڑی اور اپنے کو گرم کیا اور چاروں طرف کی سیر کی۔

ننھی سی جھیل کا پتہ نہ تھا وہاں چھوٹا سا گدلا نالا اس اونچے کگار کے نیچے شور کرتا بہا جا رہا تھا، جو کہ ایک بندھ کی طرح کھڑا ہوا تھا وہ اپنی لوٹ اور اپنے شکاروں کو بہا ہی لے گیا — اور یکایک سوئی ٹہنیوں اور سوکھی پتیوں اور ایک ٹوٹے ہار کے دانوں کی طرح بالکل بلبلوں کے بیچ ہی مادہ خرگوش نے ان دو ننھے خرگوش کے بچوں کو دیکھا۔ مرے ہوئے، لمبے اور پتلے، ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی اور کان تنے ہوئے تھے۔ وہ پانی پر دوڑ رہے تھے اور دوڑتے رہے، دو اچھے نادان بچوں کی طرح جو موت کے بعد بھی ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے۔

اب بوڑھی مادہ خرگوش ٹاپو پر سچ ہی اکیلی تھی —

(ترجمہ۔ ہندی سے)

وحید یوسف زئی

مشورہ

اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے
مئے سے دھوئی ہوئی بھوؤں میں تلی نظروں سے
لڑکھڑاتی ہوئی زاہد سی بنی نظروں سے
جھجکی جھجکی ہوئی، شرمائی ہوئی نظروں سے
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

تم بھی معصوم ہے فطرت بھی تمہاری معصوم
کتنا چنگیز ہے یہ وقت تمہیں کیا معلوم
دہر میں عشق کا سمجھا ہی گیا کیا مفہوم
مجھ کو منظور نہیں حسن کو دیکھوں مغموم
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

چاہتی ہو کہ یونہی مل کے رہیں گنگ و جمن
چاندنی رات ہو، دو دل ہوں دھڑکنے میں مگن
اور سمجھتی ہو کہ اب جیسے پڑے گا نہ گہن
میری مانو کہ تمہارا تو نہیں ہوں دشمن
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

زندگی صرف گلِ تر ہی کی رعنائی نہیں
خمِ گیسو و مہِ نو ہی کی انگڑائی نہیں
نغمۂ و شعر نہیں، مستی و برنائی نہیں
ایک زہراب کسی کے بھی جو کام آئی نہیں
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

دور کی بات نہیں میں بھی کبھی تھا نادان
غور کرنے ہی نہ دیتے تھے مچلتے ارمان
خون کے بدلے رگوں میں تھی رواں برقِ تپاں
آج لیکن مرے دل سے فقط اٹھتا ہے دھواں
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

میری چھوڑو کہ میں اک شاعرِ آشفتہ مزاج
میرا فردا نہ کوئی دوش نہ میرا کوئی آج
کتنی مدت سے ہے جانے مری دنیا تاراج
کیوں مگر ٹوٹے تمہارے حسیں خوابوں کا تاج
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

دل کی باتیں نہ سنو اک ذرا میری بھی سنو
عشق اک آگ ہے اور آگ کی لپٹوں سے بچو
تم تو خود شمع ہو، پروانوں پہ کیوں جل کے مرو
دامنِ زیست میں کانٹے ہی نہ کانٹے بھر لو
اب نہ دیکھو مجھے ان پیار بھری نظروں سے

سلیمان اریب

گھنٹی بجی، ہم سب دو گھنٹوں کے لئے لیکچر روم میں داخل ہوئے۔ چھن چھن کی جھنکار سے فضا گونجنے لگی، ہماری نظریں آواز کی طرف اٹھ گئیں ——— لطیف قہقہے، ہلکی ہلکی سرگوشیوں سے فضا جھنک رہی تھی —— دیکھیں کون آرہے ہیں —— اچھا! آپ ہیں —نجمہ، دیکھا کدھر۔ ارے ادھر اوہو، شاعر صاحب —— ارے یہ کون؟ کون! جانتی نہیں۔ نہیں تو —— اچھا اب ہنسنے لگیں۔ ادھر دیکھ کر شمشاد کو واقعی پسینہ آگیا۔ نجمہ نے شمشاد کے بازو چٹکی لی، کیوں اب پہچان لیا نا —غصہ سے شمشاد کا چہرہ لال گلال ہوگیا ہٹ، ہروقت ایسی ہی باتیں۔ واللہ کیسے رنگین مزاج ہیں، کیا نزاکت پائی ہے آپ کے اندازِ قدم تو ملاحظہ ہوں ——— قہقہے —
نجمہ نجمہ مجھے دیر تو نہیں ہوگئی۔ کیا ابھی تک پروفیسر نہیں آئے۔ گلاب گھڑی دیکھتے ہوئے بولی، اوہو، اب آئیں ہیں کہاں دیر لگادی تھی تیوری پر بل ڈال کر نجمہ نے رقیبانہ انداز میں کہا — دیکھی ساڑی کی بہار۔ تنفس کو بھی مات کر رہی ہے۔ چھیڑتے ہوئے کملا بولی —— گلاب کا سانس پھول رہا تھا وہ قدرتی طور پر موٹی تھی۔ اس کا رنگ گلاب جیسا سرخ تھا۔ جب وہ تیز چلتی تو ہانپنے لگتی گلاب کو اس حال میں دیکھ کر اس کی سہیلیاں ہنسنے لگتیں۔ کلثوم تو ہر وقت گلاب کا مذاق اڑایا کرتی تھی۔ کلثوم نے آہستہ سے کملا کے کان میں کچھ کہا کملا ہنس پڑی، کملا نے نجمہ کے کان میں بھی وہی بات کہہ دی۔ سب سہیلیاں ہنسنے لگیں گلاب دیوانوں کی طرح ہر ایک کا چہرہ تک رہی تھی —— —— "آخر میں بھی تو جانوں تم سب ہنس کیوں رہی ہیں"؟ گلاب بولی، اس جملے پر اور بھی قہقہے پڑے۔ مائی ڈیر گلاب۔ تجھے دیکھ کر میرا دل انار کھانا چاہتا ہے، کملا بولی، اب تو گلاب کالج بھر میں انارکلی کے نام سے مشہور ہوگئی۔
اس دلچسپ محفل سے دور ثریا پھولوں کے تختے کے قریب کھڑی، سر کے بال الجھا رہی تھی۔ چند ماہ سے ثریا نے اپنی تمام سہیلیوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ ثریا سنجیدہ لڑکی تھی، کملا ہر وقت ثریا کو بنایا کرتی تھی، ثریا کو یہ بات پسند نہ تھی۔ باتوں باتوں میں ثریا اور کملا میں جھڑپ ہوگئی۔ سہیلیوں نے بھی کملا کا ساتھ دیا۔ ثریا نے اپنی سہیلیوں سے بائیکاٹ کر رکھا تھا —— تنہائی میں ثریا کو سوائے سر کے بال الجھانے کے اور کوئی کام نہ تھا ——— کئی ماہ بعد آج کالج کھلا، کملا اور دوسری لڑکیاں کامیاب ہوگئی تھیں، ایک زمانہ بعد جب سب کی سب ملیں تو دل کے سوئے ہوئے خواب بیدار ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوشی کی بجلیاں رگ رگ میں کوندنے لگیں — اب بھی ثریا کے دل کا ناسور ہرا تھا۔ وہ اپنی تمام سہیلیوں سے علٰحدہ کھڑی کچھ سوچ رہی تھی، کملا کا دل صاف تھا وہ لڑتی تھی اور بہت جلد سہیلیوں کو منا بھی لیتی تھی، آج ثریا کو منانے کا اچھا موقع تھا۔ آہستہ سے کملا ثریا کے پیچھے کھڑی ہوگئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے ثریا کی آنکھیں بند کردی، دوسری لڑکیاں بھی ان کے اطراف جمع ہوگئیں۔ قہقہے برسنے لگے، درد سے ثریا تلملا اٹھی، چند لمحوں کی کشمکش کے بعد کملا نے اپنا ہاتھ ثریا کی آنکھوں سے ہٹالیا۔ دونوں میں پھر دوستی کی پینگیں بڑھنے لگیں —— نجمہ کی نظریں ثریا کے قیمتی لباس پر تھیں — ثریا انگوری رنگ کا دوپٹہ اور سلمہ ستار والے بلاؤز کو دیکھ کر نجمہ کی آنکھوں میں تارے جھلملانے لگے —

ثریا تونے یہ بلاؤز کہاں سے خریدا؟ اس ڈوپٹہ کا رنگ کتنا پیارا ہے۔ کیوں فریدہ۔ کتنا پیارا رنگ ہے نا — شروع کیں وہی اپنی دیوانی باتیں۔ نجمہ، تجھے زندگی میں سوائے رنگ، قیمت، دوکان کے نام کے اور کوئی دلچسپی نہیں۔ جب دیکھو، اہا کتنا پیارا رنگ ہے، کتنا قیمتی لباس ہے، کہاں سے خریدا — تجھے کیوں برا لگ رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں کہتی کہ خریدنے کی سکت نہیں ہے۔ جمیلہ نے فریدہ پر طعن کی۔ یہ سن کر فریدہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی، جمیلہ میں تجھے جانتی ہوں، مکار، دستر خوان کی بلی، غصہ سے فریدہ نے جمیلہ کو ڈانٹ دیا۔ — کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے، کوئی کام بھی کرنے دوگی یا یوں ہی بک بک کئے جاؤگی، تیوری پر بل ڈالتے ہوئے فہمیدہ بولی — اچھا اب مینڈک کو بھی زکام ہونے لگی۔ بڑی آئی پڑھنے والی فہمیدہ کی نوٹ بک بند کرتے ہوئے کملا بولی۔ ایم اے میں فہمیدہ نے فلسفہ لے رکھا تھا، جب دیکھو بغل میں موٹی موٹی کتابیں، ناک پر موٹی سی عینک، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے — علم کے ذوق شوق نے فہمیدہ کو عجیب وغریب فہمیدہ بنا دیا تھا۔ سوسائیٹی، ہنسی مذاق، سے وہ ہمیشہ بیگانہ رہی، شاید ہی کسی نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی ہو، جب دیکھو ہاتھ میں پنسل، نوٹ بک اور سامنے کھولی ہوئیں بڑی بڑی کتابیں، فہمیدہ کے اس دیوانے مطالعہ سے دیکھنے والوں کی آنکھیں دکھ گئی تھیں، کملا کو فہمیدہ کے اس مطالعہ سے چڑ سی ہوگئی تھی، جب کبھی فہمیدہ کوئی کتاب پڑھتی تو کملا اس سے نوٹ بک کھینچ لیتی، کتابیں بند کردیتی اور پنسل سے کھیلنے لگتی، کملا کی ان حرکتوں پر فہمیدہ تلملا اٹھتی، غصہ سے کانپنے لگتی، کئی بار کالج کے ورانڈے میں ان دونوں میں خوب نوک جھونک ہوئی، لیکن کملا کبھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی، جب کبھی فہمیدہ غصہ سے نیلی پیلی ہوجاتی تو کملا مسکراتے ہوئے اس کے قریب آتی، اپنی باہیں فہمیدہ کے گلے میں حمائل کرکے کہتی "ڈیر فہمیدہ تو اس حال میں مجھے کتنی پیاری معلوم ہوتی ہے" یہ سن کر فہمیدہ مسکرا دیتی۔

ادھر نجمہ اور ثریا میں سینما جانے کی تیاریاں ہورہی تھیں، ثریا انگلش پکچر کی دیوانی تھی، ثریا کی ساتھ داری نے نجمہ کو بھی سینما بینی کا چسکا لگا دیا تھا۔ موٹر نجمہ کی ہوتی اور ٹکٹ ثریا کے — نجمہ سنا ہے کہ گریٹا گاربو کا پکچر آیا ہوا ہے، چلوگی، نجمہ کی پیشانی خوشی سے چمکنے لگی۔ سچ — تو پھر کملا کو بھی لے چلو، کیوں کملا تیار ہے — ہاں ہاں، کیوں نہیں، ایسے دکھانے والے مل جائیں تو انکار کیسے ہوسکتا ہے، — ہم بھی دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں، عینک درست کرتے ہوئے فلسفی فریدہ بولی — ارے یہ زاہد خشک کیسے ٹپک پڑے، سب لڑکیوں نے ہنسنا شروع کیا کملا نے موٹی موٹی کتابیں فریدہ کے سامنے رکھدیں، اور کہنے لگی، بی فلسفی کہاں کا کھیل، کیسا تماشا، تمہاری دلچسپی لو کو تیشے، شوپن ہار میں دفن ہے، کانٹ کا فلسفہ چھانتی رہو، کہاں تم اور کہاں یہ پیار، محبت کی باتیں، دیوانہ — نجمہ، جمیلہ، ثریا سب کی سب ہنسنے لگیں، واللہ اچھا پارٹ ادا کیا، کمال ہی کردیا، میں کہتی ہوں کہ تو کسی فلم کمپنی میں شریک ہوجا — نقال کہیں کی — یہ ہے اسی کام کی، فریدہ نے پوچھا کہ پیچھے پیچھے یہ کیا طے ہو رہا ہے، آخر ہم بھی تو سنیں، اچھا سینما جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ہم بھی دیکھیں تم کیسے جاتے ہیں۔ سنا نہیں، آج ریڈیو پر ریحانہ کا افسانہ نشر ہو رہا ہے۔ آج کا افسانہ بھی

اس کے ہاں کھانا ہے۔ نزہت بولی' یہ سنتے ہی سب کی خوشیوں پر اوس سی پڑ گئی۔ نجمہ' کملا آج نہیں کل جائیں گے' ہونٹ لٹکائے ہوئے ثریا نے کہا'

یہ ریحانہ کو کیا ہو گیا۔ کالج کیوں نہیں آرہی ہے' نجمہ تجھے تو معلوم ہوگا۔ بتا' بات کیا ہے' فہمیدہ انگڑائی لیتے ہوئے بولی' سنا ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے —— آپ بتائیے کب آپکے سے رنگے جا رہے ہیں' کملا بولی — مہندی کا نام سنتے ہی فہمیدہ کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں' نظروں کے سامنے تاج محل جگمگانے لگے۔ مسرت بھری زندگی کا دلفریب تخیل دماغ میں گھومنے لگا —— ابھی تک پروفیسر نہیں آئے! بات بدلتے ہوئے فہمیدہ بولی — بھاگو' بھاگو' پروفیسر آگئے' فریدہ چلا اٹھی'

کھٹ پٹ' کھٹ پٹ کرتی ہوئیں' لڑکیاں اپنے لکچر روم میں داخل ہوئیں' چند لمحوں کے لئے خاموشی طاری ہوگئی' تعظیم کے لئے لڑکے اور لڑکیاں اٹھ گئیں' لڑکیوں کے چہروں سے علم کے چشمے ابل رہے تھے' ان کی آنکھیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں ہم نے علم کے میدان میں قدم رکھا ہے ہم کو لڑکوں کا مقابلہ کرنا ہے' ہم کو انھیں نیچا دکھانا ہے' خواہ مخواہ مردوں نے اپنا سکہ جما رکھا ہے' زندگی کے ہر شعبہ میں ان کو نیچا دکھانا ہوگا — بہار زندگی کی ان نوشگفتہ کلیوں کو دیکھ کر پروفیسر کے رجھائے ہوئے چہرے پر اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی' ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل گئی۔

پروفیسر کے چہرے کو دیکھ کر لڑکیاں سہم گئیں' ان کے دل دھڑکنے لگے اور وہ پیچھے کچھ دیر کے لئے دب گئے' وہ بید کی طرح کانپنے لگیں' جب کبھی پروفیسر کوئی سوال کرتے' ادھر سے خاموشی کے سوائے کوئی جواب نہیں آتا۔ ادھر لڑکوں کے قہقہوں سے فضا گونجنے لگتی' لڑکیوں کی خودداری نے اپنا زور دکھایا ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ آخر ہمت کرکے ایک لڑکی نے اپنی سہیلیوں کی وکالت کا ذمہ لیا اس نے اپنا اور اپنی سہیلیوں کا تعارف کردیا۔ —— "آپ میں سے اول کون آئی ہیں؟" پروفیسر کی آواز کمرے کی فضا میں تیرنے لگی۔ لڑکیوں کی قطار سے جی جی کی سرگوشیاں فضا میں گھومنے لگیں' ادھر سے قہقہے ابلنے لگے — "جی یہ آئی ہیں" ہمت کرکے ایک لڑکی بولی' پروفیسر لکچر دے رہے تھے' ادھر ادھر باتیں ہو رہی تھیں —— "یہ کیا ہو رہا ہے۔ میز پر مکا مار کر گرجدار آواز سے پروفیسر نے پوچھا۔ لڑکیاں اپنی جگہ سے اچھل پڑیں —— ڈرتے ڈرتے ایک نے کہا' جی۔ آج مضمون کا دن تھا۔ —— آج مضمون کا دن ہے! کیا آپ لڑکیوں نے مضمون لایا ہے' پروفیسر نے پوچھا۔ "ہاں لایا ہے" پروفیسر کی نظریں لڑکوں کی طرف اٹھ گئیں — کیا آپ لوگوں نے بھی لایا ہے —— لڑکے حیرت میں پڑ گئے' ان لڑکیوں کو خدا سمجھے' اب کیا کہیں — بیٹھے بیٹھے لڑکوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک کونسل کر ڈالی —— ایک صاحب اٹھے اور پروفیسر سے لڑکیوں کے مضامین سننے کی خواہش کی' پروفیسر تو پہلے ہی ڈھونڈ رہے تھے' کسی نہ کسی طرح سے لڑکیوں کے مضامین سنا کر لڑکوں کو غیرت دلائیں۔ پروفیسر نے عینک درست کی' مضمون اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا اور اچھے اچھے الفاظ میں تنقید کرتے ہوئے کہا

"غیرت" اس کا عنوان ہے، ابھی مضمون کی دو چار سطریں بھی ختم نہ ہوئی تھیں کہ ایک صاحب نے مضمون کو شملہ کانفرنس میں بھیجنے کی فرمایش کی اور کہا فی الحال ہمارے سیاسی لیڈروں کو غیرت کی سخت ضرورت ہے، اس جملہ پر دونوں طرف سے خوب قہقہے پڑے "وہاں" کے عنوان کا ایک اور مضمون فضا میں لہرانے لگا۔ "وہاں" کا لفظ سنتے ہی میرے تخیل میں غالب کا ایک شعر گھومنے لگا ——— ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی ——— واقعی میں کہاں ہوں۔ میں دیوانوں کی طرح اپنے اطراف دیکھنے لگا—— میرے سیدھے بازو چند لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، وائیں بازو لڑکی کا ایک چھوٹا سا خوبصورت کمرہ تھا۔ سامنے ایک کالا تختہ اور اسٹیج پر پروفیسر کا مرجھایا ہوا چہرہ، فضا میں ہنسی، قہقہے، سرگوشیاں اور دھیمی آوازیں۔ میں وہاں تھا۔ جہاں مجھے سب کچھ میسر تھا۔ مضمون شروع ہوا اور ختم بھی، لیکن میں تخیلات کی دنیا میں کچھ اس طرح بھٹک رہا تھا کہ مجھے اپنی حماقت کا اس وقت احساس ہوا جب کہ ایک نیلا کاغذ پروفیسر کی انگلیوں میں پھیلنے لگا۔ کاغذ کی رنگینی اور خوش خطی کو دیکھ کر میرا ذوقِ تجسس پرواز کرنے لگا میری دلچسپی خط کی رنگین عبارت آرائی کی طرف تیز ہونے لگی ——— مضمون اب شروع ہو گیا —— پروفیسر نے بٹوا کھولا "گلوری ہونٹوں میں دابی، اچٹتی ہوئی نظر سے ہمیں دیکھا اور اپنی نشست کا رخ بدلتے ہوئے مضمون کا عنوان پڑھا۔ جس کا مجھے بڑا اشتیاق تھا، میرے ایک ساتھی نے اس زور سے چھینکا کہ عنوان چھینک کی زد میں بہہ گیا۔ تب کچھ بھی سن نہ سکا۔ میں نے صرف اتنا سنا۔

"بارش کے دن تھے، تاریک راتیں تھیں، ہم کو ایک طویل سفر درپیش تھا۔ میں، دادی، امی اور بھائی سب کے سب موٹر میں بیٹھ گئے، امی کہتی رہیں، لمبا سفر ہے، رات کا وقت ہے، صبح سے سفر شروع کیا جائے تو مناسب ہے، ابا ضدی تھے، اپنی ہٹ پر اڑے رہے۔ ابا کو اپنے پستول پر بڑا ناز تھا۔ انھوں نے اپنے اس پستول کی ہمت پر بڑے بڑے خطرناک سفر کئے تھے . . . یہ سفر ان کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ مجھے تو سفر کے نام سے خوشی ہوتی خوش کیوں نہ ہوتی۔ مجھے بھی پرانی سہیلی ذکیہ سے ملاقات کی زمانہ سے آرزو تھی۔ میں تو چاہتی تھی کہ جتنا جلد ہوسکے میں اپنی سہیلی کے ہاں پہنچ جاؤں" ——— واقعی مضمون بڑا ہی دلچسپ تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ ہمارا اشتیاق بڑھتا جا رہا تھا۔ ہماری دلچسپی مضمون میں تھی ——— ایسے وقت، رنگ، رنگ، رنگ گھنٹی بجنی شروع ہوئی۔ پروفیسر نے کاغذ کو میز پر رکھ دیا۔ جانے کی تیاری کرنے لگے،

رات کا وقت تھا۔ آٹھ بجے تھے، میں یوں ہی ریڈیو کا ڈائل گھما رہا تھا۔ ۴۱ میٹر پر کوئی لڑکی اپنا افسانہ نشر کر رہی تھی، لڑکی کی آواز کے ساتھ آج کے دو گھنٹوں کی پرلطف زندگی کا سہانا ماحول آنکھوں میں پھر گیا افسانہ ختم ہوا —— میں یوں ہی اپنے کمرے میں لیٹا ہوا ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ چاندنی رات تھی چاند آسمان کے سمندر میں ہلکورے کھا رہا تھا۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا دماغ مہکنے لگا۔ میرے دماغ کی چٹانوں سے تخیلات کے حسین ٹکڑے ٹکرانے لگے ——— وہی لیکچر روم، کھڑکی کھڑکی کے رنگین پردے اسٹیج، میرے ساتھی، ساتھیوں کی دلچسپ اور شیریں گفتگو کے دل آویز ٹکڑے ——— آہستہ آہستہ میری آنکھیں نیند کے پیمانوں سے چھلکنے لگیں۔

سید تقی الدین احمد

خواہش

ٹوٹے ہوئے سفینۂ ہستی کی نا خدا　　صحرائے زندگی پہ برستی ہوئی گھٹا

پژمردہ دل کی حسرتِ بیدار بھی تو ہے　　دل اپنا دے کے دل کی طلبگار بھی تو ہے

مہتاب کی کرن کا سہارا تو ہی تو ہے　　دریائے زندگی کا کنارا تو ہی تو ہے

دوشیزگی تو ہی ہے عروسِ بہار کی　　صورت تری سحر ہے شبِ انتظار کی

تاروں کی روشنی، گلِ تر کی شگفتگی　　تیری جبینِ ناز ہے معراجِ بندگی

تیرا شباب عہدِ جوانی کی آرزو !　　سینے میں تیرے دفن محبت کی آبرو

تو بے حجاب ہوتی ہے بادل کے سائے میں　　سوتی ہے زندگی ترے آنچل کے سائے میں

موجوں کے اضطراب کو تجھ سے ملے قرار　　عمرِ رواں کے ساتھ ٹھہر جائے آبشار

خوابیدہ ہے فسوں تری نظروں کی گود میں　　دل بن کے میں رہوں تری نظروں کی گود میں

آ میری شامِ ہجر کی زلفیں سنوار دے　　آ مجھ خزاں زدہ کو پیامِ بہار دے

آ اے چراغِ حسن کہ پروانہ ہو نثار　　آ میرے آنسوؤں کو بنا لے گلے کا ہار

آ ! مدتوں سے ہوں میں ترے انتظار میں　　ماتم ہے حسرتوں کا دلِ بے قرار میں

پورا نہ ہو سکا اگر ارمان دید کا

نکلے گا میرے ساتھ جنازہ امید کا

جبریل
(جبل پور)

نئی کتابیں

۱- فتراک (مضامین) از جہاں بانو بیگم ۔ حجم ۲۰۴ صفحے قیمت عا/ پتہ دفتر رسالہ شہاب بیرون دبیر پورہ ۔ حیدرآباد دکن
۲- چالیس کروڑ بھکاری (افسانے) از ابراہیم جلیس ۔ حجم ۲۴۰ صفحے قیمت ہے پتہ نفیس اکیڈیمی ۔ عابد روڈ ۔ ″
۳- موج نیل (افسانے) مترجمہ قاضی زین العابدین قیمت عا/ پتہ مکتبۂ علمیہ ۔ قاضی واڑہ ۔ میرٹھ
۴- کروٹ (ریڈیائی ڈرامے) از سعادت حسن منٹو ۔ حجم ۲۰۸ صفحے قیمت عا/ پتہ اردو اکیڈیمی ۔ لاہور
۵- ترسول (افسانے) از نورالحسن بی اے۔ ″ ۲۳۱ ″ ″ عا/ ″ حیدرآباد بک ڈپو ۔ حیدرآباد دکن
۶- دنیائے شہرزاد (ورق کے حالات) از محمودہ رضویہ ۔ حجم ۱۶۴ صفحے قیمت عا/ پتہ شعاع اردو دارالاشاعت ۔ کراچی
۷- مظلوم دوشیزہ (برنارڈشاہ کا ڈراما) مترجمہ برزوجی فیروزشاہ ″ ۲۶۴ ″ ″ ہے ″ نفیس اکیڈیمی ۔ عابد روڈ ۔ حیدرآباد دکن
۸- مسلمان عورت ۔ از ابوالکلام آزاد ۔ قیمت عا/ پتہ ادبستان ۔ موچی دروازہ ۔ لاہور
۹- پنکھڑیاں (افسانے) از شیریں ″ عا/ ″ کتب خانہ علم و ادب ۔ دہلی
۱۰- تاریخ گجرات ۔ از شبیہ احمد ۔ حجم ۱۵۸ صفحے ۔ قیمت عہ ۔ پتہ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس ۔ الہ آباد
۱۱- تجلیات (مجموعۂ کلام) از میر عثمانی ۔ قیمت عا/ ۔ پتہ ۔ مکتبۂ قصر الادب ۔ آگرہ
۱۲- دلکش شخصیت ۔ مترجمہ ۔ فیروزشاہ تاراپوری حجم ۲۱۱ صفحے ۔ قیمت مجلد عا/
۱۳- جام شکستہ (افسانے) از ایم اسلم ۔ قیمت ے ۔ پتہ کتب خانہ دارالبلاغ محمد نگر میو روڈ ۔ لاہور
۱۴- اجالے سے پہلے (″) از مدھوسودن ۔ حجم ۲۱۶ صفحے قیمت عا/ پتہ اردو محل ۔ معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد دکن
۱۵- دنیا ہماری (″) از پردیسی ″ ۲۳۹ ″ ″ عا/ ″ راج محل پبلشرز ۔ جموں ۔ کشمیر
۱۶- پہلو (افسانے) از لطیف اللہ عدیل ۔ حجم ۱۶۲ صفحے ″ عا/ ″ محمد امان اللہ خاں ۔ نذر علی بلڈنگ ۔ دھرسی اسٹریٹ بمبئی
۱۷- پریشان جلوت (مضامین نظم و نثر) مرتبہ حیات زریں حجم ۲۳۹ صفحے قیمت عا/ پتہ عباسیہ اکادمی بغداد الجدید ۔ بھاول پور
۱۸- ادب پارے (ریڈیائی تقاریر) از ضیاء الاسلام حجم ۱۰۹ ″ پتہ حلقۂ ادب ۱۳ ۔ اسٹینلی روڈ ۔ الہ آباد
۱۹- شب تاب (مجموعۂ کلام) از اسرارالحق مجاز ۔ قیمت عا/ ۔ ″ ہندوستانی پبلشرز ۔ اردو بازار ۔ دہلی ۔
۲۰- مجھے خرید لو ۔ (ریڈیائی ڈرامے) ″ ″ ″ ″ ″ عا/ ″ ″ ″ ″
۲۱- ایک حمام میں (ناول) از نواب خواجہ محمد شفیع ″ عا/ ″ ″ ″ ″ ″ ″
۲۲- معاہدۂ ہند و برطانیہ از سر سلطان احمد ″ عا/ ″ ″ ″ ″ ″ ″
۲۳- قندیل (آزاد نظمیں و غزلیں) از قیوم نظر ″ عا/ ″ ۔ اردو بک اسٹال لوہاری دروازہ ۔ لاہور
۲۴- تعمیر ملت ۔ از محمد شریف چشتی ″ عا/ ″ ″ ″
۲۵- اس نظم میں از میرا جی ۔ قیمت ے پتہ ساقی بک ڈپو ۔ دہلی
۲۶- پائل (گیت) از سلام ″ عا/ ″ ″ ″ ″
۲۷- دام خیال (نظمیں) از ضیاء الاسلام قیمت عا/ پتہ حلقۂ ادب ۱۳ ۔ اسٹینلی روڈ ۔ الہ آباد
۲۸- زلفیں اور زنجیریں (مجموعۂ کلام) از مخمور جالندھری ۔ حجم ۱۷۲ صفحے قیمت ے پتہ مکتبۂ جدید ۔ بیرون لوہاری دروازہ ۔ لاہور
۲۹- شہید زلفین (افسانے) از سیاح سنامی قیمت عا/ پتہ نراین دت سہگل اینڈ سنز ۔ لاہور
۳۰- کچے انار (افسانے) از انور کمال قیمت عہ ″ ″ ″ ″ ″ ″

مرزا سیف علی خاں

اُردو شاعری کی خدمت

(پروفیسر الیاس برنی صاحب نے ایک اپیل شائع کی ہے جو ناظرین سب رس کی اطلاع کے لئے شائع کی جاتی ہے)

غالباً آپ کو علم ہوگا کہ اردو شاعری کا ایک جامع انتخاب بترتیب خاص بنام "سلسلۂ منتخبات نظم اُردو" ۱۹۱۰ء سے شائع ہونا شروع ہوا اور اس کے تین عنوان مستقل قرار پائے:۔

(۱) "معارف ملت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۲) "جذبات فطرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم (۳) "مناظر قدرت" جلد اول، دوم، سوم و چہارم عنوان کے تحت چار چار جلدیں چار ہی سال میں ۱۹۲۳ء تک شائع ہوگئیں۔ جملہ بارہ جلدوں میں دو سو قدیم و جدید شعراء کا کلام تقریباً چودہ سو نظموں کی شکل میں کم و بیش دو ہزار صفحات پر جمع ہوگیا۔ جو کیفیت و کمیت کے لحاظ سے بہت قابل قدر قرار پایا۔ چنانچہ سلسلۂ مذکور کو علمی و ادبی حلقوں، تعلیمات و جامعات میں اور عام طبقات میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جلد کے کئی کئی اڈیشن نکل چکے اور نکل رہے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ تا حال پچاس ہزار سے زیادہ نسخے شائع ہو چکے ہیں۔ حالانکہ تجارتی معمول کے پیمانہ پر اس سلسلہ کا اشتہار کبھی نہیں نکلا۔ پہلے اشاعت کا مرکز مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ رہا۔ چند سال سے اس کی اشاعت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلق سے مکتبہ جامعہ دہلی کے سپرد ہے۔

اردو میں ماشاء اللہ جس جس رنگ کی شاعری جس پیمانہ پر ترقی کر رہی ہے اس میں اردو ادب کا نیا دور نظر آتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ بیس پچیس سال میں بہت کچھ قابل قدر کلام شائع ہو چکا ہے۔ مجموعوں میں، رسالوں میں اور بہت کچھ کلام غالباً بیاضوں میں موجود ہے۔ جو آئندہ شائع ہوگا۔ غرض کہ اردو شاعری کا مستقبل بفضلہ امید افزا نظر آتا ہے۔ رہا کلام کا ذوق اور معیار۔ سو یہ ماحول کے بے شمار اثرات سے بدلتا رہا ہے اور بدلتا رہے گا دوامی یک رنگی ناممکن ہے اور نا مناسب بھی کہ فطرت میں خود تغیرات کا تسلسل ہے۔

اس دوران میں بعض جوانب سے تقاضا بلکہ ابرام ہوتا رہا کہ بعد کی شاعری بھی سلسلے میں منسلک کر لی جائے تاکہ انتخاب تا حال مکمل ہو جائے۔ اور سہ عنوانات مذکورہ کے تحت مزید جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوں۔ خود میرا بھی مدت سے یہ خیال تھا۔ لیکن کثرت کار نے ادھر متوجہ نہ ہونے دیا۔ تاہم اردو کی خدمت بہرحال واجب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حضرات شعرا اگر اردو کی صلاح و فلاح کی خاطر حسب سابق ازراہ کرم تعاون فرمائیں تو عدیم الفرصتی کے باوجود منتخبات کی مزید جلدیں ترتیب دے دے کر حسب صراحت بالا شائع کی جائیں تاکہ اردو کلام کا انتخاب اس سلسلے کی حد تک محفوظ ہوتا جائے اور اردو شاعری کی نت نئی نوعیت۔ وسعت بھی اجمالی شکل میں ملک کے پیش نظر ہوتی رہے انشاء اللہ۔

حضرات شعراء کے تعاون کی وہی شکل ہے کہ اول تو کلام کے مطبوعہ مجموعے عنایت ہوں جو بعد مطالعہ واپس کر دئے جائیں گے یا جن کی قیمت ارسال کر دی جائے گی۔ البتہ ہدیۃً عنایت ہوں تو دوسری بات ہے شکریہ۔ دوسرے جو کلام رسالوں میں متفرق شائع ہوا ہو۔ یا جو بیاضوں میں جمع ہو حسب سوابدید اس کی نقلیں ارسال فرمائی جا سکتی ہیں۔ لیکن وہ واپس نہ ہو سکیں گی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جو بیاضیں دست بدست وصول ہوں۔ ان کو بعد مطالعہ دست بدست واپس کر دیا جائے۔ توقع ہے کہ مستقل تعاون کے ساتھ کلام کی ترسیل اور منتخبات کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا تازہ بتازہ نو بنو غرض کہ جوں جوں کلام کافی منتخب ہوتا جائے گا۔ معارف ملت، جذبات فطرت، مناظر قدرت ہر سہ عنوانات کے تحت ایک ایک جلد ترتیب پا کر تین تین جلدیں ساتھ ساتھ شائع ہوتی جائیں گی۔ مثلاً ہر سہ عنوان کی جلد ہائے پنجم یا جلد ہائے ششم وغیرہ۔

جو حضرات ازراہ کرم اپنا کلام ارسال فرمائیں اس کے ساتھ اپنے مکتوب میں اجازت طبع تحریر بھی فرما دیں تو بہتر ہو اور اپنے متعلق ضروری معلومات بھی درج فرما دیں۔ یعنی اپنا پورا نام، اپنا تخلص، اپنا وطن یا پتہ، سن ولادت، اگر کچھ کلام شائع ہو چکا ہے تو مجموعوں کے نام اور اشاعت کے مقام تاکہ انتخاب کلام کی صورت میں ضروری معلومات متعلقہ جلد کے ضمیمے میں درج ہو سکیں۔ جن حضرات کا کلام کسی جلد میں شائع ہوگا۔ ان کی خدمت میں متعلقہ جلد کا نسخہ ہدیۃً پیش ہوگا اگر کسی صاحب کا کلام انتخاب میں نہ آسکے تو ان سے پیشگی معذرت چاہی جاتی ہے اور عدم انتخاب سے خدانخواستہ ان کے کلام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ مذکورہ کلام کا علمی و ادبی معیار انتخاب کے عام فہم معیار سے بلند تر ہو۔ جن حضرات شعراء کے پتے معلوم ہو چکے ہیں یا آئندہ معلوم ہوں گے ان کی خدمت میں یہ معروضہ بذریعۂ ڈاک راست پیش ہوگا۔ ایسے حضرات اگر دوسرے پتوں سے مطلع فرمائیں تو باعث تشکر ہوگا۔ پھر بھی جن حضرات کے پتے معلوم نہ ہو سکیں ان سے عدم ترسیل معروضہ کی معذرت چاہی جاتی ہے۔ اطلاع ملنے پر وہ خود ہی التفات فرمائیں تو کرم اور بھی زیادہ ہوگا۔ اردو رسائل و اخبارات سے بھی استدعا کی جاتی ہے کہ وہ براہ کرم یہ معروضہ یا اس کا خلاصہ بشرط گنجائش شائع کر کے تعاون فرمائیں۔ توقع ہے کہ یہ استدعا کسی نہ کسی حد تک ضرور قبول ہوگی اور صحافت کے ذریعے بھی حضرات شعراء تک عام اطلاع پہنچ جائے گی۔ حامیان اردو کی خدمت میں اردو کے ایک ادنیٰ خادم کی یہ ناچیز استدعا ہے ع

نتیجۂ امتحان اُردو فاضل بابت سنہ ۱۹۴۵ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے

۲۴ - سید ناظم حسین دوم (بلدہ فوج)
۴۳ - سید عبدالعزیز دوم (میسور)
۴۹ - شیخ احمد دوم (بلولی)

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز بشیر آباد

۳ - سید بدرالدین احمد شہرت دوم
۴ - سید کریم الدین دوم
۵ - جیلانی بیگم ناہید سوم

مرکز بلدہ

۹ - سید عثمان دوم
۱۰ - مرزا محمد بیگ سوم
۱۱ - سید شاہ قطب الحق دوم
۱۲ - محمد مظہر الرحمٰن سوم
۱۳ - محمد عبدالقدیر خاں سوم
۱۴ - غلام محمد سوم
۱۵ - محمد عبدالباری خاں تنویر سوم
۱۶ - محمد عبداللطیف دوم
۱۸ - سید ظہور احمد سوم
۲۰ - محمد عبدالسلیم شمیم سوم
۲۱ - نیاز محمد خاں درانی سوم
۲۲ - محمد شہاب الدین احمد سوم

مرکز بلولی

۴۶ - محمد عبدالجلیل سوم
۴۸ - غلام معین الدین سوم
۴۹ - شیخ احمد دوم

مرکز ٹاکلی جاگیر

۲۶ - محمد عبدالقادر خاں دوم
۲۷ - قاضی محمد تاج الدین سوم
۲۸ - افضل النساء بیگم سوم

مرکز کورٹلگل

۲۹ - فیاض علی سوم
۳۱ - محمد عبدالکریم سوم
۳۴ - محمد عبدالسلیم دوم

مرکز میسور اسٹیٹ

۳۵ - ایم قادر علی خاں دوم
۳۷ - بی عبدالبصیر دوم
۳۸ - بی پیر خاں سوم
۴۰ - قاضی عبدالقادر فیاض دوم
۴۱ - علی اکبر دوم
۴۲ - عبدالحمید بیگ دوم
۴۳ - سید عبدالعزیز دوم
۴۴ - رقیہ بی سوم

نتیجۂ امتحان اردو عالم بابت ۱۹۴۵ء

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ

۷۶ - منیرہ خانم اول (بمبئی)
۶۵ - کیپٹن حبیب حسین اول (بلدہ فوج)
۲۷ - علیم اللہ صدیقی اول (بلدہ ذکور)

ناموں کی ترتیب بلحاظ رول نمبر

مرکز الہند

۱ - غلام عبدالقادر سوم
۲ - مارتن بیاری سوم
۵ - لکشمن راؤ سوم
۷ - فہیم النساء بیگم دوم
۸ - علیم النساء بیگم سوم

مرکز بشیر آباد (پائیگاہ)

۹ - محمد عبدالباری سوم
۱۰ - محمد عبدالرشید دوم

مرکز بلدہ (اناث)

۱۲ - حفیظ فاطمہ سوم
۱۹ - چاندنی بیگم سوم

مرکز بلدہ (ذکور)

۲۷ - محمد علیم اللہ صدیقی اول
۲۸ - ہریش چندر دوم
۳۱ - محمد احمد محی الدین قادری سوم
۳۳ - رشید احمد خاں دوم
۳۵ - محمد جعفر علی دوم
۳۸ - بہادر علی مرزا سوم
۴۰ - محمد ممتاز علی خاں صدیقی دوم
۴۱ - محمد عبدالقادر حبیب دوم
۴۳ - سید عبدالرزاق اعجاز دوم
۴۴ - سردار علی خاں دوم
۴۸ - سید نظام الدین احمد سوم
۴۹ - محمد بدرالدین سلیم سوم
۵۰ - حمیدالدین احمد دوم
۵۱ - محمد عبدالصمد دوم
۵۷ - محمد عبدالعلیم خاں منظہر سوم
۳ - دادا راؤ مورے سوم
۱۵۸ - سید احمد حسین سوم

مرکز بلدہ (فوج)

۶۲ - محمد موسیٰ سوم
۶۳ - سید محمد عارف سوم
۶۴ - محمد خواجہ سوم
۶۵ - کیپٹن حبیب حسین اول
۶۶ - شیر محمد خاں دوم
۶۷ - سید احمد عطاس سوم
۶۸ - عبداللہ قریشی سوم
۷۰ - محمد باکوبن سوم
۷۱ - عبداللہ بالاصقع دوم

مرکز بلولی

۷۳ - مرزا قاسم بیگ سوم

مرکز بمبئی (اناث)

۷۵ - منیرہ خانم اول

مرکز ٹاکلی جاگیر

۷۸ - محمد سراج الدین سوم

مرکز جگتیال

۸۲ - محمد حیدر علی — دوم
۸۳ - محمد نور الحسن — سوم
۸۶ - محمد عبد الکریم ہزاری — دوم
۸۸ - محمد عبد الرشید — دوم
۹۰ - محمد عزیز الدین — دوم

مرکز کوڑنگل

۹۱ - محمد صدیق صدیقی — سوم
۹۶ - محمد عبد الحمید — سوم
۹۷ - منور بی — دوم
۹۹ - فضیلت النسا بیگم — سوم

مرکز گدوال

۱۰۱ - سید نور الدین — سوم

مرکز میسور اسٹیٹ

۱۲۲ - سید عبد الرزاق — سوم
۱۲۳ - محی الدین شریف — دوم
۱۲۴ - محمد نذیر احمد — سوم
۱۲۶ - سید محمد — دوم
۱۲۷ - ایم غوث محی الدین — سوم
۱۲۸ - کے عبد الوہاب خاں — دوم
۱۳۳ - طاہر النساء بیگم — دوم

مرکز ناگر کرنول

۱۳۴ - محمد عبد الوہاب — سوم

مرکز نظام آباد

۱۴۲ - غلام محی الدین انصاری — سوم
۱۴۶ - محمد نذیر احمد عشرت — دوم
۱۴۸ محمد حبیب الدین احمد منصور — دوم

امتحان اُردو دانی دوم

۱۹۴۵ء کا دوسرا امتحان اردو دانی بتاریخ ۹ دسمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۶ بہمن ۱۳۵۵ف حسب ذیل مرکزوں میں منعقد ہوا :- بلدہ (فوج) بلدہ (ذکور) بلدہ (اناث) بمبئی، دوم کنڈہ، نظام آباد، ناگر کرنول ۔

ادارے کی طرف سے حسب ذیل علم دوست اصحاب بحیثیت صدر نگران کار تشریف لے گئے تھے جنہوں نے تاریخ اور وقت مقررہ پر امیدواروں کا امتحان لیا

نواب غازی الدین احمد صاحب (بمبئی) نواب باقر علی خاں صاحب (دوم کنڈہ) مولوی مظہر الدین صاحب (نظام آباد) مولوی ظہیر الدین صاحب (ناگر کرنول) مرکز فوج اور مرکز بلدہ کے امیدواروں کی نشستوں کا انتظام نظام کالج میں کیا گیا تھا ۔ زنانہ مرکز حسب سابق زنانہ ہائی اسکول نام پلی قرار پایا ۔

نظام کالج کے امتحان گاہ کے صدر نگران کار پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی تھے [illegible] کی نگرانی میں تحریری اور زبانی امتحانات لئے گئے امتحان گاہ کی نگرانی اور زبانی امتحان میں حسب ذیل اصحاب نے مدد فرمائی ۔

پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی عبد الحفیظ صاحب صدیقی ایل ایل ایم، مولوی عبد الحفیظ صاحب قتیل ایم اے ۔ مولوی عبد الرحمٰن شریف صاحب، مولوی اظہر الدین صاحب، مولوی مرزا ضیاء الحق صاحب وکیل ۔ زنانہ مرکز کی نگرانی محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ، محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النسا بیگم صاحبہ بشیر اور مس بشیر النساء نے فرمائی ۔

ادارہ ان جملہ خواتین و اصحاب کا بطور خاص شکریہ ادا کرتا ہے جنہوں نے اپنا قیمتی وقت ادارے کے اس

علمی کام کے لئے دے کر امتحان گاہ کی نگرانی کی زحمت اٹھائی۔

مرکز نظام آباد | ۸ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء یوم شنبہ سہ پہر کو ۱۰ ۔ ۱۰ نہ ہو کر رات میں سوا نو بجے نظام آباد پہنچا۔ اسٹیشن پر مولوی محمد حسین خاں صاحب معتمد شاخ نظام آباد موجود تھے۔ صاحب ممدوح نے میرے قیام و طعام کا انتظام اپنے گھر پر نہایت ہی فراخدلی و سلیقہ کے ساتھ کر کے میرا ہر طرح خیال رکھا جس کا میں دل سے ممنون ہوں۔

امتحان گاہ کے انتظامات قبل از قبل مدرسہ فوقانیہ میں نہایت عمدگی سے عمل میں لائے گئے تھے۔ ڈرائینگ ہال میں ذکور اور اسی سے متصل ایک وسیع کمرہ میں اناث کی نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ امتحان ۹ر ڈسمبر ۱۹۴۵ء کو وقت مقررہ پر شروع ہوا اور دوپہر میں زبانی امتحان ٹھیک ۲ بجے سے شروع ہو کر پانچ بجے اختتام کو پہنچا۔ ذکور میں منجملہ (۳۱) امیدوار کے (۲۶) امیدوار نے شرکت کی اور اناث میں منجملہ (۲۵) طالبات کے (۲۰) حاضر تھیں۔

صاحبزادہ میر احمد علی خاں صاحب مہتمم تعلیمات نظام آباد و صدر مجلس ادارۂ ادبیات اردو شاخ نظام آباد کی ادب نوازی اس بات کا یقین دلا رہی ہے کہ جناب والا کی سرپرستی ادارہ کے لئے ایک فال نیک ہے۔

مولوی سید انیس الحق صاحب صدر مدرس مدرسہ فوقانیہ نظام آباد بہت زیادہ شکریہ کے مستحق ہیں کہ جناب والا کی عنایت اور مہربانی سے مدرسہ کی وسیع عمارت اور امتحانی ضروریات کی جملہ چیزیں میسر آسکیں۔

مولوی محمد حسین خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ اس شاخ کے معتمد ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے انتہائی مسرت ہوتی ہے کہ صاحب موصوف ادارہ کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ خلوص و ایثار اور بلا تفریق مذہب و ملت طلبہ کی تعلیم کا انتظام فرما کر شریک امتحان کراتے ہیں۔ اس کے لئے وہ ہر طرح لائق مبارکباد ہیں۔ گر ادارہ کی باگ ڈور چند ایسے ہی مخلص کارکنوں کے ہاتھ میں رہے تو قدم قدم پر ادارہ کی کامیابی یقینی ہے۔

مولوی غلام احمد صاحب وکیل کاشانہ نے نگرانی فرماتے ہوئے زبانی امتحان کے وقت بڑی مدد فرمائی۔ ممدوح بظاہر معمر مگر ادارہ کی خدمت گزاری اور ذوقِ ادب میں نوجوانوں سے بھی بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ مولانائے موصوف کی سعی سے امیدواروں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

مسٹر کاشی ناتھ راؤ کمیاں کر وکیل ہائی کورٹ ادارہ کے مخلص معاون ہونے کے علاوہ نادار طلبہ کی اعانت سے دریغ نہیں فرماتے۔ وکیل صاحب کا یہ ایثار قابلِ تقلید ہے۔

مولوی محمود عالم صاحب سالک مدرس مدرسہ تحتانیہ پھلانگ و مولوی عبدالواحد صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ قلعہ نے ہر دو پرچوں میں نگرانی فرماتے ہوئے ہر موقع پر میری مدد فرمائی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

مولوی عبدالغنی صاحب مدرس مدرسہ تحتانیہ بالم نے بھی معہ دو امیدواروں کے امتحان گاہ تک آنے کی زحمت کی۔ امید ہے کہ آئندہ زیادہ سے زیادہ امیدوار متعدد امتحانوں میں شریک کروا کر ادارہ کو شکریہ کا موقع دیں گے۔

مولوی محمود علی خاں صاحب محمود نے مرکز کے ضروری انتظامات میں غیر معمولی دلچسپی لے کر اپنے خلوص کا اظہار فرمایا و نیز صاحب موصوف کے محبت آمیز سلوک کو جو شروع سے آخر تک میرے ساتھ روا رکھا گیا میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

طبقہ اناث کی صدر نگران کارہ جناب صفیہ بیگم صاحبہ صدر معلمہ مدرسہ وسطانیہ لنسوان نے باوجود اپنے خانگی مصروفیات کے محض ادارہ کے امتحان کی خاطر بہر کر غیر معمولی دلچسپی لی جس کا دل سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

جناب بھیمہ بائی صاحبہ نے اگرچہ کہ یہ مرہٹی داں ہیں لیکن اردو ادب کی طرف ان کا زیادہ میلان پایا جاتا ہے۔ موصوفہ نے بھی صدر معلمہ صاحبہ کا ہاتھ بٹایا اور ہمیں شکریہ کا موقع دیا۔

منظہرالدین

مرکز ناگر کرنول براہِ اسٹیشن جڑچرلہ بذریعہ موٹر بس
ناگر کرنول پہونچا۔ وہاں معزز
سرپرست ادارہ مولوی سید عارف الدین حسن صاحب
دوم تعلقدار میری آمد کے منتظر تھے۔ میرے قیام و طعام
کا انتظام واپسی تک معزز سرپرست ادارہ نے
اپنے ہی دولت کدہ پر فرمایا تھا۔ سرپرست صاحب
کی انتہائی دلچسپی کی وجہ امتحان گاہ کا انتظام بہترین
تھا۔ امیدواروں کی نشستیں بہت ہی اصولی طریقہ
پر تھیں۔

امتحان اردو دانی کا آغاز ہوا۔ طبقۂ ذکور
کے (۲۹) امیدواروں میں سے (۲۳) شریک
امتحان تھے۔ تحریری پرچہ ختم ہونے کے بعد زبانی
امتحان میں نے خود لے کر نمبرات دئے۔

طبقۂ اناث کی (۷) امیدوارہ میں سے
(۵) شریک امتحان تھیں جن کا زبانی امتحان اور
زنانہ مرکز کی نگرانی محترمہ اہلیہ عبدالحمید صاحب ڈاکٹر
حیوانات نے کی۔

جن مقامی عہدہ داروں نے شاخ کی
سرگرمیوں میں دلچسپی لی اور ادارہ کی قدر و منزلت
بڑھانے میں اپنے عزیز وقت کو آغاز امتحان
سے آخر وقت تک صرف فرمایا اور ضروری انتظامات
اور کاروبار امتحان میں شاخ کی اعانت فرمائی
ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:-

۱۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب مددگار مہتمم پولیس
۲۔ " مظہر الحق صاحب تحصیل دار
۳۔ " حبیب الرحمن صاحب بی۔ ٹی او
۴۔ " غلام محی الدین صاحب انسپکٹر انجمن امداد باہمی
۵۔ " عبدالحمید صاحب ڈاکٹر حیوانات

معزز سرپرست ادارہ جہاں بھی رہے اردو
زبان کی اشاعت اور ترویج میں سعیٔ بلیغ فرماتے
رہے اور اس وقت مقامی ادارہ نے جو بھی
ترقی کی وہ معزز سرپرست کی انتہائی دلچسپی
ایثار اور جوشِ عمل کا نتیجہ ہے۔ ایسے مخلص اور
با اثر حضرات کی وجہ یقیناً ادارہ کو تقویت
پہونچے گی۔

ظہیر الدین احمد

مرکز دوم کنڈہ سمستان دوم کنڈہ میں ادارۂ ادبیاتِ اردو
کا یہ دوسرا سال ہے اس عرصہ میں یہاں تین مرتبہ
مرکز کا قیام عمل میں آیا اور مجھے دو مرتبہ بحیثیت
صدر نگران کار جانے کا اتفاق ہوا۔

اس مرتبہ میں نے دوم کنڈہ میں غیر معمولی
انقلاب محسوس کیا وہ یہ کہ یہاں کے بسنے والوں
میں سے عموماً ہر شخص کے دل میں اردو تعلیم کے
حصول کا شوق موجزن ہے۔

مجھے اکثر امیدواروں سے گفتگو کا موقع ملا۔
بہت ہی سلجھے ہوئے پیرایہ کے ساتھ سلیس اردو
زبان میں آئندہ کے لئے اپنے سلسلۂ تعلیم کو
جاری رکھنے کے علاوہ انھوں نے ادارہ کی خدمت
کرنے کا بھی وعدہ کیا۔

عام طور پر بلا لحاظ پیشہ و عمر ہر شخص کے خیالات
میں اس قسم کا بڑھتا ہوا شوق ادارہ کی کامیابی کا
بیّن ثبوت ہے۔ بہرکیف اس لہلہاتے ہوئے باغ
اردو کی یہ پُر زور ترقی حضرت زورؔ کے لئے مبارک ہو۔
بالخصوص دوم کنڈہ میں ادارہ کی یہ نمایاں ترقی
جناب مولوی سید غوث صاحب ڈویژن افسر
و نیز مسٹر لکشمی نارائن راؤ کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔

اغراض و مقاصد ادارہ سے دلچسپی و شغف
رکھنے والے ایسے ہی حضرات اگر دوسرے اضلاع اور
تعلقات و قصبات وغیرہ کے لئے دستیاب ہو جائیں تو

نہ صرف توقع بلکہ یقین کامل ہے کہ اس آفتاب ادارۂ اردو کی شعاعیں ارضِ مملکت ابد مدت کے کناروں کو بھی جلد سے جلد منور کردیں گی۔

اردو عالم و فاضل کی تعلیم کے لئے اساتذہ کی فراہمی وغیرہ کا مسئلہ فوری توجہ کا محتاج ہے تاکہ ان امتحانات میں بھی طلبہ کافی تعداد میں شریک ہوسکیں۔

میں بتاریخ ۸ رڈسمبر ۱۹۴۵ء مطابق ۵ بہمن ۱۳۵۵ف یوم شنبہ بوقت تین بجکر بیس منٹ روز بلدہ سے روانہ ہوکر اسٹیشن تلمنڈلہ پر شب کے آٹھ بجے پہونچا۔ اسٹیشن پر جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب منتظر تھے۔ موصوف کے ہمراہ کھاچر کے ذریعہ مرکز دوم کنڈہ کو رات کے گیارہ بجے پہونچا۔

دوسرے روز یعنی ۹ رڈسمبر ۱۹۴۵ء کو ٹھیک ساڑھے نو بجے امتحان گاہ پہونچا۔ صاحب موصوف نے نشستوں کا نہایت معقول انتظام فرمایا تھا۔ میں نے پہلا تحریری پرچہ گیارہ بجے امیدواروں میں تقسیم کردیا جو ایک بجے ختم ہوا

دوسرا زبانی پرچہ دو بجے سے شروع کیا گیا جو شام کے پانچ بجے ختم ہوا

جملہ چونتیس امیدواروں میں سے اکتیس حاضر تھے جن میں ایک بی بی سوشیلا بائی بھی شریک امتحان تھیں۔ پرچہ جات سربمہر لفافہ میں محفوظ کئے جاکر روانہ خدمت کئے جاچکے ہیں۔ راہ کرم اس کا اطمینان فرمالیا جائے۔

جناب لکشمی نارائن راؤ صاحب کا میں ممنون ہوں کہ موصوف کے قابل ستائش اخلاق کی وجہ سے قیام وغیرہ میں مجھ کو انتہائی آرام ملا۔

میر باقر علی خاں

شاخوں کے قاعدے اور طرز کار

(۱) حیدرآباد سے باہر اگر کسی مقام کے اہل ذوق اصحاب اردو زبان اور ادب کی توسیع و اشاعت کی خاطر اجتماعی طور پر کوشش کرنا چاہتے ہوں تو ادارۂ ادبیات اردو کے معتمد صاحب کے نام پانچ علم دوست اصحاب کے دستخطوں کے ساتھ ایک خط روانہ فرمائیں تاکہ قیام شاخ کے لئے اجازت نامہ کا فارم بھیجا جائے۔ اس فارم کو بعد خانہ پری واپس کرنے پر معتمد صاحب مذکور ادارہ کی مجلس انتظامی سے منظوری حاصل کرکے قیام شاخ کی اطلاع دیں گے اور اس سلسلہ میں ضروری کارروائی کریں گے۔

(ادارے کی شاخوں کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہیں)

۱۔ ادارہ کے اردو امتحانات کا چرچا کرنا۔

۲۔ امتحان اردو دانی کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کرنا۔

۳۔ اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات کی تعلیم کے لئے معاوضہ کے ساتھ انتظام کرنا۔

۴۔ اردو مطالعہ خانہ قایم کرنا۔

۵۔ سب رس کے لئے قلمی معاون اور خریدار فراہم کرنا۔

۶۔ ادارہ کے قواعد کے تحت اپنے ارکان بنانا اور جمع شدہ رقم میں سے نصف صدر ادارہ کو روانہ کرنا اور نصف سے اپنی شاخ اور مطالعہ خانہ کے اخراجات کا انتظام کرنا۔

۷۔ شاخیں سب رس کے جو خریدار فراہم کریں گی ان کے چندے کا ایک چوتھائی حصہ ادارے کی جانب سے بطور امداد اخبارات و رسائل کی صورت میں شاخوں کو دیا جائے گا۔

۸۔ ہر شاخ کے دارالمطالعہ کے لئے ادارے کی تمام مطبوعات کا ایک ایک نسخہ نصف قیمت پر دیا جائے گا اور شاخوں کی کوشش سے جس قدر مطبوعات فروخت ہوں گی ان پر ⅛ کمیشن شاخوں کو دیا جائے گا۔

۹۔ ان کے علاوہ شاخوں کے مزید قواعد و ضوابط وہی ہیں جو ادارۂ ادبیات اردو کے مطبوعہ کتابچہ معلومات میں درج ہیں

ادارہ کی مطبوعات دوسروں کی نظر میں

اشوک اعظم:۔

بچوں کے لئے یوں تو ہر صوبے سے کتابیں شائع ہوتی ہیں اور ان میں تعلیمی پہلو بھی خاصا نمایاں ہوتا ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں جو کام حیدرآباد نے کیا ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ یہ سلسلہ جہاں بچوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھتا ہے وہاں ان کی تعلیم اور تاریخی واقفیت کو ترقی دینے میں تمام دوسرے صوبوں کے ادب پر سبقت لے گیا ہے۔ اشوک اعظم ہندوستان کی تاریخ میں ایک بہت ممتاز اور زندۂ جاوید حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زندگی اور حکومت کے واقعات بہت آسان اور شستہ زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ والدین اور اسکولوں کے لائبریرین اس کتاب کی سرپرستی قبول فرمائیں گے۔ صفحات ۸۸ قیمت ۱۰ ار

ہمایوں لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

اشوک اعظم کے نام سے ہندوستان کا ہر تعلیم یافتہ شخص بخوبی واقف ہے۔ اشوک کے کتبے اور فرامین مشہور ہیں جو اس نے جگہ جگہ میناروں پر کندہ کرائے تھے۔ اس رسالہ میں جو سید مہدی جعفری حیدرآبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اشوک اعظم کے آباؤ اجداد، اس کے طریقۂ حکومت، مذہبی تبلیغ و اشاعت، فرامین، کتبہ جات، نظم و نسق، عمارات وغیرہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور خوب لکھی گئی ہے جس سے بڑے بھی مستفید ہوسکتے ہیں۔ کتاب کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

حیدرآباد:۔

حیدرآباد کی تاریخ اور جغرافیائی نوعیت پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بچوں کو حیدرآباد کے بارے میں مفصل معلومات حاصل کرنے کے لئے یہ کتابچہ بہت مفید ثابت ہوگا۔ قیمت ۱۰ ار

ہمایوں۔ لاہور۔ جولائی ۱۹۴۵ء

یہ چھوٹی سی کتاب ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے مطبوعات کی چودھویں اور ادارۂ مذکور کے شعبۂ ادبیات اطفال کے سلسلہ کی پانچویں کڑی ہے جس میں ایک ہونہار خاتون رفیعہ سلطانہ (متعلمہ بی اے عثمانیہ) نے بچوں کو ریاست حیدرآباد دکن اور اس کے متعلقات کی نہایت آسان اور سلیس زبان میں سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے گویا ریاست حیدرآباد دکن کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ ہے جس میں ریاست کی صنعت و حرفت، پیداوار، طرز معاشرت وغیرہ پر بہت عمدگی اور خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ چھوٹی سی کتاب اس قابل ہے کہ اس کے نمونے پر ہندوستان کے دوسرے ممالک میں بھی بچوں کے لئے درسی کتابیں لکھی جائیں۔ ہم اس عمدہ تصنیف پر مصنفہ کو مبارکباد کی مستحق سمجھتے ہیں۔

زمانہ۔ کانپور۔ اگست ۱۹۴۵ء

سرگزشت حاتم:۔

شاہ ظہور الدین حاتم اردو کے ان قدیم شعراء میں سے ہیں جنھوں نے ولی دکھنی کے تتبع میں مستقلاً اردو شاعری کی اور اس کو پروان چڑھایا اور اپنے بعد شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے۔ جنھوں نے اردو شاعری کی انگلی پکڑ کر اسے اور آگے بڑھایا۔ زور صاحب نے اس کتاب میں آپ ہی کے حالات و سوانح خصوصیات کلام اور بعض

اور متعلقہ مباحث پر روشنی ڈالی ہے۔ انداز گفتگو محققانہ ہے۔ مولنا آزاد کے بیانات پر اس ذیل میں خاص تنقید ہوگئی ہے۔ مرحوم حاتم کا مجموعۂ کلام "دیوان زادہ" بھی ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام طبع ہو رہا ہے۔ دیوان زادہ کے ساتھ سرگزشت حاتم کا مطالعہ اردو زبان و ادب کی تاریخ کے طالب علم کے لئے بہت مفید و سودمند ثابت ہوگا۔

برہان - دہلی - بابت جون ۱۹۴۵ء

معلم بالغاں :-

کچھ دن ہوئے نواب مہدی یار جنگ بہادر دار المہام صیغہ تعلیمات ریاست حیدرآباد دکن نے پبلک میں تعلیم بالغاں سے دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے اسی موضوع پر عمدہ اور بہترین مقالات لکھنے والے حضرات کے لئے انعامات کا اعلان کیا تھا۔ سید زاہد حسین صاحب ایم اےڈ (عثمانیہ) ہیڈ ماسٹر مدرسۂ وسطانیہ مشقی عثمانیہ ٹریننگ کالج نے بھی ایک مقالہ قلم بند فرمایا تھا جس پر فاضل مصنف کو اول انعام عطا ہوا تھا۔ بعد میں اسی مقالہ میں اضافہ کرکے اس کو "معلم بالغاں" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا اور واقعی یہ کتاب اپنے موضوع پر کافی غور و فکر کے بعد لکھی گئی ہے۔ بالغوں کا پڑھانا بھی ایک خاص فن ہے جو اس فن میں مہارت نہیں رکھتا وہ عموماً اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں بالغوں کو تعلیم دینے کے خاص اصول بتائے گئے ہیں۔ کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہوگا۔

زمانہ - کانپور - اگست ۱۹۴۵ء

یورپ جنگ سے پہلے :-

۱۹۳۸ء میں یعنی جنگ سے پہلے سوئزرلینڈ کے شہر زیوریخ میں ایک بین الاقوامی تاریخی کانگریس منعقد ہوئی تھی جس کے لئے کتاب زیر نظر کے فاضل مصنف مسٹر ہارون خاں شروانی نے "[illegible]" کے عنوان سے ایک اس قدر فاضلانہ تحقیقی مقالہ لکھا تھا کہ اسے مبصرین و ماہرین فن نے بہ نظر استحسان دیکھا اور اس کا کانگریس میں پڑھا جانا منتصور کیا گیا۔ چنانچہ فاضل مصنف نے کانگریس مذکور میں شرکت کرنے کے علاوہ مشرقی، جنوبی و مغربی یورپ کے اکثر ممالک کی سیر کرکے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے۔ اس قلیل مدت میں فاضل مصنف نے سواحل عرب، اطالیہ، بحیرہ ایڈریاٹک، بحیرہ یونان، استنبول یا قسطنطنیہ، ایڈریانوپل یا ادرنہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، فرانس، انگلستان، سوئزرلینڈ وغیرہ کے اکثر مقامات کی سیر و سیاحت میں جن باتوں سے آپ متاثر ہوئے وہ آپ نے اس مختصر سفرنامے میں بہت دلچسپ پیرائے میں درج کردئے ہیں۔ سفرنامہ کا وہ حصہ جو سواحل عرب، استنبول، بلغاریہ، یوگوسلافیہ سے تعلق رکھتا ہے مسلمانوں کے لئے اور بقیہ سفرنامہ عام ہندوستانیوں کے لئے خاص دلچسپی کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ حالات سے متاثر ہوکر آپ نے جگہ جگہ ایسے ریمارک بھی کئے ہیں جو نہ صرف عبرت انگیز بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ سوئزرلینڈ وسطی یورپ میں ایک چھوٹا سا کوہستانی ملک ہے جو بلحاظ سلسلۂ مواصلات اور قدرتی وسائل و ذرائع دولت ہندوستان کے مقابلہ میں کچھ بھی وقعت نہیں رکھتا لیکن جن طریقوں سے وہاں کے لوگ حصول معاش اور زندگی بسر کرتے ہیں ان سے ہم ہندوستانیوں کو ضرور سبق لینا چاہئے۔

اس سفرنامے کا پیرایۂ بیان دلچسپ اور طرز نگارش ولولہ انگیز، اخذ کردہ نتائج سبق آموز اور زبان سلیس و عام فہم ہے۔

بندر سعید کا ذکر کرتے ہوئے فاضل مصنف نے لفظ "ہردیسی" استعمال کیا ہے۔ جو انگریزی لفظ میٹروپولٹن Metropolitan کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ بہت خوب اور قابل داد ہے بلکہ تعریف سے مستغنی ہے۔ کتاب میں گیارہ ہاف ٹون تصویریں بھی دی گئی ہیں جن سے کتاب کی معنوی و صوری حیثیت کیا چاند لگ گئے۔

زمانہ - کانپور - اگست ۱۹۴۵ء

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
[illegible]	۸۰	۰	۸	۰
سرگزشت غالب	۶۴	۰	۸	۰
نظام الملک	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۳	۸	۰
ریڈیو نمبر (۸ تصاویر) ...	۱۶۰	۱	۰	۰
ارمغان جذب	۱۲۰	۱	۱۲	۰
یورپ جنگ سے پہلے ...	۴۱۸	۲	۸	۰
تاریخ سیاسیات	۲۷۲	۳	۸	۰
سرسالار جنگ	۴۸	۰	۶	۰
مغربی تصانیف اردو کے تراجم	۱۴۵	۱	۴	۰
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۱	۴	۰
اقبال نمبر	۱۶۸	۱	۴	۰
سائنس کے کرشمے	۱۱۲	۱	۰	۰
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۲	۱۲	۰
مکتوبات شاد عظیم آبادی ...	۳۰۰	۲	۸	۰
دادا بھالی	۱۶	۰	[illegible]	۰
اردو نامہ	۲۰۰	۲	۰	۰
سرگزشت حاتم	۱۲۸	۲	۰	۰
عماد الملک	۴۰	۰	۶	۰
اردو دانی کی پہلی کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
〃 دوسری کتاب ...	۵۶	۰	۵	۰
محمد حسین آزاد	۲۰۰	۲	۰	۰
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۱	۴	۰
فن تقریر	۹۲	۰	۸	۰
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴	۱	۰	۰
ہندستانی تمدن	۳۴۰	۳	۸	۰
پودوں کی کہانی	۰۵	۰	۰	۰
مہ لقا	۰۰	۱	۰	۰
پانی کی کہانی	۴۸	۰	۶	۰
رسائل طبیہ	۳۱۲	۲	۸	۰
سلک گوہریں	۴۰	۰	۴	۰
تاریخ ادب اردو	۷۶		۸	۰
رفیق اردو داں	۲۲۴	۱	۱۲	۰
اشوب	۵۶		۸	۰
حیدرآباد	۸۸	۰	۰۱	۰
شاد اعمال	۱۷۹	۲	۸	۰
آریائی رباعیں	۱۰۴	۱	۰	۰
نظام علی خاں	۳۲	۰	۴	۰
تذکرۂ اردو مخطوطات جلد اول	۳۹۶	۵	۰	۰
عرب اور عربستان	۵۶	۰	۱۰	۰

نام کتاب	صفحات	روپے	آنے	پائی
سچ کا جادو	۴۸	۰	۴	۰
طبیعیاتی کائنات	۶۸	۰	۸	۰
متاع سخن	۱۲۴	۰	۱۲	۰
کیف سخن	۱۲۲	۰	۱۲	۰
بادۂ سخن	۱۲۷	۰	۱۲	۰
سراج سخن	۱۵۲	۰	۱۲	۰
ایمان سخن	۱۲۰	۰	۱۲	۰
فیض سخن	۱۴۴	۰	۱۲	۰
مرقع سخن جلد اول (۵۵) تصاویر	۵۰۰	۵	۰	۰
〃 دوم (۵۰) 〃	۴۳۲	۵	۰	۰
نقد سخن	۱۷۵	۱	۰	۰
نذر ولی	۲۴۸	۲	۸	۰
گریہ و تبسم	۱۹۲	۲	۰	۰
مشاہیر قندھار دکن ...	۱۸۴	۱	۰	۰
من کی دنیا	۱۴۵	۱	۰	۰
مدراس میں اردو ...	۱۹۶	۱	۸	۰
محرم نامہ	۱۱۲	۱	۰	۰
نذر دکن	۱۵۴	۱	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۲	۸	۰
عاصمہ	۲۰۰	۱	۴	۰
دفتری معلومات	۵۶	۰	۶	۰
آبدوز کشتیاں اور سرنگ ...	۴۸	۰	۶	۰
اردو مثنوی کا ارتقاء ...	۱۴۳	۱	۱۲	۰
نمود زندگی	۲۱۶	۱	۸	۰
سرگذشت ادارہ	۳۰۴	۰	۱۲	۰
میر محمد مومن (۳۴) تصاویر	۳۱۲	۲	۸	۰
بلقان	۳۲	۰	۳	۰
خطابیات	۱۱۳	۰	۱۲	۰
علم خانہ داری	۱۵۰	۱	۰	۰
چیونٹی (۱۶) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۲	۰
انوار	۱۶۸	۱	۸	۰
کشمش نانی (۴) تصاویر ...	۸۰	۰	۱۰	۰
گارساں دتاسی	۱۲۸	۱	۴	۰
رات کا بھولا	۱۶۸	۱	۰	۰
سکندر جاہ	۲۴	۰	۴	۰
بلاغت	۵۶	۰	۱۰	۰
ادارہ سنہ ۱۹۴۲ء میں ...	۴۰۰	۰	۸	۰
ناصر الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
افضل الدولہ	۳۲	۰	۴	۰
نواب میر محبوب علی خاں	۳۲	۰	۴	۰

مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن